ماہنامہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

[سالنامہ جنوری ۱۹۸۳ء]

جلد ۱۶ — شمارہ ۱

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

سرورق
عزیز کارٹونسٹ
(کراچی)

تزئین و کیریکچر
شعیب

مجلسِ مشاورت
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

منیجر
جلیل

قیمت فی پرچہ: ۵ روپے

زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے

بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

کتابت: محمد سلیم، عبدالرؤف، اسعد محمد

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ:

شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتا ڈیری، آگرہ
۳۔ ہاکو، سری نگر
۴۔ انڈین ییسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو، کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ میلڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئیٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈمک جوشان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

Accession Number 84750
Date 9-7-86
SV02

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور چلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۲

اِس تھیلا کے چٹے بٹے (فہرست)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

مالِ مفت (انشائیے)

تانک جھانک [یورپین مزاح]

برق و شرر (مستقل فیچر)

نہیں آتی تو یاد ... یادِ رفتگان

بال کی کھال (تبصرہ)

چُوں چُوں کا مُربّہ (نظمیں)

ماہنامہ

شگوفہ کی

ایک اور خصوصی اشاعت

ہندوستانی مزاح نمبر

مہمان مدیر :- یوسف ناظم

ہندوستان میں مزاح سبھی زبانوں میں لکھا جاتا ہے۔ اس برصغیر میں بولی جانے والی سب ہی زبانوں کے ظریفانہ ادب کا شریفانہ ڈھنگ سے تفصیلی جائزہ لینے کے لیے آپ کا محبوب اور "کثیر القاری" رسالہ "شگوفہ" نامور مزاح نگار یوسف ناظم کی نگرانی میں خصوصی نمبر شائع کرے گا جس میں:

★ ہندوستانی زبانوں کے مزاحیہ ادب پر ملک کے قد آور اور نامور ادیبوں و نقادوں کے گراں قدر مقالے اور

★ مختلف زبانوں کی نمائندہ مزاحیہ تخلیقات کے تراجم

شائع ہوں گے۔

○ دیگر تفصیلات آئندہ شمارے میں ملاحظہ ہوں ○

ہندوستانی امریکہ میں ــــ کارٹونسٹ کی نگاہ میں

امریکی ڈانس، ہندوستانی اسٹائل

ہندوستانی ایر پورٹ، بے ڈھنگا سامان سفر

دسمبر کے شمارے میں نامور مزاح نگار جناب خواجہ عبدالغفور کا ایک دلچسپ مضمون "امریکہ میں ظرافت" شایع ہوا تھا۔ اس مضمون سے متعلق کارٹون، سالنامہ میں شریک کئے جا رہے ہیں ــــ خواجہ صاحب کا ایک اور مضمون صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں ــ (مدیر)

اوپیارے بچو! یہ ہے انڈیا،
سانپوں، سپیروں، شیروں،
ڈاکٹروں، انجینئروں کا ملک!
INDIA
ہم جیسے اصلی انڈین کے لیے
کوئی رعایتی شرح ؟
ADULT $ 3.00
CHILDREN
TICKET
آپ کے دیس میں ماں باپ کی
طے کی ہوئی شادیاں بہت کامیاب
لگتی ہیں۔
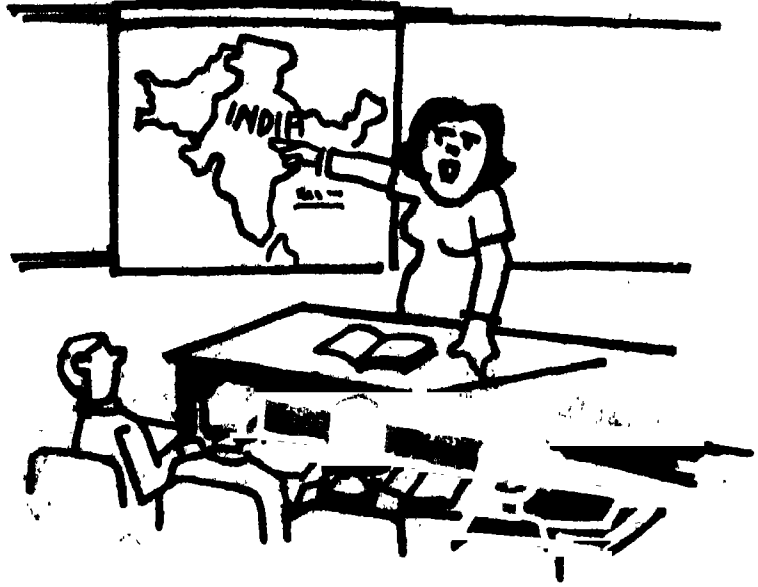
ماہانہ پارٹی
یہاں پر سارے ہندوستانی انجنیئر یا ڈاکٹر ہیں۔
سب ہی بولتے ہیں، سنتا کوئی نہیں۔
ہر ہندوستانی، دوسرے ہندوستانی سے زیادہ کماتا ہے۔
۶ گز رنگ برنگی کپڑا جو ہندوستانی عورتیں اپنے جسم پر لپیٹتی ہیں ساری کہلاتا ہے۔
عورتوں کے شیمپین گلاس میں نشہ آور کوک ہے
عورتوں سے ڈانس کے لیے نہ کہئے۔ اُن کے شوہروں سے سوال کیجئے۔
ساری عورتیں دوسری تمام خواتین سے عمر میں کم ہیں۔
سب ہی ہندوستانیوں کو اپنا ملک بے حد پسند ہے مگر ان سے یہ نہ پوچھئے کہ وطن کب واپس جا رہے ہیں۔
ساری غذا مسالہ دار تیز ہے۔ مردوں کو سروس پہلے کی جائے گی۔
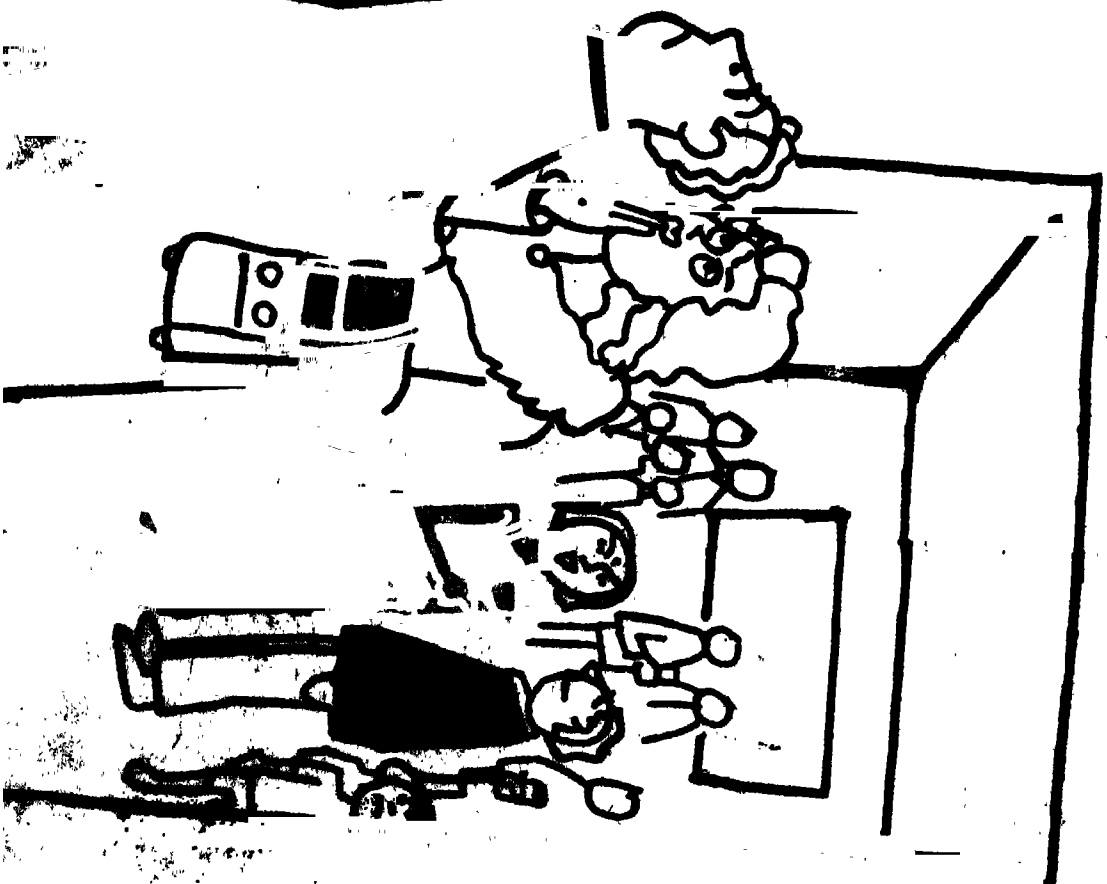
ارے یہ فیلم تو ہم' انڈیا میں دیکھ چکے ہیں۔

میں اس کی نقد قیمت
ادا کروں گا، بتایئے کیا دام ہیں؟

ہندوستانی ساس امریکی بہو
دیکھو بیٹی! لڑکا پیدا ہو تو مجھے ضرور
بتانا ورنہ میری آشیرباد ابھی سے
قبول کر لو۔
امّی! وہ پڑوسن آئی ہیں جن سے
آپ چڑتی ہیں۔
ھارے امریکہ میں شاپنگ کا خوب
ہ ہے۔ ہاتھ کھلے ہیں اور نوکر چاکر
کوئی ضرورت نہیں۔
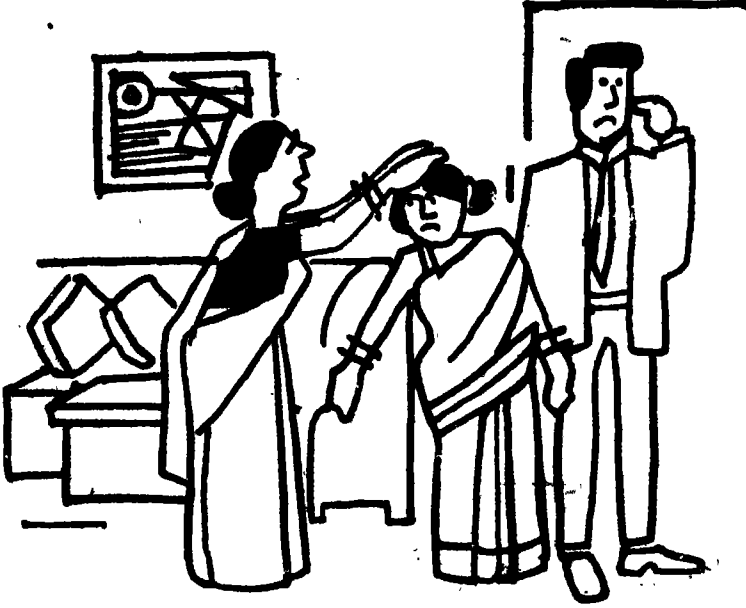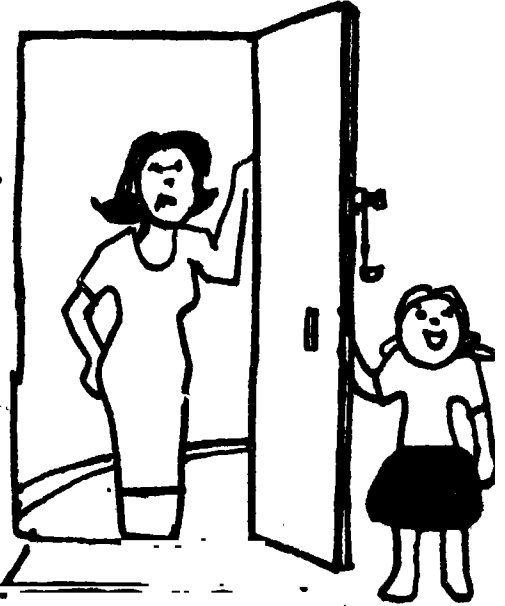
fashion bar
ہندوستانی سگریٹ لائٹر

خبردار !
سوامی جی دھیان گیان میں معروف ہیں۔
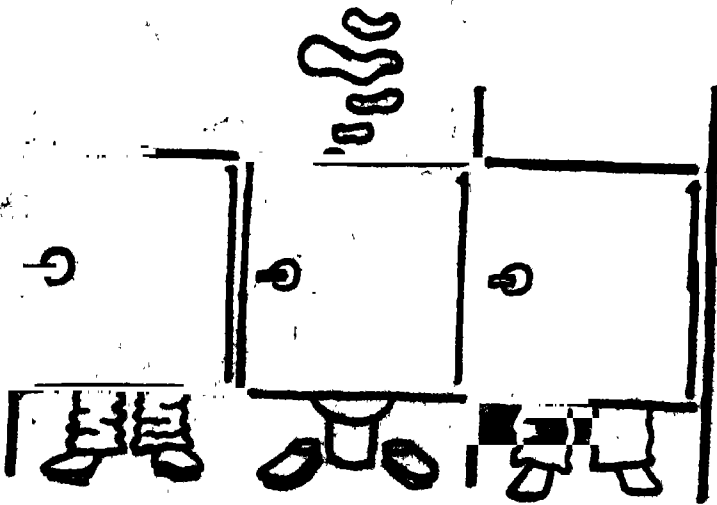
امریکی ٹائیلٹ
ہندوستانی اسٹائل

ہوائی پرواز میں
سیٹ بلٹ کی گڑبڑ
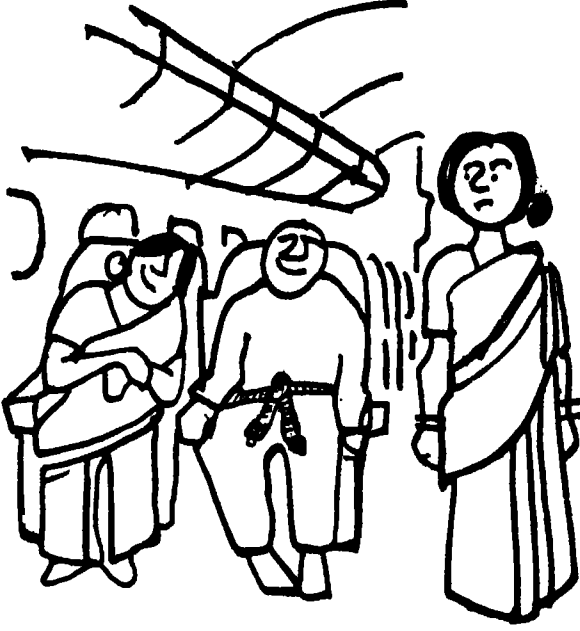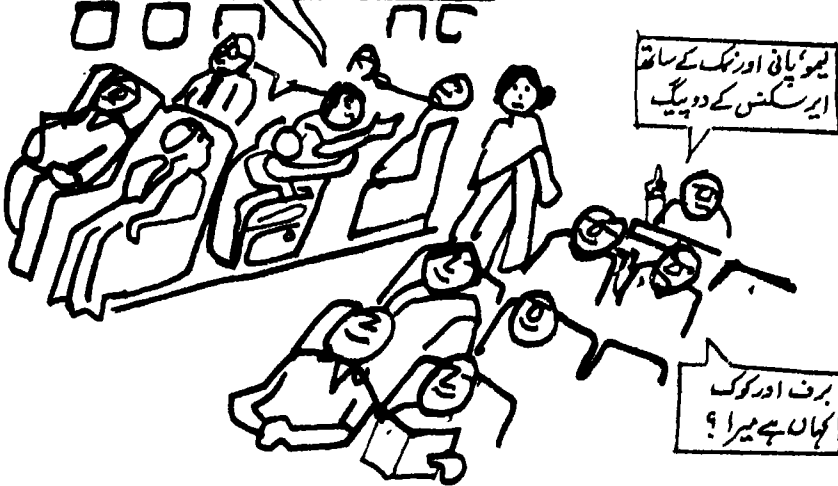
بمبئی، حیدرآباد اور دہلی میں سلور جوبلی کے بعد

بہار اور بنگال میں ریلیز کے لئے تیار

بے جوڑ شادیوں پر ایک طنز

ساگر سرحدی کی فلم

بازار

ستارے: سمیتا پاٹل ○ نصیرالدین شاہ ○ فاروق شیخ ○ سپریہ پھاٹک ○ بھرت کپور ○ بی ایل چوپڑہ ــــ اور دوسرے

میرزا غالب کا خط میرزا مجتبیٰ کے نام

مجتبیٰ حسین

یہ مضمون غالب اکیڈمی نئی دہلی کے
سکریٹری ذہین نقوی کے جشن کے موقع
پر پڑھا گیا جو ۱۵ جنوری ۱۹۸۳ء کو منعقد ہوا تھا

برخوردار کامگار میاں مرزا مجتبیٰ کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے

بدھ کا دن، بارہویں تاریخ جنوری ایک پہر
دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمہارا نامہ لایا
میرا ماتھا ٹھنکا اور بڑی دیر تک ٹھنکتا رہا۔ اوّل
تو میں تمہارے نامہ کو پڑھ کر ہنسا پھر رو دیا کیا۔ تم
سمجھو گے اس ہنسی کا تمہاری مزاح نگاری سے
کوئی ربط باہم ہوگا۔ نہیں بھائی! واللہ باللہ
اس خوش فہمی کو رفع کرلو۔ میں ہنسا اس واسطے کہ
تمہارا نامہ برخوردار سعادت اطوار ذہین نقوی
کے جشن کی خبر لایا۔ یہ امر خوش ہونے کا تھا سو
ہنسا۔ بارے تمہارے نامہ سے منکشف ہوا کہ تم
برخوردار سعادت آثار ذہین نقوی کا خاکہ رقم
کرنے والے ہو تو اس خبر وحشت اثر کو پڑھ کر
اتنا رویا کہ میری حالت کو دیکھ کر مرزا تفتہ بھی
کہ پاس ہی بیٹھے تھے، رونے لگے۔ خود بھی دلگیر
ہوا، اُن کو بھی ناحق رنجور کیا۔ میاں! ہوش
کے ناخن لو۔ ہوش کے ناخن تمہارے پاس نہ ہوں
تو بازار سے لے آؤ۔ میں تو بوقتِ ضرورت دلّی
تک بازار سے لے آیا کرتا تھا۔ کیا تمہیں ہوش
کے ناخن بھی نہیں ملتے۔ ہائے ہائے کیسا زمانہ آگیا
ہے۔ عزیزی منشی کنہیا لال کپور سے خلد آباد میں
اکثر ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اُن کی زبانی تمہارا حال
معلوم ہوا۔ تم خاکہ لکھنے کی آڑ میں لوگوں کی نہ
صرف پگڑیاں بلکہ بہت کچھ اچھالتے ہو دیکھو
بھائی! مجھ کو یہ پسند نہیں۔ ایرے غیروں کے
خاکے لکھو تو مجھ کو نہ پرواہ نہ فکر۔ مگر اب
تمہاری دست درازیاں شرفا کے دامن تک
پہونچنے لگی ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔ ذہین نقوی
میرا نام لیوا ہے۔ مجھ کو دل و جان سے عزیز ہے
میں طرفداری اُس کی بیجا نہیں کرتا۔ کہتا ہوں
سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ وہ میرا ہم مشرب

تو کیا ہم مشروب بھی نہیں ہے مگر بندۂ غالب تو ہے۔ دیکھو کس عقیدت سے میرے نام کی مالا جپتا ہے۔ مجھ میں جو صفات تھیں وہ زنہار اُس میں نہیں۔ مزید ثبوت اس کے شریف ہونے کا تمہیں اور کیا چاہیئے۔

اے بھائی! اس کا خاکہ لکھنے سے پہلے یہ بھی تو سوچو کہ تمہارا اور اُس کا کیا مقابلہ۔ وہ نیک تم بد، وہ پاکباز تم گنہگار، وہ شریف تم اوباش، وہ خوش اطوار تم بداطوار، وہ میرا سخن فہم تم میرے طرفدار۔ وہ سپید تم سیاہ، کیا بتاؤں کہ تم میں اور اُس میں کتنا فرق ہے بستی نظام الدین میں دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو تو عزیزی خواجہ حسن ثانی نظامی کو چھوڑ کر تمہیں ذہین نقوی کا سا شریف آدمی کوئی نہیں ملے گا۔ اگر خواجہ حسن ثانی نظامی ذہین نقوی کا جشن کرتے ہیں تو یہ دو شرفا کا معاملہ ہے۔ تم اس پھڈے میں کیوں ٹانگ اڑاتے ہو۔ میاں اب بھی وقت ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔ اگر یہ نہیں ملتے تو گلزار دہلوی سے کہو۔ وہ کسی اور کے ناخن لاکر دیں گے کیوں کہ ان کے پاس بھی یہ جنس گراں مایہ نہیں ہے۔ بڑے کارساز ہیں۔ (مُراد ناخنوں سے ہے گلزار دہلوی سے نہیں)

اے میاں لڑکے! ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو، میں تم کو سمجھاتا ہوں کہ ذہین نقوی کون ہے تم نے نام امروہہ کا سُنا ہوگا۔ یہ برخوردار وہیں کا رہنے والا ہے۔ کیا کہا امروہہ کو تم صرف آموں کے وسیلے سے جانتے ہو؟ بھائی تم مجبور ہو کیوں کہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ تم دماغ سے نہیں پیٹ سے سوچتے ہو! دکن کے رہنے والے جو ٹھہرے یہ بھی نہ یاد رکھا کہ تمہارا ایک وزیر اعظم امروہہ کا ہو گزرا ہے۔ آم مجھے بہت پسند ہیں مگر میں امروہہ کو صرف بر بنائے آم نہیں جانتا۔ میاں امروہہ بڑا مردم خیز خطہ ہے جس کسی شخص کو زندگی میں آگے چل کر بڑا بننا ہوتا ہے وہ امروہہ میں ہی جا کر پیدا ہوتا ہے۔ ابھی ہفتہ دس دن پہلے تم نے صادقین کا خاکہ اُڑایا تھا۔ یہ بھی امروہہ میں ہی جا کر پیدا ہوئے تھے۔ یاد رکھو امروہہ میں جو بھی پیدا ہوتا ہے وہ بڑا آدمی بنتا ہے بشرطیکہ وہ پیدا ہو کر چپ چاپ امروہہ سے چلا جائے اگر خود سے نہیں جاتا تو امروہہ والے اسے نکال باہر کرتے ہیں کہ نکل یہاں سے اور بن بڑا آدمی۔ صادقین کو بڑا آدمی بننے کے لئے پاکستان جانا پڑا اور ذہین نقوی کو دہلی آنا پڑا۔ بھائی! صادقین بھی مجھ کو بہت عزیز ہے۔ وہ بھی میرا نام لیوا ہے۔ اپنے آپ کو بندۂ غالب کہتا ہے تصویریں اُس نے میرے اشعار کی بنائی ہیں جنھیں دیکھ کر میرے اشعار کا مفہوم کچھ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی تصویریں دیکھ کر مجھ کو بڑا مزہ آتا ہے۔ اوّل تو میرے شعر پیچیدہ اس پر مستزاد اُس کی تصویریں اور بھی پیچیدہ۔ آدمی کو جتنا پریشان کرو آرٹ اتنا ہی ترقی کرتا ہے ؎

تمہارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ

اے بھائی! میں خود ذہین نقوی کے بارے میں تمہیں بتا رہا تھا، یہ شخص مجھ کو یونہی عزیز نہیں ہے۔ خوددار ایسا ہے کہ اپنی انا کو کہیں زیر ہونے نہیں دیتا۔ خودی تو مجھ میں بھی تھی بلکہ میرے شعروں میں تو مجھ سے زیادہ تھی۔ میں نے بھی اپنے اشعار میں خودی کو بلند کیا ہے۔ نور چشمی اقبالؔ نے کہ جس کے نام سے پہلے تم علامہ لگاتے ہو اور جائز لگاتے ہو، بہت بعد میں خودی کا قطب مینار بنایا مگر خودی کا سلسلہ تو مجھ سے بھی رہا ہے مگر دیکھو کہ اس وافر خودی کے باوجود میں نے کیسے کیسے قصیدے لکھے پنشن کے لئے کیسی کیسی

عنایت کیں۔ لوگوں کی کس طور خوشامدیں کیں، یہ راز کی باتیں ہیں۔ مہ جند تم کو لکھتا ہوں۔ اس آباد خرابے میں جینے کے لئے وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو میں نے کیا۔ ذہین نقوی تو یہ بھی نہیں کرتا۔ دیکھو پھر بھی زندہ ہے۔ تم بتاؤ وہ اچھا کہ میں اچھا۔ میاں تم بھی تو یہی کچھ کرتے پھرتے ہو۔ زنہار میں تم کو برا نہیں کہتا۔ اس واسطے کہ یہ حق تم نے مجھ سے سیکھا ہے مگر ذہین نقوی کو میں نے کب منع کیا تھا۔ سنا ہے کہ ذہین نقوی کی بڑے بڑے حکمرانوں سے آشنائی ہے۔ میں ہوتا تو ان کی شان میں قصیدے لکھتا۔ مگر بھائی میرے تمہارے ہاں جس رفتار سے حکمران بدلنے لگے ہیں اس رفتار سے شاید میں قصیدے نہ لکھ پاتا۔ تو سنو، ذہین نقوی نے جن نا مساعد حالات میں اپنی زندگی بنائی ہے اس کی داستان سننے کو تمہارے پاس کلیجہ کب ہے کہ ہو گا۔ میاں یہ مرد خود ساختہ ہے۔ منشی شیو نرائن نے مجھ کو ابھی بتایا کہ انگریزی میں ایسے آدمی کو SELF MADE MAN کہتے ہیں۔ مرد خود ساختہ خدا کی ذات کو کم از کم لکنت دیتا ہے۔ دور کیوں جاتے ہو اپنا ہی معاملہ لو۔ اپنے ہر کام کے لئے تم خدا کی مصروفیات میں خلل انداز ہوتے ہو۔ واللہ ذہین نقوی یہ نہیں کرتا۔ وہ محنت شاقہ کرتا ہے جو تم نہیں کرتے۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں لڑکوں کو تعلیم دی۔ تو منشی شیو نرائن بتاتے ہیں کہ انگریزی میں اس کو TUITION کہتے ہیں۔ اس نے صرف لڑکوں کو ہی نہیں لڑکیوں کو بھی تعلیم حاصل کی۔ خود بھوکے پیٹ رہ کر

لڑکوں کو تعلیم دی۔ اسی واسطے آج اس کے پڑھائے ہوئے لڑکے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ بھوکے پیٹ بھلے ہی بھجن نہ ہو مگر لڑکوں کو تعلیم اچھی دی جا سکتی ہے۔

ذہین نقوی کی خوبی یہ بھی ہے کہ نا مساعد حالات میں بھی وہ اپنی وضعداری کو برقرار رکھتا ہے۔ خوش پوشاک ہے، خوش اخلاق ہے، خوش اطوار ہے، خوش گفتار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بستی نظام الدین میں دس دوستوں کے ہمراہ سڑک پر نکلتا ہے تو بھکاری بھیک مانگنے کے لئے سب سے پہلے اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ دوسروں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ مانا کہ بھکاری مردم شناس ہوتے ہیں مگر تم یہ بھی تو مانو کہ ذہین نقوی بھلے ہی تنگ دست رہتا ہو مگر اس کی وضع قطع تو تونگروں کی سی ہوتی ہے۔ میں یہ بات پتے کی کہتا ہوں۔ اس واسطے کہ میں نے بھی فقیروں کا بھیس بنا کر اہل کرم کا بہت تماشہ دیکھا ہے۔ جو بات بھی کہتا ہوں تجربہ کی کہتا ہوں۔

میرزا مجتبیٰ! میں تم کو سچ کہتا ہوں۔ ہمدرد کے حکیم عبدالحمید صاحب فی الواقعی بڑے بنا من ہیں۔ اب تو رنج کا خوگر ہو گیا ہوں مگر پھر بھی قلق اس بات کا ہوتا ہے کہ جن دنوں میں پابندی سے بیمار رہا کرتا تھا حیف ان دنوں نہ ہمدرد دواخانہ تھا نہ حکیم عبدالحمید صاحب۔ نہ تھا خمیرہ گاؤزبان، نہ شربت روح افزا تھا نہ سنکارا، نہ صافی۔ مجھے طبیب میرا کسے ملتے؟ وارد غم جنت کی طرح ... (آخری سطریں ناخوانا)

لے آیا۔ ایسی میٹھی اور ذائقہ دار دوائیں ہیں کہ ان کے استعمال کی خاطر آدمی سدا بیمار رہنے کی دُعا کرے۔ ہمارے زمانے میں بیمار رہنے کے یہ مزے نہیں تھے۔ مجھ کو "طب محمد حسین خانی" سے ایک نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا ہر مرض کا علاج اسی نسخہ کی مدد سے کرتا تھا اور جوں جوں دوا کرتا جاتا تھا مرض بڑھتا جاتا تھا۔ اگر تم بھی اپنے مرض کو بڑھانا چاہو تو نسخہ لکھے دیتا ہوں۔" پانچ سیر پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں۔ اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب پیاس ہو تو اسے اس کو پیئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں کھایا کریں۔ پانی دن رات جب پیاس لگے یہی پیئیں۔ برس دن میں اس کا نقصان معلوم ہوگا۔"

بھائی قویٰ بہت مضمحل ہو گئے ہیں۔ کہنا کچھ چاہتا ہوں کہہ کچھ اور جاتا ہوں۔ حکیم عبدالحمید صاحب کے نباضی کی بات کرتے کرتے "طب محمد حسین خانی" تک بھٹک گیا۔ بھائی میں تو غالب اکیڈیمی کے حق میں ذہین نقوی کو حکیم عبدالحمید صاحب کا ایک تیر بہدف تصوّر کرتا ہوں اور خود غالب اکیڈیمی کو دلی کی سماجی و ادبی سرگرمیوں کے لئے ایک بہتر بہدف علاج خیال کرتا ہوں۔ حکیم صاحب کے طبیب حاذق ہونے میں کوئی شبہ مجھ کو اس واسطے نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے غالب اکیڈیمی کے لئے جو نسخہ ذہین نقوی کی شکل میں تجویز کیا ہے وہ خود نہ تو شاعر ہے نہ ادیب۔ نہ نقادی کا دعویدار ہے۔ نہ دانشور کہلائے جانے کا طلبگار۔ حکیم صاحب نے یہ اچھا کیا کہ کسی شاعر یا ادیب کو غالب اکیڈیمی کا سکرٹری نہیں بنایا ورنہ خود میری شاعری کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔

برخوردار عتیق صدیقی سے خلد آباد میں ایک بار سرراہے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی شہر میں میرے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا اور اس کا سکریٹری ایک شاعر کو بنایا گیا۔ عرصہ برس دو برس بعد اس شاعر نے اعلان کیا کہ اس کی شاعری میری شاعری سے اچھی ہے۔ میرے ادارہ کی اسٹیشنری پر اس کا کلام بلاغت نظام لکھا جانے لگا اور اس ادارہ میں میری حیثیت ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے والی ہو گئی۔ احسان خدا کا کہ ذہین نقوی شاعر نہیں ہے ورنہ وہ بھی غالب اکیڈیمی میں میری طرح تصوّر جاناں کیے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ ذہین نقوی چوری چھپے بہ زبان انگریزی شعر کہتا ہے۔ مگر مجھے اس کی پرواہ ہے نہ فکر کیوں کہ اس سے میری شاعر... کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ تاہم حفظ ماتقدم کے ط... پر یہاں شیکسپئر، ورڈ سورتھ، شیلی، براؤننگ، لونگ فیل... ٹی ایس ایلیٹ وغیرہم کو ذہین نقوی کی شاعری سے خبردا... کر دیا ہے۔ وہ جانیں اور ان کی شاعری جانے میں الگ... کیا جانوں۔

میرزا مجتبیٰ! ذہین نقوی کو غالب اکیڈیمی کا سکر... بنے تو عرصہ دس برس کا ہو گیا۔ تمہیں بھی حیدرآباد سے د... آئے عرصہ نو برس کا ہو گیا۔ ان نو برسوں میں تم نے د... میں کیا تیر مارا۔ نہ تم دہلی میں رہتے ہو نہ دہلی تم میں... ہے۔ تم دہلی میں رہنے پر اس واسطے مجبور ہو کہ تمہار... پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہے۔ اپنے ہر کام کے لئے ذہی... کے پاس دوڑے دوڑے آتے ہو۔ اپنا جلسہ کر... ہو تو ذہین نقوی، کسی دوست کا جلسہ کروانا ہو تو ذ... کسی ادیب کا پتہ معلوم کرنا ہو تو ذہین نقوی، کبھی کا...

کرنا ہو تو ذہین نقوی، کسی کو وداع کرنا ہو تو ذہین نقوی تعزیتی جلسوں میں بھی یہی ذہین نقوی کام آتا ہے۔ کہاں تک گناؤں، میاں! غالب اکیڈیمی تمہاری بنیادی ضرورت بن گئی ہے تو محض اس واسطے کہ ذہین نقوی منتظم آدمی ہے۔ اس نے عرصہ دس برس میں غالب اکیڈیمی کو دہلی کی ادبی و تہذیبی زندگی کا مرکز بنا دیا ہے یہ لطیفہ بھی تم نے ہی بتایا ہے کہ ایوانِ غالب میں کوئی جلسہ ہو تو لوگ غلط فہمی میں غالب اکیڈیمی چلے آتے ہیں۔ یہ بیٹا تم سے ملتی اور تم نے اس کا لطیفہ بنا دیا۔ حکیم عبدالحمید صاحب سے ملاقات ہو تو بعد سلام میری طرف سے عرض کر دینا کہ ان کی سعیٔ جمیلہ کے باعث میرے مرنے کے بعد میرے حالاتِ زندگی خاصے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ میں فکر مند رہتا تھا کہ بعد مرنے کے یہ سیلاب بلا کس کے گھر جائے گا۔ حکیم صاحب نے اس سیلاب بلا کے لئے غالب اکیڈیمی بنا دی اور ذہین نقوی کو اس کا سکرٹری بنا دیا۔ واللہ باللہ۔

غالب اکیڈیمی کے حسن انتظام کو دیکھ کر طبیعت میں انبساط اور روح کو سرور عطا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یک گونہ بیخودی بھی دن رات میسّر آتی ہے۔ میرے نام سے ایک فعّال ادارہ کام کر رہا ہے اس کی مجھے خوشی کیوں کر نہ ہوگی۔ غالب اکیڈیمی کا شہرہ سن کر خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق پچھلے دنوں میرے پاس آئے تھے۔ مجھ پر چوٹ کرنا چاہتے تھے سو فرمانے لگے "غالب اکیڈیمی پر اتنا نہ اتراؤ۔ میرے پرستاروں نے بھی جہانِ فانی میں میرے نام پر ایک ادارہ قائم کیا ہے نام اس ادارہ کا "حلقہ اربابِ ذوق" بتلاتے تھے۔ تم جناب مالک رام سے مل کر مجھ کو یہ سبیل ڈاک مطلع کرو کہ کیا فی الواقعی یہ ادارہ شیخ محمد ابراہیم ذوق کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس امر میں جناب مالک رام سے ملنے کو اس لئے کہتا ہوں کہ محقق اور ماہر ناچیز ہونے کے باوجود یا ذوق آدمی ہیں۔ وہی یہ بعد تحقیق اس حقیقت کا پتہ چلا سکیں گے کہ ذوق اور "حلقہ اربابِ ذوق" میں کیا رشتہ ہے۔ اس امر کا جواب تم پر لازم ہے کیوں کہ مجھ کو اس امر میں تشویش ہے۔

میاں لڑکے! دیکھو یہ نامہ کتنا طویل ہو گیا ہے۔ میں نے مرزا تفتہ کو بھی اتنا طویل نامہ کبھی نہیں لکھا۔ میرے تھوڑا لکھے کو بھی بہت جانو اور برخوردار سعادت آثار ذہین نقوی کا خاکہ زنہار نہ لکھو۔ اس واسطے کہ وہ مجھ کو دل و جان سے عزیز ہے۔ وہ فرشتہ صفت آدمی ہے یہ بات میں یہاں فرشتوں سے ملنے انھیں دیکھنے اور پرکھنے کے بعد لکھ رہا ہوں۔ ایسے خوش اخلاق، ملنسار، خوش اطوار، سلیقہ مند اور منتظم آدمی کا خاکہ لکھوگے تو اس کے رفیقانِ خاص، ابرار کرتپوری، متین صدیقی، واجد سحری، فاروق اور نہ جانے کن کن کا دل دکھے گا جو غالب اکیڈیمی کے کاموں میں اس کا بے لوث ساتھ دیتے ہیں۔ للہ ان کے حوصلے نہ توڑو۔

میرزا مجتبیٰ۔ نامہ کو ختم کرنے سے پہلے چاہتا ہوں کہ تم ذرا میرے پاس آن بیٹھو، اِدھر آؤ، اپنا کان میرے قریب لے آؤ کہ میں دو ایک باتیں تمہارے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں اور تم سے کچھ سننا بھی چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو مجھ کو یہ بتاؤ کہ برخوردار ذہین نقوی جب تقریر کرتے ہیں تو یہ تقریر اُردو میں کرتے ہیں یا فارسی میں۔ بھائی میرے! میں نے تم جیسے لوگوں کو بعد میں ان کی تقریر کا اردو میں ترجمہ کراتے دیکھا ہے۔ مانا کہ امروہہ کے لوگ اردو بھی فارسی میں بولتے ہیں لیکن زبان ایسی بھی نہ بولو کہ ان پر میرے شعروں کا گمان ہونے لگے اور کسی کی سمجھ میں نہ آوے۔ تم تو واقف ہو کہ میں مراسلہ کو مکالمہ بنا دیتا ہوں۔ برخوردار ذہین نقوی مکالمہ کو مراسلہ بنا دیتے ہیں۔ وہ غالب اکیڈیمی میں آنے والے مہمانوں کے "قدوم میمنت لزوم" کے حوالے سے مہمانوں کی خدمت میں اس قدر "ہدیۂ تبریک" اور

"جذبات تشکر" اور "گلہائے عقیدت" اور "گلہائے تحسین" اور "خراج محبت" وغیرہ وغیرہ پیش کرتے ہیں کہ بعض اصحاب کو گھر جا کر لغات کشوری میں دیکھنا پڑتا ہے کہ برخوردار ذہین نقوی نے ان کی خدمت میں جو ہدیہ پیش کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے۔ جب اس مشکل ہدیہ کے آسان معنی معلوم کر لیتا ہے تو حسب استطاعت مایوس بھی ہوتا ہے۔ اے بھائی! مگر اس میں بھی قصور ذہین نقوی کا نہیں، تمہاری اُردو دانی کا ہے۔ میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ ذہین نقوی اپنی اردو کو تمہاری کم علمی اور جہالت کی سطح تک لے آئے، کیوں کہ مجھے تمہارا فائدہ بھی مقصود ہے۔

دوسری بات مجھ کو یہ بتاؤ کہ غالب اکیڈیمی کے جلسوں میں یہ جو ایک ہی قسم کے ہار بھاری تعداد میں مہمانانِ خصوصی کو پہنائے جاتے ہیں تو ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ غالب اکیڈیمی کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب سعید میں بھی میں نے ہو بہو یہی ہار دیکھے تھے۔ کیا وہی ہار اب تک چل رہے ہیں۔ ایک ہی مہمان کو بعض اوقات کئی کئی ہار پہنائے جاتے ہیں۔ کیا ان ہاروں کی قیمت وہی مہمان ادا کرتا ہے، اگر ادا نہیں کرتا تو بھائی میرے ہر جلسہ کے بعد دو ایک میرے مزار کے لئے بھی بھجوا دیا کرو، کیوں کہ یہ مہمانانِ خصوصی کی گردن سے کہیں زیادہ میرے مزار پر بھلے معلوم ہوں گے۔ برخوردار ذہین نقوی ملیں تو تنہائی میں میری یہ باتیں ان کے گوش گزار کر دو۔ زنہار کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا۔

خط کو یہاں ختم کرتا ہوں۔ خلد آباد میں چین کی بسر ہو رہی ہے۔ گورکھپور سے عزیزی فراق آگئے ہیں اور ملیح آباد سے براستہ کراچی نور چشمی جوش تشریف لا چکے ہیں۔ خوب گزر رہی ہے۔ میرا بھی ہمہ کبھی کبھی تمہاری زمین پر دوبارہ پیدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ بارے کبھی دوبارہ جنم ہوا تو اب کی غالب نہیں بنوں گا، ماہر غالبیات بننا چاہوں گا۔ کیوں کہ اس میں بڑے فائدے ہیں۔ تم اس پر ہنسو گے۔ غالب ہوتے تو ہرگز نہ ہنستے میاں ہنسو اور ہنسو۔ تمہاری قسمت میں ہنسی لکھی ہے اور مجھ کو تم پر ترس آتا ہے۔

اس جشن کا حال تفصیل سے لکھ بھیجو۔ مرزا میر مہدی مجروح اس کا حال جاننے کے لئے مجھ سے زیادہ بے چین ہیں۔

۱۵ر جنوری ۱۹۸۳ء — تم سے نجات کا طالب

غالب

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مضامین
کے مجموعے

تکلف برطرف قیمت ۱۴ روپئے

⊙ بہر حال قیمت ۱۰ روپئے

بالآخر قیمت ۱۴ روپئے ⊙

⊙ آدمی نامہ (خاکے)
قیمت ۱۶ روپئے

بتوسط شگوفہ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

میرے پاس ایک میز ہے

میرے گھر میں ایک میز ہے، بے حد بھونڈی اور بے ڈول لیکن وہ چونکہ میری بیوی کو جہیز میں ملی تھی، اس لیے میں اس میز کو اٹھا کر باہر نہیں پھینک سکتا۔ البتہ خواب میں اسے اٹھا کر کئی بار خلیج بنگالہ میں ڈبو آیا ہوں۔ لیکن نجانے کیسے ؟ وہ خلیج بنگالہ سے پھر گھر لوٹ آتی ہے اور میرے کمرے کو چاند گرہن لگا دیتی ہے۔

میری بیوی اکثر کہا کرتی ہے "جب میں اس میز کو دیکھتی ہوں۔ مجھے میری ماں یاد آجاتی ہے"

اور میں آنسوؤں کی پوری خلیج بنگال پی کر عرض کرتا ہوں "مجھے تو تم میں اور اس میز میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ تمہارے میکے میں صرف دو ہی چیزیں معیاری تھیں ایک تم اور ایک یہ میز !"

دراصل جب میں پیدا ہوا تھا تو نہ یہ میز پیدا ہوئی تھی نہ میری بیوی۔ ہر شئے میرے پیدا ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتی چلی گئی مثلاً، میرے پیدا ہونے سے پہلے نیوٹن پیدا نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر نعمت رائے آئی اسپیشلسٹ پیدا نہیں ہوا تھا بناسپتی گھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ راشن ڈپو پیدا نہیں ہوا تھا ـــــ یہ سبھی چیزیں میرے بعد پیدا ہوئیں جبکہ یوں کہنا بہتر رہے گا کہ اگر میں پیدا نہ ہوتا تو ان چیزوں کو پیدا ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ صرف میرا امتحان لینے کے لیے ہی

پیدا ہوئیں۔

مگر میرے پیدا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے مطلع کیا کہ تمہیں بطور گلشن پرست پیدا کیا گیا ہے اور تمہیں ان چیزوں سے نباہ کرنا ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے مجھے اطلاع نہیں دی گئی ورنہ میں یہ ضرور سوچتا کہ پیدا ہونا تضیع اوقات ہے۔

اگر آپ کو یہ اطلاع دی جائے کہ ڈاکٹر نعمت رائے ایک بہترین آئی سپیشلسٹ اور بدترین سنکی ہے تو آپ کیا کریں گے ؟ یا اندھا ہوجانے کو غنیمت سمجھیں گے یا ڈاکٹر کا سنکی پن برداشت کریں گے۔ اندھا ہوجانا حماقت ہے۔ اگرچہ سنکی پن برداشت کرنا بھی کوئی خاص دانائی نہیں ہے لیکن دیکھا ہے کہ کئی دانا، احمقوں سے زیادہ احمق ہوتے ہیں۔

چنانچہ جب بھی میں ڈاکٹر نعمت رائے کے کلنک میں قدم دھرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے مقتل کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اپنی اُن تمام بے گناہیوں کو یاد کرتا ہوں جن کی پاداش میں ڈاکٹر مجھے قتل کرے گا۔ میں دل میں بے بس دھڑکنوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اتنے میں ڈاکٹر کی تنک اور خار زار خشم کی آواز اُبھرتی ہے :

"منہ میں زبان نہیں ہے کیا ؟ گونگے تھے تو یہاں کیا کرنے آئے ؟"

آپ نے فرمایا تھا "کل آنا !"

"تو کیا میں یہ کہتا کہ پرسوں آنا ؟ عجیب خود غرض ہیں یہ ہندوستانی۔ ہینکڑی کو اپنی تہذیب سمجھتے ہیں۔ جب میرا کلنک لاہور میں تھا تو جانتے ہو ایک دن کیا ہوا ؟ ایک وزیر صاحب چق اُٹھائے، اندر آ گئے۔ میں نے پوچھا، کون ہو ؟ بولا وزیر صحت ہوں۔ میں نے ڈانٹ پلائی، باہر عوام کے ساتھ برآمدے میں بیٹھو، ریسپشنسٹ سے چٹ لے آؤ ـــــ تو وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ میں نے کہا ہاتھ جوڑنا مکاری ہے، یہ عوام کے ساتھ چل سکتی ہے، ڈاکٹر نعمت رائے کے کلنک میں نہیں۔

میں نے کہا "واہ وا ... ڈاکٹر صاحب ! ونڈرفل !!" میں نے یہ تعریفی فقرہ بھی بڑی احتیاط سے کہا اور میں بھی مجھے اس سے زیادہ بے ضرر فقرہ نہیں سوجھا۔ میں نے جتنے بے ضرر فقرے اپنے منہ سے نکالے ہیں ڈاکٹر نعمت رائے کے سامنے ہی نکالے ہیں مگر وہ ہر لفظ کو ڈکشنری کے نہیں اپنے معنی پہنا دیتا ہے۔ میں نے ہر بے ضرر لفظ کو اگر ضرر رساں بنتے دیکھا ہے تو ڈاکٹر نعمت رائے کے ہاں ـــــــ

چنانچہ میرے ونڈرفل کہنے پر وہ بھڑک اُٹھا "ارے ! تم میری جھوٹی تعریف کرتے ہو ؟ کیا میری جھوٹی تعریف سے تمہاری آنکھوں کے ککرے ٹھیک ہوجائیں گے ؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں آنکھوں کا علاج بے ایمانی سے کرتا ہوں۔ بولو، بے ایمان سمجھتے ہو مجھے ؟!"

اور میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں آہ ! میں ڈاکٹر کے سامنے نہ جھوٹ کہہ سکتا ہوں نہ سچ ؟ میں اُسے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وزیر والا قصہ آپ مجھے اس سے پہلے اُنتالیس بار سُنا چکے ہیں اور کہ یہ قصہ کبھی کبھی کسی اور کو بھی سُنا دیا کیجئے تاکہ وہ بھی اس سے فیض اٹھا سکیں۔

ہاں، میں یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا۔ نہ جھوٹی تعریف نہ سچی تلخ بیانی۔ میں تو اُسے اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ مجھے غالب کا جو شعر سنا دیتے ہیں، وہ آدھا غالب کا اور آدھا ذوق کا ہوتا ہے جبکہ کئی بار تو نہ وہ غالب کا ہوتا ہے نہ ذوق کا۔ بلکہ شعر آپ کا ہوتا ہے صرف تخلص غالب کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب غالب کے پورے دیوان کو مسخ کر چکے

ہیں ۔ کئی مرتبہ میرا جی چاہا ، کم ازکم غالب کی عظمت کو ہی برقرار رکھوں اور ان سے اپنی آنکھوں کا علاج ترک کردوں ۔ لیکن ڈاکٹر کے کلنک کے باہر بڑے جلی حروف میں لکھا ہوا ہے " بابا ! آنکھیں بڑی نعمت ہیں ۔"

جیسے میری بیوی جلی لہجہ میں اکثر کہتی ہے " یہ میز میرے میکے سے آئی ہے ۔"

اور مجھے یوں لگتا ہے " ڈاکٹر نعمت رائے میرے لیے ایک میز ہے ۔"

مگر گلشن پرست کے پاؤں میں صرف میری بیوی کی میز اور ڈاکٹر نعمت رائے کے ہی کانٹے نہیں ہیں بلکہ ہر پوائنٹ پر کلنٹے اُگے ہوئے ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں ، چنانچہ ایک صاحب ہیں ماسٹر دینا ناتھ ـــــــ اُسے کسی نے بتا دیا کہ میں پیدا ہوچکا ہوں چنانچہ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے گھر آ پہنچے اور میری دائیں کلائی ایک زبردست محبت سے دبوچ کر بولے " فکر صاحب ! میں آپ کا بڑا مداح ہوں اور پھر میں شاعر بھی ہوں ۔"

میں نے پیٹھ پر بائیں ہاتھ سے دھپکی دیتے ہوئے کہا (کیونکہ دایاں ہاتھ تو اُن کی زبردست محبت کی گرفت میں تھا) " ویری گڈ ، انسان کو شاعر تو ہونا ہی چاہیئے ۔"

یہ سُن کر فرطِ مسرت میں انھوں نے میری کلائی پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلی ۔ بولے " تو پہلے میری غزل سنئے ۔"

میں نے کہا " پہلے میری کلائی چھوڑیئے ۔"

مگر اُس نے کلائی نہیں چھوڑی اور غزل سنانے لگا ۔ شاید اُسے یہ شبہ تھا کہ اگر اُس نے کلائی چھوڑ دی تو یہ غزل سننے سے انکار کردے گا ۔ یا یہ بھی حادثہ ہوسکتا کہ وہ کلائی چھوڑ دیتا تو شعر سنانے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتا ۔

تیسرا شعر سُناتے ہی وہ کچھ زیادہ جوش میں آگیا (کیونکہ میں نے بے وقوفی میں دوسرے شعر پہ داد دے دی تھی) اور میری کلائی پر گرفت کچھ اتنی تیز کردی کہ کلائی کڑکڑانے لگی ۔ جیسے منحوس کلائی بھی کڑکڑا کر داد دے رہی ہو ۔ چنانچہ میں نے چیخ کر کہا " واہ ! "

تو اُس کم بخت نے میری دوسری کلائی بھی قبضہ میں لے لی ۔ دوسری کلائی بولی " آہ ! آہ ! "

میں نے دل ہی دل میں کلائی نمبر دو سے کہا " اور لگاؤ مصرع طرح پر گرہ ! "

غرض تھوڑی دیر تک تو میری ایک کلائی آہ آہ اور دوسری واہ واہ کرتی رہی لیکن جب میری کلائیاں تھک ہار کر بالکل گونگی ہوگئیں تو میں نے تنگ آکر کہا " دینا ناتھ جی ! آپ کی غزل میں جذبات سے کمال کا پرہیز کیا گیا ہے ۔"

یہ فقرہ میں نے غزل ختم ہونے پر کہا ۔ وہ سمجھا کہ نہیں ۔ اللہ مجھ سے بہتر جانتا ہے کیونکہ عالم الغیب صرف وہی ہے ۔ ہم تم میں سے کوئی نہیں ـــــــ بہرکیف کلائیاں رہا ہوگئیں کیونکہ وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ دوسری غزل کل آکر سُناؤں گا ۔

اور دوسرے دن مجھے کسی نے بتایا کہ وہ بطور اعصابی مریض ایک ہل اسٹیشن کے ہسپتال میں داخل کردیا گیا ہے ۔

چند ہفتہ بعد ہل اسٹیشن سے اُس کا ایک خط ملا جس میں تحریر تھا

" جب سے آپ کے ساتھ ملاقات ناممکن ہوگئی ہے کسی کو شعر سنانے میں لطف ہی نہیں آتا ۔ یہاں سب کور ذوق بھرے ہوئے ہیں ۔ آپ کبھی ہل اسٹیشن تشریف لایئے نا ؟ "

میں نے جواب میں لکھا :

" دینا ناتھ جی ! میرا خیال ہے ، خدا جتنے شاعر پیدا کرتا ہے سخن فہم ان سے زیادہ پیدا کرتا ہے ۔ آپ وہاں اپنے ہسپتال کے ڈاکٹر کو آزمائیے ، وہ ضرور سخن فہم نکل آئے گا ــــ اور باقی حالات یہ ہیں کہ میں یہاں ایک ڈاکٹر سے اپنی کلائی کا علاج کروا رہا ہوں ۔ جونہی کلائی صحت یاب ہوگئی ، حاضر ہو جاؤں گا ۔"

صبح جب میں گھر سے نکلتا ہوں ۔ تو پڑوسی کا کتا بھونکنے لگتا ہے میرا پڑوسی ان پڑھ ہے (مال و زر بہت ہے) اُس کا کتا اس سے بھی زیادہ ان پڑھ ہے ۔ ایک بار میں نے اُس کتے سے کہا کہ دیکھو دوست ! ان پڑھ ہونے کے باوجود تم شرافت سے پیش آسکتے ہو ۔

تو میرا پڑوسی طیش میں آگیا ۔ بولا " میرے کتے کو کیوں گمراہ کر رہے ہو ۔ کیا اُسے یتیم سمجھ رکھا ہے ۔ ! "

اُس کے بعد میں نے کتے کو سمجھانا بند کر دیا ۔ مگر اس نے بھونکنا بند نہیں کیا ۔ اگرچہ مجھے اب بھی یقین ہے کہ کتے کو سمجھا بجھا کر مہذب بنایا جاسکتا ہے (کیونکہ وہ انسان نہیں ہے) لیکن میرے پڑوسی کو کتے کا گمراہ ہونا پسند نہیں اور میں پڑوسی سے بگاڑنا نہیں چاہتا اس لیے کتے سے میرا بگاڑ برابر چل رہا ہے چنانچہ جب کتا مجھ پر بھونکتا ہے تو میں بڑے اطمینان سے یوں گزر جاتا ہوں جیسے کتا مجھ پر نہیں ، کسی اور پر بھونک رہا ہے ۔

کتے سے " بخیریت " گزر کر میں سڑک پر آجاتا ہوں تو بوٹ کا کیل چبھنے لگتا ہے ۔ یہ بوٹ میں نے دو مہینے پہلے خریدا تھا ۔ تو اُس کے کیل چبھنے لگے ۔ میں نے دکاندار سے شکایت کی تو وہ بولا " کیا آپ یہ بوٹ ادھار لے گئے تھے ؟ "

" جی ہاں ! "

" انشاء اللہ ، اُدھار چکانے کے بعد بالکل نہیں چبھیں گے ۔ "

میں نے اُسے سمجھایا کہ کیل کا اُدھار سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہے مگر یہ نازک نکتہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ۔ مگر اُس سے پہلے کہ وہ بازار کے تمام دکانداروں کو اکٹھا کر کے مجھے اپنے فقرے کا " اصلی مطلب " سمجھا دیتا ۔ میں نے دام چکا دیئے دام چکانے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کیل اگرچہ چبھتے رہے مگر چبھنے کا احساس مر گیا ۔ ہر چبھن احساس سے پیدا ہوتی ہے ۔ احساس مر جائے تو چبھن بھی مر جاتی ہے ۔

چبھن کو ساتھ لیے ہوئے میں گھر سے آگے بڑھ آتا ہوں تو ریٹائرڈ ہیڈ کلرک جناب چمپت رائے جی مل جاتے ہیں ، ان کے پاس اب کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے اس لیے وہ لفظوں کے ماخذ کی کھوج میں لگا رہتا ہے ۔ ریٹائرڈ زندگی کے خلا کو وہ الفاظ کے ماخذوں سے پُر کرتا رہتا ہے ۔ اور سوائے اپنے ماخذ کے ہر شئے کا ماخذ پوچھتا رہتا ہے حتیٰ کہ ایک بار مجھے ایک جنازے میں شرکت کا موقع ملا تھا تو چمپت رائے جی کے راستے میں میرا کندھا پکڑ کر پوچھا " کیوں جی ! یہ لفظ جنازے کا ماخذ کیا ہے ؟ "

اور میں ؟ ، اُسے اتنا بھی نہیں کہہ سکتا چمپت رائے جی ! جنازے کا ماخذ سوائے آپ کے اور کون ہو سکتا ہے ؟

مگر اس مرتبہ ملے تو اُلٹا میں نے پوچھ لیا ۔ " جناب ! اس لفظ میز کا ماخذ کیا ہے ؟ "

وہ سنجیدہ ہو گئے ، بولے : ارے ہاں بھائی ! یہ تو بڑا سیریس مسئلہ ہے ، اس کا ماخذ تلاش کرنا چاہیئے ،

میز کا ماخذ! میز کا ماخذ! میز کا ماخذ!!"
میں نے پوچھا "کیا آپ کی بیوی جہیز میں کوئی میز لائی تھی"
"ہاں، لائی تھی"
"تو میز کا ماخذ آپ کی بیوی ہے"

آیا ہے نیا سال

برق آشیانوی

پھر جھومتا گاتا ہوا آیا ہے نیا سال
پھر دھوم مچاتا ہوا آیا ہے نیا سال

جھگڑا تو پرانا ہے مگر رنگ نیا ہے
آپس میں لڑاتا ہوا آیا ہے نیا سال

لاٹھی کہیں چلتی کہیں گولی ہے برستی
پھر خون بہاتا ہوا آیا ہے نیا سال

ہڑتالوں کا، جلسوں کا، جلوسوں کا ہے موسم
جنتا کو نچاتا ہوا آیا ہے نیا سال

"کی ہم نے ترقی ہے۔ ابھی اور کریں گے"
یہ نعرہ لگاتا ہوا آیا ہے نیا سال

بھوکا تھا برس بھر کا سمجھ کر اُسے روٹی
سورج کو چباتا ہوا آیا ہے نیا سال

فاقہ کشو' افلاس و گرانی ہو مبارک
یہ راگنی گاتا ہوا آیا ہے نیا سال

اب خیر مناتے ہیں نشیمن میں عنا دل
پھر برق گراتا ہوا آیا ہے نیا سال

○

رؤف رحیم

"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"
ہم سے خوش فہموں کو یارو یہ خیال اچھا ہے

نہ حرام اچھا ہے یارو نہ حلال اچھا ہے
کھا کے جو پچ جائے جو ہم کو وہی مال اچھا ہے

ہجر اچھا ہے نہ بیگم کا وصال اچھا ہے
جس میں لڑنا نہ پڑے ان سے وہ حال اچھا ہے

جھڑکیاں سُن کے اُدھر ہم کو اِدھر ڈانٹتے ہیں
اپنی گھر والی کا غصے پہ وبال اچھا ہے

ساتھ بیگم کے ملا کرتے ہیں دس بیس ہزار
مفت کے مالوں میں سسرال کا مال اچھا ہے

دن گزرتے ہیں کسی رشک و رقابت کے بغیر
سب حسینوں سے یہ محروم جمال اچھا ہے

نرس کو دیکھ کے آجاتی ہے مُنہ پر رونق
"وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

دام غلّے کے بڑھے جاتے ہیں سب سے اونچے
اچھے لیڈر ہو' غریبوں کا خیال اچھا ہے

تمکنت چال میں چہرہ پہ متانت آئی
حسن اُس شوخ کا مائل بہ زوال اچھا ہے

آنکھ کھلتے ہی نظر آیا ہے ان کا مکھڑا
خوب گزریں گے یہ دن رات کہ فال اچھا ہے

صرف نعروں سے غریبی تو نہیں ہٹ سکتی
ملک سے سارے غریبوں کو نکال اچھا ہے

شعر استاداں کا کر دیتے ہیں رتیا پانچہ
اے رحیم آپ کے فن میں یہ کمال اچھا ہے

نئے سال کی آمد پر

یوسف ناظم

ہر نیا سال اپنے وقت کا پابند ہوتا ہے اور اس مہمان
کی طرح ہوتا ہے جو بالکل ٹھیک وقت پر مقررہ دنوں
کے لئے آتا اور چلا جاتا ہے۔ اس کے آنے اور جانے
کو نظام شمسی بھی نہیں روک سکتا کیوں کہ جتنے بھی
نظام ہیں سب کے سب منجمد ہیں۔ ہم نے حساب کیا
تو معلوم ہوا کہ ۱۹۸۳ء اس صدی کے آخری اٹھارہ
سالوں کا افتتاحی سال ہے یعنی اس بات کی
گنجائش اب باقی نہیں رہی ہے کہ جو بچہ اب پیدا ہوگا
وہ اس صدی میں قانونی طور پر بالغ ہوگا اور لے
سرٹیفکیٹ کے فارم دیکھ سکے گا۔ یہ شوق اسے اب
اکیسویں صدی میں پورا کرنا ہوگا۔ لیکن اس میں
متاسف ہونے یا ماتم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں
ہے کہ دنیا میں ایسی بہت سی جگہیں ہیں جہاں
جانے کے لئے آدمی کا بالغ ہونا ضروری
نہیں اور اتفاق سے وہاں سب کچھ موجود ہوتا ہے
جو اسے فلموں میں بھی نہیں ہوتا ——— نئے سال
کے لئے ہم نے اب تک کوئی منصوبہ نہیں بنایا ہے
اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم پچھلے کئی سالوں
سے منصوبے بناتے رہے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں
کر پائے۔ تاہم ہم نے اب تک جتنے بھی منصوبے بنائے
ان کا تعلق لاٹری کے ٹکٹ سے تھا۔ ہم مسلسل کئی
سال سے یہ ٹکٹ خرید رہے ہیں (ایک مقصد یہ بھی
ہے کہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں) اور
ساتھ ہی ساتھ وہ اخبار بھی جس میں لاٹری کا نتیجہ
اور ہمارا حشر چھپتا ہے۔ اس میں اب تک کوئی
فرق نہیں آیا۔ جو نتیجہ برسوں سے چلا آرہا ہے
دیکھے کا ویسا ہی برقرار ہے۔ اس سلسلے میں
ہمارے کتنے پیسے خرچ ہوئے

اس کا حساب ہم نے نہیں رکھا کیوں کہ یہ رقم ہمارے نقصان کی نشاندہی نہیں کر سکتی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اب تک ہمارا لاکھوں کا نقصان ہو چکا ہے۔ پچھلے ہی مہینے ہمیں ۵ لاکھ کا گھاٹا ہوا کیوں کہ جس لاٹری کا ٹکٹ ہم نے خریدا تھا وہ پورے پانچ لاکھ کی تھی۔ (ٹکٹ پر چھپا تو یہی تھا) اور یہ ۶ چند سوں کی رقم اب تک ہماری نظروں کے سامنے گھوم رہی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے ع

یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر ہے شاید

ہاں یہ آپ نے ٹھیک پوچھا کہ ہمیں ہنر کیا آتا ہے۔ جانے دیجئے ہم یہ مصرعہ جو ہمارا ہے بھی نہیں واپس لیتے ہیں اور دوسرا مصرعہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ع

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

یہ مصرعہ یقیناً ہمارے حسبِ حال ہے اور اس سلسلے میں ہماری کسی صلاحیت کو زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔

ہم عملاً بے حس آدمی ہیں اس لئے ہم نے کبھی بھی کسی سال کے جانے پر اور کسی سال کے آنے پر نہ تو اظہارِ غم کیا نہ اظہارِ مسرّت کیوں کہ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ نئے سال کا استقبال کرنے کے لئے رات کے ۱۲ بجے تک جاگتے اور مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں نئے سال کے پہلے دن ہی بہت دیر تک سوتے رہتے ہیں اور ان میں بہتوں کی طبیعت کئی دن تک خراب رہتی ہے۔ لیکن اس نئے سال کے آنے پر ہمیں واقعی خوشی ہے اور وہ اس لئے کہ ہم نئے سال میں ایک نئے دل کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں اور یہ مصنوعی دل ہے۔ خالص پلاسٹک کا بنا ہوا۔ (پلاسٹک کا نہیں ہوگا تو ربر کا ہوگا لیکن ہے مصنوعی ہی) دل کی تبدیلی کے بارے میں ہم نے کئی مضامین اور مقالے پڑھے ہیں اور کئی تقاریر اور بیسیوں نظمیں سُنی ہیں اور ہم اب تک یہی سمجھتے رہے تھے کہ ہمیں اس بات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ ہم اپنے خیالات تبدیل کریں کیوں کہ یہ دل میں پیدا کرتے ہیں لیکن اب ہمیں معلوم ہوا کہ مقصد یہ تھا کہ اصل میں اس دل کو عملاً بدلا جائے جو ہمیں ہمیشہ حیران و پریشان رکھا کرتا ہے۔

یہاں ذرا ٹھہر جایئے اور اس مصنوعی دل کی تفصیل جاننے سے پہلے انسان کے اعضائے جسمانی کے تعلق سے چند باتیں سُن لیجئے۔ یہ بھی کچھ کم ضروری نہیں ہیں۔

انسان کے اعضائے جسمانی میں سے کس عضو کو سب پر فوقیت حاصل ہے اس معاملے میں دانشوروں اور سائنس دانوں میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور جہاں تک شاعروں کا تعلق ہے وہ تو کبھی کسی بات پر متفق نہیں ہوئے ہیں۔ ایک شاعر نے اعضائے جسمانی میں سب سے زیادہ اہمیت کلیجے کو دی ہے اور کہا ہے

کا غذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

شاعر نے یہ کام اُس وقت کیا جب وہ اپنے محبوب کو خط لکھ رہا تھا (یہاں لفظ 'اپنے' پر خاص توجہ کی جائے کیوں کہ کچھ شاعر دوسروں کے مراکزِ محبت کو بھی خط لکھتے پائے گئے ہیں)

اکثر و بیشتر شاعر جن کا کلام ہماری نظر سے گزرا ہے دل کے بارے میں بہت زیادہ حساس رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی بھی خواہ وہ کسی درجے کا کیوں نہ ہو راستہ چلتے وقت نیچے دیکھ کر نہیں چلا کرتا وہ اپنا دل اُس کے قدموں تلے رکھ دیتے ہیں۔ وہ شعر ہمیں اب تک یاد ہے جس میں شاعر نے کہا ہے

اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

دانشوروں نے بھی آدمی کے اس عضو کو بہت مانا ہے اور ہمیشہ دوسروں کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔

اور ایک بڑے شاعر نے بھی اپنے مخصوص انداز میں نقشِ قدم کی اہمیت کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے

خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اسی طرح آدمی کے ہاتھوں کو بھی بہت اہم مانا گیا ہے اور خاص طور پر سیدھے ہاتھ کو تو بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا گیا ہے۔ 'دستِ راست' اسی لئے مشہور ہے۔ ہر صاحبِ اقتدار کا ایک دستِ راست ضرور ہوتا ہے اور یہی دستِ راست اُس شخص کی طرف سے سارے کام کرتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے کئے ہوئے سب کام اُلٹے ہوتے ہیں جنہیں عوام بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ پاؤں کے معاملے میں دائیں اور بائیں پاؤں میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ فٹ بال کے میدان کی بات اور ہے ورنہ زندگی کے سفر میں دونوں پاؤں پر مساوی بار ڈالنا پڑتا ہے اور اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کے لئے بھی دونوں پاؤں استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ انگریزوں کے ہاں پاؤں کی اہمیت ذرا زیادہ ہی ہے۔ اُن کے ہاں محفلوں میں، مباحثوں میں اور مناظروں میں لوگوں کے پاؤں (جنہیں ٹانگیں بھی کہا جاتا ہے) بہت کھینچے جاتے ہیں۔ پاؤں میں پائے راست اور پائے چپ کا فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر بھی ان میں تفریق نہیں کرتے اور اگر کسی مریض کے سیدھے پاؤں کا آپریشن [illegible] ہوتا ہے تو وہ بائیں پاؤں کا آپریشن کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے ـــ

نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔

آنکھ کے تعلق سے بھی ہم نے کچھ اشعار پڑھے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ آنکھ کو اعضائے جسمانی میں سب پر فوقیت حاصل ہے کیوں کہ

مُبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

لیکن اکثریت کی رائے دل کے حق میں رہی ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی موقعہ آیا ہم نے کسی کو شیر دل کا لقب دیا یا دریا دل کا۔ کسی کو دلدار کہا تو کسی کو دلبر۔ بعض کو دلنواز بھی کہا۔ لیکن دل سے متعلق کہی ہوئی ساری باتیں اب غلط ثابت ہو رہی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح چاند کا راز کھلنے پر مجبوباؤں اور گل عذاروں نے ماہ جبین کہلانے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آدمی نے جب تک چاند پر قدم نہیں رکھا تھا دُنیا کے سارے حسین 'ماہ رو، ماہ جبین بلکہ بنت مہتاب' کہلانے کے شوقین تھے اور ایک چاند رات کی شب کو تو بحث چھڑ گئی تھی کہ یہ چاند ہے یا کچھ اور ہے۔

کچھ نے کہا چاند ہے یہ اور کچھ نے کہا چہرہ تیرا

اب دل کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔ کئی مہینے پہلے کا وہ واقعہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا جب ہمارے پچھلے آقاؤں کے دارالسلطنت لندن میں کسی شخص کے اصلی دل نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اُسے کافی ہلایا پھسلایا گیا لیکن اس [illegible] فرق نہیں آیا ڈاکٹروں کو مجبوراً اُس شخص

کے سینے میں ایک اور دل نصب کرنا پڑا۔ ڈاکٹر چاہتے تو اُس آدمی کے اصلی دل کو باہر نکال پھینکتے اور نیا دل اُس کے سینے میں فٹ کر دیتے لیکن صرف اس خیال سے کہ شاید پُرانے دل میں کبھی کوئی جذبۂ رحم پیدا ہو اور وہ پھر سے کام کرنا شروع کر دے ڈاکٹروں نے ایک اضافہ دل کی گنجائش نکال لی۔ اور اب اس دسمبر کی پہلی تاریخ کو تو کمال ہو گیا۔ ایک دندان ساز کے سینے میں مصنوعی دل فٹ کر دیا گیا ہے۔ اس پر بھی ہمیں تعجب نہیں ہوا کیوں کہ تعجب کرنا تو ہم نے برسوں پہلے ترک کر دیا۔ تعجب البتہ اس بات پر ضرور ہوا کہ جب یہ شخص ہوش وحواس میں آنے کے بعد اپنی بیوی سے ملا تو اُس نے پہلی بات جو کہی یہ تھی کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ ڈاکٹروں کا جو کمال ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی لیکن مریض کے اس ایک مختصر سے جملے سے پوری اور غیر معمولی طویل انسانی تاریخ متاثر ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پلاسٹک کے دل سے بھی محبت کیجا سکتی ہے یا اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبت اصل میں دل سے نہیں دماغ سے کی جاتی ہے جسے ہم اب تک فراموش کئے بیٹھے تھے۔

اس لئے ہم یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ صرف ہم ہی نہیں، دنیا کے سارے لوگ خواہ وہ کالے ہوں یا گورے ریڈ انڈین ہوں یا صرف انڈین، نئے سال میں نئے دل و دماغ کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔ دل تو بدل ہی گیا اور دماغ کی اہمیت بھی ظاہر ہو گئی ہے۔ عاشقوں کو بھی خوش ہونا چاہیئے کہ اب اُن کی بات اُن کے محبوب کی سمجھ میں آسانی سے آسکے گی۔ وہ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہم اس شاعر کو بھی مبارکباد دیتے ہیں جس نے آج سے سو سال پہلے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ آگے چل کر سارے اعضائے جسمانی کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں مل جایا کریں گے اور کیا تھا۔ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور۔

★★

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کے مجموعے

البتہ

قیمت: (۱۰ روپے)

فقط

قیمت (۸ روپے)

بتوسط۔ شگوفہ

نریندر لوتھر
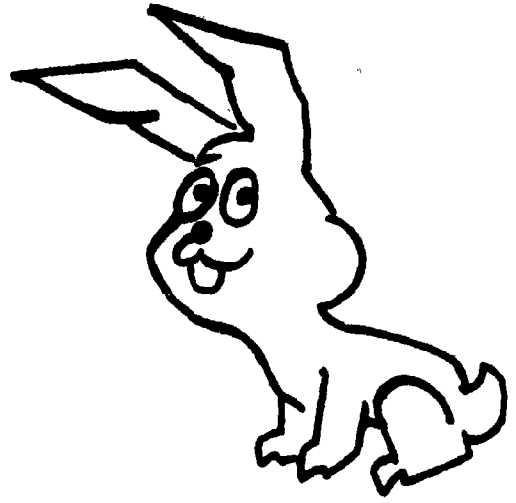
بڑا آدمی

ے بار ایک جرنلسٹ کسی گاؤں پر مضمون لکھ رہا تھا۔ اُس نے وہاں کے ایک بزرگ سے پوچھا "کیوں میاں
گاؤں میں کبھی کوئی بڑا آدمی بھی پیدا ہوا ہے؟" اُس نے جواب دیا "جی نہیں اس گاؤں میں ہمیشہ بچے ہی پیدا
تے آئے ہیں"

یہی ہماری زندگی کا المیہ ہے، پیدا تو چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں پھر بھی کئی لوگ بڑے بن جاتے ہیں
، حرکتوں کو روکا نہیں جاسکتا۔

سماج کو بڑے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عام آدمی ان سے اپنا موازنہ کر کے اپنے اندر احساس
ا پیدا کرسکے۔ اگر بڑے آدمی نہ ہوتے تو ایسا احساس پیدا نہ ہوتا اس سے ان گنت ماہروں کو روزی نہ ملتی
ثابت ہوا کہ روزگار کے لیے بڑے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔

بڑا آدمی زندگی کے ہر شعبہ میں پایا جاتا ہے، ہر کام میں، ہر پیشے میں، ہر گوشے میں بڑا آدمی مل جاتا
. بڑے آدمی کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے۔ جس کا استعمال وہ دوسروں کے لیے یا اُن کے خلاف کرسکتا ہے
ادمی انسانیت کو گروہوں میں بانٹتا ہے۔ اُس کے پیروکار اور اُس کے مخالف۔ اگر بڑے آدمی نہ ہوتے
سانیت کے ٹکڑے نہ ہوتے۔ ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر شعبے میں جب بھی کوئی بڑا آدمی اُٹھتا ہے
اج، ملک، انسانی برادری اور قومیں بٹ جاتی ہیں۔ لڑائی جھگڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی بڑا آدمی
نا تو قومیں منتشر نہ ہوتیں، فرقے نہ ہوتے، گروہ نہ ہوتے۔ آپسی تنازعے نہ ہوتے۔ ساری دُنیا

ایک گتنبہ ہوتی ۔

جب تک بڑے آدمی پیدا ہوتے رہیں گے ۔ توڑ پھوڑ کا یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ کچھ بڑے آدمیوں نے دھرتی کو مختلف ویشوں میں بانٹا، کچھ نے بانٹے ہوئے ملکوں کو جوڑنے کی کوشش کی ۔ یعنی بڑا آدمی دنیا کو جیسا پاتا ہے، ویسے نہیں رہنے دیتا۔ بڑے پن کی نشانی یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ اُتھل پتھل ضرور کی جائے عام انسان سوتے ہوئے کتوں کو سونے دیتا ہے بلکہ وہ خود بھی ان کے ساتھ سو جاتا ہے ۔ اس کے برعکس بڑا آدمی نہ صرف سوتے ہوئے کتوں کو جگاتا ہے بلکہ ان کی بیداری کے بعد انہیں بھونکنے پر اُکساتا بھی ہے ۔ یہ کسی گم نام بڑے آدمی کی برکت ہی ہے کہ ہم لوگ اکثر کتوں کے بھونکنے کی وجہ سے رات بھر نہیں سو پاتے ۔

بڑے لوگ بڑی عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ لوگ بھی ان کے ساتھ عجیب و غریب سلوک کرتے ہیں ۔ جب بھی بڑے لوگ کوئی نئی بات شروع کرتے ہیں، لوگ پہلے تو اُن پر نکتہ چینی کرتے ہیں، کبھی کبھی ان پر پتھراؤ بھی کرتے ہیں، ان کو طرح طرح کی اذیت دیتے ہیں ۔ پھر دھیرے دھیرے اُن کی تائید کرنا شروع کر دیتے ہیں، سچ ہے عوام کا کوئی اعتبار نہیں ۔

اکثر بڑے آدمی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ لوگ اُن کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ سقراط، لنکن، گاندھی، کینیڈی وغیرہ ایسے کئی نام ہیں جن کا اپنے درمیان وجود عام لوگ برداشت نہ کر سکے ۔ عام طور پر ایسے بڑے آدمیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے جو آپسی بھائی چارے اور امن کا پرچار کرتے ہیں ۔

اگر بڑا آدمی عام یا فطری موت بھی مرے تو لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ اس کے بُت بناتے ہیں بُت کی شکل میں بڑے آدمیوں کو دن رات، اندھیرے اُجالے، دھوپ چھاؤں، گرمی اور جاڑے، بارش اور طوفان میں طرح طرح کے دُکھ جھیلتے ہوئے کھڑا رہنا پڑتا ہے ۔ ہاں کئی بار خاص وجوہات کی بنا پر بڑے آدمی کو کافی حد تک معاف کر کے اُس کے بُت کو بجائے کھڑا رہنے کے بیٹھنے کی اجازت دے دی جاتی ہے مثلاً چونکہ ملکۂ وکٹوریہ بہت موٹی تھیں، اتنی کہ اُس کے لیے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا اس لیے اُس کے بُت کو 'صحت مندی' کی بنیاد پر بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی ۔ اب تو ہندوستان میں اُسے بالکل معاف کر دیا گیا ہے ۔ اور اُسے یہاں سے چلے جانے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے لیکن عموماً "بڑے آدمیوں کے بُتوں کو کھڑا ہی رہنا پڑتا ہے ۔ اس طرح اسکول کے بچوں کی طرح اُنھیں ان کے بڑے پن کی سزا دی جاتی ہے ۔ کون کہتا ہے کہ موت کے بعد دُکھوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے ؟

بڑا آدمی بننے کے کئی فائدے ہوتے ہیں ان کے نام پر اسکول، کالج، ہسپتال، یتیم خانے، پارک وغیرہ قائم کئے جاتے ہیں ۔ اگر بڑے لوگ اتنی تعداد میں نہ ہوتے تو عوام کو یہ سہولتیں بھی مہیا نہ ہوتیں جس سماج میں ایسی سہولتیں اور ایسے ادارے نہ ہوں، سمجھ لیجئے کہ اُس میں بڑے آدمی کم تعداد میں پیدا ہوتے ہیں ۔

جسم و جاں کا رشتہ ختم کرتے جیسے تاکہ نہ صرف چھٹی دی جا سکے بلکہ وقت پر مناسب طریقہ سے اس کا اعلان بھی کیا جا سکے۔ طالب علموں کو عمر رسیدہ بڑے لوگ زیادہ اچھے لگتے ہیں کیونکہ اُن کی جلد موت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں بڑے لوگ تب اُبھرتے ہیں جب سماج گراوٹ کی طرف جا رہا ہو، پس اگر ہمارا سماج خود ہی سدھرا رہے تو کسی بڑے آدمی کی ضرورت نہیں پڑے گی اس لیے اگر ہم بڑے آدمیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں خود ہی اپنی حالت سنوار لینی چاہیئے اور وہ بھی جلد از جلد۔ ورنہ نہ جانے کب، کہاں اور کس بہانے سے کسی خاتون کو حمل ٹھہر جائے اور ہمارے امن میں خلل پیدا ہو جائے۔ ہم سے ایک بار پوچھا گیا "بڑے آدمی بننا چاہتے ہو؟" ہم نے پوچھا "اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

لوگوں سے بھلا بُرا سننا پڑے گا اور اس کی پرواہ کیے بغیر تمہیں اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہنا ہوگا۔ لوگ تمہیں گالیاں دیں گے، تم پر پتھراؤ کریں گے، تمہیں قتل کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ اگر قتل سے بچ گئے تو بڑے آدمی بن جاؤ گے۔"

"اور اگر نہ بچے تو؟"

"بعد از مرگ بڑے آدمی بن جاؤ گے۔"

"ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

اگر زندگی میں ہی بڑے آدمی بن گئے تو جے جے کار ہوگی، زندگی کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں گی تمہارے نام کی ہر جگہ چرچا ہوگی۔ بقیہ زندگی سکھ چین سے گزرے گی۔"

"اور اگر مرنے کے بعد بڑا پن ملا تو؟"

تمہارے جنازے کے ساتھ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ تمہاری بیوہ کی عزت ہوگی۔ تمہاری اولاد اس کا فائدہ اٹھا سکے گی تمہارے نام پر لوگ آپس میں جھگڑا کریں گے، مریں گے۔ اور کسی شاہراہ پر تمہارا بُت کھڑا کیا جائے گا۔"

یہ بُت والی بات سُن کر ہم چوکنا ہو گئے۔

برسوں سے ہم ایک بڑے آدمی کے بُت کو دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ دن رات وہ بے چارا کھڑا رہ کر شہر کے ایک علاقہ میں پہرا دیئے جا رہا تھا۔ سارے پرندے اُس پر کھاد گراتے رہتے تھے وہ بے چارا خاموش سب کچھ سہے جاتا تھا۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ وہ بُت توڑا جا رہا ہے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ فیصلہ ہوا ہے کہ وہ آدمی دراصل بڑا آدمی نہیں تھا اس لیے اب اُس بُت کو توڑ کر اُس جگہ عوام کی سہولت کے لیے ایک بیت الخلا بنایا جائے گا۔

موت کے بعد یہ عزت!

"نا بھئی" ہم نے جواب دیا۔

"ہمیں بڑا آدمی نہیں بننا۔ ہمیں عام آدمی ہی رہنے دو۔"

تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ اور پھر جب مرزا صاحب کی باری آئی تو انہوں نے اس کے متعلق ایک ایسی داستان ہوش ربا بیان کر کے رکھ دی کہ ہمارے نہ صرف کان کھڑے ہوگئے بلکہ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس داستان کا لب لباب یہ تھا کہ کسی گورنر جنرل کی محبوبہ نے دو چمچے جن میں سے ایک ہمارے سامنے تھا، کرسمس میں بطور تحفہ انگلستان سے بھیجے تھے۔ ایک شکار کے دوران مرزا کے پردادا نے اس گورنر جنرل کو شیر کے چنگل سے چھڑا لیا تھا اور اس نے احسان مندی میں ان دو میں سے ایک چمچہ انھیں دے دیا تھا اور ٹیپ کا بند یہ تھا کہ کسی امریکی سیاح نے مرزا کو اس چمچے کو خریدنے کے لئے پانچ ہزار ڈالر کا پیش کش کیا تھا لیکن انہوں نے اس کو نفرت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس رات کو ہمیں بڑی دیر تک نیند نہیں آئی اور جب آئی بھی تو ہم نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوفناک شیر کے منہ سے گورنر جنرل کی محبوبہ اپنا چمچہ کھینچ رہی ہے۔ جنگل کشور نے اس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ مرزا کے پردادا کو ایسا تاریخی چمچہ ہرگز نہیں ملنا چاہیئے تھا چاہے شیر، گورنر جنرل کو مرزا کے پردادا سمیت کھا ہی کیوں نہ جاتا۔

اس واقعے کے چند روز بعد اتوار کو نخاس میں ہم اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے بخشو کباڑی کی دکان میں پہونچ گئے اس سے ہماری یاد اللہ تھی۔ دفعتاً اس کے سامان میں گورنر جنرل کی محبوبہ کے دوسرے چمچے پر ہماری نظر پڑی۔ ہم نے بیساختہ چمچہ اٹھا لیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں اس کے دام پوچھے۔ بخشو نے کہا "سات" ہم سمجھے کہ سات ہزار مانگ رہا ہے۔ ہم نے تفننِ طبع کے لئے کہا "پانچ ہزار لوگے"؟ بخشو بھی کچھ مسخرا سا ہے، بولا "جی نہیں۔ بُہنی کا وقت ہے لائیے اس وقت صرف پانچ روپے دے دیجئے"۔ اور پھر چند لمحوں میں ہمارا ایک پانچ روپے کا نوٹ بخشو کے ہاتھ میں اور گورنر جنرل کی محبوبہ کا وہ تاریخی چمچہ ہماری جیب میں تھا۔

ہم نے سوچا تھا کہ یہ چمچہ لے جا کر مرزا کو دے دیں گے تاکہ ان کے پاس گورنر جنرل کی محبوبہ کی دونوں نشانیاں یکجا ہوجائیں۔ لیکن ہمارے ضمیر نے جس کا شیوہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمارے ہر پہلے خیال کی مخالفت کرتا ہے ہماری سادہ لوحی پر ہم کو ملامت کی اور ہم مرزا کے بجائے اپنے پرانے دوست جنگل کشور کے یہاں پہونچ گئے۔ دوسرے روز سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ہم نے ایک امریکی سیاح سے پانچ ہزار روپیوں میں گورنر جنرل کی محبوبہ کا چمچہ خریدا۔ پھر کیا ہوا؟ آگے کی تفصیلات بہت رقت انگیز ہیں اور ہماری تباہی، رسوائی اور اضطراری حرکات کی ایک داستان بے سر و پا۔

چمچے کی نمائش کے لئے ہمارے گھر پر سویرے اور شام دوستوں اور احبابوں اور شناساؤں کی دعوتیں ہونے لگیں چمچے کی شایان شان گھر میں چائے کی پیالیاں نہیں تھیں لہٰذا ہم کو مشورہ دیا گیا کہ ہم امپورٹیڈ چمچے کے لئے کوئی بہت اعلیٰ قسم کا امپورٹیڈ چائے کا سٹ لے آئیں۔ چائے کا سٹ لینے پہونچے تو جو سٹ پسند کیا تو اس کے متعلق پتہ چلا کہ صرف چار سو کا ملتا ہے لیکن اگر ہم پندرہ سو میں اسی کے جوڑ کا ڈنر سٹ خریدلیں تو وہ مفت میں مل جائے گا۔ چنانچہ سو خرچ کر کے ہم چائے کا سٹ گھاٹے میں لے آئے۔ ہم خوش خوش یہ چیزیں لے کر گھر پہونچے تو یار دوستوں نے

دینے کے بجائے مذاق اُڑایا۔ گرجا شنکر جی بولے "یار اتنا بڑھیا یہ ڈنر سٹ اور اس کے استعمال کے لئے تمہاری لارڈ ڈلہوزی کے زمانے کی ہلتی ڈھلتی مچمچاتی بے میل کرسیاں! ان کے درمیان تو تمہارا سٹ ٹاٹ میں کم خاب کا پیوند معلوم ہوتا ہے"۔ یہ بات ہمارے دل کو بھی لگی اور ہم اس وقت جاکر کھانے کی میز اور بارہ کرسیاں لے آئے۔

اس ساز و سامان کے بعد کھانے کے کمرے کا فرش خود ہم کو بھی مور کے پاؤں جیسا معلوم ہونے لگا۔ گورنر جنرل کی محبوبہ کا چمچہ، اتنا چمچماتا ہوا دیدہ زیب جائے اور ڈنر سٹ، اتنی شاندار میز اور کرسیاں اور کھانے کے کمرے کا اوبڑ کھابڑ فرش! ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پانچ ہزار روپے کا ایک سبز ایرانی قالین لاکر اس کی ستر پوشی کر دی۔ لائق صاحب نے قالین دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ ہمارے ذوق سلیم کی بے ساختہ داد دی۔ اور اپنی نالائقی کے ثبوت میں یہ بے محل شعر پڑھا ؎

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

فرش کا خاطر خواہ انتظام ہو چکا تو ہمارے مخلصوں نے عرش یعنی چھت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی چنانچہ قالین ہی کے جوڑ کی چھت بنوائی گئی۔ سارے کمرے کا پلاسٹر، جگہ جگہ شیشے کی الماریاں، کھڑکیاں آتش دان مینٹل پیس بنوانا اور پھر ان میں رکھنے کے لئے مناسب سامان فراہم کرنا، واش بیسن، آرائش کے متفرق لوازمات مثلاً تصویریں، گملے، گلدان وغیرہ خریدنا غرض ضروری باتیں تھیں لیکن ان پر ہماری گاڑھی کمائی کے پندرہ ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ ان دنوں ہم پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ شاہجہاں کو اگر ہماری طرح سمینٹ کے لئے کلکٹریٹ کے اتنے چکر کاٹنے پڑتے [illegible] دکاندار کے یہاں دھینگا مشتی کرنا پڑتی یا لوہے سے متعلق بابو کے گھر پہ جا کر ان کے ضرورت سے زیادہ موٹے بچے کی ہم وزن مٹھائی کے روپے پیسے پٹے تو وہ یقیناً تاج محل یعنی اپنی بیوی کا مقبرہ بنوانے سے تائب ہو جاتا۔ لیکن ہم تو گویا اپنا مقبرہ بنوا رہے تھے لہٰذا دشواریاں اور رکاوٹیں ہمارے جوش اور انہماک کے لئے مہمیز ثابت ہو رہی تھیں کیوں کہ ہمارے دل میں تو گورنر جنرل کی محبوبہ کا چمچہ تیر نیم کش کی طرح کھٹک رہا تھا۔

ہماری بدحواسیاں دیکھ کر ہماری بیوی کا یہ گمان یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ ہم جس چمچے کے لئے اس قدر حیران اور پریشان ہیں وہ کسی گورنر جنرل کی محبوبہ کا نہیں بلکہ خود ہماری کسی محبوبہ کا ہے چنانچہ اس کی زیارت کے لئے دور دور سے آنے والی عورتوں کا جو تانتا سا بندھا رہتا اس کو اس نے بہکانا اور بھگانا شروع کر دیا۔ ہمارا اندوختہ اور پراویڈنٹ فنڈ تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا نعت کے قریب پنشن بھی بک چکی تھی اب بیوی

کی محبت کا کھاتا بھی اپنے لئے بند ہوتے دیکھا تو ایک سہانی صبح کو ہمارے ذہن کے گمراہوں میں عقل کی بجلی کوندی۔ اور ہم نے گورنر جنرل کی محبوبہ کا چمچہ جھپٹ کر اٹھایا اور اس کو دریا میں پھینکنے کے لئے چل پڑے۔

راستے میں اپنے مکان کے سامنے مرزا مل گئے۔ پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ عرض کیا کہ آپ کو گورنر جنرل کی محبوبہ کا جوڑی دار چمچہ نذر کرنے حاضر ہو رہا تھا۔ مرزا پر قہقہوں کا ایک دورہ سا پڑ گیا۔ کچھ قابو میں آئے تو بولے "ابھی وہ گورنر جنرل والا قصہ تو میں نے جنگ کشور کی ٹانگ گھسیٹنے کے لئے تصنیف کر دیا تھا۔ میں نے تو گھر کے پرانے برتنوں کے ساتھ وہ چمچہ بھی بخشو کباڑی کے ہاتھ کئی مہینے ہوئے فروخت کر چکا ہوں۔

ہم نے ایک دل دوز چیخ کے ساتھ زبردستی مرزا کو وہ چمچہ تھما دیا اور بھاگ گئے ۔ ۔ ۔ ہم اس منحوس، کم بخت منافق چمچے کی یاد اپنے دماغ سے کھرچ کر پھینک دینا چاہتے ہیں لیکن اس کو کیا کیجئے گا محلے والے اب ہمیں بڑے بابو کے بجائے چمچہ بابو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

■■

Accession Number 84750
Date 9-7-86

اسمٰعیل ظریفؔ

غزل

صحت خراب ہوئی ہے تو تفریح بھی کیا ہے
صحت خراب نہیں ہے تو تفریح کیا ہے

غزل میں لفظ برادر جو استعمال ہوا
وہ پوچھتے ہیں برادر کی فارسی کیا ہے

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
ہمیشہ کیوں نہیں آتا کبھی کبھی کیا ہے

سہیلیوں میں ہی ہوتی ہے نوک جھونک حضور
مگر یہ طرزِ تخاطب اری تڑی کیا ہے

خراب کرتے ہو گھر کی فضا کو کیوں یارو
یہ روز خواہ مخواہ آپس میں کرکری کیا ہے

کتاب دوست سے لے کر اسے نہ لوٹانا
ادب نوازو! یہ آپس میں دھاندلی کیا ہے

خصوصی داد جو محفل سے پا رہا ہوں میں
کوئی سمجھ نہ سکا میری پالیسی کیا ہے

مزاح کی قدر ہے زندہ دلوں کے دل میں حضور
جو مردہ دل ہیں کہیں گے یہ شاعری کیا ہے

بہت ہی کام ہے دفتر میں وہ جو کہتے ہیں
سوائے لکھنے کے دفتر میں کام ہی کیا ہے

ظریفؔ آپ کے اشعار خوب ہیں لیکن
غزل ہے آپ کی اس کی اتھارٹی کیا ہے

خواجہ عبدالغفور

لطافت کا دریا زندگی کے ہر میدان
میں اور دنیا کے کونہ کونہ میں رواں دواں ہے یہ
جغرافیائی حدبندی سے رکتا ہے نہ اپنے بہاؤ کا رُخ بدلتا ہے اس
کا کام ہے آبیاری آبپاشی اور سیرابی. کسی علاقہ کی سرزمین اس سے پورا پورا
استفادہ کرتی ہے اور کہیں ساحلی علاقے اپنا دامن سکوڑ لیتے ہیں اور اپنا دامن تر نہیں
ہونے دیتے۔ اسی طرح ظرافت لطافت اور مزاح کہیں کہیں سماج میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں اور کہیں
ان کو پناہ بھی نہیں ملتی۔ اس کا عام طور پر لوگوں کی مزاج کی حس پر انحصار ہے یا ان میں شئے لطیف کی موجودگی
یا فقدان پر۔ ــــــ یہ ضرور ہے کہ سمجھ بوجھ. معاشرہ کی خوشحالی یا خستہ حالی پر بھی منحصر ہے کہ مزاح کا رنگ کس قسم کا
ہوتا ہے اس میں کتنی خوشبو ہوتی ہے اور اس کے تاثرات کس طرح کے ہوتے ہیں۔ ــــــ امریکی مزاح کے متعلق
نہایت تفصیل سے لکھ چکا ہوں اب کچھ یورپی ممالک کے باشندوں کی باتیں پیش کر رہا ہوں۔
یہ زیادہ تر فقرہ بازی چشمک اور حاضر جوابی سے کام لیتے ہیں اور اس میں یہ تیز و
تند بلکہ زہرخند ہو جاتے ہیں گو کہ ظاہری اندازِ بیاں مزاحیہ اور خوش کلامی
سے بھرا ہوتا ہے جس کی وجہ سے مخالف کے جارحانہ ہتھیار
کند ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی مجاہد بھی اپنی
دانشوری اور عاقلانہ گفتار کی تیز دھار
سے مخالف کو نیم بسمل کرتے ہیں

بسا اوقات یہ مرد مجاہد کٹھن مقابلوں میں اس طرح کے تیر و نشتر چلاتے ہیں جو خود ان کی اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس سے فضاً خوشگوار ہو جاتی ہے کیوں کہ اس میں کوئی نبرد آزما ہوتا ہے نہ کوئی مغلوب الغضب ہو کر مغلوب ہوتا ہے۔ دوسرے سننے والے اس سے کچھ زیادہ ہی محظوظ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان وار دل سے محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ سڑک پر گندی نالی میں پھسل کر گرے تو آدمی پہلے ادھر ادھر دیکھ لیتا ہے کہ کسی کی نظر تو نہیں پڑی ہے اس پر اور جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ آس پاس کوئی نہیں تو اس کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے کسی اور کو گرتے دیکھے تو پہلا ردِ عمل اس پر ہنسنے کا ہوتا ہے جو ناروا غیر واجبی بدتہذیبی کا آئینہ دار ضرور ہے لیکن غیر اختیاری ہے۔

پابلو پکاسو دنیا کا مشہور ترین مصور فن کار تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے تجریدی اور علاماتی فن پر بہت ہی تیز وار کیا۔ اگر خدانخواستہ میرے شوہر کی راستہ میں کسی ایسی عورت سے مڈبھیڑ ہو جائے کہ جس کو اس نے تصویر نہیں پیش کیا ہے تو وہ یقیناً بے ہوش ہو کر سڑک پر گر پڑے گا۔ اور جو اس سے کہا جائے کہ اس تصویر میں عورت کے رخسار اور نوک پلک سنوارے جائیں تو وہ رخسار اور چہرہ ڈھونڈھتا ہی رہ جائے گا۔

سڈنی سمتھ ہر طرح کی الجھن کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا عادی تھا اور خود برداشتہ مزاح سے اس کو سلجھا لیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا میری تحریر ایسی لگتی ہے جیسے روشنائی کی بوتل سے کیڑے مکوڑے نکل کر سفید کاغذ پر رینگ گئے ہیں۔ MACAULAY نکلے ایک ہی سانس میں بولے جاتے تھے بلا توقف اور پانی کے بہاؤ کے دھارا کی طرح کسی اور کو دخل در معقولات کی بھی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔ سڈنی اسمتھ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا میں جا رہا ہوں اور جب میں یہاں نہ ہوں گا تو تم کو افسوس ہوگا کہ تم نے مجھے نہیں سنا۔ اس کا کہنا تھا کہ مکالے کی تقریر میں وہی حصے دلچسپ ہیں کہ جب وہ سانس لینے کے لئے رکتا ہے۔ ڈاکٹر سیمول جانسن کو کسی نے اپنی تخلیق کا مسودہ ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے دیا۔ جانسن نے فوراً ہی اپنی رائے پیش کر دی۔ آپ کا مسودہ اچھا بھی ہے اور اوریجنل بھی مگر جو حصہ اچھا ہے وہ اوریجنل نہیں اور جو اوریجنل ہے وہ بالکل بیکار ہے۔

نامور مزاح نگار جناب خواجہ عبدالغفور امریکہ میں چھ ماہ قیام کے بعد حیدرآباد لوٹے تو ادارہ شگوفہ کی فرمائش پر امریکی ظرافت پر ایک طویل مضمون لکھا جو ڈسمبر کے شمارے میں شائع ہوا اور کافی پسند کیا گیا ہے اسی مضمون میں امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کے سماجی حالات پر مبنی کارٹون بھی شریک تھے لیکن ہم نے مناسب سمجھا کہ کارٹون سالنامہ میں شامل اشاعت ہوں۔ ان کارٹونوں کے ساتھ مغربی مزاح کے چند نمونے بھی محترم خواجہ عبدالغفور صاحب نے شگوفہ کے لئے عنایت کیئے ہیں جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ مدیر شگوفہ

کامیڈین گروچو مارکس GROUCHO MARX کو کسی نے اپنی کتاب پیش کی۔ یہ مصنف بزعم خود اپنے آپ کو ظریف اور مزاح نگار سمجھتے تھے۔ گروچو مارکس نے ان کو بتایا۔ جس لمحہ میں نے آپ کی کتاب ہاتھ میں لی اور جس وقت میں نے اس کو میز پر رکھ دیا۔ اس دوران ہنسی کے مارے میرا برا حال تھا۔ کبھی وقت نکال کر مطالعہ بھی کر ڈالوں گا۔

ڈاکٹر سیمول جانسن نے کسی لمو تو پر ہلکا سا ریمارک پاس کیا۔ برابر میں بیٹھی ہوئی ایک فیشن زدہ خاتون بے مجھے بوجھے کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ جانسن اس کی کم عقلی کو برداشت نہ کر سکے۔ فوراً سوال کیا۔ میں نے کیا ایسی کوئی بات کی ہے

کہ جو آپ کی سمجھ بوجھ کے قابل ہے؟ تب تو میں اس محفل کے سامعین سے معذرت خواہ ہوں۔

جان سن ہمیشہ شریڈن SHERI DAN کو دماغی اعتبار سے سست اور کم سمجھ کہتے تھے۔ ایک دن باسول BOSWELL سے کہا شریڈن کو بڑی محنت ریاضت اور مشقت سے کام لینا پڑا ہوگا۔ جب کہیں ایسی نافہم اور عقل و دانش سے معرا شخصیت بنی ہے ایسی مثال قدرت میں کہیں نہیں ملتی۔ منکسرانہ طور پر کہتے ہیں کہ جارج مور بڑی شستہ اور خوبصورت انگریزی لکھتا تھا اس وقت تک کہ اس نے گرامر دریافت نہ کرلی۔

برنارڈ شاہ بہت ہی عظیم شخصیت کا حامل تھا جینِ حیات اس دنیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا اور اس کا کوئی بھی دوست اس کو پسند کرتا تھا نہ منہ لگاتا۔ اس کی کامیاب زندگی کا راز یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں کو ایک ایک کر کے دفنا چکا تھا۔

ڈاکٹر جانسن نے اپنے قومی غرور کے تحت اسکاٹ لینڈ والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا وہ کہا کرتے تھے کہ اسکاچ کو بہت کچھ بنایا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کو کم عمری میں پکڑ کر باندھ لیا جائے۔ اسکاچ کے دماغ کے اندر کسی لطیفہ کو یا ظرافت کی بات کو ٹھونسنا ہو تو پہلے اس کی کھوپڑی کا آپریشن کیا جانا ازحد ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کا دماغ کچھ قبول کرے۔

انگریز سمجھتا ہے اور یہ بانگ دھل کہتا ہے کہ خدا خود بھی انگریز ہے۔ فرنچ اور جرمن اسی لئے طعنہ دیتے ہیں کہ خدا انگریزوں پر بھروسہ نہیں کرتا اور اسی لئے ان کی عالم گیر سلطنت پر سورج کو ڈوبنے نہیں دیتا کہ نہ معلوم اندھیرے میں یہ کیا کر بیٹھیں۔

انگریزوں کی زبان اور بول چال کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ درجن بھر الفاظ اپنے جبڑوں میں خوب چباتے ہیں چکھتے ہیں اور پھر تھوک دیتے ہیں اور اسی عمل کو وہ گفتگو کا سلسلہ کہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ فطرتاً وہ کم گو ہیں جس کی وجہ سے ہم کو لمبی لمبی گفتگو سے بور نہیں کرپاتے۔ نہ معلوم برنارڈ شاہ نے امریکیوں کے متعلق یہ کیوں کہا ہے کہ صدفی صد امریکن ۹۹ فی صد مخبوط الحواس ہوتا ہے۔ ہم نے تو ایسی کوئی بات کبھی نہیں دیکھی۔

البتہ امریکہ میں جس بات کو ہم نے شدت سے محسوس کیا اور جس کا مشاہدہ عام ہے وہ یہ ہے کہ بڑے اپنے چھوٹوں کے ساتھ سعادت مندی کا برتاؤ کرتے ہیں یہ مشاہدہ GENERATION GAP ہے۔

مارک ٹوئین نے بڑے پتے کی بات کی۔ کولمبس نے براعظم امریکہ دریافت کیا یہ ایک خوبصورت حقیقت ہے لیکن یہ بہت زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ امریکہ کے ساحل تک پہونچتا ہی نہیں۔

یہ تو وہی سوال ہوا کہ حادثہ اور بدقسمتی میں کیا فرق ہے؟ پارلیمنٹ میں اس کو اس طرح کی تمثیل سے سمجھایا گیا ہیرلڈ لاڈ دریا میں گر پڑیں تو حادثہ ہوگا اور جو کسی نے ان کو غرق ہونے سے بچا کر کنارے پر لایا تو یہ قوم کی بدقسمتی ہوگی۔

روس کے متعلق سر ونسٹن چرچل کہا تھا کہ روس ایک پہیلی ہے جو ایک گہرے راز کے اندر ایک معمہ میں محبوس ہے۔

روسی سمجھتے ہیں کہ چینی صرف دو قسم کے ہوتے ہیں وہ جو رشوت دیتے ہیں اور وہ جو رشوت قبول کر لیتے ہیں رشوت نہ لینے والا اور نہ دینے والا چینی عالم وجود میں ہے ہی نہیں یونانیوں کے متعلق روسی کہاوت ہے کہ وہ فطرتاً اور جبلی طور پر

بیچ کہتے ہیں لیکن سال بھر میں صرف ایک مرتبہ۔

امریکی سپاہیوں کی ایک ٹیم ٹوکیو میں پنگ پانگ کے مقابلہ کے لئے گئی تو وہاں کافی دھوم دھام رہی امریکیوں کی خوب خاطر مدارات ہوئی دن ڈھلنے پر ایک امریکی اپنے میچ سے فراغت پاکر اپنی رہائش گاہ کو لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں اس کو رفع حاجت کی ضرورت لاحق ہوئی اس نے اطراف واکناف نظریں دوڑائیں۔ کچھ لوگوں سے پوچھا کہ یہاں ٹائلٹ رسٹ روم واش روم بیت الخلا غسل خانہ کہاں ہے؟ اس کی بات کسی نے سمجھی نہیں وقت گزرتا گیا اور اس کی بے چینی بھی حد سے زیادہ بڑھی۔ اشاروں کی زبان کو سمجھ کر ایک مقامی جاپانی نے اس کو اشارہ کیا اور اپنے ساتھ ایک شاندار عمارت کے اندر لے گیا جہاں ایک کمرہ قالین اور پردوں آئینوں سے مزین تھا لیکن اندھیرا اندھیرا سا تھا جاپانی نے اشارہ کیا کہ وہ یہاں پر فارغ ہو سکتا ہے یہ امریکی غریب اس نازک موقف میں تھا کہ جہاں قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ فارغ ہو کر امریکی نے پوچھا جاپانی رسٹ روم؟ جاپانی نے کہا یہ چینی سفارت خانہ ہے اور سفیر کا اجلاس۔

یہ ستم ظریفانہ عملی مذاق کی دلچسپ مثال ہے۔

کینیڈا کے لیڈر مسٹر ڈبو کے متعلق اروِنگ لےٹن نے کہا تھا۔ بالآخر کینیڈا نے ایک ایسا رہنما پیدا کیا ہے جس کا قصاص واجب ہے۔ اس کو professional Hazard بھی کہا جاتا ہے۔

شہر سویڈن سے ۸ میل دور ایک دیہات میں رہنے والے جنٹلمین فارمر کو آنے جانے کے لئے گھوڑے کی ضرورت تھی کسی نے ایک خوبصورت صبا رفتار گھوڑا پیش کیا جس کو اس نے پسند کیا دام بھی خاطر خواہ تھے فروخت کنندہ نے ساتھ ہی کہا یہ اتنا جاندار ہے کہ ۱۰ میل کی دوڑ سے پہلے رکنے کا نام نہیں لے گا۔ سویڈش فارمر نے خریداری سے صاف انکار کر دیا کہ گھوڑا دس میل نکل جائے گا تو اس کو دو میل پیدل چل کر واپس آنا پڑے گا۔

ہر دیس ہر قوم ہر سماج اور ہر ETHNIC GROUP کی نسلی خصوصیات کی موزونیت اور مطابقت سے ان کے متعلق لطائف اور چٹکلے گھڑ لئے جاتے ہیں جن میں احساس برتری یا نسلی امتیاز کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ محض خوش دلی اور سادہ ظرافت ہوتی ہیں۔

**

"میں چیخوں گا"

ناولٹ

جسے عاتق شاہ نے روشنائی سے نہیں بلکہ

اپنے خون سے لکھا ہے

** شائع ہو رہی ہے **

[illegible]

داد وصول کرنے کے طریقے

ہر فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فن کی تعریف ہو اور خوب داد ملے۔ اب وہ فنکار باقی نہ رہے جو داد اور شہرت سے بے نیاز ہوکر بالکل قلندرانہ زندگی گزارتے تھے۔ جو "داد" دیا اس کا بھلا! جو "داد" نہ دیا اس کا بھی بھلا ——— ! داد کے بعد کا درجہ شہرت کا ہوتا ہے۔ اور شہرت کسے عزیز نہیں ہوتی !؟ چنانچہ ہر فنکار اس فکر میں مبتلا رہتا ہے کہ بھلے سے معاوضہ ملے نہ ملے، مگر داد تو ملے۔ اس کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے مواقع سوائے شاعری کے دیگر فنون لطیفہ میں بہت ہی کم ہیں۔ داد پانے کے لئے شاعری کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اور وسیع بھی اتنا کہ ہر نیا سال مشاعروں سے شروع ہوتا ہے اور مشاعرہ پر دم توڑتا ہے۔ ان سالانہ مشاعروں کے علاوہ چہلم، چھٹی، سالگرہ اور شادی بیاہ کے موقعوں پر سنایا جانے والا کلام بھی شامل کرلیا جائے تو غور کیجئے کہ شاعری کا میدان کتنا وسیع ہوگیا ہے! غرض سال تمام کلام سے کہیں زیادہ "عرض کیا ہے!" "توجہ چاہتا ہوں!" "آداب عرض ہے!" وغیرہ وغیرہ سننے کو ملتے ہیں ——— شاید اب آپ یہ کہیں کہ مضمون نگاری اور افسانہ نگاری میں بھی تو داد پانے کے مواقع حاصل ہیں۔ تو عرض ہے کہ مضمون نگار یا افسانہ نگار کو اپنا مضمون یا افسانہ سنانے کے مواقع ملتے ہی کہاں ہیں؟ اور اگر اتفاق سے کبھی موقع ہاتھ آتا بھی ہے تو سال میں ایک آدھ بار۔ اور وہ بھی جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا کسی نے نہ دیکھا کے مصداق ہوتا ہے۔ اب آپ شاید یہ کہیں کہ مضمون نگار کو مطبوعہ مضمون پر تو بذریعہ ڈاک تحریری داد ملتی ہے۔ تو عرض ہے کہ اس بے حسی کے دور میں تحریری داد ملتی ہی کہاں ہے؟ اور اگر کبھی قاری کی غفلت سے مل بھی جاتی ہے تو مضمون نگار کے گھر پہنچتے پہنچتے تک محکمہ ڈاک کی مہریں کھا کھا کر نیم جان ہوجاتی ہے۔ اب اس نیم جان داد کے وصول ہونے کی اطلاع دینا اور پیسے خرچ کرکے تحریری شکریہ ادا کرنا فاضل مضمون نگار کا اخلاقی فریضہ ہوجاتا ہے۔ لیکن مشاعرے میں شاعر کے مالی موقف کو اس طرح للکارا نہیں جاتا صرف "زبانی جمع خرچ" سے کام چل جاتا ہے۔ ادھر شاعر شعر پڑھتا ہے ادھر سامعین داد سے سرفراز فرماتے ہیں "واہ! واہ! سبحان اللہ" "مکرر ارشاد!" تب شاعر داد کی رسید کے طور پر مسلسل آداب بجا لاتا ہے۔ بعض شاعر تو اتنے "بے صبرے" ہوتے ہیں کہ شعر

داغنے سے پہلے ہی رسید پہونچا دیتے ہیں۔ ان کی مثال ان دولھوں کی سی ہوتی ہے جو گھوڑے پر بیٹھے ہوئے عالم بے خیالی میں اپنا سیدھا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہوا میں مسلسل سلام کئے جاتے ہیں۔ اب ان سے یہ کون پوچھے کہ کس کو سلام کر رہے ہیں؟ کیوں کر رہے ہیں؟ اور کدھر کر رہے ہیں؟

جب شاعر مشاعرہ گاہ میں اپنے کلام سے فارغ ہو کر داد سے لدا پھندا اپنے گھر پہونچتا ہے تو اس کی جیب میں سوائے لوٹے ہوئے مشاعرے کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مشاعروں میں داد برائے نام اور ہوٹنگ بطور خاص شعرائے کرام کے حصہ میں آتی ہے۔ ایسے مشاعرے "آل انڈیا مشاعرے" کی تعریف میں آتے ہیں۔ لہٰذا طئے یہ پایا کہ مشاعرہ کی داد بڑی مصدقہ ہوتی ہے۔ (اور اتنی ہی مصدقہ ہوٹنگ بھی)۔

یوں تو ہر فنکار میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے لیکن شاعر میں کئی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری داد ہے۔ شاعر کی قسمت میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ وہ شعر بھی کہے اور داد پر مسلسل آداب بھی بجالائے۔ اگر آپ ہماری رائے کو دل کے پھپھولے پھوڑنے پر محمول نہ کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ داد کے جواب میں بطور رسید ہاتھ ہلا ہلا کر مسلسل آداب بجالانا ایک اچھی خاصی سزا ہے۔ بلکہ یوں کہئیے کہ ایک اچھا خاصا عذاب ہے۔ ہم نے کسی سہ لسانی یا ہمہ لسانی مشاعرہ میں تلگو زبان کے شاعر کو داد کی رسید کے طور پر مسلسل ڈنڈوت بجالاتے یا کسی انگریز شاعر کو داد کے جواب میں "گڈ ایوننگ" یا "گڈ نائٹ" کہتے نہیں سُنا۔ کسی اور زبان کے شاعر کو ایسی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن ہمارا شاعر تو اس کو عین راحت تصور کرتا ہے۔ داد نہ ملے تو شاعر کو یوں محسوس ہوگا جیسے یہ کائنات ایک فضول سی شئے ہے۔ حتیٰ کہ اس کا وجود تک فضول ہے۔ اسی لئے اردو زبان کا آج کا شاعر اپنی ساری تخلیقی صلاحیت فکر سخن پر صرف کرنے کی بجائے حصول داد کی ٹیکنک وضع کرنے میں ضائع کرتا ہے۔ چنانچہ شاعر کی پوری زندگی "شاعری کر مشاعرہ میں ڈال" میں گزر جاتی ہے۔

شاعر محض داد کی خاطر مشاعرہ گاہ میں سر کے بل چل کر آتا ہے۔ اگر اس سے چلا نہیں جاتا تو "چار" کے سہارے مشاعرہ گاہ میں پہونچنے سے نہیں چوکتا۔ ہم یہ بات یونہی نہیں کہہ رہے ہیں۔ ہم نے ایک مشاعرہ میں ایک ایسے بزرگ شاعر کو بھی دیکھا جن کو شاگردوں نے سہارا دے کر اسٹیج پر پہونچایا تھا۔ ان میں کلام سُنانے کی سکت تک نہیں تھی۔ کلام سُنانے کی سکت والی بات ہمارے قلم سے مروتاً نکل گئی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شاعر موصوف میں اپنی بیاض کو تک تھامنے کی سکت نہ تھی۔ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے اپنی بیاض اپنے شاگرد کے ہاتھ میں تھمادی اور خود داد وصول کرنے کے لئے مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ ادھر شاگرد نے کھڑے ہو کر مائک پر مطلع پڑھا ادھر موصوف نے دو زانو ہو کر آداب بجالانے شروع کئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ موصوف کے ہاتھوں میں بلا کی پھرتی آگئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سامعین نے شاعر کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے "کلام شاعر بہ زبان شاگرد" بڑے صبر و ضبط کے ساتھ سُنا۔ لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب پانی سامعین کے سر سے اونچا ہو گیا تو ایک نے ہوٹنگ کے انداز میں کہا "بس بس! اب بیٹھ جائیے!" مائیک پر کلام سنانے والے شاگرد نے فرمایا "آپ لوگ دیکھتے نہیں! جن شاعر کا میں کلام سُنا رہا ہوں وہ تو بیٹھے ہوئے ہیں! وہ اگر اٹھ جائیں تو میں بیٹھ جاؤں!" اس سے پہلے کہ سامعین میٹھے ہوتے

شاعر کو آڑے ہاتھوں لے کر اسٹیج سے اُٹھاتے کنوینر مشاعرہ نے آداب مشاعرہ اور حیدرآبادی روایات پر لیکچر دینا شروع کیا۔ اس طرح "حیدرآبادی روایات" کی دہائی پر سامعین خاموش بیٹھ گئے اور مشاعرہ چلتا رہا۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا داد شاعر کی کمزوری ہے۔ اور داد کی خیرات تو مشاعرہ میں ملتی ہے۔ چنانچہ داد کو حاصل کرنے کے لئے شاعر کو مشاعرہ میں حاضری دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اب وہ شاعر خال خال ہی نظر آتے ہیں جو مشاعرہ میں شرکت کو تضیع اوقات اور داد کو فتنہ پردازی کا فروغ تصور کرتے ہیں۔ اب تو مشاعرہ کی داد طبقہ داری کشمکش اور گروہ بندی کا شکار ہو گئی ہے۔ چاہئے یہ ہے کہ بسا اوقات مشاعروں میں داد کی بجائے جوتیوں میں دال بٹ جاتی ہے۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ شعرائے کرام نے بھی داد کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے وضع کرلئے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مشاعرہ کے آغاز سے تھوڑی دیر پہلے بعض شاعر اپنے اپنے دوست احباب میں گھرے نظر آتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ شاعر اپنے دوستوں کو کچھ کھلا پلا کر ان سے داد کی اڈوانس بکنگ کروالیتا ہے۔ چنانچہ جب وہ شاعر مشاعرہ میں اپنا کلام سنانے لگتا ہے تو مشاعرہ گاہ کے کبھی اس گوشہ سے اور کبھی اُس گوشے سے "واہ، واہ!" کی "صدائے نمک حلالی" بلند ہونے لگتی ہے لیکن داد کی اس طرح اڈوانس بکنگ کروالینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں "مدح خواں" کو میں"۔ میں مالیہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

جس شاعر کا مالیہ کمزور ہوتا ہے اور جو اپنے دوستوں کو کھلا پلا کر داد کا عہد نہیں لے پاتا، وہ اپنے حلیہ سے کام چلا لینے پر اکتفا کرلیتا ہے۔ کبھی عجز و انکساری کا مجسمہ بن کر تو کبھی سلام و پیام کو عام کرکے۔ غالباً آپ کو ایسے شاعروں سے سابقہ پڑا ہوگا جو روزمرہ زندگی میں سلام میں پہل کرنا تو کجا سیدھے منہ بات تک نہیں کرتے لیکن وہ مشاعرہ کے روز اچانک مودب منکسر المزاج اور ووٹ مانگنے والے انتخابی لیڈر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ لیڈر ووٹ حاصل کرکے مکر جاتا ہے۔ اور شاعر داد حاصل کرنے کے بعد آپ کو پہچانتا تک نہیں۔

جس شاعر کے پاس یہ ساری چیزیں نہیں ہوتیں، وہ اپنے ترنم سے کام چلا لیتا ہے۔ اور اپنی ساری توانائیاں ترنم "فٹ کرنے" پر صرف کرتا ہے۔ اور ترنم بھی کچھ ایسا کہ منتظمین مشاعرہ کو سامعین کی ہوٹنگ پر بیک گراونڈ میوزک کا گمان ہو۔

داد کے لئے سامعین کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سامعین کے بغیر مشاعرہ کا تصور اُس دلہے کا سا ہو جاتا ہے جس کے ساتھ براتی نہ ہوں۔ سامعین سے ہی مشاعرہ کی فضا بنتی اور بگڑتی ہے۔ چنانچہ داد کی مناسبت سے سامعین کو بڑی آسانی سے چند گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بعض سامعین کچھ اس جارحانہ انداز میں داد دیتے ہیں کہ شاعر دم بخود رہ جاتا ہے۔ اور دم بخود بھی کچھ ایسا کہ بسا اوقات شعر بھول جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بغیر مقطع پڑھے وداعی سلام عرض کرکے بیٹھ جانے کی نوبت آجاتی ہے۔

بعض سامعین بڑے ہی نازک اور نزاکت پسند ہوتے ہیں۔ یہ دراصل آئی اے ایس آفیسر اور گزیٹیڈ عہدہ دار ہوتے ہیں جو صرف اسٹیج کی رونق بننے کے کام آتے ہیں۔ وہ شاعر کے کلام پر داد دینے کی بجائے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے گھنٹوں گردن ہلانے پر حیرت ہوتی ہے۔ کیا ان کی گردنوں میں درد نہیں ہوتا؟ کیا ان کی گردن کے منکے نہیں چڑھ جاتے؟

بعض سامعین ایسے بھی ہوتے ہیں جو کانوں کی بجائے منہ سے سنتے ہیں۔ وہ اُس وقت تک اپنے گلے کو زحمت نہیں دیتے جب تک کہ کوئی مچھر یا پتنگا اُن کے منہ میں نہ گھُس جائے۔ تب کہیں انھیں اپنا فریضہ یاد آتا ہے کہ شعر پر داد بھی دینی چاہیئے۔

ایک اور قسم کے سامعین بھی پائے جاتے ہیں۔ مشاعرہ گاہ میں آتے ہی اُن کو نیند یاد آجاتی ہے۔ شاعروں کا کلام ان کے لئے لوری کا کام دیتا ہے۔ ہمارے شہر کے ایک کل ہند مشاعرہ میں ہم نے ایک ایسا سامع بھی دیکھا جو مشاعرہ گاہ میں بڑے اطمینان سے خراٹے لے رہا تھا۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو ہم نے اُنھیں جگایا کہ اُٹھیئے جناب، مشاعرہ ختم ہو گیا ہے خدارا خراٹے روکئے۔ اور گھر جاکر باقی خراٹوں سے اپنے گھر والوں کو محظوظ ہونے کا موقع عطا فرمایئے! اُنھوں نے بڑے اطمینان سے انگڑائی لیتے ہوئے فرمایا" شکریہ جناب! ٹھیک وقت پر جگایا۔ مجھے رات کی ٹرین پکڑنی ہے"۔

تب ہمیں پتہ چلا کہ وہ مشاعرہ سُننے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ مشاعرہ کے ٹائم ٹیبل سے ریل کے ٹائم ٹیبل کو ملا کر مشاعرہ گاہ میں اپنے جاگنے کا مناسب و معقول انتظام کر لیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی سہولت انھیں ہوٹل میں تو کیا گھر میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ کو بھی کبھی رات کا سفر درپیش ہو اور ٹھیک وقت پر جاگنے کا معقول انتظام نہ ہو تو اس قسم کی سہولت سے فائدہ اٹھایئے۔ مگر یہ یاد رکھیئے کہ ہمیں داد دینا نہ بھولیئے!

●●

پرویز یداللہ مہدی

"ٹائیں ٹائیں فش"

انسان، حیوان، اشیاء دنیا کی ہر جاندار و بے جان شئے اپنے نام سے پہچانی جاتی ہے اگر ناموں کے یہ لیبل چیزوں اور چہروں پر چسپاں نہ ہوتے
تو دنیا کے سارے کاروبار ٹھپ ہو جاتے، اس اعتبار سے دنیا کی منڈی میں سکے کے بعد صرف نام ہی چلتا ہے بلکہ سکہ بھی اپنی شناخت کے
لئے نام کا محتاج ہے ـــ اسی لئے کسی شئے کو اس کی صفات کے مطابق نام عطا کرنا جس قدر اہم فریضہ ہے اسی قدر دشوار گزار بھی کم از کم ہمارے لئے۔
ہزاروں کورے صفحے سیاہ کر سکتے ہیں لیکن ایک چھوٹا سا نام کوئی خوبصورت عنوان ہمیں شاذ و نادر ہی سوجھتا ہے جبکہ لوگ باگ نومولودوں
سے لے کر چوپایوں تک سبھی کے لئے اچھے اچھے اور پرکشش نام رکھ لیتے ہیں۔ یہ اور بات کہ کبھی کبھی یہ خوبصورت نام سننے والے کو تھوڑی دیر کے
لئے مغالطے میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ابھی حال ہی کی بات ہے، ہمارے ایک قریبی عزیز جو سعودی عرب سے نقد ریال کما کر تازہ تازہ لوٹے تھے
اپنے ایک لنگوٹیے یار کے ہاں دعوت میں جاتے ہوئے ہمیں بھی زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئے۔ راستے میں دعوت کی غرض و غایت کے
بارے میں بتلایا کہ دعوت کے پردے میں الدامی صاحب دراصل ایک عدد ویزا کے خواہش مند ہیں چنانچہ جیسے ہی ہم ان کے دولت کدے پر پہنچے
وہ ہمارے عزیز سے تو لپٹ گئے لیکن ہمیں دیکھ کر پہلے تو ناک بھوں چڑھائیں پھر شاید انہیں ویزا کا خیال آگیا لہذا بادل ناخواستہ مسکراتے
ہوئے مجبوراً ہمارا استقبال کیا۔ سچ ہے "سعودی ویزا" کا جادو اس قدر سر چڑھ کے بولتا ہے کہ اس کی خاطر لوگ گدھے کو باپ اور باپ کو
گدھا کہنے سے بھی نہیں چوکتے اور خوش قسمتی سے ہم تو گدھے تھے نہ الدامی صاحب کے باپ ـــ کھانا لگنے تک ادھر ادھر کی باتیں
چلتی رہیں، اس دوران میں الدامی صاحب نے اچانک ہمارے عزیز سے پوچھا ـــ "تمہیں سریلی تو یاد ہوگی۔" ہمارے عزیز جو سعودی عرب
کے ٹھیٹ ماحول میں رہنے کی وجہ سے "ساتوں سُر" بھول چکے تھے، سریلی کے حوالے سے پہلے تو چونکے پھر یاد کرنے کی کوشش کی پھر تھک ہار
کر نفی میں سر ہلایا تو الدامی صاحب حیرت سے بولے ـــ "ارے تم سریلی کو بھول گئے۔ ابھی سال بھر پہلے تک تم اس پر جان چھڑکتے تھے
اس کی مستانہ چال کے قصیدے پڑھتے تھے اس کی گداز [illegible] پیدا [illegible] تھے۔" موصوف کی اس عجیب اخلاق تشریح پر ہم
[illegible] جیسے موصوف [illegible]

کو بھول گئے لیکن مجھے یاد تھا کہ تم اس پہ مرتے ہو لہٰذا آج میں نے تمہاری خاطر اپنے دل پہ پتھر رکھ کر سُرخی کو ذبح کر ڈالا اور اب اس کی گداز رانیں تمہاری خدمت میں پیش کر کے دوستی کا حق ادا کرنے جا رہا ہوں ۔۔۔ !"

ناموں کی وجہ سے وقتی طور پہ پھیلنے والی اس سنسنی نے ہماری سوچوں کو ایسے نفسیاتی جھٹکے لگائے ہیں کہ نام رکھنے کا مرحلہ سامنے آتے ہی ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے اور ہم اپنا کام دھام، یہاں تک کہ نام بھی بھول جاتے ہیں ۔۔۔ چنانچہ جب ہمارا پہلا مجموعہ اشاعت کی منزل میں پہونچا تو ایک اچھے سے موزوں نام کی تلاش میں کافی دھکے کھانے کے بعد ہم نے بالآخر ان شناسا سے رجوع کیا جو نام رکھنے کے معاملے میں یکتائے محلہ واقع ہوئے ہیں، بلکہ اس سلسلے میں محلے کی نئی پود موصوف کی مرہون منت ہے ہم نے انھیں مائی باپ کا درجہ دیتے ہوئے ساری بپتا گوش گزار کر دی۔ ہماری بپتا سُن کر ان کی "ماما و پاپا" دونوں جوش میں آگئے نہایت ہی بارُعب لہجے میں بولے ۔۔۔ نو مولودوں کے نام رکھنے کے لئے میں عموماً فالنامے سے رجوع کرتا ہوں لیکن یہ چونکہ ادبی کتاب کا معاملہ ہے اس لئے دیوان غالب بہترین فالنامہ ثابت ہوگا ۔۔۔ دیوان غالب کے اس عجیب و غریب پہلو پر سے پردہ اٹھا کر موصوف اپنی جگہ سے اُٹھے اور پھر اپنی مختصر سفید لائبریری کا رُخ کیا جو اُن کی "بیٹھک" ہی میں "ڈائننگ بیٹھک" کے مخلوط پوز" میں موجود تھی۔ بُک شیلف کے سب سے اونچے "عرشے" سے دیوانِ غالب کا نسخۂ عرشی نکالا اور پھر فرش پہ ہمارے روبرو رکھ کر بولے ۔۔۔ "جس طرح یونانی ادویات کی دنیا میں ہر مرض کی دوا زندہ طلسمات مشہور ہے اسی طرح ادبی دنیا کی پیچیدہ گتھیوں کا واحد حل المشکلات، دیوانِ غالب ہے" دلیل اگرچہ انوکھی تھی لیکن وزن رکھتی تھی لہٰذا ہم نے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ آنکھیں بند کر کے دیوان غالب کھولا اور پھر اٹکل سے ایک جگہ اُنگلی رکھ کر دوبارہ آنکھ کھولی تو دیکھا ہماری اُنگشت شہادت کے نیچے یہ مصرعہ جام شہادت پینے کو مچل رہا تھا ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

موصوف بچوں کی طرح چہک کر بولے "کیا موزوں مصرعہ نکلا ہے، میں تو کہتا ہوں دیوان غالب ایک ایسا فالنامہ ہے جو نہ صرف ادب بلکہ تجارت، سیاست، حجامت، عشق محبت، ریس، سٹّہ، جوّا، ہر قسم کے قومی اور بین قومی معاملات میں سود مند ثابت ہو سکتا ہے ۔۔۔

ہم نے انہیں ٹوکا ۔۔۔ "قبلہ! میں اپنی کتاب کے لئے ایک چھوٹا سا نام چاہتا ہوں پورا مصرع نہیں!" وہ اُسی روانی سے بولے ۔۔۔ "ٹھیک ہے، اس مصرع میں دو عدد نادر الوجود ترکیبیں موجود ہیں۔ نقش فریادی اور شوخیٔ تحریر ۔۔۔ کوئی ایک منتخب کر لیجئے بلکہ میری مانئے تو دونوں ترکیبیں ہتھیا لیجئے ۔۔۔ ہم نے جھنجھلا کر پوچھا ۔۔۔ "وہ کیسے ۔۔۔؟"

بولے ۔۔۔ "دونوں ترکیبوں پر قبضہ کرنے کی ترکیب بڑی آسان ہے، نام اور عرفیت کا رواج ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہے اس سے فائدہ اُٹھائیے ایک ترکیب کو بطور نام استعمال کیجئے دوسری کو بطور عرفیت کے۔ یعنی نقش فریادی عرف شوخیٔ تحریر ۔۔۔ !"

ہم نے چڑ کر کہا ۔۔۔ "نام اور عرفیت کی یہ فرسودہ اور دقیانوسی ترکیب خاموش فلموں کے دور سے چلی آرہی ہے

جیسے الیلی نازعرف چھپن چھری المتخلص بہ خونی خنجر ــــ"

ہمارے اعتراض کے جواب میں رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے بولے ــ "آگے آپ کی مرضی، کتاب بھی آپ کی ہے فیصلہ بھی آپ کا۔ چاہے جو نام رکھیئے ــــ!!"

ہم یہ فیصلہ نہیں کرپا رہے تھے کہ اپنے اولین مجموعے کا نام نقش فریادی رکھیں یا شوخیٔ تحریر چنانچہ اس سلسلے میں ایک قریبی دوست سے مشورہ کیا جو ادبی دنیا میں ادبی کیڑے کے نام سے مشہور ہے اس کی جانی ہوئی کتابوں کی طرف دیمک و دیگر کاغذ خور کیڑے بھول کر بھی رُخ نہیں کرتے ہماری روداد سُن کر پہلے تو ادبی کیڑے نے تبسّم فرمایا پھر بولا ــ "چچا غالب کی دونوں شاعرانہ ترکیبیں مسل کرنسی نوٹ کے استعمال ہو چکی ہیں، نقش فریادی کے نام سے ڈاکٹر نقش فریاد پوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ مارکیٹ میں آکر برسوں سے سڑ رہا ہے بلکہ سُنا ہے اب تو اس میں اس قدر تعفن اُٹھ رہا ہے کہ لوگ ان کتب فروشوں سے بچ کر گزرتے ہی میں عافیت سمجھ رہے ہیں جن کے ہاں فروخت کی غرض سے یہ مجموعہ رکھوایا گیا ہے ــ اور شوخیٔ تحریر کے نام سے ایک مشہور شاعر اپنا ظریفانہ کلام شائع کرداچکے ہیں ــ" ہم نے مایوس لہجے میں کہا ــ "بڑی مشکل سے بذریعہ فال، یہ نام نکلے تھے وہ بھی ہاتھ [illegible] ادبی کیڑے نے مسکرا کر ڈھارس بندھائی ــ "کیا ہوا جو اس مصرع کی دونوں ترکیبیں استعمال ہو چکیں، ابھی اس میں ایک عمدہ زوردار ترکیب اور محفوظ ہے تم اپنے مجموعے کا نام رکھو ہے کس کی ــــ؟

ہم نے حیرت سے کہا ــ "آگے پیچھے کچھ بھی نہیں ــ بس صرف ہے کس کی ــ؟"

اس نے ٹھوس لہجے میں کہا ــ "ہاں ــــ صرف ہے کس کی" ــ جو منفرد بھی ہے اور معنی خیز بھی ــ!

ہم نے لقمہ دیا ــــ "معنی خیز نہیں، دو معنی کہو ــــ!"

اس نے جھنجھلا کر پوچھا ــــ "آخر تم کیسا نام چاہتے ہو ــ؟"

ہم نے وضاحت کی ــــ "ایسا جو سمجھنے میں آسان پڑھنے میں رواں اور سُننے میں رسیلا ہو ــــ!"

اس نے مضحکہ خیز لہجے میں چوٹ کی ــ یہ بات ہے تو تم اپنے مجموعے کا نام رکھو "قلاقند" ذائقے میں بھی میٹھا ہوگا" ہم نے زچ ہو کر کہا ــــ "خدا کے لیئے یہ چھیڑ خانیاں چھوڑو اور سنجیدگی سے کوئی نام سوچو ــ!" ہماری بات ختم ہوتے ہی اس نے چٹکی بجا کر فرمایا ــــ "آگیا ــ زبردست دھواں دھار نام، مزاح چونکہ چھیڑ خوبیاں سے چلی جانے والی کیفیت کا نام ہے اس لیئے تم اپنے پہلے مجموعے کا نام رکھو "چھیڑ چھاڑ ــ"!! اس طرح پہلے مجموعے کی نام رکھائی کا مرحلہ بڑے جھٹکوں کے بعد طے ہوا۔ البتہ ان ابتدائی جھٹکوں سے فائدہ یہ ہوا کہ جس طرح سانپ کا کاٹا "رسّی" سے اور دودھ کا جلا "لسّی" سے بدکتا ہے، ناموں کے معاملے میں ہم اس قدر محتاط اور چوکس ہو گئے کہ جہاں کہیں کوئی نئی ترکیب انوکھی اصطلاح نظر سے گزرتی فوراً اُسے لوٹ کر لیتے اور یوں آٹھ دس خوبصورت نام اڈوانس میں ہمارے ہاتھ لگ گئے چنانچہ دوسرے اور تیسرے مجموعے کی اشاعت کے وقت کم از کم نام کے مسئلے نے کوئی مرحلہ نہیں کھڑا کیا ــ لیکن بدقسمتی سے تازہ مجموعہ کے لئے جب مضامین کا انتخاب مکمل ہو چکا تب پتہ چلا کہ مضامین کے موضوع اور مزاج کی مناسبت سے پہلے ہی سے منتخب کردہ عنوانات

میں سے کوئی بھی کسی طور میل نہیں کھاتا لیجیے بات پھر وہیں آ پہونچی جہاں سے شروع ہوئی تھی لہٰذا ایک بار پھر ادبی کیڑے کے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اس مرتبہ کم بخت نے اپنی خوب خاطر تواضع کروائی پھر فرمایا ـــ "اگرچہ کہ تم نے اتنے برسوں میں ادب کے میدان میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہنوز اسی کنویں میں ٹرٹرا رہے ہو جس میں ادبی آنکھ کھولی تھی، تاہم اس بار میں تمہیں ایک انٹرنیشنل قسم کا عنوان دیتا ہوں" ـــ میں تنقید کے گدلے تالاب میں غرقاب کر کے وہ خود کسی سوچ میں غرق ہوگیا اور ہم بڑی بیزاری سے اس کی بیداری کا انتظار کرتے رہے بڑی دیر بعد وہ سوچ کے سوکھے ساگر سے باہر نکلا اور بولا ـــ "تمہارے تازہ ترین مجموعے کا عنوان ہوگا ٹائین ٹائین فش ـــ!"

یہ عجیب و غریب اصطلاح سن کر ہمیں ایسا جھٹکا ہوگا جیسے کسی نے مرگی کے مریض کو چپل سونگھانے کے بجائے پوری قوت سے رسید کردی ہو۔ ہم نے جھنجھلا کر کہا ـــ "کچھ کہنے سے پہلے ذرا غور کرلیا کرو تم جسے انٹرنیشنل عنوان کہہ رہے ہو وہ مجھے کسی افریقی لوک گیت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے ـــ"

"یہی تو خوبی ہے اس کی" ـــ وہ تڑاک سے بولا ـــ "جو بات ذہن سے جس قدر بالاتر ہوگی اتنی ہی لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچے گی، آج عالمی سطح پر جس قدر دھاندلیاں ہو رہی ہیں، بربریت کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں وہ سب کی سب خبروں کی شکل میں ہمارے اخباروں کی "زینت امان" بن رہی ہیں ـــ آج کی ہر اہم سُرخی میں ٹائیں ٹائیں فش کی اصطلاح بین السطور موجود ہے بس دیکھنے والی نظر کی ضرورت ہے یعنی کہ "دیدۂ ٹینا" چاہیئے ـــ"

"دیدۂ ٹینا نہیں دیدۂ بینا کہو" ـــ ہم نے ان کی تصحیح کر ڈالی ـــ حقارت آمیز لہجے میں فرمایا "لگتا ہے تمہیں جدیدیت چھو کر بھی نہیں گزری، دیدۂ بینا و مینا کا زمانہ لد گیا، اب زینت ریکھا اور ٹینا منیم کا دور ہے۔ اصل میں حد سے زیادہ پاکبازی نے تمہاری عقل کو برقع پوش کر دیا ہے، اسی لئے پردۂ سیمیں کی ان بے پردہ حسینوں کے "جلوے" تمہارے دل و دماغ میں نہ فسادات بپا کرتے ہیں نہ بلوے ـــ" ہماری پاکبازی پر جی بھر کے حملے کرنے کے بعد وہ دوبارہ اصل موضوع کی طرف آتا ہوا بولا ـــ "ذرا دنیا کے نقشے پر نظر ڈالو، ہر طرف لوٹ مار، قتل غارت گری اور جنگ کے ہولناک مناظر نظر آئینگے پچھلے کئی برسوں سے روس کی مسلح فوجیں افغانستان میں کیا کر رہی ہیں! بھانگڑا نہیں ناچ رہی ہیں بلکہ آزادی کے متوالے افغانی مجاہدین کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن مجاہدین بھی قوتِ ایمانی کے ساتھ یہ قسم کھا کر میدان کارزار میں ڈٹے ہوئے ہیں کہ اس وقت تک مقابلہ کرتے رہیں گے جب تک کہ روسی افواج "مدئیں ٹائیں فش" نہیں بول دیتیں، ادھر ایران اور عراق آپس میں برسرپیکار ہیں، ہر دو طاقتیں بذریعہ جنگ یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں کہ دیکھیں کون کس کو ٹائیں ٹائیں فش بولنے پر مجبور کرتا ہے، اور ابھی پچھلے دنوں اسرائیلی بربریت کے تازہ ترین شکار فلسطینی مجاہدین کو دیکھو جنہوں نے وقتی طور پر ملک بدر ہونا منظور تو کرلیا ہے لیکن ان کے سینوں میں سُلگتی آزادی کی جوت بدستور روشن ہے، تم دیکھنا ایک دن یہ جیالے سورما اسرائیلی ظلم کا خاتمہ کر کے رہیں گے امریکی پہلوانوں کا جو نشہ اسرائیل کو پلایا ہے وہ ایک روز ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہے گا ـــ!!!

مختلف مقامات پر ایک ساتھ ہونے والی اتنی ساری گھمسان کی جنگوں کے تذکرے نے ہم پر لرزا طاری کر دیا، ہم نے

کپکپاتے لہجے میں کہا ـــ "اس حساب سے تو ٹائیں ٹائیں فش بڑی جنگجو اصطلاح ہے ـــ!"

"بالکل ـــ" وہ بڑے دھڑلے سے بولا ـــ اب ذرا اس کی دوسری خوبی ملاحظہ فرماؤ کہ یہ ترکیب کس طرح تمہارے ادبی سفر میں ایک اچھوتا تسلسل قائم کرتی ہے، سب سے پہلے تم نے اپنے قارئین سے "چھیڑ چھاڑ" کی نتیجے میں تمہیں چوڑی کا غلام بننا پڑا، اور جب چوڑی کے غلام بنے تو ظاہر ہے "تو تو میں میں" لازمی تھی، لیکن تو تو میں میں' بھی تابکے۔ فریقین میں سے کسی نہ کسی کو "ٹائیں ٹائیں فش" بولنا ہی تھا سو تم نے بول دیا ـــ!"

اس انٹرنیشنل ترکیب کے "جنگی روپ" سے زیادہ "خانہ جنگی" والا روپ ہمیں پسند آیا لہٰذا ہم خوشی خوشی ٹائیں ٹائیں فش بول گئے ـــ!!

جیسے ہی کتاب چھپ کر آئی ہم نے پہلا نسخہ ادبی کیڑے، کے حوالے کرتے ہوئے دست بستہ گزارش کی۔ "اس مجموعے کے "نام کرن سنسکار" کے چونکہ تم ہی ذمہ دار ہو اس لئے اس کی رسم اجراء بھی اپنے ہی مبارک ہاتھوں سے انجام دیجئے" ہمیں توقع تھی کہ یہ درخواست سن کر ادبی کیڑا، مارے خوشی کے کلبلا اٹھے گا، پھر کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے خود کو حقیر فقیر پر تقصیر وغیرہ وغیرہ ثابت کر کے بالآخر ہماری درخواست کو شرف قبولیت عطا فرما کر خود اپنی عزت افزائی کے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی' ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ اس نے بڑی بے نیازی سے ہمیں مطلع فرمایا ـــ "ابھی کل ہی ترقی اردو بورڈ کے ڈائرکٹر صاحب بہ نفسِ نفیس میرے گھر تشریف لائے تھے اس معروضے کے ساتھ کہ پچھلے پچیس برسوں سے اردو لغت جدید کے وسیع پراجکٹ پر جو کام ہو رہا تھا وہ بحمداللہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور دس جلدوں پر محیط اس عظیم الشان لغت کی رسم اجراء کے لئے ہمیں اسی کے شایانِ شان کسی ادبی شخصیت کی تلاش تھی چنانچہ مختلف ذرائع حمل ونقل کے توسط سے پورے ہندوستان کی خاک چھاننے کے بعد بورڈ کی نظر آپ پر پڑی ہے، اب یہ مبارک فریضہ آپ ہی کو انجام دینا ہے خدارا انکار مت کیجئے ـــ!!" ادبی کیڑے کے اس انکشاف پر ہمیں ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا، پھر بھی ہم نے سنبھالا لے کر جوابی چوٹ کی؟ "سنا ہے اردو لغت جدید کی ہر جلد کا وزن تقریباً دس کیلو ہے اور اس حساب سے دس جلدوں کا وزن یقیناً سو کیلو ہوگا' رسم اجراء کے موقع پر کیا تمہارے دستِ نازک یہ بھاری بوجھ اٹھا سکیں گے ـــ؟"

وہ فوراً بولا ـــ "اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیا ہے میں نے، رسم اجراء کے وقت تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے یقین ہے تمہارا لحیم شحیم جثہ اس باوزن فریضے کو بآسانی نباہنے میں مددگار ثابت ہوگا ـــ!

اتنا کہہ کر ادبی کیڑے نے ایک قہقہہ لگایا پھر بڑے ہی خاکسارانہ لہجے میں فرمایا ـــ "ترقی اردو بورڈ کا شوشہ دراصل میرا خیالی پلاؤ تھا پیارے! میری نظر میں تمہارا تازہ مجموعہ دس جلدوں پر مشتمل اردو لغت جدید کا بھی والد بزرگوار ہے، میں اس کے آگے ابھی طفلِ مکتب ہوں' رسم اجرا کی بھاری ذمہ داری کا کسی طور اہل نہیں' بلکہ اس تعلق سے میں نے اپنے محلے کے سوشیل ورکر سے بات کر رکھی ہے' اس نے مجھ سے حلفیہ وعدہ کیا ہے کہ اس موقع پر کسی منسٹر کو پکڑ لائیگا"

ہم نے فوراً اعتراض جھاڑ دیا ـــــ "ادبی کتاب کی رسم اجراء کسی سیاسی شخصیت کے ہاتھوں کچھ عجیب نہیں لگے گی؟" اس نے جھلا کر کہا ـــــ "اس عجیب و غریب کے چکر میں اُلجھ کر تو ہم اردو والے دن بہ دن غریب ہوتے جا رہے ہیں" ـــــ پیارے کسی وزیر یا امیر سے رسم اجراء کرواؤگے تو کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل جائے گی۔ گورنمنٹ کھاتے میں میونسپل لائبریریوں میں . . . "چار پیسے کی آس بڑی بُری ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی آس نے ہمارے اعتراضات پر اوس ڈال دی بصلحت کی چابی نے ہماری زبان پر "چپ" کا تالا لگا دیا ـــــ ادبی کیڑے نے ہماری 'چپ' کو نیم رضامندی تصور کرتے ہوئے بھاگ دوڑ شروع کر دی اور ہفتے بھر کے اندر نہ صرف وزیر انیمل ہزبنڈری (ANIMAL HUSBANDARY) سے رسم اجراء کا وقت دن تاریخ طے کر کے آئے بلکہ ہمارے مجموعے کی پہلی جلد ان کی نذر کر کے ان کی خصوصی تقریر کی کاربن کاپی بھی لے آئے۔ جو رسم اجراء کے موقع پر وزیر موصوف بھری محفل میں پڑھنے والے تھے! ادبی کیڑے نے ایک عدد تمباکو والا پان داڑھ میں دبا کر وزیر موصوف کی تقریر کی کاربن کاپی باآواز بلند پڑھنا شروع کی ـــــ

حاضرینِ محفل!

آج اردو کی ایک کارآمد اور مفید کتاب کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ شاید آپ میں سے بہت سارے لوگ یہ نہیں جانتے یا پھر شاید جانتے ہوں کہ اردو زبان کی ابتداء سے لے کر آج کی تاریخ تک یوں تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں ادبی سرمائے کے طور پر اس زبان کے خزانۂ فاخرہ میں جمع ہو چکی ہیں لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ اس وسیع سرمائے میں مقصدی اور تعمیری کتابوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ اب کیا بتاؤں کس قدر کم ہے، داستانوں شعر و شاعری افسانوں کہانیوں اور قصّہ طوطاؤں و میناؤں کے مجموعوں کی بھرمار بلکہ یلغار میں جب کوئی ایسی کتاب منظرِ عام پر آتی ہے جو ہماری موجودہ سرکار کے بیس نکاتی پروگرام کے کسی نہ کسی نکتے کی نمائندگی کرتی ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے اور "شاہین تا ماہی فش" جو اپنے نام ہی سے اپنے موضوع پر واضح روشنی ڈالتی ہے سرکار کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے پیچھے کارفرما نقطۂ نظر اور میرے نظریئے، ہر دو کی بھرپور تائید کرتی ہے ـــــ!

قابل مصنف میری نظر میں لائق صد مبارکباد ہے کہ اس نے سستا ادب تخلیق کرنے کے بجائے ٹھوس اور مقصدی ادب کو اپنے پیشِ نظر رکھا اور یوں عالمی ادب میں اپنے لئے جگہ بنالی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ لائق مصنف بمبئی میں رہتا ہے اور بمبئی جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کی فلم زدہ نسل کے لئے بڑی مسحور کن جگہ ہوا کرتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے چاروں طرف سے محصور بھی ہے، اس کے تین طرف پہاڑ کھڑے ہیں اور ایک طرف سمندر پڑا ہے اگر قابل مصنف چاہتا تو کوہ پیمائی کے بہانے پہاڑوں سے سر ٹکرا کر تاریخی عاشقوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ سر سے کفن باندھنے کی جگہ اس نے تیراکی کی مشین کمر سے باندھ کر آکسیجن کا خول سر پر چڑھا کر سمندر میں ڈبکیاں لگانے کو ترجیح دی۔

برسوں پہلے اردو کے کسی شاعر نے فرمایا تھا ؎

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے ؞ مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

غالباً قابل مصنف نے اس شعر کی مزید تحقیق کی غرض سے سمندر کی تہہ کا انتخاب کیا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ آب رواں کے اندر بنانے والے نے آیا ایک ہی قسم کی مچھلی بنائی ہے یا ہمہ اقسام کی۔ چنانچہ مسلسل ڈبکیوں، اور غوطہ خوری کے نتیجے میں جو ریسرچ کا کام اس نے انجام دیا، تحقیق کے جو موتی اس کے ہاتھ لگے انھیں صفحۂ قرطاس پہ یکجا کر کے سمندر کو کوزے میں، پہاڑ کو خربوزے، میں اور شتر مرغ کو چوزے میں تبدیل کر دیا۔

لائق مصنف نے سمندر کی گہرائی میں ایک ایسی عجیب الخلقت مچھلی دیکھی جو طوطے کی طرح ٹائیں ٹائیں بھی کرتی ہے اور طوطے کی طرح طوطا چشم بھی ہے اسی لئے مصنف نے اس کا نام "ٹائیں ٹائیں فش" رکھا

مجھے مصنف کی دریافت کردہ ٹائیں ٹائیں فش میں "اپوزیشن" کے لیڈروں کی ساری صفات نظر آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے نوجوان مصنف کی ٹائیں ٹائیں فش بھارت کے ہر صوبہ ہر شہر ہر گاؤں میں مقبول ہوگی خصوصاً مچھلی کھانے والے علاقوں میں یہ ہاتھوں ہاتھ پھیلے گی — اس کتاب کی مقصدیت کو دیکھتے ہوئے میں خود روزگار اسکیم کے ارباب مجاز سے پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ قابل مصنف کی اس کارآمد تصنیف کی ساری جلدیں مناسب کمیشن پر خرید کر بے روزگار نوجوانوں میں مفت تقسیم کروائیں تاکہ انھیں بھی مچھلیاں پکڑنے اور ان کے "پالن پوشن" کے سائنٹیفک طریقوں کا علم ہو، اور وہ پہلی فرصت میں سمندروں، دریاؤں، تالابوں اور ندی نالوں کی طرف نکل جائیں — اس طرح ایک تو بے روزگاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا دوسرے آبادی کا بڑھتا ہوا سیلاب بھی کم ہو جائےگا کیوں کہ جو نوجوان تیرنا نہیں جانتے جب بھی مچھلی پکڑنے کی نیت سے سمندروں اور تالابوں کا رُخ کریں گے ان کی واپسی کی توقع بڑی موہوم ہوگی۔

بہرحال میں ایک بار پھر قابل مصنف کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے اُمید کرتا ہوں کہ اپنی آئندہ تصانیف میں نوجوان مصنف مرغیوں، بکریوں، بھیڑوں کے بارے میں معلوماتی مواد پیش کر کے ادب کے ساتھ ساتھ، قوم کی خدمت کا فریضہ اسی طرح خوش اسلوبی سے نبھاتے رہیں گے....!

تقریر پڑھنے کے دوران تمباکو والے تلخ پان کی 'پیک' وافر مقدار میں ادبی کیڑے کے منھ میں اکٹھا ہو گئی تھی چنانچہ تقریر

ختم کرتے ہی اس نے کھڑکی کے باہر فٹ پاتھ پر پیک کی پچکاری ماری پھر گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ "کہو کیسی لگی تقریر ۔۔۔؟"

ہم نے جواباً پہلے تو فٹ پاتھ کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں پان کی 'پیک' تجریدی آرٹ کے کسی ناقابل فہم نمونے میں تبدیل ہو چکی تھی، پھر تقریر کی کاربن کاپی کی طرف دیکھ کر سوچا ۔۔۔ تقریر کی کاپی کے اس قدر نزدیک ہوتے ہوئے اتنی دور فٹ پاتھ پر تجریدی آرٹ کا نمونہ بنانے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔!

پھر اس کے استفسار کے جواب میں اپنی طرف سے سوال داغا۔ "کیا یہ تقریر خود وزیر موصوف نے لکھی ہے ۔۔۔؟"

"اجی توبہ کرو ۔۔۔" وہ تڑاک سے بولا ۔۔۔ "وزیر مہاشے تو پیدائشی انگوٹھا چھاپ ہیں ۔۔۔!"

"تو پھر یہ تقریر کس سڑک چھاپ نے لکھی ہے ۔۔۔؟" ہم نے اپنے تجسس کی پیاس بجھانے کی خاطر پوچھا' اس نے جواب دیا ۔۔۔ "وزیر صاحب کے پی۔ اے (P.A) نے تیار کی ہے ۔۔۔!"

ہم نے جھلا کر کہا ۔۔۔ کم بخت پی۔ اے کو مجھ سے کیا دشمنی تھی جو اس نے میرے اچھے خاصے مجموعے کو مچھلیوں کی افزائش اور پالن پوشن، کا کتابچہ ثابت کرنے پر اپنا سارا زور قلم صرف کر ڈالا ۔۔۔؟" جواب میں ادبی کیڑے نے مطلع فرمایا ۔۔۔ دراصل وزیر صاحب کی ماتحتی میں آنے سے پہلے ان کا یہ پی۔ اے محکمۂ سمکیات، عرف "فشریز ڈپارٹمنٹ" میں مچھلیوں کے گودام کا انچارج تھا لہٰذا تمہارے مجموعے کا 'ٹائٹل' دیکھتے ہی اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں یہ تقریر تیار کر ڈالی ۔۔۔!"

ہم نے گڑ بڑا کر پوچھا ۔۔۔ کیا یہ تقریر بدلی نہیں جا سکتی ۔۔۔؟"

"ہرگز نہیں! اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا ہم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ۔۔۔ تو پھر وزیر موصوف ہی کو بدل دو ۔۔۔!"

"ناممکن ۔۔۔!" وہ گڑ بڑا کر بولا ۔۔۔ تم وزیر مہاشے کو نہیں جانتے ابھی پچھلے دنوں کسی مقامی انجمن نے اپنے ایک مذاکرہ پروگرام کے لئے وزیر موصوف سے بات چیت کرنے کے بعد عین وقت پر کسی وجہ سے پروگرام منسوخ کر دیا، پھر کیا تھا عزت مآب وزیر موصوف نے اسی توہین کے بدلے انجمن کے تمام ممبروں کے نام وارنٹ جاری کروا دیئے، چنانچہ انجمن ہذا کے تمام کارکنان فی الحال جیل میں سڑ رہے ہیں"! اس خطرناک انکشاف پر یوں لگا جیسے ہم سانپ کے گلے کی چھچھوندر ہو گئے ہیں' اس سے پہلے کہ نہ اگلا جائے ہے اس سے نہ نگلا جائے ہے والی درمیانہ کیفیت ہمارا کچومر نکال دیتی' ہم نے راتوں رات اپنے وطن ثانی بمبئی کی طرف کوچ کا پروگرام بنا لیا۔ اور پھر اس پروگرام پر عمل درآمد کیا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ایک چمتکار ہوا ۔۔۔ پتہ نہیں کس طرح مخالف حزب کو ہمارے درد کا اندازہ ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں ایسی سیاسی چال' چلی کہ مرکز' کو ریاستی کابینہ' تحلیل کر کے ریاست میں صدر راج نافذ کرنے پر مجبور کر دیا، اور یوں ہمارا بے ضرر فن "وزیر موصوف کی تقریر کے بھن" کی زد میں آنے سے بال بال بچ گیا ۔۔۔ اس خوشی میں ہم ادبی کیڑے کو مچھلی کھانے کے ایک ہوٹل میں لے گئے اور مچھلی کا آرڈر دیا۔ ادبی کیڑے نے متفکر لہجے میں تبصرہ فرمایا ۔۔۔ "سیاسی حالات کی اس اچانک کروٹ نے اُردو ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور تمہاری کتاب کی فروخت پر اس کا براہ راست اثر پڑیگا۔ اس کا ازالہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کوئی نہ کوئی اردو اکیڈیمی تمہاری کتاب کو انعام کا مستحق قرار دے' البتہ مجھے یقین ہے کہ کم از کم مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کے مچھلی خور اراکین تمہاری کتاب کو انعام سے ضرور نوازیں گے"! ادبی کیڑے کی اس نیک تمنا پر ہم نے فوراً کہا تمہارے منہ میں گھی شکر۔ !جسکے جواب میں اس نے مچھلی کا ایک ٹکڑا ہمارے منہ میں رکھتے ہوئے برجستگی سے کہا۔ "اور تمہارے منہ میں ٹماٹو فش!!" ●●

پرویز یداللہ مہدی
تیمیع جلیل
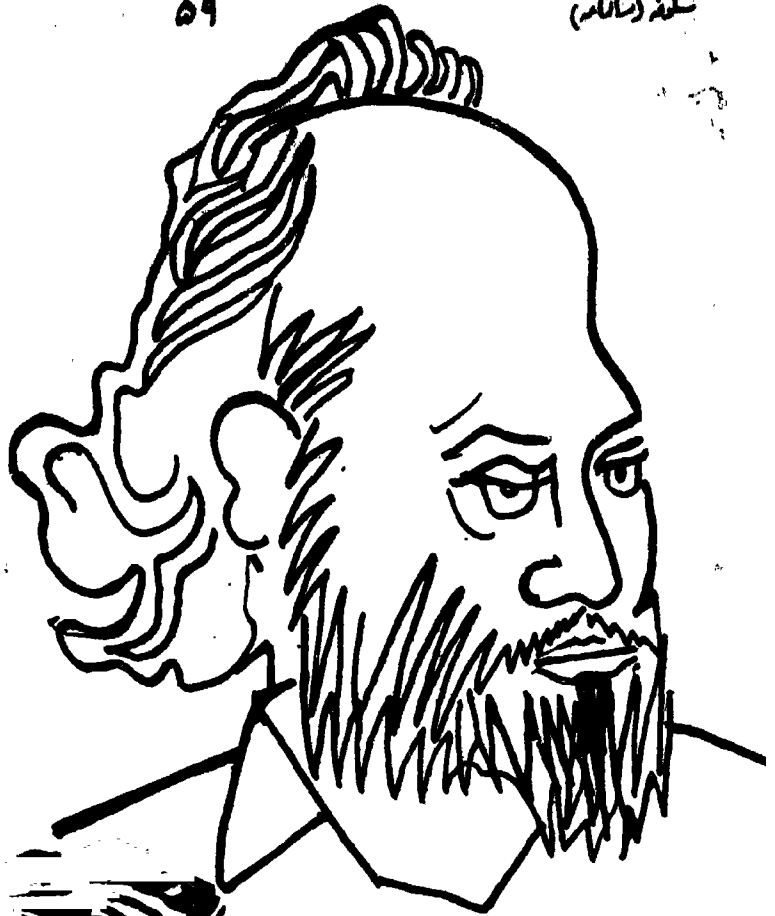
رشید عبدالسمیع جلیل

نئے سال کی آمد پر

ڈائری، جنتری، دیوار بدل دی جائے
گھر کی جو شئے بھی ہو بے کار بدل دی جائے

ہے نئے سال کی آمد اسے ویلکم ہی کریں
پچھلی ہر عادت و گفتار بدل دی جائے

"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"
عاشقو حسرتِ دیدار بدل دی جائے

ٹانگ لنگڑی ہو تو کچھ تیز سواری پکڑیں
پیر بھاری ہوں تو رفتار بدل دی جائے

اینٹ، پتھر میں نہ ہو پیار کا اک رنگ جہاں
وہ عمارت ہی مرے یار بدل دی جائے

شاعری فن ہے خدا داد کوئی کھیل نہیں
اس میں الفاظ کی بھرمار بدل دی جائے

بحث تصنیف کریں فالتو وقتوں میں ضرور
صنفِ نازک ہو تو تکرار بدل دی جائے

دیس کا ہوگا بھلا آئیے کھادی پہنیں
یہ جو ہے ریشمی شلوار بدل دی جائے

سرکیولیشن ہے اگر کم تو ایڈیٹر صاحب
آج سے قیمتِ اخبار بدل دی جائے

بیچ بازار میں بجتی ہے جو مرضی کے خلاف
ایسی پازیب کی جھنکار بدل دی جائے

اس سے پہلے کہ ملے خاک میں عزت ساری
ٹوپی و پگڑی و دستار بدل دی جائے

جنس پیدا ہو، خریدار ہو ناپید جہاں
تو وہاں رونقِ بازار بدل دی جائے

کبھی گنجائشِ گیسو کا صفایا کر دیں
کبھی زیبائشِ رخسار بدل دی جائے

ووٹ طاقت ہے جو ہاتھ آتی ہے کمزوروں کے
اس کے بل بوتے پہ سرکار بدل دی جائے

شام ہوتے ہی چلے آتے ہیں مچھر گھر میں
بلدیہ بیٹھی ہے لاچار بدل دی جائے

ضبط ہو جائے ضمانت تو کریں ترکِ وطن
اس طرح جیت میں پھر ہار بدل دی جائے

کوچہ کوچہ ہے کوئی گشت میں افواہ نئی
یہ اگر سچ ہے تو سو بار بدل دی جائے

آج کی تازہ خبر جس کو سمجھتے ہیں جلیل
کئی ہفتوں کی ہے طومار، بدل دی جائے

★

پاگل عادل آبادی

غزل

کچھ ایسے بھی اب جونیئر دیکھتا ہوں
جنھیں باپ سے سینیئر دیکھتا ہوں

لگے اب تو مرغے بھی کرنے غٹرغوں
ملاوٹ کا کیا کیا اثر دیکھتا ہوں

میرے نام جاگیر ساری جو لکھ دے
میں دل والا ایسا خسر دیکھتا ہوں

شکر مل رہی ہے یا خیرات لوگو
جو کیو میں کھڑا گھر کا گھر دیکھتا ہوں

وہ گھس گھس کے دھوتے ہیں صابن سے چہرہ
مگر پھر بھی کالا کلر دیکھتا ہوں

ٹرانسسٹروں کے تصدق میں یارو
شبِ غم بڑی مختصر دیکھتا ہوں

یوں کہنے کو ان کی کئی ڈگریاں ہیں
مگر ان کی نالج صفر دیکھتا ہوں

ستم ہے کہ چوری کے ہر کیس میں اب
میں پولیس کو بھی پارٹنر دیکھتا ہوں

کفن بھی لگے سلنے اب چھینٹ کے ہی
میں مردے بھی رنگیں کلر دیکھتا ہوں

بھروسہ کسے ہے کہ پلٹیں سلامت
میں خطرے میں ہر اک سفر دیکھتا ہوں

اڑے ہوش سارے گدھوں کے بھی پاگل
ترنم کا تیرے اثر دیکھتا ہوں

آندھرا پردیش اسٹیٹ اسینشیل کموڈیٹیز کارپوریشن لمیٹیڈ

رجسٹرڈ آفس: III, II/٦٠/٤ - ٥ - ١١، ریڈہلز، حیدرآباد-٤

یہ کارپوریشن حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے حسب ذیل و منجملہ دوسرے مقاصد کے تحت قائم کیا گیا۔

١. عام آدمی اور متوسط طبقہ کی خدمت کے لئے تاکہ چاول، گیہوں، شکر، کیروسین اور کھانے کے تیل وغیرہ جیسی اشیائے مایحتاج ریاست کے تمام دیہاتوں میں سربراہ ہو۔

٢. اس کارپوریشن نے ریاست کے تمام اضلاع میں چاول اور گیہوں کی ہول سیل تقسیم کا کام شروع کیا ہے۔

٣. آندھرا پردیش اسٹیٹ اسینشیل کموڈیٹیز کارپوریشن لمیٹیڈ اپنی انّاپورنا عوامی کینٹینوں کے ذریعہ کم قیمت میں کھانے کی اشیاء فراہم کرتی ہے۔ اڈلی پلیٹ ٣٥ پیسے، وڈا پلیٹ ۵۵ پیسے، اُپما پلیٹ ۵۰ پیسے، کافی ٤٠ پیسے، چائے ٣٠ پیسے، ویجیٹیبل بریانی ٧٥ پیسے، لڈو ۵۰ پیسے، ٹماٹر بھات ٦٠ پیسے — فل میلس (پیٹ بھر کھانا) ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

٤. رعایتی نرخ کے چاول، عام چاول کی فروخت فی کیلو ایک روپیہ ٩٠ پیسے، نفیس چاول فی کیلو دو روپے ١٠ پیسے، نفیس ترین چاول فی کیلو دو روپیہ ١٥ پیسے۔

۵. اسکول بچوں کے لئے حکومت کی طرف سے مڈ ڈے میلس اسکیم کے نفاذ کا کام سونپا گیا۔

٦. آندھرا پردیش اسٹیٹ اسینشیل کموڈیٹیز کارپوریشن لمیٹیڈ آگے بڑھ رہی ہے اور آپ کے تعاون اور سرپرستی کی ضرورت مند ہے۔

کو بھی ٹھکرا دینے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ اور جہاں موت بھی آتے ہوئے گھبراتی ہو۔ اُسی محفل میں ہنستے ہنستے بے حال ہو کے جب رومال نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو یہ بشارت ہوتی ہے کہ الماری کی چابی میز پر چھوڑی جا چکی ہے!

ایک کلاسیکل تبسم کا بریک لگتا ہے اور آپ ادھورے قہقہے کو اگلی محفل میں پورا کرنے کا وعدہ کر کے کسی امریکی راکٹ کی طرح یہ جا وہ جا !

اِس ڈائری اور اِس چابی کی بھول بسری یادیں ایسے ہی قاتلانہ موقعوں پر آتی ہیں۔ لسانیات اور ادبیات پر ایک عرصے تک ریسرچ کر کے آپ نے خاصہ مواد اکٹھا کیا۔ پھر مکمل بٹر کی ایجنسی لی۔ ایک دربار خاص کا اہتمام کروایا اور پہونچے شہنشاہِ زماں افسر عالی کے حضور۔ ابھی ڈبہ کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ڈائری رقیب روسیاہ بن کے حائل ہو گئی۔ اب آپ کھڑے جناب افسر کا روئے مبارک اس طرح تک رہے ہیں کہ وہ کراس ورڈ کا کوئی معمہ ہو یشنکرس ویکلی (آہ مرحوم) کا کارٹون ہو۔ غالب کا کوئی شعر ہو۔ شاستریہ گائن کی نہ ٹوٹنے والی تان ہو ۔۔! اور اسی ردِ عمل کے نتیجے میں آپ پاؤ سانس میں ہی ہجر و فراق کے وہ سارے شعر سنا جاتے ہیں جو آپ نے بڑی محنت سے اپنی اُس محبوبہ پر رعب ڈالنے کے لئے رٹ رکھے تھے جسے اُردو بالکل نہیں آتی !!

ان عذابات جہنم سے بچنے کے لئے آپ ڈائری کو رگِ جان بنائے ساتھ رکھنے لگے۔ لیکن سکون تو قدرت کے اس کارخانے میں محال ہے۔ کافی ہاؤس میں پل ادا کرنے کا مظاہرہ کرنے کے لئے مجاہدانہ جوش و خروش سے پرس نکالا۔ ساتھ میں ڈائری نکل کر اس طرح گری کہ آپ کو خبر تک نہیں ہوئی۔ کر

گر جانے میں یہ چیزیں صدا نہیں رکھتیں

گھر پہونچ کر۔ یا پھر دوسرے تیسرے دن اس رگِ جان کی کمی محسوس ہوئی۔ اور واقعی تلوار کا وار گردن پر پڑ گیا۔ اب جس حالت میں بھی آپ ہیں کافی ہاؤس تک دوڑ جائیے۔

قسمت کے ستارے نے اگر نحوست کے خانے کا الاٹمنٹ نہ کروالیا ہو تو بیرے صاحب ڈائری کی ادبی اور روحانی اہمیت پر ایک مقالہ لکھتے یا سوچتے ہوئے پائے جائیں گے۔ ورنہ انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان صاحب یا صاحبہ کا فزیکل اور پولیٹیکل جغرافیہ تفصیلی طور پر بتا دیا جائیگا جو آپ کے جانشین (میز نشین) تھے !

پس اگر ہمت ہے تو دوسی ہوا بازوں کے شجرے میں اپنا نام درج کرائیے اور شہر کے چوراستے پر کھڑے ہو کر ہر آنے جانے والے کا سراپا چشم بن کے یوں جائزہ لیجئے گویا آپ کو ان میں ستاروں سے آگے والے جہانوں کی تلاش ہے!

اسی کوشش میں چار چھ کے پیچھے دوڑ یئے۔ دو چار کو پکڑ کے جھنجھوڑ دیجئے۔ ڈائری ملے نہ ملے سرکاری ہوٹل ڈی لکس میں چند روز کے لئے معمولی یا غیر معمولی انتظام ضرور ہو جائے گا۔

چلئے مان لیا کہ قتالۂ عالم کافی ہاؤس میں نہیں گریں۔ لائبریری کی میز پر تو بھولنے کے امکانات ہیں۔ ذکر اس میں ہوتا اُمّی پری وش کا ہے۔ مگر بیان اپنا ایسا کہ جو پڑھے اسے اپنا ہی عکس نظر آئے۔ اب ایک فوج کی فوج کالج کے ہر خوبصورت موڑ پہ، ہر نیم تاریک گوشے میں رستہ کاٹنے کے لئے حاضر ہے اور آپ باقی ماندہ ہوش و حواس سے اپنائیت کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد بحق حسینا لکھ جہاں محفوظ کرا کے اسٹیشن پہ ۔ تاکہ انتہائی دور دراز مقام

سا ئنٹ خریدا جا سکے ـــــ!

یہ ڈائیری کیا ہوئی۔ اچھا خاصہ آنکھوں کا جال اور جی کا جنجال ہو گئی۔ اپنے پرائیوں کے مستند اور غیر مستند غموں کا پہلے ہی یہ عالم ہے کہ خدا کے حضور میں دو چار ایکسٹرا دلوں کے لئے درخواست دی جا چکی ہے۔ ڈائیری کا غم بھگتنے کے لئے تو الگ ایک سالم Unbreakable قسم کا دل چاہیئے ـــــ!

تو چاہیئے تو یہ تھا کہ اس سرمۂ بصیرت افروز کو لگا کر اور دماغ کے دریچوں کو کھول کے کچھ عبرت (کہ جواب دیگر تمام اشیاء کی طرح خالص نہیں رہی) حاصل کر لی جاتی ـــــ اور اُس دنیا میں اس قسم کی کوئی حرکت ارادی یا غیر ارادی طور پہ نہ کی جاتی۔ کیوں کہ اِس دُنیا کے نکالے ہوؤں کو اُس دنیا کی آس تو ہے! ڈائیری کے صدقے اگر اُس کوچے سے بھی بے آبرو ہو کر نکلے تو کہاں ٹھکانہ لگے گا۔

ہمارے لئے اب کوئی تیسری دنیا تخلیق کی جانے سے تو رہی ـــــ! اور معاملہ چونکہ ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد تک پہونچ جاتا ہے۔ اس لئے یہ حرکت کیا اس کا تصور بھی گناہ ـــــ!

اب بھی کچھ گیا نہیں۔ یہ تو پہلا ہی صفحہ ہے۔ ہاتھ کی صفائی جیسے فنونِ لطیفہ میں کمال دکھانے کا اس سے بہتر موقع اس منگنائی کے جہاں میں نہیں مل سکتا ـــــ!

کچھ نہیں تو ڈائیری کے آدھے دام تو مل ہی جائیں گے ـــــ!

دوسرا تاریخی دن : ـ کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی تو یہ ہے کہ ڈائیری روز لکھی جانی چاہیئے۔ بالکل اسی پابندی کے ساتھ جیسے دنیا کی آدھی آبادی کھاتی پیتی ہے۔ بقیہ آدھی آبادی کم بخت ایسے کاہلوں اور غیر ذمہ داروں کی ہے جو اتنا بھی نہیں کماتے کہ پابندی سے دو وقت کھانا کھا سکیں۔ ذرا غور کیجئے تو کسی نہ کسی طرح قصور خود ان کا ہی نکل آئے گا۔ بے چارے شرفا کو الزام دینے سے کیا حاصل ـــــ!؟

خدا کے آزاد بندے تو مرنے اور جینے تک کی پابندی کے قائل نہیں (اور یقیناً مبارک ہے یہ جذبۂ آزادی) ڈائری کے سلسلے میں اگر انھیں یہ پابندی برتنی پڑے تو وہ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس نکالیں گے مسجد اور مندر جیسے ـــــ مقامات پہ خالق دو جہاں کو بیس کانفرنس کے لئے مدعو کریں گے۔ اور پھر اُس آزاد دنیا کی مانگ رکھیں گے۔ جہاں ہر پابندی پہ پابندی ہو۔

خیر ہمیں پرائی پیر سے کیا مطلب۔ خود اپنا یہ حال کہ اگر لکھنے کے معاملے میں کچھ تھوڑی بہت بھی پابندی برتی جا سکتی تو ہم اپنے خطوط میں تاریخ اور مہینہ نہ سہی سنہ ڈالنے کی ہمت تو کر ہی لیتے ـــــ! اور وہ آدھی زندگی جو اسی سلسلے میں بہانے تراشتے تراشتے اور معذرت کرتے کرتے گزرتی ہے کسی بہتر طریقے سے گزاری جا سکتی تھی اور ہم ہر اِلّا قسم کی لعنت ملامت اور سیکڑوں روپے کی فضول خرچی سے نجات پا جاتے۔

کیوں کہ جب انتہائی ضروری خط کے جواب کی ہر ممکن دو ناممکن مدت بھی بخیر و خوبی گزر جاتی ہے۔ تو تار کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ٹرنک کال پر روپیہ پھینکا جاتا ہے۔ اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو خود مجسم لفافہ (کہ جسے دیکھ کر مضمون بھانپ لینا ممکن نہیں) بن کے جانا پڑتا ہے۔ اور جو یہ بھی ممکن نہ ہو تو گلیسرین لگا کے قسمت پہ آنسو بہانے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔

پابندی کے اس جاں فرسا تصور نے تو ہوش و حواس کو کچھ اس انداز سے عنقا کر رکھا ہے کہ اب عنقا کی حقیقت اور وجودیت پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ رات ڈائری لکھنے کے بعد کئی گھنٹے محض اس خیال سے نیند نہیں آتی کہ کل پھر سے لکھنا پڑے گا۔ (ڈائری کا وجود مبارک کہ شب بیداری کا بھرم قائم ہے) اور جب خود اپنی ہی لوریوں سے ذرا آنکھ جھپکی تو خواب میں ہر طرف ڈائری ہی ڈائری کی رنگینی بھاگتی نظر آئی۔ شہر ڈائری کے۔ سڑکیں ڈائری کی۔ ہاتھی گھوڑے سکتے۔ بلی۔ موٹر گاڑیاں، ہر چیز ڈائری کی۔

گویا ہر دوست ہر شناسا اور دنیا ایک ڈائری کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس فدائے دو جہاں کا (جو اگر ذرا ہمدردی سے ہماری مانگوں پر غور تو نہایت آسانی سے فدائے دو جہاں ہو سکتا ہے) کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آنکھ کھل گئی۔ ورنہ صبح ہوتے ہوتے میرے ہاتھ پیر یقیناً ڈائری کے اوراق میں تبدیل ہو جاتے۔

آج دن بھر ڈائری کا بھوت سوار رہا۔ کالج میں پرنسپل سے لے کر چپراسی تک ہر شخص کو ڈائری لکھنے کا مشورہ دیا۔ کیوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ دنیا کا ہر بڑا آدمی ڈائری لکھتا ہے (خواہ وہ ڈائری اس کی عظمت اور شہرت کے بعد پچھلی تاریخوں میں ہی کیوں نہ لکھی اور لکھوائی گئی ہو)۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہر وہ شخص جو ڈائری لکھتا ہے یقیناً سو فیصدی بڑا ہے۔

ہر درد کی دوا اور ہر مسئلہ کا حل ڈائری نویسی تجویز کی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ وہ دن بھی دور نہیں جب دنیا کا آغاز و انجام بھی ڈائری کا کرشمہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ سارا دن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کچھ اس قسم کے نعرے لگائے گئے۔

سر میں درد ہے ـــــــ ڈائری لکھیے۔
دل میں درد ہے ـــــــ ڈائری لکھیے۔
روٹھے ہوئے دوست کو منانا ہے ـــــــ ڈائری لکھیے
کسی وبالِ جان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے ـــــــ ڈائری لکھیے
امتحان پاس کرنا ہے ـــــــ ڈائری لکھیے۔
نوکری میں ترقی چاہیئے ـــــــ ڈائری لکھیے۔

غرض یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھے کسی ڈائری بیچنے والی کمپنی کا ایجنٹ سمجھ کر لوگوں نے کترانا شروع کر دیا۔ (بعد کی اطلاعات یہ بھی ہیں کہ خدا کے بیس پچیس نیک بندوں نے اس پر فوری عمل شروع کر دیا۔ جس کے تاریخی نتائج یہ ہوئے کہ ہمارے پانچ چھ دوست صفِ اعداء میں علانیہ طور پر شامل ہو گئے آٹھ دس کے اچھے بھلے سروں میں مسلسل بحث و مباحثہ سے مستقل درد رہنے لگا۔ ویسے آفیشیل رپورٹ میں یہ بات دبا دی گئی کہ ان میں سے دو سر چوٹ کی وجہ سے بھی دُکھ رہے ہیں) اور ایک چپراسی نوکری سے الگ کر دیا گیا۔

تیسرا اہم ترین دن :- ہم پھر بھی لکھ رہے ہیں گو اس سلسلے میں ہماری ہمت THROUGH PROPER CHANNEL آپ سے داد کی طالب ہے مگر لکھیں کیا۔!

حساب کتاب ۔

لیکن یہاں تو وہی معاملہ ہے ۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ابھی تو یہ خوش فہمی ہے کہ ساری تنخواہ صرف خرچ ہوتی ہے پھر تو یہ راز بھی فاش ہو جائے گا کہ کم از کم ایک چوتھائی گم بھی ہو جایا کرتی ہے ۔ اپنی معلومات میں یہ گراں بہا اضافہ واقعی گراں گزرے گا ۔ اور جانے کتنے رشتے ناطے ٹوٹ جائیں ۔

اور یہ بھی خدشہ ہے کہ نئے پرانے پیسوں کے حساب سے اچھی بھلی زندگی بنئے کی کتاب نہ بن جائے ۔ بینک کی چیک بک میں نہ ڈھل جائے اور ہم لوگ یوں نہ باتیں کرنے لگیں ۔

"آج مجھے پچاس نئے پیسوں کے برابر خوشی ہوئی ۔"

"ارے صاحب میرا غم تو کسی حالت میں ایک روپیہ سے کم نہیں"

"کل افتخار صاحب کو یہاں دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوئی ۔"

اُف آپ تو ابھی تک پرانی لکیر پیٹ رہے ہیں ۔ یہ بے انتہا سے کیا مطلب ہوا ۔ کنورٹ کر کے بتائیے !

"جی ۔ جی ۔ میرا مطلب ہے ۔ دو روپے پچیس پیسے ۔"

تو پھر ــــــ ؟

اچھا تو اپنا روز آنہ کا پروگرام ہی سہی ۔

عاقبت یہاں بھی سنور نے سے رہی جناب ۔ پروگرام لکھ لینے کے بعد تو اسے بھولنے کی گنجائش ختم ۔ اور زندگی سے تجاہل عارفانہ کا وجود غائب ۔

سوچئے تو سہی ۔ زندگی کس درجہ غیر شاعرانہ (بلکہ دیرانہ) ہو کے رہ جائے گی ۔ جانے کتنے بھلے مانس قسم کے دوستوں سے دشمنی ہو جائے گی ۔

کتنوں کو دیکھ کے شرمندگی سے منہ چھپانا پڑے گا ۔ اور نوکری سے تو خیر دوسرے ہی مہینے تزک و احتشام کے ساتھ چھٹکارا مل جائے گا ۔

اور ان سب کے بعد بھی بہانہ تراشنے کی کسی عمدہ کمپنی کی تلاش جوں کی توں جاری رہے گی ۔

غالباً روحانی تجربات و اردات قلبی مناسب رہیں گے ۔

اسے کہتے ہیں بیل کو دعوت نامہ بھیجنا ۔ رسوائی تو خیر جب ہوگی تو ہوگی اور خاص دھوم دھام سے ہوگی ۔ لیکن اپنے ہاتھوں وہ زور دار کلہاڑی پڑے گی کہ سارا عشق ہوا ہو جائے گا ۔ کیونکہ ڈائری میں درج کرنے کے بعد نہ تو کسی وعدے سے پھر جانا ممکن ہوگا نہ کسی جذبے میں [illegible] ـــــــــ ۔ اور نہ اپنا الزام دوسرے کے سر تھوپنے کے امکانات ۔

اور شاعری کی صدیوں کی روایتیں مفلس حقداروں کی طرح مٹ جائیں گی ۔ لے دے کے ہمارا قومی سرمایہ جو کچھ ہے وہ روایت ہی تو ہے ۔ اس کے لئے تو ہم جان تک قربان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ پھر بھلا ڈائری کی حقیقت کیا ۔

بس اب یہ آخری پالسہ ہے ۔

دوستوں اور ملنے والوں کے قلمی خاکے ۔

لیکن بات یہاں بھی نہیں بنتی ۔ اگر دنیا کی محفل سے دل اکتا گیا ہو ۔ اور زادِ راہ اور عاقبت کا خاصہ ساماں بہم پہنچا لیا ہو تو بسم اللہ ۔ شوق سے ڈائری قلمی خاکوں سے سنوار یئے سال کے ختم ہونے ہونے تک انشاء اللہ قبرستان پہنچ جائیگا ۔ اور جو ذرا صحت جان ہیں ۔ ان کا اسپتال پہنچنا تو پھر بھی یقینی ہے ۔

تو پھر بتائیے ۔ کیا لکھوں ۔ (قلمی گالوں سے قطع نظر ۔!!)

اعجاز وارثی سنبھلی

گلدان

شادی کے بعد بیوی تھی اور میرا پیار تھا
واللہ کیا جنونِ محبت سوار تھا

ہر سانس ایک نغمہ تھی اور ساز دھڑکنیں
ارماں ہزار دل میں تھے، ہمراز دھڑکنیں

دونوں رواں دواں تھے محبت کی راہ پر
ماضی سے بے نیاز تھے فردا سے بے خبر

میں تو بس ایک شاعرِ خانہ خراب تھا
کب شاعرات میں مگر اس کا جواب تھا

اس کی غزل گلوں کا تبسم، رخِ بہار
اُس کی غزل صبا کا ترنم، جمالِ یار

اس کے ہر ایک شعر میں جدت تھی بات تھی
میں صرف اک بیاض تھا وہ کلیات تھی

کہتا تھا میں کہ تو مرے خوابوں کا عکس ہے
روئے سخن نکھرتا ہے جس سے وہ "لکس" ہے

دنیائے ازدواج کا کھلتا کنول ہے تو
میری نظر سے دیکھ مجسم غزل ہے تو

ہر روز کہتی تھی وہ مرے منہ پہ رکھ کے ہاتھ
اللہ چپ بھی رہیئے بہت ڈھل چلی ہے رات

پھر شاخِ آرزو پہ کھلا اک گلِ مراد
اک شور تھا فضا میں مبارک ہو، زندہ باد

شبنم تھی اس پہ واری تو سبزہ نثار تھا
آنکھوں کا تھا وہ نور، دلوں کا قرار تھا

گلشن میں رفتہ رفتہ گلوں کا ہوا وہ زور
شبنم تھی آبدیدہ تو بے چارہ سبزہ چور

جب آنکھ دفعتاً کھلی عالم خراب تھا
تعبیر سمجھا تھا جسے میں صرف خواب تھا

خوشبو کے خیمے لوٹ کے طوفاں گزر گیا
زار و نزار پھولوں سے گلدان بھر گیا

اوقات اپنی، اپنی ہی نظروں سے گر گئی
ساری بساط عشق پہ جھاڑو سی پھر گئی

بارہ برس کا کھاتہ یہ ہے، قصہ مختصر
آپ آٹھ دختریں ہیں تو مریل سا اک پسر

یکسر بدل چکا ہے شب و روز کا نصاب
افلاس کے شکنجہ میں ہے زیست کی کتاب

خاروں کے درمیان ہے ماضی کا مرغزار
میں صیدِ روزگار تو وہ صیدِ انتشار

اسٹیڈیم ہے کھیل کا اب میرا گھر نہیں
وہ چیخ وہ پکار کہ جس سے مفر نہیں

لوکنگ بغیر رنگ تو کرکٹ وکٹ بغیر
سرکس کا شو بھی ہوتا ہے لیکن ٹکٹ بغیر

بلّا زمین پر ہے تو گیند آسمان پر
چھت پر ہیں بھائی جان تو بہنیں مچان پر

چھوٹے مچائیں شور تو پھینکیں ڈلے بڑے
کم بخت گھر کے چھوڑیں نہ ہمسایوں کے گھڑے

فرصت ملی جو بھائی سے بہنوں میں چل گئی
بیوی بچانے دوڑیں تو روٹی ہی جل گئی

ہے تیرِ طعن و طنز جہاں ہر کمان میں
ہمدردوں کی کمی بھی نہیں اس جہان میں

کہتے ہیں لوگ اس میں بھی راحت بلا کی ہے
معصوموں کی یہ فوج تو رحمت خدا کی ہے

لیکن گناہگار کو دادِ گناہ بھی
اللہ! راہرو کے لیے زادِ راہ بھی

بچوں کو میرے بختِ سکندر دے اے خدا
بخشا ہے تو نے درد تو درماں بھی ہو عطا

○
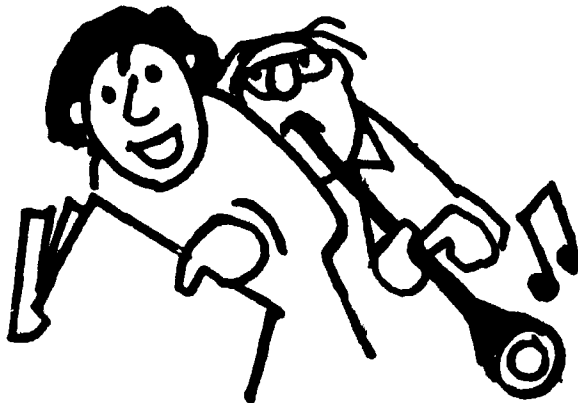
بچّے کی بھلائی
عورت کا احترام
مُلک کی شان

ننّھا پودا بنتا گلشن
کل کی جوانی آج کا بچپن
بچّہ مُلک کا پاسدار ہے
اس پر مُستقبل کا بار ہے

نئے 20 نکاتی پروگرام کے تحت بچّوں کی صحت، بھلائی اور مربوط نشو و نما کا ایک پروگرام چلایا جا رہا ہے۔
ماں، بچّے کو محض جنم ہی نہیں دیتی بلکہ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس طرح وہ صحیح معنوں میں ملک کی معمار ہے۔
عورت اور بچّوں کی فلاح پر ہی ملک کی بہبودی اور تحفظ کا انحصار ہے اس لیے بچّوں کی بھلائی اور عورت کی توقیر و احترام کے لئے اس پروگرام میں ایک نئی روح پھونکی جا رہی ہے۔

بچّے کو پُر غذا خوراک تبھی میسّر ہوگی
جب کُنبہ مختصر ہو

davp 82/448

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کیجئے :۔

ڈپٹی ڈائریکٹر،
ماس میلنگ یونٹ،
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی،
"بی" بلاک، کستوربا گاندھی مارگ،
نئی دہلی 110001
نئے 20 نکاتی پروگرام کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے براہ کرم مجھے اُردو/ہندی/انگریزی میں کتابچے روانہ کریں۔

نام ______________________

پتہ ______________________

____

پن کوڈ نمبر ______________________

نیا 20 نکاتی پروگرام

فیاض احمد فیضی
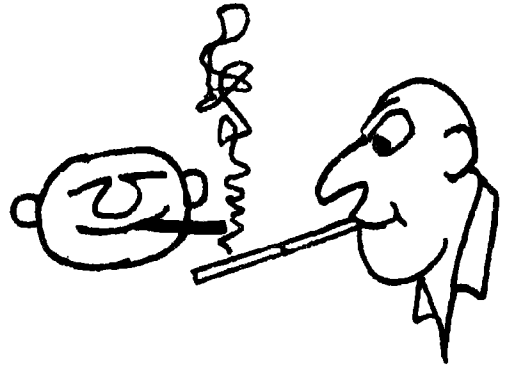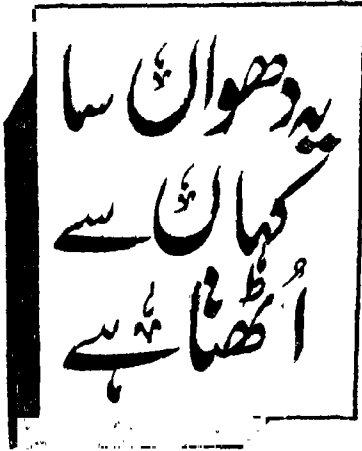
باً سگریٹ دنیا کی واحد شئے ہے جو کھینچنے سے چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ
نظریے سے متفق نہیں ہیں تو یہ آپ کے لئے فال نیک ہے اس لئے کہ اس
، وہی لوگ اتفاق کریں گے جو سگریٹ نوشی بلکہ سگریٹ کشی کے دام میں گرفتار ہیں
، عام آدمی جب کسی کو سگریٹ جلائے دیکھتا ہے تو یہی سمجھتا ہے کہ ایک سرے پر چنگاری
اور دوسرے پر چغد ہے اور جو کچھ بھی ان دونوں کے درمیان میں
ہے وہ جیب اور صحت کے لئے مُضر ہے۔ شاید اس لئے کہ درمیان میں رہنے
والی کوئی بھی ہستی کم از کم کسی کے لئے مفید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر جیب کے لئے مضر ہونا
تو سمجھ میں آتا ہے کہ سگریٹ بھی مونث ہے اور بیشتر مونث اشیاء پر یہی شک کیا جاتا ہے۔
آج تک ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ بھلا سگریٹ صحت کے لئے مُضر کس طرح
تی یا ہوتی ہے اس لئے کہ ہم نے آج تک سگریٹ کو جتنے ہونٹوں کے درمیان دیا
، ان ہونٹوں کو خون یا لپ اسٹک کی سُرخی سے تر و تازہ ہی دیکھا اور ان کے مالکان کو
تذکیر و تانیث کی قید کے بغیر صحت مند، پُرکشش اور خوشحال ہی پایا۔ سگریٹ تو دراصل
قوموں کی ترقی اور خوش اقبالی کی علامت ہوتی ہے جبھی تو
مسلمان گھرانوں میں بچپن ہی سے سگریٹ سے دور رہنے کی تلقین کی
جاتی ہے۔ ——— سگریٹ بے چاری پر ایک سنگین الزام یہ بھی ہے کہ یہ گلو کار دل
کے لئے نقصان دہ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سگریٹ نوش حضرات کی آواز میں

جو رعب، بانکپن اور منوز پایا جاتا ہے وہ عورتوں، بچوں اور سگریٹ سے پرہیز کرنے والوں کی آواز میں عنقا ہوتا ہے بہت ممکن ہے یہ شعر بھی کسی سگریٹ نوش معشوق کو دیکھ کر ہی لکھا گیا ہو ؂

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ماضی بعید میں کسی گھٹیا سگریٹ نے کسی عمدہ گلوکار کے گلے پر ستم ڈھایا ہو لیکن یہ سگریٹ سے زیادہ اس گلے کا قصور تھا جو اتنی چھوٹی سی چیز یعنی سگریٹ سے خاموش ہوگیا ورنہ ہم نے تو ہمیشہ ایسے گلے دیکھے جو اس سے کہیں زیادہ بڑی اور زیادہ بدبو دار چیزوں یعنی گندے انڈے، ٹماٹر، چپل جوتے، ہوٹنگ، گالیاں، کسی سے کبھی بھی نہیں گھبرائے۔ چلئے ایک منٹ کے لئے مان بھی لیا جائے کہ گلے اور سگریٹ کی دشمنی ہے تو آپ ہی سچ سچ بتائیے کہ ہمارے ملک میں خوش گلو گلوکاروں اور بے سُرے گائیکوں اور قوالوں کا کیا تناسب ہے؟ اور اگر کسی طرح تمام گویّوں کو زبردستی سگریٹ کی عادت ڈال دی جائے تو کیا اس سے مندرجہ ذیل دو فائدے نہیں ہوں گے؟

۱۔ جب تک سگریٹ جلتی رہے گی گلوکار ہماری اور آپ کی سمع خراشی کی زحمت نہیں اُٹھائے گا۔

۲۔ اگر سگریٹ میں واقعی گلا دبانے یا گلا خراب کرنے کی صلاحیت ہے تو ہم مستقبل میں نہ جانے کتنے بے سُرے تان سینوں کے ستم سے آزاد ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے جو لوگ بغیر سگریٹ کے موسیقی و نغمہ پر زور آزمائی کرتے سگریٹ کے دام میں گرفتار ہونے کے بعد فلسفہ، نفسیات اور تنقید، ہجو گوئی جیسے نسبتاً کم ضرررساں میدانوں میں قسمت آزمائی کرنے لگ جائیں۔

یوں تو جدید طرز کی چولی کے سوائے دنیا میں ہر چیز کا کسی نہ کسی دوسری چیز سے چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے لیکن سگریٹ کے معاملے میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن پر بڑی آسانی سے یہ تہمت لگائی جاسکتی ہے مثلاً ماچس، ایش ٹرے، بیوی کی ناراضگی، سالانہ بجٹ، ماڈرن شاعر وغیرہ۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ سگریٹ جلانے کے لئے کبھی اپنی ماچس استعمال نہیں کرتے اور راستہ چلتے شریفوں کو ٹھہرا کر ان کی ماچس یا جلتی ہوئی سگریٹ سے اپنی سگریٹ اور ان کا خون جلاتے ہیں۔ ان سے وہ لوگ بہتر ہیں جو ماچس ہمیشہ ساتھ لئے گھومتے ہیں۔ سگریٹ البتہ مانگ کر پیتے ہیں۔ ایک اور قسم سگریٹ نوشی کی وہ ہے جس میں صبح تڑکے جب مُرغا سورج کو چونچ میں لینے کے لئے ایک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اسی وقت باورچی خانے کی ماچس سے پہلی سگریٹ جلائی جاتی ہے۔ اور پھر کھڑکی کے پردے کھینچ کر رات کردینے تک ماچس کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا بس چراغ سے چراغ جلتے رہتے ہیں۔

ایش ٹرے کے معنی ہر اس جگہ کے ہوتے ہیں جہاں سگریٹ بجھائی یا چھپائی جاسکے۔ اب چاہے وہ کسی مہمان کا جوتا ہو یا کسی میزبان کے دروازے کی پُشت، دفتر کا واش بیسن ہو یا ہوٹل کی چائے کا کپ۔ اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے کلاس میں ٹیچر کے اچانک چلے آنے پر حفظانِ صحت یعنی HYGIENE کی درسی کتاب میں دھڑا دھڑ جلتی ہوئی سگریٹ کو دم توڑتے دیکھا ہے۔

ہر عورت کو اپنی شادی سے پہلے سگریٹ پیتا ہوا مَرد زیادہ اسمارٹ اور ہینڈسم نظر آتا ہے لیکن شادی کے بعد شوہر کے منہ سے نکلتی ہوئی بدبو اور کھانسی اس کے

سارے ردمان کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ اور وہ باقاعدگی سے اپنی ناراضگی کا اظہار "انکار" کی صورت میں کرنے لگتی ہے اس لئے کہ اس کے خیال میں اگر سگریٹ نوشی سے بیمہ کمپنی کا نقصان اور بیوی کی آیندہ زندگی کو خوش حال بنانا ہی شوہر کا مقصدِ حیات و ممات ہے تو اس کے لئے اتنی آہستہ روی سے کیوں کام لیا جائے، کیا کوئی دوسرا تیز رفتار اور زود اثر طریقہ نہیں ڈھونڈا جا سکتا؟ ایسی جلد باز بیویوں کے ساتھ ہماری تمام ہمدردیاں سہی لیکن ان سے بھی زیادہ ہم (دردی) کی مستحق وہ نیک دل بی بیاں ہیں جو شادی کے بعد سگریٹ کو "سوت" کا درجہ عطا کر دیتی ہیں۔ اور بھول جاتی ہیں کہ آج کل شوہر حضرات سوت کا بکھیڑا کم از کم گھر میں نہیں پالتے

ہمارے ایک بزرگ سے دوست ہیں جن کی صحت اور سگریٹ نوشی کے غیر معمولی حد تک قابلِ رشک ہونے کا یہ عالم ہے کہ وہ پچھلے چالیس سالوں سے اپنے چالیس انچ کے سینے میں روزانہ چالیس سگریٹوں کا گاڑھا گاڑھا دھواں انڈیلتے آئے ہیں۔ لیکن لوگوں کو اس چالیس کے ہندسہ کے پھیر پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، حیرت انھیں اس بات پر ہوتی ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے وہ یہ شغل صرف ایک پھیپھڑے کے سہارے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کسی ریاضی داں نے تو برسوں عرق ریزی کے بعد حساب لگا کر دنیا کو یہ بھی بتا دیا کہ ہر ایک سگریٹ پینے سے انسان کی زندگی پانچ منٹ گھٹ جاتی ہے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حساب سے ہمارے دوست موصوف نے کتنی زندگی گنوا دی اور اب اور کتنی گنوائیں گے ہمیں اگر ریاضی سے رغبت ہوتی تو ہم آپ کو بتاتے کہ بغیر سگریٹوں کے موصوف کی کُل عمر کتنی ہوتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم ریاضی داں نہیں ہوئے اس لئے کہ ایک ریاضی داں کی شناخت یہ ہے کہ اگر وہ دیکھ لے کہ خدانخواستہ آپ کا سر دہکتی ہوئی بھٹی میں رکھا ہوا ہے۔ اور آپ کے پیر انتہائی سرد ریفریجریٹر میں بندھیں تو وہ آنکھ بند کر کے چند سیکنڈ میں حساب لگا کر آپ کو بتا دے گا کہ اوسطاً آپ کی طبعی حالت بہت خوشگوار اور قابلِ رشک ہے۔

ہمارے ملک میں سالانہ بجٹ بناتے وقت ہر وزیر مالیات منہ میں پائپ دبا کر یہی سوچتا ہے کہ امسال سگریٹ کے علاوہ اور کون کون سی چیزوں پر بھاری ٹیکس لگائے۔ پچھلے تیس سالوں میں ہمارے سالانہ بجٹ کی کارفرمائیوں کی وجہ سے نہ جانے کتنی چیزیں NECESSITY (ضرورت) کہلاتے کہلاتے ______ COMFORT (آسائش) کہلانے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے LUXURY (عیاشی) کی حدود میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ پہلے ہر آدمی یہاں تک کہ شاعر بھی عشق کرنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ جب کہ آج عشق کرنا ایک LUXURY ہے جو صرف صاحبِ حیثیت لوگ ہی سہار سکتے ہیں۔ جبھی تو آج کل لڑکیوں کے والدین انھیں ملازمت کے سلسلے میں میونسپل ٹیچر بننے پر زور دیتے ہیں کہ میونسپل اسکولوں میں جو مرد ٹیچر ہوتے ہیں، ان کی تنخواہیں اتنی قلیل ہوتی ہیں کہ وہ لڑکیوں کو عشق کے چکر میں پھنسا کر والدین کی روزی کے لئے خطرہ نہیں بن سکتے۔ لیکن ہماری آپ کی اور سب کی عزیز از جان سگریٹ سالانہ ٹیکسوں کی بیسیوں مار کھانے کے باوجود بیشتر حضرات کی آج بھی اہم ترین ضرورت NECESSITY ہے۔ بلکہ اس پر تو جتنا ٹیکس بڑھتا ہے، لوگ ضد میں آکر اتنی ہی زیادہ سگریٹیں پھونکتے ہیں۔ ادھر پچھلے چند برسوں سے حکومت نے غیر ممالک کی نقل میں سگریٹ کے ہر پیکٹ اور ہر اشتہار

پر یہ لکھوانا شروع کر دیا ہے :۔

"سگریٹ پینے صحت کے لئے مضر ہے"

یہ اشتہار انگیز وارننگ سگریٹ کی فروخت بڑھانے میں زبردست مددگار ثابت ہوئی ہے۔ اگر اس قسم کی وارننگ کو مزید تین چیزوں پر لگا دیا جائے تو نتائج تہلکہ خیز برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ تین چیزیں★ ہیں جن سے دور رہنے کی تلقین گاندھی جی کو ان کی ماں نے اس وقت کی تھی جب وہ ولایت کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔

نئے زمانے کا نوجوان بھی اس وقت تک شراب اور شاعری کو ہاتھ نہیں لگاتا جب تک وہ سگریٹ نوشی کے جملہ رموز سے واقف نہیں ہو جاتا اور اس کی انگلیاں سگریٹ کی گرفت سنبھال سنبھال کر نگار نہیں ہو جاتیں۔ لیکن کبھی کوئی سرپھرا اپنے صاحب دیوان (غیر مطبوعہ) آباد اجداد کے زعم میں بغیر کسی سگریٹ کے سہارے شعر کہنے کی جرأت کر بھی بیٹھتا ہے تو دوسرے شعراء ناک پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "صاحب زادے! پہلے سگریٹ پکڑنا تو سیکھ لو پھر شعر کہنا۔ تمہارے اشعار سے تو ابھی دودھ کی بو آتی ہے"۔ نوجوان شعراء کا سگریٹ سے عشق کا جنون دیکھنے کا اتفاق ابھی چند روز پہلے ہی ہوا جب ایک ہر دلعزیز ادیب کے جنازے میں شرکت کرنا ہوا۔ قبرستان پہونچے تو دیکھا دو عدد بھلے چنگے شاعر ماہِ رمضان اور قبرستان سے بے نیاز سگریٹ پھونکتے ہوئے مرحوم کی ناگہانی موت کا قطعۂ تاریخ نکالنے میں مصروف ہیں۔ یوں تو وہاں ہم نے ایک ادب نواز تاجر اور ایک تجارت پسند ادیب کو امپورٹ IMPORT کے مسائل میں بھی الجھے دیکھا جس سے ہم نے تو یہی سمجھا کہ وہ مرحوم کے ایکسپورٹ EXPORT ہو جانے کا حساب برابر کرنے کی فکر میں ہیں۔

امپورٹیڈ سگریٹ اس سگریٹ کو کہتے ہیں جو غیر قانونی طور پر ملک میں اسمگل کر کے لائی جائے۔ امپورٹڈ سگریٹ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ ذرا مہنگی ہوتی ہے لیکن یہ ہمیشہ بآسانی دستیاب ہو جاتی ہے اور سالانہ بجٹ کے دنوں میں بازار سے غائب نہیں ہو جاتی یعنی یہ ہمیشہ بازار کی شئے رہتی ہے۔ اپنی حیثیت نہیں بھولتی۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ امپورٹڈ سگریٹ، دیسی سگریٹوں سے زیادہ مزہ دار ہوتی ہے، لیکن اس خوش فہمی میں مبتلا لوگوں کو شاید یہ نہیں معلوم کہ کئی غیر ممالک میں لوگ ہندوستانی چارمینار سگریٹ اور ہر قسم کی معمولی ہندوستانی بیڑی اور ہوی کو بالترتیب ہونٹوں اور سینوں سے لگائے رہتے ہیں، اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ یہ بہت کم داموں انھیں مل جاتی ہے اور جی بھر جانے پر ایش ٹرے میں پھینکنے میں پریشانی نہیں ہوتی۔ ورنہ ہم نے تو جب بھی امپورٹڈ سگریٹ پی اس کے بچے ہوئے فلٹر سے بھی دل لگایا اور اسے پھینکنے کی بجائے بچوں کو کھیلنے کے لئے دے دیا۔ سچ پوچھئے تو امپورٹڈ سگریٹ کے فلٹر میں ناقابل برداشت بو، کبھی نہیں پائی جاتی۔ یوں تو امریکہ والے جب تک جانوروں کا

★ گوشت، شراب اور عورت۔

چارہ گیہوں کا لیبل لگا کر بھیجتے رہے، ہمیں اس میں بھی ہمیشہ پنجاب کی لہلہاتی فصلوں اور عورتوں کی بھینی بھینی خوشبو ہی آتی رہی۔

آج کل جوانی کی غلط حرکتوں سے حاصل کئے ہوئے غم کو غلط کرنے کا سب سے مقبول طریقہ سگریٹ کشی یا خودکشی ہے۔ خودکشی گرچہ سگریٹ سے سستی ہوتی ہے۔ لیکن بیمہ کمپنی والے خودکشی کرنے والے کے اعزّہ کو بیمہ کی رقم نہیں دیتے بلکہ ان کے ایجنٹ مرنے والے کے عزیزوں کے پاس جاکر انھیں اپنے نام نئی پالیسی خریدنے اور طبعی موت مرنے کی ترغیب بھی دے ڈالتے ہیں۔ واقعی سگریٹ سے کوئی غم غلط ہوتا ہے یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں معلوم لیکن کم از کم اس سے غم کی نمائش اور تشہیر ضرور ہو جاتی ہے۔ اپنے آفس میں ہم اپنے ساتھی تمنا تارا پوری کو جب بھی مسلسل سگریٹ پہ سگریٹ سلگاتے اور اس سے گرم کی ہوئی آہیں بھرتے دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ آج بس اسٹاپ پر انھیں شربتِ دیدار نصیب نہیں ہوا ہے یا ان کی وہ مخصوص بس چھوٹ گئی ہے جس میں وہ روزانہ کسی کی اُمید میں سفر کرتے ہیں۔ اس روز ہمارا چپراسی ضرور ہمارے کان میں آکر کہے گا "شاب آج تمنا شاب کو پھر کوئی دغا دے گیا۔ ایک کلاک (ایک گھنٹے) میں ہی ایش ٹرے ان کے دل کے ٹکڑوں سے بھر گئیلا ہے"

یوں تو ہماری بیگم بھی ہر مرتبہ میکے جاتے وقت آنکھوں میں اتنے آنسو بھر لاتی ہیں کہ گلیسرین کا شبہ ہوتا ہے۔ ان مشکوک آنسوؤں کے ساتھ وہ یوں گویا ہوتی ہیں "میں جانتی ہوں میں چلی جاؤں گی تو آپ مجھے بھلانے کے لئے خوب سگریٹیں پئیں گے۔ دیکھئے نا، ذرا کم پیجئے گا ورنہ گھر بہت گندہ لگے گا۔ اور اس مہینے بھی آپ مجھے کان کے بُندے نہیں دلا سکیں گے"۔ خیر کان کے بُندوں کا الزام تو ہمیں کبھی بُرا نہیں معلوم ہوا کہ مستورات کے کان بغیر بُندوں کے اور بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن بُرا ہمیں اس وقت لگتا ہے جب گھر میں ایک سے دوسری سگریٹ سلگاتے ہی بیگم کی آواز آتی ہے "کیا آج آفس میں کسی سے لڑ کر آئے ہیں جو غصہ بے چاری سگریٹ پہ اُتار رہے ہیں"؟ اور آفس میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضرور آج گھر میں بیوی سے جنگ ہوئی ہے اور ہم سگریٹوں سے چوٹیں سہلا رہے ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ ع۔

یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ غم بھلانے اور دکھانے کے لئے سگریٹ ایک کم خرچ بالانشین حربہ ہے اور کچھ نہیں تو شراب نوشی سے تو بدرجہا بہتر ہے اس لئے کہ اس میں آدمی رند کا رند رہتا ہے اور اگر جنت کا حقدار ہے تو وہ بھی ہاتھ سے نہیں جاتی جنّت سے ہماری مُراد دنیاوی جنّت ہے کہ لڑکی والوں کو پتہ لگ جائے کہ ہونے والا داماد انگلش میں بی اے ہے اور انگریزی سگریٹ پیتا ہے تو وہ خوشی خوشی رشتہ منظور کر لیتے ہیں لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اردو میں ایم اے، پی ایچ ڈی ہے اور ادب اور شراب سے نشہ کرتا ہے تو فوراً انکار کر دیتے ہیں پھر سگریٹ وہ نشہ ہے جسے کرنے کے لئے حرام و حلال کے قضیہ میں اُلجھنا نہیں پڑتا اور نہ ہی مولوی کے فتویٰ کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔ شاید یہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی تک اس میں الکحل کی آمیزش نہیں کی گئی ہے ورنہ جہاں مولوی کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اس کے آگے الکحل ہی الکحل پھیلا ہوا ہے البتہ ان دونوں کے بیچ جو مختصر سا، نو مینس لینڈ NO MAN'S LAND ہے وہاں سگریٹ کا دھواں اور بیر BEER کا جھاگ اُٹھتا صاف نظر آتا ہے جس طرح ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر دونوں طرف کے فوجی محمد رفیع اور مہدی حسن کے ملے جلے نغمے سنتے رہتے ہیں۔

دِی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ

(گورنمنٹ کمپنی)

تیار کنندگان:

کوالٹی وہائٹ کرسٹل شوگر

کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس

اور بائیلنگ ہاؤز ایکوپمنٹ برائے شوگر فیکٹریز

قائم شدہ :-

۱. بھیم سنگھی شوگر پلانٹ، وشاکھاپٹنم ڈسٹرکٹ

۲. مریال گوڑہ یونٹ آف دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ

۳. سری وینکٹیشور کوآپریٹیو شوگر فیکٹری لمیٹڈ

۴. پرگی یونٹ آف دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ، اننتاپور ڈسٹرکٹ

۵. متیم پیٹ یونٹ آف دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ، مٹ پلی، کریم نگر ڈسٹرکٹ

۶. دی کوورور کوآپریٹیو شوگرس لمیٹڈ، کوورور، نیلور ڈسٹرکٹ

۷. دی ننڈیال کوآپریٹیو شوگرس لمیٹڈ، ننڈیال، کرنول ڈسٹرکٹ

قیام پذیر :-

۱. دی تھنڈاوا کوآپریٹیو شوگرس لمیٹڈ، ٹیونی

۲. دی پالیر کوآپریٹیو شوگرس لمیٹڈ، راجیشوراپورم، کھمم ڈسٹرکٹ

۳. ناگرجونا کوآپریٹیو شوگرس لمیٹڈ، گرزالہ، گنٹور ڈسٹرکٹ

ہیڈ آفس :-

فتح میدان روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴

فونس: ۳۳۴۸۵ (۳ لائینز) اور ۲۲۰۲۷۲

کیبل اور گرامس: "شوگر"

ٹیلیکس: NSFHD (۲۷۸)

دیگر فیکٹریز :-

شکر نگر، نظام آباد ڈسٹرکٹ — مادھو نگر، میدک ڈسٹرکٹ

امرت نگر، مریال گوڑہ، نلگنڈہ ڈسٹرکٹ — پرگی، تعلقہ ہندوپور، اننتاپور ڈسٹرکٹ

متیم پیٹ، تعلقہ مٹ پلی، کریم نگر ڈسٹرکٹ

شوگر مشینری ڈویژن :-

ناگرجوناساگر، نلگنڈہ ڈسٹرکٹ۔

ڈاکٹر سید حامد حسین

دیر سے اُٹھنا

اسکول میں ایک انگریزی کہاوت پڑھی تھی: جو جلدی سوتا اور جلدی اُٹھتا ہے اُس کے دروازے پر صحت مندی، دولت مندی اور عقلمندی
دھرنا دے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے صحت مند اور عقلمند ہیں اور جنھیں دولت مند بننے کی اتنی جلدی نہیں
ہے انھیں اس کہاوت کے ساتھ سعادت مندی کا مقابلہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ ہماری رائے میں دیر سے اُٹھنا ہی صرف
ایسا عیش ہے جس سے ہم جیسے متوسط طبقے کے لوگ جو دوسروں کی عیاشیوں کی فکر میں دُبلے رہتے ہیں اپنی اور پولیس والوں کی اخلاقیات کو
متاثر کیے بغیر لطف اُٹھا سکتے ہیں ـــــ یوں تو اس توقع میں کہ محاورے کے مطابق صحت، دولت اور فراست کی دیویاں راستے میں
گلدستے لئے ہمارا استقبال کرنے کو ملیں گی، ہم نے چند بار صبح کا جانفزا منظر دیکھنے کا جوکھم لیا ہے۔ لیکن ہمیشہ دل تھامے گھر لوٹے ہیں۔ اس
میں شبہ نہیں کہ صبح کی سیر زندگی کا ایک نادر لیکن ساتھ ہی نہایت عبرتناک تجربہ ہے کیوں کہ صبح کے دھندلکے میں مظلوم و مجبور انسانیت
کے ایسے ہیبت ناک مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ زندگی کی مسرتوں کے بارے میں اپنی خود فریبیاں برقرار رکھنے کے لئے یہ بہتر ہے کہ
انسان لحاف میں اپنی صبح گزارے اور صبح کی لطافتوں سے محظوظ ہونے کے لئے کسی شہنشاہِ تخیل قسم کے شاعر کے کلام کی جانب رجوع
کرے۔ تجربہ یہی کہتا ہے کہ جو صحت اور عقل رکھتے ہیں وہ صبح اپنے بستر میں ہی گزارتے ہیں اور جنھیں ان دونوں سے محرومی ہے یا جو
دولت کی پکڑ ہی یا کسی مجبوری کے دام میں ہیں وہ سویرے کی بندگی کرتے ہیں ـــــ صبح کے ناوک کے کیسے کیسے گھائل روز سویرے
دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ ایک بچہ ہے جو اسکول کی بس کا ہارن سن کر بھاگا جا رہا ہے۔ اس کے جسم کے وزن سے زیادہ علم کا وزن اس
کی پیٹھ پر کوبڑ کی طرح کسا ہوا ہے۔ نہ رونے مچلنے کا وقت ہے اور نہ گرم اور بھرپور ممتا کے تکلفات کا موقع۔ بچپن کا سوچیں گے تو بس
نکل جائے گی۔ اور ہاتھ نہ آئے گی۔ اور یہ صورتِ فریاد کون نوجوان ہے جو ہر تیز رو سواری کے پیچھے چند قدم دوڑتا ہے اور پھر
مایوس ہو کر پلٹ آتا ہے۔ شاید اسے کہیں جانا ہے کیوں کہ سفر کے لئے یہ سب سے زیادہ مناسب

وقت ہے۔ یہ روایت زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے کہ لوگ منہ اندھیرے شہر سے باہر نکل جاتے ہیں اور ریلوے لائن پر دو رویہ بیٹھ کر انگریز بہادر کے اُس چمتکار کا انتظار کرتے ہیں جسے عرفِ عام میں ٹرین کہتے ہیں۔ یہ روایت آج بھی قائم ہے اور قوم کو مایوسی سے بچانے کے لئے حکومت نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ساری اہم ٹرینیں اسی وقت گزاری جاتی ہیں۔

اور یہ ہمارے پڑوسی بابو جمنا داس ہیں۔ انگوچھا باندھے دتون کر رہے ہیں۔ ان کی گائے آج کل ورک ٹو رول (WORK TO RULE) پر ہے اور ۵ بج کر ۲۵ منٹ کے بعد دودھ نہیں دیتی۔ آج اُنھوں نے دودھ نکال لیا ہے اور سڑک پر کھڑے اپنی کچے کوئلے کی انگیٹھی کو جلا رہے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ صبح کی ہوا مُردہ سے مُردہ کوئلوں کو دہکا سکتی ہے۔ ادھر ہم انگیٹھی سے برآمد ہونے والے بالائی دار گاڑھے دھوئیں کو اپنے حلق میں کنڈلی مار کر بیٹھ جانے سے روکنے کی جد و جہد میں مصروف ہی ہیں کہ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جسم کے جملہ کھڑکی دروازوں سے گزرتا ہوا گرد و غبار کا ایک ایسا تیموری حملہ ہوا ہے کہ ہمیں اپنے وجود کی تلاش کے لئے اشتہار نکلوانے کی ضرورت پڑے گی چند لمحوں کے بعد جب ہم اپنے آپ کو اس جواں سال بگولے کے بے تکلفانہ معانقے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہمیں اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ہم ہوسٹل کے حدود میں کھڑے ہیں کیوں کہ ایک خاکروب اپنے قد سے لمبی لاٹھی میں جھاڑو کا پرچم بنائے ہوئے دس گز کے دائرے میں سطحِ زمین کو زیر و زبر کر کے اپنی قومی خدمت گزاری کا ثبوت ہم پہونچا رہا ہے۔

صبح کی اس مصفّا اور پاکیزہ فضا میں، اپنے حلق میں دھوئیں کا نمک اور بالوں میں گرد کی افشاں لئے جب ہم باغ پہونچتے ہیں تو وہاں اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے گھبرا کر پرندے اُڑ چکے ہیں اور اس ڈر سے کہ قدموں کی دھمک سے سبزہ زمین کے اندر اپنا سر نہ چھپالے، باغ کے دور اندیش مالی لان پر پانی چھڑکنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ایک کیاری کے اردگرد چند بچے منہ پر انگلی رکھے ایک دوسرے کو چپ رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ انھیں صبح کے منظر پر مضمون لکھنے کو دیا گیا ہے اور وہ اس وقت کلیوں کے چٹکنے کی آواز کے منتظر ہیں جس کا ان کے ماسٹر صاحب اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ سامنے ایک صاحب رضاکارانہ طور پر اپنے جسم کو ایذا پہونچانے کے اس عمل میں مصروف ہیں جسے وہ ورزش کا نام دے کر لطف حاصل کرتے ہیں۔ ایک درخت پر چمگادڑ کا بچہ چلّا کر کہتا ہے: "اماں بھاگو۔ آدمی ادھر آرہا ہے"! کیوں کہ ایک صاحب اپنا سر مادرِ گیتی کی گود میں رکھے آسمان پر قدم رکھنے کے لئے کوئی ٹھوس جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ ایک بزرگوار سر پر ٹوپ لگائے۔ کان اور گردن مفلر سے چھپائے۔ بدن پر سوئیٹر اور اوورکوٹ پہنے، ناک پر دستی رکھے، ننگے پیر شبنم کے قطروں کو تلوؤں میں جذب کرنے میں مصروف ہیں۔

باغ دراصل معذوروں اور مجبوروں کی چوپال ہے۔ یہاں کوئی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوری سے آتا ہے کسی کو دوڑ کے مقابلے میں شرکت کرنا ہے، لہٰذا خیالی کھلاڑی کو پیچھے چھوڑ کر بھاگے چلا جا رہا ہے۔ کسی کو یہ شکوہ ہے کہ اس کا جسم لوہے کا کیوں نہیں، لہٰذا اس خطا پر اُسے زاویے زاویے سے سزا دے رہا ہے۔ کسی کا موٹاپا اُس

کے ڈاکٹر کو پسند نہیں لہذا سیر کے لئے نکل پڑا ہے۔ کسی کا دُبلاپن اس کے معالج کی نظر میں ساری آفات کی جڑ ہے۔ وہ موٹا ہونے باغ آیا ہے۔ کوئی بلڈ پریشر اونچا کرنے کے عزم سے نکلا ہے۔ کوئی بلڈ پریشر نیچا رکھنے کے لئے نظر بچا بچا کر قدم رکھ رہا ہے۔

ہم نے کتابوں میں طلوعِ آفتاب کے جو بیانات دیکھے تھے اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس جنّتی فضا میں لوگ اشعار میں گفتگو کرتے ہوں گے۔ قمریاں اور تتلیاں قہقہے لگاتی ہوں گی۔ کیاریوں کے کنارے کنارے غزل خواں بیٹھے ہوں گے اور روشوں پر قوالیاں ہوتی ہوں گی لیکن یہاں تو منظر ہی دوسرا نکلا۔ لوگ یہاں اپنے اپنے مجرب نسخوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے حسب و نسب پر گفتگو ہوتی ہے۔ اپنے اپنے پرہیز کا ذکر ہوتا ہے۔ کوئی خود پریشان ہے، کوئی دوسرے کے لئے۔ کسی کو اپنی صحت عزیز ہے اور کسی کو اپنے نفاست پسند کتّے کی جسے صبح کی سیر نہ ملنے کے نتیجے میں قبض کا اندیشہ ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ سحر خیزی کی ان برکات و طلسمات کا ذکر اُس دَور کی یادگار ہے جب کہ پانی کے نل، بیت الخلاء، اور ڈبل روٹی کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ انسان نے گھر بنائے تھے لیکن عادتیں خانہ بدوشوں کی تھیں۔ اب بھی بہت سے لوگ گھر اور گھونسلے میں کوئی فرق نہیں کرتے اور بھول جاتے ہیں کہ گھونسلے میں نہ چھت ہوتی ہے اور نہ لحاف۔ صبح کی روشنی میں جب گھونسلہ چلتی پھرتی، اُڑتی تاکتی دنیا کے سامنے ننگا ہو جائے تو چنڈول بیچارا جنگل کی راہ نہ لے تو کیا کرے بعض کہتے ہیں کہ جو چنڈول جلدی اُٹھ آتا ہے اُسے فوراً نرم کیڑے کا چوگا مل جاتا ہے لیکن کیڑے کا حشر فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر اُٹھنے میں اُس نے چنڈول سے سبقت نہ دکھائی ہوتی تو کمبخت مارا نہیں جاتا۔

جلدی اُٹھنے کے بارے میں یہ ساری کہاوتیں اُس زمانے کی داستان سناتی ہیں۔ جب انسان آفتاب کا غلام تھا۔ یہ اُس وقت کی باتیں ہیں جب سورج ہی انسان کے لئے قندیل الاؤ، گھڑی، غرض کہ سب کچھ تھا لیکن آج کیا ہے جو انسان کی چٹکی میں نہیں، وہ چاہے بجلی کا کھٹکا ہو یا گھڑی کی چابی یا ماچس کی سینک۔ آج آدمی کو الارم اُٹھاتا ہے ٹارچ راہ دکھاتی ہے، ہیٹر (HEATER) اُسے گرمی پہونچاتا ہے۔ روزانہ کی زندگی میں سورج، نیوتہ دینے والے نائی کی طرح، بے مصرف ہوگیا ہے۔ وہ عادت سے مجبور ہے لہذا روز نظر آتا ہے لیکن کسی کو اُس کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھنے کی نہ ضرورت پڑی ہے اور نہ فرصت ہے اور اگر وہ کچھ دن چھٹی پہ بھی چلا جائے تو شاید کوئی اس کی اس وقت تک پرواہ نہ کرے جب تک اخبار میں اس کی خبر نہ چھپ جائے۔

جب ہماری تہذیب کا بچپن تھا تو لوگ بچوں کی طرح صبح اٹھا کرتے تھے۔ اب تہذیب ادھیڑ ہوگئی ہے

پہلے دن کی روشنی شام کی پیشانی کے گھنیرے اندھیرے میں اُلجھ کر ختم ہوجاتی تھی۔ اب اندھیرے میں پیشانی کے حدود و سرکتے سرکتے مغز کے اطراف میں جا پہونچے ہیں اور روشنی کے قافلے نے بھی بڑھتے بڑھتے نصف شب پر پڑاؤ ڈالا ہے۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ دستور کے مطابق نصف شب پر تاریخ بدلتی ہے۔ لہذا موقع، دستور، اصول جیسے سارے شریف تقاضے اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم خود کو ان اگلے وقتوں کے لوگوں میں شمار ہونے سے بچائیں جو ایک تاریخ میں سویا کرتے اور دوسرے دن اٹھا کرتے تھے کیوں کہ یہ بیدار قوم کی نشانی نہیں ہے۔

ہوش مند لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مہذب دنیا میں دن غلامی، چاکری اور ہڑتالوں کے لئے ہوتا ہے اور رات مہذب انسان کی اپنی جائداد ہوتی ہے جس میں اُسے بیوی سے جھگڑنے سے افزائش نسل تک اور مشاعرے کی صدارت سے مشکل کشاؤں کی مدارات تک سارے نجی اور قومی فرائض کی ادائیگی کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جناب والا اگر رات سوز گئی تو عقل مٹھی میں اور پیسہ جیب میں۔ صحت ان دولوں کی باندی ہے پیچھے پیچھے اپنے آپ چلی آئے گی۔ اور کہاوت کے ڈر سے اگر موٹی چادر میں منہ لپیٹ کر سو گئے تو خدا کی بات خدا جانے، صنم تو ہیلے بھی نہ دکھائے گا۔
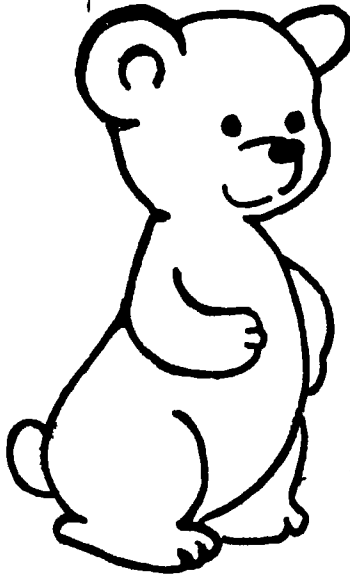
اور ہاں صاحب، شروع رات میں موٹی چادر اور اُسے اگر آپ نے نہیں دبایا تو پھر آپ کو یقیناً اپنا جائیں گے۔ عقلمند وہ ہے جو اپنے کرتا ہے اور بھونکنے والے کتے اور کتنا۔ مچھروں کے آئین میں ہتھیار والوں کے لئے، اکتوبر کے مہینے کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ مچھر ڈیفنس ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وسائل نہایت محدود ہیں بعض

سونے کے لئے چاہیئے بھی بڑی اُدھار لئے مال کی طرح کس کر نان نفقہ سمجھ کر بائی جیک کر لے دشمنوں کا باہوش و حواس مقابلہ وردی والے چوکیدار پر تکیہ نہیں ڈال کر، اپنا پر عمل کر کے سوتا نے میں بھی کسی ریبٹ (REBATE) سے ڈیفنس کا واحد طریقہ سلیف اس دفاع کے لئے انسان کے بے خبر یہ کہتے ہیں کہ انسانی پریشانیوں کا سبب یہ ہے کہ قدرت نے انسان کو عقل دی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انسان کی آدھی اذیتوں کا سبب یہ ہے کہ قدرت نے اُسے دُم عطا نہیں کی۔ بھینس کو انسان پر صرف اس لئے افضلیت حاصل نہیں ہے کہ اس کے دودھ کی مہک سے مٹی تو بھول جائیے۔ پانی بھی سونا بن جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی دُم سے مچھر کو بھی بھگا سکتی ہے اور اس کی جگالی میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ محاورے میں ڈھلتی رات کی بات اکثر سننے میں آتی ہے سمجھ رکھنے والے بتاتے ہیں کہ اس سے مچھروں کے سیلاب کا ڈھلنا مراد ہے کیوں کہ دیکھا گیا ہے کہ ساڑھے تین بجے کے قریب مچھروں کے قوی مضمحل ہونا شروع ہوتے ہیں اور پھر چار پانچ بجے کے قریب اُن کی فوجیں بارکوں میں واپس جانا شروع ہوتی ہیں اور تب ہی وہ لوگ جنھیں خدا نے احساس لطیف سے نوازا ہے۔

دن جسم و جلد کے ساتھ نیند کے خیر مقدم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

دیر سے اُٹھنے میں اس طرح قضا و قدرت، محبوب و محبوب سب کا حسب توفیق حصہ ہے۔ دیر میں اُٹھنے والے کے لئے دن خلاصۂ حالات کا حکم رکھتا ہے۔ نیا دن اُس کے لئے بلا تمہید کے شروع ہوتا ہے۔ اُسے دن کے چڑھنے بڑھنے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اُسے دن جوان اور بھرپور ملتا ہے۔ وہ بیداری کا دروازہ کھولتے ہی کارآمد زندگی کے پلیٹ فارم پر آتا ہے اور اس دنیا میں وہ عزم کی پوری تازگی اور جسم کی پوری چستی کے ساتھ قدم رکھتا ہے۔ اُس کا دن اُن دفعدار دل سے چھوٹا ہوتا ہے جو صبح سے اُٹھ کر دن کی مشقتوں کا انتظار کرنے لگتے ہیں اور ان مشقتوں کے شروع ہوتے ہوتے بے جان ہو چکے ہوتے ہیں۔ اُس پر عملی زندگی کا بخار لرزہ دے کر نہیں چڑھتا۔

دیر سے اُٹھنا۔ بند کمرے، لحاف، بجلی کی روشنی اور الارم گھڑی کی تہذیب کی نعمت ہے۔ وہ عیش بھی ہے عیاشی بھی اور کہنے کو خود فریبی بھی اور تعلّی بھی۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے کبھی کبھی خواب بھی چاہیئے ہوتے ہیں اور خود فریبیاں بھی کیوں کہ زندگی نہ صرف پریڈ گراؤنڈ ہے اور نہ تیرہ کا پہاڑہ۔
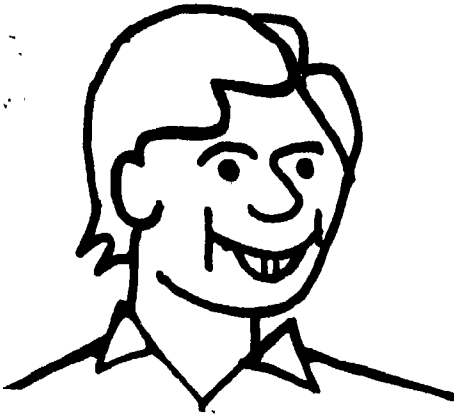
جوہر سیوانی

"پیہم تری جفا کا تقاضا کریں گے ہم"

موقع ملا تو قوم کی سیوا کریں گے ہم
مفلس کی بھی لنگوٹی اتارا کریں گے ہم

دن بھر نماز و روزے کا چرچا کریں گے ہم
شب میں جوا، شراب کا دھندا کریں گے ہم

ہر سال حج کے بعد جو پلٹا کریں گے ہم
ممنوعہ مال ملک میں لایا کریں گے ہم

دُنیا و دین دونوں پہ قبضا کریں گے ہم
اسمگلری میں نام کمایا کریں گے ہم

رہبر جو بن گئے تو سیاست کی آڑ میں
ہر ایک ساہوکار کو لُوٹا کریں گے ہم

پیدل ہیں آج، کل سے، الیکشن کو جیت کر
چمچوں کے ساتھ کار میں گھوما کریں گے ہم

تہذیبِ نو کے فعلِ سیہ کار کی طرف
چشمہ لگا کے طنز کا دیکھا کریں گے ہم

بگڑے ہوئے سماج کی بستی کے قصر میں
اشعار کے دریچے سے جھانکا کریں گے ہم

سُرمہ لگا کے طنز و ظرافت کا رات دن
ہر ایک اندھی عقل کو بینا کریں گے ہم

شاعر ہیں ہم کو ذکرِ سیاست سے کیا غرض
جب بھی کریں گے شعر کا چرچا کریں گے ہم

تخیل کے ہلوں سے مضامین کے بیل سے
بنجر زمینِ شعر کو جوتا کریں گے ہم

فرقت میں اُن کی کیسے کٹے گی شبِ فراق
بیڑی نہیں پئیں گے تو پھر کیا کریں گے ہم

چوری چھپے وہاں جو پہنچتے ہیں شیخ جی
ان کو شراب خانے میں رسوا کریں گے ہم

رشوت پہ منحصر ہے ہمارا یہ ٹھاٹ باٹ
رشوت ہوئی جو بند تو پھر کیا کریں گے ہم

خوراک ہے ہماری وفا کی تری جفا
"پیہم تری جفا کا تقاضا کریں گے ہم"

ڈنڈا وفا کا لے کے محبت کے شہر میں
جوہر جفا کے بھوت کا پیچھا کریں گے ہم

---

۴ - صفدر (امراوتی)

کرسی نامہ

کرسی کے چار پاؤں ہوتے ہیں
مگر یہ چوپایہ نہیں کہلاتی۔ اس لئے کہ چوپایہ جان دار ہوتا ہے اور کرسی بے جان۔

جب اس پر کوئی شخص اپنے دو پاؤں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے تو کرسی میں جان پڑ جاتی ہے اور یوں چھ پاؤں والی ہو کر چوپایوں سے زیادہ حیوان ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ کرسی چوپائے سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ یہ چوپائے سے زیادہ خطرناک اور بے قابو ہوتی ہے۔ یہ چوپائے سے زیادہ دودھ دیتی ہے۔ اگر دودھ دینے والی ہو۔ اور چوپائے سے زیادہ خونخوار ہوتی ہے اگر خون پینے والی ہو۔ دودھ دینے والی کرسیاں گائے بھینس اور بکری کی طرح عام طور سے مانوس، مہربان اور دسترس میں ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے خونخوار کرسیاں عام انسانی معاشرے سے پرے، وحشی اور جنگلی ہوتی ہیں ——— کرسی پر بیٹھ کر آدمی کی چال بدل جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسا ہونا بھی چاہئے کہ آدمی، آدمیت کا کام [illegible] کر چوپایہ ہو جاتا ہے لہٰذا تو اس کا چال بدل جانا نہ غیر فطری ہے نہ غیر متوقع۔ کرسیاں عام جانوروں سے ان معنوں میں مختلف ہوتی ہیں کہ [illegible] پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے کرسیوں کے معاشرے میں صرف دو ہی طبقات ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ اور [illegible]۔ [illegible] نہیں ہوتا کہ اس کا تعلق زمین سے ہوتا ہے ——— درمیانہ طبقے کی کرسیاں تعلیم [illegible] [illegible]۔ تعلیم گاہوں میں کرسیاں [illegible] ہیں [illegible] میں ہوتی ہیں اور [illegible] [illegible] تعلیم گاہوں کا اصل (?) [illegible] ہوتا ہے۔ یہاں سے ہر قوم زندگی کے [illegible]

کھیل کا میدان بھی شامل ہے، بھیجی جاتی ہے، وہ اونگھتے ہوئے تمام کام انجام دیتی ہے۔ اس طرح کام اور کام کرنے والے دونوں اپنے انجام کو پہونچتے ہیں۔ ہسپتالوں میں جو گہری نیند کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس نے اپنا ناطہ شہر خموشاں سے جوڑ رکھا ہے یہاں سے نکل کر اکثر لوگ وہیں پہنچتے ہیں۔ اسی طرح دفتروں میں سارے کام کاج ہونے نہ ہونے کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کرسیاں شہر میں ہوتی ہیں مگر شہریوں کی دسترس سے دور اور قلعہ بند ہوتی ہیں۔ یہ کرسیاں زیادہ آرام دہ ہوتی ہیں۔ جدید طرز کی ان کرسیوں میں درمیانہ طبقے سے امتیاز کے لئے اسپرنگ لگے ہوتے ہیں۔ یہ کرسیاں ضرورت سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ان پر زیادہ دیر آرام ممکن نہیں ہوتا، اچھل کود ہوتی ہے۔ یہ کھیل کچھ وضاحت طلب ہے۔ ضرورت سے زیادہ آرام پاکر کرسیوں پر براجمان لوگ باؤلے ہو کر کودنے لگتے ہیں۔ کرسیوں کے اسپرنگ بھی اسی قوت سے جوابی کارروائی کرتے ہیں اور کرسی نشینوں کو اچھال دیتے ہیں۔ اس اچھل کود میں اکثر کرسیاں بدل جاتی ہیں۔ صحافتی اصطلاح میں اس کھیل کو ' آیا رام ، گیا رام ! ' کہا جاتا ہے۔

اعلیٰ طبقہ کی کرسیاں اور متوسط طبقے کی کرسیوں میں کچھ امتیازی نشانات بھی ہیں۔ متوسط طبقے کی کرسی سے جب کوئی جڑتا ہے تو ہمیشہ کے لئے جڑ کر رہ جاتا ہے۔ وہ کرسی چھوڑنا چاہے بھی تو کرسی اس کو نہیں چھوڑتی۔ بالکل ویسے ہی جیسے دریا میں بہنے والی کمبل کو اس نے چھوڑ دیا تھا مگر کمبل نے اس کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے برخلاف اعلیٰ طبقے کی کرسیاں ، کرسی نشینوں کو 'کِک آؤٹ' کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اخبار بینوں کے لئے یہ دیکھنا دلچسپی کا باعث ہوتا ہے کہ نئے دن کے ساتھ کس کرسی نے کس چوپائے کو دوپائے میں بدل دیا ہے اور اب اس کرسی پر کون اچھل کود کر رہا ہے۔

اعلیٰ طبقے کی کرسیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو انکم ٹیکس ادا کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو انکم ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھید بھاؤ کو پسند نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا ان کرسیوں نے بھی اپنے بھید بھاؤ ختم کر لئے ہیں۔ اس لئے عام انسانوں (جو صرف ٹیکس دیتے ہیں) کے لئے یہ سمجھنا ممکن نہیں رہا کہ انکم ٹیکس دینے والی اور انکم ٹیکس وصول کرنے والی کرسیوں میں کیا فرق ہے۔ دراصل ان کا فرق کچھ یوں مٹ گیا ہے کہ جو انکم ٹیکس دیتے ہیں وہی وصول کرنے والے بھی ہیں۔ یعنی اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔

خداوند عالم نے رات سے دن کو الگ کیا اور سمندر سے خشکی کو ممیّز کیا اور یوں اُن کی پہچان مقرر کی۔ یعنی چیزیں اپنی صحیح شناخت اپنے تضاد سے پیدا کرتی ہیں۔ لہٰذا کرسیوں کو سمجھنے میں اُن لوگوں کا سمجھنا بھی مددگار ہوتا ہے جن کو کرسیاں حاصل نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دو پاؤں کو غنیمت جانتے ہیں اور انہیں پر قائم ہیں۔ یہ لوگ اپنے دو پاؤں لئے چلتے رہتے ہیں۔ کھیتوں کی طرف، کارخانوں کی طرف، بازاروں کی طرف، لہلہاتی کھیتیاں، گھر سے پیسے اور جگمگاتے بازار ان کی ساری تگ و دو کا نشانہ ہوتے ہیں۔ زمین پہ چلتے چلتے ان کے پاؤں گھس گھس جاتے ہیں اور ان کا قد کچھ اور کم ہو جاتا ہے۔ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ شاعر اس قوم کا قد و قامت دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھنے لگتا ہے۔ ؏

زمین ڈھونڈ رہی ہے مزار کے قابل

اور بالآخر زمین مل جاتی ہے اور یہ قوم پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ طبقہ کی چوپایہ کرسی پانو پر نہیں چلتی کہ وہ دو پایہ نہیں ہوتی۔ وہ دونوں پانو اٹھا کر چلتی ہے۔ ان کی مخصوص سواریاں دو ہیں۔ 'موٹر' اور 'منھ کی ٹر'۔ یہ دونوں سواریاں بے تکان دوڑتی ہیں، کرسیوں سے کرسیوں کی طرف۔ یہ لوگ مر کر بھی نہیں مرتے، امر ہو جاتے ہیں اور شہر کے خوبصورت چوراہوں پر بلند کرسیوں پر باون گزے ہو کر سینہ تانے کھڑے رہتے ہیں کہ ———
ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں۔

ہمارا معاشرہ انسانوں کا معاشرہ نہیں، کرسیوں کا معاشرہ ہے۔ انسانوں کا معاشرہ کرسیوں کے پیچھے چھپ کر غائب ہو گیا ہے۔ بلند ایوانوں کی اچھل کود، تعلیم گاہوں کی بے ہوشی، ہسپتالوں کی خاموشی اور دفتروں کی بے حسی دو پانو والے انسانوں کی سخت کوشی پر اس طرح چھائی ہوئی ہیں جیسے درخت پر اکاس بیل۔ نتیجہ یہ ہے کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اسی لئے غالبؔ نے کہا تھا (اور اگر نہیں کہا تھا تو اب ہم کہہ رہے ہیں):

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں کرسیوں سے کہ کرسی گزیدہ ہوں

کتنا اچھا تھا وہ دور جب آدمی اپنے دو پانو پر قائم تھا اور کرسیاں ناموجود تھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کو آدمی کی جون میں واپس لانے کے لئے بلند ایوانوں، تعلیم گاہوں، ہسپتالوں اور دفتروں سے کرسیاں ہٹا دی جائیں؟ ہمارے سماج کو انسانوں کا سماج بنانے کے لئے یہ ضروری ہے اور اس کے لئے ایک تحریک ضروری ہے۔ "کرسی ہٹاؤ تحریک"۔

ہر تحریک کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ 'موٹر' اور 'منھ کی ٹر'! ان دونوں چیزوں پر پہلے ہی سے کرسیاں قابض ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے کسی کرسی پر قبضہ کیا جائے۔ پھر کرسی کی مدد سے تمام کرسیوں پر یلغار کی جائے اور تمام کرسیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔
دوستو! اس عظیم انقلاب کے لئے مجھے ایک بلند ایوانی کرسی کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ ضرور میری مدد کریں گے۔

——

— پہلے "چیر پھاڑ" پھر "چوڑی کے غلام" اس کے بعد "تُو تُو، میں میں" اور اب
پرویز یداللہ مہدی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ
"ٹائیں ٹائیں فش"
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۱۵/- روپے
سرورق: دو رنگی
ناشر: زندہ دلانِ حیدرآباد
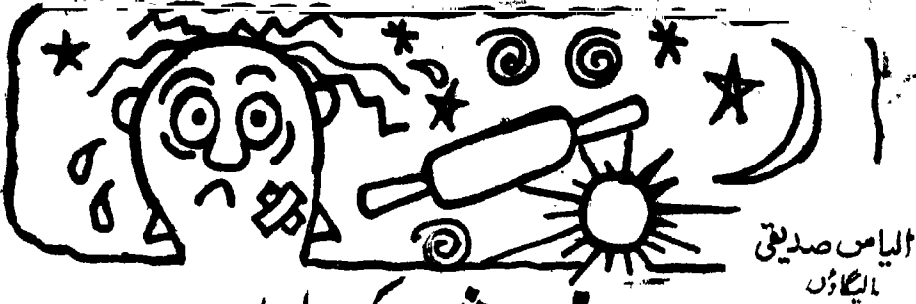
الیاس صدیقی
مالیگاؤں

مجبور شوہر کی یادیں

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

لوٹ کر دفتر سے تیری گالیوں کے ساتھ ساتھ
وہ مرا بیلن سے اکثر مار کھانا یاد ہے

وہ مرا کھانے کے خالی برتنوں کو گھورنا
اُف وہ میری ساس کا تشریف لانا یاد ہے

سر جھکا لینا مرا سُن کر تری فرمائشیں
اور ترا وہ مُنہ پھُلا کر لیٹ جانا یاد ہے

وہ ترا الفاظ کے نشتر چلانا بار بار
اور مرا گھبرا کے گھر سے بھاگ جانا یاد ہے

تیرے ابّا جان کی املاک کے پیشِ نظر
وہ مرا سینا پرونا اور پکارنا یاد ہے

دیکھتے ہی گھر مجھے بیمار پڑ جانا ترا
اور مرا ہولے سے تیرا سر دبانا یاد ہے

صرف اک تنخواہ کے دن میرے استقبال کو
آ کے دروازے پہ تیرا مسکرانا یاد ہے

○

سفر ایک رات کا

— بانو سرتاج
(چندرپور، مہاراشٹرا)

ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ بس یا ریل میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کو اُردو میں سفر اور ہندی میں یاترا، سفر کرنے والے کو مسافر اور یاتری کیوں کہتے ہیں؟ جب کہ انگریزی میں جرنی کی مناسبت سے جرنر نہیں کہتے۔ بلکہ جرنی اور پسنجر کہتے ہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ریلوں کو پسنجر ٹرین، ایکسپریس ٹرین، سپر فاسٹ ٹرین وغیرہ میں کیوں تقسیم کیا گیا ہے جب کہ بنیادی طور پر ہر ٹرین پسنجر ٹرین ہے (اگر وہ گڈس ٹرین نہ ہو۔)

یہ مہمل (؟) خیال ہمارے دماغ میں ایک قطعی نامعقول وقت، قطعی نامعقول سی جگہ میں آیا تھا جب ہم ایک ٹرین کے زنانہ ڈبے میں لیٹرین کے سامنے والی خالی جگہ میں دری بچھائے لیٹے دُنیا کی بے ثباتی اور دنیا والوں کی بے مروتی پر غور کر رہے تھے۔ پہلے کبھی ریزرویشن کے بغیر سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لئے اس راہ کی مشکلات سے واقف نہیں تھے۔ ٹرین میں سوار تو ہو گئے (وہ بھی شامت آئی تو زنانہ ڈبے میں) مگر پھر ایسے پچھتائے ایسے جھلّائے کہ بس! بخدا ہم اتنے ہی بے چین تھے کہ ٹرین سے کود جانے کو جی چاہ رہا تھا۔

ہماری والدہ محترمہ کی ایک عزیز از جان سہیلی صاحبہ کے اکلوتے فرزند حیدرآباد میں اچانک دماغی توازن کھو بیٹھے تھے (حیدرآباد کی فضا کا کوئی قصور نہ تھا) ان نام نہاد خالہ صاحبہ کو سوا ہمارے کوئی نہ سُوجھا بغل میں داب کر آناً فاناً چل دیتیں۔ ایک سیٹ ملی، تو ہم نے بہ کمالِ سعادت وہ خالہ صاحبہ کو عطا کر دی۔ خود اپنے لئے ...لک جائے بھر کی جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے — خدا جھوٹ نہ بلوائے ...خاتون کے ساتھ چار بچے (فیملی پلاننگ مردہ باد) اور پانچ تھیلے (بڑھتی ہوئی ...ائی زندہ باد) فروکش تھے، جو برتھ کے اوپر، برتھ کے نیچے، گلیاری میں غرض کہ ...جگہ موجود تھے۔ ہم نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر ایک خاتون سے عرض کی ...الہ! اگر آپ یہ تھیلا نیچے رکھ دیں تو میرے بیٹھنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

"خالہ کی بچی": وہ غرائیں۔ "تیرے کو دِکھتا نئیں بروبر۔ یہ تھیلا ہے؟ یہ میرا بٹوہ ہے بٹوہ ......"
اُن کی خونخوار آگ برساتی نگاہوں کی طرف دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پہلے ہی شعاعوں نے نکل کر ہماری آنکھوں کو خیرہ کردیا تھا اور ہم ان کے بٹوے کو تھیلا سمجھ بیٹھے تھے۔

کچھ آگے بڑھ کر ایک اور صاحبہ سے جگہ مانگنا ہی چاہتے تھے کہ وہ کلے میں بھرے ہوئے پان کو جلدی جلدی چباتی ہوئی۔ جیسے ہماری ہڈیاں چبارہی ہوں، یوں غرائیں۔ "اُنے اِتی جگہ گھیر کر بیٹھے وہ آپ کو دِکھتا نئیں۔ ہم تو رائے پور سے آرئیے۔ رائے پور سے ناگپور، ناگپور سے حیدرآباد۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے کمراں دُکھ گئے۔ تھوڑا لیٹنا بھی نئیں بولتے آپ۔ آپ کو مُفت آرام ہونا۔ ہم مُفت میں بیٹھے ہیں ......"

ہم نے گھبرا کر اُدھر کا رُخ کیا جدھر اُنھوں نے اشارہ کیا تھا۔ اُن بیگم صاحبہ نے آلتی پالتی مار کر پھیلتے ہوئے بیٹھ کر یوں ہاتھ ہلایا جیسے فقیر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کررہی ہوں ...... اور زیادہ کِرکِری کرانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ اللہ اللہ کی بندیوں میں کوئی اتنی دل والی دِکھتی کہ مانگتے پر جگہ دے دیتی (خود سے سیٹ آفر کرنے والی خاتون تو شاید کسی زنانہ کمپارٹمنٹ میں نہ ملے) ہم نے فلسفیانہ انداز میں سوچا' اس بے ثبات دُنیا میں اپنے آرام کی خاطر دوسروں کو تکلیف نہیں دینی چاہیے اور پھر درویشانہ انداز میں لیٹرین کے سامنے گیلاری میں دری بچھا کر بیٹھ گئے۔ اندیشہ ہو چلا تھا کہ رات بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں کٹ جائے گی اور اس بہانے گیان بھی مل جائے گا۔ کیونکہ سویرے چھ بجے ٹرین حیدرآباد پہنچنے والی تھی۔

ہم نے زندگی کی دوسری سب سے بڑی غلطی (سفر کی تاریخ میں) بھی اُسی روز کی کہ کوئی رسالہ ساتھ نہ رکھا۔ دراصل خالہ صاحبہ نے ٹرین کے وقت سے آدھا گھنٹہ قبل نازل ہوکر وہ طوفان مچایا کہ اپنے مکان و مکان والوں کو تباہی سے بچانے کی خاطر ہم دو ساڑیاں ایک سوٹ کیس میں ڈال اُن کے ساتھ جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوئے۔ اسٹیشن پہنچے تو بُک اسٹال بند ہوچکے تھے۔ اب لیٹرین کے سامنے بیٹھنا پڑا، دروازے کے بار بار کھلنے اور بند ہونے پر وہاں سے آتے بدبو کے جھونکوں نے دماغ کو پراگندہ کرنا شروع کیا تو گیان دھیان کی سب باتیں دھری رہ گئیں۔ خالی دماغ پر شیطان قبضہ نہ کرلے (ہم سیٹ کے لئے جھگڑا نہ شروع کردیں) اس لئے لاکھ صلواتیں اپنے اوپر بھیج ہم نے لیٹ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

کمپارٹمنٹ میں مدھم روشنی چھائی ہوئی تھی۔ ہر مسافر مع اپنے تینوں چاروں کے سوچکی تھی۔ ہم بھی لیٹ گئے اور کچھ ہی دیر بعد ہمیں نیند لگ گئی۔ ہمارے رُخسار ٹرین کے فرش پر تھے اور ہماری پیاری دُلاری ٹرین ہمیں بے مثال نغمے سُنارہی تھی۔ ہم ایک نئے عالم میں پہنچ گئے .... نئے نئے احساسات ہونے لگے ہیں۔

کبھی محسوس ہوتا ہم جھولے میں بیٹھے ہیں۔ ویسا ہی جھولا جیسا ہم نے ناگپور کی صنعتی نمائش میں دیکھا تھا۔ ایک سیدھے تار پر ایک ٹرالی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتی ہے ..... کبھی پہیوں کے چلنے کی آواز واضح ہوجاتی تو کبھی دریائی سفر کا گمان ہوتا۔ ہمیں یہ احساس تقویت بخشنے لگا کہ ہم نور جہاں کی طرف بڑھ رہے ہیں اور حج کو جانے کی ہماری دیرینہ آرزو پوری ہورہی ہے۔ چند لمحوں بعد یہ آواز جھرنے کی کل کل دھُن میں بدل گئی اور ہم اس نغمے سے محظوظ ہونے لگے۔

کچھ ہی دیر گذری تھی کہ ہمیں اپنے مکان میں ہونے کا احساس ہُوا۔ ہمارے مکان کے سامنے والی سڑک کو شدت سے مرمت کی ضرورت محسوس ہورہی تھی اور سڑک کوٹنے کے انجن کی آواز ہمیں صاف سُنائی دے رہی تھی۔ اچانک سڑک کوٹنے کے انجن کی آواز بُل ڈوزر کی کرخت آواز میں بدل گئی اور خواب میں ہمارا ' اپنے مکان کے سامنے پکی سڑک ہونے کا خواب ٹوٹ گیا۔

غرض کہ بڑی پریشانی کی نیند تھی۔ ٹرین کے پہیوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ دماغ میں دھماکے کر رہی تھی۔ کیسا ہی شور کیوں نہ ہو انسان کچھ دیر بعد اُس کا عادی ہو جاتا ہے۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ عین اُس وقت جب ہم اس دھڑک دھوں، چرخ پون اور کھڑ پھڑ کے عادی ہونے لگتے ٹرین یا تو سگنل پر رُک جاتی یا کوئی اسٹیشن آجاتا۔ بمشکل پانچ منٹ آدھا گھنٹہ چین کی نیند لیتے کہ ٹرین پھر چل پڑتی۔

چلتے وقت (ٹرین کے) پہلے طبلے پر تھاپ پڑتی' شہنائی کی بے سُری آواز گونجتی۔ پھر نوسیکھئے کے طبلے پر شہنائی کا بے سُرا ریاض شروع ہو جاتا۔ ایک بار تو پہیئے جانکنی کے عالم میں ایسے سرکے جیسے اُس کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہوں۔ قریب تھا کہ ہم اُٹھ کر زنجیر کھینچ دیتے ٹرین ٹھیک سے چل پڑی (مگر وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی)۔

مختصراً یہ کہ وہ سنگیت جو ہمارے سر کے عین نیچے چل رہا تھا۔ اگر لفظوں میں باندھا جاتا تو کچھ اس طرح ہوتا . . . . .

کھڑاک دھڑ . . . . . . پھڑام . . . . سڑکڑا دھوں

دھڑادھم . . . . . . کھڑا پھڑ . . . . پھڑک دھڑا ٹھوں

پتہ نہیں کتنا وقت گذرا۔ اچانک ہم اللہ کو پیارے ہوگئے۔ لوگ جوق در جوق ہمارے آخری دیدار کو آنے لگے۔ ہم اُن عورتوں کی آوازیں صاف سُن رہے تھے جو ہماری بے وقت موت پر غم کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہمارا جنازہ اُٹھا . . . . . چلا . . . . حیرت تو اس بات پر تھی کہ ہم سب ہواس زندہ تھے . . . . ہچکولے لیتا ہوا ہمارا جنازہ چلا جا رہا تھا . . . . . چلا جا رہا تھا . . . . . قبر میں اُتارنے وغیرہ کا تو ہمیں دھیان نہیں مگر منکر نکیر جب گرز مار مار کر ہمیں جگانے لگے . . . . اُٹھو . . . . اے گنہگار بندی . . . . اُٹھ . . .، تو ہم ہڑبڑا کر جاگ اُٹھے۔ دیکھا' دو خاصی صحت مند خواتین منکر نکیر کی طرح ہمارے سرہانے کھڑی تھیں . . . ہمیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر ایک خاتون بولیں . . . . . .

" آپا . . . . اُٹھو بس جی اب۔ دروازہ گھیر کر پڑ گئے آپ تو حیدرآباد کا اسٹیشن پاس آرہا ہے۔ ایسے کیسے سوتے ماں؟ . . . جیسے مر گئے . . . . عورتاں . . . مار آدھا گھنٹہ سے گڑ بڑ کر رئیں، اِن کو ہوش نئیں . . . . "

* *

زندگی کی حسین حقیقتیں — افسانوں کے روپ میں

انجم نجمی کے افسانوں کا مجموعہ "اَن چھوئے سپنے" (زیر طبع)

ناشر: شگوفہ پبلی کیشنز حیدرآباد۔

غزلیں

ڈاکٹر افضل افسوس

جب سُنا میکدے میں ڈرم آ گئے — رکھ کے محراب میں ہم چلم آ گئے
زلفِ گیتی کے "پیچاں" تو نکلے نہیں — ہاں کمر ہی میں "لوگاں" کے خم آ گئے
مُنہ چھپائے پھرے کیوں نہ پھر شاعری — سب کے ہاتھوں میں کاغذ قلم آ گئے
اُگتی دیکھی نہ ہریالی اُس جا کبھی — آپ کے جس جگہ پر قدم آ گئے
جانتے ہیں سیاست بُری چیز ہے — صرف کُرسی کے چکّر میں ہم آ گئے
فاصلہ ہم نے قائم رکھا تھا مگر — خود سرکتے سرکتے صنم آ گئے
عمر بھر جو کسی کے بھی ہو نہ سکے — ان کے جھانسے میں افسوس ہم آ گئے

○

محبوب عالم غنچوی

اے شوخ جو تو اِتنا ڈیسنٹ نہیں ہوتا — میں بھی ترے فادر کا سرونٹ نہیں ہوتا
یہ کیسا مسلماں ہے، قوّالی تو سُنتا ہے — اور واعظ کی محفل میں پریزنٹ نہیں ہوتا
رشوت بھی نہیں دیتے اور اُس پہ یہ کہتے ہیں — کیوں کام مرا کوئی ارجنٹ نہیں ہوتا
دِن رات کا رونا ہی پوتّے کا مقدّر ہے — کمبخت گھڑی بھر کو سائلنٹ نہیں ہوتا
بیگم کو شکایت ہے ہر ماہ بجٹ میں کیوں — میرے ہی لیے رَتّی بھر سینٹ نہیں ہوتا
میکے تجھے جانے میں کچھ دیر نہیں لگتی — اور لَوٹ کے آنا کیوں ارجنٹ نہیں ہوتا
پابندیٔ مے نوشی یہ عرصے سے قائم ہوں — میخانے سے اک شب بھی ایبسنٹ نہیں ہوتا
آجاؤ، چلے آؤ، بس جاؤ دھڑلّے سے — اس خانۂ دل کا تو کچھ رینٹ نہیں ہوتا

○

[illegible]

جسے سب لوگ اَن پڑھ، ناسمجھ، جاہل سمجھتے ہیں — سیاست میں تو ایسے شخص کو قابل سمجھتے ہیں
ہماری لائف تو خانہ بدوشوں کی سی ہے یارو! — "جہاں ٹھہرے سفینہ ہم وہیں ساحل سمجھتے ہیں"
یہ لمبے بال، پچکے گال، سوکھے ہونٹ، دُبلا پن — ترا حُلیہ ہی ایسا ہے کہ سب سائل سمجھتے ہیں
سمجھ میں کس کی آئے گی تری یہ بیور انگریزی — ترا لہجہ بھی ایسا ہے کہ سب ٹامل سمجھتے ہیں
ترے لب ناگپوری سنگترے کی قاش جیسے ہیں
ترے رخسار کو کشمیر کا آپل سمجھتے ہیں

ایم، اے، حنّان

مجھے حیرت ہوں کہ دنیا۰۰۰۰!

ہمارے ٹرافک کے قوانین کی سختی سے پابندی کرنے اور دوسروں کے ان ہی اصولوں کی صریح خلاف ورزی کی پاداش میں پیش آئے حادثہ کی وجہ سے کئی برس تک عالم فانی اور عالم بالا کے درمیان معلق رہنے کے بعد ایک مبارک دن ہم نے آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیوں کہ ان کے بقول ہم کو ہوش میں آنے کے فوری بعد اس دنیا سے پردہ فرما لینا چاہیئے تھا۔ لیکن جب ہم نے پردہ کر لینے کے بجائے تازہ اخبار اور چائے کا مطالبہ کر دیا تو وہ ششدر رہ گئے۔

ان کی یہ حیرانی اس وقت مزید استعجاب میں بدل گئی جب ہم نے اس چائے نوشی اور اخبار بینی کے شغل کو نہ صرف ایک طویل عرصہ تک جاری رکھا بلکہ ایک دن اپنے رشتہ داروں اور احباب کو شرف ملاقات بخشنے کا فیصلہ کر لیا۔

چنانچہ ہمارے اس اٹل ارادہ کے پیش نظر ڈاکٹروں نے ہمیں یہ مخلصانہ مشورہ دیا کہ فی الحال ہم نئے نوٹوں کی طرح شفاف ... کرانے ڈاکٹر غلیپ، دواخانہ میں تقسیم کئے جانے والے سیبوں کی طرح سرخ نرس شانتی دیوی، اور دودھ اور انڈوں کے کثرت استعمال کی جیتی جاگتی تصویر اسٹنڈنٹ بھاسکر ہی کو اپنا قرابت دار سمجھیں۔ کیوں کہ عرصہ سے ہمارے اصل رشتہ داروں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

یہ سن کر ہم نے خود اُن سے بہ نفس نفیس جا کر بازپرس کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس نیک ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی تو تقریباً سارا دن اسی کوشش میں گزر گیا۔ کیوں کہ دیگر اعضاء و جوارح نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا تھا۔ یہ فطری افعال کے برعکس عمل پیرا ہو گئے تھے۔ اُن کی ہیئت بھی کافی بدل گئی تھی۔ ہمارا چہرہ جو بے ہوشی سے قبل کتابی کہلاتا تھا اب الفریڈ ہچکاک کے ناول کی طرح ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ جس مقام پر پہلے کلائی ہوا کرتی تھی اب وہاں ہتھیلیوں جیسی شے نظر آ رہی تھی۔ ہتھیلیوں کی جگہ کلائی کا شبہ ہوتا تھا۔ اُن کی حرکات و سکنات کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی سی جنبش کے لئے بھی

ہمیں خاص پلاننگ کرنی پڑتی اور ایک مخصوص ٹکنیک کو بروئے کار لانا پڑتا۔

بھلا ہو ان ڈاکٹروں کا جنھوں نے اپنی شبانہ روز کوششوں، جدید آلات جراحی اور قسم قسم کی ورزشوں کے ذریعے ہمارے ہاتھ اور پیر کی معمول کی حرکات کو کچھ اضافہ کے ساتھ بحال کر دیا۔ یعنی اس میں رعشہ کا اضافہ ہوگیا تھا۔ چند دن بعد ہم موسم کی حدت سے بے نیاز کپکپاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

محبوبہ دلنواز کی طرح لہراتی بل کھاتی ہوئی سڑکیں اور اُن پر موجود گڑھے جوں کے توں موجود تھے البتہ اس میں کچھ کشادگی کے آثار ہویدا تھے۔ جیسے زلفیں شانے پر پریشان ہوگئی ہوں۔ قطار در قطار بے شمار خوبصورت گھروں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اب بجلیاں نشیمن پر نہیں گرتیں بلکہ نشیمن خود ہی بجلیاں گرانے لگے ہیں۔ شہر ایسے آباد و شاد تھا کہ گویا محمد قلی کی دُعا ؎

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

مقبول ہو چکی ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کا اتنا اژدحام تھا کہ اس سے قبل ایسا مجمع صرف جلسے جلوس، حادثہ یا لڑائی جھگڑے وغیرہ کے موقع پر اکٹھا ہوا کرتا تھا۔ لوگوں کے رہن سہن اور طرز لباس میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی۔ اگرچہ کہ بعض وضعدار شخصیتیں قدیم وضع کی پوشاک بلکہ وہی بوسیدہ پوشاک کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ خاص کر نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لباس میں کافی چھینا جھپٹی ہو چکی تھی۔ مثلاً پہلے لڑکیاں باتیں مردانہ کیا کرتی تھیں لیکن لباس زنانہ ہی پہنتی تھیں۔ لیکن اب باتیں زنانہ ہی تھیں، لیکن لباس مردانہ ہوگیا تھا۔ یہ بُشرٹ پتلون پہننے کے علاوہ ان شرٹ بھی کرنے لگی تھیں۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے مَردوں کو لنگی پہننے کے حق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اُن کے تیور تو یہ بتاتے تھے کہ اب وہ مَردوں کو شرٹ اور شلوار پہنا کر ہی دم لیں گی۔ چنانچہ مکمل سیٹ کی تکمیل کے لئے اُنہوں نے اپنی چوڑیاں بھی اُتار کر کسی مناسب وقت کے لئے محفوظ رکھ دی تھیں۔

ادھر نوجوان جو عام طور پر لڑکیوں کے پیچھے رہنے کے عادی ہیں اس معاملے میں کافی آگے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ ایک نوجوان نے اپنے بُشرٹ پر جیبوں کی ایک شاندار فصل اُگا لی تھی۔ حالانکہ ساری جیبیں خالی ہی تھیں۔ ایک مجازی شہزادہ سلیم نے اپنے نصف دھڑ کو زنجیروں میں کس لیا تھا۔ تو دوسرے روشن خیال نے جدّت پسندی سے کام لیتے ہوئے بٹنوں کی جگہ جوتوں کی ڈوریاں باندھ لی تھیں۔ ایک صاحب کے بشرٹ پر سبزہ کی اس قدر بہتات تھی کہ آوارہ جانور اکثر اُن پر منہ مارتے رہتے۔ ایک بھینس کو تو آپ کا نصف آستین تناول فرمانے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔

لوگوں کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کچھ کہنے کی فرصت تھی نہ سُننے کی۔ الغرض ڈیڑھ دو گھنٹے تک کسی شریف آدمی سے ربط پیدا نہ ہو سکا تب ہم اپنی تمام تر نقاہت کو یکجا کر کے ایک بس پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ بس کا صرف ڈیزائین نیا تھا۔ باقی تمام باتیں پرانی ہی تھیں۔ یعنی وہی مُسافرین کو آرام کم اور اذیت زیادہ پہنچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ نشستیں کم تھیں اور کھڑے رہنے کے لئے ایک وسیع احاطہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تازہ ہوا کا انتظام مسافرین کے انگریزی اردو اور تلگو اخبارات سے مربوط تھا۔ کہیں کہیں بس کی ٹین کے ٹکڑوں کی مدد سے داغدوزی کی گئی تھی۔ اِس قسم کی بس کو

نہ جانے کیا سوچ کر شاندار پینٹ کیا گیا تھا۔ جو بس سے زیادہ مسافروں کے لباس کی رونق بڑھا رہا تھا۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر کا رابطہ ایک عدد رسّی سے قائم تھا، جس پر متعدد گانٹھیں پڑی ہوئی تھیں۔ جو بار بار کھل کھل جاتی تھیں۔ جس مسافر کو اُترنا ہوتا وہ کھلی ہوئی رسّی کو گانٹھ دے کر رُکنے کی گھنٹی بجاتا۔

مسافرین کا رویہ اپنے ہمسفروں کے تئیں شریفانہ ہی نہیں بلکہ بے حد والہانہ تھا۔ چنانچہ ایک صاحب حیرت انگیز طور پر پانچ چھ خواتین کو خود سپردگی کے انداز میں گھورے جا رہے تھے۔ چند نوجوان، چند شادی شدہ عورتوں اور اُن کے بچوں کا محاصرہ کیئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب تو اتنے بدذوق واقع ہوئے تھے کہ وہ پاس ہی ٹھہری ایک نازک اندام حسینہ کے ہاتھ کو بس کا ڈنڈا سمجھ کر بار بار تھامنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو دوسرے چچا ٹائپ اپنے پیر میں ایک عدد چپل پہنے رہنے کے باوجود ایک اور زنانی چپل پہننے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ دلآویز مناظر دیکھ کر ہم نے فوراً کھلی ہوئی رسّی کو گانٹھ دے کر رُکنے کی گھنٹی بجائی اور اپنے گھر سے قریب ایک مقام پر اُتر گئے۔

لوگوں کا رہن سہن کچھ عجیب وغریب ہوگیا تھا اُن کے طرزِ گفتگو میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ بچّے ماں کو "مَم" باپ کو "ڈیڈ" اور دوستوں کو "ہائے ہائے" کرتے نظر آئے۔ حالانکہ اس سے قبل "مَم" گلے کی ایک بیماری کا نام تھا۔ مُردہ شخص کو "ڈیڈ" کہا جاتا تھا۔ اور سخت تکلیف کے عالم میں لوگ ہائے ہائے کرتے تھے۔

بداخلاقی سے پیش آنے اور بدکلامی کرنے کو لوگ اپنائیت اور بے تکلفی سمجھ رہے تھے۔ اس طرح پہلے طلبہ کا کھانے کے علاوہ کچھ اور (یعنی پان وغیرہ) کھانا بے حد معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور سگریٹ پینے والے کو تو لوگ عاق کر دیتے تھے۔ لیکن آج کل پان اور بیڑی کا ذکر ہی کیا طالبِ علم بیئر اور برانڈی نوش جان کر رہے تھے۔ بعض نہایت قلیل عمر میں ترقی کر کے وہسکی اور جانی واکر تک پہونچ گئے تھے۔ نتیجتاً طالب علم اُستاد سے گھبرانے کے بجائے اساتذہ طالب علموں سے خوفزدہ تھے۔

روپیہ کمانا زندگی کا واحد مقصد ہوگیا تھا۔ چنانچہ اسی نیک مقصد کے تحت ایک صاحب نے اپنی پوری فیملی کو مشرق وسطیٰ روانہ کر دیا تھا۔ اور خود بسترِ علالت پر بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے۔ ان کربناک لمحات میں اُن کے گرد بچوں کے بجائے اُن کے بھیجے ہوئے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر، کلر ٹی وی، گرائنڈر وغیرہ تھے۔ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک اور صاحب اپنا ذاتی مکان کرایہ پر اٹھا دیا تھا۔ اور خود ایک سسرالی رشتہ دار کے یہاں منتقل ہوگئے تھے۔ مکان کی دیواروں پر نصب شدہ ہورڈنگس کا کرایہ بھی وصول فرما رہے تھے تھیلیاں کرایہ پر دیدی تھیں اور اب اپنے بُشرٹ اور پتلون پر کسی کمپنی کا اشتہار چھپواں کرنے کے سلسلہ میں پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہے تھے۔

ٹکنیکل تعلیم کی اتنی قدر ہوگئی تھی کہ جامعات میں سیٹ کے لیئے اونچی بولی لگائی جا رہی تھی۔ اور لوگ

صنف نازک کے جذبات و احساسات کا خیال کیئے بغیر ٹکنیکل ڈگری کے حامل بھینگے اور کانے کو بھی اپنی دامادی میں لینے کو بے چین و بیقرار تھے۔ رشوت خور کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوگیا تھا اور رشوت نہ لینے والے کو لوگ نرا جاہل اور بے وقوف سمجھ رہے تھے۔ اس طرح بے حیائی اور بے راہ روی سے اجتناب کرنے والے کو "بیک ورڈ" اور "پسماندہ" کے القاب سے نوازا جارہا تھا۔ اشیاء کی قیمتیں نہ صرف آسمان سے باتیں کر رہی تھیں بلکہ فلک سے بغلگیر ہوگئی تھیں۔

اخلاق و آداب، تہذیب و شائستگی، محبت و مروّت، رحم دلی و نیک نامی اور دیگر صفات عالیہ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

یہ دیکھ کر ہمیں اچانک چکّر سا آگیا راہروؤں نے قریبی پولیس اسٹیشن پہونچا دیا۔ اور پولس والوں نے جھر سے شریک دواخانہ کردیا۔ ●●

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں!

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/-	روپے
نقطہ	یوسف ناظم	مضامین	۶/-	〃
البتہ	〃	〃	۱۰/-	〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸/-	〃
دھرگھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-	〃
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	〃
بالآخر	〃	مضامین	۱۴/-	〃
سنی سنائی	لئیق صلاح	〃	۱۵/-	〃
رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	〃	۱۵/-	〃
خواہ مخواہ	رشید الدین	〃	۱۰/-	〃
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	〃	۱۰/-	〃
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	〃	۱۴/-	〃
غبارۂ خاطر	رؤف خوشتر	〃	۱۲/-	〃

"محلہ میرا، تیرا، اُن کا"

سید احمد خان
(نئی دہلی)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ اور اسی اچھے ہندوستان کے ایک کونے میں ہماری کالونی ہے۔ ہم وہیں سے بول رہے ہیں۔ سن ۱۹ سو فلاں فلاں میں اس کا جنم ہوا اور غریب کی اولاد کی طرح اپنے آپ پلنے بڑھنے کے لئے چھوڑ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں قدم رکھا اور اپنے اندر وہ تمام بیماریاں سمیٹ لیں جو اس طرح کے بلا وجہ کے بوڑھوں میں پائی جاتی ہیں۔ آیئے آج آپ کو اسی کالونی کی سیر کرانے کے لئے لے چلتے ہیں مگر دیکھئے ذرا سنبھل کر چلئے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جگہ جگہ کھلے ہوئے مین ہولوں میں سے کسی ایک میں گڑپ ہو جائیں اور پھر ہمیں آپ کو نکال کر دوبارہ جوڑنا پڑے ویسے یہاں کے باشندوں نے میونسپلٹی والوں سے کئی بار مین ہول بند کرنے کی درخواست کی لیکن وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ یہ انسانیت کے خلاف ہے کیوں کہ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی مردہ یا برسوں سے گم شدہ آپ کا بچہ جب اس میں سے آپ کا پتہ پوچھتے ہوئے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اسے بڑی دقت ہوگی ——— یہاں کی سڑکیں بالکل حسینہ کی انگڑائی کی طرح ہیں جو پوری ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس پر چلتے ہوئے اگر آپ کی نظر لمحہ بھر کے لئے بھی کہیں بھٹکی تو یہ یقینی ہے کہ آپ یا سامنے سے آتے ہوئے کسی بے لگام اسکوٹر یا بے قابو موٹر سائیکل سے ٹکرا کر بیکا بولی ہو جائیں گے ——— ایک بار جب اتفاق بھائی اپنے دو [illegible] منوں کے ساتھ اپنی سڑکوں پہ صبح کی سیر کے لئے نکلے تو ان کی بیگم نے پردے سے جھانک کر کہا ——— اجی سنتے ہو، واپسی میں آدھا

گوشت مزور لیتے آنا۔"

"کس کا — ؟ منے کا یا پپو کا"۔ — اشفاق بھائی نے بڑی سنجیدگی سے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

یہاں پر سڑکوں کی تین قسمیں ہیں — تارکول۔ کھرنجے اور کیچڑ کی۔ جن میں کیچڑ کی سڑکوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور تارکول کی بالکل نہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سڑکوں پر کھیلنے کی عادت بہت پرانی ہے۔ اس دن رام سرن جی کیچڑ والی سڑک پر سے ایک روتے بلکتے بالک کو اٹھا کر اپنے گھر لے آئے اور بیوی سے بولے۔

"ارے رام پیاری! ذرا دیکھنا تو۔ یہ کس کا بالک ہے۔ باہر کیچڑ میں لت پت پڑا ہوا رو رہا تھا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلوا دو"۔ پھر محلے والوں کو کوسنے لگے۔ "نہ جانے کیسے ماں باپ ہیں پیدا کر کے بھول جاتے ہیں"۔

"اجی محلے والوں کو کیوں کوستے ہو، یہ تو اپنا گڈو ہے"۔ رام پیاری نے گڈو کا منہ دھلوا کر ساڑی کے آنچل سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

انہی سڑکوں کے دونوں طرف کھانے پینے کے ہوٹل کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں یہاں آکر آپ کو پتہ لگے گا کہ سڑے گوشت کا اچھا قورمہ، چونہ ملے آٹے کی بہترین تندوری روٹی اور کنکر ملے چاول سے عمدہ بریانی کیسے تیار کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب ہماری بیوی مائیکے گئی ہوئی تھی تو ہم بھی انہی ہوٹلوں میں کھانا کھانے پہونچ گئے۔ ایک ٹوٹی بنچ پر بیٹھنے سے پہلے ہم نے بھائی اخلاص سے میز پر پڑے ایک کالے کمبل کو ہٹانے کے لئے کہا۔ جوان کے ہاتھ ہلاتے ہی بھنبھناتی مکھیوں میں تبدیل ہو گیا۔ گندگی کا یہ عالم دیکھ کر ہم بغیر کھائے ہی اٹھ گئے۔ اور دوسرے ہوٹل میں جانے کی ٹھان لی۔ وہاں پر کچھ صفائی تھی۔ جیسے ہی ہم ایک بنچ پر بیٹھے تو ایک آدھ ننگے بیرے نے المونیم کے ایک گلاس میں پانی لاکر ہمارے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"کیا لاؤں صاب — قورمہ، بریانی یا بھنا"۔

"ابے! پہلے یہ پانی بدل"۔

"کیوں — ؟" بیرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں کی اولاد۔ تو نے اس میں اپنی گندی انگلیاں جو ڈبو رکھی تھیں"۔

"ابے او نکوا! جلدی سے صاب کے لئے ایک گلاس پانی بغیر انگلی کا" — وہیں سے دوسرے لونڈے کو آواز لگا کر ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور ہم سے پوچھا — "اور کیا لاؤں صاب؟"

"ایک ہاف قورمہ اور چار روٹی" — ہم نے گھبرا کر کہا۔

اس نے قورمہ والی تام چینی کی پلیٹ جیسے ہی میری ٹیبل پر رکھی ویسے ہی ایک مکھی ہوا میں قلابازی کھا کر اس میں غوطہ زن ہو گئی اور جلدی سے سطح قورمہ پر ابھر کر تیرنے لگی۔ بس اب ہمارا غصہ آؤٹ ہو گیا۔ "ابے او ......"

(ایک عام بول چال والی مردانی گالی) " دیکھا یہ کیا ہے ۔؟"

اس نے پلیٹ پر ایک نظر ڈالی اور بڑے پیار سے کہا — "کچھ بھی ہو صاحب! لیکن یہ تیرتی ہوئی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے ۔"

یہی اول جلول کھانے سے یہاں کے باشندوں کا ہاضمہ بھی لکڑ ہضم پتھر ہضم ہو گیا ہے اور جب ہاضمہ ٹھیک ہے تو جسم کو کوئی روگ کیسے لگنے لگا ۔ یہی دیکھ سن کر سرکار عرف میونسپلٹی والوں نے یہاں پر کسی اسپتال یا شاپنگ سنٹر کھولنے کی زحمت نہیں اٹھائی لیکن سرکار نے جگہ جگہ بلا وجہ پارک ضرور بنوا دیئے ہیں، جہاں پر بکرے بکریاں، جوا کھیلتے بچے، اور کوڑے کے ڈھیر پائے جاتے ہیں ۔ میونسپلٹی والے پارکوں میں لگے ان کوڑے کے ڈھیروں کو شاید اس لئے نہیں اٹھاتے کہ کہیں ان میں رہنے والے مچھر مکھیاں بے گھر بار نہ ہو جائیں ۔ ویسے ان مچھر مکھیوں کی بیشتر تعداد آج کل اس کالونی کے کوارٹروں میں بھی رہتی ہے جس کی وجہ سے ان میں رہنے والے لوگ اکثر پارکوں اور سڑکوں پر نظر آتے ہیں

ہماری کالونی میں دو قسم کی مخلوق شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے پولیس اور میونسپلٹی کے صفائی کرمچاری ۔ پولیس کی آمد و رفت یہاں اس لئے ممنوع ہے کہ یہاں پر جگہ جگہ جوّا اور شراب پی کر غل غپاڑہ ہوتا رہتا ہے اور پولیس کے آنے سے اس میں خلل پیدا ہوتا ہے ۔

مگر اس دن جب ہم نے پولیس والوں کی پوری ایک بٹالین کو کالونی میں سرگرم عمل پایا تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ چلو سرکار کے کسی محکمے کو تو ہمارا خیال آیا ۔ لہٰذا ہم اظہار شکریہ ادا کرنے کی خاطر ہم انسپکٹر صاحب کی طرف بڑھے اور ان سے کہا "بھائی انسپکٹر صاحب! بڑی مہربانی ہے آپ کی ۔ جو اس کالونی پر نظر کرم کی ۔"

وہی نکلے

سہارن پور میں ایک عیدن نامی طوائف تھی ۔ بڑی با ذوق، سخن فہم اور سلیقہ شعار ۔ شہر کے اکثر ذی علم اور معززین اس کے یہاں جایا کرتے تھے ۔ ایک دن مولانا فیض الحسن سہارنپوری بھی جا پہونچے ۔ وہ پرانے زمانے کی عورت نئی تہذیب سے ناآشنا تھی ۔ وہ نہایت سادگی سے چرخہ کات رہی تھی ۔ مولانا سے اس حالت میں دیکھتے ہی لوٹ گئے ۔ اس نے آواز دی "مولانا! آیئے، تشریف لایئے واپس کیوں چلے گئے ؟"

مولانا یہ فرما کر چل دیئے "ایسی تو اپنے گھر بھی چھوڑ آئے ہیں ۔"

" ابھی کہاں ۔" انہوں نے ہنس کر کہا ۔ "وہ تو کمشنر صاحب کا دیسی کتا کھو گیا ہے ۔" اور وہ سپاہیوں کو کچھ ہدایت دینے لگے ۔

اسی طرح میونسپلٹی کے صفائی کرمچاری ہیں ۔ جو آتے ہیں محلے کا کوڑا اٹھانے کے لئے لیکن اکثر اپنے ساتھ لایا ہوا دوسرے محلوں کا کوڑا بھی یہیں بھول جاتے ہیں ۔

بجلی والوں نے بھی کالونی میں بجلی سپلائی کرنے کے لئے بابا آدم کے زمانے کا ایک ٹرانسفارمر ضرور لگوا رکھا ہے مگر صاحب بجلی کا یہ عالم ہے کہ آتی کم ہے جاتی زیادہ ہے ۔ اور جو کبھی بھولے بسرے آبھی جاتی ہے تو بالکل اس نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتی شرماتی کہ ہاتھ لگایا، اور روٹھ گئی ۔

بجلی سے کرچاری اکثر یہاں میٹر ریڈنگ کرنے اندھیرے میں آتے ہیں اور اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لئے اس کابل اس کو اور اس کابل اس کو دے کر چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کالونی کے رہنے والوں کی ان بجلی والوں سے دست بستہ گذارش ہے کہ اب جب بھی وہ یہاں آئیں تو اپنے ساتھ ایک ایک ٹارچ ضرور لیتے آئیں۔ ویسے اس اندھیرے کا فائدہ مسجد میں نماز پڑھنے کے بہانے جانے والے اُچکّے خوب اُٹھاتے ہیں۔ اپنی پھٹی پُرانی چپلوں کی جگہ دوسرے کی نئی چپلیں پہن آتے ہیں۔

اب چلتے چلتے دو باتیں یہاں کے رہنے والوں کے بارے میں بھی ہوجائیں۔ یہاں کے رہنے والوں کے محبوب مشغلے کبوتر بازی اور گالی گلوچ ہے موسیقی کے بڑے رسیا ہیں یہاں کے رہنے والے یہی وجہ ہے کہ یہاں پر صبح چھ بجے سے لے کر رات کو تیسرے اور کبھی کبھی چوتھے پہر تک ریڈیو، ٹرانسسٹروں، ٹیپ ریکارڈوں اور لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ محمد رفیع لتا منگیشکر، غلام صابری قوال وغیرہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اور پورے کالونی والوں کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کئے رکھتے ہیں۔

اگر آپ ان سب باتوں کو جان کر ہماری کالونی میں آنا چاہیں تو یہاں پہونچنے کا بہت آسان سا طریقہ ہے۔ آپ پٹیل نگر کے بڑے چوراہے پر کھڑے ہوکر زور سے سانس کھینچیے اور جس طرف سے بھی آپ کو بدبو کا بھبکا سا آتا ہوا محسوس ہو آنکھ بند کر کے اس طرف چل دیجئے۔ مگر دیکھئے اپنے ساتھ سرکاری کارکنوں کو یہاں مت لایئے گا ورنہ بے چاروں کو یہ سب دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوگی۔ اور پھر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہاں پانی بھی نہیں آتا لہٰذا ان بیچاروں کو چلّو بھر پانی بھی نصیب نہ ہوگا ڈوبنے کے لئے۔

* *

اُردو میں نصابی کتب کی معاونت کرنے اور تعلیم کو عصری بنانے کا
پہلا کامیاب تجربہ

آؤ اُردو سیکھیں اول تا ہفتم

URDU WORK BOOK

از ابوالفہیم وحید علی خان

انگریزی کی WORK BOOK کے نہج پر ایسی مشقی کتاب جس میں مروجہ نصابی کتب کے متن کو سوالوں اور مشقوں کے ذریعہ
بڑھایا گیا ہے اور ہر سبق کی مشق کرنے کے لئے مناسب سادہ مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اب ان مشقی کاپیوں کی مدد سے
[illegible]
[illegible]
اہم ضرورت ہے یعنی اردو سیکھنے کی عام فہم اور آسان مشقی بیاض ہے۔

کوثر ایجنسی چھتہ بازار حیدرآباد اے پی

برق آشیانوی

ایشین گیمس اور ٹی. وی

ایشین گیمس کے شروع ہوتے ہی بازار سے ٹی. وی سیٹس ایسے غایب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ گدھے اور سینگ کے تعلق سے محاورہ کچھ عجیب سا لگتا ہے کیونکہ گدھے کے سر پہ سینگ ہی نہیں ہوتے جو غائب ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وہ جانور جس کے سر پر سینگ نہیں ہوتے گدھا ہوتا ہے۔ ویسے اس نوع کی تمام مخلوق میں یہ خصوصیت مشترک ہے لیکن جہاں تک غایب ہونے کی بات ہے وہ صرف گدھے تک محدود ہے۔ اس محاورے کو گدھے کے سر تھوپ کر انسانوں نے اپنے سر کو سلامت رکھ لیا ہے
ایشین گیمس کا امتیازی نشان گدھا نہیں "ہاتھی" صرف ہاتھی ہے۔ لیکن جہاں تک قدر مشترک کا سوال ہے ہاتھی کے سر پر بھی سینگ نہیں ہوتے۔ البتہ ہاتھی کے دانت مشہور ہیں جو دکھانے کے الگ ہوتے ہیں اور کھانے کے الگ۔ چنانچہ ایشین گیمس میں جس ہاتھی کو "نشانہ" بنایا گیا ہے اس کے دکھانے کے دانت تو نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے دانت نظر نہیں آتے۔ کھانے کے دانت خود ہاتھی کے کھانے کے کام آتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹی. وی سیٹس جو اب تک ہاتھی کے دکھانے کے دانتوں کی طرح دوکانوں پر سجے سجائے نظر آتے تھے۔ ایشین گیمس کے شروع ہوتے ہی کھانے کے دانتوں کی طرح نظروں سے غایب ہو گئے اور سامنے شو روم میں واجبی قیمت پر فروخت ہونے کے بجائے پیچھے کے دروازوں سے انتہائی نا واجبی قیمتوں پر فروخت ہونے لگے۔ لیکن شائقین نے سمجھا

نہیں چھوڑا اور پیچھے کے دروازوں سے بھی زیادہ قیمت دے کر خریدنے لگے۔

جہاں کئی خواتین ٹی۔وی کی اس وجہ سے مخالف تھیں کہ نہ صرف بچے ٹی۔وی میں محو ہو کر اسٹڈیز سے غفلت برتتے ہیں بلکہ شوہروں سے بھی یہ اندیشہ تھا کہ وہ ٹی۔وی میں گم ہو کر "بیوی" سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ لیکن ایشین گیمس کا آغاز ہوتے ہی ایسی تمام خواتین کی رائے بدل گئی اور ٹی۔وی کا تقاضہ شوہروں سے اس حد تک کرنے لگ گئیں کہ بیچاروں کو "ٹی۔وی" اور "بیوی" دونوں سے وحشت سی ہونے لگی۔ کیونکہ ان دونوں میں اتنی صوتیاتی ہم آہنگی ہے کہ کوئی ٹی۔وی کہتا ہے تو "بیوی" سنائی دیتا ہے۔

ایک صاحب ٹی۔وی خریدنے گئے۔ قیمت ادا کرنے کے بعد دوکان دار دو چند قیمت وصول کر کے اصلی قیمت کی رسید بنانے لگا تو نام دریافت کیا۔ خریدار صاحب نے کہا۔ "شریمتی۔۔۔" وہ آگے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ دوکان دار نے کہا۔ "جناب میں آپ کا نام دریافت کر رہا ہوں۔" خریدار صاحب نے کہا۔ "مسٹر یہ ٹی۔وی۔ میں اپنی بیوی کے نام سے خرید رہا ہوں کیونکہ بیوی نے کہا ہے کہ ٹی۔وی اُن کے نام سے خریدا جائے تاکہ ایشین گیمس کے ختم ہوتے ہی فروخت کر دینے میں انھیں آسانی ہو۔ اس کے بعد نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یعنی نہ ٹی۔وی رہے اور نہ ہم بیوی سے بے نیاز ہو جائیں۔" دوکاندار نے کہا۔ "صاحب یہ ٹی۔وی کی دوکان میں نے بھی اپنی بیوی کے نام سے کھول رکھی ہے۔ لیکن میرے اور آپ کے مقاصد الگ الگ ہیں۔"

یہاں تک تو ہم نے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کیا۔ اب تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرنا چاہتے ہیں تو پھر ایک پریشانی کا سامنا ہو گیا ہے۔ کیونکہ "تصویر کے دو رُخ" کا محاورہ بھی "گدھے کے سر سے سینگ" کی طرح عجیب و غریب ہے۔ اس محاورے کی صداقت کو جانچنے کے لئے ہم نے ایک مرتبہ ایک تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا چاہا تو وہ رُخ گنجے کے سر کی طرح صاف سپاٹ نظر آیا۔ وہاں کوئی تصویر نہ سہی کم از کم کچھ داغ دھبے ہی نظر آ جاتے تو ہم اس کو ماڈرن آرٹ کا کوئی ایسا نمونہ تصور کر لیتے جس کو کسی نمائش میں پہلا انعام دیا جا سکتا۔ اُس دن سے ہم نے تصویر کا دوسرا پہلو یا دوسرا زاویہ کہنا شروع کر دیا ہے کیونکہ اس طرح ایک ہی تصویر میں ایک زاویے سے ایک نقش نظر آتا ہے تو دوسرے زاویے سے دوسرا۔ معلوم نہیں ہمارے "نظریۂ زاویہ" کو زبان کے ٹھیکے دار تسلیم کریں گے یا نہیں یا پھر "مرغ کی ایک ٹانگ" کی طرح اڑے رہیں گے۔ لیجیے پھر ایک محاورہ ایک نئی پریشانی کا باعث بن گیا۔ کیونکہ مرغ کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن ایک ٹانگ اتنی مشہور ہو گئی ہے کہ دوسری ٹانگ کا ذکر تک نہیں آتا۔

بات تصویر کے دوسرے رُخ کی ہو رہی تھی۔ وہ یہ کہ بعض گھروں میں بیوی، ٹی۔وی کی مخالف تھیں اور شوہر مرغ کی ایک ٹانگ کی طرح بہ ضد تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بیوی کو اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ ٹی۔وی آ جائے گا تو جیسے گھر میں سوکن آ جائے گی اور شوہر اس میں نئی بلکہ نوجوان بیوی کی طرح دلچسپی لیں گے بلکہ اس حد تک کھو جائیں گے کہ پرانی بیوی کی طرح موجودہ بیوی کو فراموش کر دیں گے۔ چنانچہ ایک صاحب کے پاس اُن کے ایک دوست آئے اور کہنے لگے کہ اگر آپ کو ٹی۔وی کی ضرورت ہو تو میں فراہم کر دیتا ہوں جو نہایت خوش وضع بلکہ خوبصورت ہے۔ بیوی نے ٹی۔وی کو غالباً بیوی سُنا اور اندر سے شوہر کو

آواز دی کہ ذرا اندر آیئے۔ جب شوہر اندر آئے تو بیوی نے دریافت کیا کہ میری موجودگی میں یہ کون سی نئی اور خوبصورت بیوی کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ شوہر نے لاکھ سمجھایا کہ بیوی نہیں بلکہ ٹی۔ وی کا ذکر تھا۔ لیکن بیوی نے شوہر کی بات کو سچ نہیں جانا کیونکہ شوہروں کی باتوں پر یقین نہ کرنا، اکثر بیویوں کی سرشت میں داخل ہے۔ چنانچہ وہ یہی کہتی رہیں کہ میں نے صاف طور سے سن لیا ہے کہ ایک خوبصورت بیوی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ چنانچہ بیوی نے شوہر کو پھر باہر جانے نہ دیا اور اُن کے دوست کو بچے کے ذریعہ کہلوا دیا کہ وہ فوراً چلے جائیں اگر پھر ادھر کا رخ کیا تو اُن کی بیوی کو خبر کر دی جائے گی کہ وہ شادی شدہ مردوں کو نئی اور خوبصورت بیویاں فراہم کرنے کا دھندہ کر رہے ہیں۔ یہ سن کر بے چارے دوست سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کے بجائے زمین پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے کیونکہ انتہائی کوشش کے باوجود اپنے پاؤں کو سر پر رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

بہرحال ایشین گیمس کا آغاز ہوتے ہی ہر گھر میں ٹی وی نظر آنے لگا جس کے نتیجے میں کچھ دلچسپ واقعات پیش آئے۔ کئی ملازمین سرکار نے بیماری کے صداقت نامے حاصل کرکے پندرہ یا بیس روز کی رخصتیں لے لیں۔ جس کے نتیجے میں ٹی۔ وی کی قیمتوں کے ساتھ بیماری کے صداقت ناموں کی فیس میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ بعض ملازمین نے اپنے مرحوم بزرگوں کو دوبارہ مار کر آفسوں سے رخصت لے لی۔ اور بعض نے تو زندہ بزرگوں کو مارنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ ایک صاحب نے اپنی پہلی بیوی کی موت کی اطلاع دے کر رخصت لینی چاہی لیکن مرحوم بیوی کا نام لکھتے وقت بھول کر زندہ بیوی کا نام لکھ دیا جس پر موجودہ بیوی کی نظر پڑ گئی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایک شادی شدہ جوڑے نے آپس میں مصالحت کرکے بیوی نے شوہر کی موت کی اطلاع دے کر رخصت لی اور شوہر نے بیوی کی موت کا سانحہ درج کرکے رخصت حاصل کر لی اور دونوں ہنسی خوشی ٹی۔ وی پر ایشین گیمس دیکھتے رہے۔ ایک نوجوان نے چار مرتبہ اپنی والدہ کے انتقال پر ملال کی بنیاد پر چار چار دن کی رخصت لے کر پورے ایشین گیمس دیکھ لئے۔ عہدہ دار نے جب چوتھی مرتبہ والدہ کے انتقال کی درخواست پر حیران ہو کر پوچھا کہ کیا آپ کی والدہ چوتھی مرتبہ انتقال فرما رہی ہیں تو نوجوان نے کہا جی نہیں حضور خاکسار کے والد بزرگوار شرع کے سخت پابند تھے اس لئے انہوں نے شرع کے مطابق چار شادیاں کی تھیں۔ تین والداؤں کا تو ایشین گیمس کے ہولناک مناظر دیکھتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوا۔ البتہ چوتھی والدہ ٹی۔ وی سیٹ کے خراب ہو جانے کے باعث گیمس نہ دیکھنے کے صدمے کو برداشت نہ کر سکیں اور دوسرا ٹی۔ وی آنے تک اُن کی روح پرواز کر چکی تھی۔ عہدہ دار نے رخصت منظور کرکے کہا۔ برخوردار میں نے بھی آج ہیڈ آفس کو چار دن کی رخصت کی درخواست اپنے مرحوم والد صاحب کی دوبارہ موت کی اطلاع دے کر بھیج دی ہے تاکہ کم از کم آخری چار دن کے ایشین گیمس گھر پر بیٹھ کر دیکھ سکوں۔ ویسے اب تک تو آفس میں ٹی۔ وی رکھ کر دیکھتا رہا ہوں لیکن ان آخری چار دنوں میں ہاکی کا فائنل بھی ہونے والا ہے جس کو گھر پر بیٹھ کر سکون کے ساتھ دیکھ سکوں گا۔

اب جبکہ ایشین گیمس کا اختتام ہو گیا ہے۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ ٹی۔ وی اور بیوی کا مسئلہ کن مراحل میں داخل ہوتا ہے۔

ابھی ہم ایشین گیمس اور ٹی۔وی کی بات ختم نہیں کر پائے تھے کہ انتخابات اور نیا سال ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہم سے ملاقات کے لئے آ گئے۔ چنانچہ ہم پہلے نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ عرض کیا ہے۔ ؎

پھر دیش میں سو کھا ہے نیا سال مبارک
ہر آدمی بھوکا ہے نیا سال مبارک

دنیا میں صرف ایک نیا سال آتا ہے لیکن ہندوستان میں تین نئے سال آتے ہیں اور سابق حکومت حیدرآباد میں تو چار نئے سال آتے تھے۔ اُس حکومت کے خاتمہ کے ساتھ اس کا نیا سال بھی ختم ہو گیا۔ اس مرحوم نئے سال کا نام فصلی سال تھا اور اس کا آغاز ماہ آذر سے ہوتا تھا۔ اس طرح اب صرف تین نئے سال رہ گئے ہیں۔ جن دو نئے سالوں پر خوشیاں منائی جاتی ہیں اُن میں ایک دیسی نیا سال ہے اور ایک بدیسی نیا سال۔ دیسی نئے سال پر خوشیاں کہاں منائی جاتی ہیں یہ نظر نہیں آتا۔ البتہ بدیسی نیا سال آتا ہے تو پورے ملک میں بڑے اور چھوٹے ہر پیمانہ پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ پس تحقیق ثابت ہوا کہ ہمارے سر پر بدیسی نئے سال کا بھوت انگلش میڈیم کے بھوت کی طرح اب بھی سوار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الف لیلیٰ کے ایک کردار "تسمہ پا" کی حیثیت رکھتے ہیں جو سر پر بُری طرح سوار ہیں۔ الف لیلیٰ کی کہانی میں صرف ایک تسمہ پا تھا۔ ہمارے دیس کے سر پر دو "تسمہ پا" سوار ہیں۔ فرق یہ ہے کہ الف لیلیٰ کا "تسمہ پا" عذابِ جان بن گیا تھا لیکن ہمارے سر پر دو "تسمہ پا" کو ہم نے ہنسی خوشی اپنی گردن پر سوار کر لیا ہے۔

اس مرتبہ نئے سال کے ساتھ نئے انتخابات کے آجانے سے ہماری خوشیوں میں دوہرا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ سب سے پہلے ہمارے مکان کی دیواروں پر خوشنما تصویریں اور خوبصورت تحریریں نظر آنے لگی ہیں۔ یہ تصویریں اور تحریریں دو رنگی ہیں اس لئے کہ ایک پارٹی کا رنگ سُرخ ہے تو دوسری پارٹی کا رنگ نیلا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ پارٹیاں اپنے اپنے رنگوں پر قائم رہیں گی۔ انتخابات کے ختم ہوتے ہی گرگٹ کی طرح یہ پارٹیاں کئی رنگ بدلیں گی۔ اس لحاظ سے اگر ہر پارٹی کے اپنے مخصوص رنگ کے ساتھ ایک گرگٹ کی تصویر بھی اُتار دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ چنانچہ ہم تمام سیاسی پارٹیوں کو اس مسئلہ پر بغیر چائے پانی کے دعوت فکر دیتے ہیں۔ اِدھر دیواریں رنگی گئیں اور اُدھر شہر کے ہر محلے اور ہر محلے کی ہر گلی میں جلسے جلوس، باجے اور ریکارڈنگ کی گہما گہمی شروع ہو گئی ہے علاوہ ازیں ہر کوچہ روشنی سے جگمگا اُٹھا ہے۔ نیا سال اور انتخابات ایک ساتھ آئے ہیں تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کسی نوجوان کی، محبت کی شادی اس کی سالگرہ کے دن ہو رہی ہے۔ اس طرح سالگرہ اور شادی کی خوشیاں مل کر دوہری ہو گئی ہیں۔ گویا آئندہ سے اس کی شادی کی سالگرہ اور پیدائش کی سالگرہ اسی طرح مل کر آیا کریں گی جس طرح اس سال انتخابات اور نیا سال ایک ساتھ آئے ہیں۔ چونکہ یہ "لَو میرج" ہے اس لئے اس کی شادی کی سالگرہ سے قبل یعنی ایک سال سے قبل بلکہ بعض حالات میں تو ایک مہینہ یا پھر ایک ہفتہ ہی میں "لَو میرج" میں سے "لَو" ختم ہو جاتی ہے اور صرف "میرج" باقی رہ جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ شادی کی خوشی بھی ختم ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس قلیل مدت میں دونوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور لَو میرج کے نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ دونوں کو بغیر عینک کے صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ ہم نے میرج کر کے بڑی

غلطی کی۔ اگر میرج کو نکال کر صرف Love کو باقی رکھتے تو وہ ویسا ہوتی اور آج کل کی کہانیوں کے ہیرو اور ہیروئین کی طرح شادی کسی اور کے ساتھ ہو جاتی تب بھی Love تو باقی رہتی۔ کیونکہ لَو تنہا کبھی نہیں مرتی البتہ اس کو شادی کا زہر دے دیا جائے تو وہ گھُل گھُل کر جلد یا بہ دیر مرجاتی ہے۔

بہرحال نیا سال اور انتخابات مل کر آئے ہیں تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ "لو میرج" (love Marriage) ہے کیونکہ اب پھر پانچ سال تک انتخابات نہیں آئیں گے (بعض صورتوں میں پانچ سال کے بعد بھی انتخابات نہیں آتے) اور نیا سال ہر سال آتا ہے۔

اس لحاظ سے ہم نئے سال کو Love کہہ سکتے ہیں اور انتخابات کو Marriage۔ اس لئے کہ نئے سال کی خوشیاں Love کی طرح بہت جلد ختم ہو جائیں گی اور انتخابات کے نتائج کو شادی کے نتائج کی طرح ایک طویل مدت تک بھگتنا پڑے گا۔

**

ممتاز مزاح نگار

خواجہ عبدالغفور

کی شخصیت اور فن پر

چراغ

کی خصوصی پیش کش

* تین سو صفحات پر پھیلا یہ شمارہ ہند و پاک کے کئی اہم اہلِ قلم کے مضامین سے مزین ہوگا

* بہت سی نادر و نایاب تصاویر سے آراستہ

اگست ۸۳ء تک متوقع

رابطہ:- چراغ - محب بک ڈپو - پوسٹ بکس نمبر 13016 - بمبئی - 400 003

غزلیں

یوسف یکتا

زندگی جلتے گھر کا بانسہ ہے
سونا سمجھے تھے یہ تو کانسہ ہے

کس مپرسی کا دیکھئے عالم
اپنے کندھوں پہ اپنا لاشہ ہے

کون ناچے گا ایسی شادی میں
بیانڈ باجہ ہے اور نہ تاشہ ہے

کوئی دل گیر ہے کوئی مسرور
زندگی کا عجب تماشہ ہے

تھام سکتا ہوں اب بھی بارہ جام
گرچہ ہاتھوں میں میرے رعشہ ہے

لنگڑی لولی ہے اور کانی بھی
تونے یکتا یہ کس کو پھانسہ ہے

○

ان پڑھ جہانگیری

دیس میں ہر طرف گرانی ہے — رہبروں کی یہ مہربانی ہے
پھر مریدوں میں شادمانی ہے — کیونکہ مرشد کا عقدِ ثانی ہے
وہ ہیں میکے میں اور یہاں میری — صبح دلکش ہے شب سہانی ہے
دل نہیں صرف ایک پر مائل — اک نئی ہے تو اک پرانی ہے
بن بیاہی ہیں لڑکیاں لاکھوں — گھوڑے جوڑے کی مہربانی ہے
جان دیتا ہوں اس لئے تم پر — ایک دن جان میری جانی ہے
ایک فرلانگ چل نہیں سکتے — نوجوانوں کی کیا جوانی ہے
دودھ میں مینڈکیں بھی پلتی ہیں — ڈیری والوں کی مہربانی ہے
کار میں پھر رہے ہیں مولانا — یہ تو چندے کی مہربانی ہے
مطمئن ہوں نماز میں اب کے — میری چپل بہت پرانی ہے
کچھ تو سامانِ آخرت کر لو — ایک دن جان اپنی جانی ہے
یہ فسادات آئے دن ان پڑھ — دورِ جمہور کی نشانی ہے

بیلن نظام آبادی

دنداں شکن جواب ہیں میری صدی کے لوگ
ذنگل کی اک کتاب ہیں میری صدی کے لوگ

گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں روز روز
ٹیکنی کلر شراب ہیں میری صدی کے لوگ

ڈسکو نقیبہ لیتے ہیں خیرات میں جہیز
کیا صاحبِ عذاب ہیں میری صدی کے لوگ

حاجت نہیں ہے ووٹوں کی ایسے ہیں باکمال
آپ اپنا انتخاب ہیں میری صدی کے لوگ

چندے جو ماہتاب ہیں اُن پہ فدا ہیں سب
چندے وہ آفتاب ہیں میری صدی کے لوگ

ہر چہرے پہ کھنچی ہے بناوٹ کی اک نقاب
اُڑتا ہوا خضاب ہیں میری صدی کے لوگ

کھائیں گے جب تو لقمے بھی گن گن کے کھائیں گے
پینے میں بے حساب ہیں میری صدی کے لوگ

خنجر نہ اُٹھ سکے گا تو بیلن اُٹھائیں گے
ہر لمحہ انقلاب ہیں میری صدی کے لوگ

○

مجیب الرحمٰن بزمی

جیب میں موٹی رقم ہو تو غزل ہوتی ہے
پیٹ کا درد بھی کم ہو تو غزل ہوتی ہے

مرغ و بریانی سے اے دوست نہیں کچھ ہوتا
ہاتھ میں ساغرِ جم ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف اک چولہا جلانے سے غزل کیا ہوگی
آنکھ دھوئیں سے بھی نم ہو تو غزل ہوتی ہے

یہ حقیقت ہے نہیں اسمیں تصنع بزمی
کوئی رسوائی نہ غم ہو تو غزل ہوتی ہے

کنہیالال کپور مرحوم

بی کانگرس کا انتقال

خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والی میں

اخلاقی طور پر تو اُس کی موت ۱۹۴۷ء میں ہی ہوگئی تھی۔ جب اُس نے مہاتما گاندھی کا یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ اب اُسے سیاست سے کنارہ کشی کر لینی چاہیے۔ اگر وہ یہ مشورہ مان لیتی، زندۂ جاوید ہو جاتی۔ مگر افسوس اُس کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اور اُس نے گاندھی جی کی بات یہ کہہ کر رد کر دی۔ دولت کی طرح گھر آئی ہوئی حکومت کو ٹھکرایا نہیں جاتا۔

بی کانگریس کو جوانی میں چرخہ کاتنے کا شوق تھا۔ وہ سفید کھدر کا لباس پہنتی تھی۔ آئے دن قید و بند کی سختیاں جھیلنا اُس کا پسندیدہ شغل تھا۔ اکثر وہ ظالم اور جابر حکمرانوں کے بارے میں کہا کرتی تھی ؎

اُنھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق کہ دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

اُس وقت اُسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ سرفروش تھی ضمیر فروش نہ تھی۔ جب ملک آزاد ہوا تو اُس کی عمر باسٹھ سال تھی۔ حالانکہ وہ بوڑھی نظر آتی تھی۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کہتی تھی۔ ابھی مجھ میں کئی دم ہے۔ میں حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر مسٹر چرچل کی اس پیش گوئی کو غلط ثابت کروں گی کہ ہندوستانی کبھی اچھے حاکم ثابت نہیں ہو سکتے۔ شروع شروع میں اُس نے عوام سے کہا۔ "تم مجھے اپنا خون اور پسینہ دو۔ اپنے آنسو دو۔ میں تمہیں خوشحالی اور فارغ البالی دوں گی۔" عوام نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب عوام کی حالت بد سے بدتر ہوگئی اور اُنھوں نے شکایت کی۔ خوشحالی ہم سے کوسوں دور ہے۔ بی کانگرس نے فرمایا۔ مجھے مہلت دو۔ صرف دس برس انتظار کرو۔ میں ملک کی کایا پلٹ دوں گی۔" دس سال کے بعد عوام نے پھر شکوہ کیا۔ ہماری حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اُنھیں بتایا گیا۔ "دس سال کی مہلت قلیل ثابت ہوئی ہے۔ مجھے دس سال اور مہلت دو۔ میں غریبی کا خاتمہ کر دوں گی۔"

نامور مزاح نگار کنہیالال کپور شگوفہ کے سالنامہ کیلئے پابندی سے مضمون لکھا کرتے تھے۔ — یہ مضمون اُنھوں نے آندھرا اور کرناٹک کے انتخابات کے بعد عالمِ بالا سے نہیں بھجوایا بلکہ اپنی زندگی میں کانگریس کی شکستوں اور ان کے حشر کی یہ داستان قلمبند کر چکے تھے۔

عوام نے بخوشی اُس کی یہ تجویز مان لی اور اُس دن کا انتظار کرنے لگے۔ جب انہیں غریبی سے نجات ملے گی۔ اس مہلت کے ختم ہونے کے بعد اُنہوں نے کہا کہ "تم نے غریبی کا خاتمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن غریبوں کو ہی ختم کر دیا۔ اُنہیں مطلع کیا گیا۔ "تم نے یہ محاورہ سُنا ہوگا۔ نہ رہے گا بانس نہ باجے گی بانسری۔ جب غریب نہیں رہیں گے۔ غریبی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ بہرحال اگر تم ختم ہونا پسند نہیں کرتے۔ مجھے مزید دس سال کی مہلت دو۔" عوام نے بادل نخواستہ اپنی رضامندی دیدی لیکن اس دس سال کے عرصے میں اُن کی حالت بدترین ہو گئی اور وہ محسوس کرنے لگے۔ اُردو شاعری کے معشوق کی طرح ہی کانگرس کے وعدوں کا کوئی بھروسہ نہیں اور جب انھوں نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی بے اختیار یہ شعر اُن کی زبان پر آ گیا ؎

نگاہیں منتظر ہیں کب ہو جائے کرن پھوٹے مگر یہ رات تو کچھ اور کالی ہوتی جاتی ہے۔

ادھر بھی کانگرس کی حکومت کا کچھ ایسا نشہ چڑھا کہ وہ عوام کے ساتھ بڑی بے رُخی اور بے اعتنائی کے ساتھ پیش آنے لگی۔ نہ صرف یہ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُنہیں لوٹنا بھی شروع کر دیا۔ بات بات پر وہ عوام سے کہنے لگی۔ میں نے گذشتہ زمانہ میں ملک کی خدمت کی تھی۔ میں

قوم کی خاطر جیل گئی تھی۔ اب مگر میں اپنی قربانیوں کا معاوضہ وصول کر رہی ہوں۔ تو یہ نہ صرف مناسب ہے بلکہ جائز بھی ہے۔ شروع میں وہ صرف ایک مرض میں مبتلا تھی جس کا نام وعدہ فراموشی یا وعدہ خلافی تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد متعدد امراض میں مبتلا ہوگئی۔ جن میں خود غرضی۔ رشوت خوری کنبہ پروری۔ دوست نوازی۔ ہٹ دھرمی اور ہیکڑی جیسے مہلک روگ شامل تھے۔ یہ سب اُسے گھن کی طرح کھانے لگے وہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ لیکن اُس کے چاپلوس اور حواری اُسے ہمیشہ یہ کہہ کر گمراہ کرتے رہے۔ آئینہ لے کے تو دیکھو ابھی بگڑا کیا ہے۔

وہ جب اُن سے پوچھتی۔ ”اگر میں تندرست ہوں تو میرا چہرہ زرد اور بے رونق کیوں ہے۔ میری آنکھوں سے چمک کیوں غائب ہوگئی ہے مجھے اونچا کیوں سُنائی دیتا ہے۔ مجھے سانس لینے میں تکلیف کیوں ہوتی ہے“۔ اُسے بتایا جاتا۔ یہ سب صحت کی علامات ہیں۔ ان سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچھ اور عرصے کے بعد بی کانگرس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ نہ اُٹھ سکتی تھی نہ چل سکتی تھی۔ نہ اُسے کھانا ہضم ہوتا نہ نیند آتی۔ اُس نے اپنے چاپلوسوں سے کہا۔ خدا کے لئے کوئی تدبیر کرو۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ ہم کبھی تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ کیونکہ تمہاری موت دراصل ہماری موت ثابت ہوگی۔ ہم جینا ہی گذھ۔ لکھنؤ اور شملہ کے تجربہ کار حکیموں سے تمہارا علاج کرائیں گے چنانچہ ان حکیموں کو اکٹھا کیا گیا۔ اُنھوں نے اتفاق رائے سے بی کانگرس کے لئے سونے اور چاندی کے کشتے تجویز کیے۔ بی کانگرس اٹھارہ ماہ ان کشتوں کا استعمال کرتی رہی لیکن اُسے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر رہتک کے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر کو بُلایا گیا اُس نے مریضہ کا چیک اپ کرنے کے بعد کہا۔ اُسے آکسیجن کی ضرورت ہے۔ کم از کم دو ماہ اُسے آکسیجن پر رکھا جائے“۔ جب اس علاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بی کانگرس کو ایک جادو ٹونہ کرنے والے سادھو کے پاس لے جایا گیا وہ برابر تین ہفتے طرح طرح کے ٹونے کرتا رہا۔ مگر اُس کے سب ٹونے بے سود ثابت ہوئے۔ آخر مایوس ہوکر بی کانگرس کے چاپلوسوں نے ایک پہنچے ہوئے سنت سے مشورہ کیا۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”دوا کا وقت گذر گیا۔ اب تو دُعا کیجیے شاید مریضہ کی جان بچ جائے“۔ چاپلوس دن رات دعائیں مانگنے لگے۔ مگر اُن کی دعا قبول نہ ہوئی کیونکہ دُعا تو اُن کی قبول ہوتی ہے جو نیک ہوں، شریف ہوں، پاکباز ہوں۔ اور یہاں تمام چاپلوس پرلے درجے کے مکار اور ریاکار تھے۔ آخر وہ دن آگیا جب بی کانگرس کا سانس اُکھڑنے لگا۔ نبض چھوٹنے لگی۔ نزع کا عالم طاری ہوگیا۔ کہتے ہیں مرنے سے پہلے اُس نے نریش کمار شاد کا یہ شعر پڑھا تھا اور کہا تھا۔ اِسے میری آخری وصیت تصور کیا جائے۔ ؎

یاروں کی بےپناہ نوازش کے باوجود میری تباہیوں میں میرا اپنا ہاتھ ہے

بذلہ سنج وائس چانسلر

جامعہ عثمانیہ کے نئے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس (ریٹائرڈ) نے، اُن کے اعزاز میں منعقدہ ایک تہنیتی تقریب میں کہا کہ سرکاری فرائض کو انھوں نے بہ حسنِ خوبی جس طرح نبھایا اسی طرح ان کی نجی زندگی بھی خوشگوار گذری جس کا اصل سبب وہ معاہدہ ہے جو شادی کے فوری بعد انھوں نے بیوی کے ساتھ کیا تھا۔ انھوں نے کہا۔” ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ چھوٹے موٹے فیصلے بیوی کریگی، اہم فیصلے میں کروں گا اور شادی کے بعد آج تک (۳۵ سال میں) کوئی اہم فیصلہ لینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

پہلے پندرھواڑہ میں نئی حکومت کی کامیابیاں

نئی ریاستی حکومت نے چھ کروڑ تلگو عوام کے اعتماد کو حق بجانب قرار دینے کی غرض سے اور اپنے کئے ہوئے وعدوں کی تکمیل کی خاطر کچھ اسکیمات پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا ہے تاکہ یہ ریاست ہمہ گیر ترقی و فروغ کی راہ پر لگ جائے۔

- غریب عوام کو دو روپے فی کیلوگرام کے نرخ پر چاول کی فراہمی اور اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں اضافہ کو روکنے کے لئے منصوبے تیار کر لئے گئے ہیں۔
- اسکول کے بچوں کے لئے دوپہر کے کھانے کی اسکیم میں اصلاح کی گئی ہے اور نئے انتظام کے تحت انہیں ڈبل روٹی اور دودھ پر مشتمل غذائیت سے معمور مفت غذا کی فراہمی عمل میں لائی جائے گی اس طرح اسکول بھی باورچی خانوں میں تبدیل ہونے سے بچ جائیں گے۔
- تعلیم کے میدان میں ایک نئے باب کی شروعات ہوئی ہیں جس سے تعلیمی اداروں میں عطیات اور دوسری برائیوں کا خاتمہ ہوگا اور لیاقت کی اساس پر داخلے عمل میں آئیں گے۔
- تمام شعبوں میں بدعنوانی کو مٹانے کی کارروائی شروع کر دی گئی ہے۔
- نظم و ضبط کی سختی کے ساتھ برقراری اور خواتین کو تحفظ کی فراہمی کے لئے تمام اقدامات عمل میں لائے گئے ہیں۔

نئی ریاستی حکومت مختلف ترقیاتی پروگراموں میں عوام
کے تمام طبقات سے تعاون کی اپیل کرتی ہے

جاری کردہ

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ ۔ حیدرآباد DIPR. NO: 12

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کے دو مجموعے

فقط قیمت ۸/ روپے

البتہ قیمت: ۱۰/ روپے

شگوفہ سے حاصل کیجئے

تبصرہ

تبصرہ نگار :۔ لئیق صلاح

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

مصنف :۔ مرزا جعفر حسین
ناشر :۔ ترقی اُردو بیورو۔ نئی دہلی
قیمت :۔ ۲۷/- روپے

٭ ٭ ٭

یہ کتاب ترقی اُردو بیورو نئی دہلی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ لکھنؤ اپنی تہذیب کے سبب ہندوستان گیر شہرت کا حامل ہے۔ لکھنؤ کی معاشرت کے تعلق سے سب سے پہلے روشناس کرانے والے عبدالحلیم شررؔ ہیں جنھوں نے تقریباً نصف صدی قبل اس موضوع پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ " دبستانِ لکھنؤ " تھا۔ اول الذکر تصنیف سے لکھنوی تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے تو موخر الذکر تصنیف میں اس تہذیبی مرکز کے شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ دونوں تصانیف اپنی جگہ مُسلّم ہیں۔ لیکن مرزا جعفر حسین کی تصنیف " قدیم لکھنؤ کی آخری بہار " لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کا بھرپور جائزہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عبدالحلیم شررؔ کی تصنیف ایک مختصر سا تعارف ہے، اور ہر موضوع کی تفصیلات مرزا جعفر حسین کی اس تصنیف میں موجود ہیں۔ مرزا جعفر حسین لکھنؤ کے باشندے ہیں۔ اس کتاب میں جن واقعات کو انھوں نے پیش کیا ہے اُن میں سے بہت سارے اُن کے " دیدہ " ہیں اور جو " شنیدہ " ہیں، وہ بھی معتبر ذرائع سے حاصل کی گئی اطلاعات ہیں۔ موضوعات کے انتخاب کے ساتھ، اندازِ بیان کی بھی داد دینی چاہیئے کہ کہیں اُکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ ہر صفحہ پر ایک نئی بہار جلوہ گر ہے۔

" لکھنؤ کی آخری بہار " چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں طرزِ زندگی، محلوں، عمارات، فنونِ لطیفہ مختلف دلچسپیاں جیسے کبوتر بازی، مرغ بازی اور پتنگ بازی وغیرہ، علمی و ادبی و ثقافتی سرگرمیاں، مذہبی مجلسیں، شادی و غمی کی رسمیں اور صنعت و حرفت جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اہلِ لکھنؤ کی وضع داری مشہور زمانہ ہے۔ اس کتاب میں مرزا جعفر نے ایک رئیس کی وضع داری کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک روز وہ اتفاقاً انگرکھے کا تکمہ لگانا بھول گئے۔ اُن کے کسی شناسا نے گزرتے ہوئے سلام کیا اور مسکرایا۔ اُن کے آگے بڑھنے کے بعد جب موصوف نے غور کیا کہ مسکراہٹ کا کیا سبب ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ سلام کے بعد مسکرانا بھی اُن کی تہذیب کے لحاظ سے ایک گری ہوئی حرکت تھی۔ لباس کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ تکمہ لگانا بھول گئے۔ اور پھر بقول مرزا جعفر حسین " انھوں نے زندگی بھر انگرکھے کا تکمہ نہیں لگایا اور اسی کھلی ہوئی گردن کا انگرکھا اُن کی وضع داری میں داخل ہوگیا۔ "

کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے مرزا جعفر حسین نے بہت ہی مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے۔ جیسے " ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر رام لال چکروتی) نے انتہائی متانت کے ساتھ سادگی کی اجازت چاہی اور یہ کہا کہ آپ نے جنوں کی قسمیں دریافت کی تھیں وہ یاد آگئیں جتنی تعداد تعلقداروں کی انھوں نے بتائی تھی ڈاکٹر صاحب نے وہی تعداد اقسامِ جنوں کی بتادی (ص ۱۰۸)

لکھنؤ کی طرزِ معاشرت کی جزئیات تک فراموش نہیں کیں۔ مختلف انواع و اقسام کے کھانے، لباس تراش خراش زنانی و مردانی ملبوسات و زیورات کی تفصیل، اُن کی معروفیتیں، اُن کے ذوق و شوق کے سامان حتیٰ کہ "پان" کے بارے میں بھی تفصیلی بیان موجود ہے۔

طوائفیں کسی دور میں لکھنؤ کی تہذیب کا جزو لا ینفک تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ امیرزادوں کو شائستگی و تہذیب سکھلانے کے لئے، اکثر ان کے کوٹھوں پر بھیجا جاتا تھا۔ ایک محفل کا ذکر مرزا جعفر نے کیا ہے جس میں ایک صاحبزادے طوائف سے پہلا مصرعہ سنتے ہی دوسرا مصرعہ باآواز بلند پڑھ دیتے تھے۔ لکھتے ہیں ــ "مشتری نے دو مرتبہ برداشت کیا۔ تیسری مرتبہ جب اُس نے یہ مصرعہ لگایا کہ شعر

بیمارِ محبت نے لیا تیرا سنبھالا

اور انھوں نے فوراً یہ دوسرا مصرع پڑھ دیا کہ شعر

لیکن یہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

تو مشتری نے انتہائی متانت و سنجیدگی سے اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ اب میری کیا ضرورت ہے آپ ہی اس جگہ پر آجایئے۔" (صفحہ ۱۹۵)

لکھنؤ میں یہ حرکت آدابِ محفل کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔

شاعروں کی کیفیت بھی اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ "مشاعرہ گاہ" کی پوری تصویر آنکھوں کے آگے کھنچ جاتی ہے۔ داد لینے پر کورنش، آداب اور تسلیمات بجالانا۔ آدابِ مشاعرہ کا خاص اہتمام، یعنی پہلو تک بدلنا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا تھا۔ مختلف اساتذہ کے شاگردوں کی آپسی نوک جھونک، تعریف و توصیف، نکتہ چینیاں اور اعتراضات غرض سب کچھ موجود ہے۔

سوز و اداری، تعزیہ بٹھانا، مرثیہ گوئی کی محفل کا حال بھی بہت ہی سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مرثیہ نگاری کی فنی خوبیوں کے علاوہ، مرثیہ پڑھنے کے انداز کی بھی خاصی اہمیت تھی، جو میر انیس کے دور سے لکھنؤ کی ایک روایت بن چکی تھی۔ شعر پڑھنے کے ساتھ ساتھ جذبات کی ترجمانی کرنا بھی ایک کمال سمجھا جاتا تھا۔ ہاتھوں کی حرکت اور آنکھوں کے اُتار چڑھاؤ سے وہ واقعہ کی تصویر کھینچ دیا کرتے تھے۔ ان میں انیس اور نفیس کے خاندان والوں کے علاوہ اور بھی مرثیہ گو تھے، جو اس فن میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔

صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی لکھنؤ نے کافی ترقی کی تھی چکن اور کامدانی، کارچوبی اور سلمیٰ ستارے کا کام، طلائی و نقرئی زیورات، پیتل اور تانبے کے ظروف، مٹی کے برتن اور کھلونوں کے علاوہ، بعض چیزوں میں انھوں نے اپنی جدت اور قدرت کا اظہار بھی کیا ہے۔ آج بھی لکھنؤ کا چکن، کامدانی اور کارچوبی کام مثالی سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا جعفر حسین نے پانچ سو اٹھاون صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب لکھ کر تہذیب و تمدن سے دلچسپی رکھنے والوں کی بہت ساری مشکلات حل کر دیں۔ اب یہ نقوش مٹ چکے ہیں، لیکن مٹنے کے بعد فانی نہیں بلکہ لافانی ہو گئے ہیں۔ اُس "داستانِ پارینہ" کو دلچسپی سے سننے والے آج بھی موجود ہیں۔ اس تصنیف کے مطالعے کے بعد زمانے کے انقلابات و تغیرات کا شدید احساس ہوتا ہے شعر

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کی یہ مکمل تصویر ہے۔

علم و ادب اور تہذیب و تمدن سے لگاؤ رکھنے والے "اربابِ نظر" مرزا جعفر حسین کی تصنیف "لکھنؤ کی آخری بہار" کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ساتھ ہی اپنے کتب خانوں کی زینت بنائیں گے۔ کتاب کی افادیت کے لحاظ سے دام بالکل واجبی، یعنی صرف -/۲۷ روپے ہیں۔

خرافات (مراسلے)

تازہ شمارہ ملا۔ سرورق دیکھ کر بے اختیار دادِ تحسین نکل گئی۔ اُردُو دشمن دور میں اتنا دیدہ زیب سرورق کے ساتھ مزاح کا خزانہ تقسیم کرنا آپ کا ہی دم خم ہے۔

رؤف خوشتر، گلبرگہ

کئی ماہ بعد شگوفہ میرے ہاتھ لگا۔ یہ رسالہ روتے ہوئے دل کو ہنساتا ہے۔ میری نظر میں یہ واحد مزاحیہ رسالہ ہے، اور وہ بھی اردو کا جو سرزمین حیدرآباد سے شائع ہوکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مزاح پھیلاتا ہے۔

افتخار محمود انصاری۔ ناگپور

نومبر کا شگوفہ ملا۔ شکریہ۔ کتنا دیدہ زیب پرچہ ہے۔ خدا کرے اس کو زمانے کی نظر نہ لگے۔

نشتر سیوانی۔ سیوان، بہار

کل آپ کا ارسال کردہ ستمبر کا شمارہ ملا۔ ستمبر کے شمارہ میں شفیق الرحمٰن کا مضمون دیکھنے کو ملا۔ اگر اسی طرح ہم عصر پاکستانی مزاحیہ و طنزیہ ادیبوں کی تخلیقات کو شگوفہ میں دیتے رہیں تو کافی محظوظ ہوتے رہیں گے۔ نئے سال کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ۔

انیس احمد، دوحہ، قطر

ماہ ستمبر کا شگوفہ جلوہ افروز ہوا۔ اس بار آپ نے کمال کردیا ہے۔ بہت ہی خوبصورت گٹ اپ اور بڑی ہی معیاری تخلیقات سے مزین شگوفہ گزشتہ سال کا نایاب تحفہ ثابت ہوا ہے۔ جس کے لئے آپ کو مبارکباد۔

کرکٹ ۔ ۱۹۸۳ء

نامور مزاح نگار

خواجہ عبدالغفور کے مضامین

قیمت : ۸/- روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجیے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

سالنامہ کا کام جاری تھا کہ شہر میں فسادات پھوٹ پڑے ان فسادات پر اب کیا لکھیں۔ یہ تو ہماری جمہوری زندگی کا جز بن گئے ہیں! حیدرآباد عرصہ دراز تک اپنی خاص ہندوستانی تہذیب کے لئے مشہور و ممتاز تھا۔ لیکن گذشتہ تین چار سال سے جارحیت پسند فرقہ پرست قوتوں نے اس شہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کانگریسی حکومت ان قوتوں کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔ آزادی کے بعد پہلی بار آندھرا پردیش میں کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تلگو دیشم کی حکومت قائم ہوئی ہے دیکھنا یہ ہے کہ این ٹی آر حکومت فسادات کی لعنت سے دارالخلافہ کو کس طرح بچاتی ہے ــــ اس فساد کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ کرفیو کے عالم میں جبکہ سارا پرانا شہر پولیس کی نگرانی میں تھا تلگو کے مشہور شاعر غلام یٰسین انکی بیوی بچے اسا ڈکے کا دن دھاڑے بہیمانہ طور پر قتل کر دیا گیا۔ کئی اور افراد زخمی کر دیئے گئے۔ کیا اس سے بڑھ کر پولیس کی کارکردگی کی مثال ہو سکتی ہے؟

ان نامساعد حالات کے باوجود ہم نے سالنامہ بروقت شائع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوصی شمارہ کے لئے ملک کے ممتاز کارٹونسٹ شعیب ربانی نے خاصا وقت دیا۔ تخلیق کاروں کے لئے تصویر کیریکیچر بنائے اور اپنے قلم کے جادو سے پرچہ کے حسن کو نکھارا۔ ہم شعیب کی اس خصوصی دلچسپی کے لئے سراپا سپاس ہیں۔

زندہ دلان حیدرآباد کے انتخابات میں نامور مزاح نگار جناب نریندر لوتھر متفقہ طور پر صدر منتخب ہوئے ہیں لوتھر صاحب کا زندہ دلان حیدرآباد سے بہت قریبی و قدیم تعلق ہے۔ ۱۹۶۱ء میں اس ادارے کی افتتاحی تقریب کی انہوں نے صدارت کی تھی برسوں وہ اس ادارہ کی نائب صدارت پر فائز رہے۔ اور اسکی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں اہم حصہ ادا کیا۔ یقین ہے کہ صدارت پر فائز ہونے کے بعد ادارہ کی سرگرمیوں کا دائرہ اور وسعت اختیار کرے گا۔ جناب بھارت چند کھنہ جن کے دور صدارت میں زندہ دلان حیدرآباد نے ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ اب اس ادارہ کے سرپرست ہوں گے۔

ادارۂ شگوفہ کو جناب یوسف ناظم کا قلمی تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ لیکن ہماری خواہش تھی کہ ان کی ناظمانہ صلاحیتوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ان سے شگوفہ کی کسی خصوصی اشاعت کا مہمان مدیر بننے کی درخواست کی۔ اپنی روایتی اخلاص کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اور طے پایا کہ ۱۹۸۳ء کے وسط میں ہندوستانی مزاح نمبر شائع کیا جائے۔ اس خصوصی اشاعت کے کام کا تیزی سے آغاز ہو چکا ہے ــــ ادارۂ شگوفہ جامعہ عثمانیہ کی وائس چانسلری کے عہدہ پر جناب ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) کے تقرر کا دلی خیر مقدم کرتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب ہاشم علی اختر جیسے قابل و تجربہ کار منتظم، علم دوست، خلیق و ملنسار، خوش دل و خوش مزاج شخصیت کے دور میں جامعہ علم و تہذیب کے میدانوں میں ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کرے گی۔

اپنی بصارت کا معائنہ

امریکہ کی آٹو میٹک آئی ٹسٹنگ مشین

سے کروائیے۔

امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹکنالوجی کے

مستند تربیت یافتہ معیاری چشموں کی تیاری کے لیے

تشریف لائیے

غوری اینڈ کمپنی آپٹیشینس

ترپ بازار، حیدرآباد

فون: 42127 —— کوالیفائیڈ آپٹیشینس آکادمی آف آپٹیشنری (امریکہ)

With Best Compliments

FROM

DAKSHIN PHARMACEUTICALS LTD

JEEDIMETLA

تہذیب و شائستگی کے نمائندہ شہر حیدرآباد میں

شائستہ نفیس، مضبوط، پائیدار اور خوش وضع

زنانہ، مردانہ اور بچوں کے لئے ہر سائز کے

جوتوں کا حسین انتخاب

شو ورلڈ

شو ورلڈ سرکل، پتھرگٹی حیدرآباد ۲
فون: ۴۴۸۵۲ ، رہائش: ۴۵۰۴۶

نیو شو ورلڈ

عابد روڈ، حیدرآباد ۱
فون: ۵۰۳۳۷

شو ورلڈ اینڈ کمپنی

عابد سرکل اسٹیشن روڈ
حیدرآباد ۱

No. [illegible]822/88 — Postal Regd. No. H. HD 6
ol. 16 Copy 1 — (Annual Number) — Jan. 1983 Phone : 57716

شگوفہ

FEBRUARY 1983 **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد
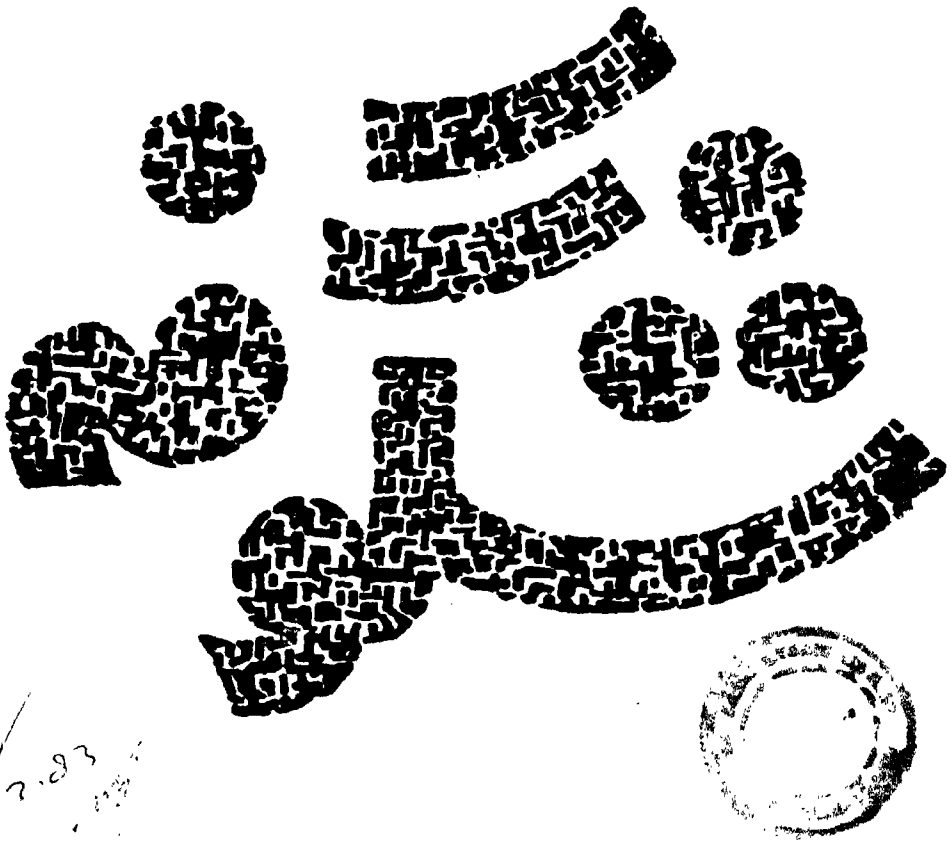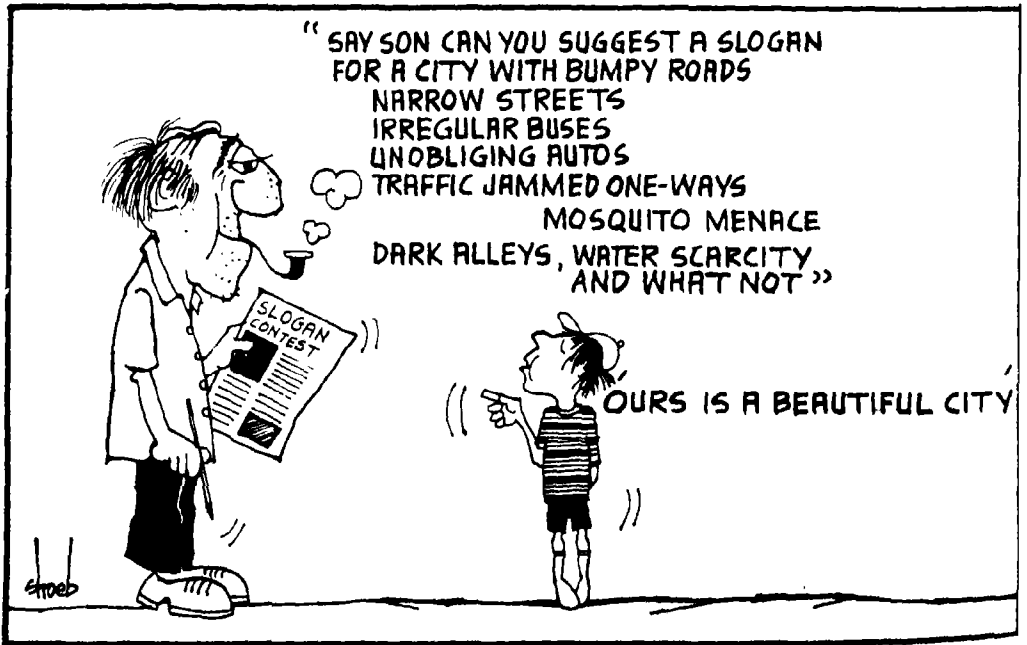
جلد ۱۶ فبروری ۱۹۸۳ء شمارہ ۲

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائٹل:
شعیب
بہ شکریہ
"دکن کرانیکل"

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: سمیع جلیل

کتابت: عبدالرؤف، مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ:
"شگوفہ" ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے :-

۱. موہن میکن بریوریز
۲. آجنتہ ڈیری، آگرہ
۳. ہارکو، سری نگر
۴. انڈین سیٹ کمپنی لمیٹڈ
۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶. میڈونا کیننگ کمپنی
۷. ہیری سوئیٹس اینڈ ٹافینس
۸. ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹. چیپین وہائٹ روشس
۱۰. سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جُلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبّے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان :

پوُرن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ و افسانہ)

ایسی کی تیسی (تنقید)

رپورتاژ

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

برق و شرر (مستقل کالم)

پھوہڑ (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ
امریکہ کی آٹومیٹک
ائی ٹسٹنگ مشین
سے کروائیے
امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹکنالوجی
کے مستند تربیت یافتہ
معیاری چشموں کی
تیاری کے لئے
تشریف لائیے
غوری
اینڈ
کمپنی آپٹیشنس
ترپ بازار حیدرآباد
فون: 42127
کوالیفائیڈ آپٹیشنس آکادمی
آف آپٹیشنری (امریکہ)

اردو
ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر ظ انصاری

ہندی
ڈاکٹر سریدھر مشرا
رتی لال شاہین

انگریزی
ڈاکٹر ملک راج آنند
ڈاکٹر سید حامد حسین

بنگالی
شانتی رنجن بھٹاچاریہ

تلگو

مراٹھی
ڈاکٹر عبدالستار دلوی

کنڑی
حمید الماس

گجراتی
ڈاکٹر کنھیا لال زویری

سندھی

کشمیری

آسامی، اڑیا

پنجابی

تامل

ڈوگری

ملیالم

"شگوفہ"
"ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور **انتخاب** (حصہ نثر)

وسط ۱۹۸۳ء میں شائع ہوگا

دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کیجئے۔ اپنی کاپی کے لیے آج ہی لکھئے ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحات

قیمت ۳۰ روپے

مہمان مدیر ——— یوسف ناظم

ساتھ میں بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے اور "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

رشید احمد صدیقی پطرس فرحت اللہ بیگ عظیم بیگ چغتائی شوکت تھانوی

فرحت کاکوروی کنھیا لال کپور بھارت چند کھنہ فکر تونسوی احمد جمال پاشا یوسف ناظم

مجتبیٰ حسین شفیقہ فرحت خواجہ عبدالغفور نریندر لوتھر رشید قریشی برق آشیانوی مسیح انجم پرویز یداللہ مہدی

حصہ معلومات

اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی (مرتبہ ادارۂ "شگوفہ")

شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱

انجمن زن مریداں

رضا نقوی واہی

جب ہوا ناقابلِ برداشت ، ظلم و جورِ زن   زن مریدوں نے بنائی ایک خفیہ انجمن
صدر دفتر اک کھنڈر کی چار دیواری میں تھا   طائرانِ تیرہ شب کی جو عملداری میں تھا
دور آبادی سے مرکز اس لیے رکھا گیا   بیگموں کو اس بغاوت کا نہ چل جائے پتا
وقتِ شب جب محوِ خوابِ ناز ہوتیں بی بیاں   مثل چوروں کے گھروں سے باہر آتے کل میاں
آہٹوں پر کان دھرتے ، رک کے چلتے دوڑتے   نصف شب تک سب پہونچ جاتے وہاں سہمے ہوئے
چند ساعت کی یہ آزادی تھی اتنی جاں نواز   بھول بیٹھے اپنے حق میں نیک و بد کا امتیاز
شیرنی کی زد سے بچ کے ، توڑ کر زلفوں کا دام   "ریت کے ٹیلوں پہ آہو کا وہ بے پروا خرام"
سب کے سب اک دوسرے سے حالِ دل کرتے بیاں   کس نے کس حد تک کیا برداشت جورِ بیگماں
ڈرتے ڈرتے ایک دن سب نے یہ کی تجویز پاس   اسٹرائیک کر کے ہم دل کی نکالیں گے بھڑاس
بیبیوں کے سامنے اب دُم ہلائیں گے نہ ہم   جھڑکیاں کھا کھا کے اُن کی سر جھکائیں گے نہ ہم

بی جمالو کو نہ جانے کیسے سُن گُن مل گیا
جھٹ سے اک بی بی کے گھر کر آئیں اسکا تذکرا

پھر تو کانوں کان سارے شہر میں پھیلی یہ بات   کس طرح یہ سرکشی برداشت کرتیں بیگمات
انتقامی کارروائی کی مہم جاری ہوئی   انجمن پر دفعتاً شب خوں کی تیاری ہوئی
میرِ مجلس جیسے ہی تقریر کرنے کو اُٹھے   ہر طرف ڈائس پہ چھاپہ مار دستے چھا گئے
منچ کے چاروں طرف گھیرا کچھ اتنا سخت تھا   بھاگنے کا ایک بھی شوہر نہ موقع پا سکا
صف بہ صف بیٹھے ہوئے تھے ایک سے اک نامور   کیسے کیسے مولوی فاضل ، محقق ، لیکچرر
شاعرانِ نیم وحشی ، ناقدینِ بے سہار   ماہناموں ، روزناموں کے مدیرانِ کبار
گھر کے باہر جو بنے رہتے تھے قالینوں کے شیر   یوں تھے نرغے میں کہ جیسے بند پنجروں میں بٹیر
بیگموں نے اپنے اپنے شوہروں کو ڈھونڈ کر   بیلن و کفگیر سے جی بھر کے لے ڈالی خبر
منچ پہ چاروں طرف منظر تھا دار و گیر کا   "سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا"
الاماں وہ بی بیوں کی زن مریدوں سے جھڑپ   "آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ"
القصہ سب پٹ پٹا کر اپنے اپنے گھر چلے   سرکشی کا شوق تھا ، وہ شوق پورا کر چلے

گھر کے باہر لاکھ اکڑیں ایں جناب و آں جناب
گھر کے آنگن میں رہیں گے وہ سدا خانہ خراب

مرحوم شوہر کی تصویر کو دیکھ کر

برق آشیانوی

تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

میں گالیاں دوں گی تو وہ خاموش رہے گی
بیلن سے جو ماروں گی تو وہ کچھ نہ کہے گی
گھر سے جو نکالوں تو کہیں جا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

پکچر مجھے ہر روز وہ لے جا نہ سکے گی
ساڑی نئی ہر ماہ مجھے لا نہ سکے گی
کھانے مرے ہاتھوں کے پکے کھا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

نخرے نہ سہے یہ، نہ مرے ناز اُٹھائے
عمر دل پہ مرے یہ کبھی قربان نہ جائے
شوہر مرا ہونے پہ، یہ اترا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

ٹکڑوں پہ مرے باپ کے یہ پل نہ سکے گی
نوکر کی طرح پیچھے مرے چل نہ سکے گی
بازار سے سودا یہ کبھی لا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

بٹھلاؤں تو بیٹھے، نہ اٹھاؤں تو اُٹھے گی
ہر دم نہ اشاروں پہ مرے ناچ سکے گی
ہر وقت قصیدے یہ مرے گا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

کپڑے یہ صفائی سے مرے دھو نہ سکیگی
نیچے یہ مسہری کے مری سو نہ سکے گی
بچے مرے روئیں گے تو بہلا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

بھولے سے جو خوشنودی کا اظہار کرونگی
غلطی سے وفاؤں کا جو اقرار کروں گی
تعریف کروں گی تو یہ شرما نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

تصویر میں خوبی ہے تو بس ایک یہی ہے
یہ شعر و سخن کی تو نحوست سے بچی ہے
اشعار سنا کر مرا سر کھا نہ سکے گی
تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

یوسف ناظم

انٹرویو
مابین صحافی و ادیب

انٹرویو لینے اور انٹرویو دینے کے موجودہ طریقۂ کار میں ایک کیمرہ اور ایک ٹیپ ریکارڈ بہت ضروری اشیاء ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر اس لئے رکھا جاتا ہے کہ بعد میں دونوں فریقین ایک دوسرے کو جھٹلا سکیں اور ثبوت کے لئے ٹیپ پیش کرنے کے لئے کہا جائے تو یہ کبھی برآمد نہ ہو سکے۔ حال حال تک انٹرویو میں صرف ۲ اشخاص کی گنجائش تھی لیکن اب یہ تعداد بڑھا دی گئی ہے اور ایک ہی فرد کا انٹرویو دو یا تین اشخاص لے سکتے ہیں۔ یہ طریقہ سرکاری دفاتر سے لیا گیا ہے۔ اس میں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ جو شخص انٹرویو دیتا ہے اس کی حیثیت مسلّمہ ہوتی ہے جب کہ سرکاری انٹرویو میں، انٹرویو دینے والے کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے بلکہ ہوتی ہی نہیں ہے اس میں ٹیپ ریکارڈ بھی نہیں رکھا جاتا۔ ہر دو قسم کے انٹرویو میں ایک چیز بہرحال مشترک ہوتی ہے۔ ان کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔

انٹرویو درج ذیل ہے جس کا ٹیپ ضائع کر دیا گیا ہے۔

صحافی: آپ تیار ہوں تو ہم انٹرویو شروع کریں۔

ادیب:۔ آپ چائے پی چکے ہوں تو ضرور شروع کیجئے۔ آپ کو کسی اور کا انتظار تو نہیں ہے نا۔

صحافی:۔ جی نہیں۔ آپ کے انٹرویو کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ پہلے یہ فرمایئے کہ عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش مشتبہ ہوا کرتی ہے کہیں کچھ لکھی ہوتی ہے کہیں کچھ۔ لیکن آپ کی تاریخ پیدائش کئی جگہ ایک ہی لکھی ہوئی ملی۔ اس کا کیا سبب ہے۔

ادیب:۔ اصل میں میرے والدین میں ہم خیالی یعنی متفق الرائے ہونے کی عادت زیادہ تھی۔ اور پھر میں نے بھی اپنی تاریخ پیدائش کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی کیوں کہ اس سے کسی ادیب اور شاعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

صحافی:۔ آپ کی جائے پیدائش بھی ایک ہی ہے؟

ادیب:۔ جی ہاں۔ یہ بھی ایک ہی رہی لیکن شکل یہ آن پڑی کتاب اس جگہ کا نام ہی بدل گیا ہے کیوں کہ پچھلے دس برسوں میں سڑکوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں اور شہروں کے نام بہت پابندی سے بدلے جا رہے ہیں۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ

صحافی:۔ میں سمجھ گیا۔ یہ فرمائیے کہ جب آپ کے شہر میں خود ایک ہائی اسکول تھا تو آپ نے دوسرے شہر جا کر کیوں تعلیم حاصل کی۔

ادیب: لکھا نا آخر آپ نے میری دکھتی رگ پہ ہاتھ۔ بھائی صاحب بات یہ ہے کہ ہمارے شہر کے ہائی اسکول کا معیار تعلیم بہت اونچا تھا اور دوسری جگہوں کے ہوشیار اور ذہین طالب علم اس اسکول میں داخلہ حاصل کیا کرتے تھے۔ ہر جماعت میں داخلے کے لئے کم سے کم ۵۰ فی صد نمبروں کی شرط تھی جب کہ خاکسار نے اس معاملے میں ہمیشہ انکساری سے کام لیا اور ۳۵ فی صد سے زیادہ نمبر کبھی حاصل نہیں کئے

صحافی:۔ پھر آپ ادیب کیسے بن گئے؟

ادیب:۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ اسکول اور کالج کے امتحانات میں کامیاب ہونا مشکل ہے یا یوں کہئے کہ مشکل تھا۔ لیکن ادیب بننا کبھی بھی مشکل کام نہیں مانا گیا اور جرائم کی فہرست میں یہی ایک جرم ہے جس کی کوئی سزا نہیں۔ لکھنے لکھانے کی ہر شخص کو آزادی ہے آدمی جو چاہے اور جتنا چاہے لکھے اور اس کی تحریر سے زبان و ادب یا ملک و قوم کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہونچے کوئی باز پرس نہیں کرتا جب کہ

صحافی:۔ جب کہ آپ غلط طریقے سے موٹر پارک کریں تو آپ کو اٹھا کر پولیس وین میں رکھ دیا جاتا ہے۔

ادیب:۔ جی ہاں اس طرح کی کئی باتیں ہوتی ہیں اور قدم قدم پر جرمانے ہرجانے ادا کرنے پڑتے ہیں لیکن ادب میں کھلی آزادی ہے۔

صحافی:۔ تو اس لئے آپ نے لکھنا شروع کیا۔

ادیب:۔ لکھنا تو میں نے ایک غلط فہمی کی وجہ سے شروع کیا۔ ذرا آپ تھوڑی دیر خاموش رہیں تو میں تفصیل سے بتاؤں ۔۔۔ میں جب مدرسے میں ابتدائی جماعتوں میں پڑھتا تھا تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ ادیب اور شاعر کسی اور ہی دنیا کے لوگ ہوتے ہوں گے اور وہیں سے لکھ لکھا کر اپنا سامان ادھر بھیجتے ہوں گے۔ ایک مرتبہ اسکول میں ایک صاحب آئے تو ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا انھیں ہار پھول پہنائے گئے، شال اوڑھائی گئی۔ تصویریں کھینچی گئیں اور ان کی تقریر کے بعد اتنی تالیاں بجیں کہ لوگوں کے کان بجنے لگے۔ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر میں کئی لوگ ان چھوٹی چھوٹی کتابیں لے کر ان کی طرف دوڑے اور انھوں نے ہر کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ آٹو گراف بک ہے۔ جھانک کر ایک آٹو گراف بک دیکھی تو اس پر ان ادیب کے صرف دستخط تھے۔ دل میں خیال آیا کہ اگر ایسے ہی لکھنا کہتے ہیں تو کل سے ہم لکھنا شروع کرتے ہیں۔

صحافی:۔ خوب خوب۔ جی آپ کہے جائیے۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا ہے۔

ادیب:۔ تو دوسرے دن سے ہم نے اپنی بیاضوں پہ اپنے دستخط کرنے شروع کر دیئے۔ طرح طرح کے دستخط ایجاد کئے۔ ایک دستخط لالٹین کے نمونے کا تھا تو کسی نے خاردار جھاڑی کی شکل اختیار کی۔ ایک دن چچا میاں نے ہماری ایک بیاض اٹھائی تو انہیں اس میں حساب کے سوال تو نہیں صرف دستخط ہی دستخط نظر آئے۔

(نلیش بیگ)

چچامیاں : اچھن میاں یہ سب کیا ہے۔
اچھن : چچا جان یہ ہمارے دستخط ہیں۔
چچامیاں : یہ کیوں کئے جا رہے ہیں۔
اچھن : جی ہم ادیب بننے جا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے اسکول میں ایک ادیب کو دیکھا تھا وہ سب کی چھوٹی چھوٹی بیاضوں پر اپنے دستخط کر رہے تھے۔
چچامیاں : ہونہہ۔ اچھا۔ تمہیں ادیب بننا ہے نا۔ ہم تمہاری تربیت کریں گے۔

(فلیش بیک ختم)

ادیب : چچا جان نے فوراً ہی ہماری تربیت شروع کر دی اور کچھ دن بعد جب ہم نے اُن کی تعریف میں ایک ۱۰ سطری مضمون لکھا تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے گھر بھر کو مٹھائی کھلائی اور اعلان کر دیا کہ اچھن میاں ادیب ہو گئے ہیں۔ اُن کے اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے بھتیجے سالانہ امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچے اور ابا نے اُنھیں آئندہ ہماری تربیت کرنے سے منع کر دیا۔
صحافی : جی میں سُن رہا ہوں ذرا آپ چائے منگوا سکیں گے۔

ادیب : چائے آتی ہی ہوگی۔ میں نے کہہ رکھا تھا کہ ہر آدھ گھنٹے بعد ایک کپ چائے آپ کو دے دی جائے۔ ابھی صرف ۲۵ منٹ ہوئے ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب میں آٹھویں یا نویں جماعت میں تھا تو میں نے شاعری شروع کی تھی۔ اسکول کے سالانہ جلسے میں ایک شاعر کو سُنا تھا۔ وہ کوئی غزل سُنا رہے تھے اور اُنھیں غضب کی داد مل رہی تھی۔ میں نے سوچا ایسی غزلیں تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ گھر پہنچ کر کاغذ قلم لیا۔ کاغذ پر فٹ پٹی سے برابر برابر کی لائنیں کھینچیں اور جواب، ثواب، کتاب قافیہ مقرر کر کے سارے قافئے سطر کے آخر میں لکھے اور پھر ان کے آگے چند الفاظ۔ مصرعے تیار تھے۔ یہ سب کے سب مصرعہ ثانی تھے۔ ذرا سی کوشش اور کی تو دیکھا کہ مصرعہ اول بھی چلے آ رہے ہیں۔ پانچ شعر کی غزل مکمل ہو گئی۔ پڑوس میں ایک شاعر رہتے تھے۔ بھاگا بھاگا اُن کے ہاں پہنچا۔ اُنہوں نے غزل دیکھی۔ خوشی سے اچھل پڑے۔ تھوڑی سی اصلاح بھی دی۔ اور بولے یہ ایک شعر مجھے دے دو ذرا فحش ہے تمہیں زیب نہیں دیگا۔ شباب کا قافیہ تمہیں نہیں باندھنا چاہیئے تھا۔ میں تمہیں اپنے دو شعر دیئے دیتا ہوں اور تم حساب اور رباب کے قافیوں پر دو شعر اور کہہ لو۔ پہلا مصرعہ میں لکھ دیتا ہوں۔ سودا طئے ہو گیا۔ گھر آ کر میں نے دو شعر اور کہے پہلے کے چار اور ۲ شعر اُستاد کے۔ جملہ ۸ شعر۔ لیکن نئے دو شعر کہہ کر میں اُستاد کے ہاں نہیں گیا ——— لیجیے آپ کی چائے آ گئی۔ ایک بسکٹ بھی کھائیے ——— میرے ایک دوست کے والد بھی شاعر تھے۔ یہ ۸ شعر لے کر میں اُن کے ہاں گیا تو اتفاق سے اُنھیں وہ دو شعر بہت پسند آ گئے جو اُستاد نے عنایت کئے تھے۔ وہ دو شعر اُنہوں نے زبردستی لے لئے اور اپنے ۳ شعر مجھے عنایت فرمائے۔
اب میرے پاس ۹ شعر ہو گئے۔ میں پھر اپنے پڑوسی

اُستاد کے ہاں گیا اور غزل دکھائی تو اُنہوں نے کہا تمہاری عمر کے شاعر کیلئے ۹ شعر کی غزل بہت بڑی ہوگی۔ یہ ۳ شعر یہاں چھوڑ جاؤ۔ یہ میں بھی تخلص۔ یہ وہی ۳ شعر تھے جو میرے دوست کے والد نے مجھے دیئے تھے۔ میں نے کہا لے لیجئے۔ کچھ دن بعد ایک مشاعرے میں گیا تو دیکھا کہ دونوں اُستاد موجود ہیں اور جب ان کی باری آئی تو انھوں نے وہی غزلیں پڑھیں جن میں جواب، شباب، حباب اور حجاب کے قافیوں کے شعر تھے۔ مشاعرے کے بعد دونوں اُستاد وہیں مشاعرے میں لڑ پڑے لیکن تصفیہ نہیں ہو سکا کہ کس نے کس کے شعر چرائے ہیں۔ بس اُسی دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ شاعری نہیں کروں گا۔ صرف نثر لکھوں گا۔

صحافی : آپ نثر بھی کیوں لکھتے ہیں مطلب یہ کہ آپ کیوں لکھتے ہیں اور لکھنے کے بعد خود کو کیسا محسوس کرتے ہیں۔

ادیب : میں نثر اس لئے لکھتا ہوں کہ نثر میں بحر اور عروض کا جھگڑا نہیں۔ کسی جملے میں سکتہ نہیں آتا۔ کوئی حرف گرتا نہیں، کسی اور کے جملے پر گرہ بھی نہیں لگانی پڑتی۔ کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ زمین فلاں فلاں کی ہے۔ نثر کی زمین خُدا کی اور اُس کے بعد خود کی زمین ہوتی ہے۔ نظم میں مشکل یہ ہے کہ بڑے سے بڑے خیال کو کم سے کم لفظوں میں ادا کرو جب کہ نثر میں یہ ہے کہ جملے کے جملے لکھ جاؤ خیال ادا ہو یا نہ ہو کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے وہ لوگ جنہیں کچھ کہنا نہیں ہوتا نثر لکھتے ہیں۔ میں بھی لکھتا ہوں۔

صحافی : بجا فرمایا آپ نے۔ نثر کے تعلق سے اور کوئی بات۔

ادیب : کہہ تو رہا ہوں۔ نثر لکھنے میں اسٹیشنری کا فی خرچ ہوتی ہے اور یہ شاعری کے مقابلے میں مہنگی پڑتی ہے۔ ڈاک خرچ بھی زیادہ آتا ہے لیکن اب نثر کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔

صحافی :- وجہ؟

ادیب :- اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ نثر اچھی لکھی جا رہی ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاعری میں سوائے شاعری کے سب کچھ ہو رہا ہے۔

صحافی :- کیا آپ ایمان داری کے ساتھ یہ رائے دے رہے ہیں۔

ادیب :- میں نقاد نہیں ہوں آپ میری رائے پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

صحافی :- ایسا معلوم ہوتا ہے آپ چاہتے تو تنقید بھی لکھ سکتے تھے۔

ادیب :- اب اتنا زیادہ آرام بھی ٹھیک نہیں ہے۔

صحافی :- نثر لکھنے کے فوائد کے بارے میں آپ کچھ کہہ رہے تھے۔

ادیب :- نثر لکھنے والے کی روز مرہ کی زندگی متاثر نہیں ہوتی کیوں کہ ادیب کو صورت سے لوگ پہچانتے نہیں ہیں جبکہ ہر وہ شاعر جو ۴، ۶ مشاعرے پڑھ چکتا ہے گلی گلی کوچے کوچے پہچانا جاتا ہے اور اس طرح اُس کا چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا۔ مشاعرے میں بھی سامعین شاعروں سے کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے اور اب تو مشاعرہ بھی کرکٹ کے کھیل کی طرح ہو گیا ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر کتنی دیر تک ٹکے گا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ نثر کے بھی سیمی نار ہوتے ہیں لیکن سیمی نار کے سامعین اتنے خون آشام نہیں ہوتے۔ نثر نگار ذرا محفوظ ہی رہتا۔ لیجئے آپکی چائے آگئی۔ اب تو میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔

صحافی :- آپ نے نثر میں کوئی تجربہ کیا یا نہیں۔

ادیب :۔ نثر میں سرجری کی گنجائش کم ہے۔ افسانے میں تجربے ضرور ہوتے ہیں لیکن اتنے نہیں جتنے نظم میں ہوتے ہیں۔

صحافی :۔ آپ ابھی اور کتنا لکھیں گے؟ شاعری میں تو کوئی حد نہیں ہوتی لیکن نثر میں تو ہوتی ہے۔

ادیب :۔ ہوتی ہوگی۔ لیکن کسی اور زبان میں اردو میں کسی چیز کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/-	روپئے
نفظ	یوسف ناظم	مضامین	۶/-	”
البتہ	” ”	”	۱۰/-	”
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	”	۸/-	”
دھرگھیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/-	”
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	”
بالآخر	” ”	مضامین	۱۴/-	”
سنی سنائی	لئیق صلاح	”	۱۵/-	”
رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	”	۱۵/-	”
خواہ مخواہ	رشید الدین	”	۱۰/-	”
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	”	۱۰/-	”
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	”	۱۲/-	”
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	”	۱۲/-	”

نیا سال مبارک ۱۹۸۳ء

اسمٰعیل آذر

فاقوں سے بُرا حال نیا سال مُبارک
ہڈی پہ فقط کھال نیا سال مبارک
روٹی کو نہ رو لال نیا سال مُبارک
کیا غم جو نہیں دال نیا سال مُبارک
مہنگائی تو ہوتی ہے سدا باعثِ برکت
اے مفلس و کنگال نیا سال مُبارک
امراض کی بہتات ملاوٹ کا کرشمہ
پھر شامتِ اعمال نیا سال مُبارک
ہڑ دنگے، بم اندازیاں لٹھ بازیاں ہڑبونگ
یہ بند وہ ہڑتال نیا سال مُبارک
ڈاکہ زنی و ظلم و ستم خون و خرابہ
تفصیل کا اجمال نیا سال مُبارک
وہ فرقہ پرستی، وہ فسادات، وہ بلوے
کیا خوب ہے سُر تال نیا سال مُبارک
میرٹھ ہو کہ کیرل ہو علیگڑھ کہ بڑودا
ہر سمت ہے بھونچال نیا سال مُبارک
کل تک جو اپاہج تھے وہ اب شکرِ خدا ہے
چلنے لگے ہیں چال نیا سال مُبارک
دیکھیں گے وطن کو وہ اسی ایک نظر سے
اس دور کے دجال نیا سال مُبارک
اے کرسی نشینانِ وطن تم کو نمستے
منجانبِ بدحال نیا سال مُبارک
اللہ کرے اور بھی ہوں تیز اُڑانیں
اے بال پر و بال نیا سال مُبارک

میں اور وہ

مہمل لکھنوی

★

آؤ
کہ ایلیٹ کی
سناؤں تمہیں نظمیں
یا
ہلکے ترنم میں پڑھوں
فیض کی غزلیں

آتی ہوں ابھی آتوں ہوں کچھ دیر ٹھہریئے
یہ مُنّا رو رہا ہے ذرا دودھ پلا دوں

یہ دیکھو
پکاسو کی نئی پنٹنگ
کی نقل
حیران ہے جس کو دیکھ کے
نقادِ فن
کی عقل

دیکھوں گی۔ مگر آپ کی اکلوتی یہ پتلون
پیچھے سے پھٹی جاتی ہے پیوند لگا دوں

لو
مانگ کے
لایا ہوں میں
ژاں پال کا ناول
پڑھ کے ذرا بتلاؤ کہ
تشنہ ہے یا کامل

پڑھ لوں گی۔ ذرا بنیئے سے آٹا مجھے لادو
دفتر میں بھوکے بیٹھیں گے کیا؟ روٹی بنا دوں

رؤف خیر

وہ سال لو یہ ملا بھی تو سرسری اب کے
اُداس کر گئی پہلی ہی جنوری اب کے

سرسری ملاقات کا یہ حال ہے، اگر تفصیلی ملاقات ہوئی ہوتی تو نہ ہم اس مضمون کے لکھنے کو باقی رہتے اور نہ آپ سننے کے قابل ..... ہوا یوں کہ اس بار ہمیں سالِ نو کی مبارکباد دینے والوں میں ایک کتے نے پہل کی۔ چنانچہ اس نے اپنے تین عدد دانت ہمارے بائیں پیر کی پنڈلی میں گاڑ دیئے اور فرمایا "نیا سال مبارک" ——— ہم نے جواباً ایک عدد پتھر سے اس کی تواضع کرنی چاہی لیکن خاک ہاتھ آتا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ہم نے کہا کہ میاں نہ یہ کوچۂ یار ہی تھا اور نہ تو سگِ لیلیٰ۔ پھر یہ مہربانی کس لئے تھی۔ ہم تو صرف اپنی بکری کی تلاش میں ادھر آ گئے تھے ——— اس نے غرا کر دیکھا گویا فرمایا ہو کہ نئے سال کے موقع پر جہاں کئی انسان کتوں کا روپ دھار لیتے ہوں وہاں اگر کوئی کتا اپنے اصلی روپ میں ایک آدھ آدمی سے پیار کر لے تو حرج ہی کیا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ باقیات الصالحات کے طور پر پنڈلی پر تین عدد دانتوں کے نشانات رہ جائیں۔ چلو جہاں اتنے انسان ایک دوسرے کو دن رات کاٹتے رہتے ہیں وہیں ایک آدھ کتے کو بھی موقع ملنا ہی چاہیئے تھا مگر ؎ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
غالب کی یہ بات اگر کتوں کی سمجھ میں آ جاتی تو ماہرِ غالبیات مالک رام کی جگہ آج کسی بلڈاگ نے لے لی ہوتی اور وہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہوتا ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

بہرحال اپنی ذات میں تین عدد دانتوں کے نشانات کے ساتھ ہم نے دواخانے کا رُخ کیا۔ شام کا سُہانا وقت ـــ نئے سال کی ابتداء ـــ ہفتہ کی شام ـــ بے چارہ ڈاکٹر قہر درویش بر جانِ درویش سرکاری ملازمت کا کاٹا ہوا، ہاتھ پر ہاتھ دھرا منتظر فردا تھا

ہم نے پنڈلی کے اوپری حصے کو ڈوری سے باندھ رکھا تھا تاکہ زہر اوپر دل کی جانب چڑھنے نہ پائے۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو ہنس کے فرمایا کہ بھائی کُتے نے ہی تو کاٹا ہے سانپ یا بچھو نے نہیں ـــ لہٰذا زہر کے اُوپر نیچے چڑھنے یا اُترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ویسے سگ گزیدگی کو کتنا عرصہ ہوا؟ ہم نے کہا ابھی ابھی تو کاٹا ہے یہی کوئی دس منٹ ہوئے ہیں۔ گھر سے فوری دواخانے سیدھا اس واقعہ کے بعد ہم حاضر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ فوراً صابن سے زخمی حصہ کو دھو دیا جائے۔ جراثیم ختم ہو جائیں گے۔ ہم نے تعمیلِ حکم کی ـــ پھر ڈاکٹر صاحب نے کتے کا حال پوچھا۔ یہی کہ سلیم الطبع کُتا ہے یا ہارے ہوئے سیاست داں کی طرح پاگل ہم نے کہا ہماری نظرِ انتخاب میں کُتا غیر سیاسی ہے اور پاگل پن سے دور بھی۔ پتہ نہیں تقدیر کی کس ناکامی سے جلا بھُنا بیٹھا تھا کہ کاٹ لیا ورنہ یہ بات اس کی شان سے بعید ہی تھی۔ ہم تو سگ مزاج انسانوں سے بھی دور دور ہی رہتے ہیں چہ جائیکہ خود کتوں سے کیسے قریب آسکتے ہیں۔ کُتا کسی غلط فہمی کا شکار ہوا اور ہم کتے کا شکار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم کتے کی خیریت دریافت کرتے رہیں۔ کتے کو پاگل نہیں ہونا چاہیئے۔ اور انسانی بدن میں بجائے خود اتنا زہر ہوتا ہے کہ وہ اچھے بھلے کتے کو پاگل کر ڈالے۔ وہ وہ بے چارہ انسان کو کاٹ کر بعض وقت پچھتا تا بھی بہت ہے۔ نتیجتاً خود پاگل ہو جاتا ہے۔ ہمیں پہلی دفعہ کتے پر رحم آیا۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کتے کی عدم خیریت کس طرح محسوس کی جائے ڈاکٹر صاحب نے تب کہا کہ وہ معمولات سے کسی قدر ہٹ جاتا ہے کچھ اپنے آپ میں مگن رہنے لگتا ہے گویا کسی مجذوب کی طرح فنا فی الذات ہو جاتا ہے۔ بیشتر مراقبے کی حالت میں ہوتا ہے البتہ یہ اثرات قوی ہو جائیں تو انا الحق کے نعرہ کا امکان بھی ہے۔ اور پھر انا الحق کا انجام کیا ہونا چاہیئے اس سے تو آپ واقف ہی ہیں جب منصور نہیں بچ سکے تو کُتا کس کھیت کی مولی ہے ـــــ فی الحال ڈاکٹر صاحب نے ٹیٹنس کا انجکشن دے دیا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ چنانچہ دواخانے میں بھی اتوار کی چھٹی ہوتی ہے۔ ایکسپریس ڈلیوری کیسس بھی بڑی مشکل سے بار پاتے ہیں ورنہ موت بھی آئے تو اسے ایک آدھ دن سڑنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ پیر سے ہم نے کتے کے کاٹے کے ٹیکے لینا شروع کیے۔ پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ٹیکہ اندازی کے مقامات اوجھل ہوا کرتے ہیں۔ نرس کے ہاتھ میں کنگ سائز سیرنج دیکھ کر ہم نے سوچا کہیں غلطی سے ہم دواخانۂ علاجِ حیوانات میں تو نہیں آگئے۔ مگر کھلا کہ انسان بھی چونکہ حیوانِ ناطق ہی ہے لہٰذا یہ ٹیکہ یہ سیرنج بھی اسی کے لئے ایجاد ہوا ہے۔ A R V ٹیکہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ نتیجتاً درد بھی ہوتا ہے اور اُسے سینکا بھی نہیں جا سکتا۔ اور ایسے مراحل سات یا دس یا پھر اور زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور یہ صرف کتے کے مزاج پر منحصر ہے۔ یعنی اگر کُتا خیریت سے ہو تو سات A R V ٹیکے کافی و شافی ہوں گے اگر کتے کے ہوش و حواس جواب دے چکے ہوں تو دس یا پھر اور بھی ہو سکتے ہیں۔

تیسرے چوتھے دن اُن صاحب سے ملاقات کی سبیل نکالی جن کا کہ کُتا تھا۔ معلوم ہوا کہ صاحب موصوف سے بس میں اکثر ملاقات ہوا کرتی ہے مگر چونکہ کوئی وسیلۂ سگ گزیدگی درمیان میں نہ تھا! اس لیئے اُن سے تعارف نہیں تھا۔ اُن سے ہم نے بعد سلام عرض کیا کہ بھائی صاحب آپ کے کُتے کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے دیگر احوال یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ناچیز تین ٹیکے لے چکا ہے چنانچہ پیٹ کے سکور بورڈ پر فی الحال تین گومڑے موجود ہیں۔ باقی آئندہ حسبِ توفیق اور آئیں گے انشاء اللہ انہوں نے کہا کہ میرے کتے کے گلے میں نمبری پٹہ ہے کسی اور کتے نے کاٹا ہوگا۔ ہم نے عرض کیا کتا چاہے تو میا یا ہوا ہو کہ نہ ہو کوئی فرق نہیں پڑتا

اور یوں بھی سرکاری کتّے کچھ زیادہ ہی کاٹتے ہیں۔ گزشتہ دنوں اخبار میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ بھارت کے ایک مرکزی وزیر کے کتّے نے حزب مخالف کے ایک بہت بڑے لیڈر کو جن کا ایک فرقہ پرست جماعت سے بڑا گہرا تعلق ہے' کاٹ کھایا۔ ایسا لگتا ہے کتوں میں بھی فرقہ پرستی کے عناصر کام کرنے لگے ہیں ایسا لگتا ہے یہ کتا میناکشی پورم کے واقعات سے بہت متاثر ہے اور ایک بڑی پارٹی کی غلط بیانیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر اس کے ایک نمائندے سے ہاتھاپائی کر ڈالی مرکزی وزیر تو خیر قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈنر کھاتا رہے گا لیکن بے چارہ حزب مخالف کا لیڈر پیٹ میں سوئیاں کھا کھا کر پارلیمان میں آواز اٹھانے سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح بعض قومی مسائل شاید آسانی سے طے ہو جائیں۔ تو بھائی کتے کا کیا بھروسہ اس کے سرکاری یا غیر سرکاری ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پتہ نہیں کب ارادہ بدل دے جس طرح بعض سیاست داں پارٹی بدل دیتے ہیں۔ تو ہم آپ کے کتّے کے کاٹنے سے شاکی نہیں۔ ہمیں نہ صرف اپنی جان پیاری ہے بلکہ آپ کے کتّے کی جان بھی عزیز ہے۔ اگر اس کی جان پر بن آئے تو ہم اپنی جان دے دیں گے۔ تب موصوف کو اطمینان ہوا کہ ہم ان کے کتّے کے خلاف کسی کارروائی کا ارادہ نہیں رکھتے اور انہوں نے اس کی خیریت کی خبر دی۔ اس کی خیریت کی اطلاع ملتے ہی ہماری باچھیں کھل گئیں۔

کتّے کے کاٹنے کے بعد کے اثرات بہت صبر طلب تھے۔ ٹیکہ اندازی کی مہم سر کرنے کے علاوہ بعض مرغوب چیزوں سے رضا کارانہ ہاتھ دھونا پڑا۔ ڈاکٹر نے لاکھ کہا کہ کھانے پینے' نہانے پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر اماں نے حکم صادر فرمایا کہ کوئی میٹھی چیز نہیں کھاؤ گے حتی کہ چائے بھی پھیکی یا حسبِ ذائقہ کھاری ملے گی ـــــ اور خالص شہد کا ایک بڑا بوتل جو ہم خاص طور پر اپنے لئے لائے تھے اس پر ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے ہاتھ صاف کرتے رہے۔ ہم نے اماں سے کہا بھی کہ دیکھئے خالص شہد کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اُسے کتّا منہ نہیں لگاتا خدانخواستہ اگر ہم میں کتّے کا زہر سرایت کرجاتا تو شہد سے یہ رغبت نہ ہوتی۔ مگر ہماری شنوائی نہ ہوئی جہاں ہم نے کسی میٹھی چیز کو ہاتھ لگایا' بچوں نے اپنی دادی ماں کو آواز دی ـــــ اور گھر کے اندر میٹھے سے دوری کا وہ نفسیاتی اثر ہوا کہ گھر سے باہر بھی ہاتھ لگاتے ڈر ہوا۔ ڈاکٹر کے مشورے کے باوجود۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی ـــ اس لئے کہ آج کل ڈاکٹری بھی رشوت کے وسیلے مل رہی ہے آپ اسے رشوت کے بجائے ڈونیشن DONATION کہہ لیں۔ ڈاکٹری مشورہ اگر حسبِ حال یا حسبِ روایت نہ ہو تو آدمی ذرا ہچکچاتا ہی ہے۔

جیسے کتّے کو اپنے سردار سے وقت پر روٹی نہ ملے تو وہ ایسے آدمی کے آگے بھی دُم ہلاتا ہے جو اُسے وقت پر روٹی کا ٹکڑا ڈال دے۔ لاحول ولا قوۃ بات پھر پھر کر پھر کتّے کے موضوع پر آرہی ہے۔ دراصل کتّے کے کاٹنے کے بعد اپنے آپ میں بعض عجیب وغریب تبدیلیاں محسوس ہو رہی ہیں طبعیت میں چڑچڑاپن آگیا ہے یعنی ہر چھوٹی بات پر کاٹنے کو دوڑنا چاہتی ہے کچھ غیر شرعی حرکتوں پر مائل ہے مگر آپ کا اور اپنا وقار حائل ہے۔ اس لئے صحت یابی کی دُعا فرمایئے کہ اس میں آپ ہی کا بھلا ہے۔

● مضامین صاف خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھ کر ارسال فرمائیں

ادارہ

ضرورت رشتہ

حیدر بیابانی

یہ اشتہار اے مرے غم خوار چھاپنا
اے ساکنانِ کوچۂ اخبار چھاپنا

بیوی کی بے شمار ضرورت ہے اب مجھے
ٹی بی ہو، یا بخار ضرورت ہے اب مجھے

کالی بھی ہو، اگر تو گوارہ لگے مجھے
تاکہ بُری نظر سے ہمیشہ وہ بچ رہے

محفل میں وہ رکھے مری مردانگی کی لاج
گھر میں بلا سے لیوے اگر مجھ سے کام کاج

ہو بڑبڑی اگر تو مجھے کوئی غم نہیں
کیوں کہ حضور میری سماعت میں دَم نہیں

ساری پڑوسنوں کو جو لڑنے میں مات دے
میرے حریف کے بھی مقابل کمر کسے

گرجاؤں ضعف سے تو مجھے گھر میں لاسکے
چھ سات من کا بوجھ جو تنہا اُٹھا سکے

اُنگلی پکڑ کے جاؤں میں اس کی ہر ایک جا
بیوی کے روپ میں ہو، جہاندیدہ رہنما

اک شرط یہ بھی ہے کہ ملے اتنا کچھ جہیز
تا عمر میں کمائی سے کرتا رہوں گریز

دس سال ہو، جسے بھی گرہستی کا تجربہ
شادی کا پیش آئے جسے پہلے حادثہ

ترجیح اس کو دوں گا ہر اُمیدوار پہ
ہووے نہ اس کا حُسن اگرچہ بہار پہ

بچپن میں، میں پلا ہوں بڑے لاڈ و پیار سے
تھا دور کا نہ واسطہ جھڑکی سے مار سے

پانی کی طرح پی ہے ہر اک درد کی دوا
دس سال تک نہ جسم سے مکھی اڑا سکا

مرکز تھا ماں کے پیار کا، بابا کی جان میں
بی بی کے "نونہال" ہوا ہوں جوان میں

ویسے جلایا خوب ہے اپنوں نے بھی مجھے
داغ مفارقت دیئے دانتوں نے بھی مجھے

چیچک کا ایک آنکھ مری ہو گئی شکار
شیشے کی آنکھ لائی ہے رُخ پر مگر نکھار

اک پیر چھوٹا ہے مرا اک پیر ہے بڑا
چلتا ہوں تو لگے ہے کہ کرتا ہوں بھانگڑا

قبضہ جما چکی ہے مرے گھر میں مفلسی
لیکن ہے میرے پاس تو دولت خلوص کی

اک بار اتفاق سے شادی ہوئی مری
کڑ کڑ کے لوگ کہتے ہیں بیوی وہ مر گئی

روتی تھی میری شکل کو وہ دیکھ دیکھ کے
کس قدر باوفا تھی خُدا مغفرت کرے

اب جو بھی خوش نصیب مرا گھر بسائیگی
کچھ بچیوں کی پہلے سے ماں کہلائے گی

ڈاکٹر سمیع بن سعد

اعتراض

اعتراض ......؟ جی ہاں اعتراض ..... کیوں آپ کیوں چونک گئے یعنی آپ کو بھی اعتراض ہے ..... جی ہاں! یہ وہی اعتراض ہے جو نہ پیدل چلنے دے، نہ گدھے پر بیٹھنے دے، اور نہ گدھے کو اپنے اُوپر بٹھانے دے۔ ایک چھوٹا سا عمل، جس نے ساری دنیا کو چکرا دیا ہے۔ دنیا کے سارے کاروبار، سارے ہنگامے، ساری رونق، ساری چہل پہل اسی کی کارستانی ہے۔ دنیا کی تخلیق، آدم کی تخلیق، جنّت کی تخلیق، جہنم کی تخلیق، سب کی تخلیق جو ہوئی اسی اعتراض کی بدولت۔ اس پر شاید آپ کو اعتراض ہو، لیکن یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ آپ کے اس اعتراض پر مجھے بھی اعتراض ہے۔

'لا' پر اعتراض ہوا، کائنات کی تخلیق ہوئی، زمین کی ویرانی پر اعتراض ہوا، بابا آدم کی تخلیق ہوئی۔ فرشتوں کو آدم کو سجدے کا حکم دیا گیا، جو اس لفظ سے واقف نہیں تھے بے چوں و چرا جھک گئے۔ لیکن حضرت ابلیس جو واقف تھے، سجدے پر اعتراض کیا کہ یہ خاک کا پتلا آگ کا، بھلا اس کی میری برابری؟ سجدہ نہیں کیا۔ اسی اعتراض کی وجہ سے حضرت ابلیس اور اولادِ آدم میں وہ دشمنی ہوئی جو جہنم کی آبادی کا باعث بنی۔ خدا نے آدم کو شجرِ ممنوعہ کھانے سے منع کیا، بھلا حضرت ابلیس جو اس لفظ سے واقف تھے وہ کہاں چوکتے اُن کو آدم کے خدا کے حکم ماننے پر اعتراض ہوا اور انہوں نے یہ لفظ بی بی حوّا کے کان میں پھونک دیا۔ حضرت آدم و بی بی حوّا نے اعتراض کو اپنا حق مانتے ہوئے، شجرِ ممنوعہ نہ کھانے دینے پر اعتراض کیا اور پھر اسی اعتراض کی بدولت اُنہوں نے شجرِ ممنوعہ کھایا جو اُن کے سفرِ کرۂ ارض اور پھر دنیا کی آبادکاری کا باعث بنا۔ اب آپ ہی بتلائیے! دُنیا کی آبادی کا باعث کون؟ "اعتراض"۔ اب آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

تب سے اعتراض آدم کی گھٹی میں رچ بس گیا ہے، بچہ دنیا میں کیا آتا ہے زور و شور سے اعتراض شروع ہو جاتا ہے۔ ہم نے تو صرف کانوں سے سُنا، باقی واللہ عالم بالصواب، لیکن اتنا جانتے ہیں کہ جو آیا اعتراض کرتا ہوا اور جو گیا [illegible] تو کیا آپ نے بھی شاید کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی ننھے میاں ہنستے کھیلتے ہوئے وارد ہوئے ہوں اور نہ کوئی صاحب بڑے خوش و خرم اِس دُنیا

سے روانہ ہوئے ہوں ، صاحب یہ تو وہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت عزرائیل بھی ایک بار ڈگمگا جائیں اس اعتراض کو ہم آپ عالم سکرات کہتے ہیں۔ آخر کار عزرائیل کو زبردستی ڈیٹو استعمال کرکے اس اعتراض کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ آج تک تو یہ ہوتا آیا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کو دنیا کی آبادی پر اعتراض ہوتا تو وہ کسی وبا کو نازل کرکے آبادی معمول پر لے آتے لیکن انسانوں کو ان وباؤں پر اعتراض ہوا تو انہوں نے انہیں ختم کرنے کے لئے دوائیں ایجاد کیں لیکن کچھ لوگوں کو اُن کے خالص ہونے پر اعتراض ہے اس لئے وہ نقلی دوائیں تیار کرکے حضرت عزرائیل کے کام کو آسان بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ کہ دنیا کا ہر شخص معترض ہے اور مُردہ بے چارہ اعتراض سن رہا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں آپ کو یہ نقشے بہت دیکھنے کو ملیں گے۔ قوم کے رہنما اعتراضات میں مُبتلا ہیں اور قوم سُن رہی ہے۔

دنیا میں تاریخ نگاری کا وجود بھی اس اعتراض کی بدولت ہی ہوا ہے۔ دنیا کی تاریخ اعتراضات سے بھری پڑی ہے۔ خدا کو لوگوں کے اعمال پر اعتراض ہوا تو پیغمبروں کو بھیجا گیا۔ اُنہوں نے برائی پر اعتراض کیا تو انھیں بھی اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ مہابھارت کی اصل وجہ بھی یہی اعتراض ہے۔ کورُوں کو پانڈؤں کی برتری پر اعتراض ہوا تو اس اعتراض کو ختم کرنے کے لئے کرکشیتر کے مقام پہ جمع ہوکر اس اعتراض کو ختم کیا۔ سکندر کو دارا اور پورس کی بادشاہت پر اعتراض تھا۔ اسی لئے اس نے یونان چھوڑا اپنے آپ کو مصیبتوں میں ڈال، جان ہتھیلی پر لئے ایران سے ہندوستان تک آیا۔ دیکھئے ایک اعتراض انسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے اور کیا کیا کرواتا ہے۔

بابر کو ابراہیم لودھی پر اعتراض تھا جس کو اس نے میدان پانی پت میں دور کرلیا۔ یہ میدان اعتراضات دور کرنے کے معاملے میں تاریخ ہند میں مشہور ہے۔ جنگ پلاسی اگر اعتراض کی وجہ نہ ہوتی تو نہ یہاں انگریز آتے نہ حکومت کرتے۔ اعتراض نہ ہوتا تو کانگریس کی بنیاد پڑتی نہ جنگ آزادی لڑی جاتی۔ نہ خلافت، سودیشی، اہنسا کی تحریکیں چلتیں، نہ انگریز جاتے نہ خون خرابہ ہوتا۔ نہ گاندھی جی قتل ہوتے۔ نہ تاریخ یاد کرنے کی طالب علموں کو زحمت ہوتی، موجودہ دور کے چند مشہور مقابلے جو بیروت، ایران، عراق، فاکلینڈ وغیرہ کے میدانوں میں باقاعدگی اور بے قاعدگی سے ہوئے یا ہو رہے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے پر اعتراض کا نتیجہ ہی تو ہیں۔

ہماری روزانہ زندگی بھی اعتراضات سے بھری پڑی ہے۔ مُنّے میاں پیدائش سے اعتراض کرتے چلے آئے ہیں۔ بڑے ہونے پر انھیں دودھ پینے پر اعتراض، دوا پینے پر اعتراض، مٹی کنکر منہ میں ڈالتے ہیں، کوئی اعتراض کرے تو اس کا جواب بھی اعتراض سے دیتے ہیں یعنی بار بار وہی کام کرتے ہیں جس کے لئے انہیں منع کیا جائے۔ ماں باپ اور بڑوں کی مرضی کے خلاف عمل ان کا اعتراض ہے۔

مدارس تو اعتراضات کی کان ہے۔ استادوں کو طلبہ کے عمل پر اعتراض ہے تو طلبہ کو استادوں کے رویہ، امتحان لینے، نمبر کم دینے، مُرغا بنانے پر اعتراض، مدرسہ کے قوانین بنانے پر اعتراض، بلکہ مدرسہ کے وجود پر ہی اعتراض ہے۔ آئے دن ہونے والے ہنگامے، ہڑتالیں، گڑبڑ یہ سب اعتراض نہیں تو اور کیا ہیں؟

بے چارے نوجوانوں کا تو خدا ہی حافظ، آج تو وہ سراپا اعتراض بنے ہوئے ہیں۔ بیل باٹم لباس، اینا جھکٹ بال بجیب بدغریب شکلیں، یہ دراصل قدیم طرزِ زندگی اور وضعداری پر اعتراض کے مختلف انداز ہیں۔

صنف نازک کو تو اعتراض کے زندہ طلسمات کو استعمال کر [illegible]

نہیں دیں گے۔ اس کے لئے آپ جمیلہ بی ٹیڈوس سے ..... والا منظر دیکھ لیں۔

اب رہے حضرات وہ لوگ جو "بزرگوار" کہلاتے، سمجھے جاتے یا بن جاتے ہیں۔ جن کی نظر میں ہمارا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا کھانا پینا، ہر جائز اور ناجائز حرکت باعث اعتراض ہے۔ ان کے اعتراض کا ٹیپ کا جملہ یہ ہے۔

"کیا خراب زمانہ ہے ..... ہمارے زمانے میں تو ....." وغیرہ وغیرہ ان کی نصیحتیں سراسر اعتراض ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی بزرگی ختم ہو جائے گی دراصل نوجوانوں کو وہ اپنی بزرگی کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔

آپ کی نظر میں اعتراض کا عمل چاہے کتنا ہی قابلِ نفرین کیوں نہ ہو۔ لیکن کچھ لوگوں کے لئے عمل رحمت باری کا ہے۔ سیاسی میدان میں دیکھئے۔ اگر یہ اعتراض نہ ہوتا، تو نہ اتنے لیڈر پیدا ہوتے، نہ اتنی سیاسی پارٹیاں بنتیں نہ ہڑتالیں، نہ لوٹ مار، نہ اسمبلیوں میں جوتم پیزار، بڑے بڑے لیڈروں کے گھر بار، روزی روٹی اسی اعتراض کی بدولت چل رہی ہے۔ اگر وہ اعتراضات نہ کریں تو انہیں پوچھنے والا تک نہیں رہے گا۔ وکالت اور عدالت اعتراض کی بدولت قائم ہیں۔ بلکہ میری رائے میں میدان حشر میں بھی اعتراضات کی بوچھاڑ رہے گی۔ گویا یہ ازل سے شروع ہونے والا اعتراضات کا سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۲ء سے ۱۹۸۲ء

آپ کی پسندیدہ

لمسا چاکلیٹ چائے اور

لاسا اسپیشل چائے نے

اپنے ۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ مکمل کر لیئے ہیں

غزل

ڈاکٹر مجید اذر

مٹھائی دے کے ٹالا جا رہا ہے سینا میرا سالا جا رہا ہے

نئی تہذیب میں دلھا، دلھن کا اکاؤنٹ دیکھا بھالا جا رہا ہے

مشیکا، ساس کا، سالوں کا خرچ مرے کندھوں پہ ڈالا جا رہا ہے

نئی جورو جناب شیخ لائے پُرانی کو نکالا جا رہا ہے

پلا کر دودھ نفرت اور ہوس کا بھیانک ناگ پالا جا رہا ہے

ہے "ماہ عسل" اور جگہیں نہیں ہیں سمندر کو کھنگالا جا رہا ہے

تپش دے دے کے اپنے عارضوں کی ہمیں کُندن میں ڈھالا جا رہا ہے

ہے چالیسویں میں دعوت شیخ جی کی نوالہ پہ نوالہ جا رہا ہے

کٹی ہے بھینس سسرے کے دوارے چوتی کا مسالہ جا رہا ہے

وہ گھر والی سنبھالے کس طرح سے ابھی تو گھر سنبھالا جا رہا ہے

جو پوچھا ہے کہاں آذر تو بولے
وہ کیا گویا بگھٹا لا جا رہا ہے

⊙

نشتر سیوانی

وہ عشق میں مجنوں کا چچا نظر آتا ہے
چہرے سے تو اُلّو کا پٹھا نظر آتا ہے
معشوقہ کے ابّا نے پیٹا تھا کبھی اُس کو
خوابوں میں اُسے اب تک ڈنڈا نظر آتا ہے

کہلاتا ہے لیڈر جو باز اِس سیاست میں
لیکن کسی لیڈر کا چمچہ نظر آتا ہے

ہر چیز تو مہنگی ہے اِس دور میں نشتر اب
بس عشق ہی اب لوگو سستا نظر آتا ہے

شوشے

صوفی دھولیوی

★

ہر وقت لگا رہتا ہے میلہ مرے آگے
رہتا ہے محلے کا جھمیلا مرے آگے
بیگم بھی لڑاکا ہیں پڑوسن بھی لڑاکا
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

کیا کہوں دوستو کہ کیا نہ ہوا
میرے سجدوں کا یہ صلا نہ ہوا
جوتے چوری ہوئے ہیں مسجد سے
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

گھڑی تو آئی تھی بگڑی ہوئی بنانے کی
دکھائی راہ مقدّر نے جیل جانے کی
بڑی صفائی سے پاکٹ اڑا لیا تھا مگر
غضب ہوا کہ نظر پڑ گئی زمانے کی

اہل سفر بڑھاتے رہے رات بھر قدم
جب صبح کا اُجالا ہوا تو کھلا بھرم
رہبر کی رہبری پہ ذرا غور کیجئے
پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

رؤف خوشتر

سِتم ہائے روزگار

باوا آدم کو دُنیا میں روزگار کے روگ کا علم پہلے ہوتا تو وہ اماں حوّا کے سوگ نما ڈھونگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حکم عدولی کی ہمت کر بیٹھتے۔ لیکن یہ تو آدم اور اولادِ آدم کا مقدر ہے کہ زندگی کی راہِ پُرخار پر روزگار کے زخموں کو لے کر چلتا رہے۔ ہاں فرشتوں کو اس مسئلہ سے الگ رکھا گیا ہے اِسی لئے تو فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان ہونا کہا گیا ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ شریکِ حیات و پیشۂ بے ثبات دونوں پر غالب تھے۔ اب معاملہ برعکس نظر آرہا ہے۔ درونِ خانہ و بیرونِ خانہ میں بالترتیب بیگم اور پیشہ حاوی ہیں۔ ازدواجی اعتبار سے وہ "دلہن وہی جو پیا من بھائے" اور معاشی اعتبار سے "پیشہ وہی جو کالا دھن لائے" کے مقولہ پر کاربند نظر آتے ہیں۔

بقول غالب آج ہم سب رہینِ ستم ہائے روزگار ہیں"۔ کیا امیر اور کیا فقیر سبھی ہمہ وقت اپنے پیشہ میں ایسے مُبتلا ہیں کہ اس کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ سارے سفید پوشوں کو کالے دھن کی ایسی دُھن سوار ہے کہ راتوں رات عمارت خرید لیتے ہیں اور "ھٰذا مِن فضلِ ربّی" لکھ کر ایسے مطمئن ہو جاتے ہیں، جیسے کفارہ ادا ہو گیا ہو۔

پہلے پیشہ صرف گفتار اور تکرار کی حد تک صاحبِ پیشہ پر سوار تھا اب اس کا دخل کردار پر بھی ہو رہا ہے۔ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کیسے روزمرّہ زندگی میں پیشہ سے مجبور ہیں ملاحظہ ہو۔

ایک چور اور نقب زن ہیں جو باہر آتے ہی پھر اندر جانے کی دن رات (بلکہ صرف رات) کوشش میں لگے رہتے ہیں شکر ہے جب سے جیل کی اصلاحات ہو رہی ہیں انہیں اندر اور باہر کی دنیا میں کچھ خاص فرق نظر نہیں آتا۔ بعض سہولتوں کی بناء پر وہ زنداں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لئے جیل سے باہر آتے ہی گنگنانے لگتے ہیں۔

مشہر میں رہ کے دیرانہ مرا دل ہوتا جاتا ہے۔

ان کی بیگم کا ہیلی نے شوہر کی مصروفیت کے متعلق پوچھا تو بیگم نے کہا۔ شام ہی سے اُلجھا رہتا ہے ؛ شوہر ہوا ہے دماغ ابلیس کا

سہیل نے لقمہ لگایا۔ اچھا تو طارق بھائی اب سارق بن گئے ہیں۔ ایک دن بیگم نے الٹی میٹم دیا کہ مکان میں غلّہ اور پیسہ ختم ہو گیا ہے۔ پیشے سے مجبور ہو کر شوہر نامدار دوبارہ گرفتار ہوتے ہوئے کہا۔ "روپے لاتا ہوں، ذرا بینک تو بند ہونے دو"۔

ہمارے ایک دوست ہیں جن کی دواؤں کی دکان ہے۔ انکشاف کیا کہ اموات کی شرح میں کمی کا سبب دواؤں کا ترکِ استعمال ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ بیمار ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اس لئے کہ ڈاکٹر کو بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ پھر دوائیں خریدتے ہیں کہ دوا ساز کمپنیاں اور دوا فروش کا کاروبار چل سکے۔ دوائیں لا کر پھینکنا بھی ضروری ہے اس لئے کہ خود بیمار کو بھی زندہ رہنا ہے۔ ساحر نے کہا تھا جو دوا کے نام پہ زہر دے مجھے اُسی چارہ گر کی تلاش ہے۔ اب ہمیں تلاش کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس ملاوٹ کے دور میں کوئی شئے خالص نہیں۔

اسی دوا فروش کی بیٹی کی شادی ہوئی۔ رخصتی پر داماد کو ایک گوشہ میں لے جا کر سمجھا رہے تھے کہ بیٹی اکلوتی ہے بڑے ناز و نعم میں پلی ہے آرام سے رکھنا محبت سے پیش آنا۔ پھر پیشہ اپنا کام کر گیا اور بے ساختہ کہہ اُٹھے اسے دھول اور دھوپ سے محفوظ رکھنا۔ گویا دلہن نہ ہوئی ٹانک کی بوتل ہوئی۔

ایک صاحب جو خوش آواز تھے محفل میں دوسرے نغمے کی فرمائش پر دوبارہ وہی آئٹم دوبارہ یا دہرا کر سنایا کرتے۔ ہم نے کلاسیکی ٹائپ کے قدری بعد اس پوگا ٹائپ نغمہ سرا ہونے کا سبب پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ اُن کی ریکارڈوں اور گراموفون کی دکان ہے اور دن بھر ریکارڈ بجا کر پلٹتے رہتے ہیں۔ اسی محفل میں ایک صاحب بات بات پر چشم بد کی گردان کئے جا رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ماہر چشم ہیں اور اُن کی عینک کی دوکان ہے۔ اداکاروں پر اداکاری کا نقاب اُن کی ذاتی زندگی میں بھی لگا رہتا ہے۔ مشہور اداکارہ کی صرف صدیقی شادی پر شوہر بے قرار نے جب حُسن کی تعریف کی تو دلہن ادارہ بڑی مشکل سے شرماتے ہوئے اشتہار کا رٹا ہوا جملہ دا غا کہ میرا حُسن لکس صابن کا مرہونِ منت ہے۔

ہمارے ایک عزیز جن کو شاعری میں بھی دخل ہے۔ شادی کے بعد گھریلو آدمی یعنی عام قسم کے شوہر بن گئے۔ دوستوں نے ایک دن گھر سے باہر گھیر کر مصروفیت دریافت کی۔ وہ صاحب الاپنے لگے۔

اپنا تو دستور ہے یہ پُرانا
بیگم کو ہنسانا بچوں کو سُلانا

تو صاحبو اس دور میں ہم سب رہین ستم ہائے روزگار ہیں۔ غالب نے تو روزگار کے چکر میں بہادر شاہ ظفر اور ملکۂ انگلستان کی مدح سرائی کی تھی۔ آج ہم روزگار کے حصول اور اس کی بقاء کے لئے ایرے غیرے نتھو خیرے کی مداح سرائی پر مجبور ہیں۔ اس لیلائے روزگار کے ستم سے کوئی محفوظ نہیں۔ گویا میر ہوتے تو اس لیلیٔ روزگار سے یوں مخاطب ہوتے۔؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

انصاری اصغر جمیل

ناگپور

"ہم خادمِ قوم ہیں"

آہا! کتنا پیارا لفظ ہے "خادمِ قوم"۔ خادمِ قوم یعنی قوم کے خادم۔ قوم کی خدمت کرنے والے کو خادمِ قوم کہا جاتا ہے۔ یوں تو قوم کی خدمت کئی طریقوں سے کی جاسکتی ہے جیسے کہ تن، من اور دھن سے۔ لیکن عقل اگر کام کر جائے تو اس سے بھی قوم کی خدمت کی جاسکتی ہے جس میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی آئے چوکھا۔

اب سے دو سال قبل گریجویٹ ہونے کے بعد بھی جب ہمیں کہیں کوئی نوکری نہیں ملی تو یکایک خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی گرد آلود عقل سے کام لے کر قوم کی خدمت کی جائے (یوں بھی ایسے خیالات اُسی وقت آتے ہیں جب آدمی بیکار رہتا ہے) ہم نے اپنے بنائے ہوئے طریقے پر اپنی ہی ناقدانہ نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر میدانِ خدمت میں کود پڑے۔ ارے! ہم یہ تو بتانا ہی بھول گئے کہ پہلے ہم جس محلہ میں قیام پذیر تھے وہاں بچوں کے کھیلنے کے لئے ایک میدان واقع ہے اور اس میدان ہی کو ہم نے اپنی خدمت کا مرکز چن لیا۔ کسی نہ کسی طرح شہر کے رؤسا و داناؤں کی فہرست حاصل کی اور ایک ایک کر کے ان کی خدمت میں پہونچ گئے۔ (یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ میدان بلدیہ کا تھا اور ہمارا اس سے کسی بھی قسم کا تعلق نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ زمین حاصل کرنے کے لئے ہم نے رتی بھر کوشش بھی نہ کی تھی) رؤسا و داناؤں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ہم نے اپنا مرتب شدہ پلان ان کے سامنے رکھ دیا کہ اس زمین پر غریب اور نادار طلباء کے لئے اسکول و مدرسے تعمیر کرنا ہے جس کے لئے کثیر رقم درکار ہے۔ یقین جانیئے ہمارے پلان کی خوب تعریفیں کی جانے لگیں، کسی نے بھول کر ہمیں خادمِ قوم بھی کہہ دیا اور دل کھول کر ہمیں چندے دیئے جانے لگے۔ (ہائے رے بیچارے پیسے والے! یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی آیا وہ زمین ہمارے باوا کی جاگیر ہے یا ہم نے اسے بلدیہ سے کسی طرح حاصل کر لیا ہے۔ آخر وہ کرتے بھی کیوں کر جبکہ ہم نے سیاسی حربہ استعمال کر کے انہیں ہزاروں میں ایک ثابت جو کر دیا تھا) اس طرح ہمارے پاس بھی کافی دولت جمع ہو گئی۔ یہ بات ذرا الگ ہے کہ ہم آپ کو حاصل شدہ رقم کا ہندسہ بتانے سے قاصر ہیں کیوں کہ یہ بزنس سکریٹ ہے۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ یہاں ہمارا قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ ختم ہو گیا بلکہ اب تو تشنگی اور بڑھ چکی تھی لہذا اپنی خدمت کی رفتار

تیز کرنے کے لئے ایک عدیم النظیر عظیم الشان کل ہند مشاعرہ منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہماری نظریں ایک ایسے کم عقل انسان کی متلاشی تھیں جو اس مشاعرہ کی صدارت کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں خطیر رقم سے بھی نوازے۔ کہتے ہیں کہ خدا جب کسی پر مہربان ہوتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ملک کے ایک ایسے ہی حضرت کا ہمیں علم ہوا۔ ہم فوراً پہلی ٹرین سے ان کی خدمت میں پہونچے اور ان سے صدارت کی استدعا کی۔ وہ حضرت بھی شاید عرصہ سے کسی صدارت کے منتظر تھے فوراً حامی بھر لی اور ہمیں خطیر رقم دینے کا وعدہ بھی فرمایا۔ ان سے تاریخ طے کرنے کے بعد ہم نے ملک کے مشاہیر شعرائے کرام سے خط و کتابت شروع کر دی۔ نتیجتہً ملک کے آٹھ نامور شعراء نے ہمارے مشاعرہ میں شریک ہونے کی منظوری دے دی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہم انہیں کم از کم سو سو روپے بطور پیشگی روانہ کر دیں تاکہ وہ ٹرین پہ اپنا ریزرویشن کروا سکیں۔ ہم نے جب حساب لگایا تو شعراء کے کل سات ہزار روپے بنتے تھے اس میں سے آٹھ سو روپے انھیں بطور پیشگی روانہ کرنے میں ہمیں کوئی مضائقہ نظر نہیں آیا لہٰذا ہم نے فوراً ان کے حکم کی تعمیل میں سو سو روپے بطور پیشگی روانہ کر دیئے۔

نظامت کے سلسلے میں ہمارے ذہن میں ایک پلان یہ تھا کہ اشتہار میں ملک کے مشہور اناؤنسر کا نام دیا جائے لیکن اس سے خط و کتابت بھی نہ کی جائے اور یہ کام اپنے ہی محلہ کے ایک نوجوان سے لے لیا جائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی ہم نے بڑے سائز کا اشتہار شائع کروایا۔ صدر مشاعرہ، بیرونی شعرائے کرام اور ناظم مشاعرہ کے ساتھ ہی ساتھ جلی قلم میں اپنے نام کے آگے خادم قوم بھی لکھوا لیا۔ کاتب اشتہار کی مہربانی سے جب اشتہار منظر عام پہ آیا تو یہ دیکھ کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ صدر مشاعرہ کے نام سے زیادہ نمایاں اس میں ہمارا نام تھا۔ اس مشاعرہ کو یادگار بنانے کے لئے ہم نے سوئنیر بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا جس کے لئے بے شمار اشتہارات اکٹھا کئے۔ (یہ صحیح ہے کہ اشتہارات جمع کرنے کے لئے ہمیں بہت دقت اٹھانی پڑی۔ یہی نہیں بلکہ کئی جگہ تو ہمیں دھکے بھی دیئے گئے لیکن آپ کو ہماری ہمت کی داد دینی ہی پڑے گی کہ ہم بغیر اشتہار لئے وہاں سے ایک انچ بھی نہیں کھسکے) ایک خاص بات آپ کو یہاں یہ بھی بتا دیں کہ ہم نے اشتہارات کی رقم نقد وصول کر لی اور ادھاری کو خود سے چالیس قدم دور رکھا کیوں کہ یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک مرتبہ سوئنیر میں اشتہارات شائع ہونے کے بعد اس کی رقم وصول نہیں ہوتی خواہ ہم کتنی ہی ایمانداری سے ان کے اشتہارات شائع کئے ہوں۔

ٹکٹ کی فروخت کے لئے ہم نے "شعراء چوک" پر ایک سنٹر بھی بنا دیا لیکن افسوس کہ ٹکٹیں فروخت ہی نہیں ہو رہی تھیں چنانچہ ہم نے اپنے ملاقاتیوں کو ٹوپیاں پہنانی شروع کر دیں اور بڑی رقم کی ٹکٹیں زبردستی فروخت کر ڈالیں۔ خدا خدا کر کے مشاعرہ کا دن آ ہی پہنچا بیرونی شعراء کے قیام کے لئے ہم نے شہر کے عالیشان ہوٹل میں انتظام کر رکھا تھا۔ صبح سے ہی شعراء کی آمد شروع ہو گئی۔ اس سلسلہ میں ہم نے ایک قابل قدر کارنامہ یہ انجام دیا تھا کہ "شعراء چوک" پر ہی ایک بڑا سا بورڈ آویزاں کر دیا تھا اور جوں ہی کوئی بیرونی شاعر اسٹیشن پر نمودار ہوتا اس کا نام اس بورڈ پر تحریر کر دیا جاتا۔ غرض کہ شام تک تمام شعراء تشریف لے آئے جو کہ ہمارے شہر کی تاریخ میں اہم بات تھی لیکن نہیں آئے تھے تو صرف ناظم مشاعرہ (جنہیں ہمارے مشاعرہ کا علم بھی نہ تھا) عوام کے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے ہم نے اس بورڈ پر تحریر کر دیا کہ ناظم مشاعرہ رات میں ذرا دیر سے پہونچیں گے کیوں کہ وہ جہاز جس سے وہ تشریف لا رہے ہیں ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے بیچ میں کسی ایرپورٹ پہ رکا ہوا ہے اور درست ہوتے ہی اڑان بھرے گا۔ عوام نے ہماری باتوں پر مکمل اعتبار کر لیا۔

(یوں تو ہم نیا بھی اعتبار کرنے کے قابل)۔ اس کے بعد تو جیسے ٹکٹ سنٹر پر لائن لگ گئی۔ عوام جوق در جوق اپنے پسندیدہ شعراء کو دیکھنے اور سننے کے لئے ٹکٹیں خریدنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری ٹکٹیں ختم ہو گئیں۔ صدر مشاعرہ تو ایک روز قبل ہی ہمارے شہر میں وارد ہو چکے تھے اس لئے ان کی جانب سے ہم بے فکر تھے۔

سوینیئر شائع ہو کر آیا یہ دیکھتے ہی ہماری باچھیں کھل گئیں کہ ایک پورے صفحہ پر ہماری اِنلارجڈ فوٹو چمک رہی تھی اور وہ بھی عمدہ کاغذ پر۔ محسوس یہ ہو رہا تھا کہ مشاعرہ کی صدارت ہم ہی فرما رہے ہیں۔ واقعی ہمارے احباب نے اس کام کو عمدگی سے انجام دیا تھا۔ ارے ہاں! خوب یاد آیا۔ ایک بات تو ہم آپ کو بتانا بھول ہی گئے کہ اس دوران ہمارے ارد گرد کئی چمچے جمع ہو گئے اور لگے ہماری چمچہ گیری کرنے۔ ہم چوں کہ حاتم طائی کی اولاد ہیں اس لئے انہیں بھی کوئی نہ کوئی ذمہ داری سونپ دی سوائے لین دین کے معاملے کے۔ مشاعرہ میں ڈیکوریشن کے سلسلے میں ہم نے شہر کے مشہور ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کیں۔ معاملہ چار ہزار روپے میں طے ہوا۔ ہم نے انہیں ایک ہزار روپے بطور پیشگی ادا کر دیا (جس کا افسوس ہمیں آج تک ہے) ہمارے احباب واقعی بڑی یکسوئی سے اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ اور ڈائس سجانے میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دراصل ہمارے وہ احباب صرف ڈائس پر براجمان ہونے کے لئے ہی اتنی جانفشانی کر رہے تھے اور ہماری اِنلارجڈ فوٹو بھی انہوں نے ہی سوینیئر میں شائع کروائی تھی۔

صدرِ مشاعرہ اور شعرائے کرام کو شان و شوکت کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں لایا گیا اور سوینیئر کے اجراء کے ساتھ ہی مشاعرہ کا آغاز کر دیا گیا۔ وہیں ہم نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ہوائی جہاز جس سے ناظمِ مشاعرہ تشریف لانے والے تھے ہنوز سدھارا نہیں جا سکا۔ اس لئے ان کے تشریف لانے تک ایک نوجوان مشاعرہ کی کارروائی چلائے گا۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ عوام نے ذرا بھی ہوٹنگ نہ کی اور خاموشی سے برداشت کر لیا۔ مانو ہم نے انہیں ہپنا "ٹائز" کر دیا ہو۔ مشاعرہ شروع ہوتے ہی ہم نے ٹکٹ سنٹر سے ٹکٹوں کی فروخت سے حاصل ہوئی رقم اپنے قبضہ میں کی (صدرِ مشاعرہ سے تو ایک روز قبل ہی وصول کر لی تھی) اور ساری رقم سمیٹ کر مشاعرہ گاہ سے کافی دور نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ ہم ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ٹرین عرصہ ہوا ہمارا شہر چھوڑ چکی ہے۔ ہم تقریباً ایک سال تک اس شہر سے غائب رہے اس دوران ہمیں ہمارے شہر کا خیال تک نہ آیا کہ ان شعراء، صدرِ مشاعرہ اور ڈیکوریٹر کا کیا ہوا۔ اور جب دوبارہ لوٹے تو اس وقت تک معاملہ سرد ہو چکا تھا۔ اب ہم لاکھوں کے مالک تھے اور کوئی ہم پر انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا کیوں کہ ہمارے پاس بے شمار دولت تھی اور ہمارے ملک میں جن کے پاس ڈھیر سی دولت ہو ان کے لئے سارے جرائم معاف ہوا کرتے ہیں۔

تب اور اب میں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ہم خود کو خادمِ قوم کہلانا پسند کرتے تھے۔ یعنی اپنے نام کے آگے زبردستی لکھ کرتے تھے اب ہماری قوم خود ہی ہمیں قوم کا سچا خادم کہتی ہے اور اپنے ہر پروگرام میں ہمیں یاد کیا کرتی ہے۔ اور ہم بھی واقعی خادمِ قوم۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ ہم نے قوم کی کچھ خدمت کی ہے یا نہیں۔ [illegible] رقم تھی اور جس کے بوجھ تلے [illegible] ہم نے اس کا بوجھ کتنی آسانی سے کم کر دیا ہے۔ اس لئے ہم اب فخر سے کہہ سکتے ہیں اور آپ کو بھی کہنا ہوگا کہ "ہم خادمِ قوم [illegible]

★★

"غریبی دُور کرنے کا ایک ہی منتر ہے —
اور وہ ہے واضح مقصد اور ڈسپلن کے
احساس کے ساتھ سخت محنت"

— اندرا گاندھی

ستیہ میو جیتے — شرم ایو جیتے

davp 82/514

صباح الدین ہاشمی
★
علیگڑھ
★

ہائے استاد کا بیاں ہو جائے

جب بھی کسی بچے کی آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں کتاب کا تھیلا دیکھتا ہوں تو ماضی کے اوراق بے ساختہ اُلٹنے لگتے ہیں۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب میرا ذہن اس ورق پہ مرکوز ہو جاتا ہے جہاں صرف کتاب، پنسل، سلیٹ اور آنسو نظر آتے ہیں۔ اور میری بھی آنکھیں اسی بچے کی مانند ہو جاتی ہیں اور ایسے ہی لوگ کہتے ہیں کہ "بچپن کا زمانہ سنہرا زمانہ ہوتا ہے"۔ لیکن اب یہ بات بہت پُرانی ہو چکی ہو سکتا ہے یہ بات اس وقت کہی جاتی ہو جب لوگوں میں تعلیم جیسا 'جان لیوا' طریقہ رائج نہ تھا۔ اب لوگوں نے تعلیم حاصل کرنا اپنا فرض اولین سمجھ لیا ہے اس لئے یہ کہنا کہ "بچپن کا زمانہ سنہرا زمانہ ہوتا ہے"۔ میرے خیال سے بچوں کے ساتھ سراسر ظلم ہوگا۔
ذرا سا ہوش سنبھالا پھر بے ہوش کرنے والے مولوی صاحب مل گئے اور درجہ بدرجہ ان کا ظلم و ستم بڑھتا ہی گیا۔
مجھے بھی پہلی بار جس مولوی صاحب سے سابقہ پڑا وہ تو دیکھنے میں بہت ہی نیک تھے کیونکہ اُن کی آنکھیں ڈراؤنی تھیں وہ چھڑی ہی رکھتے تھے مگر فطرتاً بہت ہی بُرے انسان تھے۔ بُرے اس لئے تھے کہ ہمیشہ پڑھنے پڑھانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔
کہتے ہیں کہ معصوم بچوں کی دُعاؤں کا اثر زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اگر بچوں کی دعاؤں میں اثر ہوتا تو مولوی صاحب کبھی کے اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے۔ اور جب دعائیں بھی ناکام ہو جاتیں تو سارے بچے دل ہی دل میں مولوی صاحب کے پورے خاندان کو جتنی گالیاں یاد ہوتیں دیتے اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتے کہ چلو مولوی صاحب سے مار کا بدلہ لے لیا۔
مثل مشہور ہے کہ بلی کو خواب میں دودھ ہی نظر آتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مولوی صاحب سے خوب پٹ جانے کے بعد میں روتے روتے سو گیا خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب مر گئے بہت سارے لوگ جمع ہیں اور رو رہے ہیں اور ساتھ ہی میں بھی اس طرح رو رہا تھا جیسے آج کل کی ماں اپنی جوان بیٹی کے مر جانے پر روتی ہے۔ اور جب میرے کانوں سے مولوی صاحب کی آواز ٹکرائی تو میرے سارے سپنے بکھر کر چور چور ہو گئے اور بات یہ بھی ہے کہ سپنے تو صرف دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔۔۔!!
مولوی صاحب کے بعد جس استاد سے میری ملاقات ہوئی وہ مولوی صاحب نہیں بلکہ ماسٹر صاحب تھے۔ آپ کی اُلجھن اللہ

کرنے کے لئے مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب کے فرق کو واضح کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب وہ ہوتے ہیں جو تیس روپئے مہینے اور تین وقت بھر پیٹ کھانا پر پڑھانے کے ساتھ پورے گھر کی غلامی کرتے ہیں۔ غلامی کا مطلب ہے کہ کوئی زیادہ کام نہیں کرتے صرف بیل کو کھلاتے ہیں، بکری کو ادھر اُدھر باندھ دیتے ہیں اور کبھی کبھی بازار بھی کر جاتے ہیں۔ اور یہ کام اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ مولوی صاحب کے پاس تیسرا پاس کی بھی ڈگری نہیں ہوتی۔

ہاں! تو میں ذکر کر رہا تھا ماسٹر صاحب کا بھئی! ماسٹر صاحب تو بہت نیک تھے ان کا اصول تھا کہ "کسی کے ذاتی معاملے میں دخل نہ دینا چاہئے۔" اس لئے وہ بچوں کے بھی ذاتی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے بچے جہاں بھی جائیں انھیں اپنی ناول سے کام ہے! اسی وجہ سے بچے ان سے بہت پیار کرتے تھے۔

ہمارے تیسرے استاد تو بہت ہی قابل تھے۔ ان کی قابلیت کا واقعہ لوگ یوں بیان کرتے ہیں۔ ایک بار ڈپٹی صاحب اسکول میں آئے مولوی صاحب بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ سلام کلام کے بعد ڈپٹی صاحب نے ایک بچے سے پوچھا "بتاؤ دسرتھ جی کا دھنش کس نے توڑا؟" بچے نے ڈرتے ہوئے کہا "میں نے نہیں توڑا کلو نے توڑا ہے"۔ پھر کلو نے کہا "للو نے توڑا ہے" اور اس پر ماسٹر صاحب بول اُٹھے "جانے دیجئے حضور! بچے ہیں، کسی نے توڑ دیا ہوگا"۔

چوتھے استاد کو تو ٹھیک ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ کبھی کبھی کچھ پڑھا دیا کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں کلاس میں بیٹھا شور مچا رہا تھا اس پر ماسٹر صاحب بگڑ کر کہنے لگے "زیادہ شور مچاؤ گے تو جو پڑھایا ہے وہ بھی چھین لیں گے۔ رحمان چچا جو ان کے بغل میں بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے "ماسٹر صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو پڑھا دیا ہے اسے کیسے چھین لیں گے"؟ پھر ماسٹر صاحب بول اُٹھے "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ دس دن پڑھانا چھوڑ دوں گا نیا سبق تو یاد ہوگا نہیں آموختہ تو آتے جاتے بھول جائے گا"۔

لیکن صداقت ان کا شیوہ تھا اسی وجہ سے کہا کرتے تھے کہ "میرے شاگرد کا لکھا ہوا خط کلکتہ نہیں جا سکتا اور اگر چلا جاتا ہے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہے"۔

ایک اور استاد جو پڑھانے سے زیادہ کھانے کی باتیں کیا کرتے تھے، وہ تو نہ مولوی تھے نہ ماسٹر تھے بلکہ جوہر سیوانی کے مطابق "آدھا ادھر آدھا اُدھر" تھے۔ اگر انہیں موڈرن مولوی کہہ لیجئے تو بیجا نہ ہوگا۔ بہر حال تو وہ اپنے طالب علمی کے زمانے کا قصہ اکثر پڑھاتے وقت سنایا کرتے تھے کہ جب میں دہلی میں تھا تو فلاں نواب کے یہاں پانچ سو من کا دیگ چڑھتا تھا اور فلاں کے یہاں دعوت شیراز کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

ایک اور بات جو ان کے سلسلے میں قابل تعریف ہے کہ وہ ماسٹر کی تعریف بڑے ہی جامع الفاظ میں کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ "ماسٹر تین طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا ماسٹر جو کبھی کبھی بچوں کو کچھ پڑھا دیا کرتا ہو۔ دوسرا ماس ٹر یعنی جس کے جسم سے گوشت ختم ہو گیا ہو۔ تیسرا ماہ ٹر، جو ماہ کے ٹرنے یعنی ختم ہونے کا انتظار کرتا ہو۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ مجھ جیسا شخص تھا کہ ایسے استادوں کی شفقت میں رہتے ہوئے پانچواں پاس کر لیا

میں سوچتا ہوں کاش! میرا لکھا ہوا خط کلکتہ پہونچ جاتا اور یہی کہہ کر صبر کر لیتا ہوں کہ

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اس پہ طرّہ یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ "میں پُرانے زمانے کا پانچواں پاس ہوں" اس لئے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طالب علم بھی میری علمی صلاحیت کا لوہا مانتے ہیں۔

ہند و پاک کے عظیم طنز و مزاح نگار شاعر رضا نقوی واہی کے فن اور شخصیت پر

ماہنامہ نکھارِ ادب ایک نادر تحفہ پیش کر رہا ہے۔

رضا نقوی واہی نمبر

اِس نمبر میں رضا نقوی واہی کی شاعرانہ بصیرت، فکر و فن، اَدبی مقام و مرتبہ اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر سیر حاصل مضامین کے علاوہ واہی صاحب کی بہترین اور معرکۃ الآراء نظموں کا اِنتخاب بھی شامل ہوگا۔

عمدہ کاغذ، اعلیٰ کتابت و طباعت اور خوبصورت پلاسٹک کور سے مزین

مارچ ۸۳ء کے پہلے ہفتے میں منظرِ عام پر آرہا ہے

صفحات ۲۰۰ ـــــ قیمت ۲۰/- روپئے
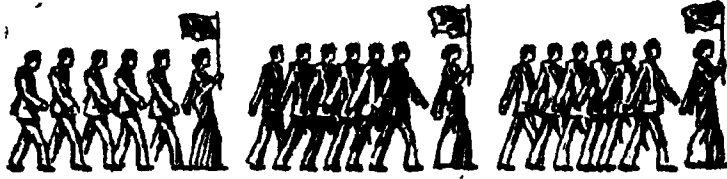
مینجر نکھار پبلی کیشنز۔ مئو ناتھ بھنجن (یو۔پی)

سدا بڑھتے قدم

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔

اسٹیڈیم ریکارڈ ٹائم میں تعمیر کئے گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن پر کھیلوں کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کمپیوٹروں، الکٹرانک ایکسچینجوں، مائکرو ویو اور مصنوعی سیارے کے ساتھ رابطوں کے عظیم سلسلے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔

تال میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے

اگر ہم دوسرے تعمیری شعبوں میں بھی اسی لگن سے کام کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

آیئے ہم سب مل جل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

davp 82/586

سید محمود حسن (ایم اے عثمانیہ)

جی تو یہ چاہتا ہے کہ ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار ...

کیوں کہ جب سے ہم سخت زکام کا شکار ہوئے ہیں لوگوں نے ہمارے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں شروع کردی ہیں۔ مختلف لوگ، مختلف دوائیں اور رائیں تجویز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہمارے ایک عزیز دوست جن کا اعتقاد تعویز، گنڈوں پر زیادہ ہے اُنہوں نے یہ تجویز رکھی کہ ہمیں کسی مُلاّ کو دکھانا چاہیئے۔ اور پھر کانا پھوسی کرتے ہوئے یہ بھی سُنا گیا کہ جمعرات کی رات کسی غریب کو کھانا ضرور کھلائیں۔ چونکہ جمعرات کی رات بڑی کٹھن ہوتی ہے۔

ہماری اہلیہ کے ایک عزیز ملنے کو آئے تو انہیں ہماری سردی زکام کی اطلاع ملی۔ اُنہوں نے فوراً یہ تجویز ہماری اہلیہ کے سامنے رکھی کہ ہمیں فلاں درگاہ لے جانا چاہیئے۔ جہاں بیماریاں تو کجا، دیوانے بھی اچھے ہو رہے ہیں۔

ہماری اہلیہ محترمہ بھی ذرا توہم پرست واقع ہوئی ہیں۔ اُنہیں تو گویا اپنے خیال کی تائید حاصل ہوگئی۔ اور اُنہوں نے اُن کے سامنے ہی کہنا شروع کر دیا کہ میں ہر وقت اُنہیں کہتی ہوں کہ فلاں بزرگ کے ہاں چلیں گے۔ مگر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں۔ اب آپ ہی انھیں سمجھائیں۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست جو دفتر کے بھی ساتھی ہیں۔ ملنے کے لئے پہونچے۔ اُن کو بہت سے ڈاکٹروں کے پاس جانے کا موقع ملتا رہا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے بیماری دیکھی نہ مرض پہچانا۔ فوراً کہنا شروع کر دیا کہ کیا آپ نے ڈاکٹر ماتھر کو دکھایا۔ ہم نے کہا نہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر ماتھر بچوں کا خصوصی ڈاکٹر ہے۔ پھر اُنہوں نے کہا۔ کیا آپ نے برہما جی راؤ کو دکھایا۔ ہم نے نفی میں جواب دیا۔ حالانکہ یہ دل کا خصوصی ڈاکٹر ہے۔ بہرحال حیدرآباد میں جتنے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اُنہوں نے اُن سب کے نام گنوا ڈالے مگر اُنہوں نے

یہ نہیں سوچا کہ مرض کیا ہے اور کس قسم کا ڈاکٹر اس کا علاج کر سکتا ہے۔ اور ہمارا مرض تو ایسا ہے کہ اسے بنا کسی ڈاکٹر کو بتائے بیند دور ہو سکتا ہے، مگر اُن کو اپنی دھونس جمانا تھا کہ وہ شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے واقف ہیں۔

ایک اور ساتھی جن سے ہمارے تعلقات عزیزوں جیسے ہیں۔ ہمارے مرض کی اطلاع اُن کو پہونچی۔ فوراً دوڑے دوڑے آئے اس بات کا انکشاف یہاں بے جا نہ ہوگا کہ۔ اُن کو اپنی اہلیہ کی تیمار داری کی وجہ سے جو ایک مدت مدید سے مرض کا شکار ہیں۔ کافی دواؤں کے نام یاد ہو گئے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ڈاکٹر کا پرانا نسخہ ہی اپنی اہلیہ کو استعمال کرا کے اپنے آپ کو نیم ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہمارے لئے بھی وہی نسخے تجویز فرمانے لگے۔ جو انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کے لئے استعمال کئے تھے۔ حالانکہ ہمارے مرض اور اُن کی اہلیہ کے مرض میں کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

ہماری خوشدامن صاحبہ جو اپنی بیٹی سے کہیں زیادہ توہم پرست واقع ہوئی ہیں۔ اُن کے کانوں میں بھی ہماری بیماری کی بھنک پہونچ گئی۔ وہ بے چاری دوڑی دوڑی آئیں۔ آتے ہی اُنہوں نے ہمارا صدقہ اُتارا۔

یہاں اس بات کا تذکرہ شاید بے محل نہ ہوگا کہ ساسوں کو اپنے داماد کا جس قدر خیال رہتا ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض اوقات تو بیٹے کی معمولی سی بیماری کو بہو کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ بیٹے کی ہر بیماری بہو کی کارستانی سمجھی جاتی ہے۔

ہماری خوشدامن صاحبہ اپنے دامن میں مختلف قسم کے میوے لئے ہوئے تشریف لائیں لیکن یہ میوے بیمار سے کہیں زیادہ صحت مند اور پرسان حال کے نصیب میں آئے۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ، ہمارے محلے میں ایک صاحب ہیں جنھیں لوگ مرزا عیادت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اُن کا کام ہر بیمار کی مزاج پرسی ہے بلکہ بعض اوقات تو وہ دوسروں کو بیمار کی عیادت کے لئے اُکساتے ہیں۔ اور مختلف دلائل اس سلسلے میں پیش کرتے ہیں کہ بیمار کی عیادت مذہبی، دینی، ملی اور سماجی فریضہ ہے۔

لیکن معلوم یہ ہوا کہ موصوف کو اس بات کا وسیع تجربہ ہو گیا تھا کہ ہر مریض کے ہاں کوئی نہ کوئی پھل، میوہ جات وغیرہ موجود رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مریض خود تو تمام پھل کھا نہیں سکتا لیکن مرزا صاحب جیسے پرسان حال کی خدمت میں ضرور پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح مرزا صاحب کو تازہ بہ تازہ پھل ہر روز کسی نہ کسی مریض کے ہاں مل جاتے تھے۔

مرزا کو بعض اوقات ایسے سخت قسم کے مریضوں سے بھی واسطہ پڑتا جو پھل تو کُجا پانی پلانا بھی نہیں چاہتے لیکن مرزا بھی ٹلنے والے آدمی نہیں۔ وہ فوراً اپنی طرف سے یہ کہتے کہ معاف کرنا میں کچھ میوہ جات وغیرہ آپ کے لئے نہ لا سکا۔ اس ہمدردی کے الفاظ کا وار مریض پہ بھرپور ہوتا۔ وہ فوراً بلبلا اُٹھتا کہ کوئی ضرورت نہیں۔ چونکہ پہلے ہی سے بہت سے میوہ جات سڑ رہے ہیں۔ بلکہ میں خود آپ کو کھلانے کی سوچ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنے پاس رکھے باکس سے تازہ پھل نکال کر مرزا کے سامنے پیش کر دیتا۔

ہماری بیماری نے بھی کیا کیا تماشے دکھائے ہیں۔ دور دور سے لوگ مزاج پرسی کے لئے چلے آ رہے ہیں خدمت کرتے کرتے اہلیہ محترمہ کا حلیہ بالکل قابل رحم ہو گیا ہے۔ اور ہمارا قرض اُن لوگوں کی سربراہی کرتے کرتے اور بڑھ گیا ہے۔ ہماری جیب پہلے ہی تنگ تھی

اب مزاج پرسی کرنے والوں کے قیام و طعام کے باعث اپنی تنگ دامانی کا گلہ بیانگ دہل کر رہی ہے۔ مگر مزاج پرسی کرنے والوں کی اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ ناک چڑھی رہتی ہے کہ صبح کے ناشتہ میں انڈہ نہ ملا۔ دوپہر کے سالن میں گوشت کم تھا۔ شام کا کھانا بگھارہ ہی ملا۔ ہمارا مرض تو ایک طرف ـــ شکایت لیئے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔ گویا یہ لوگ مزاج پرسی کرنے نہیں بلکہ مزاج داری کے لیئے آتے ہیں۔

ہم نے اپنی اہلیہ سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ سے آپ کسی کو ہماری کسی بیماری کی خبر نہ دیں۔ صرف ہمارے مرنے کی خبر ہی لوگوں تک پہنچنا چاہیئے۔ چونکہ ایسی مزاج پرسی سے مریض اچھا کم اور بیمار زیادہ ہوتا ہے۔

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور

کے مضامین

سمن زار قیمت ۸/- روپئے

ماہنامہ سہیل گیا کی فخریہ پیشکش

کیفی اعظمی نمبر

ہندوستان کے چوٹی کے فنکاروں کے ذریعہ عظیم ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کے
فکر و فن، شاعرانہ عظمت اور ادبی مقام و مرتبے کا تعین
کیفی اعظمی کی نمائندہ نظموں اور غزلوں کا انتخاب
اعلیٰ اور نفیس کتابت، خوشنما طباعت کیساتھ فروری ۸۳ء میں منظر عام پر آرہا ہے
صفحات تقریباً ۱۰۰ ـــ قیمت : صرف ۱۵ روپئے۔ ایجنٹ حضرات جلد از جلد اپنی کاپیاں محفوظ کرالیں
پتہ: ماہنامہ سہیل، ریلور سائڈ روڈ، گیا (بہار)

سرسوتی سرن کیفؔ
چندی گڈھ

آنا حضرت ادیب کا بوقت ناشتہ

ناشتے کے وقت مجھے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھا تو سارے خانوادے کو پریشانی ہوئی۔ بانو نے پوچھا "ابو طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" میں خاموش۔ زبیدہ نے استفسار کیا "دفتر میں صاحب سے کچھ کہاسنی ہو گئی؟" میں پھر خاموش۔ اب بڑی بی بھڑکیں "لے ہے! کیا نخرے دکھا رہے ہیں بڑھاپے میں۔ بچے پریشان ہو رہے ہیں ان کی ہتک ہو رہی ہے!"

میں نے آہ بھر کر کہا "بیگم، میں تم سے مہر بخشواتا ہوں۔ امّی جان جنت نشین ہوتیں تو اُن سے دودھ بھی بخشواتا۔"

اب وہ گھبرا اٹھیں "لے ہے، نوج ایسی منحوس باتیں کیوں نکال رہے ہیں زبان سے۔ اللہ کا کرم رہے۔ ایسی کیا مصیبت آئی ہے؟"

"آئی نہیں ہے آنے والی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں شام تک اس دارِ فانی میں رہوں یا نہیں۔ . . . . آدھے گھنٹے میں ادیب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ کئی مرتبہ ادھ مواکر کے چھوڑ گئے ہیں۔ ابکی ذرا زیادہ تیاری سے آ رہے ہیں" میرا یہ کہنا تھا کہ میرے سوا، میز پر بیٹھے ہوئے سارے لوگ تہقہے پر قہقہہ لگانے لگے۔ بڑا غصہ آیا۔ میری جان پر بن رہی ہے اور یہاں میرے ساتھ ہمدردی اس لیے دردی سے ظاہر کی جا رہی ہے۔ میں نے غرّا کر کہا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

بیٹی تو خاموش ہو گئی لیکن فریدہ صاحب نے فرمایا "مزاح نگار کا استقبال اور کس طرح کیا جائے؟"

"تو اُن کے آنے پر استقبال کرنا۔ ابھی سے کیوں شور مچا رہے ہو؟"

بھائی کی سمجھ میں کوئی معقول جواب نہ آیا تو بہن نے سہارا دیا "یہ تو ہم ریہرسل کر رہے تھے۔"

ریہرسل کے جواز یا عدم جواز پر بحث کی نوبت نہ آئی کیوں کہ وقت مقررہ سے آدھ گھنٹے پہلے ہی پردہ اُٹھ گیا تھا۔ ادیب صاحب تشریف لے آئے تھے۔ میں نے کرسی سے اُٹھ کر اُن سے مصافحہ کیا۔ شاید کچھ اسی انداز سے اہالیانِ قبر منکر اور نکیر کا استقبال کرتے ہوں گے۔

ادیب صاحب نے آتے ہی فرمایا "معاف کیجئے گا کچھ جلدی ہی آگیا۔ بات یہ ہے کہ چیف منسٹر صاحب . . . ."

بیگم صاحبہ کو خدا لاکھوں برس کی عمر دے مصیبت کے وقت خوب کام آتی ہیں۔ اُنھوں نے حضرت کا پہلا حملہ ناکام کر دیا۔

ادیب صاحب پندرہ بیس منٹ تک یہ بتاتے رہے کہ چیف منسٹر صاحب سے ان کے بہت پرانے تعلقات ہیں یعنی جب تک وہ چیف منسٹر نہیں ہوئے تھے ان کے رکشے کے ساتھ ساتھ دوڑا کرتے تھے اور گورنمنٹ کے ساتھ انھوں نے کئی برس تک گلی ڈنڈا کھیلا ہے اس کے پہلے ہی بیگم صاحبہ نے کہا "گولی ماریئے چیف منسٹر کو۔ آپ چائے تو پیجیے۔"

مجھے اطمینان کا سانس لیتے دیکھ کر بیگم صاحبہ کی رگ شرارت پھڑکی۔ جی ہاں، اب جوانی کے ناز انداز تو نہیں رہے لیکن بہ فضلِ ایزدی شرارت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اللہ رکھے کچھ اضافہ ہی ہوا ہے بسلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولیں "چیف منسٹر تو دو چار گھنٹے آپ کا انتظار کرلیں گے۔ اب آئے ہیں تو تھوڑی دیر ہم غریبوں کے ساتھ بھی۔۔۔"

ادیب صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا "بس بھابی آپ کی انہیں باتوں نے تو مجھے آپ لوگوں کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ورنہ آپ کی دُعا سے آپ کے اس غلام کی وہ وقعت ہے کہ اچھے اچھوں کے آگے گھاس نہیں ڈالتا۔ لوگ بلاتے رہ جاتے ہیں، بڑے بڑے لالچ دیتے ہیں لیکن میں تو اسی در کا بھکاری ہوں یہ آپ کی شیریں کلامی کا جواب ہے نہ آپ کے کھانا پکانے کا۔ آپ کا پکایا مرغ مسلم مہینوں تک خوابوں میں آکر بانگ دیا کرتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا اور اشاروں میں کہا "لو بھگتو مجھے پھنسانے کا نتیجہ۔ اب پکاؤ مرغ مسلم اور دسترخوان کی ککڑوں کوں!"

"لیکن بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ اس نے آڑے وقت پر ماں کی مدد کی کیا بتائیں انکل۔ ہم تو خود ہی آج مُرغ منگانے کی سوچ رہے تھے لیکن دوراہا سنگٹھن کی پولیٹکل کانفرنس کی وجہ سے ہوٹل والوں نے بازار میں ایک بھی مرغ نہیں رہنے دیا۔"

بات نہایت بے تکی تھی۔ دوراہا سنگٹھن نام کی کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے نہ اس وقت شہر میں کوئی سیاسی اجتماع ہو رہا تھا۔ لیکن یہی بے تکی بات جم گئی کیوں کہ حضرت ادیب کا سیاسی علم صفر سے بھی کم تھا۔ بات صرف جمی ہی نہیں بلکہ اُگ کر پھل پھول بھی دینے لگی! ادیب صاحب کو مرغ مسلم یاد نہ رہا۔ فرمانے لگے۔ "ہاں ہاں، میرے ضلع کے سنگٹھن والے مجھے اپنی یونٹ کا صدر بنانا چاہتے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا کیوں کہ مجھے ادب کی خدمت ہی سے فرصت نہیں ہے۔ ویسے وہ لوگ میرے انتظار میں ابھی تک عہدہ صدارت خالی رکھے ہوئے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے اپنی ہنسی کو کھانسی کا جامہ پہنایا اور غسل خانے میں پناہ لی۔ بچوں کی ہنسی پر پابندی ہی کیا تھی۔ مجھے ضرور غصہ آیا۔ میں نے کہا "یار میرے، کبھی تو عقل کی بات کیا کرو۔ دوراہا سنگٹھن کون سی جماعت ہے؟ آپ نے کسی کو ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ آپ کس ضلع کے باشندے ہیں۔ کس ضلع کی بات کر رہے ہیں؟"

حضرت ادیب کو جب دنیا میں بھیجا گیا تھا تو کچھ مسخرے فرشتوں نے ان کی کھوپڑی سے عقل نکال کر اس میں یاوہ گوئی بھر دی تھی لیکن جلدی میں چوری ٹھیک طرح نہ ہو سکی اور یاوہ گوئی کے ساتھ تھوڑی حاضر جوابی بھی آگئی تھی۔ بغیر پلک جھپکائے بولے "اجی وہ تو میں بچوں کو ہنسا رہا تھا۔" لیکن یہ ظاہر تھا کہ اس چکر میں مرغ مسلم اُن کے دماغ سے پرواز کر گیا تھا۔

"انکل جھانسی کے رہنے والے نہیں ہیں؟" بالا نے حیرت سے پوچھا۔ ان کا تخلص تو ادیب جھانسوی ہے؟"

میری طبیعت جواب دینے کی نہ ہوئی۔ ادیب جھانسی کے تو کیا ہوتے اپنی باسٹھ برس کی زندگی میں جھانسی ضلع کے چار سو میل اِدھر اُدھر بھی نہیں بھٹکے تھے۔ میری خاموشی کی تلافی فرزند عالی گہر نے کر دی۔ بولے "نہیں آپا۔ انکل کا تعلق جھانسی سے بالکل نہیں ہے

تخلص تک کے ساتھ جاسوسی تو اس لئے لگایا ہے کہ آئے دن ادبی انجمنوں اور رسائل کے ایڈیٹروں کو جھانسا دیتے رہتے ہیں۔"
میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ ادیب صاحب کا چہرہ پہلے سفید ہوا پھر سرخ۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دماغ کا آخری حربہ استعمال کیا یعنی ایک بے معنی فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولے" بڑے ذہین ہیں آپ کے بچے؟
میرا موڈ کافی ٹھیک ہو گیا تھا۔ میں نے کہا" نہیں، بچے تو لوں ہی سے ہیں۔ لیکن آپ کے کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اعتراف کر لیا ہے کہ آپ ادیبوں اور ایڈیٹروں کو جھانسا دیتے رہتے ہیں۔"
" ہا ہا ہا،" آپ کی باتوں کا بھی جواب نہیں" ادیب صاحب کا جواب تھا۔ ظاہر تھا کہ آج صبح صبح انہوں نے کسی منحوس کا منہ دیکھا تھا (بہت ممکن ہے آئینہ دیکھا ہو) اسی وجہ سے آج کا مرغ مسلم بھی مارا گیا اور انھیں بولنے کی بجائے سُننا بھی زیادہ پڑ رہا تھا۔ ایک سرکاری ماہ نامے کے ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے مجھے ہر چوتھے پانچویں دن ادیب صاحب کی کسی نئی تصنیف اور تین چار گھنٹے کی خود ستائی سے مملو بک بک کا التھاب پینا پڑتا تھا اور اس کے بعد بھی کئی گھنٹوں تک کام کرنے کا موڈ نہیں بنتا تھا۔ سگریٹ کا پورا پیکٹ ختم کر کے ہی ادیب صاحب کی تشریف آوری کی تاثیر مابعد (AFTER-EFFECT) دور ہوتی تھی۔ آج پانسا کچھ اُلٹا پڑ رہا تھا اور غیبی امداد کی طرح میرے بچوں کو فرصت بھی تھی اور ان کا موڈ بھی موزوں تھا۔
" ہاں انکل۔ پاکستان کے رسائل میں آپ کی کوئی تصنیف شائع ہوئی ہے اِدھر؟ صاحب زادے نے سوال کیا۔ میں نے انہیں نشم آلودہ نگاہوں سے دیکھا۔ آخر کیا تک تھی بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے میں؟ لیکن فرزند دلبند کو اپنے بزرگ کا شاید زیادہ پروا نہیں تھی۔ سوال جاری رکھتے ہوئے اُنہوں نے کہا" سُنا ہے ماہنامہ شرارت کے ایڈیٹر ابلیس عزازیلی پچھلے مہینے دلی آئے تھے۔ آپ کی تو ان سے ملاقات ہوئی ہی ہوگی؟" مجھے تعجب ہوا۔ گزشتہ مہینے پاکستان سے کوئی ادیب دلی نہیں آیا تھا۔
ملاقات کیا صاحب۔ پورے چوبیس گھنٹے ساتھ رہا۔ وہ ضد کر کے مجھے اپنے ہوٹل میں لے گئے اور زبردستی اپنے کمرے میں ٹھہرایا۔
بیٹی کو بولنے کے لئے تیار دیکھ کر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن معلوم ہوتا ہے پشتی تنزلی (GENERATION GAP) بہت بڑھ گئی ہے۔ اس نے میرا اشارہ نظر انداز کر کے بھائی کا ساتھ دیا۔ بولی" میں نے تو سُنا ہے کہ ابلیس صاحب ہوٹل میں ٹھہرے ہی نہیں تھے، اپنے بچپن کے ساتھی کنسا نندرا دنیہ کے گھر فروکش ہوئے تھے۔"
" ہاں ہاں" ادیب صاحب کی حاضر دماغی پھر کام آئی" میں کچھ کنفیوز ہو گیا تھا۔ ہوٹل میں تو مجھے طوفان بحرانی لے گئے تھے لیکن ابلیس صاحب سے بھی کافی دیر تک چائے پر گپ شپ رہی۔ رادنیہ خود مجھے اپنی کار پر لے گیا تھا۔"
" رادنیہ کے پاس کار کب سے ہو گئی۔ ان کا بزنس تو کافی ڈھیلا جا رہا ہے۔ تین مہینے پہلے انہیں اپنا اسکوٹر بھی بیچنا پڑا تھا۔"
" اب بھی مجھے کیا معلوم کہ کار اُن کی تھی یا کسی اور کی" ادیب صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ بچوں نے سمجھ لیا کہ کار کو زیادہ دوڑایا گیا تو حادثہ ہو جائے گا۔ چنانچہ شاہ راہ چھوڑ کر سیگ ڈنڈی پر آ گئے۔ صاحب زادے نے کہا" تعجب کی بات ہے انکل۔ مُنیر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ آپ ابلیس کے پیچھے گھنٹوں لگے رہے لیکن اُنہوں نے دو ایک بار کی ہاں نا کے علاوہ آپ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔"
" یہ مُنیر کا بچہ مجھ سے جلتا ہے اسی لئے اُلٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میرے خلاف۔ بالکل جھوٹ بولتا ہے کمینہ"

اصلیت یہ ہے کہ خود اسی کو ابلیس صاحب نے منہ نہیں لگایا۔ جب سے مجھے فرضی اکادمی کا انعام ملا ہے کئی پُرانے دوست جل رہے ہیں اور میرے دشمن ہوگئے ہیں۔" ادیب صاحب کے چہرے پر جلال آگیا تھا "مُنیر کی کسی بات کا یقین نہ کیا کرو۔"

"یہ آپ نے اچھا بتادیا" میں نے کہا "مُنیر کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ادیب سے بڑھ کر مزاح نگار ہندوستان میں تو ہے ہی نہیں پاکستان میں بھی شاید ہی ہو۔ اب اس کی باتوں کا یقین . . . . "

دراصل مُنیر سے زیادہ قابل نقاد اس شہر میں آپ کو نہیں ملے گا۔ کبھی کبھی وہ شرارتاً میرے خلاف کچھ کہہ دیتا ہے ویسے اُس کی ادبی رائے بہت صائب ہوتی ہے۔" ادیب صاحب نے پینترا بدلا۔

صاحب زادے نے آڑی دی "مُنیر صاحب یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اکادمی کا انعام آپ کے اڑیل پن کی وجہ سے ملا ہے۔ آپ اکادمی کے چیرمین کے مکان کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے اور بھوک ہڑتال کی دھمکی دے رہے تھے۔ اکادمی کے چیرمین سے چیف منسٹر ویسے ہی ناخوش ہیں۔ ان کے عہدے کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا اس لئے انہوں نے ممبروں کی منت سماجت کرکے انہیں آپ کا نام منظور کر لینے کے لئے رضامند کرلیا۔"

ادیب نے داڑں کاٹا "جھک مارتا ہے مُنیر۔ ایسے بات کرتا ہے جیسے اکادمی کا چیرمین خود ہی ہو۔"

"چیرمین نہ سہی، ممبر تو ہیں ہی" بانو بولی۔

"وہ تو میں نے ہی کوشش کرکے اُسے ممبر بنوایا تھا۔" ادیب صاحب کی جھنجھلاہٹ اب بے لگام سی ہوتی جارہی تھی۔

"خیر مُنیر صاحب جو چاہیں کہیں آپ کے ادب کو بڑی سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔" بانو نے ان کے زخموں پر مرہم لگایا۔ "پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں ایک ادبی نشست ہوئی تھی۔ اس میں آپ کا بڑا چرچا رہا۔"

"اچھا!" ادیب صاحب کھل کر بولے "میں پچھلے ہفتے کلکتہ چلا گیا تھا، ایک مشاعرے میں بلایا گیا تھا۔ (دراصل گذشتہ ہفتے وہ شام کو بلاناغہ رام بھروسہ پنواڑی کی دکان کے سامنے بنچ پر بیٹھے پائے گئے تھے)۔ مجھے کسی نے بتایا نہیں۔ کیا بات ہوئی تھی؟"

"وہاں بحث چھڑ گئی کہ آپ مزاح نگار ہیں یا مرثیہ گو۔ مزاح نگار کہہ رہے تھے کہ آپ مرثیہ خوانی کرتے ہیں، مرثیہ گو کہتے تھے کہ آپ کی نظمیں مہمل یا زیادہ سے زیادہ مذاق ہوتی ہیں" بانو نے کہا۔ ـــــ ادیب کی حالت خراب تھی۔ ان کا چہرہ سندوری رنگ لے چکا تھا۔ فرید نے کہا "پھر فیصلہ کیا ہوا؟" ـــــ "فیصلہ صاحب صدر نے کیا اور اس پر سبھی نے اتفاق کیا۔ صاحب صدر کا کہنا تھا کہ حبالنوی کا کلام مرثیہ بھی ہے اور مزاح بھی۔ مرثیہ اس لئے کہ اسے دیکھ کر اُردو ادب پر رونا آتا ہے، مزاح اس لئے کہ اسے سن کر مصنف پر ہنسی آتی ہے" بانو نے آخری وار کیا۔ یہ وار کاری ثابت ہوا۔ ادیب صاحب چیخ کر بولے "نظامی صاحب آپ نے اپنے بچوں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے!" ـــــ "جی" میں نے چونک کر کہا "معاف کیجئے، میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ کیا بات ہوئی؟ ارے ارے آپ کہاں جا رہے ہیں؟ بیٹھئے تو..." "نہیں نہیں، مجھے بیدر جانا ہے۔ دس بجے کی بس پکڑنی ہے۔ آپ اپنے بچوں..." "لیکن چیف منسٹر..." بیگم صاحبہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ ادیب صاحب چیتے کی سی تیزی دکھا رہے تھے۔ پانچ منٹ تک مسکراہٹوں کا سیلاب آتا رہا۔ پھر فرزند دلبند نے کہا "ابا جان..." "ضرور ضرور، تم نے انعام کا کام کیا ہے" میں نے دس روپے کا نوٹ دیکر کہا "تم اور بانو سینما دیکھ آنا۔" "اور اگر ہم لوگ مستقل مہم شروع کرکے ان سے آپ کو ہمیشہ کیلئے چھٹکارا دلا دیں تو؟" بانو کا سوال تھا۔ جواب میری بجائے بیگم نے دیا "تو میں اپنی طرف سے تم دونوں کو نینی تال کی سیر کا خرچہ دیدونگی۔" میں نے بیگم کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر مجھے ایک بار پھر ویسی ہی دلکشی نظر آئی جیسی پہلی یعنی ہماری شادی کے وقت نظر آئی تھی۔ ▲▲▲

سید حسن عباس
گوپال پور (بہار)

شوکت تھانوی کی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں

فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، پطرس بخاری، کنھیا لال کپور، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، عظیم بیگ چغتائی جیسے مشاہیر قلم نے شوکت تھانوی کو اپنے دور کا ناقابلِ فراموش طنز و مزاح نگار تسلیم کیا ہے۔ شوکت تھانوی نے طنز و مزاح کی صحت مند روایت کو آگے بڑھانے کی جو پُر خلوص کوشش کی ہے وہ کسی بھی طرح فراموش نہیں کی جا سکتی۔

مشہور مزاح نگار و افسانہ طراز عظیم بیگ چغتائی نے شوکت تھانوی کی ظریفانہ حیثیت کو سمجھاتے ہوئے اپنے دور کے چند بڑے مزاح نگاروں سے شوکت کا موازنہ کیا ہے جو کسی بھی طرح خالی از دلچسپی نہیں۔ اُنہوں نے سب سے پہلے اپنے اور شوکت کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"شوکت مجھ سے نہ صرف اچھا لکھتے ہیں بلکہ بہت اچھا لکھتے ہیں"۔

"مزاحیہ نگاری میں میں شوکت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، اگر افسانہ نویس اور مزاحیہ نگار میں کوئی فرق ہے اور آپ اِس کو محسوس کرنا چاہتے ہیں تو میرے افسانے اور شوکت کے مضامین دیکھئے۔ میرے مضامین مزاح کی صحیح چاشنی اور زبان کی لطافت سے خالی نظر آئیں گے۔ لے دے کر میری تمام مزاحیہ نگاری کا دار و مدار محض افسانویت یعنی پلاٹ پر ہے پلاٹ نکال دیجئے تو پھر کچھ نہیں رہ جاتا لیکن شوکت بغیر پلاٹ کے ایسا مضمون لکھتے ہیں کہ میرا بہترین سے بہترین پلاٹ اس کے آگے کچھ نہیں"..........

...... بہ حیثیت مزاح نگار شوکت کا رنگ میرے لئے قابلِ تقلید ہے نہ کہ قابلِ تنقید۔"

عظیم بیگ چغتائی نے شوکت تھانوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"...... آپ کا فرحت سے کا مقابلہ شوکت اپنے رنگ میں ضرور کرتے ہیں جہاں تک اپنے رنگ کا فکاہیہ مضامین کا تعلق ہے شوکت بھی ان سے کم نہیں"۔

پطرس بخاری سے شوکت کا مقابلہ یوں کرتے ہیں۔

"ایک عجیب ناقابل بیان خوبی پطرس کے جملوں میں ہے شوکت کے یہاں اتنی ہی خوبصورت چیزیں ہیں مگر جنس اور ہے دونوں کی مزاحیہ نگاری اپنے اپنے رنگ میں خوب ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں۔"

مُلا رموزی اور شوکت تھانوی کا تقابلی مطالعہ بھی دیکھئے۔

"ملا رموزی کی تمام مزاحیہ نگاری کا دار و مدار چند جملوں پر تھا جو بار بار دہرائے جا چکے ہیں اب ان میں کچھ نہیں رہ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شوکت کو ملا صاحب سے کوئی مناسبت نہیں یہ کہدینا کافی ہے کہ شوکت ادیب اور مزاحیہ نگار ہیں اور ملا صاحب محض ایک "غور طلب مصلح" نہ کہ مزاحیہ نگار۔"

عظیم بیگ نے رشید احمد صدیقی اور شوکت کا جو موازنہ پیش کیا ہے وہ بھی دلچسپ ہے اور بڑی حد تک شوکت کی مزاحیہ نگاری پر روشنی ڈالتا ہے۔

"رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی کی مزاحیہ نگاری میں عجیب و غریب مناسبت بھی ہے اور فرق بھی ــ فرق یہ ہے کہ اگر رشید احمد صدیقی بلاغت کے ساتھ مزاحیہ نگاری کے عجیب و غریب نمونے پیش کر سکتے ہیں تو شوکت تھانوی اپنی فصاحت اور شستگی میں جواب نہیں رکھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ دونوں کے یہاں روزمرہ کے واقعات لے لیجئے ۔ ۔ ۔ شوکت اور صدیقی میں ہجو یا طنز کا پہلو بعض جگہ یکساں ملے گا۔"

شوکت تھانوی کے یہاں طنز کا جو لطیف احساس ملتا ہے وہ بہت حد تک کامیاب طنز نگاروں کی پہچان ہے مزاح کا اثر وقتی ہوتا ہے جبکہ طنز کا تیکھا پن دقیع اور دیرپا ہوتا ہے۔ شوکت نے نثر و نظم دونوں ہی میں اس کا خاص خیال رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ان کے یہاں سماجی، سیاسی اور اخلاقی اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش کی واضح جھلکیاں طنز و ظرافت کے پیرائے میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ طنز و ظرافت کا زندگی سے قریب تر ہونا لازمی ہے ورنہ وہ محض "چیزے دیگر" ہو کر رہ جائے گی شوکت تھانوی نے زندگی کی بے ضابطگی اور بے ہنگم طرز پر کاری ضربیں لگائی ہیں اور زندگی کرنے کا سلیقہ بتایا ہے مگر لطافت و شستگی کے پیرائے میں جس سے طنز کا تیکھا پن قاری کے منہ کا مزہ کڑوا نہیں کرنے پاتا۔

نثر سے قطع نظر اس وقت ان کی چند مزاحیہ اور طنزیہ نظموں پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ ان کی نظموں کا بھی وہی انداز ہے جو ان کی نثر میں ملتا ہے۔ واقعہ طرازی شوکت خوب جانتے ہیں۔ اخلاقی زوال، سماجی بے ضابطگی اور سیاسی ہنگامہ بازی پر ان کا قلم خوب چلتا ہے مگر کہیں بھی شاعرانہ خیال کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ ذیل کی نظم "الوداع" دیکھئے۔ کس قدر رواں دواں نظم ہے گو کہ موضوع اور خیال پامال ہیں۔ جملوں کی برجستگی اور تحریر کی روانی میں یہ بات گم ہو جاتی ہے کہ شاعر نے آورد ہی آورد کا استعمال کیا ہے جو آمد بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

چور بازاری گرانی الوداع — دودھ میں لے نل کے پانی الوداع

گھی کے اندر موبل آئل الفراق — تیری محدوں میں روانی الوداع

اب کہاں مکھن پہ سرسم کا گماں — اے گمان بدگمانی الوداع

اب صفائی خود بہانا فرض ہے — الوداع اے مہترانی الوداع

سچ تو ہے یہ جس کی لاٹھی اسکی بھینس ؎ الوداع اے من کی مانی الوداع

ان اشعار میں طنز کا تیکھا پن کس قدر موجود ہے مگر شوکت نے اپنی ظریفانہ طبیعت کے رنگ میں انہیں پیش کر کے انہیں مکدر ہونے سے بچا لیا حقیقت میں یہ نظم موجودہ دور کی افراتفری اور بدحالی کی مکمل تصویر ہے۔

"کراچی کی بسیں" ان کی ایک مزاحیہ نظم ہے ؎

دلربا اے نازنینو! اے کراچی کی بسو ؎ تم پہ صدقے ہو کے ہم مر جائیں لیکن تم جیو

کجروی چھوڑے فلک اب چال تم ایسی چلو ؎ ہم تو خود ہی چل بسیں گے تم مگر چلتی رہو

تم پہ بس عشاق کا چلتا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم اللہ بس باقی ہوس

کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار ؎ جو ہر اک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار

اپنے پہلو میں دبائے اک دل بے اختیار ؎ اور نظروں سے گرائے زندگی کا اعتبار

اس قدر لمبی قطار اور زندگانی مختصر
گھر پہونچنے سے تو ہے آسان دنیا کا سفر

بھیڑ بھاڑ کی منظر کشی دو تین اشعار میں اس طرح کی ہے ؎

دیکھنا چاہیں اسے گردن میں باہیں کس کی ہیں؟
جسم تو اپنا ہے لیکن اس میں ٹانگیں کس کی ہیں؟

منڈھ گئے ہیں ہم کسی کے سر کوئی ہم پہ سوار
ہو جو کھجلی ہم نشیں کو ہم کھجائیں بار بار
مہر لب پر ہو سنیں کانوں سے بیشک تو تکار
یاد بس کرتے رہیں اپنی لحد کا ہم فشار

شوخی اور برجستگی میں شوکت اپنا جواب نہیں رکھتے لفظوں کی الٹ پھیر سے بات کہاں کی کہاں لے جانے میں ان کا کوئی اور ثانی نظر نہیں آتا۔ شوکت کی اس خصوصیت پر دقار عظیم نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

"....شوکت کے بے تکلف اور بے ساختہ مزاحیہ اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی گفتگو میں بات میں بات نکلتی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ برابر بڑھتی چلی جاتی ہے اس کی لطافت اور شگفتگی میں فرق نہیں آتا اور آورد ہونے کے باوجود آمد کا مزہ دیتی ہے اس مزیدار آمد میں ہر جگہ لفظوں کا طلسم اپنا کام کرتا ہے کبھی لفظوں کا تضاد، کبھی ابہام اور رعایت، کبھی [illegible] کبھی پھبتی اور معترضہ جملے اور کبھی محض لفظوں کی الٹ پھیر.... جو پڑھنے والوں کو بے شمار تفریح و انبساط کا سامان مہیا کرتی

"مری" ان کی ایک ایسی ہی خوبصورت نظم ہے اس کی خوبی منظرکشی ہے "مری" گرمیوں میں اہل دولت کی آماجگاہ ہوتا ہے ہر چہار جانب سے جوق در جوق رئیسان ملک اس شہر میں گرمی کا لطف اٹھانے آتے ہیں اس کی خصوصیت بھی وہی ہے جو گرمیوں میں کشمیر، شملہ، نینی تال، مسوری یا اور دوسرے پہاڑی شہروں کی ہوا کرتی ہے ؎

اے مری اے گرمیوں میں اہل دولت کے وطن
اے چمن اندر چمن اور اے چمن اوپر چمن
اُف تری رعنائیاں اللہ رے یہ بانکپن
جنت کشمیر کی بے شک ہے تو چھوٹی بہن

میں تو کہتا ہوں زمانے میں ترا ثانی بھی ہے
تجھ میں خوباں بھی بہت ہیں اور خوبانی بھی ہے

مزاحیہ اور طنزیہ پہلو ملاحظہ ہو ؎

عاشقوں کی سرد آہیں ٹھوک ملتی ہیں یہاں ؛ سرد مہری لینے آتے ہیں حسینان جہاں
سیکھتی ہیں آسماں سے ظلم تیری چوٹیاں ؛ کجروی میں خود ہی ماہر ہیں تری پگڈنڈیاں
اہل دل کیواسطے المختصر تو موت ہے
بلکہ جنت تک یہ کہتی ہے کہ میری سوت ہے

ندرت خیال ملاحظہ فرمائیں ؎

زندگی ہی زندگی ہے نام ہے لیکن مری ؛ خود ہی کوہ قاف ہے تو اور خود اسکی پری
مال پہ اللہ اکبر حسن کی لسکاری گری ؛ عشق پر طاری ہے جس کو دیکھ کر اک تھرتھری
یہ بناوٹ، یہ سجاوٹ، یہ نکھار اور یہ پھبن
اے مری اے گرمیوں میں اہل دولت کے وطن

نظم "شاعر کی بیوی" میں انہوں نے شاعر کی اندرونی زندگی کو بہت ہی خوشگوار انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم تشریح و توضیح کا باربرداشت نہیں کرسکتی یہ احساسات و جذبات کا نازک آبگینہ ہے جو خارجی لمس پاتے ہی بکھر جاسکتا ہے۔ الفاظ کی نشست و برخواست اس کی خاص خوبی ہے شاعر کا تخیل چار دیواری کے اردگرد نظر آتا ہے داخلیت کی عکاسی جس خوبی کے ساتھ شوکت نے کیا ہے یہ ان ہی کا حصہ تھا۔ شاعر کی مصیبت پر آپ بھی نظر کریں ؎

شاعری اور پیٹ کا دھندا عجب ثم العجب ؛ جان کے گاہک ہیں بیوی اور بچے سب کے سب
فاعلاتن فاعلاتن بیٹھ کر کرتے ہیں جب ؛ اہلیہ کو یاد آتی ہے ہماری بے سبب
اک سر تا ہاتھ میں اور پاندان اپنا لیے
سر پہ آجاتی ہے لڑنے خاندان اپنا لئے

لمعشہ بر ... (illegible)

شاعر شیریں بیان کی گھبراہٹ دیکھئے ؎

ایک لڑکا جس کو پچھلے چار دن سے ہے بخار ؛ ایک لڑکی جس کی آنکھیں دُکھ چلی ہیں بار بار
تیسرا جو ٹھیک ہے وہ رو رہا ہے نابکار ؛ شامت اعمال کی ہر قسم ہے سر پہ سوار
شاعر شیریں بیاں بیٹھا ہے گھبرایا ہوا
ذہن میں ہے طرح کا مصرعہ بھی بولایا ہوا

فکر معاش کے مضمون کو زیر لب تبسم کی کیفیت کے ساتھ خوشگوار اور نشاط انگیز بنا دیا ہے ؎

وہ یہ کہتی ہیں کہ جائے بھاڑ میں یہ شاعری ؛ ایڑی چوٹی پہ کروں قربان یہ کاریگری
اتنے دن سے کوئی بھی پیسہ ملا سوچو ذری ؛ یاد کر لو خود دسمبر، جنوری پھر فروری
تم ہی سوچو کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ
مجھ کو روٹی چاہیئے اور تم کو خالی واہ واہ

تسلی و تشفی کا انداز ملاحظہ فرمائیں ؎

میں یہ کہتا ہوں کہ اے شمع شبستان حرم
تو ہے اک شاعر کی بیوی کیا ہے یہ اعزاز کم

تعلّی دیکھئے ؎

تجھ کو کیا معلوم میرا مرتبہ میرا حشم ؛ گھر کے باہر دیکھ چل کر کس قدر ہوں محترم
تو سمجھتی ہے مجھے یوں ہی سا اک انسان ہوں ؛ اے مری نادان بیوی میں ادب کی جان ہوں

ردعمل ملاحظہ فرمائیں ؎

شاعری کرتے ہیں اور پھولے ہوئے ہیں شوہری ؛ کوئی دھندہ بھی نہیں کرتے نہ کوئی نوکری
باپ دادا کی کمائی بھی نہیں گھر میں دھری ؛ میں تو پلّے بندھ کے اک شاعر کے جیتے جی مری
یہ نحوست شاعری جس کلموہی کا نام ہے
مجھ سے پوچھو یہ نکھٹو مردوں کا کام ہے
میں گئی چولھے میں حلیہ دیکھئے اپنا ذرا ؛ جیسے خود ردگھاس ہو خط اسطرح سے ہے بڑھا
جیسے اک قیدی ہو کاٹے کوئی لمبی سی سزا ؛ مرحبا اے شاعر رنگیں بیاں صد مرحبا
بھاڑ میں جائے یہ تیری شاعری یہ تیرا فن
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن"

دیکھا آپ نے کس خوبصورتی سے ایک شاعر اور اس کی بیوی کے درمیان کی بچی گفتگو کو ظرافت کے رنگ میں پیش کیا ہے

بقول جعفر علی خاں اثر۔

"بعض جگہ شوکت کی ظرافت ژرف نگاری سے ہم پلہ ہوگئی ہے"۔ اور یہاں ان کی ژرف نگاہی اور ژرف نگاری دونوں ہی غور طلب ہیں۔ "آٹا" بھی اسی طرح کی ایک نظم ہے جس میں ظرافت کے دوش بدوش معاملہ فہمی، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، فاقہ مستی پر اظہار خیال کیا گیا ہے دو ایک بند خالی از دلچسپی نہیں ؎

حضرت آدم پہ جو گذری ہے سب کو یاد ہے — دانۂ گندم کی زندہ آج تک بیداد ہے
آج پھر اولاد آدم پر وہی افتاد ہے — اس کا بانی بھی فرشتوں کا وہی استاد ہے
دور دورہ آج اس کا چور بازاروں میں ہے
ماہرینِ چور بازاری کے غم خواروں میں ہے

ان میں دیکھا اس کا جلوہ جو ذخیرہ باز ہیں — دفن تہہ خانوں میں جن کے بوریوں کے راز ہیں
بوریوں سے ملتے جلتے توند کے انداز ہیں — اور فریاد و بکا میں سب کے ہم آواز ہیں
توند پر ہے ہاتھ اور فاقوں سے حالت زار ہے
ان کو ایندھن اس جہنم کے لئے درکار ہے

طنز کا پہلو دیکھئے ؎

ہوگیا بازار سے آٹے کا ایسا انتقال — اب کھلے بازار میں آٹے کا ملنا ہے محال
لہلہاتی کھیتیوں کے دیس میں کیسا یہ کال — کال کی حیرت ہے پاکستان میں گل جائے دال
دست قدرت سے چھنا آزار کا ہر اختیار
فقر و فاقہ کا بنا انسان خود پروردگار

"جنت میں الیکشن" شوکت تھانوی کی ایک خوبصورت نظم ہے جس میں الیکشن کے موقع سے پیدا ہونے والے انتشارات الیکشن کی بے اعتدالیاں اور عوامی مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے دراصل یہ نظم پنجاب کے ایک الیکشن سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اس میں طنز و مزاح کی کارفرمائی بڑے حسین انداز میں ہوئی ہے مگر طنز کی تلخی کہیں منہ کا مزہ ہی کڑوا نہ کردے اس لئے ظرافت کی شیرینی بھی مناسب طور پر استعمال کی گئی ہے اور اسے قابل قبول بنایا گیا ہے تاکہ جو کوئی بھی شوکت کے طنز کا نشانہ بنا ہے وہ رو ٹھنے اور بگڑنے کے بجائے ہنس دے۔ چاہے وہ خفت آمیز ہی ہنسی کیوں نہ ہو ؎

جنت الفردوس میں پیدا ہوا یہ انتشار — صرف اک رضوان کو ہے کیوں یہاں کیوں اقتدار
یہ ازل سے کیوں بنے بیٹھے ہیں آخر ٹھیکہ دار — جبکہ اس جنت میں ایسے لوگ بھی ہیں بے شمار
تجربہ کار، اور قابل، باا ثر اور با رسوخ
جن سے خوش ہیں حور و غلماں جن سے راضی ہیں شیوخ

یہ نظم مزاحیہ اور طنزیہ رنگ لئے رچی بسی ہے جب ہم اس کے تاثرات پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر المیہ بھی ہے برنارڈ شا نے کہیں لکھا ہے کہ اعلیٰ ترین ظرافت وہ ہے جس میں ہنسی کے ساتھ آنسو بھی نکل آئیں " سماجی اصلاحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مروجہ سماجی، سیاسی، قومی، اور ملکی حالات و واقعات پر طنز کرنا شوکت خوب جانتے ہیں معمولی سے معمولی اور پامال سے پامال مضامین و موضوعات کو نئی طرز اور نئی فکر دے کر شوکت قابل قبول بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جس کی ایک بہترین مثال "جنت میں الیکشن" ہے۔ الیکشن جیسے گھسے پٹے موضوع پر قلم اٹھا کر شوکت نے اپنی شوخی و ظرافت کی خاص ادا سے اسے سمن زار بنا دیا ہے جب ہی رحمت اللہ بیگ کو یہ کہنا پڑا کہ مٹی سے سونا نکالنا اور پتھر سے ہیرا پیدا کرنا انہیں (شوکت) جیسے اہل قلم کا کام ہے":

شوکت سکا آ ہوئے خیال جنت کی سیر کرتا ہے اور جو دیکھتا ہے اسے بے کم و کاست ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے مگر ابتذال سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیتا شوکت مزاح کی اصلیت سے بخوبی واقف ہیں طنز کی نشتریت اور تلخی کو کم کرنے کے لئے ظرافت کا استعمال موقع محل سے کرتے ہیں جس سے قہقہہ، تبسم زیر لب" میں تبدیل ہو جاتا ہے جو امر مشکل ہے اثر لکھنوی لکھتے ہیں ۔

" وہ سطحی خیالات سے حتی الوسع اجتناب کرتے ہیں اور سامنے کی بات اس طرح کرتے ہیں کہ گہرائی اور بانکپن پیدا ہو جاوے"

ایک سچا شاعر سیاسی و اقتصادی گتھیاں سلجھا دیتا ہے اور طبائع کو غور و فکر اور حقیقی نفع و ضرر سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے" شوکت نے بھی الیکشن کی گتھیاں سلجھانے اور اس کے پیدا کردہ انتشار کی نشاندہی جس خوبصورتی سے اس نظم میں کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

شوکت کی زیادہ تر نظمیں مسدس کے فارم میں ملتی ہیں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر شوکت فسانہ طراز تھے واقعہ طرازی کے لئے نظم میں طویل نظمیں مرثیہ یا مثنوی ہی زیادہ مناسب اور موزوں ہوتی ہیں شوکت نے مثنوی کے فارم میں تو نہیں، ہاں مسدس کی ہیئت میں نظمیں لکھی ہیں۔ اس سے شوکت کی قوت احساس و ادراک اور قادر الکلامی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کیوں کہ جملہ اصناف نظم میں مسدس لکھنا عموماً مشکل فن سمجھا جاتا ہے مگر شوکت نے بہت ہی آسانی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر اور واقعہ طرازی کی پیش کش کی ہے اس ہیئت میں ان کا ایک مرثیہ بھی ملتا ہے۔ غزل کے کینوس سے زیادہ وسیع اور کشادہ کینوس مسدس کا ہوتا ہے اور ایک واقعہ طراز کے لئے جس قدر مسدس کا کینوس کار آمد اور مفید ہوگا غزل کا کینوس اتنا مفید نہیں ہوگا۔

شوکت نے واقعات و حالات کا مطالعہ و مشاہدہ گہرائی کے ساتھ کیا ہے جس کی بدولت ان کے یہاں دور از کار باتیں یا غور طلب چیزیں شاذ ہی ملیں گے لغزشوں سے کس کا کلام پاک ہے؟ نظم و نثر دونوں جگہ ان کا مخصوص میلان طبع نمودار ہوا ہے ان کا مزاحیہ رجحان طنزیہ اسلوب کے درپردہ جلوہ گر ہے جو قاری کو اگر ہنسنے پر مجبور کرتا ہے تو دوسری طرف "کچھ سوچنے" کی دعوت بھی دیتا ہے۔ فن کا لحاظ پوری طرح موجود ہے جس کی طرف مولانا عبدالماجد دریاآبادی یوں اشارہ کرتے ہیں۔

" شوخ نگاری و ظرافت دوسروں کے لئے پطرس بلکہ رشید احمد صدیقی تک کے لئے ایک مشغلۂ تفریح رہی ہے شوکت نے اسے مستقل فن بنالیا ہے اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فنکار کی نگاہ ہوگئی ہے اور ان کا قلم ایک فنکار کا قلم ہے" شوخ نگاری کی ایک مثال پر مضمون ختم کرتا ہوں ۔

صادق ہوں اپنے قول کا شوکت خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

پروفیسر یداللہ مہدی

حیدرآباد بھوپال حیدرآباد

(سفرنامہ - کم - رپورتاژ)

جب میں ذہنی طور پر پریشان ہوتا ہوں یا "کام کوڑی کا نہیں، فرصت گھڑی بھر کی نہیں" کی زائد مصروفیات سے مسلسل گذرنے کی وجہ سے "اوور ٹائم"، تھکن کا وافر اسٹاک میرے تن من کو بوجھل کر دیتا ہے تب یہ بوجھ اُتارنے کے لئے، وطنِ ثانی بمبئی میں ہوتا ہوں تو سمندر کے کنارے چلا جاتا ہوں جہاں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی ریت کا وسیع و عریض بستر میری ساری تھکن اُتار کر مجھے پھر سے چاق و چوبند کر دیتا ہے ــــ اور جب وطنِ معروف حیدرآباد دکن میں ہوتا ہوں تب دفتر "شگوفہ" کو ساحلِ سمندر کا نعم البدل سمجھ کر وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ یوں بھی دفتر چاہے کسی اُردو ماہنامے کا ہو یا سرکار عالیہ کا، دفتروں کا بنیادی مقصد اپنے ملازمین کو وہ سکون و آرام بہم پہنچانا ہوتا ہے جو اُنھیں اپنے گھروں میں میسر نہیں آتا۔ چنانچہ ہر ملازم سرکار، سرکار کی اس نوازش کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتا ہے۔ سرکار کی طرف سے عنایت کردہ 'برقی پنکھے' کو 'فل اسپیڈ' میں چلا کر کرسی پر نیم دراز ہو کر میز پر ٹانگیں پھیلا کر فائلوں کے انبار کا تکیہ سرہانے لگائے دن بھر آرام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری دفتروں پر چوبیسوں گھنٹے غنودگی طاری رہتی ہے۔ البتہ دفتر شگوفہ چونکہ سرکاری "مراعات" سے محروم ہے اس لئے یہاں آرام کے ساتھ ساتھ کام بھی ہوتا ہے۔ تاہم مدیرِ شگوفہ نے مجھ جیسے تھکے ماندے بیرونی مسافرین و زائرین اور مقامی اُدبا، شعرا، ظرفا و مساکین کی سہولت کے پیشِ نظر آرام اور کام کے اوقات الگ الگ مقرر کر رکھے ہیں۔ دن بھر تو دفتر شگوفہ پر غنودگی منڈلاتی رہتی ہے لیکن شام ہوتے ہی یہ انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے، کیونکہ چھ بجتے ہی اس کے اوقات

" مطلب و مطلب " شروع ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ
دفتر شگوفہ کے اوقات کار کی تقسیم سے فائدہ اُٹھا کر
اس روز میں تھکن کا بوجھ اُٹھائے عین دوپہر کے وقت
وہاں پہنچ گیا۔ حسب معمول غنودگی نے ماں کی گود کی طرح
بانہیں پھیلا کر میرا استقبال کیا۔ اس وقت اتفاق سے نہ تو
مدیر شگوفہ وہاں موجود تھے نہ ان کی مجلسِ ادارت ، بس
ایک عدد " مجلس کتابت " موجود تھی جس نے بڑی بے نیازی
سے مطلع فرمایا کہ اس وقت مدیر شگوفہ اپنی مجلس ادارت
عرف مسیح انجم کے ہمراہ تین گھنٹوں کے لئے اپنی کُرسیٔ
ادارت کو خالی چھوڑ کر کسی قریبی سینما ہال کی کُرسی کو
گرم کرنے گئے ہیں ۔ اس دل خوش کن اطلاع پر میں
نے فوراً خالی کُرسی ادارت ، کی جانب چھلانگ لگائی۔ مدیر
شگوفہ کی کرسیٔ ادارت شروع سے میری کمزوری بھی رہی
ہے اور مجبوری بھی ، جس طرح جانوروں میں سب سے
بڑے جانور کا رُتبہ ہاتھی کو حاصل ہے وہی درجہ و رتبہ
دفتر شگوفہ کی دیگر کرسیوں کے مقابلے میں کُرسیٔ ادارت
کو حاصل ہے۔ اس کُرسی کی " Revolving "
عرف " پھرکی " نما خصوصیت کی بناء پر آپ اس کُرسی
سمیت جدھر چاہے گھوم سکتے ہیں جبکہ دفتر شگوفہ کی دیگر
کرسیاں حرکت سے یکسر عاری اور بے جان ہیں۔
یوں لگتا ہے جیسے ان کرسیوں پر جمود ' طاری ہو چکا
ہے اور ادب کی اصطلاح میں جمود ' موت کی علامت
تصور کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ جمود زدہ کرسیاں مختصر
" قاعدے " والے حضرات کو تو بڑی آسانی سے اپنے
میں سمو لیتی ہیں لیکن مجھ جیسے " بے قاعدہ " اصحاب کی
پوزیشن ان کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد بڑی ہی تکلیف دہ

اور مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ
کرسی پر نہیں کسی کی گود میں بیٹھے ہیں ۔ ہر شخص خواہ مخواہ
مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتا ہے ۔ لہٰذا جب بھی
مجھے کرسیٔ ادارت پر بیٹھنے کا موقعہ ملتا ہے میں پورا
پورا فائدہ اُٹھاتا ہوں اور اس وقت خوش قسمتی سے
پورے تین گھنٹوں کے لئے کرسیٔ ادارت میرے زیرنگیں
تھی گویا بیٹھے بٹھائے تین گھنٹوں کی سلطانی ' میرے
حصے میں آگئی تھی۔ البتہ اس چند گھنٹے کی سلطانی میں
چمڑے کا سکہ چلانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ
دورِ حاضر میں کاغذی سکے کی ایجاد نے سکے کی مارکیٹ
اس قدر گرادی ہے کہ اس کے مزید گرنے کی کوئی
صورت باقی نہیں رہی ہے اس لئے میں نے اپنی
سلطانی میں نیند کا سکہ چلانے کی کوشش کی لیکن
تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی کھوٹا ثابت ہو گیا کیونکہ
غیر متوقع طور پر وہاں شگوفہ کی مجلس مشاورت عرف
مجتبیٰ حسین پہنچ گئے ــــــــــ پچھلی دو دہائیوں
میں مجتبیٰ نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو اپنی تخلیقات
سے اس قدر مالامال کیا ہے کہ اُردو کے مزاحیہ
ادب کے نام پر دہائی دینے والے بھی انہیں " بڑا "
دینے پر مجبور ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
جو کسی زمانے میں صرف مجتبیٰ حسین ہوا کرتے
اب ان کا نام دو لفظوں کے حدود سے نکل کر اچھے
خاصے جملے میں تبدیل ہو گیا ہے یعنی اب
صرف مجتبیٰ حسین نہیں کہلاتے بلکہ " ملک کے مشہور
و منفرد طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین " کہلاتے ہیں
گویا جو نام کبھی سمٹے تو دلِ عاشق کی طرح مختصر ہے

اب پہلے تو زمانے کی تفسیر بن گیا ہے۔ بلکہ اگر
لے بھی مجتبیٰ خود کو "راہ راست" پر لانے سے اسی طرح
تے رہے تو وہ دن دور نہیں جب انھیں ایشیاء کا
م ادیب نمبر ۲ ہونے کا اعزاز حاصل ہو جائے گا۔
اضح ہو کہ نمبر ۲ کی قید میری لگائی ہوئی نہیں ہے بلکہ
۔ تو اُردو کا طنزیہ و مزاحیہ ادب خود دوسرے درجہ
ہلاتا ہے۔ 'دوسرے' برسوں پہلے آنجہانی کرشن چندر
یشیا کا عظیم ادیب نمبر ایک ہونے کا شرف عطا
چکا ہے۔ مجتبیٰ ان دنوں اپنی لڑکی کی شادی کے
لے میں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ پہلے تو ہمارے
مصافحہ و معانقہ ہوا پھر خیر خیریت کے رسمی کلمات
بادلہ ہوا اور پھر مجتبیٰ نے اچانک استفسار فرمایا۔
حیدرآباد میں تمہارا گھر چنچل گوڑے میں کس طرف
ہے ـــ ؟"

یہ پہلا موقع تھا جب مجتبیٰ مجھ سے میرے گھر کا
پتہ پوچھ رہے تھے ورنہ اب تک ہم دونوں پر ایسی
کوئی افتاد نہیں پڑی تھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے
اپنے اپنے گھر کا پتہ ٹھکانہ پوچھنے کی نوبت آتی ـــ
میں نے سوچا ہو سکتا ہے مجتبیٰ محض اس لئے میرے گھر
کا پتہ دریافت کر رہے ہیں کہ اپنی بچی کی شادی کا
دعوت نامہ بہ نفس نفیس میرے گھر پہنچ کر بدست خود
میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ مجھے یہ بات کسی
طرح گوارا نہ ہوئی کہ شادی کی مصروفیات میں اس
قدر اُلجھے ہوئے ہونے کے باوجود محض ایک عدد رقعہ
پہنچانے کے لئے وہ میرے گھر تک آنے کی زحمت
اُٹھائیں لہذا میں نے انھیں مطلع فرمایا ـــ "شادی
کا رقعہ مجھے مسیح انجم کے ذریعہ مل چکا ہے ـــ "
مجتبیٰ بولے ۔ "اچھا ـــ تم پہلے شخص ہو جس
کی زبانی یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مسیح انجم نے
دعوت نامے تقسیم کرنے کی جو ذمہ داری زبردستی
اپنے سر لی ہے، اسے نہ صرف یہ کہ خوش اسلوبی کے
ساتھ نبھا رہے ہیں بلکہ رقعے بھی صحیح اشخاص تک
پہنچا رہے ہیں۔ خیر ویسے یہ ایک جملۂ "غیر معترضہ"
تھا اب ایک بار پھر اصل موضوع کی طرف آجاؤ چنچل گوڑے
میں تمہارا گھر کہاں واقع ہے۔ میرا مطلب ہے صحیح
محل وقوع ۔ ۔ ۔

پھر ایک بار تان میرے گھر کے پتے پر ٹوٹی
میں نے اپنے تئیں اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش
کی کہ ایسی کون سی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے جس کی
وجہ سے مجتبیٰ میرے گھر کا صحیح اتا پتا جاننے کو اس
قدر مصر ہو گئے ہیں ـــ حالانکہ اب سے پہلے جب کبھی
ہمیں ایک ساتھ حیدرآباد میں رہنے کا اتفاق ہوا
ہے ہم اکثر بیچلرز کوارٹر، دفتر شگوفہ، نمائش کلب،
زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاس، لنچ و ڈنر پارٹیوں،
ہوٹلوں وغیرہ میں اتنی بار مل لیتے ہیں کہ گھروں
پر ملنے کی خواہش باقی نہیں رہتی ـــ لیکن
اس بار پہلی ہی ملاقات میں میرے گھر کے پتے کے
تعلق سے مجتبیٰ کا یہ اصرار میرے لئے باعث حیرت
تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بات ضرور ہے جسے
کہنے میں انھیں تکلف محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں
میرا کسی قدر بے تکلف ہو جانا ضروری تھا لہذا میں
نے کھل کر کہا ـــ "اگر میرے لائق کوئی خدمت

ہو تو بلا تکلف کہو بلکہ تم کہو تو میں خود تمہارے گھر
پہنچ جاتا ہوں ـــ "
مجتبیٰ نے فوراً کہا ـــــ " نہیں نہیں ایسا کوئی
خاص کام نہیں ہے۔ ویسے تم صبح کے وقت شریف
آدمیوں کی طرح یقیناً گھر پر ہی ہوتے ہوں گے "
میں کل صبح یا تو خود تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا یا کسی
کے ذریعہ پیغام بھجوا دوں گا ۔ ویسے چنچل گوڑے میں
تمہارا گھر شاید ڈلیے خاں نواب کی دیوڑھی کے
آس پاس ہی کہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایسا لگتا تھا جیسے مجتبیٰ اس بات کا بیڑہ اٹھا
چکے ہیں کہ میرے گھر کا پتہ جان کر ہی رہیں گے۔ آپ
تو جانتے ہی ہیں کہ ایک مزاح نگار جب کسی بات کا
بیڑہ اٹھالیتا ہے تو پھر چاہے اس کا اپنا بیڑہ غرق
ہی کیوں نہ ہو جائے بات کی تہہ تک پہنچ کر دم لیتا
ہے ۔ مجھ پر بھی چونکہ مزاح نگار ہونے کی تہمت
لگی ہوئی ہے اس لئے میں کسی اور مزاح نگار کے بیڑے
کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ
فوراً اپنے گھر کے صحیح محل وقوع کے بارے میں مجتبیٰ کو
سمجھانا شروع کیا۔

" دبیر پورہ اسٹیشن سے جو سڑک سیدھی سنٹرل
جیل کی طرف جاتی ہے اس میں چنچل گوڑے کا مشہور
چڑھاؤ بھی آتا ہے۔ اسی تاریخی چڑھاؤ کے عین درمیان
سے ایک راستہ فتح یاب خاں بازار کی بائیں جانب سے
ہوتا ہوا ڈلیے خاں نواب کی دیوڑھی کی طرف جاتا
ہے اسی راستے پر چالیس قدم چلنے کے بعد ایک گلی
بائیں طرف کو جاتی ہے اس گلی میں مزید چالیس
قدم چلنے کے بعد ایک اور گلی دائیں طرف کو نکلتی ہے
اسی گلی میں چالیس قدم مزید چلنے کے بعد پورے
چالیسویں قدم پر جو دروازہ نظر آئے گا اس پر
بلا تکلف دستک دیجیئے جسے سن کر جو شخص برآمد
ہوگا وہ انشاء اللہ میں ہی ہوں گا ـــ " میری
زبانی یہ تفصیلی پتہ سن کر مجتبیٰ نے فوراً پوچھا ۔
" مسیح انجم کو تمہارے گھر کا پتہ یقیناً معلوم ہوگا ؟"
میں نے عرض کیا ـــ " ہاں، وہ کئی بار میرے
گھر آچکے ہیں ـــ " مجتبیٰ نے ہنس کر کہا ـــــ
" مجھے اس بات کا پورا یقین تھا محض چالیس قدم
چلنے سے ایک مسلمان کو جو ثواب دارین حاصل
ہوتا ہے اُسے بٹورنے سے مسیح صاحب کبھی نہیں
چوکتے بلکہ وہ تو ایسے ثواب بٹورنے کی تاک میں
رہتے ہیں اور پھر تمہاری بیان کردہ تفصیلات کے
مطابق تو تمہارے گھر تک پہنچنے والا ایک مسلمان
تین گنا ثواب کما سکتا ہے اور ظاہر ہے اس لالچ
میں مسیح صاحب بے وقت تمہارے گھر پر نازل ہوتے
ہوں گے ۔ میں کل صبح مسیح صاحب کو تمہارے
گھر بھیج کر ایک بار اور انہیں ثواب کمانے کا موقع
فراہم کردوں گا ـــ"

اتنا کہہ کر مجتبیٰ تو روانہ ہوگئے لیکن میرے
دل میں کرید اور تجسس کی ایک چنگاری چھوڑ گئے
جو اگلی صبح تک اچھے خاصے "الاؤ" میں تبدیل ہوگئی۔

(باقی آئندہ)

محمد اسداللہ
★
وروڈ (امراوتی)

ایک سیاہ فام خاتون ماتمی لباس میں کالے صوفے پر براجمان تھیں۔ کسی نے پوچھا۔ میڈم آپ کہاں سے شروع ہوتی ہیں؟ اور اب یہی سوال میں اس خاکے کے مرکزی کردار سے پوچھ رہا ہوں کہ جناب! آپ کہاں سے شروع ہوتے ہیں؟

یہ کون ہے؟

یہ ایک جدید شاعر ہیں۔ ابہام کا بھوت جدید شاعری سے اُتر کر ان سے لپٹ گیا ہے۔ آپ نے ایڈیسن کی تصویر دیکھی ہے اور ان صاحب کو نہیں دیکھا تو پہلی مرتبہ ضرور چونکیں گے کہ ایڈیسن کی پیٹھ پر پایا جانے والا کبڑ کہاں چلا گیا اور یہ اتنا اُونچا اور ہینڈسم جواں کیسے ہو گیا۔ لیکن تھوڑی سی انکوائیری کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ دو درجہ کے جدید شاعر صفدر ہیں۔ تھوڑا ٹھگنا سا قد، ہاتھ میں بیگ لیئے ہوئے ہم پیشہ ٹیچرس اور بکھرتے ہوئے قہقہوں کے درمیان راستے سے گزرتے ہوئے اور کبھی تنہا فُل پینٹ شرٹ میں ملبوس انگلیوں میں دبی سگریٹ۔ سوچوں میں دبے سلگتے خیالات، ذہانت کی غماز چمکدار آنکھیں اور آنکھوں میں چھپی الجھن چہرے پر تفکر کے سائے۔ اس صورت میں کوئی دیکھے تو لگے کہ کوئی فلسفی فرانس کے کیفے سے نکل کر آ رہا ہے۔

صفدر، شاہد کبیر، مدحت الاختر اور عبدالرحیم نشتر دو درجہ کی جدید شاعری کے ۴ کھونٹ ہیں صفدر صاحب آج کل شاید "دو یا تین اچھے" کے نعرے سے متاثر ہو کر شاعری، تنقید اور طنز و مزاح کا ایک تکون بنائے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں کہنے لگے میں سوچ رہا ہوں اب باقاعدگی سے انشائیے لکھوں۔ میں نے کہا۔ سر! اس کی کیا ضرورت ہے آپ ایک کاتب رکھ لیجیئے وہ آپ کی دن بھر کی باتیں نوٹ کر کے آپ کو شام میں ایک بنا بنایا انشائیہ تھما دیا کرے گا۔

صفدر صاحب کو دیکھ کر بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایک طویل اسپرنگ پریس کر کے ایک مختصر قد میں فٹ کر دیا گیا ہے میں اکثر یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ اس چھوٹی سی بوتل میں آخر کتنے جن قید ہیں۔ میں ہفتہ کے شروع میں صفدر صاحب کو فرشتہ کہوں تو اگلے دن ایک آدھ اشتعال انگیز جن باہر نکل کر اس کی نفی کر دے گا۔ میں الفاظ واپس لے لوں تو حرکات و سکنات کے خس و

وخاشاک میں بکھرا ہوا صفدر صاحب کا کوئی رویہ میرے تاثر کو شش و پنج میں ڈال دے گا۔ شاید یہ شش و پنج انسان کی صحیح تعریف ہے ممکن ہے یہ مثال مناسب نہ ہو شاید مجھے بجائے فرشتے کے موسیٰؑ کہنا چاہیئے تھا۔ جو اپنے رہبر اور خود سے زیادہ باخبر خضرؑ سے بار بار اُلجھتے ہیں۔ یہ فطری زندگی کی سرکشی "صفدر شناسی" میں KEY POINT کا درجہ رکھتی ہے۔ کوئی بات ان کی دانست میں غلط ہے وہ ضرور اُلجھیں گے۔ ظاہر ہے ایسا آدمی ہر گام پہ ماحول سے برسرِ پیکار رہو گا بالخصوص ہمارا ماحول جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہو سکی۔ موسیٰؑ کا ساتھ خضرؑ کو پسند نہ آیا، موجودہ دور کو کیا بھائے گا۔ دلچسپ بات یہ کہ صفدر صاحب ہمارے لئے موسیٰؑ بھی ہیں اور خضرؑ بھی۔

میرے لئے صفدر صاحب کی پہلی اور آخری حیثیت ایک شفیق استاد کی ہے۔ میرے اکثر دوست ان کے طلبہ کو دیکھتے تو لے اختیار پرتھوی راج (اکبر اعظم) کے لہجے میں دعا دیتے۔ خدا انہیں جلالِ صفدری سے محفوظ رکھے۔ مگر اب وہ اتنے سخت گیر نہیں رہے۔ دراصل ابتداء ہی سے انتہائی حساس، خوش مزاج اور منہ پھٹ ہونے کے باوجود بات بات پہ بھڑکنے سے اکھڑ جانے کا مادہ بھی ان میں موجود ہے۔ پہلے ان کی ہنسی میں ایک زہر تھا کھنکار میں اک احتجاج اور لفظ لفظ چٹکی لیتا ہوا۔ پھر یوں ہوا کہ۔ قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قوم حجاز، صفدر صاحب کا مذہب سے انسلاک پیدا ہوا اور بقول خود۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہم لوگ روشن ہو گئے۔

ان کے چہرے پر داڑھی جلوہ افروز ہوئی ماضی قریب جسے وہ ایام جاہلیت کہتے ہیں کے تمام رویئے یکسر بدل گئے ان کی ہنسی اور خوش مزاجی گلی کوچوں میں مٹھاس بانٹتی پھرتی، مسجد کے محراب تلے خوابیدہ اور منبر پہ بولتا ہوا سراپا، گل افشانی گفتار، مذہب کا گہرا مطالعہ اور دل چھو لینے والا انداز غرض اس کایا پلٹ نے انھیں بستی کی محبوب ترین شخصیت بنا دیا۔ جو غیر محبوب عناصر تھے خود انہوں نے اپنی شخصیت سے نکال پھینکے یا انہیں صیقل کر دیا۔ چنانچہ اب یہ عالم ہے کہ کسی باغیچے سے گزر رہے ہیں تو درخت کے نیچے خورد و نوش میں مصروف بیٹھے حال مزدور ہانک لگاتا کہ۔ ماسٹر صاحب آؤ کھانا کھانے، تو یہ اپنائیت سے بڑھ کر ایک لقمہ ضرور لیں گے۔ اس زمانے میں جس جن پہ صفدر صاحب نے سب سے زیادہ قابو پایا وہ "جلال" ہے۔ ان کے یہاں تھہر رد و دیش بر بجانِ پیلک ہوتا ہے۔ ادٹ پٹانگ حرکات ناانصافیاں، جہالت کے مناظر ان کے چہرے کو کارڈیو گرام میں بدل دیتے ہیں۔ ان کے مزاج کی تیزی کی وجہ شاید وہ مرچیں ہیں جو انھیں بہت زیادہ مرغوب ہیں انہوں نے داڑھی چھوڑی تو میں نے اندازہ لگایا کہ داڑھی نے مرچوں کی ساری تیزی جذب کر لی۔

حاضر جوابی اور برجستہ طنز میں ان کا جواب نہیں ایک طنز نگار کے لئے جس بے مروتی اور بے باکی کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے سینے میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر تڑپ اٹھنے والے حساس شاعر کا دل ہے۔ معمولی معمولی چیزوں، واقعات اور لوگوں کے مہمل رویوں سے محظوظ ہونے، اور ان کے خوردبینی مزاحیہ گوشوں کو گرفت میں لے کر کچھ اضافے کے ساتھ ادا کرنے کا اشتیاق اور صلاحیت صفدر صاحب کو عملی زندگی میں بہت زیادہ دلچسپ آدمی بنا کر پیش کرتی ہے۔ ہر چند یہ مشاعروں سے دور بھاگتے ہیں اور مشاعرے میں پڑھنے کے نام سے تو گویا الرجی ہے۔ ہمارے اصرار پر مزاحیہ شاعری کبھی کبھی پڑھ لیتے ہیں لہذا یہاں عام آدمی انہیں ان شعروں سے جانتے ہیں۔

چوک پہ گھیر نہ لے بھوت بھگانے والا ۔ "دل کے آسیب کا ہر ایک سے چرچا نہ کرو"[1]

---

[1] یہ مصرع زبیر رضوی کا ہے، درود کے ایک مشاعرے میں مصرع طرح دیا گیا تھا۔

اور "سترہ ٹونڈیا پُں"[2] سے کچھ دھوکا نہیں ؛ ایک ٹونڈیا[3] آدمی سے جی ڈرے

ایک مشاعرے میں یہ صدر تھے ایک پنجابی شاعر کچھ وطنی قسم کی نظموں کے بعد ان سے مخاطب ہوا کہ ـــ صدر صاحب کی اجازت ہو تو کچھ عشق و عاشقی بھی پڑھ سکتا ہوں؟ صفدر صاحب نے برجستہ کہا۔ ضرور، بلکہ تم کر بھی سکتے ہو۔

اس بات سے قطع نظر کہ صفدر صاحب کے پڑھنے کے من موہنے انداز میں ان کی آرٹسٹک لوچ سے مزین آواز کا کیا رول ہے۔ ان کی کھنکار ایک تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھتی ہے۔ اس کا میدان عموماً وہ LONG PLAY تقاریر ہیں جہاں معصوم سامعین کی بے بسی اور بے علمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر میں وزیر اعظم ہوتا تو صفدر صاحب کی اس احتیاجی کھنکار کو ایک بل کی صورت پیش کر کے پاس کرا لیتا اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والا سامعین کا یہ استحصال رک جاتا۔ اصلاً صفدر صاحب جس طرح شاعری میں الفاظ کے انڈوں سے معنی کے تر و تازہ چوزے برآمد کرتے ہیں وہ ہر ادٹ پٹانگ رسالے میں چھپنے والے بسیار نویس ادیبوں اور شاعروں کی اصلاح کے لئے صفدر صاحب لائف بوائے صابن تک استعمال کرتے ہیں۔ (بدقسمتی سے خاکسار کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہے)

صفدر صاحب جب لفظوں کو چھوتے ہیں تو ان کی شاعری میں معنویت کے نت انوکھے رنگ برنگے پھول کھل اٹھتے ہیں مگر جب وہ لوگوں کے رویوں کو چھیڑ کر ان سے زبردستی معنی برآمد کرتے ہیں تو فضا میں بارودی بو پھیل جاتی ہے۔

میں نے صفدر صاحب کو کئی بار اس رنگ میں دیکھا ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہیں اور کسی سماجی، مقامی، دنیاوی یا اخروی CRISIS کے احساس پر بے چین آنسوؤں کا DELEGATION ان کی داڑھی سے شرفِ ملاقات حاصل کر رہا ہے، کبھی ان کے قہقہے فلک شگاف ہو گئے ہیں اور روایتی امیج کا چھلکا توڑ کر وہ کھلنڈرا بچہ بن گئے ہیں۔ کبھی جھگڑ پڑے کبھی خود سے پٹا لیا کبھی کسی دوست اور اسٹوڈنٹ کی آمد کا مژدہ سن کر دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں دوڑ پڑے دولوں کے سوٹ کیس چھین کر چلنے لگے۔ زبردستی ٹھنڈا پانی پلا کر خوش ہو رہے ہیں۔

خوش ہوئے تو زمانے پر سب نچھاور، بگڑ بیٹھے تو کبھی آمادہ جنگ اور کبھی راہبوں کا گمان ہونے لگا سب سے کٹی۔ وہی ہیروشیما اور ناگاساکی کے مناظر مگر اس کے باوجود نیک مشورے، رہنمائی۔ برے حال پر اظہار افسوس ہمدردیاں کسی دوسرے شخص کے ذریعہ آپ تک برابر پہنچ رہی ہیں۔ بعض اوقات سچ کی طرح کڑوے۔ چاہے کسی طرح قبول کیا جائے سچ کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ لوگ انھیں بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

فنکار کی سوچوں اور محسوسات میں جاری مور ناچ، اور دمکتا ہوا جنگل، فن کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے۔ مور کے پروں میں دمکتے ہوئے رنگوں کا اک سرشار رقص صفدر صاحب کی ذات میں نظر آتا ہے۔ آپ کو بھی نظر آئے گا آپ بھی بوتل میں جھانکئے تو سہی مگر اس بوتل کے دہانے پر کھڑے جنوں سے ڈر کر بھاگ مت جائیے انہیں تھپتھپائیے سنبھالئے اور بوتل میں اتر جائیے جہاں صفدر صاحب اپنی عادت کے مطابق نہا دھو کر سردی سے کٹکٹاتے ہوئے دانتوں کے درمیاں دھیمے دھیمے لہجے میں اپنے دوست مدحت الاختر کا یہ شعر گنگنا رہے ہیں۔

اس سمندر میں گرے چار طرف کے دریا ؛ کون سا رنگ میری ذات کے اندر نہ ملا

---

[2] سترہ ٹونڈیا، یعنی سترہ منہ والا، دودھ کے ایک پُل کا نام ہے جس میں ۱۷ کمانیں ہیں۔ [3] ایک ٹونڈیا ـ مراٹھی لفظ ہے یعنی ایک منہ والا۔

برق آشیانوی

ایڈیٹر شگوفہ کے نام ایک خط

کمال صاحب۔

السلام علیکم۔ یہ خط میں بہ غرضِ خاص اشاعت کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ اب تک جو خطوط میں نے لکھے وہ اشاعت کے قابل تو کیا پڑھنے کے بھی قابل نہ ہوتے تھے جواب دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس خط کا جواب مطلوب ہے۔ بیت ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو "قایل" ہیں تمہارے "کام" کے

کے مصداق خط لکھا کرتے تھے بیت ؎

الفت کے واسطے نہ محبت کے واسطے
ہے خط بغرضِ خاص اشاعت کے واسطے

"آمدم بر پائے مطلب" ۔ آمدم بر سر مطلب اس لئے نہیں لکھا کہ ایک تو یہ محاورہ بہت فرسودہ ہوگیا ہے۔ دوسرے اس سے مطلب بھی پورا نہیں ہوتا۔ مطلب کے سر پہ آنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ مطلب کے پیر پر آجانے سے مراد گویا "پاؤں آجانا" یا اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا لیا جاسکتا ہے۔ اگر اس کے علاوہ بھی کچھ مطلب لیا جائے تو ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں۔ غرض "آمدم بر پائے مطلب" کہ مصرعہ ؎

نظر لگے نہ شگوفہ کے حسن صورت کو

کیونکہ شگوفہ سولہویں سال کی ایسی خطرناک عمر کو پہنچ گیا کہ مصرعہ ؎

جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

مذاق ہو" بدنظر" اس کو بُری نظر" سے دیکھنے لگا ہے۔ بُری نظر سے ہمارا مطلب کچھ بُرا نہیں بلکہ صرف اتنا
سی رسالے کا اتنی پُرکشش عمر تک زندہ رہنا بدخواہوں کی نظر میں کھٹکنے لگتا ہے۔ اور وہ اس بُری نظر سے
ہیں کب شگوفہ بند ہو جائے اور کب انہیں آرام کی نیند سونا نصیب ہو۔

بہرحال میں صرف دو باتیں لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے دس باتیں اب تک کہہ گیا۔ یہ بات ہمارے ملک کی
ں داخل ہے کہ کوئی شخص کچھ کہنا چاہتا ہو تو اس "کچھ" کو کہنے سے پہلے "بہت کچھ" کہہ جاتا ہے جس کا تعلق
"کچھ" سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اب تک جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سوائے "بے سود" باتوں کے اور "کچھ" نہیں
س کی وجہ سے سود کی بات رہ گئی۔ سود سے ہمارا مطلب مہاجن کا سود یا ریاضی کا سودِ مفرد یا سودِ مرکب نہیں
نکہ ہمارے نزدیک سود لینا یا سود دینا جائز نہیں ہے۔ سود سے ہمارا مطلب صرف "مفید" ہے۔ چنانچہ وہ مفید
یہ ہے کہ صدیاں گذر گئیں جبکہ میں نے آپ سے ایک بات کہی تھی۔ صدیاں میں نے اس لئے لکھا ہے کہ آپ کا
لطیفے ہے اور میرا نام موسیٰ۔ اس لیے وقت کو امروز و فردا کے بجائے "صدیوں" کے پیمانے سے ناپتا
پس تحقیق ثابت ہوا کہ کسی اور لحاظ سے نہ سہی عمر اور عہد میں آپ سے بڑا ہوں۔ ویسے آپ ہی بہت
ہیں اس لئے کہ کسی ایسے رسالے کا ایڈیٹر ہونا جو "نظرِ بد" سے بچائے جانے کی عمر کو پہنچ جائے ایک بہت ہی
آدمی کا کام ہے۔ غرض صدیاں گذر گئیں میں نے آپ کو خط لکھا تھا کہ شگوفہ میں شاعری کے معیار کو بلند
اس کے بعد اصحابِ کہف کی طرح آنکھ بند کر کے سو گیا۔ اور جب اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شگوفہ میں شاعری کا
قطب مینار سے بھی اونچا ہو گیا ہے جس کی بلندی کے نقطۂ آخر کو دیکھنے کے لئے سر کو اتنا اونچا اُٹھانا پڑتا
توازن کھو کر نیچے گرنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے شگوفہ
شاعری کے معیار کو کافی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہنے پر بھی مجبور ہوں کہ نثر کا حصہ بھی پہلے سے
یادہ معیاری ہو گیا ہے۔ جس کو پڑھنے کے لئے کم از کم پندرہ آدمی تو مجھ سے مانگ کر لے جاتے ہیں اور
واں آدمی پڑھ کر ایسے رکھ لیتا ہے جیسے اُسی کی ملکیت ہے۔ جب میں اس سے رسالہ منگواتا ہوں تو صاف
ہتا ہے کہ "مانگ کر پڑھنے کی عادت اچھی نہیں۔ خرید کر پڑھا کیجیے۔" اُسے معلوم نہیں کہ اس رسالے کا
رکت غیرے میں تنہا مالک ہوں۔ بہرحال شگوفہ کا شعری معیار بھی بلند دیکھ کر دل بے حد خوش ہو گیا۔

علاوہ ازیں آپ نے مزاح نگاری کی "کاشت" بھی اعلیٰ پیمانے پر شروع کر دی ہے جس کے
ں آندھرا پردیش میں انگور اور مزاح نگار بازار میں بہت سستے داموں دستیاب ہونے لگے ہیں۔ اس
بر یہ ہے کہ ان دونوں جنسوں کی کاشتکاری پر انکم ٹیکس یا سیلز ٹیکس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

جس طرح بعض انگور کھٹے اور بعض میٹھے ہوتے ہیں اسی طرح شگوفہ میں بھی بعض تخلیقات کھٹی
ں میٹھی ہوتی ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ مٹھائی سے کم رغبت رکھتے ہیں وہ کھٹائی کو زیادہ

پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ کھٹائی پسند کرنے والوں کا تعلق اس صنف سے نہیں ہوتا جو کھٹائی کو چند خاص دنوں میں زیادہ شوق سے استعمال کرتی ہے۔ لیکن شگوفہ کی کیا میٹھی اور کیا کھٹی، تمام تخلیقات کو بالحاظ عمر و صنف اور بلا قید "زمانہ" پورے ذوق و شوق سے ہر ایک قاری ہضم کرجاتا ہے۔ ہاضمہ کی بات آگئی تو یہ بات بھی سن لیجیے کہ "شگوفہ" کے مستقل استعمال سے کئی لوگ جو بدہضمی کی بیماری میں مبتلا تھے اتنے صحتیاب ہوگئے ہیں کہ اب ان کی صحت پر بیماری کا شبہ ہونے لگا ہے اس لئے کہ طبی اصول کے تحت موٹاپا بھی ایک بیماری ہے۔ چنانچہ وزن کم کرنے کے لئے لوگ فوراً جدید شاعری یا نثری شاعری کی دو ایک خوراکیں استعمال کرلیتے ہیں تو وزن اعتدال پر آجاتا ہے۔

کارٹون کا سلسلہ شروع کرکے آپ نے ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے۔ چنانچہ مزاح نگاروں کی ایسی ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ اُن پر اصلی شکل و صورت کا گمان ہوتا ہے۔ ورنہ فوٹو گرافروں نے نقلی شکل و صورت اتار کر فنکاروں کو خوش فہمی میں اور ناظرین کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بالخصوص ہماری تصویر دیکھ کر بچے تو بچے بڑے بھی قہقہے مار کر ہنسنے لگے بلکہ تالیاں بجانے لگے۔ تالیوں کی گونج میں ہم نے بھی ایک قہقہہ داغ دیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جہاں لوگ ایک تبسم کے لئے ترستے ہیں وہاں آپ نے قہقہے بانٹ دیئے ہماری رائے یہ ہے کہ کارٹون کا سلسلہ جاری رکھیے کیونکہ اس سے "شگوفہ" "شگفتہ" نظر آنے لگتا ہے۔

شگوفہ کا سالنامہ وصول ہوگیا جو محکمہ ڈاک کے خار دار صحرا سے گذر کر بخیریت تمام ہم تک پہنچ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سالنامہ ہونے کے لحاظ سے ڈاک کے بعض اہلِ ذوق قارئین پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنے مطالعہ کے لئے ہمارے گھر پہنچانے کے بجائے اپنے گھر نہ لے جائیں۔

میں خیریت سے ہوں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کو اتنا طویل خط لکھ سکا۔ لوگ تو صرف اُمید کرتے ہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بالکل خیریت سے ہیں ورنہ اتنا شاندار سالنامہ حالیہ درپیش نامساعد حالات و موانعات میں نکالنا ممکن ہی نہ تھا جس کے لئے میں اور وہ تمام لوگ جو اب تک مجھ سے مانگ کر پڑھ چکے ہیں آپ کی خدمت میں پرخلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ فقط

برق آشیانوی

ممتاز مزاح نگار لئیق صلاح کے انشائیے

سنی سنائی

قیمت — دس۱۰ روپے

بتوسط، شگوفہ

خرافات

مراسلے

● پیارے مصطفیٰ کمال:

شگوفے کا سالنامہ مل گیا۔ آندھرا میں گولیاں چل رہی تھیں اور تم دیوانوں کی طرح سالنامہ برآمد کرنے میں مشغول رہے۔ دیوانگی دونوں طرف رہی، داد تمہیں ملی، گولیوں کو نہیں ـــــ اب تم آئندہ جب بھی کوئی خاص نمبر شایع کرنا چاہو۔ گولی برداروں سے پہلے پوچھ لیا کرو کر اپنا مال تیار رکھو۔ میں داد لینے کے لیے پھر آمادہ ہوگیا ہوں ـــــ یوں لگتا ہے، جب تک گولیوں کی دنادن یا تلگو دیشم کی چھناچھن نہ ہو۔ تم اعلیٰ سالنامہ شایع نہیں کرسکتے۔ کیا تم نے اپنا یہ سالنامہ پولیس ہیڈکوارٹر میں بھیجا تاکہ وہ اُسے پڑھ کر عبرت حاصل کرسکیں۔

فکر تونسوی

● مکرمی: سالنامہ "شگوفہ" ملنے میں جب تھوڑی بہت تاخیر ہوئی تو میں سمجھا "شگوفہ" فسادات کی زد میں آگیا۔۔ مگر مقامی بک اسٹال پر جب سالنامہ "شگوفہ" کو موجود پایا تو لگا مصطفےٰ کمال صاحب حقیقت میں باکمال آدمی ہیں کہ حیدرآباد کے دہشت زدہ ماحول اور بھیانک فسادات میں سالنامہ کو نہ صرف شایع کیا بلکہ قہقہوں کا طوفان بناکر پورے ملک میں پھیلا دیا۔ اس سالنامے میں سب سے پہلے خواجہ عبدالغفور کے مضمون سے متعلق کارٹون دیکھنے کے بعد ہندوستانیوں کی عجیب وغریب حرکتوں پر ہنسی آئی (ویسے بھی ہم ہندوستانیوں کی حرکتیں ہوتی ہی ہیں مضحکہ خیز) اس کے بعد مجتبیٰ حسین کا ذہین نقوی پر خاکہ نظر نواز ہوا۔ واہ ... واہ کیا انوکھا انداز ہے خاکوں کی صنف میں ایک ندرت۔ عالم لافانی میں مرزا غالب مرزا مجتبیٰ حسین کو شراب پی پی کر داد دے رہے ہوں گے۔ نریندر لوتھر کا "بڑا آدمی" پڑھا تو ملک کے موجودہ بڑے آدمیوں کے چہرے ذہن میں گھومنے لگے۔ آج پورے ملک پر چند بڑے آدمیوں کا راج ہے عوام جن سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر بقول نریندر لوتھر مرنے کے بعد یہ بڑے آدمی پتھر میں ڈھل کر دیوتا کہلانے لگیں گے۔ نریندر لوتھر کا یہ مضمون ملک کے نام نہاد بڑے آدمیوں کے مُنہ پر ایک طمانچہ ہے۔ مسیح انجم نے "داد حاصل کرنے کے طریقے" بتاتے ہوئے رات کی ٹرین پکڑنے والوں کو مشاعرہ گاہ میں جاگ کر یا سوکر وقت گزارنے کا جو اشارہ دیا ہے اس کے لیے مسیح انجم واقعی داد کے قابل ہیں۔ صفدر کا "کرسی نامہ" کافی دلچسپ ہے۔ برق آشیانوی کا مضمون پڑھ کر ایشین گیمس اور ٹی۔وی دونوں کا لطف آیا۔ (کیونکہ نہ ہم ایشین گیمس دیکھنے دلّی گئے تھے اور نہ ہی ہمارے مکان میں ٹی۔وی ہے) کنہیا لال کپور کا مضمون پڑھ کر ایک بار پھر دُکھ امنڈ آیا پتہ نہیں خدا اچھے فن کاروں کو جلد دنیا سے کیوں اُٹھالیتا ہے۔ اس بار سالنامہ "شگوفہ" میں مضامین کے علاوہ "چوران" بھی کافی دلچسپ رہی۔ اس قدر طنز و مزاح سے بھرپور سالنامہ نکالنے پر مبارکباد۔

منظور وقار، گلبرگہ

● جناب ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم: "شگوفہ" کا سالنامہ دیکھا۔ چشم بد دور بہت محنت کی ہے آپ نے۔ مضامین نثر ونظم سب ہی بہت عمدہ ہیں۔ یوسف ناظم۔ فکر تونسوی وغیرہ تو ملنے ہوئے مزاح نگار ہیں ان کی تخلیقات کا کیا کہنا۔ مجتبیٰ حسین کا خاکہ خصوصاً تعریف کے قابل ہے۔ نئے مزاح نگاروں

میں جنہیں آپ نے سالنامے میں جگہ دی بانو سرتاج کا "سفر ایک رات کا" بے حد پسند آیا۔ اچھا لکھتی ہیں محترمہ۔ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔ امید ہے کہ اگلا پرچہ اور بھی بہتر شائع ہوگا۔

سید شبیر حسین۔ ناگپور

● جناب:

سالنامے کی تاخیر کا 'باعثِ تاخیر' بے حد پر زور، پر اثر اور حسین ہے۔ پورا پرچہ قہقہوں مسکراہٹوں سے کھکھلاتا ہوا نوکِ نشتر سے احساس کو جگاتا ہوا اور دعوتِ فکر دیتا ہوا۔

کس کس کی تعریف کروں (اپنے علاوہ ــ!) اتنی بھرپور اور کامیاب کوشش کے لیے مبارک باد قبول کیجئے۔ اب کے "زندہ دلوں کے دلوں میں جشن کی امنگ" ترنگ کب اُٹھنے والی ہے۔

شفیقہ فرحت، بھوپال

● "شگوفہ" کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں شفیق الرحمٰن کا مضمون دیکھنے کو ملا۔ اگر اسی طرح ہمعصر پاکستانی مزاحیہ و طنزیہ ادیبوں کی تخلیقات کو شگوفہ میں جگہ دیتے رہیں تو قارئین کافی محظوظ ہوتے رہیں گے۔

انیس احمد، دوحہ، قطر

● مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب۔ آداب

امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔ ایک تازہ ترین مزاحیہ تخلیق "شگوفہ" کے لیے ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے مزاح کا یہ اچھوتا انداز پسند آئے گا۔ کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر قلمی تعاون کا موقع دیں۔ آپ کے خلوص بھرے جواب اور سلجھے ہوئے مشوروں کا شدت سے انتظار رہے گا۔

کامٹی میں "شگوفہ" ایجنٹ کے ذریعے برابر مل رہا ہے۔

"شگوفہ" ہر بار ایک نیا رنگ اور اچھوتا پن لیے ہوتا ہے۔ دسمبر کے شمارے میں سرورق کا کارٹون اور خواجہ عبدالغفور صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ دیگر سارے مضامین بھی طنز و مزاح کے اعتبار سے معیاری ہیں۔

شکیل شاہجہاں

● کنہیالال کپور نمبر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی ساتھ ہی اس کا ملال رہا کہ کیوں نہ میں "شگوفہ" کا اس سے قبل خریدار بنا ــــ اردو ادب سے مجھے لگاؤ ہے ــــ

رنگاچاری ٹریننگ اسکول، جھانسی

● ماہ دسمبر کا شگوفہ جلوہ افروز ہوا۔ آج اپنی پہلی فرصت میں آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں۔ اس بار آپ نے کمال کر دیا ہے بہت ہی خوبصورت گٹ اَپ اور بڑی ہی معیاری تخالیق سے مزین "شگوفہ" گزشتہ سال کا نایاب تحفہ ثابت ہوا ہے۔ جس کے لیے آپ کو مبارک کہہ دینا ضروری ہے۔

کریک بتیاوی

● محترم مصطفےٰ کمال صاحب سلام مسنون:

نومبر کا "شگوفہ" ملا۔ شکریہ، کتنا دیدہ زیب یہ پرچہ ہے۔ خدا کرے اس کو زمانے کی نظر نہ لگے۔

نشتر سیوانی، سیوان، بہار

زندہ دلانِ حیدرآباد کی

سالانہ تقاریب

۱۴ ر و ۱۵ ر اپریل ۱۹۸۳ء

کو منعقد ہوں گی۔

No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H. HD 5
16 Copy 2
Feb. 1983 Phone : 57716

زندہ طلسمات سر درد، کھانسی، زکام سے فوراً
آرام دیتا ہے ___ اور کئی امراض مثلاً پیچش، ہیضہ
فلو وغیرہ کے لئے ___ کامیاب علاج!

تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات
حیدرآباد-۵۰۰۰۱۳

حیدرآباد

ماہنامہ

Courtesy Deccan Chronicle

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۶ ——— شمارہ ۳

مارچ ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر ——— سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:
راجیندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

8

ٹائیٹل:
شعیب

مجلس ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: مسیح جلیل

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف

طابع: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپشلسٹ . . .

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد-۱

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ پارکو، سری نگر
۴۔ انڈین یسیٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو، کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ جیمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچیے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندہ:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۲

مالِ سرقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

قاضی جی دبلے (رپورتاژ)

برق و شرر (مستقل کالم)

چورن (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ
امریکہ کی آٹو میٹک آئی
ٹسٹنگ مشین سے کروائیے

امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹکنالوجی کے مستند
تربیت یافتہ

معیاری چشموں کی تیاری
کے لئے تشریف لائیے

اینڈ
کمپنی آپٹیشینس

ترپ بازار حیدرآباد
فون ۴۲۱۲۷۰

کوالیفائیڈ آپٹیشینس آف دی
آف آپٹیشنری (امریکہ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی پندرھویں ۱۵ سالانہ تقاریب

۱۴ / ۱۵ / اور ۱۶ / اپریل ۱۹۸۳ء

بمقام نمایش میدان منعقد ہوں گی

اس بار تقاریب میں شرکت کرنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے انتخاب پر مشتمل

ماہنامہ شگوفہ کا

سوونیر

شایع ہوگا

قیمت ۴ روپے

"شگوفہ" کا

"ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب

(حصۂ نثر)

وسط ۱۹۸۳ء میں شایع ہوگا

مہمان مدیر : یوسف ناظم

* ساتھ میں بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

اُردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی — مرتبہ ادارہ "شگوفہ"

شگوفہ ۳۱- مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد — ۱

کرنل محمد خان

کار بکاؤ ہے

ہم سے پہلے بھی کوئی صاحب گزرے ہیں جنہوں نے بیٹھے بٹھائے بکری پال لی تھی اور پھر عمر بھر اس کے زانو پر سر رکھ کر منمناتے رہے تھے۔ ہمیں غیب سے یہ سوجھی کہ اتفاق سے ولایت جا رہے ہیں، کیوں نہ وہاں سے نئی کار لائی جائے؟ یعنی کیوں نہ جانے سے پہلے پرانی کار بیچ دی جائے؟ اور یہ سوچنا تھا کہ جملہ اندیشۂ شہر کو لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا اور کار بیچنا شروع کر دی۔ بوٹی بوٹی کر کے نہیں، سالم!

ہمارے کار فروشی کے فعل کو سمجھنے کے لئے کار سے تعارف لازم ہے۔ یہ کار ان کاروں میں سے نہ تھی جو خود بک جاتی ہیں۔ اس متاعِ ہنر کے ساتھ ہمارا اپنا بِکنا بھی لازم تھا۔ یعنی اس کار کے بیچنے کے لئے ایک پنج سالہ منصوبے کی ضرورت تھی، لیکن ہمارے پاس صرف تین دن تھے کہ چوتھے روز ہم نے فرنگ کو پرواز کر جانا تھا۔ سو ہم نے ازراہ مجبوری ایک سہ روزہ کریش پروگرام بنایا جس کا مختصر اور مقفیٰ لبِّ لباب یہ تھا: آج اشتہار، کل خریدار، پرسوں تیس ہزار! سو ہم نے اشتہار دے دیا۔

کار بکاؤ ہے۔

"ایک کار، خوش رفتار، آزمودہ کار، قبول صورت، فقط ایک مالک کی داشتہ، مالک سمندر پار جا رہا ہے۔ فون نمبر ۶۲۲۰۹ سے رابطہ قائم کریں۔"

یہ سب کچھ صحیح تھا لیکن جو اس سے بھی صحیح تر تھا ـــــ اور جسے ہم اشتہار میں بالکل گول کر گئے تھے ـــــ وہ موصوفہ کی عمر تھی جس کا صحیح اندازہ حضرتِ خضر کے سوا کسی کو نہ تھا۔ وہ طویل مسافت تھی جو محترمہ طے کرتے کرتے لڑکھڑانے لگی تھی اور اس کے اندرونی اعضاء کی وہ باہمی شکر رنجیاں تھیں جنہیں شیر و شکر کرنے میں ممدوحہ کے مالک اور گرد و نواح کے جملہ مستری بے بس تھے۔

دوسری صبح اشتہار کے جواب میں ٹیلیفون آیا:

"السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔"

اس متشرع سلام کے جواب میں ہم نے صرف وعلیکم السلام کہا جو بہت ناکافی محسوس ہوا۔ ہمیں ذرا شک سا تھا کہ وعلیکم السلام کے ساتھ بھی برکاتہ وغیرہ لگ سکتے ہیں یا نہیں، ورنہ جی تو چاہا کہ سلام کا مُدار ستارہ بنا کر پیش کریں۔ اتنے میں اُدھر سے آواز آئی۔

"بندہ پرور، یہ کار کا اشتہار آپ نے دیا ہے؟"

"جی ہاں"

"کس ساخت کی ہے؟"

"فوکس ویگن ہے جناب۔ آج کل بڑی مقبول ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ کون سا ماڈل ہے؟"

"ایسا پرانا نہیں۔ نئے ماڈل سے ملتا جلتا ہے"

"میرا مطلب ہے کس سال کی ساخت ہے؟"

اب ساخت تو یہ دس سال پہلے کی تھی لیکن جواب میں یوں کھُلم کھُلا سچ بولنا ہمیں موافق نہ تھا۔ اِدھر جھوٹ بولنا بھی نامناسب تھا۔ معاً ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ خریدار کے شرعی رجحانات کے پیشِ نظر کار کی تاریخِ پیدائش سنِ عیسوی کی بجائے سالِ ہجری میں بتائی جائے۔ شاید شعائرِ اسلام کے احترام میں مزید موشگافی نہ کرے۔ بدقسمتی سے ہمیں موجودہ سالِ ہجری کا صحیح علم نہ تھا۔ کچھ اندازہ سا تھا اسی سے آٹھ سال منہا کر کے کہا:

"قبلہ ۱۳۷۷ ہجری کی ساخت ہے"

"الحمد للہ۔ آپ تو بڑے صالح مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں تو آپ نے فرمایا ۱۳۷۷ ہجری۔ موجودہ سالِ ہجری ہے ۱۳۹۰ گویا تیرہ سال پہلے کا ماڈل ہے؟"

ہم اپنے پھیلائے ہوئے دامِ تزویر میں پھنس گئے تھے بہرحال ہم نے پھڑ پھڑا کر نکلنے کی کوشش کی یعنی جب ہجری کو آلۂ کار نہ بنا سکے تو سیکولر پینترا بدلا اور کہا۔

جناب معاف فرمائیے گا۔ ہجری حساب کچھ ٹھیک نہیں بیٹھ رہا۔ دراصل یہ صرف دس سال پہلے کا ماڈل ہے"

دس اور تیرہ میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کتنے میل کر چکی ہے؟"

ہمیں اسی سوال کا ڈر تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ دس سال میں اگر ہماری کار اِدھر اُدھر چلنے کی بجائے خطِ مستقیم میں چلتی رہتی اور تیر بھی سکتی تو بحرالکاہل کے رستے دنیا کے چار چکر کاٹ چکی ہوتی۔ یعنی دیر چکر کی مستحق ہوتی۔ اس کا سپیڈومیٹر ننانوے ہزار نو سو ننانوے میل بتاتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ لکھ نہ سکتا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ نکل گیا تھا وہ کوسوں دیارِ حرماں سے اور اس حقیر کُرۂ ارض کا محیط زیادہ سے زیادہ پچیس ہزار میل ہے۔ اور اگر اُڑ بھی سکتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ جب نیل آرمسٹرانگ چاند پر اُترتے تو پہلی جائے غریب خانے پر نہ پہنچتے۔ الغرض ہماری کار اب دشتِ امکاں عبور کرنے کے بعد تمنا کا دوسرا قدم تول رہی تھی۔ مگر افسوس کہ ہمارے گاہک کو ان مادرائی صفات میں دلچسپی نہ تھی، چنانچہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کتنے میل کر چکی ہے،

زبان میں رعشہ پیدا ہونے لگا۔ بہرحال ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

" تقریباً ننانوے ہزار نو سو ننانوے میل "

ہمیں یقین تھا کہ یہ سن کر یا تو اپنا فون توڑ دیں گے یا گریبان پھاڑ ڈالیں گے لیکن خلاف توقع اُدھر سے توڑ پھوڑ کی کوئی آواز نہ آئی۔ بلکہ ایک اُمید افزا سوال سنائی دیا:

" کتنی قیمت ہے ؟"

" تیس ہزار "

یہ ہم نے آدھے سانس میں کہا اور کامیابی سے اُچھو کو روکا۔ اُدھر سے مولوی صاحب کی آواز آئی:

جناب بندہ ــــ آپ کی کار دس سال پرانی ہے۔ ایک کم ایک لاکھ میل چل چکی ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق حالت اچھی ہے۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے۔ تین ہزار روپے قبول فرمائیے گا ؟"

" کیا فرمایا آپ نے ؟"

یہ جملہ ہمارے منہ سے اضطراراً نکلا تھا، ورنہ ہم نے تین ہزار کی پیشکش اچھی طرح سن اور سمجھ لی تھی۔ فقط ہمارے دل میں وہی قہر نے کروٹ لی تھی۔ وہی قہر جو کبھی پطرس کے دل میں اُبھرا تھا جب خدا بخش کے ساتھی نے ان کی تاریخی سیکل کی قیمت چند روپے تجویز کی تھی اور پطرس نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا:

" او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے انسان، مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بے ہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہونچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کروں گا۔"

ہمارے غیر ارادی سوال کے جواب میں آواز آئی:

" میں نے عرض کیا تھا تین ہزار ــــ لیکن آپ کو بہتر قیمت مل سکے تو بڑے شوق سے دوسری جگہ بیچ دیں۔ ویسے زحمت نہ ہو تو میری پیش کش بھی کسی کونے میں نوٹ کرلیں۔ میرا فون نمبر یہ ہے اور میرا نام عبدالغفور ہے۔ خاکسار کو مولوی عبدالغفور کہتے ہیں۔"

تو یہ مولوی تھے: جبھی تو ذرا سی بے زبانی کی بھی عیسوی بنائی تھی۔ بہرحال ہم نے اپنے سارے غصّے کا ایک فقرہ بنا کر مولوی صاحب کو پیش کیا:

" آپ سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے ؟"

جواب میں ہلکی سی ہنسی سنائی دی اور کچھ اس قسم کی گنگناہٹ کہ جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکر خارا۔ اور پھر آہستگی سے فون بند ہوگیا۔ بڑا طنّاز مولوی تھا ظالم!

" تھوڑی دیر میں ایک اور خریدار کا انگریزی بولتا ہوا فون آیا:

" چھوٹا والا اشتہار موٹر کے بارے میں آپ لوگ دیا ؟"

" جی ہاں میں نے ہی دیا ہے۔"

" کون والا کار ہے ؟"

" فوکس ویگن والا "

" اس میں ریڈیو ہے ؟ "

" جی نہیں "

" یہ تو بڑا DRAW BACK ہے "

ہم سمجھ گئے یہ اینگلو ورنیکلر صاحب محض ٹیلیفون قریب ہونے کی وجہ سے گاہک بن بیٹھے ہیں اور مطلب کار خریدنا نہیں، خریدنے کا سوا دلینا ہے۔ عرض کیا:

" جناب اس کار کا بڑا نقص یہ نہیں کہ ریڈیو نہیں رکھتی بلکہ یہ کہ رولز رائس نہیں "

" فوکس ویگن میں بھی تو ریڈیو لگ سکتا ہے "

لگنے کو تو اس میں شہد کا چھتہ بھی لگ سکتا ہے لیکن خاکسار کی کار میں یہ ایکسٹرا فٹنگ نہیں۔ گڈ بائی "

ایک دو اور فون بھی آئے لیکن کار کی عمر رفتہ اور سفر گزشتہ کا ذکر آیا تو بامقصد گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسی طرح شام ہوگئی۔ شام کی صبح ہوئی۔ ٹیلیفون ہمارے پہلو میں پڑا تھا لیکن چپ۔ سامنے آخری شب تھی، یعنی پرواز یورپ میں چند ساعتیں باقی تھیں ہم نے سوچا اگر کار نہ بکی اور اس عالم پیری میں اسے تین ماہ گیراج میں گزارنے پڑ گئے تو جوڑوں کے درد کا شکار ہو جائے گی اور پھر شاید کوئی مولوی غفور بھی میسر نہ آئے۔ چلو، مولوی صاحب سے ہی رجوع کریں، لیکن فون اٹھایا تو ساتھ ہی مولوی صاحب کی ہنسی اور گنگناہٹ یاد آئی۔ سوچا، شیک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو، مگر اندر سے آواز آئی کہ میاں غالب کا پرابلم تمہارے پرابلم سے سراسر مختلف تھا۔ وہ عشق کا معاملہ تھا۔ یہ تجارت کی بات تھی۔ بے تکلف فون کرو۔ ہم نے بے تکلف مولوی صاحب کا نمبر ملایا اور سلام اور رحمتیں اور برکات بھیجنے کے بعد کہا:

" مولانا ساڑھے تین ہزار میں کار آپ کی ہے۔ چاہیں تو آج ہی لے جائیں "

تین پر ساڑھے کا اضافہ محض مولوی صاحب کی فتح کو جزوی شکست دینے کی خاطر تھا۔ لیکن قارئی محترم قصہ کوتاہ، اسی شام مولوی صاحب ایک سو کم تین ہزار میں کار لے گئے۔ ایک سو کم اس لئے کہ بقول مولوی صاحب پچھلی بات چیت کے بعد کار چند قدم چل کر اور بوڑھی ہو چکی تھی۔ اور کچھ یہ بھی کہ مولوی صاحب کی خودی ہماری خودی سے ٹکرا کر ذرا زیادہ پائیدار نکلی تھی۔ ■■

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور

کے مضامین

سمن زار

قیمت: ۸/ روپئے

خامہ بگوش

پاکستانی روزنامہ "جسارت" کے کالم سے

گلڈ اور اکیڈمی جیسے اداروں کے قیام کے بعد معیاری ادب یا ادیبوں کا مسئلہ نہیں رہا

پچھلے ہفتے کراچی میں گرمی کی لہر اور مسیح الدین صدیقی ساتھ ساتھ آئے۔ گرمی تو خیر سب شہریوں سے یکساں سلوک کرتی ہے لیکن صدیقی صاحب خاص خاص شہریوں یعنی ادیبوں کے حال پہ مہربان رہے۔ اور ادیبوں کے حال کی خرابی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ انہیں اپنی ذات پر اتنا اعتماد بھی نہیں رہا جتنا انھیں صدیقی صاحب پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اپنی کتابوں کی اشاعت سے لے کر بعد از وفات وظیفہ برائے پسماندگاں تک کے مسائل صدیقی صاحب کے سامنے پیش کرتے رہے اور صدیقی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ادیبوں ہی کو نہیں، ان کے پسماندگان کو بھی ہر طرح کی مایوسی سے بچائے رکھنے کا مژدہ سنایا۔ افسوس کہ صدیقی صاحب سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ ورنہ ہم عرض کرتے کہ جو سلوک آپ کو ہمارے پسماندگاں سے کرنا ہے اس سے استفادہ کا موقع ہمیں جیتے جی عنایت کیجئے کہ ہم اپنے پیچھے سوائے قرض خواہوں کے کسی کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

چند دنوں میں صدیقی صاحب نے اتنی دعوتوں، عشائیوں عصرانوں اور مشاعروں میں شرکت کی جیسے وہ اسلام آباد سے نہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرح دہلی سے آئے ہوں۔ فرق یہ ہے کہ نارنگ صاحب جہاں جاتے تھے۔ ایک ہی جیسی باتیں کرتے تھے۔ صدیقی صاحب ایک ہی جیسی باتیں سنتے رہے۔ ادیب صدیقی صاحب کے سامنے اپنے مسائل پیش کرتے رہے اور وہ اس طرح ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے جیسے وہ واقعی ادب کے مسیحا ہوں۔ صدیقی صاحب نے ادب اور ادیبوں کے ہر طرح کے مسائل حل کرنے کے وعدے اسی فراخدلی سے کئے جس فراخدلی سے سیاست داں انتخابات سے پہلے وعدے کیا کرتے ہیں۔ صدیقی صاحب کا انداز گفتگو والہانہ تھا جیسے ان کا تعلق اکیڈمی آف لیٹرز سے نہ ہو، کالعدم مسلم لیگ کے خیر الدین گروپ سے ہو۔ ایک غزل گو نے صدیقی صاحب سے کہا "معلوم نہیں کیا بات ہے آج کل مجھ سے شاعری نہیں ہو رہی"۔ صدیقی صاحب نے فرمایا "فکر نہ کیجئے، اکیڈمی ہر طرح کے معذور ادیبوں کا خیال رکھے گی۔ ہمارا ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ جو ادیب لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ چکے ہیں، انھیں باصلاحیت معاون فراہم کئے جائیں جو ان کے لئے ادبی و تخلیقی کام انجام دیں"۔

ایک محفل میں صدیقی صاحب سے کہا گیا "اکیڈمی ادیبوں کے ساتھ جو نیکیاں کر رہی ہے، ان کی حیثیت وہی ہے جو پیاسے کے لئے سراب کی۔ اگر کوئی نیکی کرنی ہے تو یہ کیجئے کہ ادیبوں کی کتابیں معقول تعداد میں خریدیئے اور لائبریریوں کے ہاتھ فروخت کیجئے"۔

صدیقی صاحب نے کہا "یہ کام تو اکیڈمی کر رہی ہے۔ ہم ہر کتاب کے تین نسخے خریدتے ہیں"۔ جب یہ کہا گیا کہ صرف تین نسخوں کی خریداری سے کیا فائدہ ہوگا تو صدیقی صاحب نے کہا۔ "یہ فائدہ ہوگا کہ اب ہر ادیب یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی کتاب کے کچھ نسخے فروخت بھی ہوتے ہیں۔"

صدیقی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے ادیبوں سے ذاتی رابطہ پیدا کر کے رائٹرز گلڈ کی اجارہ داری ختم کر دی ہے۔ اب گلڈ کی بجائے اکیڈمی مایوس ادیبوں کی آخری پناہ گاہ بن گئی ہے۔ کسی کو غیر ملکی دورے پر بھجوا دیا جاتا ہے کسی کو مختلف بہانوں سے اسلام آباد کی سیر کرا دی جاتی ہے۔ کسی کی کتاب چھپوانے کا وعدہ کر لیا جاتا ہے، کسی کو معذوری کے نام پر مالی مدد دے دی جاتی ہے اور اب تو ہجری ایوارڈ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے! ہر صاحب تصنیف کو یقین ہے کہ اس سال ایوارڈ اسی کو ملے گا۔

اب کے صدیقی صاحب کو کراچی کے اخباروں نے بھی بڑی اہمیت دی۔ شاید ہی کوئی اخبار ہو جس میں صدیقی صاحب کے دورۂ کراچی کی تفصیلات شائع نہ ہوئی ہوں۔ کالم نگاروں نے بھی ایک دوسرے سے بڑھ کر خراج تحسین پیش کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے فلمی ایڈیشنوں کی کمی صدیقی صاحب کے تذکرے سے پوری کی گئی ہو۔

ادیبوں سے اتنی قربت کا ایک خطرناک نتیجہ بھی نکل سکتا ہے اور وہ یہ کہ کہیں صدیقی صاحب بھی ادیب نہ بن جائیں۔ مشاعروں میں جس طرح وہ داد دیتے ہیں اور ادبی مسائل پر وہ جس طرح گفتگو کرتے ہیں" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر چند دن یہی لیل و نہار رہے تو ادیبوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اہلِ قلم کانفرنسوں کے انعقاد کے بعد ادیب بننے کے لئے لکھنے کی شرط نہیں رہی، صرف بولنے سے بھی آدمی اچھا خاصا ادیب بن جاتا ہے۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ادیبوں نے جتنا وقت صدیقی صاحب کے ساتھ صرف کیا۔ اگر اتنا وقت وہ مطالعے پر صرف کرتے تو ان کی تخلیقات کا معیار بہتر ہو جاتا۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ گلڈ اور اکیڈمی جیسے اداروں کے قیام کے بعد "معیار" ادب یا ادیبوں کا مسئلہ نہیں رہا۔

پہلے غزل چوری ہوئی پھر شاعر چوری ہو گیا: ناصر زیدی مشہور آدمی ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور کالم نگار بھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شعر اچھے کہتے ہیں یا کالم اچھے لکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی شاعری میں کالم نگاری اور کالم نگاری میں شاعری کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ورنہ ہم نے تو ایسے لکھنے والے بھی دیکھے ہیں جن کی شاعری کو کالم نگاری اور کالم نگاری کو شاعری لے ڈوبتی ہے۔ ڈوبنے کے ذکر پر یاد آیا کہ ناصر زیدی کے مجموعۂ کلام کا نام "ڈوبتے چاند کا منظر" ہے لیکن یہاں ڈو... کا تعلق صرف چاند سے ہے، شاعری سے نہیں۔

ناصر زیدی گاہ گاہ کراچی تشریف لاتے رہتے ہیں، پچھلے دنوں چار سال کے بعد اُنہوں نے اس شہر میں ورود فرمایا تو کراچی اُنہوں نے خاصا بدلا ہوا پایا۔ وہ اپنے ایک تازہ کالم میں فرماتے ہیں "کراچی میں جہاں آئندہ چند برسوں میں ہوا دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ پلا... بے پلانہ تعمیر ہو رہے ہیں، مادّی قدریں حاوی ہیں، روحانی و ادبی اقدار بدل چکی ہیں، موت کا ذکر یہاں سننے میں نہیں آتا، جیسے کسی کو... ہی نہیں۔" ــــ معلوم نہیں زیدی صاحب کراچی میں کن لوگوں کے درمیان رہے جو اُنہوں نے اس شہر کے بارے میں اتنی خراب را... قائم کی ورنہ یہاں روحانی و ادبی اقدار آج سے ۲۵ برس پہلے تھیں، وہ آج بھی موجود ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ اس شہر میں موت کا

نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ اچھے خاصے زندہ لوگوں کو بھی مرحوم تصوّر کرلیا جاتا ہے یقین نہ آئے تو خواجہ حمید الدین شاہد کے رسالے "سب رس" کا "یادِ رفتگاں نمبر" دیکھ لیجئے۔ اس میں نادم سیتاپوری صاحب کے بارے میں ایک تعزیتی نوٹ شامل ہے جبکہ نادم صاحب خدا کے فضل و کرم سے زندہ ہیں۔ رسالے چھپنے کے بعد جب خواجہ شاہد صاحب کو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے اخبارات میں ایک معذرت نامہ چھپوادیا۔ حالانکہ معذرت تو نادم صاحب کو کرنی چاہیئے کہ ان کی وجہ سے "سب رس" کا یادِ رفتگاں نمبر ساقط الاعتبار ٹھہرا۔ اب لوگ اس نمبر کو ہاتھ میں لیتے ہی یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں کن کن موجودگان کو رفتگان میں شامل کیا گیا ہے۔ اگر سبھی رفتگان نادم صاحب کی طرح زندہ ہوگئے تو خواجہ شاہد صاحب کو بار بار معذرت نہیں کرنا پڑے گی۔ صرف ایک مرتبہ یہ اعلان کرنا پڑے گا کہ "یادِ رفتگاں نمبر" کا نام بدل کر "یادِ موجودگان نمبر" کردیا گیا ہے۔

معاف کیجئے ذکر تھا نامر زیدی صاحب کا اور بات کہیں اور پہونچ گئی...... ہاں تو زیدی صاحب نے کراچی آتے ہی ایک شعری نشست میں شرکت کی کہ شعرائے کرام جہاں جاتے ہیں سب سے پہلے یہی کام کرتے ہیں۔ اس نشست میں سرشار صدیقی صاحب نے بھی کلام سنایا۔ ان کا ایک مصرعہ ہے — میں ایک سادہ ورق ہوں مگر کتاب میں ہوں

زیدی صاحب کا خیال ہے کہ سرشار صاحب سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں کیوں کہ ان کی یعنی زیدی صاحب کی ایک بہت پرانی غزل کا مطلع ہے۔

مثالِ سادہ ورق تھا مگر کتاب میں تھا ؛ وہ دن بھی تھے کہ ترے عشق کے نصاب میں تھا

افسوس کہ زیدی صاحب نے ایک سینئر اور معتبر شاعر پر الزام لگاتے وقت یہ نہ سوچا کہ اس قسم کے سامنے کے مضامین میں توارد کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ زیدی صاحب جس شعر کو اپنا "مال" بتاتے ہیں، وہ خود روش صدیقی مرحوم کے اس شعر کا چربہ ہے۔

میں ہی کتابِ زیست میں سادہ ورق تھا دوستو ؛ مجھ پہ بھی گردشِ جہاں کر گئی ثبت نقشِ غم

جہاں تک غزل کا تعلق ہے، اس کے مضامین اور ذخیرۂ الفاظ اتنا محدود ہے کہ ہر شاعر کے یہاں بے شمار مصرعے یا شعر مل سکتے ہیں جنھیں مالِ مسروقہ قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً محسن بھوپالی کا مشہور شعر ہے۔

زیست ہم سے مانگا ہوا زیور تو نہیں ؛ ہر گھڑی ہم کا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

محسن سے بہت پہلے عندلیب شادانی نے اس مضمون کے دو شعر کہے تھے جو ان کے مجموعۂ کلام "نشاطِ رفتہ" میں شامل ہیں۔

مجبوریوں پہ ڈالے ہیں پردے ؛ میری ہنسی ہے مانگے کا زیور!

میرا ہنسنا میرا کب ہے مانگے کا اک زیور ہے ؛ جس کو اپنا حال چھپانے والے پہنے ہوتے ہیں

اسی طرح رئیس فروغ کا یہ شعر خاصا مشہور ہے۔

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لئے ؛ ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کرسکتے

جگر مرادآبادی فرماتے ہیں:

عشق نے خدمتِ دشوار وہ کی ہے تفویض ؛ خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو

ہمیں معلوم نہیں رئیس فروغ کی عمر کیا ہے۔ اگر وہ جگر صاحب سے عمر میں بڑے ہیں تو جگر صاحب سرقے کے الزام سے بچ نہیں سکتے۔

۲+۲ : ۵ والے شمیم احمد نے غالب پر اپنے مضمون میں ۲+۲ ، ۴ کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے غالب کے بہت سے ایسے مصرعے پیش کئے تھے جو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ غالب سے تقریباً سو سال پہلے کے شاعر فغاں کے کلام میں ملتے ہیں۔ کیا اس وجہ سے ہم غالب کو سارق کہیں گے؟ بہر حال ہمیں سرشار صدیقی سے دلی ہمدردی ہے کہ ان پر سرقے کا الزام لگایا گیا۔ سرقہ کرنا ہی تھا تو میرؔ و غالبؔ کی طرف دیکھا ہوتا۔ یہ کیا کہ کسی ایسے کلام پر ہاتھ صاف کیا جائے جو خود ہاتھ کی صفائی کے نتیجے میں وجود میں آیا ہو۔

ناصر زیدی کی نے ایک مصرعے کا بوجھ تو سرشار صدیقی پر ڈالا اور پوری ایک غزل کا بوجھ سعادت علی جوہر نام کے ایک شاعر کے سر پر رکھا اور یہ فرمایا کہ ان کی ایک ایسی غزل جو ہر نے اپنے نام سے چھپوائی ہے جو منی بیگم اور نسیمہ شاہین کی آوازوں میں اکثر ریڈیو سے نشر ہوتی رہتی ہے منی بیگم کی آواز میں تو ای ایم آئی سے کیسٹ بھی ریلیز ہو چکا ہے"۔

ہم سعادت علی جوہر کے ممنون ہیں کہ اگر وہ ناصر زیدی کی غزل اپنے نام سے نہ چھپواتے تو ہمیں کبھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ منی بیگم اور نسیمہ شاہین۔ زیدی صاحب کی غزل یکے بعد دیگرے یا باہمی اشتراک سے گا چکی ہیں۔ اور ای ایم آئی نے منی بیگم کی آواز میں اس غزل کا کیسٹ بھی جاری کیا ہے ای ایم آئی والے اگر یہ کالم پڑھیں تو ان سے گزارش ہے کہ جس طرح شعراء اپنے دیوان تبصرے کے لئے ہمیں بھیجتے ہیں اسی طرح غزلوں کے کیسٹ بھی ہمیں تبصرہ کے لئے بھجوا دیا کریں تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ گانے والوں کے پسندیدہ شاعر کون ہیں۔

ناصر زیدی نے یہ بھی بتایا ہے کہ "ایک صاحب کراچی میں خود کو ناصر زیدی بنائے پھر رہے ہیں۔ شاعر ہونے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہماری غزلوں پر ہاتھ صاف کیا سو کیا۔ ہمارے معاوضے کے چیک بھی وصول کر لئے۔ یہ دن دھاڑے آخر کیا ہو رہا ہے۔ ہر طرح کے چوروں نے ناصر زیدی کو کیوں تاک لیا ہے۔ کلام چوری کرتے کرتے خود شاعر ہی کو چوری کر لیا یہ صورتِ حال خاصی تشویشناک ہے۔ اکیڈیمی آف لیٹرز کو چاہیئے کہ ناموں کے سلسلے میں ادیبوں کے مفادات کا تحفظ کرے تاکہ کسی کو دوسرے کا نام چوری کرنے کی ہمت نہ ہو سکے اکیڈیمی کو ناموں اور تخلصوں کی رجسٹریشن کا کام بھی شروع کر دینا چاہیئے تاکہ ناموں اور تخلصوں کی حد تک ادیبوں کی انفرادیت برقرار رہے۔ اس سلسلے میں سختی سے کام لینا چاہیئے بلکہ اس پر بھی پابندی لگائی جانی چاہیئے کہ دو معروف ادیبوں کے نام کا ایک ایک جز لے کر تیسرا نام بنا لیا جائے جیسے ناصر کاظمی سے جزو اول لیا اور مصطفیٰ زیدی سے جزو ثانی اور تیسرا نام بنا لیا۔"

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کے دو مجموعے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے۔

ہم سمجھتے ہیں قفس کو بھی نشیمن کی طرح

جوہر سیوانی

دِل جدائی میں سُلگتا رہا ایندھن کی طرح
اور آنکھیں بھی برستی رہیں ساون کی طرح

وہ بضد ہے کہ پڑھے بزمِ سخن میں اشعار
اِس بڑھاپے میں بھی ضد اس کی ہے بچپن کی طرح

مجھ سے ٹکرانا ذرا سوچ سمجھ کر اے دوست
چوُر ہو جاؤ گے تم کانچ کے برتن کی طرح

کبھی جنتا تو کبھی کانگریس آئی میں گھُسے
وہ لڑھکتے ہی رہے تھالی کے بینگن کی طرح

تم سیاست کی کسی ہانڈی کی تہہ پر نہ جمو
لوگ اک روز کھرچ ڈالیں گے کھُرچن کی طرح

تم جو دامانِ سیاست سے چپک جاؤ گے
وقت کی قینچی کتر ڈالے گی کترن کی طرح

سیکڑوں زخم ابھی دل میں سما سکتے ہیں
دل ہمارا ہے کشادہ ترے آنگن کی طرح

اُجلے بالوں میں کبھی پوت جو لیتی ہیں خضاب
بی جمالو بھی نظر آتی ہیں دلہن کی طرح

اک سیاست ہے، یہ تبدیلیٔ مذہب کیا ہے
یہ سیاست بھی بدل جائے گی فیشن کی طرح

زہر پھیلے گا الکشن کا بدن میں تیرے
جب بھی ڈس لے گی سیاست تجھے ناگن کی طرح

اب چھُرا ہاتھ میں رہتا ہے، قلم کے بدلے
امتحان گاہ کا منظر ہے الکشن کی طرح

بے مزہ شئے بھی مزیدار ہے مہنگائی میں
آجکل بھات بھی لگتا ہے متنجن کی طرح

مسئلہ بھوک کا جب آپ سے حل ہو نہ سکے
نیوٹرن بم ہی بنا لیجئے ریگن کی طرح

جنسیت پر بھی اثر ڈالا نئے فیشن نے
مرد بھی چلتے ہیں اِٹھلاتے ہوئے زن کی طرح

فورس کی ناک میں دم ایک لیڈرن نے کیا
دیویاں دیش میں پیدا ہوں تو پھولن کی طرح

رام لچھمن کو، ہنومان کو آواز تو دو
پھر کئی روپ اُبھر آئے ہیں راون کی طرح

لکڑیاں شہر میں ملتیں نہیں آسانی سے
اب جلاون بھی ملے کارڈ پہ راشن کی طرح

معفت کی پی کے سرِ بزم جب آتا ہے سرور
شہر سیواں بھی نظر آتا ہے لندن کی طرح

زن مریدانِ وطن جیل پہنچ کر بولے
"ہم سمجھتے ہیں قفس کو بھی نشیمن کی طرح"

پیش جوہر جو نہیں چلتی ہے سازش اُس کی
اپنی ہی آگ میں جلتا ہے وہ ایندھن کی طرح

★

تجھ کو فیروز خاں نہیں معلوم
اور زینت اماں نہیں معلوم

کس قدر دیک ہے تری نالج
تجھ کو سنجے کی ماں نہیں معلوم

جاؤں میں اب کہاں نہیں معلوم
ہے کہاں کارواں نہیں معلوم

کس لیے ہیں تمہارے لہجے میں
اس قدر تلخیاں نہیں معلوم

فوڈ منسٹر کے ٹور پر کتنی
کٹ گئیں مرغیاں نہیں معلوم

چھوڑ کر کیوں وہ پانچ سو پچپن
پی رہا بیڑیاں نہیں معلوم

کس لیے نان سٹاپ تو مجھ کو
دے رہی گالیاں نہیں معلوم

پی کے مدہوش ہوگیا تھا میں
کیسے آیا یہاں نہیں معلوم

سراج نرملی

ظفر کمالی

حال جس شخص کا اِس دور میں ابتر ہوگا
وہ کوئی اور نہیں کوئی سخنور ہوگا

کج روی چھوڑ دو اے دوستو! سُن لو میری
ورنہ ہاتھوں میں مرے طنز کا پتھر ہوگا

میں نے پوچھا ہے نہ پوچھوں گا کبھی بُت تیرا
پوجتا ہے جو تجھے وہ کوئی آذر ہوگا

آج کہتے ہو جسے چور اُچکا لوگو
کل کو دیکھو گے وہی قوم کا رہبر ہوگا

بیلا دو آنے لگے نیتاؤں کو جب جنتا کی
تو بلاشبہ الکشن کا وہ چکر ہوگا

چہرے پر کرب، تفکر کی جھلک آنکھوں میں
ہے یہ پہچان کہ اِس دور کا شوہر ہوگا

ساغر شولاپوری

ڈیل ملیتن مجے اب کیسے نرالے لوگاں
کبھی اُجلے کبھی گورے کبھی کالے لوگاں

سوب بھانڈے میری سسرال میں جاکو پھوڑے
میرا کھا کو میرے پچ پھر بڑے سالے لوگاں

ہر یتیم خانے کے ناماں پو اُٹھا کو چندے
پیٹ بھرنے کے توے دھندے نکالے لوگاں

ڈھول لائے میں نہ بیٹھی تھی کبھی باڈی پہ
آخر موت مجے مٹی میں میں ڈالے لوگاں

عاتق شاہ

ہر گھر کے پیچھے ایک بہتی ہوئی گندی نالی ہوتی ہے !

اور میرے گھر کے پیچھے بھی ایک نالی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض نالیاں نظر آجاتی ہیں ۔ اور بعض نہیں۔ نظر نہ آنے والی نالیاں انڈر گراؤنڈ اپنا سفر جاری رکھتی ہیں ۔ اور جو نظر آجاتی ہیں وہ ہر قریب سے گزرنے والے کو دعوتِ فکر دیتی ہیں !

ایک ایسی ہی نالی میرے گھر کے پیچھے بھی ہے جو کوئی دس سال سے بہہ رہی تھی ۔ کئی بار میں نے اپنے مالک مکان کو توجہ دلائی ۔ پہلے تو وہ وعدے کرتا رہا ۔ پھر ٹالتا رہا ۔ اور ایک دن اس نے برہم ہو کر کہا ، آپ کیسے ادیب ہیں جو ایک معمولی نالی کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ خود آپ کی کہانیوں اور مضامین میں ، میں نے کئی گندی نالیاں دیکھی ہیں ۔ لیکن آج تک میں نے کبھی آپ کو ان کی صفائی کے لئے نہیں کہا ۔ اور ایک آپ ہیں کہ مجھے ایک چھوٹی سی نالی کے لئے پریشان کر رہے ہیں ۔

میں بھی خفا ہو گیا ۔ اور میں نے اُس سے کہا ، ٹھیک ہے ، آپ موری کو صاف مت کروائیے ۔ میں بھی آپ کو کرایہ نہیں دوں گا ۔ اور اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک آپ میرے مطالبے کو مان نہیں لیتے ۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل سرکار نے کرایہ داروں کو بڑے حقوق عطا کئے ہیں ۔ "ٹیننٹ ایکٹ " . . . . کہتے ہیں ۔

بات کاٹ کر وہ بولا ۔ اجی جائیے ۔ جائیے بڑے آئے ہیں مجھے ایکٹ بتانے والے ۔ مجھے آپ چاہئے اور نہ آپ کا ایکٹ چاہئے ۔ فوراً مکان خالی کر دیجئے ۔ یہ میری آخری وارننگ ہے ۔

مکاندار کے اس اچانک حملے سے میں پریشان ہو گیا ۔ میں نے کہا ، جناب ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟

اُس نے ذرا سنبھل کر کہا ، وہی کہہ رہا ہوں جو گزشتہ تین چار برسوں سے کہتا آیا ہوں کہ بھائی مجھے مکان کی سخت ضرورت ہے ۔ خالی کر دیجئے ۔ خدا کے لئے تخلیہ فرما دیجئے ۔ مگر آپ سنتے ہی نہیں ۔ اور اب پوچھ رہے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں افسوس کی بات ہے ۔ مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی !

مکاندار نے اتنی اونچی آواز میں باتیں کیں کہ محلے کے کچھ لوگ جمع ہو گئے اور اُن سبھوں نے اپنی دانست میں یہی سمجھا کہ قصور میرا ہے ـــــ اور میں ہکا بکا خاموش کھڑا یہ سب کچھ سنتا رہا۔ اور سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کیسے اور کس طرح کہنا چاہیئے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ مکان دار کو قطعی مکان کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ایک بڑی کوٹھی میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ایسے دو درجن مکانات ہیں جن کا کرایہ وہ کھاتا ہے۔ اور ان پر ایک پائی بھی خرچ نہیں کرتا۔

لیکن میں خاموش رہا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا ـــــ وہ خاموشی اب تک چل رہی ہے۔ اسے نہ مکان کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ مجھے موری کا خیال آیا۔ اس طرح مہینوں اور برسوں گزر گئے۔ اور نالی اپنی اُسی رفتار سے میرے گھر کے پیچھے بہتی رہی ـــــ لیکن ایک دن صبح صبح معلوم ہوا کہ برسوں سے بہتی ہوئی نالی ٹھہر گئی ہے۔ اور پڑوسی نے منوں مٹی ڈال کر اس کا راستہ روک دیا ہے کیوں کہ اُسے بدبو آرہی تھی۔ لہٰذا میرے گھر کے عقبی حصے میں پانی جمع ہونے لگا۔ گویا علمی زبان میں "جمود" کی کیفیت سے دوچار ہو گیا اور جمود خواہ پانی میں ہو یا ادب میں مکھی اور مچھر کو پیدا کرتا ہے!

میں نے سوچا کہ اب واقعی صحت عامہ کی خاطر کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اس سوچ میں تین چار دن کیا ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب بھنگی کو بھی گویا آگ کا دریا پار کر کے گھر میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ بیگم نے کہا بہت سوچ چکے۔ اب تو اٹھو۔ پانی گھر میں گھسا ہی چاہتا ہے۔

میں نے ایک معصوم بچے کی طرح گویا بلبلا کر پوچھا، مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ تم چاہتی ہو کہ موریاں اور نالیاں صاف کرنے کے فرائض انجام دوں؟ حد ہو گئی۔ چین سے گھر میں بیٹھنے نہیں دیتیں۔ یہ کرو۔ وہ کرو۔ آخر یہ کیا مذاق ہے۔ تمہاری اگر یہی آرزو ہے تو چلو آج سے موریاں صاف کرنے کا کام بھی شروع کرتے ہیں۔

میں غصے میں یوں اُٹھا گویا یہ کام کرنا ہی چاہتا ہوں۔ بیوی دوڑ کر قریب آئی۔ اور بولی، خواہ مخواہ خفا ہوتے ہیں۔ آپ کو کون کہتا ہے یہ کام کرنے کے لئے ـــــ پھر ـــــ؟ سوالیہ نشان بن کر میں نے اُسے گھورا ـــــ پھر کیا ـــــ محکمہ بلدیہ کو درخواست دو ـــــ پھر مجھے یاد آیا کہ میونسپلٹی نام کی کوئی شئے بھی اس شہر میں ہوتی ہے جو باقاعدگی کے ساتھ مکانوں کا ٹیکس لیتی ہے۔ اور شہریوں کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ لہٰذا کمشنر کے نام میں نے ایک شاندار درخواست لکھی۔ گھر میں داخل ہونے والی اس طغیانی سے مجھے بچایا جائے۔ ورنہ گھر میں رہنے والے تمام افراد کی زندگی، صحت و خوشحالی خطرے میں ہے۔

اس ٹائپ شدہ درخواست کی دوسری کاپی سینیٹری انسپکٹر، تیسری میونسپل انجینیئر اور چوتھی میونسپل کونسلر کے نام بغرض فوری کارروائی دی گئی ـــــ خیال تھا کہ سب سے پہلے میونسپل کونسلر سے مل لوں۔ ایک تو شخصی طور پر درخواست دینے کے لئے اور دوسرے صرف اس حقیقت کا اظہار کرنے کے لئے کہ اس کی حالیہ الکشن کی کامیابی میں میرا اور میرے خاندان کے تمام افراد کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ میں، میری بیوی اور دوسرے افراد اس کے ووٹر رہے ہیں۔ لیکن میں سیدھا میونسپل کونسلر کے گھر نہ جا سکا۔ کیوں کہ راستے میں واٹر ریزروائر تھا جس کے احاطے میں میونسپل انجینیئر کا سرکاری گھر تھا۔ گزرتے ہوئے سوچا کہ سب سے پہلے انجینیئر سے ہی مل لوں۔ چنانچہ میں واٹر ٹینک بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہوا۔

اندر گھستے ہی یوں لگا جیسے میں کسی تپتے ہوئے صحرا سے کسی شخص کی آئیڈیل جنت میں داخل ہو گیا ہوں۔ واٹر ٹینک کے

سامنے کھلے ہوئے خطے پر ایک خوبصورت باغ تھا۔ جگہ جگہ پھول کھلے ہوئے تھے۔ مالی درختوں کو پانی دے رہے تھے۔ سرکار کی طرف سے انجینئر کو دیا ہوا سیدھا سادھا یہ ایک محض کوارٹر ہی نہیں تھا بلکہ ایک اچھی خاصی کوٹھی تھی۔ اور جس میں داخل ہوتے ہی میں اپنے اندھیرے گھر اور اس کے پیچھے بہتی ہوئی نالی نہیں ٹھہری ہوئی نالی کو بھول گیا!

میں نے سوچا اگر ایک مہینے کے لئے رہنے کو یہ کوٹھی مل جائے تو اپنے گھر کا کیا پورے شہر کا نقشہ بدل دوں۔ شہر کیا پوری دُنیا کو ایک ایسے ہی خوبصورت خطے میں تبدیل کر دوں ——— انجینئر صاحب ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے برآمد ہوئے۔ اور ایک کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ بڑی دیر تک میری درخواست کو بغور پڑھتے رہے۔ پھر محلے اور گھر کے محل وقوع کے بارے میں پوچھا۔ اور آخر میں معذرت چاہتے ہوئے فرمایا، مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ میں اپنے آرڈرس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ نئے آنے والے انجینئر صاحب سے مل لیں!

میں نے کہا، مگر نئے انجینئر صاحب کے انتظار میں تو کئی دن لگ جائیں گے۔ اور پتہ نہیں وہ آئیں گے بھی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا تبادلہ رُکوانے کی کوشش بھی کریں۔ اور پھر جناب ابھی تک آپ کو آرڈرس بھی نہیں ملے۔ اور جب تک آپ کو آرڈرس نہ ملیں، آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا ہے؟ ——— انجینئر کے چہرے پر ایک ہلکی سی ناگواری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اسے بھانپتے ہوئے میں نے کہا، بھئی! جانے سے پہلے میرا یہ کام کر دیجئے۔ ورنہ نئے انجینئر صاحب کے یہاں آنے اور سنبھلنے تک نالی کا ٹھہرا ہوا پانی دیواروں کو ڈھا کر میرے گھر میں داخل ہو جائے گا۔ اس لئے پلیز ——— مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر انجینئر کے چہرے پر دوڑ کر اُس کی آنکھوں میں نہیں بلکہ آنکھوں کے گوشوں میں غائب ہو گئی۔ اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔ کیا کام کرتے ہیں آپ؟

اس غیر متعلق اور غیر متوقع سوال پر میں ایک ثانیئے کے لئے سٹپٹایا۔ اور پھر بولا۔ بس یونہی کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں' لکھنے پڑھنے کا ——— وہ سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے لگا ——— میں نے کہا، جی ہاں ۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں مضامین لکھتا ہوں۔ میں ——— اوہو ——— سمجھا۔ آپ رائٹر ہیں ——— رائیٹر ——— پہلے کیوں نہ بتایا؟ اوہو ——— بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ——— کرسی سے اُٹھ کر اُس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور کہا، ڈونٹ وری ——— اب سمجھئے کہ آپ کا کام ہو گیا۔ بھئی آپ لوگوں سے ڈرنا پڑتا ہے۔ ورنہ نیوز پیپر اور میگزین میں آپ کچھ بھی چھاپ دیں گے۔

میونسپل کونسلر ادھیڑ عمر کا نہیں بلکہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ لیکن جسمانی اعتبار سے بڑا پھرتیلا تھا۔ وقت ضائع کئے بغیر ایک رائیٹر کی حیثیت سے میں نے اُس سے اپنا تعارف کروایا۔ کونسلر بہت خوش ہوا۔ اور بولا، رائیٹر صاحب! آپ جیسے لوگوں کی تو ہمیں تلاش رہتی ہے۔ کاش الکشن سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جاتی۔ آپ کے مبارک ہاتھوں سے میں ایک شاندار پمفلٹ لکھوا لیتا۔ خیر کوئی بات نہیں آئندہ کبھی آپ کو زحمت دوں گا ——— کونسلر نے چائے سے میری خاطر کی۔ اور دوسری صبح اپنے حلقے کا دورہ کرنے کا وعدہ کیا۔

صبح صبح وہ میرے گھر پر تھا۔ اُسے دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ واہ لیڈر ہو تو ایسا ہو۔ کونسلر کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جو غالباً میونسپلٹی کا سپروائیزر تھا۔ اور جسے وہ اپنے حلقے میں بننے والی تمام موریوں اور سڑکوں کے بارے میں ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کا بے روزگار بیٹا ہے۔

چائے کے بعد اُس نے محلے کا دورہ کیا۔ اور میرے گھر کے عقبی حصّے میں جمع شُدہ پانی کو دیکھا۔ اور مجھے اطمینان دلایا کہ وہ اپنی کونسلری کے جادو سے اُسے یوں غائب کر دے گا جیسے اُس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا لیکن ——— لیکن اس کے لئے کچھ دن لگیں گے کیوں کہ الکشن کے بعد کوئی بجٹ نہیں آیا ہے ——— ! لیکن یہ جمع شُدہ پانی جس میں روز اضافہ ہو رہا ہے آخر اس کی نکاسی کے لئے کچھ نہ کچھ تو کیجئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نہ مٹی کے اس ڈھیر کو جو ہمارے مہربان پڑوسی نے ڈال دیا ہے۔ اور دیکھئے نہ پانی کیسے ٹھہر گیا ہے۔

بُوڑھے کونسلر نے اپنی آدھ جلی سگریٹ ٹھہرے ہوئے پانی میں پھینکی۔ اور ساتھ ہی پانی میں کئی دائرے اُبھر کر غائب ہو گئے۔

اس نے کچھ سوچ کر مجھ سے پوچھا، مسٹر آوارہ جہنمی کیا آپ کے دوست ہیں ؟ ——— کون آوارہ ——— مشہور شاعر مسٹر آوارہ ——— اچھا آپ اُن کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ہاں دوست تو ہیں۔ مگر ان باتوں کا اُن سے کیا تعلق ؟ ——— تعلق ہے ——— اسی لئے تو جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی وہ آپ کے گھر آئے تھے ؟ ——— نہیں تو ——— میں نے جھٹ سے کہا۔ اور آتے بھی کیوں کہ جب کہ انہیں میرے گھر کا پتہ ہی نہیں معلوم ——— مگر ——— مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟ آخر اُن کا اِس گندی نالی سے کیا تعلق ہے

کونسلر نے دوسری سگریٹ جلادی۔ اور کہا، تعلق ہے صاحب۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اب تک آپ کے گھر نہیں آئے۔ لیکن اِن کی ہر نظم میں آپ کے گھر کی اس گندی نالی کا ذکر ملتا ہے۔ میرے الکشن کے احتجاجی جلسوں میں اُنہوں نے جتنی نظمیں پڑھیں ان سب میں یہی گندی نالی شامل ہے۔ مجھے تو اسے دیکھنے کے بعد ایسا لگتا جیسے انہوں نے اسی نالی کو سامنے رکھ کر شعر کہے ہیں۔ وہی ٹھہرا ہوا پانی۔ بھنبھناتی ہوئی مکھ اور اڑتے ہوئے مچھر ——— بدبو ——— سٹراندھ ——— ٹرم ٹرم کرتے ہوئے مینڈک۔ بھئی کمال ہے شاعر کا۔

میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو جناب آوارہ کی نظموں کی تعریف ہوئی۔ لیکن یہ بتائیے کہ اب آپ اس نالی کا کیا کرنے والے ہیں؟ اب ایک کنٹے میں تبدیل ہو رہی ہے ! ——— کونسلر نے نالی کو اور پھر مجھے غور سے دیکھا اور کہا، رائیٹر صاحب ! فکر مت کیجئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ذرا شانتی کے ساتھ۔ اصل میں پانی ٹھہرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں گڑھا ہے۔ اور جہاں گڑھا ہوتا ہے وہاں پانی ٹھہر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے گھر کا پانی اور آپ کے پڑوسی کے گھر کا پانی یہاں آکر جمع ہو رہا ہے۔

وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں نے کہا۔ میں نے وجہ نہیں پوچھی۔ بلکہ یہ درخواست کی ہے کہ اس ٹھہرے ہوئے پانی کو بہنے کے لئے راستہ بنائیے۔ اور ممکن ہو سکے تو میرے مہربان پڑوسی نے میرے ساتھ جو حرکت کی ہے اُس کے خلاف قانونی کاروائی کیجئے۔ اور اُس سے پوچھیئے کہ سرکاری زمین پر بہتی ہوئی نالی کو روکنے کا حق اُسے کس نے دیا ؟

کونسلر نے بڑے لیڈرانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، آپ جھگڑوں میں کیوں پڑتے ہیں۔ نالی اس سمت میں بہے یا اُس سمت میں آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کا کام ہو جائے آپ یہی چاہتے ہیں نہ ؟ ——— میں نے کہا، میں بالکل یہی چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے قطعی سروکار نہیں کہ نالی کو کس سمت میں بہنا چاہیئے۔ اور بہہ کر کہاں جانا چاہیئے۔ ویسے میں نے اصل واقعے پر روشنی ڈالتے ہوئے پڑوسی کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ پڑوسی سے میرا کوئی جھگڑا ہے۔ اور نہ میں کسی سے جھگڑا پسند کرتا ہوں۔

بوڑھے کونسلر نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا، واہ رائیٹر صاحب۔ کیا بات فرمادی آپ نے۔ اگر آپ کی طرح سب ایسے ہی سوچنے لگیں تو ہمارے دیس کے آدھے سے زیادہ جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اور ہر طرف امن اور شانتی کا دور دورہ ہو !

گھر کے عقبی حصے میں رہنے والے گلی کے بہت سے مرد، عورتیں اور بچے جمع ہوگئے تھے۔ اور مجموعی طور پر سب کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں ـــــ کونسلر نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر نمستے کیا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ نوجوان بے روزگار بیٹے نے اسکوٹر سٹارٹ کی۔ سب پر اپنی مسکراہٹ نچھاور کرتا ہوا چلا گیا۔ مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی، فکر مت کیجئے۔ جھگڑے مت کیجئے۔ ہر کام کے لئے سمے چاہئیے۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ جے ہند!!

ایک کمرے پر مشتمل سینٹری انسپکٹر آفس میں انسپکٹر سے نہیں اُس کے اسٹنٹ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُسے درخواست دے دی اور دوسری صبح انسپکٹر سے ملنے گیا ـــــ انسپکٹر کسی فلم کے ہیرو سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے جب اُسے اپنی آمد کی وجہ بتائی تو اُس نے درخواست کی وصولی کی اطلاع تو دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ درخواست کہیں کھو گئی ہے۔ اِس لئے میں دوسری درخواست ابھی دے دوں۔ تاکہ وہ فوری کوئی ضروری قدم اُٹھا سکے ـــــ میں نے حکم کی تعمیل کی ـــــ اُس نے گھنٹی بجا کر دو نوجوانوں کو بلایا۔ دونوں خاکی وردی میں ملبوس تھے۔ ایک کا نام نارائن اور دوسرے کا امام الدین تھا ـــــ امام الدین پستہ قد کا چوڑا چکلا شخص تھا۔ لیکن جسم کا بڑا ہی پھُسپھُسا۔ کمرے میں اس طرح داخل ہوا جیسے باہر سے کسی نے اُسے ڈھکیلا ہو۔ مگر نارائن گٹھے ہوئے جسم اور نسبتاً امام الدین سے پھرتیلا تھا۔ دونوں بڑے ادب کے ساتھ انسپکٹر کی میز کے قریب اٹن شن ہوکر کھڑے ہوگئے۔

انسپکٹر نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، میں ایک ضروری کام سے کمشنر آفس جا رہا ہوں۔ مجھے ہیلتھ اگزیبشن کے انتظامات کرنے ہیں۔ تم دونوں ان صاحب کے ساتھ جاکر دیکھو کہ پانی کیسے اور کیوں کر ٹھہر گیا ہے۔ اور آکر مجھے رپورٹ کرو۔ اور سنو یہ بڑا صاحب ہے۔ اِن کا کام فوراً ہوجانا چاہیئے۔

بڑے صاحب کے تعارف پر دونوں جوانوں نے مجھے نیچے سے اُوپر تک دیکھا۔ اور نظروں کی ترازو میں مجھے تول کر کمرے سے یوں باہر گئے۔ جیسے کہہ رہے ہوں، بہت دیکھے ایسے بڑے صاحبوں کو ـــــ اس کے بعد انسپکٹر نے مجھ سے مسکراتے ہوئے کہا، صاحب! فکر نہ کیجئے۔ آپ کا کام ہوجائے گا! ـــــ انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے میں باہر نکل گیا۔ اور چلتے چلتے امام الدین اور نارائن سے کہا بھئی! جلد آؤ۔ میں تم دونوں کا گھر پر انتظار کروں گا! ـــــ آپ چلئے سرکار ـــــ ہم ابھی آتے ہیں!
دونوں نے ایک ساتھ اور ایک آواز میں کہا ـــــ میں سیدھا گھر پہونچا۔ اور بڑی دیر تک وارنڈے میں بیٹھا سڑک پر گزرنے والے ہر شخص کو دیکھتا رہا۔ لیکن خاکی وردی قریب سے اور دُور سے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ آخر تھک کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ جوتوں کے بند کھول کر میں نے اپنے پیروں کو جوتوں کے شکنجے سے آزاد کیا۔ اور سستانے کے انداز میں آرام کُرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنے پیر سامنے کی اسٹول پر پھیلا دیئے۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔

لیکن میرے کان کسی کی دستک یا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ صرف کان کیا میرا سارا وجود کان بن گیا تھا۔ ہر آہٹ اور گزرتی ہوئی ہر سیکل اور اس کی بجتی ہوئی گھنٹی کی آواز پر میں آنکھیں کھول کر دروازے کو دیکھنے لگتا۔ لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا کوئی راہرو ہوتا جو تیز تیز اپنی منزل کی طرف چلا جاتا۔

انتظار بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ میونسپلٹی کے جوان کا ہو یا محبوبہ کا۔ محبوبہ عام طور پر رات میں آتی ہے۔ اور میونسپلٹی

کا جوان دن میں۔ اگر خلافِ توقع مجوبہ دن میں آجائے تو کوئی ہرج نہیں۔ ایسے عام طور پر نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جوان کا رات میں آنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سارا دن انتظار کے کرب میں مبتلا رہا۔ شام تک ان دونوں میں سے کوئی جوان نہیں آیا۔ اس طرح اُمید کی آخری کرن بھی مایوسی کے اندھیرے میں کہیں کھوگئی۔ اور ساتھ ہی میرے دل اور میرے ذہن میں شام کا اُمڈتا ہوا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے گندی نالی کا جمع شدہ پانی گھر میں داخل ہو رہا ہے۔

میں بے چین ہوگیا۔!

میرے اندر کا آدمی چیخا۔ لعنت ہو تم پر۔ دو ہفتے گزر گئے اور ایک تم ہو کہ معمولی موری بھی صاف نہیں کروا سکتے۔ نہیں موری نہیں گُنڈا۔ میں نے بگڑ کر جواب دیا۔ اچھی بات ہے گُنڈا ہی سہی۔ تو اس کو صاف کروانا ایسا کون سا بڑا کام تھا۔ اب تم کہو گے کہ میں نے درخواست دی ہے۔ اور شخصی طور پر سب سے مل رہا ہوں۔ انہیں توجہ دلا رہا ہوں۔ اور اگر وہ لوگ نہ آئیں تو میں کیا کروں۔ ارے واہ۔ واہ بھولے نواب۔ اٹھو۔ اور خود کچھ کر دکھاؤ۔ اب تم پوچھو گے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے تو میں کہوں گا کہ تمہیں وہی کرنا چاہیئے جس کا خوف اور ایک ہلکا سا ڈر تمہیں کچوکے دے رہا ہے۔ ارے کمر کس کر میدان میں اترو اور خود گندے کیچڑ کو بہانے کی کوشش کرو۔ لوگ دنیا میں کیا کیا نہیں کرتے۔

شام ہو چکی تھی۔ میں بڑے جذباتی انداز میں اُٹھا اور انگنائی میں جا کر پھاوڑے کو ڈھونڈنے لگا ـــــ بیوی نے پوچھا ڈھونڈ رہے ہو؟ ـــــ میں نے کہا، کچھ نہیں۔ اپنی بینین کو دیکھ رہا ہوں۔ بینین تو وہ الگنی پر پڑی ہے۔ یہاں زمین پر کیوں لگی؟ زمین پر تو میں چنبیلی کے اُس پودے کو ڈھونڈ رہا تھا جو مجھے بے حد پسند ہے ـــــ کہاں ہے وہ؟ ـــــ زہے نصیب ـــ برسوں بعد اب آپ کو اُس خوبصورت پودے کی یاد آئی ہے جسے اکھیڑ کر آپ نے اپنی محترمہ بہن صاحبہ کی نذر کیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا کہ ایسے درجنوں پودے لگا کر اس انگنائی کو باغ میں تبدیل کر دوں گا ـــــ ہاہا ـــ ہا ہا ـــــ میں نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔ اور کہا، جب تم جیسا کھلا ہوا، مہکتا ہوا پھول گھر میں موجود ہو تو باغ کی کیا ضرورت ہے! ـــــ شرم نہیں آتی ایسا کہتے بچے بڑے ہوگئے ـــــ وہ سنیں گے تو کیا سوچیں گے۔ ـــــ وہ فوراً کچن میں گھس گئی!

اور میں پھر پھاوڑے کو ڈھونڈنے لگا۔ جس کی مدد سے میں رُکے ہوئے پانی کو دوسری سمت میں بہا سکتا تھا ـــــ میں پھاوڑا ملا۔ اور ساتھ ہی ایک لمبی سی لکڑی بھی جس کی مدد سے نالی کے سوراخ میں پھنسے ہوئے کیچڑ کو نکالا جا سکتا تھا!

بیوی کچن میں تھی۔ اور بچے اپنے اپنے کمروں میں پڑھ رہے تھے۔ اپنے ہی گھر میں ایک چور کی طرح دبے پاؤں پچھلے دروازے سے باہر نکل کر دروازے کو اس سلیقے سے بند کر دیا کہ ذرا سی آہٹ بھی نہ ہو۔

رُکے ہوئے پانی کے کُنٹے کو پھلانگ کر میں دوسری سمت ہوگیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ بچپن میں کھیل کود میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ اپنی سانسوں کو دُرست کرتا ہوا پتلون کو گھٹنوں تک چڑھایا۔ اور پھاوڑے کو مضبوطی سے کہ پانی کے کنارے کے کیچڑ کو اپنی طرف سرکانے لگا۔ لیکن توازن کو باقی نہ رکھتے ہوئے میں گرتے گرتے بچا۔ پیر اور پیر کی چپل لت پت ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کی آواز آئی۔ اور گلی کی خاموشی ایسے ہی ٹوٹی جیسے میرے پھاوڑے

آواز سے سینکڑوں مچھروں کی فوج اُڑنے لگی تھی۔ اور ساتھ ہی ان کی آواز آرہی تھی ـــــ گھوں، گھوں!!

لیکن اس گھوں گھوں میں ہنسی کی آواز بڑی اُونچی اور چبھتی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا سامنے کے ایک چھوٹے سے گھر کا کھلا ہوا ہے۔ اور دروازے میں ایک عورت کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے۔ جب میں نے غصّے سے پلٹ کر دیکھا تو وہ چپ ہوگئی۔ پھر بولی، یہ کیا کر رہا ہے صاحب؟ ـــــ میں نے کہا وہی کر رہا ہوں جو تم دیکھ رہی ہو! ـــــ نہیں صاحب ـــــ یہ کام تیرے کرنے کا نہیں! وہ مسکرائی۔ اور پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر بولی، ارے کاہیکو تکلیف کرتا ہے ساب ـــــ پھینک پھاوڑے کو۔ اور جا اپنے بال بچوں میں ـــــ تو کیا تم صاف کروگی اِس موری کو؟ میں نے غصے سے پوچھا ـــــ اس نے بڑی ہی چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے جلے ہوئے سگریٹ کو پانی میں پھینکتے ہوئے کہا، صاف کروں گی۔ ایک نہیں سو بار صاف کروں گی۔ مگر راجا ـــــ ایک بار تو میری کوٹھڑی میں تو آ ـــــ اس کے ہونٹوں پر بڑی تیز مسکراہٹ چمکی۔ اور اُس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے ہوئے مجھے دیکھا۔ اور پھر اپنی ساڑی کی پرتوں کو درست کرتی ہوئی اندر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن جاتے ہوئے دروازے کو ادھ کھلا رکھا! یہ اُس کے گھر کا عقبی حصّہ تھا!

میرے لئے یہ کوئی چونکا دینے والی بات نہ تھی۔ یہی وہ عورت تھی جو محلے کے کنوارے نوجوانوں کی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ اور وقتی طور پر اُن شادی شُدہ حضرات کا بھی خیال رکھتی تھی جن کی بیویاں اپنے اپنے میکے چلی جاتی تھیں۔ مختلف لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ ـــــ مُنی بائی ـــــ رادھا بائی ـــــ شمشاد بیگم ـــــ تیتلی بے بی ـــــ اور مس ٹن ٹن ـــــ جانے اُس کے کتنے نام تھے۔

میں نے اُسے محلے میں کم اور سڑکوں، شاہراہوں، اور سینما گھروں میں زیادہ دیکھا ہے۔ چالیسویں سالگرہ منانے کے بعد اُس نے اپنی مصروفیتوں کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔ اب وہ ایک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اٹھارہ سال کی عمر سے لے کر بائیس سال کی عمر تک لڑکیوں کی ایک باقاعدہ ٹیم ہے۔ محلے کے شرفا نہ صرف اس سے اور اس کی ٹیم سے بے زار ہیں بلکہ کئی بار انہوں نے پولیس اور متعلقہ عہدہ داروں کو متوجہ کیا۔ اور میمورنڈم بھی دیا۔ دستخط کرنے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ پولیس آتی رہی۔ جاتی رہی۔ مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار پولیس کا دھاوا ابھی ہوتا رہا۔ اور وہ دوسرے دن عدالت میں جرمانہ ادا کرکے شام کو سیٹی بجاتی، سگریٹ کا دھواں پھونکتی ہوئی یوں لوٹی جیسے وہ کسی پک نک پر گئی تھی۔

گندی نالی!

میں بڑبڑایا۔ اور پھر سنبھل کر پھاوڑے سے کیچڑ کو نکال کر کنارے، کنارے اُس کے ڈھیر لگانے لگا! لیکن اِس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میں جیسے جیسے کیچڑ نکالتا ویسے ویسے پانی گڈھے میں دائرے بناتا ہوا جمع ہونے لگا۔ دوسرے پڑوسی کے گھر کا پانی بھی میری طرف تیزی سے آنے لگا۔ میں دو پڑوسیوں کے بیچ میں تھا۔ ایک جس نے منوں مٹی ڈال کر راستہ روک دیا تھا۔ اور دوسرا وہ جو بے نیازانہ انداز میں سب کچھ کر گزر رہا تھا۔ کیوں کہ اس کا گھر محفوظ تھا!

نصف گھنٹے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ شل ہوگئے ہیں۔ اور میں پسینہ پسینہ ہوگیا ہوں۔ ذرا آگے بڑھ کر

میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ لیکن پانی کا رُخ گڑھے کی طرف تھا۔ آخر ہار مان کر میں نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے۔ اور سانسوں کو درست کر کے گلی کا جائزہ لینے لگا ——— مُنی بائی یا شمشاد بیگم کے گھر کے پچھلے دروازے سے لوگ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نکل رہے تھے۔ اور بعض داخل ہو رہے تھے۔ ان میں محلے کے وہ شُرفاء بھی شامل تھے جنہوں نے اس ناپسندیدہ اڈے کی برخواستگی کے میمورنڈم پر دستخط کئے تھے۔ اور جنھوں نے محلے کی ایک میٹنگ میں دھواں دھار تقریریں کی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ چائے کے جوان بیڑی کے کش لیتے ہوئے اس کھلے کچرے کے سامنے یوں ٹہل رہے تھے جیسے اس کی حفاظت کر رہے ہوں!

شمشاد بیگم کے گھر کی ہلکی ہلکی روشنی میں گڑھے کا میلا اور گندہ پانی چمک رہا تھا۔ اور اس کی پرسکون سطح پر پھینکے ہوئے ادھ جلے سگریٹ تیر رہے تھے۔

ابھی ابھی میں یہاں پھاوڑا لے کر جس جذبے اور جوش کے ساتھ آیا تھا اتنا ہی نڈھال اور مایوس ہو کر میں واپس ہو رہا تھا۔ ایک ایک قدم تول کر میں نے اُن ابھرے ہوئے اُونچے پتھروں پر رکھے جو بھنگی کے آنے اور جانے کے لئے ڈال دیئے گئے تھے۔ پتھروں پہ پیر رکھتے ہی میرا توازن بگڑ گیا۔ اب میرے لئے ایک ہی طریقہ تھا کہ لکڑی کو کُنٹے کی تل تک پہونچا دوں۔ چنانچہ میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی لمبی لکڑی کو میں نے کُنٹے کی تل میں دھنسا دیا۔ کوئی تین فٹ گہرا پانی تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے لکڑی کیچڑ کے اندر اُترتی جا رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں بھی جیسے نیچے ہی نیچے اُترتا جا رہا ہوں۔ زمین کی گہرائیوں میں۔ اس احساس کے ساتھ ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ دوسرا قدم میں نے دروازے کی چوکھٹ پہ رکھا مضبوطی کے ساتھ زنجیر کو پکڑ کر قدم اُٹھاتا ہوا کُنٹے کو عبور کیا۔ اور بڑی خاموشی سے دروازے کو اندر سے بند کر کے پاس ہی لگے ہوئے غسل خانے میں گھس گیا!

جانے میں کب تک نہاتا رہا۔ صابن مل مل کر جیسے جسم کو نہیں بلکہ روح کو بھی صاف کر رہا تھا۔ اپنی زندگی کے ایک لمبے غسل کے بعد جب میں کھانے کے کمرے میں پہونچا تو بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا، غسل کے معاملے میں بے چاری عورتیں بدنام ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ مرد بھی کسی طرح کم نہیں!

ہزاروں لیٹر رُکے ہوئے پانی کے جس گڑھے کو میں بھول چکا تھا یا بھُلانا چاہتا تھا وہ دفعتاً میرے سامنے آگیا۔ امام الدین اور نارائن پر نظر پڑتے ہی مجھے ایک ایک بات یاد آگئی۔ اور ساتھ ہی میں نے اُن سے پوچھا، آخر کہاں غائب رہے تم دونوں؟ کیا اس طرح تم عوام کا کام کرتے ہو؟ ——— امام الدین اور نارائن میرے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ جیسے اقبالِ جرم ہے لیکن ان کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی مسکراہٹ شبہ کی گنجائش پیدا کر رہی تھی۔ آخر مسکراہٹ کا یہ کون سا موقع ہے! ——— میں نے کہا، امام الدین! تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ ——— امام الدین نے کہا، کچھ نہیں صاحب! بس آپ کو سلام کرنے آئے ہیں۔ ہم نے سوچا بڑا ساب ہے کچھ نہ کچھ انعام مل ہی جائے گا ——— میں نے ذرا تلخی سے کہا، آخر کس بات کا انعام؟ کیا وعدہ خلافی اور جھوٹ بولنے کا انعام؟

نہیں صاحب — ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ ویسے کبھی کبھی وعدہ خلافی ہو جاتی ہے۔ مگر کیا کریں ساب۔ یہ میونسپلٹی کا کام ہی ایسا۔ لیکن اس وقت تو ہم اپنے کام کا انعام لینے آئے ہیں۔ حالانکہ ہم انعام پہلے لیتے ہیں۔ اور کام بعد میں کرتے ہیں۔ لیکن سرکار ہم نے کام کیا ہے۔ اور اب انعام کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ سرکار جو بھی مناسب سمجھیں ——— سلام ساب ——— !

تو کیا واقعی تم دونوں نے کام ختم کر دیا؟ سچ کہتے ہو؟ —— حضور! کیا ہم جھوٹ بولیں گے۔ چل کر خود ہی ملاحظہ فرمالیں!

میں جیسے خوشی سے اُچھلا۔ اور خود اپنی چارپائی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں دریچے سے میرے کمرے میں آرہی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سوائے میری بیوی کے جو مجھ پر جھکی ہوئی میرے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی طبیعت کیسی ہے؟ آپ رات بھر بڑبڑاتے رہے!

دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی منٹوں میں تیار ہو کر ناشتہ کیا۔ اور چائے پی کر سیدھا میونسپل آفس پہونچا!

دس بج چکے تھے۔ کمشنر صاحب تشریف فرما تھے۔ قاعدے کے مطابق اُن کے پرسنل اسسٹنٹ سے میں نے ربط پیدا کیا۔ اتفاق سے وہ میرے شناسا نکلے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، آیئے —— آیئے۔ آج تو بونسپلٹی کی قسمت جاگ اُٹھی ہے۔ کیسے کیسے ادیب اور فن کار یہاں آرہے ہیں۔

پھر انہوں نے مسکرا کر اپنی بڑی میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ اور میرے بیٹھنے کے بعد اُنہوں نے کرسی سنبھالی —— میز کے اطراف ان کے آفس کے چند کلرکس، اور سپرنٹنڈنٹ قسم کے اصحاب فائلوں کو لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے سب کو اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔

پھر گھنٹی بجائی۔ اور چپراسی کو فوراً دو کپ کافی کا آرڈر دیا۔ اور میری طرف مخاطب ہو کر بولے، حضور! حکم دیجئے۔

مختصراً میں نے انھیں موری کی داستان سُنائی جو کنٹے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور اپنی درخواست کی ایک نقل ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ اُنہوں نے قہقہہ لگا کر کہا، حضور! بس اتنی سی بات ہے۔ میں سمجھا کوئی بڑا کام ہے۔ مگر اس معمولی کام کے لئے آپ نے زحمت کیوں کی؟ صرف آپ کا ٹیلیفون کافی تھا۔ خیر آپ تشریف لائے ہیں یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کم از کم اس بہانے آپ سے ملاقات تو ہو گئی۔ ورنہ آپ حضرات سے ملنا کہاں ہوتا ہے!

بہت بہت شکریہ، میں نے کہا، تو پھر اس سلسلے میں کیا کمشنر صاحب سے ملنے کی ضرورت ہے؟ —— قطعی نہیں۔ آپ کا خادم یہاں کس لئے بیٹھا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کا کام ہو گیا۔ میں آج ہی متعلقہ انسپکٹر کو شخصی طور پر ہدایت دوں گا —— جی۔ جی شکریہ!

اُنہوں نے سگریٹ جلا کر ایک لمبا کش کھینچا۔ اور دھواں چھوڑتے ہوئے میز پر دونوں ہاتھوں کو رکھ کر میری طرف ذرا جھکے۔ اور مجھ سے پوچھا، کہئے۔ لکھنے پڑھنے کا کام کیسے ہو رہا ہے —— میں نے کہا، ان حالات میں کیا کام ہو سکتا ہے۔ اندازہ تو کیجئے۔ سچ کہتا ہوں، ایک لفظ نہیں لکھا —— اب لکھیں گے جناب —— وقت آگیا ہے۔ بس لکھنا شروع ہو جائے گا۔ سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں ڈال کر انہوں نے کہا۔ اور پھر فرمایا، ایک شعر آپ کی نذر کرتا ہوں —— ارشاد —— ارشاد!!

اچھا تو یہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ میں دل ہی دل میں بڑبڑایا —— شعر بہت ہی معمولی تھا۔ لیکن میں نے اخلاقاً داد دی۔ جواب میں اُنہوں نے سلام کیا۔ اور سگریٹ جلانا ہی چاہتے تھے کہ چپراسی چائے کا ٹرے لے آیا —— چائے پی کر اور پلا کر وہ مسکرائے اور کہا، آپ کی داد تو میرے لئے سند کا درجہ رکھتی ہے۔

میں انکار نہ کر سکا۔ ویسے یہ بات جی میں آئی تھی کہ اُن سے کہہ دوں کہ حضور! آپ بور کر رہے ہیں۔ محض تک بندی کو شاعری

نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن میں اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گیا۔ گھر کے عقبی حصے میں ٹھہری ہوئی نالی میرے سامنے آ گئی۔

پھر انہوں نے سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف پھونکتے ہوئے بڑے اسٹائل سے پوچھا کہیں آپ کو جانا تو نہیں؟ ـــــ میں نے کہیں نہیں۔ کمشنر صاحب سے ملنے آیا تھا۔ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اب اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن دل ہی دل میں، میں نے کہا کہ چلو پڑھنے سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ گھر کی نالی صاف کروائی جا سکتی ہے۔ ہماری میونسپلٹی ادیبوں کی کم از کم اتنی تو قدر کرتی ہے!

مزید اجازت چاہتے ہوئے میں نے پی۔اے سے پوچھا، فرمائیے ـــــ میرے لائق کوئی خدمت!

مرزا میر شمشیر علی بیگ شمشیر، پی اے۔ ٹو کمشنر میونسپل کارپوریشن بڑے ٹھٹے سے مسکرائے۔ اور کہا، حضور! خدمت لئے تو ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ بس آپ کو ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔ اگر وقت ہو تو حضور ایک تازہ غزل سماعت فرمائیں!

ارشاد ـــــ ارشاد!!

جواب میں وہ مسکرائے۔ اور میز کی دراز سے ایک ضخیم بیاض نکالی۔ اور میری طرف ذرا جھکتے ہوئے بولے۔ ملاحظہ فرمائیے بیاض کو دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اور نہ جانے میرا بلیڈ پریشر کتنا بڑھ گیا۔ اور معلوم نہیں کتنی دیر تک میں اپنی گردن ہلا ہلا کر داد دیتا رہا۔ لیکن جس وقت مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے محسوس کیا دل کے دھڑکنے کی رفتار بھی سست ہوتے ہوتے رک گئی۔ میں نے فوراً اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج چکے تھے۔ گویا تین گھنٹے میں اسی نشست پر بیٹھا رہا۔ اور کئی صبر آزما مرحلوں سے رہا۔ جب شمشیر صاحب سے اجازت چاہی تو وہ لنچ کے لئے اصرار کرنے لگے۔ لیکن میں نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ کسی طرح باہر میں نکلوں۔

دوسرے اور تیسرے دن میونسپلٹی کا کوئی جوان یا انسپکٹر نہیں آیا۔ آخر چوتھے دن میں سینٹری انسپکٹر آفس پہونچا۔ اتفاق سے متعلقہ انسپکٹر سے ملاقات ہوئی جس سے میں مل چکا تھا! ـــــ انسپکٹر نے بڑی خفگی کے ساتھ مجھے دیکھا۔ اور بولا۔ یہ کیا گڑبڑ کر رہے ہیں آپ میں نے پوچھا کیسی گڑبڑ؟ ـــــ یہی کہ کیا آپ کمشنر صاحب سے ملے تھے؟ ـــــ بالکل ملا تھا۔ اور اگر ضرورت پڑے تو صدر جمہوریہ سے بھی ملوں۔ ـــــ ٹھیک ہے ـــــ ٹھیک ہے۔ اب نوٹس ملنے پر آپ کو سب معلوم ہو جائے گا! انسپکٹر بڑبڑایا۔

کیسی نوٹس؟ میں پریشان ہو گیا ـــــ یہی کہ آپ محلے کے عوام کی صحت خراب کر رہے ہیں۔ اور فلش نہیں بنواتے ـــــ

میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا، گھر میں فلش بنوانا یا نہیں یہ ایک نجی معاملہ ہے اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے محلے میں ڈرینج کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ آپ نوٹس کس بات کی دیتے ہیں۔ خیر آپ نوٹس دیجئے۔ لیکن مجھے ایک کو نہیں، بلکہ پورے محلے نوٹس دینی ہوگی جہاں ہزاروں آدمی رہتے ہیں۔ اور اُن سب سے پوچھنا ہوگا کہ وہ گلی کوچوں اور سڑکوں پر گندی نالیاں کیوں بہا رہے ہیں؟ اسکے بعد جواباً ہم بھی آپ کو دوسری نوٹس دیں گے۔ اور اُس نوٹس میں ہم آپ سے یہ پوچھیں گے کہ میونسپلٹی ہم عوام سے جو مختلف وصول کرتی ہے اُس کا وہ کیا استعمال کر رہی ہے۔ خیر میں چلتا ہوں ـــــ آپ کی نوٹس کا انتظار کروں گا!

انسپکٹر نے اپنی کرسی چھوڑ کر مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، حضور! تشریف رکھئے۔ آپ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں میرا مطلب تھا کمشنر صاحب سے ملنے اتنے لمبے سفر پر جانے کی آپ نے کیوں زحمت کی؟ جب آپ کے خادم یہاں موجود ہیں تو پریشانی

کیا بات ہے حکم دیجئے۔

حکم وکم کچھ نہیں۔ براہ کرم وہ گنٹھے کو صاف کروا کے پانی کے بہاؤ کے لئے کوئی راستہ بنوا دیجئے۔

انسپکٹر نے معذرت چاہتے ہوئے کہا، تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں میں ہیلتھ اگزیبیشن کے کاموں میں بے حد مصروف تھا۔ اب فرصت ملی ہے۔ اور اب آپ کا کام یوں چٹکی بجاتے ہوئے کر دوں گا۔ "یوں" ـــ اشارہ کرتے ہوئے اس نے چٹکی بجائی۔ اور میں ایک عدد کرے پر مشتمل آفس سے نکل گیا۔

میونسپلٹی کا ایک نیا جوان جو کسی اور محلے سے متعلق تھا دوسری صبح میرے گھر پر تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ امام الدین اور رائن ابھی آفس نہیں آئے۔ اس لئے اسے بھیج دیا گیا ہے تاکہ وہ انسپکٹر کو گنٹھے کے بارے میں اپنی رپورٹ دے سکے۔

میں اس جوان کو گھر کے پچھلے حصے میں لے گیا۔ اور کہا، دیکھو یہی ہے وہ گنٹہ جس کے بارے میں میں نے درخواست دی ہے۔ جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ سب جاکر کہنا ـــ نئے جوان نے سر ہلا کر بغور گنٹھے کو دیکھا!

گنٹھے میں اور کئی ہزار لیٹر پانی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی پُرسکون سطح پر کائی کی ایک تہہ جم چکی تھی۔ اس کے علاوہ ادھ جلے سگریٹ، پھینکے ہوئے خالی سگریٹ کے پیاکٹ، ٹین کے ڈبے، پرانی چپلیں، بچوں کے ٹوٹے ہوئے کھلونے، تار تار قمیص، دوپٹے رنگ برنگی ساڑیوں کے ٹکڑے پانی پر تیر رہے تھے۔

گلی میں کوئی نہ تھا۔ اس وقت دو چار سور اور چند مینڈکیں گڑھے کے ادھر اُدھر کنارے اپنی بھوک اور پیاس کو بجھا رہے تھے۔ میونسپلٹی کا جوان جانے لگا تو میں نے کہا، تم ان تمام چیزوں کا ذکر اپنے انسپکٹر سے کرنا جو تم نے یہاں دیکھا۔ اور اسے یہ بھی بتانا کہ ٹھہرا ہوا پانی کس طرح گھر کی دیواروں اور بنیادوں کو کمزور کر رہا ہے۔

مزید چار پانچ دن یونہی گزر گئے! اور گنٹھے کا پیٹ ایک سرمایہ دار کی توند کی طرح پھولتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مچھروں اور چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی فوج میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا گیا!

آخر ایک سہانی صبح کو میونسپلٹی کا ایک کلرک میرے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹائپ شدہ پروفارمہ تھا وہ گھر گھر جاکر بچوں اور بڑوں کی مردم شماری کر رہا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میری درخواست پر میونسپلٹی نے یہ طے کیا ہے کہ ہر گھر کے عقبی حصے میں "انڈر گراونڈ" ایک ٹینک بنا کر دیا جائے۔ جس پر ساڑھے تین ہزار کا خرچ آتا ہے اور یہ رقم بہت ہی آسان اقساط میں ہر مہینہ صاحب خانہ سے وصول کی جائے۔

مگر اس پر مجموعی حیثیت میں لاکھوں روپیوں کا خرچ آئے گا ـــ ہاں صاحب کلرک نے گردن ہلائی۔

لیکن یہ کب تک ہوگا؟ ـــ اعداد و شمار جمع کرنے کے بعد شہر کے تمام میونسپل کونسلروں کی میٹنگ میں اس نئی اسکیم کو برائے منظوری رکھا جائے گا۔ اور پھر اس کے بعد میونسپلٹی انجینیروں کی میٹنگ میں اس پر غور کیا جائے گا کہ کتنا خرچہ آئے گا۔ اور اس کے بعد مجموعی رقم کی منظوری کے لئے میونسپلٹی کا اجلاس منعقد ہوگا۔ اور اس میں یہ اسکیم پاس ہو جائے تو اسے نئے بجٹ میں شامل کر لیا جائے گا!

مگر اس اسکیم کے پاس ہونے تک کئی مہینے گزر جائیں گے۔ اور اُس وقت تک ـــ

اس وقت تک اس کُنٹے کا کیا ہوگا؟

کلرک چپ کھڑا تھا، کیوں کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا!

مگر اِس کنٹے کا کیا ہوگا؟

جیسے میں خود اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ اور پھر میں نے خود سے کہا، اس کنٹے کا کچھ نہیں ہوگا۔ شمشاد بیگم کا کچھ نہیں ہوگا۔ اہلِ محلہ اپنی متعدد درخواستوں کے باوجود شمشاد بیگم عرف مُنی بائی کا کچھ نہ بگاڑ سکے لہٰذا میں ایک مہینے کی لگاتار جدوجہد کے بعد کنٹے کو ختم نہ کرا سکا۔ دونوں باقی ہیں۔ اور شاید ایک دوسرے کے لئے دونوں کا وجود ضروری ہے۔ اور ان کے لئے میرا وجود۔ اس لئے میں چپ ہوں۔ تین مہینے گزر گئے۔ اور اب تو کُنٹہ ایک چھوٹے سے تالاب میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ آج کل میں کنٹے کے بارے میں سوچتا ہوں اور نہ یہ خیال ستاتا ہے کہ اس کے بہاؤ کے لئے کوئی سمت دے دوں۔ اس لئے میں چپ ہوں۔ اس لئے اس کے رہنے اور نہ رہنے سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ کنٹہ میرے گھر کے عقبی حصّے سے میرے دماغ میں منتقل ہو چکا ہے۔ اور دل کی وادیوں میں اس کا پانی ٹھہر گیا ہے!

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

لسا چاکلیٹ چائے

اور

لاسا اسپیشل چائے

نے اپنے ۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ مکمل کر لیے ہیں

بانو سرتاج
★
(چندرپور)

کنوئیں کا مینڈک

ہمارے دس سالہ بیٹے مُنّے سے ہم نے ایک روز پوچھا "بیٹے، آپ بڑے ہوکر کیا بننا چاہیں گے ؟"
اُس نے فوراً جواب دیا "پرائمری اسکول کا ٹیچر یا ٹریننگ کالج کا لکچرر"
آپ سے کیا چھپانا ؟ ہم اپنے اس بیٹے سے بہت خائف رہتے ہیں۔ ایسی ایسی باتیں کرتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ یقین جانیے ہمیں پہلے کچھ سُن گُن مل گئی ہوتی تو اسے جنم دینے سے پہلے بی اے، ایم اے ضرور کر لیتے اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو کچھ جنرل نالج تو ضرور ہی بڑھانے کی کوشش کرتے۔ اب دیکھئے نا اس اسپوٹنک دور میں جب ہر بچہ ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس یا آئی پی ایس افسر بننے کی خواہش رکھتا ہے ہمارا بیٹا بننا بھی چاہتا ہے تو ٹیچر بننا چاہتا ہے۔ ہماری جگہ پر بچوں کے مستقبل کے اونچے اونچے خواب دیکھنے والی کوئی دوسری ماں ہوتی تو یقیناً غش کھا کر گر پڑتی۔ مگر ہم اپنے بچوں کے خطرناک مذاق کے عادی ہو چکے ہیں۔

ہماری ایک سہیلی جونیر کالج میں ہندی کی لکچرر ہے۔ ایک روز اس نے طلباء کو 'میرا نصب العین' موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ سائنس کی کلاس تھی سب کے سب ذہین اور پُرحوصلہ۔ کاپیاں دیکھتے وقت ہماری سہیلی نے پایا کہ زیادہ تر طلباء (ستر نیصدی) نے ڈاکٹر یا انجینئر بننا اپنا نصب العین بنا رکھا ہے تو ۲۵ نیصدی کو سرکاری ملازمت کی شان و شوکت نے گرویدہ کر رکھا ہے۔ ۵ نیصدی بزنس کی کامیابیوں میں یقین رکھتے ہیں اور بقیہ ۵ فیصدی متفرق ملازمتوں اور پیشوں کو اپنانے کی خواہش میں سرشار ہیں۔ ۶۵ طلباء میں صرف ایک نے ٹیچر بننے کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ہماری سہیلی نے وہ کاپی الگ رکھ لی۔ کلاس میں کاپیاں تقسیم کرتے وقت اُس نے طلباء سے کہا "ملک کی ترقی کے لئے ڈاکٹروں، انجینئروں اور ایڈمنسٹریٹیو (Administrative) آفیسرس کی ہی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کو جہالت کے اندھیرے سے نکالنے اور علم کی روشنی دینے کے لئے اچھے ٹیچرز کی بھی ضرورت ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں سر ینیدہ۔ کم سے کم تم نے ٹیچر بننے کی خواہش کی۔ ٹیچر بننا اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔۔۔۔ اچھا یہ تو بتاؤ تم نے ٹیچر بننے کے لئے سوچا کیسے ؟"

سریندر نے لاپرواہی سے کہا "سوچا دوچا کیا میڈم؟ یہ لاسٹ پریفرنس (last preference) ہے"۔
ہماری سِٹّی پِٹّی گم ہو گئی۔ سریندر نے سمجھایا "میڈیکل میں کہیئے یا انجینیئرنگ میں، وہاں اپنے کو داخلہ ملنے والا نہیں۔ بزنس کے لئے اپنے رام کے پاس سرمایہ نہیں، بس لیکچرر بن جائیں گے۔ بینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ آئے چوکھا۔۔۔"

آج کل کی نوجوان نسل کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہتے ہیں مطلب دوسرا نکلتا ہے۔ کرنا کچھ چاہتے ہیں کر کچھ اور جاتے ہیں۔ ایک طالب علم مستقبل کے ہزار ہا رنگین خواب دیکھتا ہے مگر مطلوبہ انسٹی ٹیوشن میں داخلہ نہ ملنے یا امتحان میں کم نمبر ملنے پر خودکشی کر لیتا ہے قول اور عمل میں کچھ تو مطابقت ہونی چاہیئے۔ لیجئے کہاں بات پہنچ گئی۔۔۔ مُنّے کی بات سُن کر ہمیں شبہ ہوا کہ بات اتنی غیر اہم نہیں جتنی حقیقت میں نظر آتی ہے۔ ہم بات کی تہہ تک نہ پہونچ سکیں گے یہ بھی اتنا ہی یقینی تھا۔۔۔ دل ہی دل میں ڈر گئے۔ دال جلنے کی بو آرہی ہے' کہہ کر بھاگے اور باورچی خانہ میں پناہ لی۔

دراصل جیسے کسی بھی ملک کا محکمۂ دفاع اپنے ہتھیاروں و جنگی اسلحوں کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر جنگ کا اعلان کرنے یا جنگ میں شامل ہونے سے ڈرتا ہے اُسی طرح شوہر نامدار کی غیر حاضری میں ہم اپنے بچوں سے بحث کرنے سے کتراتے ہیں۔ جتنی باتیں ہم اپنی ۳۵ سالہ زندگی میں نہیں جان پائے اُس سے زیادہ کا علم آج کل کے بچے دس سال کی عمر میں حاصل کر لیتے ہیں۔ "اوہ ممّی! آپ اتنا بھی نہیں جانتیں" ایک ایسا جملہ ہے جو روزانہ بلا مبالغہ ہمیں دس مرتبہ تو سُننا ہی پڑتا ہے۔

ہم کبھی کبھار اردو کے میگزین پڑھ لیتے ہیں۔ جھوٹ کیوں بولیں، ہمارا زیادہ وقت اپنے بچوں کی نصابی کتب پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ صرف اسی لئے کہ رات کو جب ہم اُن کا ہوم ورک کرانے بیٹھیں تو ہمیں پہلے سے کچھ نہ کچھ آتا ہو۔ ایک میگزین میں ہماری نظر سے یہ لطیفہ گزرا۔ انگریزی کانونٹ میں پڑھنے والے ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا "ممّی سرکار اسکولوں میں سیکس ایجوکیشن دینے کی تجاویز پر غور کر رہی ہے"۔ "اچھا" ماں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "مگر تمہیں فکر کس بات کی ہے"۔ بچے نے خدشہ ظاہر کیا "آپ تو گھر پر اس مضمون کے پڑھنے میں ہماری مدد نہ کر سکیں گی"۔ ماں نے کہا "میں کیوں مدد نہ کر سکوں گی؟" "آپ بھلا اس کے بارے میں کیا جانیں؟ آپ کے زمانے میں یہ سبجکٹ تھا کہاں؟"

ہم اس خوف سے نیم جان رہنے لگے کہ کب یہ موضوع ہمارے بچوں کے سامنے آتا ہے اور وہ ہمیں اس موضوع کی تعلیم کے لئے نااہل ٹھہراتے ہیں۔ دوسرے چند موضوعات کے لئے ہماری نااہلیت کا اعلان وہ کر چکے تھے ہماری چھوٹی بیٹی کل اپنے ڈیڈی کو ایسی صلاح دے بیٹھی جس سے ہمیں اپنا وجود اس گھر میں خطرے میں نظر آنے لگا۔ ہُوا یوں تھا کہ ہمارے بڑے صاحبزادے خیر سے اس سال نہم جماعت میں گئے تھے۔ ابھی تک اُس کا ہوم ورک ہم ہی کرواتے تھے مگر نہم جماعت کی نصابی کتب دیکھ کر تو ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ ہم نے گھبرا کر شوہر نامدار سے کہا "کوئی دوسرا انتظام کیجئے"۔
ہمارا واضح اشارہ ٹیوشن کی طرف تھا مگر بیٹی نے فوراً ڈیڈی کو مشورہ دیا "ڈیڈی، ایسا کیجئے ایک ممّی اور لے آئیے یہ ممّی آٹھویں کلاس تک کا ہوم ورک کرائیں گی دوسری ممّی اس کے بعد کا۔"

اب بتایئے جس گھر میں ایسے شیطان بچے ہوں وہاں ماں کی جان سولی پر لٹکی رہے گی یا نہیں۔۔۔ کل یگ ہے۔ بچّے کو اسکول

یں داخلہ دلانے لے جاؤ تو بچّے کی ماں کا انٹرویو پہلے لیا جاتا ہے آیا وہ بچوں کا ہوم ورک کرانے کی قابلیت رکھتی ہے یا نہیں کیوں کہ سکول میں پڑھایا کم جاتا ہے ہوم ورک زیادہ دیا جاتا ہے۔ کانونٹ کے بچوّں کی مصروفیت کا عالم وزراء کی مصروفیت سے کچھ کم نہیں ہوتا ہم جب بمبئی میں رہتے تھے تب نیا حساب سکھانے کے لئے قدم قدم پر کلاسز شروع ہوئی تھیں۔ جی نہیں بچوں کے لئے نہیں بچوّں کی ماؤں کے لئے جس سے کہ وہ پڑھ کر گھر پر بچوں کو پڑھائیں)۔ بچے بھی تو ان کانونٹ اسکولوں میں پڑھ کر حد سے زیادہ اسمارٹ بن جاتے ہیں۔ ہمارے پڑوس کا ہی واقعہ لیجئے۔ ایک ڈالڈا اور تیل کے تھوک بیوپاری ہیں۔ اُن کے پہلے تین بچوں نے اسکول کی صورت نہیں دیکھی چوتھی لڑکی جو بڑھاپے میں پیدا ہوئی تھی بڑے ارمانوں سے کانونٹ بھیجی گئی DARENTS DAY پر سب بچوں کے والدین کو مدعو کیا گیا تھا۔ عادت مند بیٹی کہنے لگی "ممی پاپا، آپ دونوں وہاں نہ آیئے گا۔ میری سب سہیلیوں کے ممی ڈیڈی جوان ہیں۔ آپ جیسے سفید بالوں والے ممی ڈیڈی کو دیکھ کر سب میرا مذاق اڑائیں گی آپ چھوٹے بھائی بھابی کو بھیج دیں۔ میں انہیں ہی اپنے ممی ڈیڈی کہہ کر سب سہیلیوں سے ملوادُوں گی"۔

ہم اپنے بچوں کی بات کر رہے تھے۔ گھر میں وہ چاہے جو ہمیں کہہ لیتے ہوں۔ گھر کے باہر ہماری پوزیشن ڈاؤن نہیں ہونے دیتے تھے غلطی ایسے ہر ایک سے ہوتی ہے جیسے گھر میں ہر وقت شوہر کو ڈانٹنے والی بیوی کبھی کبھی باہر بھی شوہر کو ڈانٹ دیتی ہے۔ ایک بار کی بات ہے شوہر نامدار اریل اور ہارڈی کی فلم کے چار ٹکٹ لے آئے۔ پکچر جانے کے لئے تیار ہوئے مگر عین وقت پر انھیں آفس سے بلاوا آگیا۔ بندر کی بلا طویلے کے سر پڑے گی یہ سوچ کر ہم سر درد کا بہانہ لے کر پڑ گئے۔ شوہر نامدار نے کہا "ایک دن بچوں کے ساتھ فلم دیکھنے جانے میں کیا مضائقہ ہے؟ چار ٹکٹ ضائع ہو جائیں گے بے کار ہی"۔

بچوّں نے بھی بہت اصرار کیا تو ہم نے کہا "ایک شرط پر چلتے ہیں"۔

تینوں بچوں نے ایک ساتھ پوچھا "کون سی شرط؟"

ہم نے کہا "خاموشی سے فلم دیکھو گے۔ سمجھ میں نہ آئے تب بھی ہم سے کچھ پوچھو گے نہیں"۔

انگریزی فلموں کے انگریزی مکالمے ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ پتہ نہیں کیا غوں غاں کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی انگریزی ہماری بلی تب بولتی تھی جب پہلے پہل اُس نے بولنا سیکھا تھا۔ ہندوستانیوں کی انگریزی تو خیر سے ہم سمجھ لیتے ہیں۔ شوہر نامدار بچوں کے ساتھ جاتے تو درمیان میں انہیں سمجھاتے بھی جاتے۔ ہم نے پہلے ہی کچھ نہ پوچھنے کی شرط رکھ دی تو بچوں کو ماننا پڑا۔ پہونچے سنیما ہال۔ چاروں طرف کئی شناسا صورتیں نظر آئیں تو ہمارا خون سوکھنے لگا۔ ہم نے بچوّں سے کہا "دیکھو ہماری ہدایت یاد ہے نا۔ ہم سے پوچھنا نہیں کچھ۔ گھر پہنچ کر سمجھا دیں گے ہم"۔

فلم شروع ہوئی تینوں بچّے مزے سے دیکھ رہے تھے قہقہے لگا رہے تھے ادھر ہم دل میں بار بار دہرا رہے تھے کہ آج آگئے سو آگئے۔ آئندہ کبھی انگریزی فلم دیکھنے نہیں آئیں گے۔ اچانک پورا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ لاریل نے ہارڈی سے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی۔ ہمارے بڑے بیٹے نے جو ہمیں گم سم بیٹھے دیکھا تو اپنی ہنسی روک کر بولا "واہ کیا بات تھی۔ ممی آپ کی سمجھ میں نہیں آئی"۔ کہتے کہتے اُس نے ہمیں سمجھانا بھی شروع کر دیا۔ ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر ہمارے بیٹے کا اس میں قصور بھی کیا؟ ہم نے بچوں کو

کچھ نہ پوچھنے کی ہدایت کی تھی۔ کچھ سمجھانے سے تو روکا نہیں تھا۔

دن بھر ہم خیالوں میں کھوئے رہے مگر کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکے۔ شام کو شوہر نامدار کو چائے کا ایک کپ دیتے ہوئے ہم نے موقع غنیمت جان کر منے سے کہا... بیٹے آپ بڑے ہو کر کیا بننا چاہیں گے، ذرا اپنے ڈیڈی کو بھی بتائیں۔"

وہی جواب اسی تپاک سے ملا "پرائمری اسکول کا ٹیچر بنوں گا یا ٹریننگ کالج کا لکچرر..."

شوہر نامدار کے ہاتھوں میں پیالی تھرتھرانے لگی۔ "کیا کہہ رہے ہو منے؟"

"کیوں کیا ٹیچر بننا بُرا ہے؟" نہایت معصومیت سے سوال کیا گیا۔

"نہیں تو... مگر... تم ٹیچر ہی کیوں بننا چاہتے ہو؟"

"کیوں کہ اس ملازمت میں کام دوسرے پیشوں کی بہ نسبت کم ہوتا ہے... نہ کے برابر..."

"کیا کہتے ہو بیٹا!" ہمیں حیرت ہوئی۔

"دیکھئے ممی.. سال کے بارہ مہینوں میں سے گرمیوں میں دو ماہ، سرما میں ایک ماہ اور کرسمس میں ایک ہفتہ.. تعطیلات ہوتی ہیں۔ اس کے بعد باقی بچے دنوں میں سے سال کے پچاس اتوار وضع کردیں۔ مختلف راشٹریہ اور مذہبی تہواروں کی چھٹیوں کو بھی نکال دیں تو باقی کتنے دن رہ گئے۔ میڈیکل اور دوسری چھٹیاں الگ۔"

ہمارا حساب تو خیر ابتدا ہی سے کمزور تھا مگر شوہر نامدار کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ "دوسری اور خاص بات یہ کہ پڑھانا کچھ بھی نہیں پڑتا۔"

ہمیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر منا اپنے گرانقدر خیالات کی بمباری کئے جا رہا تھا "پرائمری اسکول کے بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ جو ٹیچر کہہ دے وہی سب سے بڑا سچ۔ ذرا بھی بے اطمینانی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ٹریننگ کالج کے اسٹوڈنٹ سمجھدار ہوتے ہیں اس لئے بے اطمینانی ظاہر کرکے ٹیچر سے سوالات پوچھ کر اُس کی قابلیت کی پول نہیں کھولنا چاہتے۔ جو پڑھا دیتا ہے سُن لیتے ہیں۔ پرائمری اسکول کے ٹیچر کو ہر پیریڈ پر کلاس میں جانا لازمی ہے مگر اُسے کلاس میں نیند لینے کا حق بھی حاصل ہے بالکل اسی طرح، جیسے کالج میں داخلہ ملتے ہی ہڑتالیں اور مظاہرہ کرنے کا حق ہر طالب علم کو مل جاتا ہے۔ ٹریننگ کالج کا لکچرر کلاس میں نہیں سو سکتا تو کلاس میں جانے کے لئے بھی اُسے کوئی مائی کا لال مجبور نہیں کرسکتا۔ جی چاہے پڑھانے جاؤ، جی چاہے نہ جاؤ۔" "بیٹے! آپ کو یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟" شوہر نامدار نے نہایت مودبانہ ڈھنگ سے پوچھا۔

"اب مستقیم بھائی ہی کو لیجئے۔ بڑے لکچرر بنے پھرتے ہیں۔" منا اپنی دُھن میں کہتا گیا "وہ جب دوسری کلاس میں پڑھتے تھے تب کا قصہ سنئے۔ ایک دن اُن کے جناب دو گھنٹے کی نیند لے کر اُٹھے اور فٹا فٹ سوالات پوچھنے لگے۔ ایک سوال تھا، ایک سال میں ایک مرغی کی دو ٹانگیں ہیں تو تین سال بعد کتنی ہوجائیں گی، کسی نے چار کسی نے پانچ کسی نے سات ٹانگیں بتائیں۔ صرف مستقیم نے برابر جواب دیا تین سال بعد مرغی کی چھ ٹانگیں ہوجائیں گی۔ جناب نے خوش ہوکر مستقیم بھائی کو دو کھٹے انعام میں دیئے اور پھر سو گئے۔"

ہم چاہنے لگے کسی طرح اس موضوع کا خاتمہ ہو مگر مُنّا اپنی بات کہنے پر تُلا تھا۔ "یہ تو ہوئی پرائمری اسکول ٹیچر کی بات۔ ٹریننگ کالج کا لکچرر جب پڑھانے کھڑا ہوتا ہے تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے سامنے وہ اسٹوڈنٹس بیٹھے ہیں جو کل خود ٹیچر بن گئے۔ اونٹ کبھی کبھی پہاڑ تلے آتا ہے یہ سوچ کر وہ ہر غلط سلط لکچر کو خاموشی سے سُن لیتے ہیں"۔

ہمیں اندیشہ ہوا شوہر نامدار کہیں قوتِ برداشت نہ کھو بیٹھیں۔ اُن کے چہرے پر پھیلتی رنگوں کی قوس قزح ہم دیکھ رہے تھے گورنمنٹ سروس میں آنے سے پہلے وہ ایک ٹریننگ کالج کے لکچرر تھے۔ اُن کی کہی ایک بات ہمیں یاد آگئی۔ ہم نے مُنّے سے کہا "تمہارا اس طرح سوچنا غلط ہے۔ بنیاد جتنی مضبوط ہوگی عمارت اتنی ہی عظیم بنے گی۔ ابتدائی تعلیم اعلیٰ تعلیم کی بنیاد ہوتی ہے پھر اس میں غفلت کی گنجائش کہاں؟ غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص ابتدائی جماعتوں کو پڑھاتے ہیں گو کہ تنخواہ انہیں اُن کی علمی قابلیت کے مطابق ہی ملتی ہے"۔

مُنّے نے ہمیں ٹوک دیا۔ "اپنے ملک کی بات کیجئے ممی۔ غیر ممالک کی ترقی اور خوشحالی کی مثال زبان کو خوبصورت بنانے کے لئے اچھی ہے مگر یہ مثال جوہری کی دکان میں سجے ہوئے زیورات کی مانند ہے جن کی چمک آنکھوں کو اچھی لگتی ہے مگر ہر آدمی اُن زیورات سے خود کو سجا سنوار نہیں سکتا کیوں کہ وہ اُن کی پہنچ سے باہر ہیں"۔

ہم مُنّا کے منہ سے اتنی بڑی بات سُن کر اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر کسی طرح اپنے کو سنبھال کر کہا "وہ غدار ہیں بیٹے جو فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں۔ دیش کی نئی نسل کو محنتی جفاکش اور تعلیم یافتہ بنانے کی جگہ کام چور اور جاہل بناتے ہیں۔ یہ لوگ استاد کی عظمت پر بٹہ لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کل کا استاد جو بے انتہا عزت کا حقدار ہوتا تھا آج نفرت کا کردار بن کر رہ گیا ہے۔ کل کا طالب علم اُستاد کو سرِ راہ دیکھ کر نظریں جھکا کر تعظیم کرتا تھا، آج کا طالب علم نظریں بچا کر نکل جاتا ہے"۔

اُسی وقت مُنّا کے کچھ دوست آگئے وہ اُن سے ملنے چلا گیا۔ ہمیں رات کے کھانے کی تیاری کرنی تھی شوہر نامدار کو فکر میں غلطاں چھوڑ ہم باورچی خانے کی طرف بڑھ گئے۔

دوسرے دن ہم مستقیم کی خبر لینے پہونچ گئے۔ ہمیں شک تھا کہ ہو نہ ہو، وہی مُنّے کے دماغ میں یہ خرافات بھر رہا ہے۔ جاتے ہی اُس پر برس پڑے "یہ کیا ہے مستقیم۔ بچّے کے دماغ میں ایسی اُلٹی سیدھی باتیں بھر کر کیوں اُسے برباد کرنے پر تُلے ہو؟"

وہ ششدر رہ گیا "کیا بات ہے؟ میں سمجھا نہیں بھابی جان"۔

ہم نے مُنّے کی باتوں کا خلاصہ اُسے بتایا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا... "بخدا بھابی جان میں نے اس سے کوئی بات نہیں کہی، ہاں کل اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر میں یہی سب کہہ رہا تھا۔ مُنّا اس وقت میری الماری میں سے کہانیوں کی کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ میری باتیں بغور سُن کر حفظ کر رہا ہے"۔

ہم خاموشی سے لوٹ آئے۔ اپنا سکّہ کھوٹا ہو تو دوسروں کو الزام دینے سے فائدہ کیا...

مستقیم سے بات چیت کے بعد ہم بہت ہوشیار رہنے لگے ہیں۔ شوہر نامدار کو بھی خبردار کر دیا ہے پتہ نہیں ہم لوگ کس وقت کیا باتیں کریں اور مُنّے انہیں سن کر باہر Relay کرتے پھریں۔ عبرت حاصل کرنے کو ایک واقعہ ہمیں پہلے بھی معلوم

تھا۔ ایک بچے نے اپنے گھر آئے مہمانوں میں سے مہمان خاتون کو مخاطب کر کے کہا...

"آنٹی، ہمیں سکھائیے کہ انگلیوں پر کسی کو کیسے نچایا جاتا ہے"۔

آنٹی کچھ نہیں سمجھیں تو بچے نے کہا "آپ کو یہ کمال آتا ہے آنٹی۔ ہمیں پتہ ہے۔ ابھی کل ہی تو ڈیڈی میری ممی سے کہہ رہے تھے کہ اشوک کی آنٹی اشوک کو انگلیوں پر نچاتی ہے"۔

کیا حالت ہوئی ہوگی بچے کے ممی ڈیڈی کی، آپ سوچ سکتے ہیں۔ ہم نے منے کو ایک مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی۔ اس طرح چھپ کر دوسروں کی باتیں سننا معیوب ہے۔ تو وہ الٹا ہمیں ہی کہنے لگا۔ "ممی ہر شخص کو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا چاہیئے کنویں کا مینڈک بن کر جینے سے کیا فائدہ.."

آپ کا کیا خیال ہے؟ کنویں کا مینڈک والی پھبتی ہم پر تو نہیں کسی گئی؟

■■

ادارۂ **شگوفہ**

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔!

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/-	روپے
نقطہ	یوسف ناظم	مضامین	۶/-	"
البتہ	"	"	۱۰/-	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-	"
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-	"
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	"
بالآخر	"	مضامین	۱۴/-	"
سُنی سُنائی	لئیق صلاح	"	۱۵/-	"
رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵/-	"
خواہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰/-	"
چند کلیاں نشاط کی	عمران حسین	"	۱۰/-	"
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲/-	"
غبارِ حاضر	رؤف خوشتر	"	۱۲/-	"

جاوید کمال
★
(حیدرآباد)

"ضرورت رشتہ"

ڈرامہ کے کردار

۱. بوڑھا سجاد ـــــ عمر چالیس سال
۲. خورشید ـــــ اٹھائیس سال
۳. انور ـــــ پچیس سال
۴. غفور ـــــ تیس سال
۵. اُمیدوار بوڑھا ـــــ عمر ستر سال
۶. انسپکٹر ـــــ چالیس سال
۷. حوالدار ـــــ پینتیس سال

:- پہلا منظر :-

(ایک ڈرائینگ روم کا پس منظر۔ انور اخبار پڑھ رہا ہے۔ دروازہ پر کھٹکھٹاہٹ)

انور :- (دروازہ کھولتے ہوئے) کون؟ خورشید۔ آؤ یار، میں تمہارا ہی انتظار دیکھ رہا تھا۔

خورشید :- لیکن تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟ پکچر چلنا نہیں ہے ـــ؟

انور :- آج پکچر کا موڈ نہیں ہے یار۔ آج اخبار میں ایک دلچسپ اشتہار چھپا ہے۔

خورشید :- کیسا اشتہار؟

انور :- ٹھیرو۔ میں تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔

خورشید :- ارے چھوڑو یار۔ یہ اشتہاروں کے چکر۔ ان سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

انور :- تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ اشتہار دوسرے اشتہاروں سے بالکل الگ ہے۔ تم سنوگے تو خوش ہو جاؤگے!

خورشید :- اچھا بابا۔ تم سنانے پر بضد ہیں تو سنا دو۔ ورنہ مجھے ان اشتہاروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

انور :- لو سنو (اخبار پڑھتے ہوئے) ضرورت رشتہ۔! ایک عدد انتہائی حسین و جمیل، دراز قد، اعلیٰ تعلیم یافتہ، امور خانہ داری سے واقف، صوم و صلوٰۃ کی پابند، صاحب جائیداد اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی کے لئے لڑکے کی ضرورت ہے۔

مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اُترنے والے حضرات ہی رجوع ہوں۔

خورشید :۔ شرائط بھی ہیں ۔؟

انور :۔ ہاں سنو۔

امیدوار کا بیروزگار ہونا ضروری ہے۔

خورشید :۔ بہت خوب

انور :۔ اپنے ماں باپ کا چہیتا نہ ہو۔

خورشید :۔ اچھا ۔!

انور :۔ باہر جانے کا خواہشمند ہو۔

خورشید :۔ وہ تو اپنا بھی ارادہ ہے۔

انور :۔ سرکاری ملازم نہ ہو۔

خورشید :۔ ہوں۔

انور :۔ گھر داماد ی قبول کر سکتا ہو۔

خورشید :۔ چلو قبول ہے یہ بھی۔

انور :۔ میٹرک کامیاب حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔

خورشید :۔ چلو اس میں بھی ہم پورے اُترتے ہیں۔

انور :۔ عمر کی کوئی قید نہیں ——— تصفیہ بالمشافہ ۔ انٹرویو آج دو بجے دن مندرجہ ذیل پتہ پر لیا جائے گا۔ پتہ۔

خورشید :۔ بند کر دیار یہ بکواس، یہ کوئی فراڈ معلوم ہوتا ہے ان شرائط پر تو شہر کے لاکھوں نوجوان پورے اُترتے ہیں۔ آج کتنے بیروزگار نہیں ہیں؟ آج کا ہر نوجوان باہر جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ گھر داماد ی کسے پسند نہیں ۔؟ اور پھر اوپر سے عمر کی کوئی قید نہیں ۔ ہوں۔

انور :۔ اسی لئے تو کہتا ہوں۔ آج ہم بھی قسمت آزما لیتے ہیں۔

خورشید :۔ تم جا سکتے ہو؟ میں ان لغویات میں اپنا وقت نہیں برباد کر سکتا۔

انور :۔ ارے یار بیروزگاری میں اس سے اچھا مشغلہ کیا ہو سکتا ہے۔؟ ہو سکتا ہے ہم میں سے کوئی پسند آجائے۔

خورشید :۔ تم شوق سے جا سکتے ہو۔ میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا۔

انور :۔ تو تم نہیں چلو گے؟

خورشید :۔ نہیں ———!

انور :۔ تو ٹھیک ہے۔ میں تو ضرور جاؤں گا ۔!

خورشید :۔ ضرور جاؤ ——— WISH YOU BEST OF LUCK ۔ (روشنی غائب ہوتی ہے میوزک)

دوسرا منظر

(آفس کا کمرہ ——— ایک میز ۔ چار کرسیاں ۔ میز پر کچھ کاغذات رکھے ہیں۔ ایک بوڑھا کاغذات درست کرتے ہوئے۔)

بوڑھا :۔ (پکارتے ہوئے) غفور ۔ ہمارے غفور میاں۔

غفور میاں :۔ (آتے ہوئے) جی آیا مالک ۔!

بوڑھا :۔ سب تیاری مکمل ہو چکی ہے نا؟ (گھڑی کی طرف دیکھ) دو بجنے میں آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ لوگ آتے ہی ہوں گے۔

غفور :۔ کچھ لوگ آچکے ہیں مالک۔

بوڑھا :۔ (کھانستے ہوئے) ٹھیک ہے لیکن ہم اپنے اُصول نہیں توڑیں گے۔ ٹھیک وقت پر ہی انٹرویو شروع کریں گے

غفور :۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں مالک ۔

بوڑھا :۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھو ۔! جب ہم انٹرویو لیں تو تم کمرے کے باہر رہو گے؟ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نوکروں کے سامنے نہیں کہی جا سکتیں۔ سمجھے ۔؟

غفور :۔ جی ۔ جی ۔ میں سمجھ گیا مالک ۔ میں باہر ہی رہوں

بوڑھا :۔ اچھا اب ہم ظہرانہ نوش فرمانے جا رہے ہیں ٹھیک دو بجے انٹرویو شروع ہوگا۔ (روشنی غائب ہوتی ہے۔ پھر آتی ہے۔ گھڑی دو گھنٹے بجاتی ہے)

بوڑھا :۔ غفور ۔ غفور میاں ۔ (پکارتا ہے)

غفور :۔ جی مالک ___ (آتا ہے)

بوڑھا :۔ اب ایک ایک آدمی کو اندر بھیج دو۔ جب وہ باہر آجائے تو دوسرے کو بھیجنا۔ سمجھے؟

غفور :۔ جی سمجھ گیا مالک۔ ابھی بھیجتا ہوں۔ (باہر چلا جاتا ہے)

(ایک نوجوان اندر آتا ہے)

انور :۔ السلام علیکم۔

بوڑھا :۔ وعلیکم السلام۔ وعلیکم السلام۔ آؤ بیٹھو۔ کیا نام ہے تمہارا۔؟

انور :۔ جی ___ جی انور

بوڑھا :۔ واہ ___ بڑا پیارا نام ہے بابا ___ خیر۔ اس فارم کی خانہ پوری کرو۔

انور :۔ جی ___ میں سمجھا نہیں ___؟

بوڑھا :۔ برخوردار۔ بات دراصل یہ ہے میں یہ اسم نویسی وغیرہ کا قائل نہیں۔ اسم نویسی کی قیمت دو تین روپے ہوتی ہے جبکہ یہ فارم میں پیسے میں ایک ہے۔ خیر وقت ضائع مت کرو۔ خانہ پوری شروع کرو۔ (کھانستا ہے)

انور :۔ جی ___ جی بہت اچھا۔ (فارم بھرتا ہے) یہ لیجئے بھر چکا۔

بوڑھا :۔ ٹھیک ہے برخوردار ایک اور بات۔ اس کی دس روپے رجسٹریشن فیس ہوتی ہے۔

انور :۔ (حیرت سے) جی ___ رجسٹریشن فیس ___؟

بوڑھا :۔ ہاں۔ ہاں۔ آج کل ہر کام کے لئے اپنا نام رجسٹرڈ کروانا پڑتا ہے۔ اور پھر ان دس روپیوں میں دو روپے پوسٹل چارجس بھی ہیں۔

انور :۔ پو ___ پوسٹل ___ چارجس ___ دو ___ کیوں؟

بوڑھا :۔ بات دراصل یہ ہے برخوردار۔ تمہارے منتخب ہونے یا نہ ہونے کی خبر ہم ٹپہ کے ذریعہ دیں گے۔ سمجھ گئے۔؟ اور آٹھ روپے سواری خرچ!

انور :۔ ایں ___ سواری خرچ!

بوڑھا :۔ (کھانستا ہے۔ چشمہ درست کرتا ہے) بات دراصل یہ ہے۔ ہمارے یہاں ایک سلکشن کمیٹی ہے۔ جو لڑکی کے ماموں خالو اور چچا پر مشتمل ہے۔

انور :۔ سیلکشن کمیٹی۔؟

بوڑھا :۔ ان میں جو لڑکی کے ماموں ہیں وہ بلدیہ میں ملازم ہیں۔ وہ تمہارے گھریلو حالات کے بارے میں دریافت کریں گے۔

انور :۔ جی ___؟

بوڑھا :۔ اور خالو کا تعلق محکمہ انکم ٹیکس سے ہے۔ وہ تمہاری آمدنی کے بارے میں دریافت کریں گے۔ آیا تم بیروزگار بھی ہو یا نہیں ___؟

انور :۔ اور لڑکی کے چچا ___؟

بوڑھا :۔ (کھانس کر) صبر کرو برخوردار۔ صبر کرو۔ کہہ تو رہا ہوں ہاں چچا کا تعلق ہے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ سے۔ وہ تمہارے چال چلن کے بارے میں تحقیقات کریں گے۔

انور :۔ (آہستہ سے) یا اللہ رحم کر میرے حال پر۔

بوڑھا :۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، سواری خرچ۔ جب یہ لوگ تمہارے بارے میں دریافت کریں گے تو آنے جانے میں پیسے خرچ ہوں گے ہی۔ سمجھ گئے ___؟

انور :۔ جی ___ جی سمجھ گیا۔ لیکن۔ لیکن اس وقت میرے پاس صرف آٹھ روپے ہی ہیں۔

بوڑھا :۔ کوئی بات نہیں برخوردار۔ کوئی بات نہیں۔ ہم پوسٹل چارجس نہیں لیں گے۔ تم خود ہی ایک مہینہ بعد آکر نتیجہ معلوم کر لینا۔ سمجھے ___؟ (کھانستا ہے)

انور :۔ جی ۔۔۔ جی سمجھ گیا۔ یہ لیجئے آٹھ روپے ۔ (روپے دیتا ہے)

بوڑھا :۔ لاؤ ۔۔۔ اللہ تمہیں، تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔ اب تم جا سکتے ہو ۔

انور :۔ جی ۔۔۔ اچھا۔ خدا حافظ۔ (چلا جاتا ہے)

بوڑھا :۔ غفور ۔۔۔۔ Next ۔

(ایک ستر سال کا بوڑھا ہاتھ میں لکڑی لیئے داخل ہوتا ہے)

امیدوار بوڑھا :۔ السلام علیکم۔

بوڑھا :۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ تشریف رکھیئے ۔ تشریف آپ اپنے لڑکے کے لئے رشتہ مانگنے آئے ہیں ۔۔۔ ؟

امیدوار بوڑھا :۔ جی نہیں ۔۔۔ اپنے لئے ۔

بوڑھا :۔ (ایکدم کرسی سے اچھل کر) کیا ۔۔۔ کیا مطلب ؟

اُمیدوار :۔ آپ کی دعا سے ابھی میں کنوارا ہوں ۔۔۔!

بوڑھا :۔ لیکن محترم بزرگ وار، آپ اس عمر میں ۔۔۔ ؟

اُمیدوار :۔ ہاں ہاں۔ آپ نے اشتہار میں یہ بھی تو لکھا تھا کہ عمر کی کوئی قید نہیں۔

بوڑھا :۔ (کھانس کر) لکھا تھا۔ لیکن . . . . .

اُمیدوار :۔ لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ آپ کو میرا انٹرویو لینا ہوگا۔

بوڑھا :۔ ٹھیک ہے آپ کو فارم بھرنا ہوگا ۔۔۔ اور رجسٹریشن فیس . . . . .

اُمیدوار بوڑھا :۔ میری نظر کمزور ہے ۔ فارم آپ ہی بھر لیجئے۔ رہی رجسٹریشن فیس۔ ؟ اگر آپ سو روپے کہیں تو بھی دینے تیار ہوں ۔۔۔

بوڑھا :۔ (کھانستا ہے) تو محترم بزرگ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بیروزگار نہیں ہیں ۔۔۔ ؟

اُمیدوار :۔ بالکل بیروزگار رہوں ۔ اور گھر داماد بھی بنوں گا ۔

بوڑھا :۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ سلکشن کمیٹی
یہ سب دریافت کریں گے۔ ہاں تو عزت مآب

امیدوار :۔ رنگیلے شاہ ۔ (شرما کر)

بوڑھا :۔ ماشا اللہ، ماشا اللہ ۔ کیا نام ہے۔
عمر میں بھی آپ رنگین طبیعت کے مالک ہیں ۔
یہاں دستخط فرمائیے ۔ (فارم آگے بڑھاتا

اُمیدوار :۔ دستخط تو زندگی میں کبھی نہیں
لگا دوں۔ آں ۔ ہاں ۔۔۔ یہ لیجئے۔ (فار

بوڑھا :۔ اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔ اللہ آ
کرے ۔ (امیدوار چلا جاتا ہے)

(میوزک)

بوڑھا :۔ غفور میاں۔

غفور :۔ جی آیا مالک۔

بوڑھا :۔ ابھی اور کتنے اُمیدوار ہیں میاں

غفور :۔ جی ۔۔۔ یہی کوئی پچاس ساٹھ

بوڑھا :۔ (کھانستا ہے) ماشا اللہ ماشا ا
ان میں سے اور دو کو اندر بھیج دو۔ باقی امیّ
کہ انٹرویو کا وقت ختم ہو چکا۔ باقی اُمیدوا
کل ٹھیک دو بجے سے شروع ہوگا۔ سمجھے

غفور :۔ جی سمجھ گیا۔ جو حکم مالک ۔۔۔ باہ

(ایک پولیس انسپکٹر وردی پہنے داخل ہو

بوڑھا :۔ (گھبرا کر) انسپکٹر صاحب ۔ آ

انسپکٹر :۔ جی ۔۔۔ آپ کا اشتہار دیکھ
ایسے رشتہ کی ہمیں بہت دنوں سے تلاش

بوڑھا :۔ لیکن ۔۔۔ لیکن انسپکٹر صاحب
لئے بیروزگار لڑکے کی ضرورت ہے۔ آپ تو

سر روزگار ہیں۔

انسپکٹر:۔ ہمیں آپ کی لڑکی کی نہیں۔ بلکہ آپ کی ضرورت ہے —!

بڈھا:۔ میں — میں — میری ضرورت ہے — وہ — وہ کیوں —؟ انسپکٹر صاحب۔

انسپکٹر:۔ تاکہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے الزام میں آپ کو گرفتار کرسکیں۔

بڈھا:۔ (بوکھلاہٹ میں) د۔ دھو۔ کہ۔ دھوکہ۔ کیسا دھوکہ۔ (چیختا ہے) غ۔ غفور۔ بچاؤ۔

انسپکٹر:۔ آپ کا ملازم بھی دھوکہ دہی میں ساتھ دینے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ میرے پاس آپ دونوں کی گرفتاری کا وارنٹ موجود ہے۔

بڈھا:۔ ارے میاں۔ برخوردار۔ تم۔ تم سے رجسٹریشن فیس نہیں لوں گا۔ تم۔ یہ فارم ......

انسپکٹر:۔ بکواس بند کرو مسٹر سجاد۔ اب تم قانون کے ہاتھوں نہیں بچ سکتے۔ یہ بوڑھے کا سوانگ ختم کرو۔ تم پر مختلف شہروں میں لوگوں کو مختلف طریقوں سے ٹھگنے کا الزام ہے۔ (انسپکٹر آگے بڑھ کر بوڑھے کی داڑھی کھینچ لیتا ہے)

حوالدار — اجیت سنگھ۔

جیت سنگھ۔ یس۔ سر۔

انسپکٹر:۔ مسٹر سجاد کو ہتھکڑی پہنادو۔ اور لے چلو انہیں۔

جیت سنگھ:۔ یس سر۔ (آگے بڑھ کر سجاد کو ہتھکڑی پہنادیتا ہے) چلیئے مسٹر سجاد۔

سجاد:۔ چلیئے انسپکٹر صاحب۔ آپ نے سچ کہا قانون کے ہاتھوں سے کوئی مجرم نہیں بچ سکتا (تینوں آگے پیچھے اسٹیج سے باہر چلے جاتے ہیں۔ روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اور میوزک آہستہ آہستہ ابھرتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

ڈی فارم

ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد

۱. مقام اشاعت :۔ ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

۲. وقفہ اشاعت :۔ ماہنامہ

۳. پرنٹر کا نام و شہریت :۔ سید مصطفیٰ کمال، ہندوستانی

پتہ :۔ ۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ حیدرآباد ۲۳

۴. پبلیشر کا نام و شہریت :۔ سید مصطفیٰ کمال ہندوستانی

۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ حیدرآباد ۲۳

۵. ایڈیٹر کا نام و شہریت :۔ سید مصطفیٰ کمال، ہندوستانی

پتہ: ۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۳

۶. ان لوگوں کے نام جو اخبار کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ایک فیصدی حصہ رکھتے ہیں۔

تبصرہ کمال

۱۷-۶-۲۶۸ دبیرپورہ حیدرآباد ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا معلومات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

سید مصطفیٰ کمال

۱۵ مارچ ۱۹۸۳ء

سدا بڑھتے قدم

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔

اسٹیڈیم ریکارڈ ٹائم میں تعمیر کئے گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن پر کھیل رنگوں کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کمپیوٹروں، الکٹرانک ایکسچینجوں، مائکروویو اور مصنوعی سیارے کے ساتھ رابطوں کے عظیم سلسلے کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔

تال میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے

اگر ہم وطن تعمیر کے دیگر شعبوں میں بھی اسی لگن سے کام کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آیئے ہم سب مل جل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

davp 83/586

گربچن چندن

★

مسخرہ میلہ

ھندوستان کے نویں بین الاقوامی فلم فیسٹی ول کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے اور اعتراض ہوئے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ اناڑی پن کا میلہ تھا۔ سرما کا ٹھنڈا اور بے نمک سالن تھا۔ لنگڑے کی تلاش منزل تھی۔ مجذوب کی ترنگ تھی۔ افراتفری کا میلہ تھا اور ایک تبصرہ یہ تھا کہ یہ میلہ ہی نہیں تھا۔

ایسے تبصرے اکثر ہر فلمی میلے پر ہوتے ہیں۔ ان سے نقادوں کی تیر اندازی کس قدر کامیاب ہوتی ہے یہ تو دیکھا جائیں لیکن میلہ ضرور بانس پر چڑھ جاتا ہے اور لوگ اس کی بلندی کی حدیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

یہ نقاد شاعر کے وہی خار ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں اس لئے گلوں سے بہتر ہیں۔ لیکن ذرا غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ نقاد اور میلے کا معاملہ وہی ہاتھی اور اندھوں کا معاملہ ہے جس میں ہاتھی کو نہایت سنجیدگی سے جاننے کے لئے ہر اندھے نے ایک کامیاب مسخرے کا کردار ادا کیا تھا۔

دراصل یہ ہاتھی اور اندھوں کی کہانی کا رائٹر بھی کوئی مسخرہ ہی تھا جس نے ہاتھی کی شخصیت کا اندازہ لگانے والوں کو اندھا کہا۔ بھلا ہاتھی کی جسامت کو کون نہیں جانتا۔ خود ہاتھی کا لفظ ہی ہائے اور اتھاہ کی پیداوار نظر آرہا ہے اور جس زمانے میں یہ کہانی بنی اس میں سب لوگ جن میں اندھے بھی شامل تھے، ہائے اور اتھاہ کا مطلب جانتے تھے۔

ہاتھی کے وجود کا اندازہ لگانے والے مسخرے تھے یا نہیں نویں فلم فیسٹی ول کے نقادوں نے مسخرے پن ہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ زندگی کی طرح ہر فیسٹی ول بھی ایک مذاق ہے جو بقدرِ احساس اور ذوق ایک شخص کے لئے گرم تو دوسرے کے لئے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ جس طرح چند روز کی ایک مستعار مدت میں، جسے ایک بھرم میں ہم زندگی کہتے ہیں، ہماری تمام سنجیدگیاں اور تحصیلیں بالآخر ایک مجذوب کی بڑ ثابت ہوتی ہیں اس طرح فیسٹی ول کے بڑے بڑے نقشے اور بھرے ہوئے پروگرام طبعِ ظرافت کی تسکین کا سامان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسے آپ ثقافتی مذاق کہیئے، تہذیبی مذاق کہیئے، سماجی مذاق کہیئے۔

یہ ہے مذاق ہی جو سلسلہ وار اپنے معیار قائم کرتا چلا جا رہا ہے۔

نقادوں نے کہا ہے کہ اس بار اس نے جو معیار قائم کیا ہے وہ پچھلے بیس سال میں سب سے ادنیٰ تھا۔ اس میں آنے والی فلموں کی تعداد پہلے سے کم تھی۔ ان کی کوالٹی کمتر تھی۔ انتظامی دفتر میں اس قدر تبدیلیاں ہوئیں کہ نئے لوگوں کی ناتجربہ کاری فاش ہوگئی۔ وہ اپنی تیاری کی مدت یعنی دو سال کے دوران میں اچھی فلمیں ڈھونڈھ ہی نہیں سکے۔ فلموں کا انتخاب چھوٹی سوچ کے نظریے سے کیا گیا۔ کسٹم والوں نے اپنی پڑتال پر بہت وقت لگایا۔ مقابلہ داری صیغے کے لئے فلمیں وصولی کی آخری تاریخ کے بعد بھی لی گئیں۔ فیسٹی ول سے پہلے ارباب پبلسٹی نے اس کے لئے مناسب ماحول تیار نہیں کیا۔ پروگرام ٹھیک نہیں بنائے گئے۔ اس کے دونوں ہفتوں میں پروگرام تاخیر سے جاری کئے گئے جس سے ناظرین کو اپنی اپنی دیکھنے والی فلموں کا انتخاب کرنے کے لئے بہت کم وقت ملا۔ ٹکٹوں کے دام زیادہ تھے وغیرہ وغیرہ

لیکن ہمارے نقاد اس امر کی داد نہیں دیتے کہ ان سب باتوں کے باوجود فیسٹی ول وقوع پذیر ہوا۔ اس میں پچاس ملکوں کی دو سو سے اوپر فلمیں دکھائی گئیں۔ ستر فلمیں مقابلہ داری صیغے میں داخل کی گئیں جن میں سے ججوں کی جماعت کے لئے دو درجن کا انتخاب کیا گیا۔ تیسری دنیا یعنی نو آزاد اور ترقی پذیر ممالک میں سے ۲۷ نے میلے میں شرکت کی۔ گزشتہ برسوں میں یہ تعداد ایک درجن سے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے قریب ڈیڑھ ہزار فلم سازوں، ڈائرکٹروں، اداکاروں نقادوں اور ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی۔ راجدھانی کے ایک بھولے بسرے گوشے میں ایک نیا فلمی مرکز بلکہ روپ نگر قائم کیا گیا جس سے اس تاریخی علاقے کے مرحوم سری   قلعے اور قریب سات سو سال پہلے یہاں ہندوستان کا دوسرا دارالخلافہ قائم کرنے والے سلطان علاؤالدین خلجی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ حکومت ہند کے وزیر اطلاعات و نشریات نے فیسٹی ول کا افتتاح کیا اور اس موقع پر جب بمبئی کی نئی فلمی ساحرہ دیپتی نول نے وزیر کبیر کو میلے کا چھ فٹ اونچا پیتل کا چراغ روشن کرنے کے لئے مٹی کا روایتی دیا پیش کیا تو ہزاروں ناظرین نے پرشور تالیاں بجا کر اس کا سواگت کیا۔

کیا یہ تالیاں موجودہ اور گزشتہ نقادوں پر پھبتی اور تمسخر نہیں تھیں جو اپنی تنقیدوں سے باز نہیں آتے؟ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ تمام تر مفروضہ کوتاہیوں کے باوجود ارباب اختیار نے مقررہ تاریخوں پر میلے کا انعقاد کیا اور اپنی جرأت رندانہ کے نئے ریکارڈ قائم کئے۔

ان کی جرأت نے خود میلے ہی کو ایک سخت جان مسخرہ بنا دیا جو اپنے کاروبار پر چودہ دن تک خود ہی نہقہے لگاتا رہا۔

غور فرمائیے کہ اس سے زیادہ انوکھا بلکہ اس سے بڑا بین الاقوامی مذاق کیا ہوگا کہ آپ دنیا بھر کے ممالک سے مقابلے کے لئے آنے والی فلموں میں سے پوری دو درجن فلمیں چن کر ججوں کی جماعت کے سامنے رکھتے ہیں اور دنیا کو یہ انتظار کراتے ہیں کہ آپ اس کی بہترین نئی فلم کو اپنا بہترین ایوارڈ گولڈن پی کاک عطا کریں گے لیکن جب میلہ ختم ہو جاتا ہے تو آپ کی جیوری کا صدر مسٹر نندا سے اینڈرسن درجنوں ملکوں کے نمائندوں کی بھری محفل میں کھلم کھلا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس بار گولڈن پی کاک نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ کوئی بھی فلم اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی وہ یہ شگوفہ بھی چھوڑتا ہے کہ مقابلے کے صیغے میں فلمیں داخل

کرنے کی ذمہ داری جیوری پر نہیں ہے!

اس سلسلے میں پہلے کا ایک اور مسخرہ پن ملاحظہ فرمائیے۔

مقابلے کے صیغے میں فلمیں داخل کرنے کی آخری تاریخ ختم ہوجاتی ہے۔ اب نئے داخلوں کے لئے کسی اور فیسٹی دل کے دروازے پر، کہ دنیا میں بہت سے کھلے ہیں، دستک دی جانی چاہیئے لیکن سرکاری طور پر ایک خبر جاری کی جاتی ہے کہ اس صیغے میں تین اور فلمیں داخل کرلی گئی ہیں اور انہیں فلموں میں سے دو کا دیگر ایوارڈوں کے لئے انتخاب ہوجاتا ہے!

آپ شاید اس پر تیوریاں چڑھائیں یا بھویں تانیں لیکن سامنا تو مسخرے سے ہے، وہ آپ کی کیا پرواہ کرے گا!

دراصل یہ سوچنا ہی باعثِ شرم ہے کہ فلم فیسٹی دل کسی ارسطو یا افلاطون کی تصنیف کا باب ہے۔ اس لئے اس پر انتہائی متانت اور سنجیدگی سے رائے قائم کی جانی چاہیئے۔

میلہ تو بہرحال میلہ ہے۔ اقوامِ متحدہ کا کوئی ہنگامی اجلاس نہیں کہ آپ دوسرے فریق پر غالب کے عشق کی طرح آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑیں۔

جب شاعر نے کہا تھا کہ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے یا ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق تو اس نے بڑی دوراندیشی سے بیسویں صدی کے فلم فیسٹی دل کی ترجمانی کی تھی۔

ذرا دیکھئے کہ سال کے کسی اچھے سے مہینے میں، شہر کے کسی اچھے سے مرکز پر اہلِ انتخاب کی کسی رطب و یابس کے ذریعے آپ دنیا کے زیادہ سے زیادہ ممالک سے آنے والی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو فلمیں دیکھنے کی سعادت بلکہ نرخ بختی حاصل کر رہے ہیں تو کیا آپ اس نادر موقع کو اُلٹے سیدھے اعتراضات اور ٹیڑھے ترچھے نظریات سے پریشان کرنا پسند کریں گے؟ اگر ہاں تو حسنِ مذاق اور ذوقِ سلیم سے انحراف ہوگا۔

اللہ میاں نے جو سب سے بڑا خالق مزاح ہے، ہر چیز میں مذاق بھرا ہوا ہے، صرف دیکھنے والے کے پاس لطف اٹھانے کی صلاحیت ہونی چاہیئے!

کیا یہ معمولی بات ہے کہ ۱۹۸۳ کے پہلے ہی مہینے کے پہلے ہی دو ہفتے ہماری راجدھانی دنیا بھر کے ممالک کے فلمی شاہکاروں کی نمائش اور فلمی اکابر کی چہل قدمی سے جھومتی رہی؟ بلکہ پوری دنیا کی فلمی راجدھانی بنی رہی؟ لوگوں نے یہاں سینکڑوں فلمی فن کاروں کے دیدار حاصل کئے۔ ان کے آٹو گراف لئے۔ ان سے بالمشافہ بات چیت کی۔ ان کے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لیا۔ ان کے ساتھ ہوٹلوں میں کھانے کھائے۔ جام ٹکرائے اور تبادلہِ خیالات کیا۔ اس تبادلے کے دامن میں خواہ کتنی ہی طنز و تنقید رہی ہو کم از کم یہ گرمیِ جذبات کا محرک تو تھا اور گرمیِ جذبات سے بہتر زندگی کی کوئی اور آرزو یا جستجو کیا ہو سکتی ہے۔

کیا یہ کم ہے کہ ہندوستان نے ایک بار پھر اپنی یہ اہلیت دکھادی کہ وہ برابر دنیا کے ان معدودے چند ملکوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے جنہیں اس تقریب کے لئے فلم سازوں کے عالمی اور مستند ادارے کی منظوری حاصل ہے۔ یہ ادارہ جس کا نام انٹرنیشنل فیڈریشن آف فلم پروڈیوسرس ایسوسی ایشن ہے پچھلے پچاس سال سے فرانس کے شہر پیرس میں اپنی کسوٹی جمائے

بیٹھا ہے۔ ... اب تک صرف آٹھ ملکوں کو اس کی منظوری ملی ہے اور وہ ہیں، اٹلی (وینس فیسٹی ول) روس (ماسکو) چیکوسلواکیہ، (کارلووی واری) فرانس (کانز) مغربی جرمنی (برلن) ایران (تہران) اسپین (سان سبیستان) اور ہندوستان۔ مزید آفریقہ اور ایشیا کے ممالک میں ہندوستان واحد ملک ہے جس کے فلم فیسٹی ول کو بین الاقوامی منظوری حاصل ہے۔ مزید براں تیسری دنیا یعنی نو آزاد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے ہندوستان کا میلہ اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہے۔ پہلے تہران کو بھی ایسے مرکز کی حیثیت بلکہ فلموں کی نمائندگی کے اعتبار سے بہتر ترتیب حاصل تھی لیکن بھلا ہو خمینی صاحب کے نظام کا کہ اس کے ارباب اختیار نے تہران کا فیسٹی ول بند کر دیا اور اس باب میں ہندوستان کو یکتائی عطا کر دی۔

اس یکتائی نے ہندوستان کی عظمت کے کئی اور پہلو بھی اجاگر کئے ہیں۔ مثلاً فلم سازی کے میدان میں یہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ یہاں ہر سال ساڑھے سات سو سے اوپر یعنی ہر روز دو فلمیں تیار ہو جاتی ہیں۔ یہ تقریباً نصف صدی سے بین الاقوامی فلمی میلوں میں شرکت کر رہا ہے اور اس نے چوٹی کے میلوں کے مقابلوں میں انعام و اکرام پائے ہیں۔ پچھلے تیس سال سے خود بھی فلمی میلوں کا اہتمام کر رہا ہے اور اب تک چودہ فیسٹی ول کر چکا ہے۔ ان میں سے نو بین الاقوامی اور پانچ قومی میلے یا فلموتسو تھے۔ اس کا موجودہ ہمارے فلمی میلے کا مستقل نشان ہے جنگل میں نہیں ناچا بلکہ کرہ ارض میں اپنی ادائیں اور عشوے بکھیر رہا ہے۔ اس کی ثقافتی قدروں کی پوری دنیا میں دھوم ہے۔ ڈاکومنٹری فلموں کے میدان میں اس کا جھنڈا کسی ترقی یافتہ ملک کے جھنڈے سے نیچا نہیں۔ اس کے فلم ساز اور ڈائرکٹر کئی ممالک کے ممتاز میلوں کے ججوں کی جماعت کے رکن بنائے گئے ہیں اور پچھلے سال منیلا کے فلم فیسٹی ول کی جیوری کے صدر ہندوستان کے ستیہ جیت رے تھے۔

ان حقائق پر ہمارے منتظمین کو بہت ناز ہے اور ناز خود اعتمادی کا ایک اظہار ہے۔ یہ خود اعتمادی بعض اوقات مے خواری کی طرح کچھ زیادہ ہی سر پر سوار ہو جاتی ہے اور وافر خود اعتمادی کو جنم دیتی ہے۔

چنانچہ اس وافر خود اعتمادی میں ارباب اختیار جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ کبھی وہ مغرب کے معیاروں کی بانہوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور میلے میں عریاں یا نیم عریاں فلمیں شامل کرتے ہیں۔ کبھی تیسری دنیا سے بغل گیر ہوتے ہیں تو ان کے موضوعات یعنی سماجی، اقتصادی اور سیاسی پسماندگی پیش کرتے ہیں۔ اس ادھر ادھر کے چکر میں ایسی منزل پر پہونچ جاتے ہیں جہاں نہ ہی ہے نہ وصال صنم۔

کچھ دوسرے عناصر بھی ان کے ذہنی توازن کو پریشان کرتے ہیں۔ مثلاً شرکت کرنے والے ممالک کے ناز اٹھانے پڑتے ہیں۔ کوئی یہ سوچتا ہے کہ ہندوستان کی شان بڑھانے سے ہمیں کیا غرض۔ کوئی یہ سوچتا ہے کہ ہمیں جیوری یا انعام و اکرام میں جگہ نہ ملی تو ہمارے وقار کی سبکی ہوگی اور کوئی یہ کہتا ہے کہ جنوری میں ہونے والا میلہ ہمارے کرسمس اور جشن نوروز سے ٹکرا رہا ہے۔ ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال رہا ہے۔ ہم اپنے [illegible] کو چھوڑ کر وہاں کیوں جائیں۔ اس آخری اعتراض نے تو ہمارے میلے کو اُ بے رونق کیا ہے۔

چنانچہ یہ میلہ جس میں فلمی شخصیتوں یعنی حسین و جمیل ایکٹرسوں کے دیدار و نرخ بازی کا نادر موقع ملتا ہے اکثر بے رنگ ا

بے نمک ہو جاتا ہے۔ ہاں تھوڑی سی رونق اپنے ملک کی ایکٹرسوں کی آمد سے ہو جاتی ہے لیکن فرنگی حسن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ چاہے سن خوردہ بھی ہو، اپنے دل پھینک عشاق میں بے پناہ گرمی پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارے پچھلے فیسٹیول یعنی ۱۹۷۷ء میں جب ہالی ووڈ کی ایک سبکدوش اور بوڑھی ایکٹرس جینا لولو بریگیڈا ہمارا میلہ دیکھنے آگئی تو ہندوستان کے مجنوں آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کی خزاں میں بھی بہار کا نظارہ کرتے رہے اور اس پر دیوانہ وار اپنی تحسین و ستائش کے ڈونگرے برساتے رہے۔

انسانی نظر اور ایمان داری سے دیکھا جائے تو حسن و جمال سے متاثر ہونا عین فطری امر ہے اور اگر ہمارے عشاق میلے کھا گھمی میں غیر ملکی فلموں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی حسن کے بھی شاہ کار دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں تو یہ ان کے حسن مذاق اور ذوق سلیم کا پختہ ثبوت ہے۔

ثقافت، آرٹ، فلسفے اور دانش کی طرح حسن بھی ایک ایسی دولت ہے جس کی دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کو اکثر چھپایا جاتا ہے لیکن حقیقت تو حقیقت ہے۔ پردہ اٹھا کر بلکہ پردہ پھاڑ کر بھی سامنے آجاتی ہے۔ مغربی جرمنی کے چانسلر مسٹر ہلمٹ کوہل نے حال ہی میں کہا کہ ان کے ملک کی حسین و جمیل عورتیں ان کی قومی دولت کا جز ہیں اور وہ اپنے قومی خزانوں کے بڑے مداح ہیں۔ عالمی وحدت کو فروغ دینے والے آج کے دور میں ہر قومی خوبی پوری دنیا کی میراث ہے لہٰذا حسن و جمال کی دولت خواہ کہیں بھی ہو اس پر دوسرے ممالک کا قدرتی اور طبعی حق ہے اور ہمارے فلمی میلے کا تو مسلک ہی یہ ہے کہ ساری دنیا ایک ہی خاندان ہے۔ اس مسلک پر عمل کرتے ہوئے اگر ہمارے شائقین اپنے عالمی خاندان کے حسن و جمال سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں تو دنیا کو اس سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔

غالباً اسی اصول اور خیال کے ساتھ ہندوستان نے جنوری کے بارے میں غیر ملکی اعتراضات کو تسلیم کر لیا ہے اور اصلاح کی راہ اختیار کی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہمارے بین الاقوامی میلے اگست میں ہوا کریں گے۔ اب اگر ہمارے اگلے بین الاقوامی فلمی میلے یعنی اگست ۱۹۸۴ء میں غیر ممالک نے اپنے حسن و جمال کے شاہ کاروں کے ساتھ شرکت نہ کی تو یہ ان کی بڑی بے مروتی اور بداخلاقی ہوگی۔

یہاں یہ دیکھنا مشکل نہ ہوگا کہ ایک میلے کی کامیابی میں موسم کا بھی بہت دخل ہے۔ چنانچہ کانز (فرانس) کا یہ میلہ جو ۱۹۴۶ء میں شروع ہوا، اپنے سال آغاز سے ۱۹۵۰ء تک موسم خزاں میں ہوتا رہا لیکن ۱۹۵۱ء سے موسم بہار میں ہو رہا ہے۔ برلن (مغربی جرمنی) کا میلہ پہلے گرما کے وسط یعنی جون میں ہوتا تھا لیکن آج کل یہ فروری مارچ میں ہوتا ہے۔

مقصد تو میلہ کو کامیاب بنانا ہے۔ اس کے انعقاد کے لئے کسی خاص مہینے پر اصرار کرنے میں تک ہی کیا ہے؟

کچھ لوگ جن میں فلم نہ دیکھنے والوں کی اکثریت ہے، اعتراض کرتے ہیں کہ فلمی میلوں کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اس کے جواب کے لئے ویسے تو ایک مصرعہ ہی کافی ہے کہ

چائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

لیکن ان زاہدان خشک اپنی ہی قسم کے سخنوروں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ فلمی میلے ہی ہیں جن میں مختلف ملکوں کی تاریخ

طرزِ حیات، تمدن، فنونِ لطیفہ اور ان کے فنی اوصاف کے تھرکتے مچلتے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہیں یار لوگ وہ غیر سنسر شدہ فلمیں دیکھ سکتے ہیں جو انہیں اپنے روزمرہ میں کبھی نصیب نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان کے تھیٹروں میں صرف شائقین ہی کی بھیڑ نہیں ہوتی بڑے بڑے معزز اور معتبر لوگ اونچے داموں پر ان کے ٹکٹ خریدتے ہیں اور اپنی فتوحات کا بڑے چسکے سے چرچا کرتے ہیں

انھیں میلوں کی بدولت ہمارے کئی فلم سازوں کو غیر ملکی فلموں کے افسانے اور مناظر اڑانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ موقعہ بقدرِ جثہ ہوتا ہے چنانچہ ان کے مالِ غنیمت سے غیر ملکی فلموں کی ٹیکنیک باہر ہی رہ جاتی ہے۔ باہر والے ان کی فلموں کے کسی افسانے سے خواہ ایک الف بھی اٹھانے کی خواہش نہ کریں۔ یہ ان کا پورا پلاٹ سمیٹ لینے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ آخر مہمان نوازی ہمارا قدیم شیوہ ہے اگر ہم باہر سے آنے والی فلموں کی کہانیوں کو نظر کے راستے سینے میں نہ اتارلیں اور پھر اسے اپنے پردہ سیمیں پر نہ پہنچا دیں تو ہماری عظمت کا کمال ہی کیا!

فلمی میلے میں صحافیوں کو جن میں بارلیش اور الحاج صاحبان بھی ہوتے ہیں، ملکی اور غیر ملکی فلمی ستاروں کے ساتھ، جنہیں منہ کی خاطر مسلسل با مروت ہونا پڑتا ہے۔ فوٹو کھچوانے کا عمدہ موقعہ ملتا ہے۔ چنانچہ اس بار جب پاکستان کی خوش رنگ اور شیریں ادا زیبا اپنے خوب رو خاوند ایکٹر محمد علی اور ان کی فلم "سنگدل" کے خوش گفتار ہیرو ندیم کے ساتھ میلے کے روپ نگر میں آئی تو ہر بوالہوس ان کے یا سچ پوچھو تو اس کے ہم دوش تصویر کھچوانے کے لئے بے قرار ہوگیا۔

کرنی خدا کی عین اس وقت ادارہ شمع نے ان مہمانانِ عزیز کے لئے ایک بے تکلف استقبالئے کا اہتمام کردیا۔ بس لطف وکرم کا گیٹ کھل گیا۔ اور یار لوگوں نے کھاؤ اور فوٹو کھچواؤ کا بے باک شعار اختیار کیا۔

فلمی ستاروں کے لئے جن کی جلوہ سامانی کی ہستی حباب کی سی ہے، فوٹو گرافی کشتی کی سیر والے نقشِ آب کی طرح ہوتی لیکن ہمارے مدیرانِ بے نظیر ہر نقشِ آب سے آب زر بنا لیتے ہیں اور اس کی مدد سے اپنے اور صرف اپنے جریدے میں تصویر کے عنوانات کو اپنی آزادیٔ صحافت سے آسمانِ روابط تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ میلے کی طغیانی کے ہر بلبلے سے ایک بلبل پکڑنے کے بھرم میں رہتے ہیں اور انہیں جو تصویریں مل جائیں ان پہ بڑا بھروسہ کرتے ہیں۔ اس بھروسے کی بنیاد پر انہوں نے اپنے کو تاثر دیا کہ زیبا جو فقط دو روز کے لئے سرکاری انتظامات کے تحت میلہ دیکھنے آئی تھی ان کی شخصیت اور میگزین کی عظمت پر فدا ہوگئی اور بہ رضا و رغبت ان کے ساتھ تصویریں کھنچواتی رہی۔

صحافیوں کی اس ضرورت یا کمزوری کے پیشِ نظر ہمارے فوٹو گرافروں کی بھی بڑی چاندی ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں ہتھیلی پہ سرسوں جماتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ اس کا انعام پا سکتے ہیں۔ صحافیوں کے سیدھے یا ترچھے اشارے پر یہ میلے کی ہر بزم میں آگے بڑھ کر مینا تھام لیتے ہیں اور اپنے کیمروں کی پیٹیوں میں وہ سامان بھر لیتے ہیں جو اپنی اشاعت یا عدم اشاعت سے قطع نظر جریدوں اور مدیروں کی موت کے بعد ان کے گھر سے نکلتا ہے۔

فلمی میلوں کا ایک فائدہ اور بھی ہے۔ یہاں ہمارے فلمی ستاروں اور گل رخوں کو، جو اپنے نگار خانوں کے شہر شہر شہرت کی وجہ سے شرف باریابی دینے سے معذور ہوتے ہیں، اپنے پروانوں اور بھونروں کی فضاؤں میں اترنے

مچھلیوں کی طرح تیرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس موقع سے ان کے چاہنے والوں کی تعداد میں خوب اضافہ ہوتا ہے۔ یہ موقع ملکی مداحوں سے بڑھ کر غیر ملکی مداحوں تک پھیل جاتا ہے اور شاعر کے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ میری جان چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

ایسے میلوں میں ہمارے فلمی چاند تارے اور بالخصوص نو واردانِ شوق کس سادگی اور پرکاری سے مٹرگشتی کرتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ راقم نے اس میلے میں دیکھا کہ پردہ سیمیں کی نئی ساحرہ دیپتی نول اپنے پریشان اور گھنے بالوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر اُٹھائے نوخیز ہرنی کی طرح گھومتی ہوئی اپنے مداحوں کی نگاہوں کی حرارت سے مسرور و مغرور ہو رہی تھی۔ اسے یہ حق بھی تھا۔ اس کے دیپ سے میلے کا دیپ جلا تھا۔

میلہ شروع کرنے کے لئے جو چراغ جلایا گیا اسے بجھانے کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی۔ یہ تکلف ۱۹۸۲ کے نویں ایشیائی کھیلوں ہی تک محدود تھا۔ ورنہ ہر چراغ غالب کی شمع کی طرح رو کر یا ہنس کر اپنے آپ ہی بجھ جاتا ہے۔

معلوم نہیں مغرب کے لوگ اپنی سالگرہ کے جشن پر پہلے اپنے ہی ہاتھوں موم بتیاں جلا کر پھر اپنی ہی پھونکوں سے انہیں بجھا کر وہ سانسیں کیوں ضائع کرتے ہیں جو زندگی کے ایک ایک لمحے کے لئے ضروری ہیں۔

یہ بھی فلسفۂ مزاح کا ایک پہلو ہے۔ ایک تہذیب اس چیز کی بھی اجازت دیتی ہے کہ بچپن ہی سے اپنی زندگی کے برسوں کے گھٹنے کا جشن کرو اور تالیاں بجاؤ

فلمی میلوں پر اعتراض کرنے والوں کی حجت بازی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔

ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ فلمی میلے تضیعِ اوقات اور ذہنی عیاشی ہیں اور دوسری طرف ان کے بھائی یہ چاہتے ہیں کہ آنے والا فلمی میلہ ان کے شہر میں لگے۔ چنانچہ حیدرآباد سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ اگلا نیم فیسٹی ول اس کے عروس البلاد میں ہو۔

اب تک یہ فیسٹی ول دہلی کے علاوہ مدراس۔ بنگلور۔ کلکتہ اور بمبئی میں ہو چکے ہیں۔ لیکن حیدرآباد میں کوئی فیسٹی ول نہیں ہوا۔ حالانکہ پچھلے سال آندھرا پردیش ملک میں سب سے زیادہ فیچر فلمیں بنانے والی ریاست تھی۔ آخر دو ہفتے کے اس روپ نگر پر کسی کی اجارہ داری کیوں ہو اور یہ ہرجائی کیوں نہ ہو!

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں یہ واجب بھی ہے۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہاں فیسٹی ول کو ڈبل رول دیا گیا۔ ایک مقابلہ داری کا اور دوسرا غیر مقابلہ داری کا۔ مقابلہ داری میں دنیا بھر کے ممالک شریک ہوتے ہیں، اس لئے اسے انٹرنیشنل فیسٹی ول کا نام دیا گیا اور اس کا مقام مرکزی راجدھانی دہلی میں رکھا گیا۔ غیر مقابلہ داری کی نوعیت ملکی ہے۔ چنانچہ اس کا نام فلموتسو رکھا گیا اور اس کا مقام باری باری ملک کے مختلف فلمی مرکزوں میں رکھا گیا۔

اب آئندہ فیسٹی ول اگر حیدرآباد میں ہو تو اسے ایک ایسے وزیر اعلیٰ کی سرپرستی بھی نصیب ہوگی جو فلمی دنیا کے عظیم کردار رہے ہیں۔ ان کی بدولت فیسٹی ول کو وہ خطابت بھی حاصل ہو سکے گی جس سے موقع اور موضوع کی وحدت کا تاثر پیدا ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جو ہمارے ہاں ذرا کم ہی ملتی ہے۔

عام طور پر یہ فریضہ صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ یا مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ادا کرتے ہیں۔ ۱۹۸۰ میں جب ہندوستانی اسکرین کی خاتونِ اول دیویکا رانی نے بنگلور میں فلموتسو کا افتتاح کیا تھا تو اس میلے کی کچھ اور ہی دلربائی تھی۔

ویسے فلمی میلے کا ہنگامہ تحریک پرور بھی ہے۔ یہ بڑے بڑے معزز اصحاب کو اپنا رنگِ کلام بدلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ یہاں آتے ہی چہکنے لگتے ہیں۔ اردگرد اور سامنے اہلِ حسن و جمال ہوں تو کون مائی کا لال، خواہ اس کا سن و سال کچھ بھی ہو، چہکنے سے پرہیز کریگا۔

چنانچہ جب نواں میلہ اپنی سحری چال چلنے کے بعد اختتام پر پہونچا تو آخری دن کی تقریب میں نائب صدر جمہوریہ جناب محمد ہدایت اللہ نے اپنی لطافت و ظرافت سے اس کی کوتاہیوں اور محرومیوں کا تاثر دور کرنے کی بڑی رندانہ کوشش کی ـــــ وہ ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کے لئے ذمہ دار تو نہیں تھے لیکن انہوں نے منچ پر آتے ہی یہ کہہ دیا کہ یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ وہ اس فیسٹی ول کے زمانے میں دلی سے باہر تھے ـــــ! صاحب موصوف نے کہا کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ ایک فلم کی کامیابی کے لئے کیا چیز ضروری ہے لیکن آج اکثر حالتوں میں جنسیات اور مار دھاڑ کے مناظر سب سے زیادہ توجہ کھینچتے ہیں۔ یہاں ہندوستان کے نقادوں کی خوشامد کے لئے اپنے میلے کی مثال دی جاسکتی تھی لیکن موصوف خوشامد پسند نہیں۔ وہ اس کی شہادت جاپان سے لائے اور اخبارات کی ایک خبر کے حوالے سے کہا کہ ایک جاپانی فلم کا اس لئے بائیکاٹ کردیا گیا کہ وہ ٹھنڈی تھی یعنی اس سے ناظرین کے اندر کوئی گرمی نہیں پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں یار لوگ ابھی اتنے بے باک نہیں ہوئے یہ ابھی تک وہی مریضِ عشق ہیں۔ جن کی دوا پردے ہیں۔ خود موصوف نے بھی اعتراف کیا کہ جنسی معاملات میں ہمارا سماج ضرورت سے کچھ زیادہ حساس ہے ـــــ جنسیات کا ذکر چھڑے تو بات کیوں نہ پہونچے "تیری جوانی تک" لیکن موصوف نے اس منزل پر زیادہ نہ رکتے ہوئے کہا کہ ہمارے آج کے ایکٹر اور ایکٹریس وقت گزارنے کے ساتھ اپنے خد و خال کا خیال تو رکھتے ہیں لیکن اپنی اداکاری کی پرواہ نہیں کرتے ـــــ اب ہدایت کاروں کو دیکھئے۔ ان کے واقعات کی پیش کش بڑی مزاحیہ ہوتی ہے۔ عدالت کے سین میں گواہ شہادت نہیں دیتے بلکہ بحث کرنے لگتے ہیں۔ جج ایسے فیصلے صادر کرتے ہیں جن پر گھوڑے بھی ہنہنانے لگیں اور وکیل لال بجھکڑوں کی مانند بے محل اور بے تعلق نکات کی نمائش کرتے ہیں۔ اور پھر حادثوں کے مناظر ہوتے ہیں جن کی زد میں اکیلا ہیرو آتا ہے یا ہیروئن۔ دونوں کبھی نہیں ـــــ اب سوال یہ ہے کہ اچھی فلم کی کیفیت کیا ہو۔ اس کے جواب میں ایک پرلطف واقعہ سنئے:۔

مشہور ڈرامہ نگار اور نقاد برنارڈ شا ایک بار ابسن کے ڈرامے دی وائلڈ ڈک کا اولین شو دیکھ کر تھیٹر سے باہر نکلے۔ ان کے آگے آگے ایک اور شخص نکلا جو ایک شرابی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ برنارڈ شا نے اسے سہارا دینے کے لئے اپنا بازو پیش کیا۔ اس شخص نے کوئی توجہ نہ دی۔ برنارڈ شا نے کہا "آپ کہیں تو میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں" اور اس کے ساتھ ہولئے۔ لیکن چند لمحوں کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ وہ شراب کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ اس ڈرامے کی مستی سے جھوم رہا تھا۔ برنارڈ شا بے حد محظوظ ہوا۔

ہمارا فیسٹی ول بھی اگر یہی کیفیت پیدا کرے تو اسے دیکھنے والے بھویں نہیں تانیں گے بلکہ ابسن کے ناظر کی طرح کیف و مستی کے شاہکار ہوں گے۔ ایسا سماں پیدا کرنے کے لئے البتہ یہ ضروری ہوگا کہ فلموں کے خاصانِ انتخاب میں بندگانِ فائل کے ساتھ بندگانِ فن بھی شامل ہوں۔

★ مضامین صاف خوش خط صفحہ کے ایک ہی جانب لکھکر ارسال فرمائیں ★ (ادارہ)

پرویز یداللہ مہدی

دوسری قسط

حیدرآباد - بھوپال - حیدرآباد

(سفرنامہ - کم - رپورتاژ)

اگلی صبح مسیح صاحب کی دستک کے دھوکے
، ایک عدد اخبار فروش ، دو عدد میوہ فروش ، تین
۔ کارکنان گشتی یتیم خانہ اور چار عدد چمٹا و ڈفلی
ں کو نہ صرف یہ کہ بھگتنا پڑا بلکہ اپنی "معاشی سطح"
ان سے کسی قدر بلند برتر ثابت کرنے کے لیے اپنی
ب کی سطح کو بتدریج گراتے ہوئے اسے سطح سمندر
۔ لانا پڑا۔ اور جب ٹھیک ساڑھے نو بجے گیارہویں
ردار دستک سنائی دی تب احتیاطاً اپنی جیب کا
ہ لیا تو پتہ چلا کہ اس کی معاشی سطح تو سطح سمت ر
، بھی کئی میٹر نیچے گر چکی ہے۔ اب شرم سے منہ
بانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ دستک
جواب میں گھر کے اندر ہی سے ہانک لگائی۔
"معاف کرنا سائل صاحب گھر میں کچھ نہیں ہے"
اب میں سائل صاحب کی کڑک دار آواز سنائی دی
"اگر سخی داتا کی مالی حالت اس قدر تباہ ہو چکی
ہے تو اندر بیٹھے کیا کر رہے ہیں، کشکول لے کر باہر
آئیے ۔۔۔ !!"

سائل کی آواز کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی لپک
کر جو باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ہی سائل
کے بھیس میں تھا مسیحا کھڑا ہوا ۔۔۔۔ یعنی مسیح انجم
صاحب اپنی گمبھیر داڑھی اور دلگیر مسکراہٹ کے ساتھ
کھڑے تھے۔ انھیں فوراً دیوان خانے میں لاکر بٹھایا
اور پھر ملتجی نظروں سے ان کے باریش چہرے کی
طرف دیکھنے لگا کہ کل کی ملاقات میں مجتبیٰ حسین نے
سارے فسانے میں ذکر کئے بغیر جس بات کا بتنگڑ
بنا دیا تھا اور جس کی وجہ سے میری پچھلی رات تقریباً
جاگتے ہوئے گذری تھی اس کا انکشاف کر کے مسیح
صاحب میرے سینے میں دہکتے تجسس کے الاؤ کو
اپنے شبنمی تکلم سے ٹھنڈا کر دیں گے۔ لیکن دیوان خانے
میں قدم رنجہ فرماتے ہی حضرت تو ایک دم چپ سادھ

گئے۔ نہ اشارہ، نہ کنایہ، نہ تبسم نہ کلام — چنانچہ
ان کی اس اچانک سرد مہری کو بھگانے کے لئے ان
کی خدمت میں گرما گرم چائے کا پیالہ پیش کیا پھر
سگریٹ نذر گذرانا۔ چائے کے آٹھ دس جرعے اور
سگریٹ کے دو چار کش لگانے کے بعد میں موصوف
نے خفیہ پولیس والوں کی طرح احتیاط سے دیوان خانے
میں چاروں طرف دیکھا کہ کوئی دیکھتا یا سنتا نہ ہو، جب
ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تو بڑے ہی محتاط لہجے میں
بولے —' پرویز صاحب سامان باندھ لیجیے آپ کو
میرے ہمراہ بھوپال چلنا ہے —!' اگرچہ کہ یہ بات
انہوں نے نہایت دھیمے سروں میں کہی تھی لیکن مجھے
یوں لگا جیسے اچانک دیوان خانے میں بھونچال آگیا
ہو، میں نے سٹپٹا کر پوچھا — "یہ اچانک آپ کو
بھوپال جانے کی کیا سوجھی؟ وہ بھی مجھے ساتھ لے کر"
وہ فوراً اپنی صفائی میں بولے " خدانخواستہ مجھے بھوپال
جانے کی کیوں سوجھی —! یہ سازش تو مجتبیٰ حسین
نے مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی کے ارباب مجاز کے ساتھ
مل کر ہمارے خلاف کی ہے —!' میں نے فوراً مخدوش
لہجے میں ٹکڑا لگایا۔" پچھلے دنوں لبنان میں فلسطینی
مجاہدین کے بے گناہ خون سے ہولی کھیلنے والی صیہونی
قاتلوں کی ٹولی کیا آج کل بھوپال پہنچ گئی ہے جو مجتبیٰ
نے کسی بین الاقوامی خفیہ تنظیم کے اشارے پر ہم دونوں
کو رضاکاروں کی حیثیت سے بھوپال بھیجنے کی سازش
کی ہے — " مسیح صاحب گڑبڑا کر بولے۔" جی
نہیں دراصل بھوپال میں یادِ ملا رموزی کے تحت
۱۱ اکتوبر کو محفل طنز و مزاح منعقد کی جا رہی ہے جس
میں شرکت کی غرض سے سکریٹری اکیڈیمی ہذا جناب
فضل تابش صاحب پچھلے ایک ہفتے سے روزآنہ
بلا ناغہ ٹرنک کال کرکے مجتبیٰ حسین کو مدعو کر رہے
ہیں اور مجتبیٰ چونکہ حیدرآباد میں اپنی بچی کی شادی
کے سلسلے میں لوگوں کو مدعو کرنے میں معروف
ہیں اس لئے خود تو شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ
ان سے یہ وعدہ کرلیا کہ اکیڈیمی کی طرف سے ہونے
والی اس محفلِ طنز و مزاح کو کامیاب کروانے میں ہر
ممکنہ مدد کریں گے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اکثر
ادیب و شاعر اکیڈیمیوں سے انعامات و اعزازات بٹورنے
کے باوجود اکیڈیمیوں کے خلاف خواہ مخواہ مظاہرے
کرکے ان کے دُکھ درد بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ
سے جانے نہیں دیتے، جب کہ مجتبیٰ حسین، اکیڈیمیوں
کے دکھ درد بٹانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں
لہٰذا مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی کا دکھ بٹانے کی
خاطر انہوں نے فوراً میرا نام پیش کردیا جسے سکریٹری
اکیڈیمی ہذا نے خوشی خوشی قبول بھی کرلیا —!'
میں نے فوراً مبارکباد دینے کی غرض سے اپنا ہاتھ
مسیح صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" یہ تو
بڑی خوشی کی بات ہے آپ کو فوراً رختِ سفر باندھ
کر نکل جانا چاہیے۔ موصوف نے جواباً میرا ہاتھ پیچھے
کی طرف دھکیلتے ہوئے فرمایا۔ شاید آپ نہیں جانتے
میں تنہا سفر کرنے سے بے حد گھبراتا ہوں۔"
میں نے فوراً لقمہ دیا — " حالانکہ ایک دن ہر
ذی روح کو اکیلے ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔"
وہ جھنجھلا کر بولے — " میرا اشارہ اس سفر کی

طرف نہیں ہے جس میں واپسی کا کوئی چانس نہیں ہوتا۔ میں دراصل اس سفر سے ڈرتا ہوں جس میں پہلے سے یہ طے ہوتا ہے کہ مسافر کو ایک روز پھر واپس گھر لوٹنا ہے ۔۔۔"

میں نے ٹکڑا لگایا ۔۔ "گویا آپ ایک بار نکل جانے کے بعد دوبارہ گھر لوٹنے سے ڈرتے ہیں۔"

بولے ۔۔ "میں گھر لوٹنے سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ اُس استقبالیہ فقرے سے ڈرتا ہوں جو گھر لوٹتے ہی اس کے متعلقین دہراتے ہیں، یعنی لوٹ کے بدھو گھر کو آئے ۔۔۔!"

میں نے ہنس کر کہا ۔ "یہ فقرہ تو ہر شوہر کا مقدر ہے، اس سلسلے میں نہ آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں نہ میں آپ کی ۔۔"

جھنجھلا کر بولے۔ "یہ بات میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں، پچھلے پچیس سال سے عہدۂ شوہری، پر فائز ہوں اور میرا 'سروس ریکارڈ' تم سے زیادہ طویل ہے ۔۔۔ خیر بات بھوپال کی ہو رہی تھی۔ میں نے مجتبیٰ حسین کو مختلف بہانوں سے ٹالنے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ کسی صورت ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ چنانچہ میں نے آخری پتہ پھینکا کہ، ایک ہی شرط پر میں بھوپال جاؤں گا اگر پرویز صاحب میرے ساتھ چلیں گے۔ مجتبیٰ حسین نے یہ شرط بھی مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی کے سکریٹری سے فوراً منظور کروالی جس کی پاداش میں اب ہم دونوں کو بہر حال بھوپال جانا ہے کہ یہ مجتبیٰ حسین کی "ساکھ"، زندہ دلانِ حیدرآباد کی دھاک اور اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی "ناک" کا سوال ہے ۔۔۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ۔۔ "گویا بلّی کے گلے میں گھنٹی بندھ چکی ۔۔!" جواب میں موصوف نے اثبات میں سر ہلایا

میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ "غالباً اس سے قبل بھی ایک بار یہ بھوپالی گھنٹی آپ کے گلے میں بندھ چکی ہے؟" حضرت نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنے مخصوص مسکین لہجے میں تفصیلات بہم پہنچانے لگے۔"

"۱۹۷۰ء میں پہلی بار بھوپال جانے کا 'اتفاقی حادثہ' ہوا تھا لیکن یہ جانا ایسا جانا تھا کہ جانا اور نہ جانا برابر تھا۔ بھوپال کے کسی ہفت روزہ اخبار کی طرف سے اسی جشنِ ناتمام کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں میرے علاوہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے چند شعراء نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ منتظمین حضرات کی مالی حالت اس قدر خستہ تھی کہ ہمیں نہ صرف کسی یتیم خانے سے ملتے جلتے خانے میں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ کھانا بھی وہ پیش کیا گیا جو عموماً لنگروں میں مفت تقسیم ہوتا ہے، جب قیام و طعام اس معیار کا ہو تو آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پروگرام کا معیار کیا ہوگا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس معیاری پروگرام نے میرے غیر معیاری حافظے کے ساتھ ایسا بالجبر سلوک کیا کہ جب بھی کوئی مجھ سے بھوپال کے سفر کے بارے میں پوچھتا ہے تو ذہن کی 'گرانڈ ٹرنک ایکسپریس' 'وندھیاچل اور ست پوڑہ' کے پہاڑی سلسلے تک تو برابر دوڑتی ہے لیکن جیسے ہی یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے میرے حافظے کی وادی میں

مکمل "بلیک آوٹ" ہو جاتا ہے۔"

موصوف کی زبانی سیوپال کی یہ "بھر نچالی روداد" بلکہ "داد فریاد" سن کے میں نے تعجب کا اظہار کیا "حیرت ہے! سلوک کی ان کٹھن منزلوں سے گزرنے کے باوجود آپ ایک بار پھر "بلیک آؤٹ" کی آزمائش سے گزرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔"

وہ بولے — "اس بار محض مجتبیٰ حسین کی خوشی کی خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے میں نے، اور پھر خود مجتبیٰ نے پورا یقین دلایا ہے کہ "پچھلا حادثہ" قطعی نہیں دہرایا جائے گا۔ ویسے بھی پچھلا پروگرام اُردو کے ایک اخبار کے ادارے نے کیا تھا اور اُردو اخباروں کی حالت تم سے کچھ چھپی ڈھکی نہیں۔ جب بے چارہ اخبار خود "معاشی بحران" کا شکار ہو تو پھر اس کی جانب سے منعقد کئے جانے والے پروگرام میں معاشی خوشحالی کا دور دورہ بھلا کس طرح ہوتا، جب کہ یہ تازہ ترین محفل طنز و مزاح، مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی کی جانب سے منعقد ہو رہی ہے۔ اور اُردو اکیڈیمیوں کے تعلق سے مجتبیٰ حسین کا کہنا ہے کہ اندرونی طور پر اکیڈیمیاں چاہے کتنی ہی بد نظمی کا شکار ہوں، ان کی جانب سے کل ہند پیمانے پر بپا کئے جانے والے پروگراموں میں انتظامات بڑے معقول ہوتے ہیں۔ اور مدھیہ پردیش کی اُردو اکیڈیمی اس معاملے میں بڑی معقول معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمیں آنے جانے کا فرسٹ کلاس کرایہ دے رہی ہے جو ظاہر ہے خاصی معقول پیشکش ہے۔ علاوہ ازیں قیام و طعام کے معقول انتظام کا بھی وعدہ کیا ہے اور پھر مضمون سنانے کے عوض پانچ سو روپے کی رقم الگ سے نذر کرے گی جو بہت زیادہ معقول تو نہیں تاہم نامعقول بھی نہیں ہے۔"

انتظامات کی معقولیت کے بارے میں یہ اطلاعات اس قدر معقول تھیں کہ اس سلسلے میں مزید جرح بحث کرنا اپنے آپ کو نامعقول ثابت کرنے کے مترادف ہوتا لہٰذا ہم نے پہلا معقول کام یہ کیا کہ فوراً ۸؍اکتوبر کی دکشن ایکسپریس کے ذریعے ریزرویشن کروالیا اور طئے یہ پایا کہ ۸؍اکتوبر کی شام میں مجتبیٰ حسین کی دختر نیک اختر کی شادی میں شریک ہو کر سیدھے نامپلی اسٹیشن چلے جائیں گے ہماری روانگی کے "معقول" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں مدیر "شگوفہ" جناب مصطفیٰ کمال کے معقول مشوروں کا خاصا عمل دخل رہا۔ اور اس طرح موصوف نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "معقول" مدیر اعلیٰ ہی نہیں معقول "مشیر اعلیٰ" بھی ہیں۔

(باقی آئندہ)

-:- -:- -:-

مجتبیٰ حسین کے خاکے

آدمی نامہ قیمت ۹/- روپے

بتوسط : شگوفہ

سرقے و شر
(مستقل فیچر)

* بیگ انصاری *

روس کے ہفتہ وار اخبار "New Times" نے " ایڈن گارڈن " کے تعلق سے لکھا ہے کہ اس کے محل وقوع کا متنازعہ مسئلہ آج تک بھی موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ نیویارک سے شایع ہونے والی (Book of Lists) میں "ایڈن گارڈن" کے محل وقوع کے بارے میں مختلف مابعد الطبیعات اور جغرافیائی نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ ممالک مشرق وسطیٰ میں "کہیں" پایا جاتا تھا : اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ مشرقی افریقہ میں کسی مقام پر واقع "ہے"۔ چند دانشوروں کا قیاس ہے کہ چین کے صوبہ سن کیانگ (Sinkiang) میں ہوگا اور کسی نے تحقیق کے ساتھ کہا ہے کہ وہ جاوا (Jawa) میں ہے۔ کہیں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ مجوبہ عالم دراصل روئے زمین پر ایک براعظم تھا جو کسی سانحۂ قدرت کے سبب بحر ہند میں غرق ہوگیا۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ روئے زمین پر اس کا کوئی وجود تھا نہ ہے بلکہ ایڈن گارڈن حقیقت میں مریخ میں واقع "تھا" (ہے" نہیں)۔

اس پوری عبارت کو پڑھ کر ہم عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص تحقیق و تدقیق کے اس جزو سے ہمیں زیادہ پریشانی لاحق ہے جس میں صیغۂ ماضی استعمال کرتے ہوئے "تھا" لکھا گیا ہے۔ جہاں کہیں بھی "تھا" تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کہاں "ہے" بلکہ ہے بھی یا نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر مریخ میں تھا تو وہاں سے کہاں چلا گیا۔ کیا مریخ سے کرۂ ارض پر آگیا یا تھر پھر کسی اور سیارہ کو چلا گیا۔ اگر مشرق وسطیٰ میں تھا تو وہاں

سے کوچ کر کے کیا " مغرب ادنیٰ " کے کسی علاقہ میں
جا بسا۔ یا پھر مذکورۂ صدر ایک تحقیق کی رو سے مشرقی
افریقہ میں منتقل ہوگیا تھا۔ اگر چین کے صوبہ سن کیانگ
میں اڈہ جمایا تھا تو وہاں سے ہند چین کی جنگ میں
ہندوستان کے علاقہ میں شامل ہوگیا ——
بہرحال ہمیں سب سے زیادہ معقول بات یہ نظر آتی
ہے کہ اوپر بیان کئے ہوئے ایک نظریے کے بموجب
بحر ہند میں غرق ہوگیا۔ یہ سب سے اچھا فیصلہ ہے
اس لئے کہ اس نظریے کے محقق نے "ایڈن گارڈن"
کو سمندر میں غرق کر کے مسئلہ کو ختم کر دیا تاکہ رہے
بانس نہ بجے بانسری۔ غنیمت یہ ہوا کہ کسی نے یہ نہیں
کہا کہ زمین میں دفن ہوگیا ورنہ محققین اس کی تلاش
میں کرۂ ارض کے چپہ چپہ کو کھود ڈالتے تاکہ زمین
کے اندر سے اس ایڈن گارڈن کو نکالیں جس کا نتیجہ
بہ قول غالب یہ ہوتا کہ ؏
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں کے مصداق
زمین پر ایک مکان بھی نہ ہوتا اور مکینوں کے لئے
جب یہ سوال پیدا ہوتا کہ اب وہ کہاں رہیں تو یہ
دانشور لوگ فیصلہ سنا دیتے کہ ان کو دفن کر دیا
جائے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی آشیاں تک باقی
نہ ہوتا جس میں بیٹھ کر کوئی برقی پر چند سطور لکھ سکتا
اس لئے کہ یہ محققین روئے زمین کی آبادیوں کو کھود
کر اس طرح چھوڑ دیتے جس طرح آج کل بلدیہ کا
محکمہ سڑک کو وسیع کرنے کے لئے کھود کر یوں چھوڑ
دیتا ہے کہ سڑک وسیع ہونے کا تو امکان نظر نہیں
آتا البتہ اور زیادہ تنگ ہو کر رہ جاتی ہے پھر برسوں
محکمہ بلدیہ پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ جب عوام توجہ
دلاتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ " جناب سڑک
کی توسیع کے لئے جو رقم منظور ہوئی تھی وہ کھودنے
میں صرف ہوگئی۔ اب موازنہ میں توسیع کے لئے رقم
موجود نہیں ہے۔ جب اقتدار اعلیٰ میں یہ مسئلہ پیش
ہوتا ہے تو وہاں سے سوال کیا جاتا ہے کہ آخر توسیع
کے بڑے کام کے لئے جو کثیر رقم منظور ہوئی تھی وہ
صرف کھودنے کے چھوٹے سے کام میں کیسے صرف ہوگئی
اس سوال کے حل ہونے تک دو چار سال لگ جاتے
ہیں اور وسیع ہونے والی سڑک زیادہ تنگ ہی رہ جاتی
ہے۔ آخر جب یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو کھودی ہوئی
سڑک کو بھر دیا جاتا ہے اور مسئلہ ختم ہو جاتا ہے
اور فائل کلوز (File close) کر دی جاتی
ہے۔ اس مرحلہ پر ہمیں ان تمام دانشوروں کی نادانی
پر ہنسی آگئی کیونکہ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ بقول کسی کے
سانپ کے چلے جانے کے بعد لکیر پیٹ رہے ہیں۔

غرض ایڈن گارڈن کا مسئلہ آج تک حل نہیں
ہو سکا تو ہم نے ارادہ کیا کہ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ
میں لے لیں اور اس کا فیصلہ کر کے چھوڑیں۔ چنانچہ
" چھان بین " شروع کر دی۔ تو پتہ چلا کہ
" ایڈن گارڈن " دراصل اس باغ کو کہتے ہیں جس
میں آدم و حوا رہتے تھے۔ یہ جان کر ہمیں بڑی
خوشی ہوئی کہ یہ تو ہماری " آبائی میراث " ثابت
ہوئی۔ جس کے ہم شرعی و قانونی اور اخلاقی ہر لحاظ
سے وارث و حقدار ہیں۔ اور اگر یہ ہمارے ہاتھ
آجائے تو ہم اپنی " بنتِ حوا " کو لے کر اس میں منتقل

ہو جائیں گے۔ اور آرام سے اس باغِ بہشت میں رہیں گے۔ لیکن جب مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت آدم نے اللہ میاں کے ایک حکم کی نافرمانی کی تو اللہ میاں نے کان پکڑ کر اُن دونوں کو "ایڈن گارڈن" سے نکال کر (Hell of the Earth) زمین کی دوزخ میں ڈال دیا جس میں نسلاً درنسلاً بعد ہم بھی پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جان کر ہمیں زبردست کوفت ہوئی اور ہم سوچنے لگے کہ اگر بابا آدم اللہ میاں کی ذراسی بات مان جاتے اور گیہوں کا مزہ نہ چکھتے تو آج ہم بھی "ایڈن گارڈن" میں اپنی "بنتِ حوا" اور جملہ ہابیلوں اور قابیلوں کے ساتھ رہتے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا بجز اس کہ "چڑیاں چُگ گئیں کھیت" کہنے کے بجائے "آدم چکھ گئے گیہوں" کہنا پڑ رہا ہے۔ بعد میں یہ جان کر پھر ہمارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی کہ اگر "عملِ صالح" کریں تو ہماری یہ آبائی جائیداد ہم کو دے دی جائے گی لیکن یہ معلوم کر کے دل بیٹھ گیا کہ اگر عملِ صالح کریں بھی تو زندگی میں ہم کو نہیں دی جائے گی بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے جان نذر کرنا پڑے گا تو پھر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور آغا حشر کا یہ شعر ہمارے ذہن میں گھومنے لگا۔ ؎

اگر دینی تھی ہم کو حور و جنت تو یہاں دیتے
وگرنہ مستیٔ عہدِ جوانی بھی وہاں دیتے

اس شعر کو پڑھ کر ایک نئے غم میں مبتلا ہو گئے کہ ہائے اب نہ مستی باقی رہی ہے نہ جوانی اور یہ ہمارے مضامین میں جو اس کی جھلک ملتی ہے تو یوں سمجھیے کہ عہدِ رفتہ کا مرثیہ پڑھ لیتے ہیں اور بس۔ بہرحال ہم اس غم میں اتنی دیر بیٹھے رہے (آنسو نہیں بہائے) کہ کھانے کا وقت گذرنے لگا تو ادھر سے "بنتِ حوا" کی آواز آئی کہ "کھانا بھی کھائیے گا یا یوں ہی گھُٹتے رہیئے گا"۔ آواز ابھی ہمارے کانوں میں گونج ہی رہی تھی کہ "بنتِ حوا" خود بھی آ پہنچیں۔ اور ہمیں رنجیدہ و ملول دیکھ کر دریافت کیا۔ "بات کیا ہے بہت رنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ کیا پھر چار شادیاں نہ کرنے کا غم یاد آگیا ہے۔" یہ کہہ کر ہنس پڑیں۔ کیونکہ وہ ہماری اس "شرعی بھول" کا اکثر مذاق اُڑاتی رہتی ہیں۔ کیونکہ ہم بات بات پر شرع کی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ انتہا یہ کہ ہم خالص "شرعی" ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ۔ "بات دراصل یہ ہے کہ روس کے ہفتہ وار New Times میں "ایڈن گارڈن" کے مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ وہ کہاں واقع تھا یا کہاں ہے"۔ یہ سن کر پھر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں کہ اُن نادانوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ "ایڈن گارڈن" تو خود ہمارے شہر حیدرآباد میں کنگ کوٹھی کے پاس ہی واقع ہے۔ جس میں کسی زمانے میں حضور نظام کے ولی عہد رہے تھے۔

ہم نے کہا۔ "نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایڈن گارڈن اس باغ کا نام ہے جہاں آدم و حوا رہتے تھے" تو اور زیادہ ہنس کر کہنے لگیں کہ۔ "تو پھر وہی ایڈن گارڈن ہے جو کنگ کوٹھی کے پاس ہے۔ کیونکہ وہ اب ایک "میارج ہال" بن گیا ہے۔ وہاں

آئے دن ایک ابنِ آدم اور ایک بنتِ حوا کو لاکر
جنت دکھائی جاتی ہے اس کے بعد وہاں سے نکال
دیا جاتا ہے تو ان سے پھر ایک ابن آدم اور ایک
بنتِ حوا جنم لے کر ایک روز اسی ایڈن گارڈن
میں ایک دن کے لیے لائے جاتے ہیں اور دوسرے
دن نکال دیئے جاتے ہیں ۔۔ بس بہت ہو چکا
مذاق، اب چلئے کھانا کھا لیجیے۔ اس کے بعد ظہر
کی نماز پڑھ لیجیے۔ اسی میں آپ کو ایڈن گارڈن
کا راستہ مل جائے گا۔"

یہ سن کر ہم نے New Times
کو بند کر دیا اور کھانے کے لئے چلے گئے۔

--

سلسلۂ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد

ممتاز مزاح نگار پرویز ید اللہ مہدی

کے مضامین کا تازہ مجموعہ

ٹائیں ٹائیں فش

گیارہ پُر از مزاح دلچسپ مضامین

صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۱۵ روپیہ

مجلد خوبصورت ڈسٹ کور کے ساتھ

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے

خرافات

(مراسلے)

٭ مجتبیٰ مصطفیٰ کمال صاحب، آداب!

سالنامہ ملا۔ شگوفائی دستار سے سربلند ہے۔ شایانِ شہرت ہے۔ شگوفے ہی شگوفے ہیں۔ کارٹون خوب لوٹ پوٹ کرتے ہیں۔ انہوں نے لیتھو کے قرطاس پر اپنے کیری کیچر ہونے کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ میرزا مجتبیٰ کے نام میرزا غالب کا خط تو شاہ کار ہے۔ خلد آشیانی میرزا کو غالب اکیڈمی کے فعال سکریٹری ذہین نقوی کی ستائش کے لئے ان سے بہتر کبوتر نہیں مل سکتا تھا۔

گربچن چندن۔ دہلی

٭ سالنامہ طنز و مزاح کے مزاج کا نباض نکلا۔ وہ کارٹون جو سرورق ہے سالنامہ کو دلچسپ پہلو عطا کرتا ہے۔ سرورق سے آخیر ورق تک ایک ایک لفظ ایک عظیم المرتب اور طنز شناس مدیر کی فنی عظمت کی پرچھائیں ہے۔ نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کے باوجود ایسا عدیم المثال سالنامہ آپ کی مسلسل ادبی کاوشوں کا ٹھوس ثبوت ہے۔ سالنامے کے لئے ایسے صحت مند مزاحیہ مضامین، معلوماتی فیچرس اور مزاحیہ کلام کا انتخاب یقیناً ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کی نباہ آپ جیسے ادیب و فنکار ہی کر سکتے ہیں۔ ایسی یادگار پیشکش کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

کارٹونسٹ جناب شعیب ربانی نے تو فن کا جادو جگا کر اپنی فنی حیثیت خود متعین کرلی ہے۔ ہر فن کار کا حسب حال کارٹون پیش کر کے سالنامے کو ایک ایسی چمک عطا کی ہے جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتی۔ میری نظر جب اپنے کارٹون پر پڑی تو اس میں میں نے اپنے بچپن کی پرچھائیاں دیکھی۔ جناب شعیب ربانی نے اس عمر میں میرا بچپن میرے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ شعیب ربانی صاحب کے قلم کا فن چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے موقع پر انہیں مبارکباد پیش کرنا ہر فنکار کا ادبی فریضہ ہے۔ امید کہ موصوف قبول فرمائیں گے۔

دعاگو ہوں کہ "شگوفہ" روز بروز ترقی کی بلند منازل طے کرتا جائے۔

جوہر سیوانی

٭ سالنامہ "شگوفہ" دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی اور ہم بڑے بڑے ادیبوں کے مضامین پڑھ کر اتنے مسرور ہوئے جس کا بیان کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اللہ اس پرچے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور دنیا کے تمام ملکوں میں اس کی مانگ کو ابھارے اور تاقیامت اردو ادب کا خدمتگار رکھے۔

عبدالصمد بن علی مہدپوری (بیتیا)

٭ آپ کے پرچے کو دیکھ کر ہمارے ہوسٹل کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ کئی دنوں تک ہاتھوں ہاتھوں گھومتا رہا۔

صباح الدین ہاشمی (علیگڈھ)

بچوں کا ادب ـــ ترقی اردو بیورو کی کچھ اہم مطبوعات

کتاب کا نام	مصنف مترجم	صفحات	قیمت
۱. چارلز ڈکینس کا قصہ	نورالحسن نقوی	۹۴	۳-۲۵
۲. چندر دیو	بھیم لتا ـ کشور سلطان	۲۵	۳-..
۳. حاتم طائی کا قصہ	مرتب نورالحسن نقوی	۱۲۰	۶-۵۰
۴. رابنسن کروسو	ڈینیل ڈیفو ـ م ندیم	۸۰	۳-۴۰
۵. راجہ رام موہن رائے	سکندر لال گھوش ـ انعام الحق	۱۱۲	۳-۵۰
۶. سجاتا اور جنگلی ہاتھی	شنکر ـ ایس ایم شاہ نواز	۳۹	۴-..
۷. سرسید احمد خاں (دوسرا ایڈیشن)	میر نجابت علی ـ سید ابوالحسنات	۲۴	۱-..
۸. شریف زادہ	مرزا ہادی رسوا ـ مرتب حفیظ عباسی	۶۴	۲-۲۵
۹. عقلمند بھیڑیا اور دوسرے ڈرامے	مرتب م. ندیم	۴۸	۲-۲۰
۱۰. نٹ پال کی کہانی	راج نرائن راز	۶۷	۶-..
۱۱. گاندھی جی کے مختلف روپ	الونبدھو پادھیائے ـ شکیل اختر فاروقی	۲۱۱	۳-..
۱۲. مشینی گھوڑا	اطہر پرویز	۱۴۳	۵-..
۱۳. مولانا روم کی کہانیاں	مرتب محمد حفیظ الدین	۴۰	۲-..
۱۴. مہاگری	ترجمہ: حفیظ الکبیر پرواز	۲۴	۳-۷۵
۱۵. نصوح کا خواب	مرتب حفیظ عباسی	۱۲۴	۳-۵۰
۱۶. ناگ متی	ساوتری ـ سلمیٰ اجمیری	۲۵	۳-..
۱۷. نورتن کہانیاں	انتخاب اور بازگوئی شمیم احمد	۱۹۲	۶-۵۰
۱۸. ہری اور دوسرے ساتھی	شنکر ـ پریم نرائن	۶۱	۶-..
۱۹. کیمیا کی کہانی	سید شہاب الدین دسنوی	۱۲۸	۷-۵۰
۲۰. خط کی کہانی	غلام حیدر	۱۰۸	۳-۷۵
۲۱. گلستان کی کہانیاں	مرتب امیر حسن نورانی	۷۹	۴-..
۲۲. بچوں کی مسکان	سیدہ فرحت	۶۴	۳-۷۵
۲۳. للی پٹ کا سفر	جوناتھن سوئفٹ ـ م. ندیم	۴۸	۲-۱۰
۲۴. دیس دیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۳۵	۲-..
۲۵. فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۸۳	۴-۲۵

نوٹ:۔ ہمارا سہ ماہی رسالہ "اردو دنیا" اور فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔ کتابوں اور دیگر معلومات کے لئے لکھیں:

شعبۂ فروخت و نمائش، ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم و ثقافت، حکومت ہند، ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۲

DAVP 511(127)/82

(یونانی دوا)

زندہ طلسمات

اطمینان کر لیجئے کہ
شیشی مہربند ہے

ZINDA TILISMATH
MUST BE IN EVERY HOUSE
TRADE MARK 57
Registered

کامیاب اور
بے ضرر علاج!
جس سے ضمنی
اور مضر اثرات
بالکل نہیں ہوتے

زندہ طلسمات سر درد، کھانسی، زکام سے فوراً
آرام دیتا ہے ___ اور کئی امراض مثلاً پیچش، ہیضہ
فلو وغیرہ کے لئے ___ کامیاب علاج!

تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات
حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳

زندہ دلانِ حیدرآباد
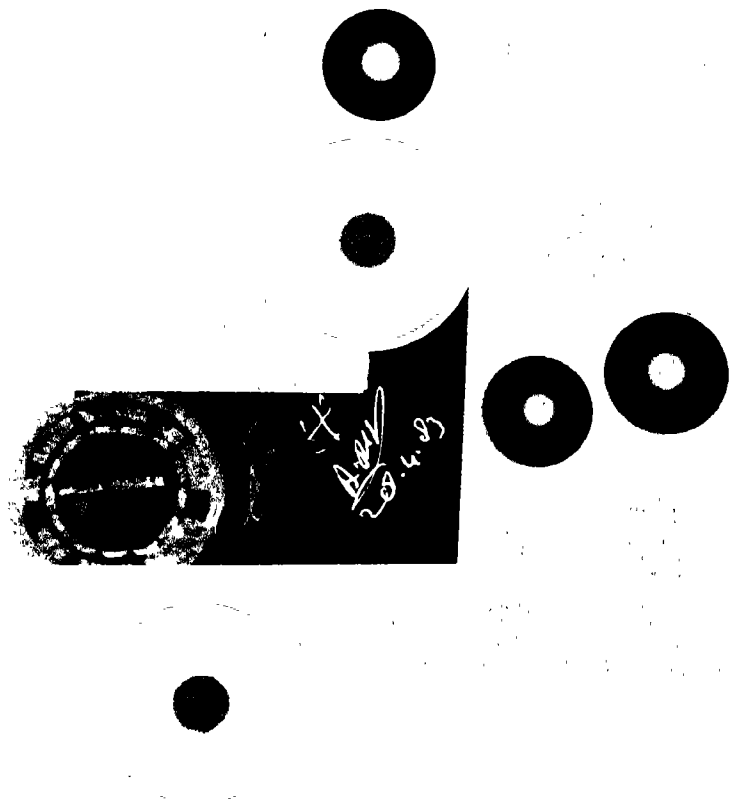
پندرھویں سالانہ تقاریب

۱۴، ۱۵ اور ۱۶ اپریل ۱۹۸۳ء

ماہنامہ شگوفہ (سوونیر)

حیدرآباد

جلد ۱۶ ـــــ اپریل ۱۹۸۳ء ـــــ شمارہ ۴

ایڈیٹر:

سید مصطفیٰ کمال، ایم اے

مجلسِ ادارت: محمد منظور احمد

حمایت اللہ

مسیح انجم

سرورق: طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت:

راجندر سنگھ بیدی

بھارت چند کھنہ

خواجہ عبدالغفور

نریندر لوتھر

مجتبیٰ حسین

کتابت: محمود سلیم اور محمد عبدالرؤف

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

چار کمان۔ حیدرآباد ۔۔ ۲

کنوینر سوونیر: محمد منظور احمد

زرِ سالانہ: (۳۰) روپے

بیرونِ ہند سے (۹۰) روپے

سالانہ انفرادی (۲۵) روپے

قیمت فی پرچہ، ۴ روپے

جنرل منیجر: سمیع جلیل

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

(فون: 57716)

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ ہارکو، سری نگر
۴۔ انڈین یسیٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو، کیننگ انڈسٹریز ترچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چیمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذّت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جُلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبّے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۲

زندہ دلانِ حیدرآباد
پندرھویں سالانہ تقاریب

۱۴، ۱۵ اور ۱۶ اپریل ۸۳ء بمقام نمائش میدان

عہدہ داران زندہ دلان

جناب بھارت چند کھنہ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ)	سرپرست
جناب نریندر لوتھر آئی۔ اے۔ ایس	صدر
جناب رشید قریشی	نائب صدر
جناب محمد حمایت اللہ	نائب صدر
جناب طالب خوندمیری	معتمد عمومی
جناب مسیح انجم	شریک معتمد
جناب بوگس حیدرآبادی	شریک معتمد
جناب محمد سلیمان	خازن
جناب سید مصطفیٰ کمال	رکن
جناب مصطفیٰ علی بیگ	"
ڈاکٹر حبیب ضیاء	"
جناب اسمٰعیل ظریف	"
جناب اسلم فرشوری	"
جناب سعادت علی خاں	"

جناب سعادت علی خاں	ڈائس
جناب حفیظ خاں مذاق	نشر و اشاعت
جناب یوسف شریف	بکنگ
جناب قمر الدین احمد خاں و جناب محمد حبیب احمد خاں	انتظامات
جناب اسلم فرشوری	رابطہ
جناب مرزا نقی علی بیگ	بک اسٹال
جناب وہاب قیصر	طباعت

(۱)

محفلِ لطیفہ

۱۴ اپریل ۱۹۸۳ء بروز جمعرات ۵½ بجے شام
بمقام نمائش کلب

- افتتاح: یم۔ راجندر راؤ وزیر لیبر و امپلائمنٹ
- صدارت: جناب اے رنگا راؤ
نائب صدر نمائش سوسائٹی
- مہمانِ خصوصی: جناب بی جیا سینا رکن نمائش سوسائٹی

لطیفہ گو

نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
رشید قریشی
شاہدہ جلیل

کنوینرس

محترمہ طاہرہ نکہت	شعبۂ خواتین
ڈاکٹر حبیب ضیاء	ادبی اجلاس
جناب محمد منظور احمد	سوونیر
جناب طالب خوندمیری	محفل لطیفہ
جناب مصطفیٰ علی بیگ	مشاعرہ

افشاں جبیں
بالا پرشاد گوڑ
ایں۔ اے۔ واسع
اظہر افسر
طالب خوندمیری
حمایت اللہ
مصطفیٰ علی بیگ
حفیظ خاں مذاق
حاجی بشیر
موہن پرشاد
اسلم فرشوری
دولت رام
احمد جلیس
کلیم صدیقی
حامد کمال
ذہانت علی بیگ

کنوینر : ——— طالب خوندمیری

(۲)

ادبی اجلاس

۵ اپریل ۸۳ء بروز جمعہ ۶ بجے شام بمقام نمائش کلب

- صدارت : جناب انتظار حسین (پاکستان)
- مہمان خصوصی : جناب سید ہاشم علی اختر
  وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی

مضمون نگار

بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
رشید قریشی
مجتبیٰ حسین
جیلانی بانو

شفیقہ فرحت
ڈاکٹر حبیب ضیاء
مسیح انجم
پرویز یداللہ مہدی
برہان حسین
فضل جاوید

کنوینر : ——— ڈاکٹر حبیب ضیاء

(۳)

مزاحیہ مشاعرہ

۱۶ اپریل ۸۳ء بروز شنبہ ۸ بجے شب
بمقام نمائش میدان

افتتاح : جناب بن بھاسکر راؤ صاحب
وزیر فینانس و برقی حکومت آندھراپردیش

صدارت : نواب شاہ عالم خاں صاحب

شعرائے کرام

ہلال سیوہاروی (یوپی) ، شمسی مینائی (بارہ بنکی)
ساغر خیامی (دہلی) ، ناظم انصاری (ناگپور)
دلکش آفریدی (مراد آباد) ، خواجہ بدیع الدین (پاکستان)
عظمت بھلاواں (کرناٹک) ، ہندی کے مشہور شاعر دینو گوپال بھٹ

پاگل عادل آبادی | علی صاحب میاں | سرپٹ حیدرآبادی
اسماعیل ظریف | گلیم میدکی | حمایت اللہ
طالب خوندمیری | مصطفیٰ علی بیگ | حفیظ خاں مذاق
صبغتہ اللہ بساط | اشرف خوندمیری | بوگس حیدرآبادی
محمود نشتر | قادر حیدرآبادی | رشید عبدالسمیع جلیل

انّ پڑھ بھونگیری | احمد سلطان

کنوینر : ——— جناب مصطفیٰ علی بیگ

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

پچُورن (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ
امریکہ کی آٹومیٹک آئی ٹسٹنگ مشین
سے کروا یئے۔

امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹیکنالوجی کے
مستند تربیت یافتہ ۔۔۔

معیاری چشموں کی تیاری
کے لئے
تشریف لایئے :

غوری اینڈ کمپنی آپٹیشنس

والیفائیڈ آپٹیشنس اکاڈمی آف آپٹیشنری (امریکہ)
ترپ بازار حیدرآباد ۔ فون: 42127

بمبئی کے اسٹاکسٹس

ایف۔ڈی۔خان
اینڈ کمپنی

فون : 221882
عابد روڈ حیدرآباد

اور اس کے علاوہ دوسرے معیاری ٹری کاٹ ٹریلین اور کاٹن کے پارچہ جات کے فروخت کنندگان، جدید قسم کے پردے، تولیے، چادریں اور اسکول کے یونیفارمس کے لئے واحد نام!

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ——— (اداریہ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی پندرھویں سالانہ تقاریب کے موقع پر روایت سے انحراف کرتے ہوئے شرکائے تقاریب کی تخلیقات کا انتخاب زیرِنظر سوونیر میں پیش کیا جارہا ہے۔ ایک عرصہ سے قارئین کی یہ خواہش تھی کہ مزاح نگاروں کا ایک جامع انتخاب شایع ہونا چاہیئے۔ ایسا مکمل انتخاب کسی اور موقع پر ضرور شایع کیا جائے گا، تاہم اس شمارہ میں ہماری سالانہ تقاریب میں شریک ہونے والوں کی نمائندہ تخلیقات کو یکجا کیا گیا ہے۔

اس سوونیر کی اشاعت میں کنوینر سوونیر جناب محمد منظور احمد، جناب اعظم علی (مالک نیشنل فائن پرنٹنگ پریس) خوش نویس حضرات محمود سلیم و ایم اے رؤف نے خصوصی دلچسپی لی اس لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سہ روزہ تقاریب
کے موقع پر
دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں

آپٹیکس کارپوریشن

گدوال ہینڈلوم بلڈنگس ۔ عابد روڈ
آپ کی بینائی میں مزید روشنی پیدا کرنے کے لیے تشریف لائیے

رشید احمد صدیقی　پطرس　فرحت اللہ بیگ　عظیم بیگ چغتائی　شوکت تھانوی　فرقت کاکوروی　کنہیا لال کپور　بھارت چند کھنہ
فکر تونسوی　احمد جمال پاشا　یوسف ناظم　مجتبیٰ حسین　شفیقہ فرحت　خواجہ عبدالغفور　نریندر لوتھر　رشید قریشی
برق آشیانوی　مسیح انجم　پرویز یداللہ مہدی　—— حصۂ معلومات　اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی

مرتبہ : ادارہ "شگوفہ"

شگوفہ ۲۱-۳ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔

بھارت چند کھنہ

ہندوستانی بال سینا

زندہ دلان حیدر آباد کے سرپرست جناب بھارت چند کھنہ اس ادارہ کے قیام سے لے کر وسط ۱۹۸۲ء تک صدر رہے ــــــــ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۸۰ء میں جشن کھنہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

۱۹۱۴ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ لاہور حیدر آباد اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ آئی۔ اے۔ ایس کیا اور ریاست آندھرا پردیش کے مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔ پانچ کتابیں مسکراتے آنسو، پھبتیں، ٹھنڈی بجلیاں، تیرنیم کش، اور کیا نام نہ ہوگا شائع ہو چکی ہیں۔

بیوی میکے سے واپس آرہی تھیں۔ جس گاڑی سے ان کے آنے کی اطلاع ملی تھی وہ صبح ساڑھے پانچ بجے اسٹیشن پر پہونچتی تھی۔ ریلوے انکوائری سے دریافت کر کے کہ گاڑی ٹھیک وقت پر آرہی ہے، خادم بالکل ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہونچا۔ مگر اپنی غیر پابندیٔ وقت کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس منحوس صبح گاڑی وقت سے ٹھیک پندرہ منٹ پہلے ہی پدھار چکی تھی۔ بھاگم بھاگ جب میں پلیٹ فارم پر پہونچا تو بیوی سامان سمیت دو تین قلیوں میں گھری میرے وقت پر نہ پہونچنے کی وجہ سے بھک جل کر اڑ جانے والا مادہ بنی آنکھوں سے شعلے برسا رہی تھیں۔ میں نے اپنی رفتار کو بریک لگایا اور بالکل ان کے قریب پہونچ کر دیر سے پہونچنے کی وجہ بیان کرنے ہی والا تھا کہ بیوی نے گفتار کا آغاز یوں کیا: "اللہ رے ادھر دے میرے اس قدر نزدیک کیوں آرہا ہے، کیا پلیٹ فارم پر کھڑے رہنے کے لئے اور جگہ نہیں؟"

ملاقات ہونے پر اس افتتاحی جملے کو سن کر میرے جملہ حواس باختہ اور ہاتھوں کے طوطے، بال، ناخن اڑنے لگے ۔ ۔ ۔

قلی نے بیوی سے کہا: "آج کل غنڈہ گردی عام ہوگئی ہے۔ آپ ذرا ٹھہریئے، میں ابھی پولیس کے آدمی کو بلا کر لاتا ہوں تاکہ علی الصبح عاشق کا چکر چلانے والے اس سڑک چھاپ غنڈے کو حوالات میں پہونچا دے۔ یہ کہہ کر قلی ایک طرف لپک کر جا ہی رہا تھا کہ میں نے اُڑے ہوئے ہوش سنبھال کر قلی کو للکارا "کر اے ابے او بکری کی اولاد! زبان کو لگام دے ورنہ حوالات تو میں شاید جاؤں گا ہی مگر تیرا قتل کر لے کے بعد!"

بیوی نے میری جو آواز سُنی تو الف لیلیٰ کی کہانیوں کی شہزادیوں کی طرح بے ہوش نہ ہوتے ہوئے اپنی ٹھوس آواز میں بولی! "اُٹھیں" یہ کیا گول مال ہے، اور آپ بھیس بدل کر اسٹیشن پر کیوں آئے ہیں؟ کیا کسی فلم میں بوڑھے ویلن کا رول ادا کرنے کا کام مل گیا ہے؟

میں نے کہا: "باتیں گھر چل کر ہوں گی۔ پلیٹ فارم پر بیوقوفوں کا بلا لحاظ مظاہرہ ٹھیک نہیں"۔ میں نے قلیوں سے سامان اٹھوایا اور موٹر میں بیٹھ کر انجن چالو کر کے چلنے ہی والا تھا کہ اسی خرانٹ قلی نے آوازہ کسا کیا زمانہ آگیا ہے، بیوی خاوند کو نہیں پہچانتی۔ اور ایسے ہی اسٹائل خاوند کو نہ ہی پہچانے تو سکھی رہے گی۔" میں چاہتا تھا کہ موٹر روک کر اس قتل کا ارتکاب کر ہی ڈالوں، جس کی دھمکی میں نے اس قلی کو دی تھی کہ بیوی نے حرفِ آخر کے طور پر یہ کہہ کر گاڑی چلوا دی کہ اب خاکسار مزید بے وقوفی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بیوی کے مجھے نہ پہچاننے کی وجہ ان کی بینائی کا قصور نہ تھا، گو ان کی نظر ضرور کمزور ہے اور وہ اکثر اپنی عینک چھپا کر اس کو ہر وقت نہ لگا رکھنے کی وجہ پیدا کر لیتی ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ امورِ خانہ داری اور بڑھتی ہوئی قیمتوں کو آمدنی کی سمت میں لانے کی کوشش سے بیزار اور لاچار ہو کر بیوی مجھے میری آمدنی کے ساتھ میرے حال پر چھوڑ کر چھ مہینے کی نجات حاصل کرنے کے لئے میکے چلی گئی تھیں۔

ان کی غیر موجودگی میں خاکسار نے گھر کا بجٹ متوازن کرنے کی غرض سے بال کٹوانے کا ارادہ بالکل قطع کر دیا تھا۔ چھ مہینوں میں میرے بال نوجوانانِ وطن کے بالوں کی طرح ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ان کو ماتھے پر چھجے کی طرح جما لینا اور کانوں پر اُوڑھ لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مونچھوں کو لمبا کرنے کے لئے صبح شیو کرتے وقت اُسترا کان کی سیدھ کی بجائے جبڑوں کی لائن سے چلاتے پر ڈیڑھ ماہ میں یہ ضرورت بھی پوری ہو گئی تھی۔ اس طریقۂ کار سے نہ صرف حجامت کے صابن کی بچت بلکہ بلیڈوں کی عمریں بھی دراز ہونے لگیں۔ رہ گئی مونچھیں تو ان کو بھی خادم نے بڑھا کر ایسی تراش کی بنالی تھیں کہ ان کے کونے میری خاکساری کے ثبوت میں اس طرح نیچے کی طرف جھکے ہوئے تھے کہ چہرے کے ڈائیل پر پانچ بج کر پچیس منٹ کا وقت بتلاتے تھے۔

اس طرح جدید صورت بنا کر اور اس خیال کے مدِنظر کہ جیسا دیس ویسا بھیس بھی ہونا چاہئے میں نے دو تین پتلونیں اچھے خاصے پھیلے ہوئے بیل باٹم کی سلالیں۔ چھ انچ چوڑا کمر بند یعنی بیلٹ اور چھ انچ اُونچی ایڑی والے جوتے بھی خرید لئے۔ ان پر رنگ برنگی نقش والی قمیص جن کے کالروں کی نوکیں یا گولائیاں ــــــ شانوں کے باہر تک پہونچ جاتی تھیں لے لیں۔ ایسے لباس اور جدید صورت میں بڑی تسکین ہوئی، کیوں کہ لوگ اب مجھے حقارت کی نگاہوں سے یا پرانی، فرسودہ اور آثارِ قدیمہ کا کم قیمت نمونہ نہیں سمجھتے تھے! میں ہندوستانی یال سینا یعنی انڈین ہیر فورس کا ایک باوقار رکن بن گیا تھا۔ اپنے نئے لباس اور جدید صورت میں جب میں ریلوے پلیٹ فارم پر اپنی بیوی سے ملا تو ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں جان سکی تھیں کہ باطن میں میں کون تھا؟

گھر پہونچ کر میں نے کہا "چائے تیار ہے، پی لو" اور بیوی نے کہا پہلے مجھے خونِ جگر پی لینے دو، ان بالوں پر ہائے ہائے اور

بال دیر تو لو بچ لینے دو۔ جب میں گھر سے گئی تھی تو مجھے پورا پورا یقین تھا کہ واپس آنے پر گھر کا حلیہ بگڑا ہوا ہوگا، وہ تو ہوا ہی ہے، گو خیر سے گھر اپنی جگہ پر موجود ہے، گھر کے فرش پر دو دو انچ مٹی جمی ہوئی ہے، جگہ جگہ جالے لگے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھو چھت سے جالے کے تار سے مکڑی جھولا جھول رہی ہے۔ بیلمینٹس میں چڑیوں نے گھونسلے بنالئے ہیں۔ بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے کہ بیوی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ کسی بلے بیا ہے کو بہت نزدیک نہ آنے دے اور خاوند کو بہت دور رہنے دے۔ گھر کے تباہ و تاراج ہونے کا تو مجھے یقین تھا مگر جس چیز کا حلیہ حقیقت میں بگڑ چکا ہے وہ آپ کی ذاتِ طفیل بندہ ہے۔ آپ کو پہچاننے کے لئے دو گواہوں کی ضرورت لاحق ہو رہی ہے۔ آخر آپ نے اپنی صورت کا جو دیسے بھی اصلی ویسی ہی تھی کیوں خونِ ناحق کر کے رکھ دیا؟ چھ مہینے کا عرصہ کچھ ایسی مدت نہ تھی کہ آپ من مانی کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ میں اپنے جاننے والیوں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ وہ مجھے آپ کی بیوی کہہ کر پکاریں گی۔ ؟ کیا میں شرم کے مارے زمین میں نہیں گڑ جاؤں گی؟۔ اگر ایسی بے حیا حرکت کرنا ہی تھا تو پہلے لکھ کر مجھ سے مشورہ کر لیا ہوتا۔ کیا آپ کے ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں نے بھی آپ کو بہروپ دھارنے سے نہیں روکا؟ مگر وہ کیوں روکتے۔ اگر کوئی جھیل میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر ہی چکا ہو تو اسے کون روک سکتا ہے؟ مگر میں آپ کی چینی مونچھوں اور ریچھوں جیسے بالوں کو پل بھر کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ آخر میری بھی اس شہر اور اس محلہ میں کوئی عزت ہے، آبرو ہے؟ آپ کو کیا حق تھا کہ میرے بڑے مشکل سے بنائے ہوئے وقار کو اس طرح نیست و نابود کر دیا؟"

بیوی ذرا دم لینے کے لئے رکیں تو میں نے کہا: آخر چھوٹے بال ہی کیوں اور لمبے بال کیوں نہیں؟ کیا ہندوستان کے کروڑوں نوجوان اور دنیا بھر کے مرد جو لمبے بال رکھتے ہیں سب بے وقوف ہیں؟ کیا ان سب کی صورتیں بگڑی ہوئی ہیں؟ یہ سب ایک ہی رُخ سوچنے کا نتیجہ ہے جو آپ کو لمبے بالوں سے چڑ ہے۔ کیا صرف عورتوں کو ہی لمبے بال رکھنے کا اجارہ حاصل ہے؟"

بیوی نے کہا: "اس میں اجارے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ازل سے مرد کا جو تصور بنا ہوا ہے اس میں اس کے بال چھوٹے اور عورتوں کی چوٹی ہوتی تھی اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے لئے انسائیکلوپیڈیا دیکھا جائے یا سپریم کورٹ کے کسی فیصلے کا حوالہ دیا جائے۔"

میں نے کہا: "اس ازلی مرد کے تصور ہی کو لیجئے۔ وحشی جنگلی مرد کے بال بہرحال لمبے تھے کیوں کہ ان کو کاٹنے کے لئے اس کے پاس کوئی اوزار نہیں تھا۔ ابتدائی انسان کے بعد کے زمانوں میں بھی مرد کے بالوں کی لمبائی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عیسائی مذہب کے بانی یسوع مسیح کے بال لمبے تھے۔ دیگر مذاہب کے ولیوں پر نظر ڈالو۔ ہندو دھرم کے اوتاروں کا ذکر چھوڑو سری رام اور سری کرشن اور شیواجی مہاراج کی شبیہوں کو دیکھو سب کے سر بھی جٹاؤں سے سجے ہوئے تھے اور پھر سکھ مت۔

بیوی نے بات کاٹ کر کہا "چھوڑیئے ان باتوں کو، نہ آپ ولی ہیں، نہ اوتار۔ آپ کے لئے یہی مناسب ہے کہ اپنے اس لباس کو اتارو اور اپنی صورت کی مرمت کراؤ۔ بال بڑھانے سے بزرگی نہیں بڑھتی۔ سُنتے ہو؟"

میں نے کہا: "سن رہا ہوں۔ آپ میری صورت غیر مانوس ہونے سے برہم ہو گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے مشہور دانشور اور بزرگ لمبے بالوں اور لہراتی ہوئی داڑھیوں سے پہچانے جاتے تھے۔ آئین اسٹائن، کارل مارکس، ولیم شیکسپیر، اسکار وائلڈ، کالی داس، ارسطو، سقراط، ٹیگور، سیمسن جس کی بے پناہ طاقت کا راز اس کے بالوں میں تھا۔۔۔"

اور بیوی نے فرمایا کیا آپ سر پر بالوں کی جھاڑی اُگا کر خود کو سیمسن سمجھنے لگے ہیں؟ جہاں تک میں جانتی ہوں سیمسن ایک دراز قامت انسان تھا لیکن آپ۔! اس قدو قامت پر آپ دور سے کلاہ ماراں یعنی سانپ کی چھتری کی طرح دکھائی دیں گے۔ اور بفرض محال اگر آپ سیمسن بننا ہی پسند کرتے ہیں تو پھر یاد رہے، میں بھی ڈیلائلا سے کچھ کم نہیں جس نے سیمسن کے بال کاٹ دیئے تھے۔ اب آپ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں بھی ڈیلائیلا کا رول ادا کرتے ہوئے رولنگ پن کی مدد سے آپ کے جھاڑی نما سر کے اندر دماغ کو سہلاؤں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اپنے معمولی ہوش و حواس بھی رکھتے تو ہرگز ایسی حماقت نہ کرتے۔"

میں نے بیوی کو سمجھایا کہ آپ تو صرف سیمسن کو پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں حالانکہ میں نے دیگر کئی بزرگوں، آئن اسٹائن کالیداس وغیرہ کے نام بھی لئے تھے۔ ان کے علاوہ رانا پرتاپ، رستم و سہراب، شیواجی بشمول شیواجی گنیش ..... یہ سب تاریخ کے مشہور نام ہیں۔"

بیوی نے بات کاٹ کر کہا، کیا کوئی تاریخ کی جماعت ہے، بات حجامت کرانے کی ہو رہی ہے۔ میری غیر موجودگی میں آپ حماقت الملک ہوگئے آخر آپ کو یہ کیا سوجھی؟ کیا آپ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں گھر واپس نہیں آؤں گی؟

میں نے منت کی کہ بیوی! میں نے ان بالوں کو بڑے شوق سے بڑھایا ہے۔ میری یہ گل مونچھیں کس قدر رعب دار اور زینت بخش ہیں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ اس باغ و بہار گلستان کو آنِ واحد میں اُجاڑ دوں، نہیں، میں ہرگز ہرگز.....

اور بیوی نے پھر ٹوک کر کہا کہ آپ تو کیا آپ کے فرشتے بھی ضرور بہ ضرور میری بگڑی تقدیر اور اپنی بگڑی صورت کو بنانے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اپنی جدید صورت کی نیا کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے کہا" بیوی اگر آپ تاریخ کی نامور شخصیتوں سے مرعوب نہیں ہوتیں تو پھر کرکٹ کی دنیا کے ستاروں کو دیکھئے۔ آسٹریلیا کا ڈینس لالی، ویسٹ انڈیز کا کلائیڈ لائیڈ، ہندوستان کا دشوا ناتھ گنیش کے امرت راج...."

"یہ سب فضول کی بحث ہے" بیوی نے حسب معمول مجھے بولنے سے روکتے ہوئے کہا" مجھے دشوا ناتھ کی مہیب مونچھیں متاثر نہیں کر سکتیں اور پھر آپ صرف ان جوکروں کو ہی کیوں دیکھتے ہیں۔۔ دنیا کے مکہ بازی کے چمپین محمد علی کلے کو کیوں نہیں دیکھتے۔ بہر صورت مجھے صرف آپ کی صورت سے واسطہ ہے اور میں اس کی ہولناکی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ شاید اپنی صورت سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لیجئے پانچ روپے۔ کیوں کہ اس سے کم اُجرت پر شاید ہی کوئی حجام آپ کو درندے سے انسان بنانے پر تیار ہو۔"

جھولی میں ڈالے ہوئے روپے دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ شادی ایک محصور قلعے کی طرح ہے جو لوگ اس کے اندر ہیں وہ باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور جو محاصرہ کئے ہوئے ہیں وہ اس کے اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور شادی صرف ایک لفظ ہی نہیں بلکہ دائمی سزا کا فتویٰ ہے۔ شادی ایک جنت نہیں بلکہ ایک میدانِ جنگ ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو یہ غلطی پہلا مرتبہ بھی نہیں کرتے۔

بیوی نے مجھے خاموش دیکھ کر فاتحانہ انداز میں آخری وار کرتے ہوئے کہا" اگر آپ چاکلیٹ کی رنگت کے تے ہوئے توسٹوں

کی بنیاد پر سنہری رنگت کے سکہ بیل انڈوں کی عمارت ناشتہ کے لئے چاہتے ہیں تو دیر مت کرو۔ اٹھو اور نزدیک ترین حجام کی دکان کا رخ کرو۔

یہ ترغیب کچھ ایسی تھی کہ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے حجام کے پاس بادلِ ناخواستہ پہنچ گیا۔ حجام نے مجھے کرسی پر بیٹھا کر کسی جنگی جرنل کی طرح میرے سرپا کا جائزہ لیا اور ارشاد فرمایا کہ آپ کے بال اب اس صلاحیت کی منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ فیشن کے کسی بھی ستارے سے ٹکرلے سکتے ہیں۔ آج کی تراش کے بعد اس روایتی ایک آنچ کی کسر بھی باقی نہیں رہے گی۔ البتہ مونچھوں میں کچھ اور گہرائی اور ٹھوسیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ کل مونچھوں کے سرے سیدھے نہیں بلکہ چودھویں کے چاند کی طرح خمدار کئے جاسکتے ہیں۔ صاحب آپ کے بالوں کی کاٹ میرے لئے باعثِ فخر ہے۔"

میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا کہ " میرے سر پر جو سبز انقلاب آیا تھا، افسوس کہ اس کا دور کامرانی اور میرا شادمانی کا دور ختم ہوگیا ہے۔ اب تم انقلاب کے زمانے سے پہلے کی کٹ کردو۔"

اور میرے حجام نے کہا۔ "ان بالوں کا بے دردانہ قتل میں نہ کرسکوں گا آپ اس کے لئے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے حجام کے پاس جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا: یہ لو پانچ روپے۔ اڑھائی روپے بال کٹوائی اور باقی ماندہ رقم بطور رشوت۔ رشوت بھی زمانہ بال تو کیا گھوڑوں کی جڑیں تک کاٹ دیتی ہے۔

حجام صاحب نے بال کاٹنے کی مشین پکڑی اور بڑی بے دردی سے میرے سر اور چہرے پر پھیر دی ؎

ہائے ان چارگرہ بالوں کی قسمت یارب
جن کی صورت میں تھا بیوی کو ہراساں کرنا
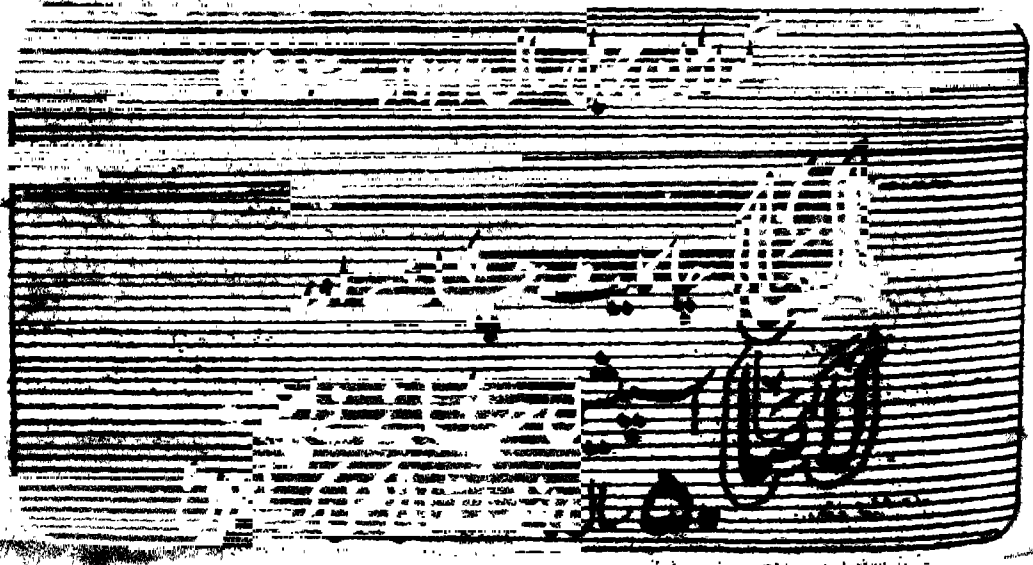
خون کی مانگ ہے...

ہلال سیوہاروی

خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکشا کیلیے
میرے نزدیک یہ قربانی ہے چھوٹی دے دو
لیکن ارباب حکومت سے بھی کہنا ہے مجھے
جن سے خون مانگ رہے ہو انہیں روٹی دیدو
ان غریبوں کا لہو بہہ چکا بن کے پانی
زندگی ہے کہ بہر حال لیے بیٹھے ہیں
خشک ڈھانچوں سے نچوڑو نہ لہو کی بوندیں
خون لو ان سے کہ جو خون پئے بیٹھے ہیں
جن کے چہروں پہ چمکتا ہے غریبوں کا لہو
جن کی آنکھوں میں چھلکتا ہے غریبوں کا لہو
ان کے مے خانوں میں جاؤ تو کبھی رات ڈھلے
ان کے ساغر سے چھلکتا ہے غریبوں کا لہو
مودی و ٹاٹا و برلا کے ٹھکانے دیکھو
خون ہی خون ہے تم ان کے خزانے دیکھو
ان خزانوں میں مروت کا لہو پاؤگے
کسی فن کار کی محنت کا لہو پاؤگے
کسی دوشیزہ کی عصمت کا لہو بھی ہوگا
کسی بیوہ کی امانت کا لہو پاؤگے
سستے داموں جو لیا ہے وہ لہو آج تو لو
ان کے شیشوں میں بھرا ہے وہ لہو ان سے لو
پونجی والو بڑا احسان کیا ہے تم نے
قوم کا دامن صدا چاک کیا ہے تم نے
وقت کی نبض کو پہچان لیا ہے تم نے
آج سونے کا بڑا دام دیا ہے تم نے

اب رہا خون تو وہ اہل جنون دیدینگے
سونا دینے کو جو ہو گا تو یہ خون دیدینگے
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کے لئے
آج ہر ایک کے آگے ہے بھیانک انجام
زر پرستو تمہیں ناموس وطن سے کیا کام
اپنی پونجی سے بنائے رکھو جنتا کو غلام
تم اشاروں پہ نچاتے رہو دنیا کا نظام
تم تو ماحول پہ چھائے ہو لہو کیوں دوگے
تم لہو چوسنے آئے ہو لہو کیوں دوگے
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کیلیے
سرفروشی کے تقاضوں سے گزرنے والے
موت کے سامنے جانے سے نہ ڈرنے والے
شان سے نیفا و لداخ میں لڑنے والے
ہم غریبوں کے سوا کون ہیں مرنے والے
کوئی چنگاری نہیں ہے جو سلگ جاتی ہے
پیٹ کی آگ ہی بارود میں لگ جاتی ہے
برف پر خون کی بوندوں کا جماؤ دیکھو
اپنے ہاتھوں میں وہ قطرات اٹھاؤ دیکھو
دیکھنا ہے تو ذرا رنگ ملاؤ دیکھو
اپنے سونے کی سلاخوں کو تپاؤ دیکھو
گرم ہوکر جو ذرا رنگ نکھر آئے گا
ہم غریبوں کا لہو صاف نظر آئے گا
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکشا کیلیے
دیکھو وہ سامنے مزدور چلے آتے ہیں۔

سخت محنت سے بدن چور چلے آتے ہیں
عیش و راحت سے بہت دور چلے آتے ہیں
گئے رنجور تھے رنجور چلے آتے ہیں
خون تو خون پسینہ بھی نہیں لائے ہیں
وہ بھی دامن میں مشینوں کے بہا آئے ہیں۔
تم نے ان گرد کے ماروں سے لہو مانگا ہے
جنھیں سنسار میں دو دن کی بھی راحت نہ ملی
ان کے خون کی کوئی قیمت ملے ممکن ہی نہیں
آج تک جن کے پسینے کی بھی قیمت نہ ملی
جذبۂ ایثار کا تا حدِ یقیں ہے ان میں
جسم رکھتے ہیں مگر خون نہیں ہے ان میں
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کیلیے
جب خبر تھی کہ اچانک یہ ضرورت ہوگی
تم نے بے وجہ بہا ڈالا فسادات میں خون
جاؤ لاہور و نواکھالی کی سڑکیں دیکھو
جہاں سر پیٹتا پھرتا تھا مذاہب کا جنون
کبھی ہولی کے بہانے تو کبھی عید کے دن
تم نے اس خون کا اک جشن منایا برسوں
آج انساں کے اسی خون کی ضرورت ہے تمہیں
تم نے جس خون کو سڑکوں پہ بہایا برسوں
جاؤ ان فرقہ پرستوں کو جھنجھوڑو جاکر
ان کے دامن میں لہو ہے تو نچوڑو جاکر
خون کی مانگ ہے اس دیش کی رکھشا کیلیے

مجتبیٰ حسین ★

سندباد جہازی کا سفرنامہ

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کے پہلے مجموعہ "تکلف برطرف" (فروری ۱۹۶۸ء) میں کرشن چندر نے لکھا تھا کہ "مجتبیٰ حسین صحیح معنوں میں مزاح نگار ہیں۔ ان کے مزاح میں رچاؤ اور لطافت ہے"۔ ۱

"اگست ۱۹۶۲ء کو مجتبیٰ حسین نے اپنی پہلی مزاحیہ تحریر لکھی۔ پہلا مزاحیہ مضمون "غالب کے طرفدار" ۱۹۶۲ء میں ماہنامہ "صبا" (حیدرآباد) میں چھپا۔ خاکہ نگاری کی ابتداء ۱۹۶۹ء میں حکیم یوسف حسین خان پر خاکہ سے شروع ہوئی۔ اب تک پچاس سے زیادہ خاکے لکھے ہیں۔ خاکوں کے مجموعہ آدمی نامہ (۱۹۸۱ء) میں ۱۵ خاکے شامل ہیں ــــ مجتبیٰ حسین ایک ہی نشست میں مضمون لکھنے کے قائل ہیں۔

تاریخ و سنہ پیدائش ۱۵۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور ۱۹۵۹ء میں ڈپلوما ان پبلک ایڈمنسٹریشن کا امتحان کامیاب کیا ــــ ۱۹۶۶ء میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس کے جنرل سکریٹری رہے۔ جنوری ۱۹۶۲ء میں زندہ دلان حیدرآباد کے جنرل سکریٹری منتخب کئے گئے۔ اب تک مزاحیہ مضامین کے پانچ مجموعوں ۱۔ تکلف برطرف ۲۔ قطع کلام ۳۔ قصہ مختصر ۴۔ بہرحال اور ۵۔ بالآخر کے علاوہ خاکوں کا ایک مجموعہ "آدمی نامہ" اور شیشہ و تیشہ (۱۹۶۳ء) کے زیرِ عنوان مشہور کالم نگار شاہد صدیقی مرحوم کے مزاحیہ کالموں کا ایک انتخاب شائع کیا۔

حضرات! میں سندباد ہوں۔ وہی سندباد جہازی جو سفر کم کرتا تھا اور سفرنامے زیادہ لکھا کرتا تھا بلکہ اکثر سفرنامے سفر کئے بغیر ہی لکھ دیتا تھا۔ میرے سفرنامے اتنے مقبول ہوئے کہ پبلشروں نے مجھے کوئی رائلٹی دیئے بغیر ہی ان کے کئی کئی ایڈیشنس شائع کرلیئے اور میرے کان پر جوں تک نہ رینگنے دی۔ ادھر عرصہ سے پبلشروں کا تقاضہ تھا کہ میں کوئی ایسا سفرنامہ لکھوں جسے زیورِ طبع سے آراستہ کرکے وہ اپنی بیویوں کو زیورِ طلائی سے پیراستہ کرسکیں اور میں بدستور اپنی لنگوٹی میں مگن رہوں۔ پبلشروں کو لاکھ سمجھایا کہ اب میرا

سالی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہاتھ میں لکڑی پکڑتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے لکڑی پکڑ رکھا ہے یا لکڑی نے مجھے۔ پھر یہ عذر بھی پیش کیا کہ عرصہ سے بلا ٹکٹ سفر کرنے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے۔ ٹکٹ خرید کر سفر شروع کروں گا تو اپنی کج کلاہی پر آنچ آئے گی اور فقیرانہ شان الگ متاثر ہوگی لہٰذا اجازت ہو تو حسبِ عادتِ قدیم سفر کئے بغیر ہی سفرنامہ لکھ ڈالوں۔ لیکن پبلشروں کا استدلال یہ تھا کہ جب [illegible] اتنے سارے فرضی سفرنامے لکھ ڈالے ہیں تو اب تجربے کے طور پر عملاً ایک آدھ سفر کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ سوچتا رہا کہ جب سفر کرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ اس مقصد کے لئے کسی اچھے ملک کا انتخاب کیا جائے۔ اسی اثنا میں ملک ہندوستان سے یہ اطلاعیں دھڑا دھڑ ملنے لگیں کہ وہاں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سال فسادات کے بیج بو کر انسانی سروں کی فصلیں کاٹی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور دل بے چین تھا کہ اپنی چشم گنہگار سے ان فسادات کو دیکھوں اور اپنی نظر کو سرور عطا کر دوں۔

اپنے بیرون شمار دوستوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو ایک نے رائے دی "اگر فسادات کو دیکھنا ہی آپ کی منزل مقصود ہے تو امریکہ چلے جائیے۔ وہاں کے (نسلی) فسادات کا دور دورہ ہے (بلکہ دور کم اور دورہ زیادہ ہے)" مگر دوسرے دوست نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "لیکن اگر آپ خالص فسادات دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہندوستان ہی جائیے یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ ان میں کہیں بھی انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اس صفائی سے انسانوں کے سر کاٹے جاتے ہیں اور ان کے جسموں میں چھرے بھونک دئے جاتے ہیں کہ عقل حیران اور نظر دنگ رہ جاتی ہے۔" مجھے بتایا گیا کہ فرقہ وارانہ فساد ہندوستان کا بڑا قدیم کھیل ہے۔ اگر اس کھیل کو نہ دیکھا تو اس دنیا میں پیدا ہونے کا مقصد ہی کیا ہوا۔ ایک اور دوست نے کہا "ویسے ہندوستان میں تاج محل ایلورہ اور اجنتا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن فرقہ وارانہ فسادات کی تو بات ہی جداگانہ ہے!"

اس خیال کے آتے ہی میں نے دوستوں سے سامان سفر مانگنا شروع کر دیا اور اسے باندھ کر ہندوستان کی سیاحت پر روانہ ہوگیا۔ خشکی کے سفر کی بے شمار صعوبتیں جھیل کر اور راستہ بھر سی آئی ڈی کی نظروں سے بچ کر میں بخیر و عافیت ہندوستان پہنچ گیا۔ مگر دوستوں نے کہہ رکھا تھا کہ ہندوستان کو بخیر و عافیت پہنچنا تو بہت آسان ہے لیکن وہاں سے بخیر و عافیت واپس آنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی سرزمین پہ قدم رکھتے ہی مجھے واپسی کی فکر لاحق ہوگئی۔ چنانچہ میں نے اپنا سامان سفر بدستور باندھے رکھا کہ خطرہ کی گھنٹی بجتے ہی میں اسے اٹھا کر واپس بھاگ کھڑا ہو جاؤں۔ میرے قیام و طعام کا یہاں کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا لیکن بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ہندوستان میں خود اہل ہند کے قیام و طعام کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہے۔ وہ تو بس سارے ملک کو ایک سرائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور آخر میں سرائے کا کرایہ بقائے میں رکھ کر اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا میں نے ایک ریلوے پل کے نیچے ایک وسیع اور پُر فضا جگہ اپنے قیام کے لئے منتخب کر لی۔ وہاں میری طرح اور بھی چار مقامی سیاح رہتے تھے جو دن بھر بھیک مانگا کرتے اور رات کو اپنے سفرنامے ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے۔ ہندوستان میں سیاحوں کو درویش کہا جاتا ہے۔ میں بھی ان درویشوں میں یوں شامل ہوگیا جیسے دودھ میں چینی شامل ہوتی ہے۔ ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ لیکن مقامی درویشوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں بیرونی سیاح ہوں اور میرا نام سندباد جہازی ہے تو ان سب نے مل کر قہقہہ لگایا اور مجھ سے کہا "ابتدا میں یہاں آنے والا ہر سیاح اپنے آپ کو سندباد جہازی ہی کہتا ہے۔ تم آٹھویں سندباد ہو۔ چند دن اس ملک میں ٹھہر جاؤ گے تو خود بخود تمہارا

نشہ ہرن ہو جائے گا۔ میں ان درویشوں کی غلط فہمی کو دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ میرے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھاری رقم موجود تھی۔ وہ مجھے اپنی ہی طرح درویش سمجھتے رہے میں نے ان سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہر روز بھیک مانگنے چلوں گا تفریح بھی ہو جائیگی اور پیٹ بھی بھر جائے گا۔ مگر درویشوں نے کہا میں بیرونی درویش ہوں اور اس اعتبار سے ان کا مہمان ہوں۔ اہل ہند مہمان نوازی کے لئے بدنامی کی حد شہرت رکھتے ہیں۔ وہ کبھی مہمان کو بھیک نہیں مانگنے دیتے بلکہ خود بھیک مانگ کر مہمان کا پیٹ بھرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ بڑی آسان قسم کی مہمان نوازی ہے کیوں کہ اس میں میزبان کو ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ طریقہ عمل یہاں اوپر سے نیچے تک رائج ہے۔ اگر عوام کبھی حکومت سے کسی مسئلہ پہ مدد طلب کرتے ہیں تو حکومت جواباً بیرونی ملکوں سے مدد طلب کرتی ہے اور سارا حساب بے باق ہو جاتا ہے۔ گویا اس طرح اہلِ ہند کے کاروبار بالا بالا ہی طے پا جاتے ہیں۔ میں عرصہ تک ان درویشوں کی صحبت سے لطف اندوز اور بھنگ چرس اور گانجہ جیسی مفرح اور مقوی اشیاء کے استعمال میں ید طولیٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں نے ان درویشوں کو اپنے ہندوستان آنے کا کوئی مقصد نہیں بتایا تھا کیوں کہ اہلِ ہند کسی مقصد کے بغیر زندگی گزارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ نہ تو اپنی زندگی میں کوئی مقصد تلاش کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کے مقصد کے بارے میں استفسار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک دن میں نے موقع کو غنیمت جان کر ان درویشوں سے کہا "بھائیو! میں اصل میں آپ کے عظیم الشان ملک کے عظیم الشان فسادات کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں! اسی لئے کوئی ایسی ترکیب کیجئے کہ میں فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کرسکوں"۔

فساد کا نام سنتے ہی درویشوں کے کان کھڑے ہو گئے ایک درویش نے کہا "اے سندباد! تم کوئی بیرونی ایجنٹ نظر آتے ہو ہمیں تمہاری نیت پر شبہ ہونے لگا ہے۔ خبردار جو تم نے ہم درویشوں کے سامنے پھر کبھی فسادات کا ذکر کیا۔ انہی فسادات کی وجہ سے تو ہم درویش بن گئے ہیں اور اس ریلوے پل کے نیچے اپنی بقیہ زندگی کا بقیہ حصّہ گزار رہے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے ہم بھی ہندو اور مسلمان تھے۔ ہم اتفاق سے پڑوسی تھے اور خود ہم نے فسادات میں ایک دوسرے کے گھر جلائے تھے اور ایک دوسرے پر لاٹھیوں سے حملہ کیا تھا لیکن جب ہمارا سب کچھ لٹ گیا اور ہمارے افراد خاندان فسادات میں مارے گئے تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ہندو اور مسلمان باقی نہیں رہے ہیں کیوں کہ نہ تو ہمارے پاس زر و جواہر تھے اور نہ ہی کوئی مال و متاع۔ ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں کہ جس کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت کی جا سکے۔ گویا وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر نفرت کا آشیانہ تھا۔ لہٰذا ہم چاروں درویشوں نے ایک دوسرے کو غربت کے رشتہ میں باندھ لیا۔ اب ہم اس پل کے نیچے رہتے ہیں۔ یہیں آکر ہم اس لئے اچھے پڑوسی بن سکے کہ ہمارے مکان نہیں ہیں۔ ہم اچھے دوست اس لئے بن سکے کہ نفرت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ لہٰذا سندباد تم فسادات کا ذکر نہ کرو کہ ہم اپنی غربت میں مالا مال ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ دوسرے درویش نے کہا "سندباد تمہارا اب ہمارے درمیان رہنا مناسب نہیں ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہم خود تمہارے خلاف فساد نہ کر بیٹھیں۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ اور اس پل کا تخلیہ کر دو ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ دوسرے درویش کی سختی کو محسوس کر کے میں خوف زدہ ہو گیا اور اپنا سامان اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کئی دنوں تک پیدل چلنے کے بعد میں ایک شہر میں پہونچا جو ویرانی اور تباہی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ لوگ سہمے ہوئے اور خوف زدہ سے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا "بھائی آپ کے شہر پر یہ نحوست کیوں برس رہی ہے؟ اس

شخص نے کہا "ابھی دو دن پہلے اس شہر پر فساد نازل ہوا تھا"

فساد کا نام سنتے ہی میری باچھیں کھل اٹھیں۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "کہاں ہو رہا ہے فساد! مجھے وہاں لے چلئے میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے یہاں اسی لئے تو آیا ہوں۔ مجھے فوراً فساد کے پاس لے چلیئے"

اس شخص نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ بھلا فساد بھی کوئی ٹکنے والی چیز ہے وہ بس آندھی کی طرح آتا ہے اور بگولہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ میں نے پوچھا "پھر کب آئے گا فساد اس شہر میں؟"

وہ بولا "ابھی ابھی تو فساد نے سارے شہر میں جھاڑو سی پھیر دی ہے۔ جب تک یہ شہر از سرِ نو ترقی نہیں کر لے گا اور یہاں کے لوگ خوش حال نہ ہو جائیں گے اس وقت تک یہاں فساد کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا آپ فساد کو تلاش کرنے کے لیئے کسی خوش حال اور آباد شہر کی طرف چلے جائیں۔ اس وقت تو فساد نے اس شہر کو لیموں کی طرح نچوڑ لیا ہے اور انسانی سروں کی فصل کٹ چکی ہے پھر فسادات کے ماہرین بھی اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے آباد شہروں کی طرف چلے گئے ہیں۔

میں بہت مایوس ہوا اور دوسرے شہر کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ فسادات کے اور میرے درمیان اچھی خاصی آنکھ مچولی جاری تھی میں ہر روز اخبار کا مطالعہ کرتا اطلاعیں ملتیں کہ فلاں شہر میں فساد ہو گیا فلاں گاؤں میں اتنے مکانات جل گئے فلاں شہر میں کئی سو افراد نے بیک وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور داعیٔ اجل کا کام بڑھا دیا مگر افسوس کہ میرے پہنچنے تک فسادات کی تباہی ختم ہو چکی ہوتی اور امن کمیٹیوں کی تباہیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں ایک ایک شخص سے فسادات کا پتہ پوچھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں تقریباً مایوس ہو گیا مجھے اپنا وطن بے ساختہ یاد آنے لگا اور میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا تھا کہ ایک دن اچانک میری ملاقات ایک شخص سے ہو گئی جسے لوگ اپنا لیڈر سمجھتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اس لیڈر سے جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوا مگر بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس کی خوشی صرف ایک سیاسی چال تھی۔ اس لیڈر کی غذا یہ تھی کہ وہ صبح میں اپنے نام کے ساتھ "زندہ باد" کے نعرے سنتا۔ دوپہر میں اپنے حواریوں کی چاپلوسی سے لطف اندوز ہوتا اور رات میں وہ سارے کام کرتا جن کے کرنے کے لئے قدرت نے رات بنائی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں سندباد جہازی ہوں تو اس نے دوسرے کمرہ میں جا کر اپنے سکریٹری سے سندباد جہازی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کمرہ سے نکل کر میرے سفرناموں کی تعریف کرنے لگا۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کو میرا کون سا سفرنامہ زیادہ پسند آیا تو وہ پھر اپنے سکریٹری کے کمرہ کی طرف چلا گیا اور واپس آکر کہنے لگا۔ "میرے سکریٹری کو اب یہ یاد نہیں رہا کہ مجھے آپ کا کونسا سفرنامہ پسند آیا تھا۔ تاہم میں نے سکریٹری سے کہہ رکھا ہے کہ وہ شام تک کوئی سفرنامہ پسند کر کے آپ کو اس کی اطلاع دیدے"

اس لیڈر سے میری گفتگو نہ صرف دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز بھی رہی۔ باتوں باتوں میں میں نے اس لیڈر سے اپنے ہندوستان آنے کا مقصد بیان کیا اور شکایت کی کہ آپ لوگ اپنے شہرۂ آفاق فسادات کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق کیوں نہیں کرتے تاکہ سیاحوں کو فسادات کے انعقاد کی پہلے سے اطلاع مل جائے تو وہ وقتِ مقررہ پر پہنچ کر ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔ پھر میں نے کہا کہ میں نظارہ کرنے کی غرض سے ہندوستان آیا تھا لیکن فسادات ہمیشہ ایسے شہروں میں ہوتے رہے جو مجھ سے دور واقع تھے۔ اب یہ حسرت اپنے دل میں لے کر ہی اس ملک سے جا رہا ہوں۔

میرے اس بیان کو سُن کر لیڈر نے زور دار قہقہہ لگایا اور بولا "مسٹر سندباد آپ تو بڑے معصوم آدمی نظر آتے ہیں! جی فسادات کو دیکھنا کونسا مشکل کام ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے تو میں کل ہی اس شہر میں ایک فساد کروا دیتا ہوں۔ ہم ہندوستانی اپنے مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ میں اتنا بڑا لیڈر ہوں کیا میں آپ کی اتنی چھوٹی سے آرزو بھی پوری نہیں کر سکتا؟"

لیڈر کی اس تقریر دلپذیر کو سن کر میں گیند کی طرح اچھل پڑا اور بولا "لیڈر صاحب میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی ۔۔۔ ب میں اطمینان سے آپ کے ملک کے فسادات کو دیکھ کر اپنے وطن واپس جاؤں گا۔ اور بقیہ زندگی سفرنامہ لکھنے میں گنوا دوں گا؟"

اس پر لیڈر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مسٹر سندباد مگر یہ بتائیے کہ آپ کس قسم کا فساد دیکھنا پسند کریں گے؟" میں نے پوچھا "آپ کے پاس فساد کی کتنی قسمیں ہیں؟" وہ بولا "اے کلاس سے لے کر زیڈ کلاس تک فسادات کی کئی قسمیں ہیں افواہی فساد۔ تباہی فساد۔ خواہ مخواہی فساد۔ واہی تباہی فساد۔ ایک قسم ہو تو گناؤں بھی۔ یہ بتائیے کہ آپ سیدھا سادا فساد دیکھنا پسند کریں گے یا ایک دم ہنگامہ خیز" میں نے پوچھا ان دونوں فسادات میں کیا فرق ہے؟" وہ بولا سیدھا سادا فساد اصل میں ہنگامہ خیز فساد کا ٹریلر ہوتا ہے اس میں صرف دکانات اور مکانات جلائے جاتے ہیں۔ باشندوں کی تھوڑی سی ہڈیاں اور پسلیاں توڑی جاتی ہیں اور اگلے فساد کی تمہید باندھی جاتی ہے۔ ہنگامہ خیز فساد ایک دم ٹاپ کلاس ہوتا ہے۔ اس میں دکانات اور مکانات جلانے کے علاوہ انسانوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے۔ ان کے پیٹوں میں چھرے بھونکے جاتے ہیں بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی عصمتیں بڑے اہتمام سے لوٹی جاتی ہیں، یہ فساد (ONLY FOR ADULTS) ہوتا ہے الغرض بڑا ہی لطف آتا ہے؟"

میں نے کہا جب اتنی دور سے آیا ہوں تو اے کلاس فساد کو دیکھنا ہی پسند کروں گا۔ بار بار ایسا موقع پھر کہاں ملے گا۔"

لیڈر نے کہا تو گویا بات پکی ہو گئی سمجھئے۔ آپ کو اس فساد کے انعقاد کے لئے ۳۰ ہزار روپے دینے ہوں گے تاکہ میں فسادیوں کو تیار کر سکوں آپ اطمینان رکھیں کہ اگر آج آپ فساد کا آرڈر ہمارے پاس بک کرائیں تو کل شام تک فساد تیار ہو جائے گا" میں نے خوشی خوشی ۳۰ ہزار روپے نکال کر لیڈر کو دیدیئے۔ اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو بلوایا اور ان کے ہاتھوں میں کرنسی نوٹ رکھتے ہوئے بولا "میرے دوست سندباد ایک دم اے کلاس فساد دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم لوگ کل شام تک فساد کے انتظامات مکمل کر لینا۔ کل شام میں ٹھیک چھ بجے مسٹر سندباد شہر کے چوک میں فساد کو دیکھنے آئیں گے وہ ہمارے مہمان ہیں ان کا خیال رکھنا؟" جب اس کے آدمی چلے گئے تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور فسادات کے بارے میں اس سے مختلف استفسارات کرنے لگا۔

میں نے پوچھا آپ ہندوستانی اس قدر آسانی سے کس طرح فساد برپا کر لیتے ہیں یہ بھی کمال ہے! وہ بولا "فساد برپا کرنا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ برسوں کے ریاض کے بعد اب ہم نے اس فن میں وہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ کسی وجہ کے بغیر ہی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ فساد کے لیئے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان دونوں کے اتحاد کے بغیر فساد کا ہونا ناممکن ہے۔ اگر ایک ہندو نے کسی مسلمان کی طرف گھور کر دیکھا تو یہ بات خود ایک ہنگامہ خیز فساد کے لیئے بہت کافی ہے۔ ہندو اور مسلمان کی بات تو چھوڑیئے۔ اگر کسی مسلمان کے کتے نے کسی ہندو کے کتے پر بھونکنا شروع کیا تو سمجھ لیجئے کہ فساد کی بنیادیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ جب ۔۔۔ ے دوسرے پر بھونکنا ختم کر دیں گے تو ان کے مالکین ایک دوسرے پر بھونکنے لگ جائیں گے اور بھونکنے کی یہ وبا اتنی عام

ہو جائے گی کہ فضا میں شور و غل مچ جائے گا اور اگر ایسے میں کسی منچلے نے مذاق مذاق میں اپنا چاقو کسی کے پیٹ میں اتار دیا تو سمجھ لیجئے کہ فسادات کا باقاعدہ افتتاح ہو گیا ہے۔

میں بڑی دیر تک اس لیڈر سے فسادات کے بارے میں تفصیلات حاصل کرتا رہا اور اپنے سفرنامے کے اہم نوٹس لیتا رہا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں دوسرے دن ٹھیک چھ بجے شہر کے چوک میں موجود رہوں اور حسب استطاعت فسادات کا نظارہ کروں۔ میں نے لیڈر سے رخصت ہو کر رات ایک کباڑ خانے میں گزاری اور دوسرے دن صبح ہی سے ہندوستان کے شہرہ آفاق فسادات کا دیدار کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

شام کو چھ بجے مقررہ وقت سے کچھ منٹ پہلے جب میں چوک میں پہونچا تو خوب چہل پہل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فساد کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں مجھے لیڈر نے دھوکہ نہ دیا ہو۔ دور دور تک اس کے آدمی نظر نہیں آتے تھے زندگی بڑی حسین نظر آ رہی تھی۔ میں چوک کے کلاک ٹاور پر چڑھ گیا تاکہ محفوظ مقام سے فسادات کا نظارہ کر سکوں۔ چھ بجنے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا کہ اچانک سڑک پر ایک اسکوٹر کی ٹکر دوسری اسکوٹر سے ہو گئی۔ کسی نے چیخ کر کہا "جس اسکوٹر نے ٹکر دی ہے وہ مسلمان اسکوٹر ہے" کسی نے کہا جی نہیں یہ ساری کارستانی ہندو اسکوٹر کی ہے۔ ہم اپنے مذہب پر اتنے بڑے حملہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ میں نے کلاک ٹاور پر سے دیکھا کہ دونوں اسکوٹروں پر لیڈر کے آدمی سوار تھے اور جو اصحاب شور و غل مچا رہے تھے وہ بھی لیڈر کے آدمی ہی تھے۔ میں کلاک ٹاور پر سے چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ میں دھوکہ دہی کے ذریعہ ہونے والے فساد کو نہیں دیکھنا چاہتا کہ اسی اثناء میں ایک چاقو فضا میں چمک اُٹھا۔ پھر آن کی آن میں کئی چاقو فضا میں لہرانے لگے۔ برچھے اور بھالے بھی فضا میں بلند ہوئے۔ ہندو چاقو مسلمان کی گردن تلاش کرنے لگا اور مسلمان چاقو ہندو کی گردن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ہندوستان کے مشہور و معروف فسادات کو دیکھنے کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔ آج دل کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ انسانوں کے سر اس قدر صفائی سے کٹ رہے تھے کہ میں عش عش کرنے لگا ایک فسادی نے ایک کمسن بچے کو اس کمال سے اپنے نیزے پر اُٹھا لیا کہ میرے منہ سے بے ساختہ تعریف نکل گئی۔ میں نے اس کے فن پر یوں داد دی جیسے اس نے کوئی شعر کہہ دیا ہو۔ اس نے میری تعریف کے جواب میں مودبانہ سلام کیا تو میں نے چیخ کر کہا "مکرر ارشاد ہو" اس پر اس نے جھپٹ کر ایک اور بچہ کو نیزے پر اٹھا لیا مجھے اس کا وار کچھ زیادہ پسند نہ آیا تو میں نے ہوٹنگ کے انداز میں اس سے کہا "اب مقطع کی طرف آ جائیے۔ وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کلاک ٹاور کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت تک شہر کے چوک میں کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے اور بازار میں صرف انسانوں کا خون بک رہا تھا میں ابھی اچھی طرح فسادات کا نظارہ کر بھی نہ پایا تھا کہ وہ فسادی کلاک ٹاور پر چڑھ گیا۔ وہ میرے سر پر آن کھڑا ہوا اور اپنا نیزہ بلند کر کے مقطع ارشاد کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے گڑگڑا کر اس سے کہا "میں بیرونی باشندہ ہوں میں تو صرف فساد کو دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہوں مجھے نہ مارو" اس پر اس نے پوچھا "بتاؤ تم ہندو یا مسلمان ؟"

میں نے کہا "میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں تو صرف ایک انسان ہوں" اس پر وہ بولا "جب تک آدمی ہندو یا مسلمان نہ بنے اس وقت تک وہ انسان کیسے بن سکتا ہے" تب میں نے کہا "لیکن ہندو اور مسلمان بننے کے بعد تو انسان انسان کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ گاجر اور مولی میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے"

میری گستاخی کا جواب نیزے سے دینا چاہتا تھا کہ میں نے اچانک اس لیڈر کا حوالہ دیا جسے میں نے فساد کے لئے بھاری رقم دی تھی۔ لیڈر کا نام سن کر اس نے نیزہ اپنے ہاتھ سے پھینک دیا مگر اسی اثناء میں دوسرے فسادیوں نے مجھے نرغے میں لے لیا میں نے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے ایک بار لیڈر سے مل لینے دو۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو چاہو سلوک کر لینا۔ وہ سب مجھے دھکے دے کر اپنے لیڈر کے پاس لے گئے لیکن لیڈر اس وقت بہت مصروف تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ امن کمیٹی کا صدر نشین بن گیا ہے اور کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا وہ فساد میں ہلاک ہونے والوں کی یاد میں اپنی آنکھوں سے خشک آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے کہا "فسادات ہمارے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے" میں حیران نظروں سے اس لیڈر کو یوں دیکھتا رہا جیسے اُسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد لیڈر نے اعلان کیا "میں اس تباہی سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے اپنی طرف سے ریلیف فنڈ میں ۱۰ ہزار روپے کا عطیہ دیتا ہوں۔" اس پر سارے ہال میں تالیاں گونج اٹھیں۔ لیڈر کی جے جے کار ہونے لگی۔ اور میں تالیوں کی گونج میں پکارتا رہا "حضور! میں نے آپ کو ۳۰ ہزار روپے دیئے تھے آخر بقیہ ۲۰ ہزار آپ نے صرف اپنے ریلیف کے لئے کیوں رکھ لئے؟"

لیکن میری آواز کا وہی حشر ہوا جو نقار خانہ میں طوطی کی آواز کا ہوتا ہے۔ میں نے لیڈر سے اپنی دی ہوئی رقم کا حساب پوچھنے کا خیال ترک کر دیا کیوں کہ اس وقت میرے کانوں میں خطرہ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں فسادیوں کی نظر بچا کر بھاگ کھڑا ہوا اور کئی دنوں تک بھاگتا رہا۔ ایک دن میں بالآخر اپنے وطن پہونچ گیا لیکن مجھے اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مسلسل بھاگ رہا ہوں اور فسادی میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ اب ہندوستان کے تاج محل ایلورہ اور ایجنٹہ تو مجھے یاد نہیں رہے۔ ہاں صرف وہاں کے فسادات کی یاد تازہ ہے اور اس قدر تازہ ہے کہ میں اکثر نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور چیخنے لگتا ہوں۔

مجھے لیڈر سے ایک بار مل لینے دو!!

اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سارا وجود ایک ایسا نیزہ بن گیا ہے جس پر ایک معصوم بچہ کا سر لٹکا ہوا ہے۔

ذائقہ میں لذیذ عمدہ اور تازہ ترین بسکٹ ڈبل روٹی اور گرماگرم انڈا کری قیمہ کری اور ترکاری کے کری پف کے لئے ہمیشہ یاد رکھئے

بیکریوں کی دنیا میں نیا اور واحد نام

ہائی کلاس بیکرس اینڈ کنفکشنرس

افضل گنج حیدرآباد۔ فون نمبر ۵۱۷۰۸

کرسمس کیک ۔ ویڈنگ کیک ۔ سالگرہ کیک ۔ نئے اور انوکھے انداز و ڈیزائن میں ذائقہ دار آرڈر پر سپلائی کئے جاتے ہیں ۔

پرانے شہر کے دو شہرت یافتہ اور تاریخی نام

چارمینار اور نواز بیکری

جہاں آپ کو اپنی پسند کے ذائقہ دار ۔ کیک ۔ پیسٹری ۔ پلم کیک ۔ فروٹ بسکٹ ۔ فروٹ ڈبل روٹی ۔ سادہ بسکٹ ۔ ہمہ اقسام کے کری پف ۔ تازہ بہ تازہ استعمال کیجئے

یاد رکھئے

نواز بیکری شاہ علی بنڈہ روبرو مغل پورہ روڈ حیدرآباد

شمسی مینائی

قطعات

دھرتی پہ رہ کے چاند پہ قبضہ کریں گے ہم
راکٹ کی شرط ہے نہ ضرورت دیان کی
ہم کیوں اڑیں فضاؤں میں، مصیبت اٹھائیں کیوں
مہنگائی لا رہی ہے خبر آسمان کی

○

اہلِ وطن کا شوق یہاں تک بدل گیا
چوری چھپے کی بات بھی محفل میں آ گئی
کیا حوصلے کے لوگ ہیں ہندوستان میں
رشوت بھی اختیار کی منزل میں آ گئی

○

یہ کلیجہ ہے اپنے بھارت کا
جسم پھیلا ہے دل بستی ہے
ظلم ہی ظلم ہر طرف لیکن
"پیار ہی پیار" فلم بنتی ہے

○

نعروں پہ عمل کوئی ضروری تو نہیں ہے
ہر چیز کو سرکار کی جاگیر بنا دو
اب تم سے غریبی تو ہٹائی نہیں جاتی
بہتر تو یہی ہے کہ غریبوں کو مٹا دو

○

ناظم انصاری

ناظم انصاری ۱۹۲۹ء میں ناگپور میں پیدا ہوئے۔ اِن دنوں پرنٹنگ پریس چلاتے ہیں۔ مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے سارے ملک میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے مزاحیہ اشعار میں خالص غزل کا انداز ملتا ہے۔ ایک مجموعۂ کلام "گوبھی کے پھول" شائع ہو چکا ہے۔

غزل

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں

کھائی تھی میں نے جینے کی جن کے لیے قسم
وہ کر گئے وفات ارے باپ کیا کروں

سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی ابھی کہ پھر
ماری ہے اس نے لات ارے باپ کیا کروں

ہر روز روزِ عید ہے بیگم کے واسطے
ہر شب، شبِ برات ارے باپ کیا کروں

بالغ ہوا ہوں صوفی و ملا کی گینگ میں
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی رات ارے باپ کیا کروں

اس نے یہ کہہ کے ملنے سے انکار کر دیا
ناظم ہے واہیات ارے باپ کیا کروں

ساغر خیّامی

علاء الدین کا تربوز

گنوا ہی دیں گے کسی روز جان دِلّی میں
تلاش کرتے ہوئے ہم مکان دِلّی میں

تمام دن کے سرِ راہ ہم تھکے ہارے
شکم میں چوہے اچھلتے تھے بھوک کے مارے

بڑا تھا میرا شکم دوستو میں کیا کرتا
رقم تھی جیب میں کم دوستو میں کیا کرتا

چلا خرید کے تربوز سوئے دشت حقیر
لگی جو پاؤں میں ٹھوکر سنور گئی تقدیر

غمِ حیات کی راتوں میں دن نِکل آیا
چھٹا جو ہاتھ سے تربوز جن نکل آیا

ادب سے بولا کہ ادنیٰ غلام ہوں ساغر
جو ہو سکے نہ کسی سے وہ کام ہوں ساغر

اشارہ ہو تو میں رُخ موڑ دوں زمانہ کا
بنا دوں تم کو منیجر یتیم خانے کا

مرے سبب سے لطیفہ مشاعرہ ہو جائے
پلک جھپکتے میں شاعر بھی شاعرہ ہو جائے

گناہ و شرک کی راتوں میں آفتاب ملے
عبادتیں کریں مُلّا تمہیں ثواب ملے

اگر میں چاہوں ملمٹی سے رس بھری ہو جاؤ
بغیر تیر چلائے پدم شری ہو جاؤ

جو حکم ہو تو میں مُردے میں جان دلوا دوں
میں عہدِ پیری میں بیوی جوان دلوا دوں

بجائیں سیٹیاں اب تلخیاں زمانے کی !
یہ پکڑو کنجیاں قارون کے خزانے کی

میں آدمی نہیں دشمن سے ساز باز کروں
اگر میں چاہوں تو احمق کو سرفراز کروں

نہیں ہے دل کی تمنا جہان دلوا دے
میں ہاتھ جوڑ کے بولا مکان دلوا دے

یہ کہہ کے گھس گیا، تربوز میں وہ کالا جن
عجیب وقت ہے بگڑے ہوئے ہیں سب کے دن

یہ سرد سرد فضاؤں کا غم نہ سہتے ہم
مکاں جو ملتا تو تربوز میں نہ رہتے ہم

جیلانی بانو

یہ کون ہنسا

ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار جیلانی بانو، اردو کے نامور شاعر علامہ حیرت بدایونی کی صاحبزادی ہیں۔ انھیں اپنے آبائی وطن بدایوں اور شہر حیدر آباد سے بے حد پیار ہے۔ ان کے افسانے سویرا، افکار، نقوش، نیا دور، فنون، اور شاہراہ میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا افسانہ "ایک نظر ادھر بھی" ادب لطیف (لاہور) کے سالنامہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جیلانی بانو کے نقطۂ نظر کے مطابق افسانہ میں پہلا جملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا افسانہ "پرایا گھر" بی۔ بی۔ سی سے نشر ہو چکا ہے اور عالمی کہانیوں کے مجموعہ میں شامل ہے۔ اس افسانہ کا محرک یہ جملہ ہے جو انہوں نے ایک شخص کو اپنے کسی دوست سے کہتے ہوئے سنا تھا: "جاؤ جاؤ خدا حافظ۔ اپنے گھر جانا نہ بھولنا"۔ جیلانی بانو کے افسانوں میں زندگی کی حرارت اور عصری حسیت ہے طنز و مزاح ان کا ایک پسندیدہ موضوع ہے۔ انھیں موسیقی اور پینٹنگ کا بھی ذوق ہے۔ وہ ڈرامے بھی لکھتی رہی ہیں۔ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ "اکیلا" زیر ترتیب ہے۔

تاریخ و سنہ پیدائش ۱۱ جولائی ۱۹۳۶ء مقام پیدائش۔ بدایوں (یو پی)

ابھی محققوں نے اس راز سے پردہ نہیں اُٹھایا ہے کہ انسان نے ہنسنا کب سے شروع کیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہنسنا انسان کا قدرتی فعل نہیں، اکتسابی ہے۔ بلکہ یقین کامل ہے کہ پہلی بار انسان اپنے سے کمتر انسان کو دیکھ کر حقارت سے ہنسا ہوگا کیوں کہ ہنسنا ایک سماجی ضرورت ہے۔ فرض کیجئے آپ کے پاس غریب پڑوسی ہوں نہ آپ کے مقابلے میں الیکشن ہارنے والے حریف تو آپ کس پر ہنسیں گے؟ جس طرح ہر شخص صرف اپنے غم پر روتا ہے۔ اسی طرح ہنسی دوسروں پر آتی ہے جو لوگ اپنے پر ہنسنے کی جرأت نہیں کر سکتے وہ دوسروں پر ہنسا کرتے ہیں۔ البتہ یہ سنا ہے کہ غالب کو اول اول اپنے حال دل پر ہنسی آیا کرتی تھی۔ ابد میں وہ بھی کسی بات پر نہ ہنس سکے۔

اگر آپ دوسروں پر ہنستے ہیں تو یہ ایک دلچسپ بات ہے۔ لیکن اگر کوئی آپ پر ہنس رہا ہے تو یہ بداخلاقی کہلاتی ہے۔ لوگ تلوار کی دھار سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا جگ ہنسائی سے ڈرتے ہیں۔ بلکہ غور کیجئے تو ہمالیہ کی فتح چاند پر راکٹ کا پہونچنا اور لائن میں کھڑے ہو کر کسی پکچر کا ٹکٹ حاصل کرنا، ان تمام فتوحات کے پس پردہ صرف ایک خوف کا احساس کام کر رہا تھا۔ لوگوں کی ہنسی کا خوف۔ اگر لوگ کسی کی ناکامی پر ہنسنا شروع کر دیں تو ہمارے معاشرے میں ایک زبردست انقلاب آجائے۔ لوگ لڑکیوں کو جہیز دینا نہ کار خریدیں، عورتیں ساڑیاں اور میک اپ کا سامان خریدنا بند کر دیں۔ اور مرد فریج اور ٹیلی ویژن کو زندگی کی ضرورت نہ سمجھیں کیوں کہ ان تمام لوازمات کی ضرورت تو صرف اسی لئے ہے کہ لوگ ہم پر نہ ہنسیں۔ عورت اور مرد کی ہنسی میں فرق ہے۔ مثلاً عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ "ہنسی اور پھنسی" لیکن مرد صرف اُس صورت میں ہنستے ہیں جب "پھانسے" میں آچکے ہوں۔

ہنسی کی بے شمار قسمیں ہیں۔

طنزیہ ہنسی وہ ہے جو آپ کی ترقی کی خبر پر آپ کے دوستوں کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ دلکش ہنسی ہر اس عورت کی ہوتی ہے جو آپ کی بیوی نہیں ہے۔

غمناک مسکراہٹ چہرے پر اُس وقت آتی ہے جب آپ کی بیوی شاپنگ کر کے لوٹی ہو خطرناک مسکراہٹ وہ ہے جو کھلونوں کی دکان پر آپ کے بچے کے چہرے پر نظر آتی ہے۔

ایک صاحب ہنسی پر ریسرچ کر رہے ہیں وہ پردے کے پیچھے کسی کو ہنستے ہوئے سن کر بتا سکتے ہیں کہ یہ آدمی کنوارا ہے یا شادی شدہ کلرک ہے یا باس ــــ شاعر ہے یا سامع۔ ہنسی کی طبیبوں نے مختلف خاصیتیں بتائی ہیں مثلاً بعض مریضوں پر ہنسی جلتے پر تیل کا کام کرتی ہے۔ اور ان کا مرض دوگنا ہو جاتا ہے اس لئے کسی کو ہنستے دیکھ کر ہرگز غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ حملے کے جواب میں ایک عدد قہقہہ پیش کرنا ضروری ہے۔

آج کل ڈاکٹر لوگ دواؤں کے ساتھ نسخے میں ہنسی کی کچھ مقدار بھی شامل کر دیتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ ہنسی زندگی بڑھاتی ہے لیکن میں ایک خاتون سے واقف ہوں جنھیں ہنسی سے بے حد نفرت تھی اتنی کہ ایک بار وہ اپنی بہو کو ہنستے دیکھ کر بیہوش ہوگئی تھیں۔

مگر کچھ لوگ دواؤں کے عادی ہو جاتے ہیں، جب تک وہ صبح اُٹھ کر وٹامن اے۔ بی۔ سی ڈی نہ کھائیں وہ کھڑے نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس لئے وہ کڑوی دوا کی طرح سبزیاں نگلتے ہیں۔ اور ٹکٹ لے کر ہنسنے کے لئے کسی اندھیرے ہال میں جاتے ہیں اور بار بار اپنے پڑوسیوں سے پوچھتے ہیں۔ "کیا ہوا ــــ! ابھی آپ کس بات پہ ہنسے تھے؟"

ایک بار ہم نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ اندھیرے ہال میں بیٹھے ہیں اور اسٹیج پہ ہونے والے پروگرام کی بجائے پیچھے مُڑ مُڑ کر ہنسنے والے چہروں کو دیکھ رہے ہیں ــــ میں نے تعجب سے پوچھا ــــ "آپ یہاں کہاں ــــ؟" مُسکراتے ہوئے بولے۔

کیا کروں بیٹا ڈاکٹر نے ہنسنے کی ہدایت کی ہے مگر دل میں درد ہو رہا ہے۔ بیٹھا نہیں جاتا۔
ایسے ہی ایک اور صاحب ہنسی کی تلاش میں آئے اور فرمائش کی۔

"کوئی لطیفہ سناؤ"

ہم نے لطیفہ عرض کیا ـــــ "ایک صاحب کسی کے ہاں دعوت میں گئے میزبان کی بیوی نے کھانے کی میز پر ڈش میں بطخ لاکر رکھی اور خود سامنے بیٹھ گئی۔

مہمان نہایت انکساری سے کہنے لگے۔ "اچھا تو اس بطخ کے سامنے میں ہی بیٹھوں گا ـــــ ؟ اور پھر گھبرا کر بولے "میرا مطلب اس روسٹ کی ہوئی بطخ سے ہے۔"

"ہاں تو پھر کیا ہوا ـــــ ؟" ان صاحب نے دلچسپی سے پوچھا۔
"ہوا نہیں بلکہ یہ ہوگا کہ اب کی بار آپ اچھے نہیں ہو سکیں گے۔"

ہم نے انھیں آگاہ کیا۔ ان صاحب کے جانے کے بعد ہنسی کی اس قلت پہ سخت تشویش ہوئی کہ کہیں بادام کی طرح ہنسی بھی ہمارے دیش سے غائب نہ ہو جائے۔ کیوں کہ نہ ہم سرکار کی توجہ اس جانب دلائیں کہ پرانے کھنڈروں، مورتیوں اور مخطوطوں کے ساتھ ساتھ ہنسی کے تحفظ کے لئے بھی منصوبے بنائے جائیں۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ کسی دل کے مریض کے لئے بیس میک کے ساتھ ساتھ ہنسی کے انجکشن بھی یورپ سے منگوانا پڑے اور کہیں ہنسی کی آواز سن کر ہم چونک پڑیں کہ یہ کون ہنسا۔ ▲▲

زندہ دلانِ حیدرآباد کے پندرھویں سالانہ اجتماع پر
نیک تمناؤں کے ساتھ

کنگ انٹرپرائزس

اکسپورٹ اینڈ اوورسیز مینجمنٹ سروسیز

۲۸۔ ریڈی ہاسٹل کامپلکس ـــ روڈ حیدرآباد

علی صائب میاں

فائن آرٹس اکیڈمی کے ادبی شعبہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کی طرف سے بزرگ طنز و مزاح نگار علی صائب میاں کے کلام کا مجموعہ "کھوکرو کے کانٹے" فروری ۱۹۶۸ء میں شایع ہوا۔

علی صائب میاں کے "کھوکرو کے کانٹے" اور رضا نقوی واہی کے مجموعۂ کلام کی ۱۹۶۸ء میں اشاعت سے زندہ دلانِ حیدرآباد نے اپنی مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ سید غلام علی صائب میاں نے اپنے اس مجموعہ کو اردو کے صاحبِ طرز اور اپنے رنگ کے منفرد طنزیہ و مزاحیہ شاعر نذیر احمد دہقانی کے نام معنون کیا ہے۔ حیدرآباد علی صائب میاں کا مولد ہے، ان کی فوقانی تعلیم اشرف المدارس اور چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا لیکن بی۔ اے کی تکمیل نہ ہو سکی۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے زائد از نصاب مصروفیات میں دل کی بھڑاس نکالنے کی حد تک جی کھول کر حصہ لیا۔ انھیں ڈراموں میں حصہ لینے سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ وہ تقریباً بیس سال تک پرنس نواب اعظم جاہ بہادر کے متعلقین سے وابستہ رہے۔ علی صائب میاں دکنی کے اہلِ زبان شاعروں کے سرخیل ہیں۔ انہی کے دور میں نذیر احمد دہقانی اور اعجاز حسین کھٹا بھی شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ علی صائب میاں نے فطری صلاحیت استعداد کی بنا پر اس میدان میں اپنی انفرادیت کا لوہا جلد منوا لیا۔ آج بھی وہ قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دکنی زبان کے گھریلو محاوروں پر ان کی نظر گہری ہے۔ لسانی اعتبار سے علی صائب میاں کے کلام کی اہمیت مسلّمہ ہے۔

ہڈیاں ٹوٹے تلک تو ایڈیاں کراتے رہے
گنڈوں کی بات آئی تو بھرکیاں پھرلتے رہے
عمر تمام یہونچ کٹی علی صاب کی!
اماں کا کھاسے ماموں کی بکریاں چراتے رہے

○

مجنوں عشق کی لاج تلک نئیں بچا سکا
لیلیٰ کو اپنے دل میں اُتنے نئیں رچا سکا
کتّے کے سر کا بھوکتا جنگلے جنگل پھریا
عشق کی کھیرپی گیا پن نئیں پچا سکا

○

عشق وہ بھی شرط کے ساتھ تھوٗ ہے
نہر کھودیا کتے دن رات تھوٗ ہے
ارے فرہاد عشق میں اِتّی روتنڈی
مریا سر پھوڑ کو کم ذات تھوٗ ہے

○

آنگ میں سوٹ، مُنہ میں جھوٹ ہے دیکھے
بھائی بھائی میں پھوٹ ہے دیکھے!!
جس کو دیکھو ہے مطلبی بندہ
دُنیا کِتّی لپوٹ ہے دیکھے؟

نریندر لوتھر

★

پیدائش ۱۹۳۲ء پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ بعد میں برٹش کونسل کے وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے۔ ۱۹۵۵ء میں آئی اے ایس کے لئے چُنے گئے۔ تب سے حکومت آندھرا پردیش اور حکومت ہند کے محکمہ جات میں مختلف عہدوں پر کام کر چکے ہیں۔ متعدد بیرونی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں لیبیا کی حکومت کے صنعتی مشیر بن کر وہاں گئے۔ اُردو، ہندی اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح سے خاص دلچسپی ہے۔ کہانیوں اور مضامین کا پہلا مجموعہ "بند کواڑ" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مزاج پُرسی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سرگرمیوں سے ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے آجکل اس ادارہ کے صدر ہیں۔ اور حکومت آندھرا پردیش کے معتمد برائے پبلک انٹرپرائزس ہیں۔

ٹیلی فون انسان کی ایک بہت ہی معرکتہ الآرا ایجاد ہے۔ انسان کو ایک دوسرے کے پاس لانے میں اس نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ٹیلی فون کے تار نے انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ سمندر پار سے سیکڑوں میل دُور سے انسان ایک دوسرے سے بات کر سکتا ہے۔ ہر نئی چیز مثلاً ریڈیو، موٹر سیکل اور بجلی کے پنکھے کی طرح فون بھی رُتبے کی علامت (STATUS SYMBOL) ہے۔ ایک زمانہ تھا جب صرف ٹکڑ والے نیواڑی ہی کے پاس ریڈیو تھا۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہتر قسم کا بھکاری بھی اپنے ساتھ ٹرانسسٹر رکھتا ہے: بجلی کا پنکھا تو آج کل تھرڈ کلاس ڈیٹنگ ہال میں بھی لگ گیا ہے اور موٹر سیکل جو کسی وقت صرف تھانے داروں کے پاس ہوا کرتی تھی، آج کل بیشتر بے کار نوجوانوں کے پاس بھی ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں

درجہ کے (STATUS SYMBOL) ہیں۔ لیکن ٹیلی فون کا شمار موٹر کار، بنگلے، کلب، کُتّے اور کاک ٹیل کے ساتھ اول درجہ کے ی.ی میں ہوتا ہے کسی پرانی کتابیں بیچنے والے یا ڈرائی کلینر یا چپل فروش کے پاس فون ہو تو بیچارے فون پر ترس آجاتا ہے۔ اس کو جکڑ کر تالا لگا کر ایسے رکھا جاتا ہے جیسے اس کو قید با مشقّت کی سزا ملی ہو۔ کئی لوگ فون کو ایک قسم کی بہنگی میں ڈال کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ایسے لئے پھرتے ہیں جیسے کوئی سوڈا واٹر کی بوتلیں بیچ رہے ہوں۔ کچھ لوگوں نے اکثر ٹیلی فون کو ذریعہ معاش بنایا ہے۔ پبلک سے ہر کال کے تیس پیسے لے کر وہ شام تک اچھی روزی کما لیتے ہیں۔ ہندوستان میں فون کے (STATUS SYMBOL) ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی مانگ زیادہ ہے اور سپلائی بہت کم، اسی وجہ سے سرکار نے ٹیلی فون الاٹ کرنے کے لئے لوگوں کو کئی زمروں میں بانٹ رکھا ہے۔ دُنیا کی اور اچھی چیزوں کی طرح یہاں بھی پہلا زمرہ "مُفت خوروں" کا ہے۔ جس میں وزراء اور اعلیٰ افسر وغیرہ ہیں، جن کو اپنے رتبے کی وجہ سے فون دیا جاتا ہے۔ ان کی یہ شرطِ ملازمت ہوتی ہے کہ دن بھر کام کے ساتھ وقتاً فوقتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بھی سُنتے جائیں اور شام کو جب دن حلال کر کے گھر پہنچیں تو بھی ٹیلی فون کی گھنٹی انھیں یاد دہانی کراتی رہے کہ ؎

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

دوسرا زُمرہ ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جن کو اپنے پیشے کی بِنا پر قیمت ادا کرنے پر ٹیلی فون مل سکتا ہے۔ ڈاکٹر، وکیل، لیڈر اور بڑے بڑے تاجر لوگ اس زُمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ جنتا کی سیوا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے پاس ایسا آلہ ہو جس کے ذریعہ جنتا کی ان تک کبھی بھی شنوائی ہو سکے جن لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے ان کو یاد ہوگا کہ ہندوستان کے انصاف پسند مغل شہنشاہ جہانگیر نے بھی اپنے ایوانِ شاہی میں ایک ٹیلی فون لگوا رکھا تھا جس کو کوئی بھی فریادی تیس پیسے دیئے بغیر اپنی فریاد شہنشاہ تک پہنچانے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔

سب سے آخری قسم کا زُمرہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح ٹیلی فون لے لیتے ہیں اور پھر اس کا کچومر نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی اشارتاً کہا تھا، ہمارا خیال ہے کہ فون جہانگیر نے ایجاد کیا تھا لیکن کچھ مغربی مورخوں کی رائے ہے کہ ٹیلی فون کا موجد ایک امریکی (G. RAHAMBELL) تھا، جس نے اپنے نام کو لافانی بنانے کے لئے ٹیلی فون کے ساتھ بھی ایک "بیل" یعنی گھنٹی لگا دی ہے۔ یہی گھنٹی وہ چیز ہے جو کئی بار ٹیلی فون کو دورِ جدید کی ایک لعنت بنا دیتی ہے۔ جب آپ خیالوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے بیٹھے ہوں تو اچانک فون کی گھنٹی آپ کے ہوائی قلعے مسمار کر دیتی ہے۔ جب ہر طرف سکوت ہو تو فون کی گھنٹی اسے بے دردی سے جھنجھوڑ کر ختم کر دیتی ہے۔ جب زندگی میں خوابیدگی اور سکون ہوتا ہے تو یہ گھنٹی ایک قسم کی افراتفری پیدا کر دیتی ہے۔ فون کی گھنٹی میں ایک ایسا فوری پن، ایک ایسی فرعونیت اور ایک ایسا حکم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا آدمی فوراً دوڑ کر اُسے اُٹھاتا ہے انسان دنیا کی کسی اور ایجاد کی اتنی اطاعت برداری نہیں کرتا۔ کچھ لوگ تو [illegible] فون کے اُوپر تکیہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ ہم نے ایک بار ایسا کیا تھا ساری رات کانوں میں اس تکیہ سے فون کی گھنٹی کی آواز آتی رہی۔ اگر آپ کے لئے واقعی گھنٹی کا شور ناقابلِ برداشت ہے تو اس کے لئے ہمارا مشورہ ہے کہ ایک علٰحدہ تکیہ بنوا لیجئے۔

فون کے بے شمار فوائد ہوتے ہیں۔ دُور دراز سے بات ہو سکتی ہے۔ دوست کو خوش کیا جا سکتا ہے۔ دشمن کو تنگ کیا جا سکتا ہے۔ الارم
گھڑی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ بنی نوع انسان کی مختلف بولیوں کے بارے میں علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور وقت بے وقت اپنا اَتا پتا
ے بغیر کئی قسم کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رات کو اگر گھر میں کوئی چور گھس آئے تو فون کے ذریعہ پولیس
طلاع دی جا سکتی ہے۔ اس فائدے کے بارے میں ہمیں شک ہے۔ کیوں کہ اگر ایسے وقت اُٹھ کر ٹیلی فون کرنے کی ہمت ہے تو یقیناً
ب میں خود ہی چوروں سے نپٹ لینے کی صلاحیت بھی ہوگی۔ ہاں اگر چور خود ٹیلی فون کر کے آئے تو پھر آپ پولیس کو پہلے سے اطلاع کر سکتے
ں۔ لیکن چوروں کے طبقے سے ایسے مہذب سلوک کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر آپ کو اپنی محبوبہ سے بات کرنی ہے تو فون بہت ہی عمدہ
یعہ ہے۔ آپ فون کیجئے اگر محترمہ اُٹھائیں تو بات کر لیجئے اگر کوئی اور اُٹھائیں تو ٹپک کر رکھ دیجئے۔ اسی طرح اگر آپ کو اپنے صاحب
ے کوئی بدلہ لینا ہو تو اُسے صبح کے تین چار بجے فون کر دیں جب وہ اٹھائے تو آپ نیچے رکھ دیں۔ ایسا کرنے سے پہلے یہ پتہ کر لیں کہ وہ
۔ کے اُٹھنے والا آدمی تو نہیں۔ ٹیلی فون کے استعمال کے بارے میں محکمہ تار اکثر ہدایات شائع کرتا رہتا ہے۔ مثلاً جب کوئی آپ کو فون
ے تو 'ہیلو' کہنے کی بجائے آپ کو فوراً اپنا نام یا نمبر بتلا دینا چاہیئے۔ لیکن اکثر لوگ ان ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔ اس سے کئی بار بہت
بیب حالات پیدا ہو جاتے ہیں، کئی بار تو 'ہیلو ہیلو' کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو پاتا۔ کئی لوگ تو فون کا نمبر ملنے پر ایکدم پوچھ لیتے ہیں:

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

اِس سوال کا جواب کئی منچلے یُوں دیتے ہیں:

"اجی صاحب، ہم منہ سے بول رہے ہیں۔ آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

ایک بار ہم نے ایک مدراسی نوکر رکھا۔ اس کو فون سُننے کا بہت شوق تھا اور جب بھی فون بجتا تھا وہ بھاگ کر رسیور
ٹھا لیتا اور ہمیں آ کر بتا دیتا کہ فلاں صاحب کا فون ہے۔ ایک بار اس نے فون سُن کر رسیور واپس رکھ دیا اور ہمیں بتلائے بغیر اپنے
م میں مشغول ہو گیا۔ ہم نے پوچھا تو کہا کہ "صاحب، جب ہم نے اپنا نمبر بتایا تو سوائے رام کرشنا کہہ کر فون رکھ دیا۔"

گرید نے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب نے 'سوری رانگ نمبر' کہا تھا۔ لیکن ہمارے مدراسی نوکر نے اپنے صوبے کے نام کا کوئی فرد
ھا۔ ایک بار ہم کسی سے ملنے گئے تو وہ صاحب گھر پر نہیں تھے۔ کھڑکیاں کھُلی تھیں۔ لیکن دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اور ان کا نوکر
ہر ستا رہا تھا۔ ہم ابھی نوکر سے بات کر ہی رہے تھے کہ اندر سے اچانک فون کی گھنٹی کی آواز آئی۔ نوکر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر
لن کی طرف دیکھ کر چلّانے لگا۔

"صاحب گھر پہ نہیں ہے، صاحب گھر پہ نہیں ہے، صاحب گھر پہ نہیں ہے۔"

پبلک کی سہولت کے لئے حکومت نے جگہ جگہ ٹیلی فون لگا رکھے ہیں۔ اس میں آپ بیس پیسے ڈال کر فون کر سکتے ہیں
بر نہ ملنے کی صورت میں آپ کو اپنے پیسے واپس مل جاتے ہیں۔ لیکن کئی بار نہ تو نمبر ملتا ہے اور نہ ہی پیسے واپس ملتے ہیں۔ اگر کبھی ایسا
ہو تو آپ یہ مت سمجھئے کہ آلہ خراب ہے۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ ٹیلی فون کے محکمہ کے لوگ ایسا کبھی کبھی جان بوجھ کر کر دیتے ہیں اور

آپ سے اکٹھی کی ہوئی تمام رقم قومی ریلیف فنڈ میں جمع کر دیتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں لوگ نیکی کر کے کُنویں میں ڈال دیتے تھے۔ کیوں کہ اکثر بارش معقول نہ ہونے کی وجہ سے کُنویں سوکھ جاتے ہیں اس لئے حکومت نے پبلک کال آفس لگا دیئے ہیں۔ تاکہ پبلک کو نیکی کرنے میں کوئی تکلیف نہ ہو، ویسے تو ٹیلی فون نہایت سنجیدہ قسم کا آلہ ہے۔ لیکن حکومت نے اسے نصب کرتے وقت پبلک کی تفریح کا خیال بھی رکھا ہے۔ اکثر آپ کا تجربہ ہوگا کہ آپ نے کوئی نمبر ملایا تو پہلے ہی دو صاحبان میں گفتگو جاری رہتی ہے۔ آپ یا تو اسے خاموشی سے سُنتے جایئے یا خود بھی اس گفتگو میں شامل ہو جایئے۔ ہمیں ایکبار ایسا تجربہ ہوا تھا کہ ہمیں کسی سے اشد ضروری بات کرنی تھی لیکن دو صاحبان تھے کہ ٹیلی فون چھوڑتے ہی نہ تھے۔ آخر تنگ آکر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم بھی مناسب موقع پر گفتگو میں شریک ہو جائیں گے۔ جب ایک صاحب نے جماہی لے کر کہا۔

"ارے ہاں، ارشد کو جانتے ہونا"۔۔۔

دوسرا بولا: "ہاں ہاں وہ تو ہمارا خالہ زاد بھائی ہے"۔

ہم نے بیچ میں لُقمہ دیا۔

"اُس نے دوسری شادی کر لی ہے"۔

"ہائیں"۔۔۔ ان میں سے کسی ایک کے دل پر حملہ ہُوا۔

"کب"؟

"ابھی پرسوں کی بات ہے"۔ ہم نے کہا

"بڑا کم بخت ہے، بڑا شریف بنا پھرتا تھا۔۔۔ اور بیچاری جمیلہ کا کیا ہُوا"؟

ظاہر ہے جمیلہ، ارشد کی بیوی تھی۔

ہم نے جواب دیا: "پرسوں ارشد نے شادی کی، کل جمیلہ نے خودکشی کر لی"۔

"ارے"! ایک آواز یہ گویا قلبی حملہ ہوا۔ گفتگو ایکدم ختم ہوگئی اور ہمیں اپنا نمبر مل گیا۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ایسا تب ہوتا ہے جب فون کی لائنیں اُلجھ جاتی ہیں۔ جب انسان کی **NERVES** اُلجھ سکتی ہیں تو بے شک فون کی لائنیں بھی اُلجھ سکتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ دیکھا جائے کہ فون میں اور بھی کئی انسانی خصلتیں، خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ مثلاً انسان کی طرح فون **ENGAGED** بھی ہو جاتا ہے لیکن جس تیزی سے یہ **ENGAGED** سے **DIS ENGAGED** ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ لگا جا سکتا ہے کہ فونوں کے سماج میں طلاق کی رسم عام ہوگی۔ پھر انسان کی طرح فون مر بھی جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے اور شاید صرف قیامت کے روز اُٹھتا ہے۔ اس کے برعکس ٹیلیفون، غزل گو شاعروں کی طرح کئی بار مرتا اور کئی بار زندہ ہوتا ہے۔

المختصر ٹیلیفون ایک عجوبہ ہے۔ یہ ایک بہت ہی مفید دکھاوا آلہ ہے اس سے گھر کی شوبھا بڑھتی ہے اور سماج میں ہمارا درجہ اُونچا ہوتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ ٹیلی فون سے نالاں ہیں، سچ بولنے والے انسانوں میں سے نہیں ہیں۔

رف ڈینگ مارنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کے پاس فون ہے بلکہ وہ بڑے .V.I.P قسم کے آدمی ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ دورِ حاضر
رانسان کی یہ ایک بنیادی خواہش ہے کہ وہ کسی خوبصورت شہر میں رہے اس کا ایک نیا را بنگلہ ہو اور اس میں رنگ دار فون
جس پر وہ وقتاً فوقتاً ... کہہ سکے۔ کسی سے بات کر سکے، دوستوں کو خوش کر سکے اور دشمنوں کو تنگ کر سکے اور اگر وہ بہت ... اور
ں کر رہا ہو تو دوسرے لوگوں کی گفت گو بھی سن سکے۔ .. اگلی بار اگر کوئی صاحب آپ سے کبھی یہ کہیں کہ وہ ٹیلی فون سے نالاں ہیں تو
) مانیئے اُن سے اُسی وقت ایک قینچی مانگیئے اور چپکے سے اُن کی فون کی ڈوری کاٹ دیجئے۔

اِدارہ شگوفہ

کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ڑے کاہن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/-	روپئے
نط	یوسف ناظم	مضامین	۸/-	"
لبتہ	"	"	۱۰/-	"
مینار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-	"
م گھیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-	"
دی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	"
بالآخر	"	مضامین	۱۴/-	"
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵/-	"
بَعضِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵/-	"
واہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰/-	"
چندکلیاں نٹ کھٹ کی	برہان حسین	"	۱۰/-	"
نوم شکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲/-	"
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲/-	"
دائیں بائیں قش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵/-	"

حمایت اللہ

حمایت اللہ قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ فائن آرٹس اکیڈمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی روحِ رواں ہیں۔ اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں تو تالیوں کی گونج سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ چھوٹے نواب کا کردار حمایت اللہ کی ایکٹنگ کا شاہکار ہے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے چھوٹے نواب کا پروگرام بے حد مقبول ہوا۔ کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد کے نشریہ سے بھی چھوٹے نواب کے اس پروگرام کو عوام نے ہمیشہ پسند کیا۔ ٹیلی ویژن پر انھوں نے دلچسپ پروگرام پیش کئے۔ حمایت اللہ، ایک اچھے مزاحیہ شاعر، خاکہ نگار اور اداکار ہیں۔ انھوں نے سینٹ پیٹرک میں تعلیم حاصل کی۔ پیشے کے اعتبار سے حمایت اللہ گتہ دار

کانٹوں پر زباں رکھ دی

سیماب اکبرآبادی کی روح سے معذرت کے ساتھ

"یہ کس نے شاخِ گل لاکر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی"

سمجھ میں صاف نہیں آیا تو پوچھا شاخِ گل کیا ہے
تو بولے شاخِ گل بولے تو پھولوں کی ڈغالی ہے
قریبِ آشیاں کا بھی اُنوں مطلب بتا ڈالے
ارے کیا شاعری ہے دیکھ رئیں واہ واہ رے واہ رے واہ
مگر اک بات رہ رہ کر مرے دل میں کھٹک رئی ہے
جدھر مُنگس ہے واں پہ سانپ رہنا بھوت مشکل ہے
جدھر گُل ہے ادھر بُلبل بھی رہتے ان کے گھر رہتے
چمن نیئں سو جگہ پو گھر بنایا کون ہوَلا تھا
چلو پت جھڑ کا موسم ہونگا یہ مان لیتوں میں
خزاں میں پھر یہ شاخِ گُل کدھر سے کون لایا رے
سُنا ہوں قیس کو ہر چیز میں لیلیٰ نظر آئی
تو ہوگا وہ بھی شاخِ گل کا دیوانہ زمانے سے
نہ کانوں سے کوئی دیکھا نہ آنکھوں سے کوئی سُنتا
بِلنے تو شوقِ گُل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ رائے
زباں سے عاشقی، [illegible]

یہ گل بوسی بولے تو کیا قریب آشیاں کیا ہے
یہ گل بوسی بولے تو پیار پھولوں کی لِغالی ہے
زبردستی جو مُنہ بند تھا سو وہ منہ کو کھلا ڈلے
اِدھر لوگاں بھی واہ وا بول رئیں واہ واہ رے واہ رے واہ
سُنا ہوں جب سے یہ شعراں مری عقل بھٹک رئی ہے
چمن نیئں سو جگہ بُلبل کا رہنا بھوت مشکل ہے
جدھر بھی چاندنی رہتی چکوراں بھی ادھر رہتے
وہ بلبل تھا یا کوّا تھا، وہ بچّو تھا یا کولا تھا
خزاں ہوگی چمن برباد ہوگا مان لیتوں میں
یہ اُبلیوں کو ڈُبا کو پتھرے پانی پو ترایا رے
نظر والا اُنے جاں بھی اُسے لیلیٰ نظر آئی
جبھی کو شاخِ گُل اُسکی ڈغالی پر نظر آئی
یہ گُل بوسی میں بوسہ ہے تو بوسہ ہونٹ سے ہوتا
کیا اُس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے جو کانٹوں پر زباں رکھ ڈالا
[illegible]

رشید قریشی ٭

گھوڑا جوڑا

رشید قریشی صاحب کے پندرہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "مزاح شریف" زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

رشید قریشی اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ بے تکلف ہم خیال اور ہم مذاق دوستوں کی محفل ہو تو وہ اس خول سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ فطرتاً ظریف، بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہیں۔ گفتگو کے دوران، مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں۔ باغ و بہار اور پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ سینکڑوں لطیفے انھیں از بر ہیں۔ انکی زندہ دلی، محفل میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضمون پڑھنے کا انداز بھی بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ اپنا مضمون بہت مزے لے لے کر سناتے اور پڑھتے کے دوران بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ انکے مزاحیہ مضامین میں زبان و بیان کی خوبصورتی اور انکی شگفتہ تحریر کا ڈرامائی انداز پڑھنے والوں کے دلوں کو گرما دیتا ہے۔ وہ ایک اچھے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔

خادم کے والد چاہتے تھے کہ خادم ڈاکٹر بنے۔ اُدھر وہ پہاڑ شا کا چلّہ بیٹھے اور اِدھر خادم ایک ہم جماعت لڑکی کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈی میں جُت گیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ خادم کے والد بخصوص الحوارییں مُبتلا ہو گئے اور خادم اسقاط نشانات کی پاداش میں اس ہاتھ لڑکی سے اور اس ہاتھ ڈاکٹری سے محروم رہ گیا۔ اس ناکامی سے خادم کی اُمیدوں کا دم نکل گیا لیکن اس کے والد پست ہمت نہیں ہوئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے صبر میں ربر ہے اور یہ دعویٰ انہوں نے سچ ثابت کر دکھایا۔ اُنہوں نے خادم کو وٹرنری کورس میں داخلہ دلوا دیا اور جب خادم کمبائنڈ اسٹڈی کے بغیر امتحان میں کامیاب ہو گیا، بیٹوں کے باپ اور شادی کا رگھیراؤ کی مُہم کے نقشے بنانے لگے۔ گھیراؤ۔ اس میں ایک غیر رومانٹک ناشادیانہ سیاسی دباؤ کار فرما محسوس ہوتا ہے اس لئے دولھا کے شکار کے لئے یہ اصطلاح کچھ موزوں نظر نہیں آتی۔ یہ کہنا زیادہ حسب حال ہوگا کہ بیٹوں کے باپ اور شادی کار خادم کے لئے کھیڈا کی تیاریوں میں لگ گئے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کھیڈا ہاتھیوں کو پکڑنے کا قدیم طریقہ ہے۔ اس میں ہاتھیوں کو گھیر کر بانس بجاتے ہوئے ایک مضبوط حصار میں ہنکا لاتے ہیں اور جب نا عاقبت اندیش ہاتھی اندر داخل ہو جاتے ہیں، اُوپر سے

گرنے والا تقدیری دروازہ اُن کو ہمیشہ کے لئے قیدی بنا دیتا ہے۔

شادی کے بازار میں ڈاکٹر کی بڑی مانگ اور اُونچا نرخ ہے۔ ڈاکٹر اگر حیوانات کا بھی ہو تو سر کے بالوں اور پلکوں پر چلیا ہے بلکہ حیوان ہو لیکن ڈاکٹر ہے تو بھی بزدر نشتر گھوڑے جوڑے کی رقم ہتیاتا اور ایک پری زاد کو اپنی کنیزی میں قبول کرتا ہے۔ خادم کے معاملے میں خادم سے زیادہ اس کے والد دولھا تھے کیوں کہ خادم ایک سعادت مند اور احسان مند بیٹا تھا۔ سعادت مند اس لئے کہ والد کی طرف سے کسی بات کی روک ٹوک نہ تھی، احسان مند اس لئے کہ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی کا تصد نہیں کیا تھا۔ جہاں بھی سلسلہ جنبانی ہوتی وہ اپنے ساتھ محلہ کے دو دوستوں ہم محکمہ، دو وظیفہ یابوں، دو رشتہ داروں اور محلہ کی مسجد کے موذن صاحب کو لازمی طور پر منسلک رکھتے۔ کہیں دوپہر کا کھانا، کہیں شام کی چائے، کہیں عشائیہ اور ہر مقام سے اس نعرہ کے ساتھ اُٹھتے، ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے اپنا۔ ایک پیام تو ایسا للچانے والا آیا کہ والد صاحب نے خادم کو پس پُشت ڈال کر خود آگے بڑھ جانے کی ٹھان لی۔ لیکن ان کے حق میں لڑکی والوں نے جہیز کی رقم نصف گھٹادی تو وہ پیچھے ہٹ آئے اور خادم پر ایک اور احسان کر گئے۔ یہ نسبت سمنٹ کے سیٹھ دولت خاں کی بیٹی کی تھی۔ گھوڑے جوڑے کی رقم بیس ہزار، چالیس ہزار کا مکان، پچاس ہزار کا زیور، دھوم دھام کی شادی، جس میں کسی نہ کسی وزیر کی شرکت یقینی، لڑکی کی وجاہت کے تعلق سے یہ مقامی اشارہ دیا گیا کہ وہ سو فیصد آدم زاد ہے اور شجرہ کی کسی شاخ پر بھی کسی دوسری جنس کا گھونسلا نہیں ہے۔ لڑکی کو دیکھنے کی بات پیش ہوئی تو کہا گیا کہ لڑکی کوئی دُم دار ستارہ نہیں اور یہ کہ دیکھنے ہی پر اصرار ہو تو جہیز میں مکان نہیں دیا جائے گا۔ خادم کے والد نے لڑکی کو دیکھنے کی تجویز واپس لے لی مگر مکان کے معائنہ پر اَڑ گئے۔

خادم حیوانات کا ڈاکٹر سہی لیکن اس کا انسانی جمالیاتی ذوق پری وشوں کی تشخیص کرتا تھا۔ اپنی شریک زندگی کے تعلق سے اس کا خانگی نظریۂ حسن یہ تھا کہ وہ مدھوبالا کا انداز قد رکھے، گیتا بالی کی طرح غنچہ دہن ہو، نینا کی سنجیدہ نزاکت کا جواب ہو ......

لیکن خادم کے والد کا مشورہ تھا یہ وہ کچھ نہیں، تم حیوانات کے آدمی ہو، تم کو تو ایسا سراپا سوچنا چاہیئے، ریگستان کی رانی کا قد، گلہری کا دہن بیمار بلی کی سنجیدہ نزاکت اور دولت خاں کی بلکہ دولت کی بیٹی ....

خادم کی یہ بدقسمتی تھی کہ اس کے والد نے اس کی خیالی دنیا میں کبھی جھانک کر نہیں دیکھا۔ ان کے قدم زمین پر تھے اور ان کی نظر میں بھی زمین بسا تھیں۔ زمین کہاں سونا اُگلتی ہے، کہاں بنگلوں کو سربلند کرتی ہے، کہاں موٹروں کو گھماتی ہے ......

اور ایسی زمین ان کو سیٹھ دولت خاں کے قبضہ میں مل گئی۔ انہوں نے سیٹھ دولت خاں کی بیٹی سے خادم کا رشتہ طے کر دیا۔ گھوڑے جوڑے کی رقم وصول کر لی۔ اب شادی کی تاریخ سے اُن کو دلچسپی نہ تھی۔ لیکن سیٹھ دولت خاں نے بذریعہ فرمانِ خسروی دوسرے ہی ہفتہ کے دوسرے دن شادی مقرر کر دی۔ برات کے تعلق سے خادم کے ایک دوست نے شاعرانہ نازک خیالی کو ایڑ لگائی۔ مشورہ تھا کہ گھوڑے جوڑے کی رقم گھوڑے پر سوار ہونے سے حلال ہوتی ہے اور حیوانات کا ڈاکٹر ہونے کے ناطے خادم کے لئے گھوڑے سے زیادہ نسبتی سواری کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

خادم نے سہم کر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ گھوڑے کا علاج کرنا اور چیز ہے... گھوڑے پر سوار ہونا اور۔ خادم نے بچاؤ کا یہ پہلو نکالا کہ موٹر میں بھی گھوڑے کی طاقت ہوتی ہے اور امپالا میں تو اُڑن گھوڑوں کی طاقت پرواز جتنی ہوتی ہے۔ لیکن اس دوست نے خادم کے والد کو سمجھایا کہ موٹر کی سجاوٹ اور پٹرول پر کم از کم دو سو روپیوں کا خرچ بیٹھے گا.... اور گھوڑا.... وہ مفت مُہیا کر سکتا ہے۔ خادم کے والد نے حکم صادر فرمایا کہ دولھا گھوڑے پر برات کا سپہ سالار ہوگا..... اور خادم کے دوست کو ہدایت ہوئی کہ وہ اُسی گھوڑے کو ڈھونڈھ نکالے جس پر وہ خادم کی والدہ کو بیاہنے نکلے تھے۔ اِس بے چارے کو وہ تاریخی گھوڑا تو نہ مل سکا البتہ منگل ہاٹ میں ایک کمہار کا ٹٹو مل گیا۔ ہر چار پیر والا جانور گھوڑا نہیں ہوتا لیکن ہر ٹٹو گھوڑے کا بھتیجہ ہوتا ہے۔ خادم کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوا۔ کرسی منگوائی گئی کرسی پر اسٹول رکھا گیا اور خادم کو خطِ ارض سے کرسی پر اور کرسی سے اسٹول پر پہنچا دیا گیا... اس بلندی سے ٹٹو پست قد تھا۔ اس لئے خادم کو صرف قدم رنجہ ہونا تھا..... ڈرم دھم بولا۔ اور کارومنڈل بینڈ حرکت میں آگیا۔ اودے رنگ کے جودھپوری کوٹ پر پیلا شملہ باندھے بینڈ کی مخلوق مرغ کے تازہ واردوں کی ہیئت میں تھی لیکن ڈرم بجانے والا اسی دنیا کا تھا۔ کیوں کہ اس غریب کے جسم پر کوٹ نہیں تھا صرف بنیان تھا۔ بینڈ بجنے لگا۔ برات رینگنے لگی۔ ٹٹو بھی براتیوں کے ریلے میں پیروں کو جنبش دیئے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ بینڈ نے اپنی مہارت کی چیز چھیڑ دی۔ غم دیئے مستقل... کتنا نازک ہے دل ـ ہائے ظالم ـ کے ساتھ ڈرم بجانے والے کی آستین پھٹ کر اس کی کلائی میں اُتر آئی۔ اور وہ آستین چڑھانے کے لئے رُک گیا۔ اتنے میں دولھا کا ٹٹو اس کے پاس پہونچ گیا۔ ڈرم بجانے والے نے آستین کا غصہ ڈرم پر نکالا اور اس دھماکہ کی ضرب لگائی کہ ٹٹو مراقبہ سے اُچھلا۔ خادم کے ہاتھ کی سُرخ دستی سے خنجر اُڑا۔ وہ تو کہئے خیر ہوئی، خادم نے بدحواسی سے کام لیا اور ٹٹو کے گلے کا ہار بن گیا۔ ورنہ عقد کی کارروائی ہسپتال میں انجام پاتی....

دلھن کا گھر چاند تاروں کا میلہ تھا، موٹروں کا اڈہ تھا، مہمانوں کا چھتہ تھا۔ جب بارات پہونچی تو سب کی نظریں خادم کی طرف اُٹھ گئیں لیکن اسی وقت سیٹھ دولت خاں کے اشارہ پر گھنگھر بالا نے رقص شروع کردیا۔ سب مہمان اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ خادم کو چاول پھنکوائی کے لئے بُلایا گیا تو ایک لحیم شحیم بلڈ پریشری رشتہ دار نے خادم کو ٹٹو کی پیٹھ پر سے اپنی گود میں اتار لیا۔ لیکن دوسرے ہی قدم پر وہ خادم پر ڈھیر ہوگئے۔ خادم کے والد نے اسے بلڈ پریشر کے دباب سے کشاں کشاں آزاد کیا اور پرستان کی طرف ڈھکیل دیا.... خادم چُست چالاک دلھن کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی نے پکارا..... اُدھر نہیں اِدھر ہے دلھن اور خادم کو ایک خوبصورت جوان مہمان لڑکی سے صرف دو قدم دور رُک جانا پڑا۔ پینترا بدل کر جب وہ اپنی حقیقی دلھن کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اس کا چاول پھینکنے والا ہاتھ لرزنے لگا۔ خادم کے والد اس کے نزدیک پہونچ گئے۔ گھبراؤ نہیں بیٹا۔ شہسوار ہی لرزتے ہیں۔ گاما پہلوان بھی لرزے تھے۔ چلو پھینکو چاول.... دیوانے مت بنو۔ گھر میں چھ اَن بیاہی بہنیں بیٹھی ہیں اور جب خادم دولھا کی مسند پر آ بیٹھا، اُس کے جبڑے بج رہے تھے اور آنکھوں سے حسین ساگر چھلک رہا تھا۔

قاضی صاحب نے فیس لے لی، مصری بادام سے اپنی تھیلی بھر لی اور ایجاب و قبول کا مرحلہ آگیا۔ خادم نے ایک عالمِ بے بسی میں مسماۃ زرینہ بنت دولت خاں کو بعوض ڈھائی لاکھ مہر موجل اپنے عقدِ نکاح میں تین بار قبول کرلیا۔ مبارکبادیوں کا ہنگامہ شروع

ہوگیا۔ سیٹھ دولت خاں اس وقت دنیا کا سب سے سبکدوش سیماب شاداں باپ تھا لیکن ابھی رخصتی باقی تھی۔ جلوے کی تیاری میں ڈاکٹر فریبی فردوس پیش پیش تھیں، کیوں کہ ان کے کالج کو سیٹھ دولت خاں کی طرف سے گرانٹ ملا کرتی تھی۔ اور اس شادی کے لئے میں روزانہ دُعا، پر بیر اور بیرا ر تھا ہوا کرتی تھی۔ سیٹھ دولت خاں خادم کو لے کر زنانے میں گئے۔ ایک مہمان خاتون نے سرگوشی کی دولہا تو گھوڑے کی شکل کا ہے۔ ڈاکٹر فریبی فردوس نے خاموشی کی انگلی دکھائی ش ش ش۔ حیوانات کا ڈاکٹر ... گھوڑا جوڑا ... سرگوشی ساکت ہوگئی لیکن روشنی کا فیوز اُڑ گیا ... اندھیرے کی کھلبلی مچی بجلی کے کاریگر دوڑا اپنے کام پر لگ گئے۔ بچے بلبلانے لگے لیکن روشنی اندھے کی بینائی کی طرح روٹھی رہی۔ سیٹھ دولت خاں نے پٹرومکس منگوائے۔ لیکن انکو پٹرومکس کا انتظار گوارا نہیں ہوا۔ مبارک گھڑی کو اندھیرے اُجالے سے سروکار نہیں ہوتا اس لئے آرسی مصحف کی رسم اندھیرے ہی میں شروع کروادی گئی۔ دولت خاں کی رننگ کامنٹری کے ساتھ دیکھو جو ستارہ چمک رہا ہے وہ پیشانی کا ٹیکہ ہے دس ہزار کا۔ اور غور سے دیکھو جو گردن کے پاس اُجالا ہے وہ چمپا کلی ہے چالیس ہزار کی۔ خادم نے ایک سفید چمکتی حملہ آور چیز بھی دیکھی جو ٹیکے اور چمپا کلی کے درمیان واقع تھی۔ خادم خوف زدہ اُٹھ گیا۔ سیٹھ دولتخاں نے اپنی بیٹی کو بھی اُٹھا دیا۔ جاؤ خوش رہو، لے جاؤ خوش رہو۔ واپسی کے لئے خادم کو ٹٹو سے چھٹکارا مل گیا۔ وہ موقع پا کر ڈرم پر دولتیاں جھاڑ کر تیلنگ کی طرف بھاگ نکلا تھا ... بینڈ والے بھی اُسے نہ ملے۔ اُن کو چادر گھاٹ سے دولھا کے آگے چلنا تھا اور سیکل پہ ڈبل سواری کے جرم میں پولیس والوں نے سبھوں کو دھر لیا تھا۔ دلھن کی موٹر شادی کا ہارن بجاتی خادم کو اس کے گھر لے آئی ... خادم کے والد وہیں دولت خاں کے بنگلے میں رک گئے۔ اس دن لاری والوں نے ہڑتال کر رکھی تھی اس لئے جہیز کے سامان کی فوری منتقلی ممکن نہ تھی، وہ دولھا کے باپ تھے اس لئے شادی کی رات کہیں بھی بسر کر سکتے تھے۔ وہ ایک آنکھ سوتے ایک آنکھ جاگتے صوفے پر دراز رہے اور جہیز کا سامان جیسے ان کی ہتھیلی پر جما رہا۔ دوسرے دن صبح خادم کے دوست مبارکباد دینے اس کے گھر پہنچے کسی کے ساتھ تحفہ تھا ... کوئی پھولوں کے ہار لایا تھا ... خادم نے مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ جب چائے آئی تو سبھوں نے ایک زبان ہو کر نعرہ بلند کیا دلھن بھابی کے ساتھ چائے پی جائے گی ... خادم ٹالتا رہا لیکن دوستوں کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ اس اصرار کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ خادم کے انتخاب کا نظارہ چاہتے تھے۔ وہ اس کی چنا چنی سے واقف تھے اور ان کو یقین تھا، خادم کی جستجوئیں خوب اور خوب تر کو چھوڑ کر آخر کار خوب ترین پر قابض ہوگئیں اور دوستی کی بناء پر اُن کو حق پہنچتا ہے کہ وہ دلہن بھابی کے درشن مانگیں ... دوست دولھا کی قسمت پر رشک کریں ـــ خادم بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور اندر چلا گیا۔ آنکھیں جلوہ جو یا ... دلوں کی دھڑکن تیز ... تو تعاتی انتظار کی سنسنی ... اب ... کوئی ... مدھوبالا کی قامت لئے۔ گیتا بالی کی غنچہ دہنی پر مسکراتا ... نینا کی سنجیدہ نزاکت کو کشیدہ ابرو پہ تولتا آیا ... آیا ... چشم براہ ـــ نگاہوں سے قدم بوسی کے لئے تیار ... کہ دروازہ دھڑکا، پردہ کو جنبش ہوئی۔ تہنیتی ترانہ چھڑ گیا

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب
مہکیں تیرے عارض کے گلاب

اور خادم کے پیچھے سمٹتی، لنگڑاتی اس کی دلہن نمودار ہوئی ... شراب سوکھ گئی، گلاب جھڑ گئے۔ ایک دوست نے آگے جھک کر

دوسرے کو رازدار بنایا۔ دولھا میاں کو آنکھوں کا عطیہ دینا ہوگا۔ خادم نے اپنا سر تھام لیا۔ ایک اور دوست نے عینک درست کی، ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ یہ لیو ہتھی کے دو دانت دکھانے کے ہوتے ہیں ان کے چار دانا تا ابھا باہر ہیں۔ خادم کا سر کچھ اس طرح جھٹکے کھانے لگا جیسے برقی رو چھو رہی ہو۔ کسی نے آواز اٹھائی، دیکھو گلے میں جھریوں کے ہار بھی ہیں۔ خادم اب تک خاموش بیٹھا یہ تعزیتی تبصرے سُن رہا تھا۔ آخری جملہ پہ قندیل کی طرح بھڑک اٹھا... ارے زور سے بات کرو رے، بھابی بہری بھی ہیں۔

دلہن نے بہوت ماحول کی تڑپتی، تلملاتی مایوسی کو محسوس کیا اور پلٹ کر خادم کی طرف دیکھا۔ تبدیلیٔ فضا کے لئے ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے دانتوں پر چمک گئی۔ سفید خربوزے پہ لاری کا پہیہ گزر گیا جیسے' بغیر باپ پیدا ہونے والے انڈے کو خود اس کی والدہ نے پیدا ہوتے ہی پھوڑ دیا ہو جیسے'.... خادم چونک گیا۔ یہ مسکراہٹ اس سے پوچھ رہی تھی ـــــ نہیں جانتے تھے بھکاری کو پسند کرنے کا حق نہیں؟

ہندوپاک کے ادیب اور مزاحیہ شعراء کا پرخلوص استقبال کرتے ہوئے
سہ روزہ پروگرام
کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ
MOON ME ELECTRONICS
مون الکٹرانکس پتھر گٹی حیدرآباد
فلپس ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈس کے مسلمہ ڈیلر و کیسٹ ریکارڈنگ سنٹر
اِس پروگرام کے اوریجنل کیسٹ ہم سے طلب فرمائیے
نیتا آرٹس

آندھرا پردیش

صنعتی محاذ پر آگے بڑھ رہا ہے

آندھرا پردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن نے ریاست کے صنعتی کاروبار کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے اور اب تک 22551 یونٹوں کو ترقی دینے میں 328.25 کروڑ سے بھی زائد سرمایہ مشغول کیا ہے۔

صنعتی کارنامہ انجام دینے کے بارے میں غور کیجئے اور ہم مالی ضروریات فراہم کریں گے۔
ہم نے آپ کی بہتر مدد کے لیے ایک اسپیشل اسکیم تیار کی ہے۔

- پچھڑے علاقوں میں یونٹوں کے قیام کے لیے رعایتی شرح سود پر سرمایہ کی فراہمی
- اسپیشل اسکیم صناعوں کے لیے
- پرکشش سہولتیں ذیلی یونٹوں کے لیے

ہم اراضی، بلڈنگ اور مشینری، فارن اکسچینج قرضے اہم مال و اسباب کی درآمد کے سلسلے میں سرمایہ مشغول کرتے ہیں۔

★ ★

براہ کرم تفصیلات کے لیے
حیدرآباد۔ رنگاریڈی۔ کرنول۔ تروپتی۔ وجے واڑہ۔ وشاکھاپٹنم۔ راج مندری
نظام آباد۔ ورنگل۔ گنٹور۔ کھم۔ اننت پور اور نیلور کی
قریبی برانچ سے ربط پیدا کیجئے۔ یا
لکھ کر معلومات حاصل کیجئے۔

مینجنگ ڈائرکٹر
آندھرا پردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن
194-9-5 کوچہ چراغ علی پوسٹ باکس نمبر 165 حیدرآباد 500001
APSFC آندھرا پردیش صنعت کو آگے بڑھا رہی ہے۔

اسماعیل ظریف

آپ کہنہ مشق مزاحیہ شاعر ہیں۔ وہ ناندیڑ کے تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کا شوق، طالب علمی کے زمانے سے شروع ہوا۔ جو آج بھی انھیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا تو اپنے خاندان کی روایت کے مطابق تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ مشاعرہ کی محفلوں میں اپنا کلام سناتے اور داد پاتے ہیں کل ہند مشاعروں میں بھی انھوں نے اپنا کلام سنایا ہے۔ معیاری اخباروں اور رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بھی متعدد مرتبہ ان کا کلام نشر ہوا ہے۔ چاند پر مشاعرہ پڑھنے کے بے حد مشتاق ہیں اور شاید یہ ان کی آخری خواہش ہے۔

چارمینار

قطب مینار کو گر چار سے دی جائے ضرب
حاصلِ ضرب جو آئے گا وہ ہے چار مینار
دلکشی تاج محل میں بھی بہت ہے لیکن
حسنِ مردانہ میں اس کا نہیں ثانی کوئی
کمپنی والوں نے سگرٹ کا سہارا لیکر
اس کی تصویر کی عظمت کا اڑایا ہے مذاق
اس کے ہر سمت میں نصب نرالی گھڑیاں
دورے پڑتے ہیں تو بے ہوش بھی ہو جاتی ہیں
بعد مدت انھیں پھر ہوش میں لاتا ہے کوئی
مشرقی وقت بتاتی ہے وہ مشرق کی گھڑی
مغربی ٹائم کا پابند ہے مغرب کی گھڑی
آیئے اب ذرا اوپر کی طرف چلتے ہیں
چڑھ کے مینار پہ نیچے کا نظارا کر لیں
اب ذرا دیکھئے نیچے کی طرف
گاڑیاں رینگ رہی ہیں ایسے
جیسے بچوں کے کھلونے ہوں کوئی
ہاں ذرا خود کو سنبھالو ورنہ
ایک ہی جست میں منزل پہ پہنچ جاؤ گے
جاتے جاتے کسی راہرو کو بھی لے ڈوبو گے
وہ رہا بس اسٹاپ
دھوپ میں لوگ پریشان ہیں ڈبل بس کے لیے
ان میں شرفا کے سوا
چار سو بیس کوئی ہے تو کوئی پاکٹ باز
ایک ہی کیو میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
دیکھئے وہ کوئی رکشا سے اتر آیا ہے
کیو میں اک دوست کھڑا ہے اس کا
آنے والے نے کہا
یار اک مشورہ کرنا ہے ضروری تجھ سے
تین بجنے کو ہیں
چھ بجے لوٹ کے میں آؤں گا
کہو گھر ہی پہ ملو گے یا کسی اور جگہ
یہ دیا اس نے جواب

بس کے آنے میں ابھی دیر ہے اتنی باقی
لوٹ کر بھی اسی کیو میں یہیں پاؤ گے مجھے
پھر یہ پوچھا اس نے میاں صاحبزادے
وہ جو رکشے میں ترے ساتھ ہے بیٹھا کوئی
آج کوئی نیا اُلّو تو نہیں پھانسا ہے
یہ دیا اس نے جواب
ارے پاگل وہ مرے فادر ہیں
بالغوں کے لیے ٹیچر جو لگی ہے انگلش
وہ دکھانا ہے انھیں
لاڈ بازار کا منظر بھی بہت دلکش ہے
پائی جاتی ہے یہاں
چاندنی چوک سی دلّی کی جھلک
چوڑی والوں کے یہاں بھیڑ بہت ہے لیکن
یہاں پردے کی کوئی قید نہیں
یوں تو دوکانوں میں شوروم میں لیڈیز مگر
سیلز مین جنٹس ہوا کرتے ہیں
چوڑیاں پہنے ہوئے بیٹھے ہیں شاید یہ لوگ
وہ رہی سامنے مکہ مسجد
جہاں ہر قوم کے سیّاح بطورِ تفریح
گھومتے پھرتے ہیں ہر روز نمائش کی طرح
اس طرف دیکھیے یونانی شفاخانہ ہے
کئی بیمار یہاں آکے شفا پاتے ہیں
کئی بیماروں کے یہاں فیوز بھی اڑ جاتے ہیں
وہ گزر جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے
چارمینار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ پلنگ ہم تو سفر کرتے ہیں
کیا پڑی ہے تمہیں ان سارے بکھیڑوں سے ظریف
تم کوئی شہر کے افسر تو نہیں
سننے والوں کے لیے بارِ سماعت نہ بنو
اب ذرا مائیک سے ہٹ جاؤ، ہوا آنے دو ■■

رشید عبدالسمیع جلیلؔ

جلیلؔ تخلص ہے۔ ۱۹۵۸ء سے باضابطہ شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۰ء سے کلام چھپنے لگا۔ سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں اپنی صلاحیت منوا چکے ہیں۔ چند سال پیشتر سنجیدہ شاعری کا پہلا مجموعہ "نصابِ دل" شائع ہوا۔ مزاحیہ کلام کل ہند مشاعروں میں سُنا چکے ہیں۔ قدرت نے انھیں حسّاس دل اور بیدار ذہن دیا ہے۔ آندھرا پردیش کے ضلع میدک کے ایک دیندار گھرانے میں ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ حلیم الطبع، پُرخلوص اعتدال پسند ہیں۔ شاعری، ورثہ میں ملی ہے۔ ان کے والد بھی شاعر ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے سیاسیات سے ایم۔ اے کامیاب کیا۔ ایک سرکاری محکمہ میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر مامور ہیں۔

بیگم کی حکومت ہے انجام نمی دانم
کیا حکم بجا لاؤں جب کام نمی دانم
دن رات فقط نخرے آرام نمی دانم
کب گھر میں سحر آئی کب شام نمی دانم
شادی کا وہی اک دن پھر آج کا یہ دن ہے
فالودہ نمی نوشم بادام نمی دانم
پہنا تو دیئے کنگن آں چہرہ نمی بینم
ہر روز دُھلے برتن حمّام نمی دانم
خلوت میں سجی محفل، محفل ہوئی تنہائی
ترسیل کا موسم ہے، ابہام نمی دانم
بگڑی ہوئی کچھ سطریں پھیلے ہوئے کچھ نقطے
مکتوب پُرانا ہے، پیغام نمی دانم
تولید میں یم۔فل ہوں، تقلید میں پی۔ایچ ڈی
ہر ڈگری ہے ترغیبی، اکزام نمی دانم
زلفوں کی درازی پر سمجھو نہ مجھے شاعر
من بندۂ ہپّی ام حجّام نمی دانم
ہر شعر جلیلؔ اپنا لوکل ہے ولادت سے
از آندھرا پردیشم خیّام نمی دانم

طالب خوندمیری

بڑے بھائی اشرف خوندمیری کو شعر کہتا ہوا دیکھ کر بچپن ہی میں طالب خوندمیری کے دل میں بھی شعر گوئی کا خیال پیدا ہوا۔ مشقِ سخن ایک مدت سے جاری ہے۔ مسلسل اور مستقل طور پر طنز و مزاح سے بھرپور شعر کہتے رہنے کی وجہ سے، رنگِ سخن میں نکھار آگیا ہے۔ ان کے لہجہ اور ان کی آواز کی انفرادیت صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ شعر گوئی کے علاوہ ان کے دیگر پسندیدہ اور محبوب مشغلوں میں مصوری خوش نویسی اور مضمون نگاری ہیں۔ کارٹون بھی خوب بناتے ہیں۔ ماہنامہ شگوفہ کے ٹائیٹل کے لیے طالب نے کئی مرتبہ اپنے آرٹ کے بعض خوبصورت نمونے نذر کئے ہیں۔ انھوں نے آرکیٹکچر کا پانچ سالہ کورس کالج آف فائن آرٹس اینڈ آرکیٹکچر سے کیا۔ وہ ۱۴۔ فروری ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں دونگل میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام سید محمود ہے۔ علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں طالب خوندمیری سے زیادہ مشہور اور متعارف ہیں۔ ان کے والد سید عبد الکریم، محکمہ آبکاری میں ملازم تھے۔ ملازمت کے دوران، ان کا تبادلہ آندھرا پردیش کے مختلف اضلاع پر ہوتا رہا جس کی بدولت طالب خوندمیری کو ان اضلاع کی سیر کا موقع ملا۔

آرکیٹکٹ غالبؔ

ایک دن غالبؔ سے کوئی اجنبی آکر ملا
آپ نے بھی مسکرا کر یہ سوال اُس سے کیا

غالبؔ: آپ کا کیا نام ہے، کہیے کہاں سے آئے ہیں
کیا کوئی پیغام جاناں کی گلی سے لائے ہیں؟

نووارد: نام تو عبد الغنی ہے، قدر داں ہوں آپ کا
دیسے میں اکلوتا مالک ہوں کرانہ شاپ کا

غالبؔ: خیر، یہ فرمایئے، کیوں آپ کا آنا ہوا؟
کس لیے اس بے نوا کو یاد فرمانا ہوا؟

نووارد: میں نے سن رکھا ہے غالبؔ آدمی ہیں کام کے
گھر کے نقشے بھی بنا سکتے ہیں سستے دام کے

غالبؔ: ہاں میاں، ہم بھی کسی دن واقعی تھے کام کے
مقبرے بھی ہم بنا دیتے تھے خاص و عام کے

عشق نے ہم کو تو بالکل ہی نکما کر دیا
مبتلائے دردِ دل، مصروفِ دمہ کر دیا

ہاتھ میں رعشہ ہے کوئی کام کر سکتا نہیں
ضعف اتنا ہے کہ شغلِ جام کر سکتا نہیں

نووارد: خواہ کچھ ہو، یہ مکاں میں آپ سے بنواؤں گا
آپ سے نقشہ ہی لے کر اب یہاں سے جاؤں گا

غالبؔ: آپ کی ضد ہی چلو ہو کر رہے گی کامیاب
بن تو جائے گا کوئی نقشہ مگر پہلے جناب

فیس میں کچھ بوتلیں وہسکی کی منگوا دیجئے
ساتھ کوئی ساقیِ نوخیز لگوا دیجئے

آم کا موسم ہے طلوبے بہت مرغوب ہیں
ٹوکرے ان کے فقط دس بیس ہی مطلوب ہیں

اب ذرا فرمایئے، نقشہ میں کیا کیا چاہیئے
کونسا اِسٹائیل ہو، کیسا نمونہ چاہیئے

نووارد : دیکھئے، قبلہ مجھے کچھ ایسا نقشہ چاہیئے
جس کو سب اہلِ جہاں حیرت سے دیکھا چاہیئے
خوب گنجائش رہے، دیوان خانے کے لیے
اک کشادہ ہال ہو میرے زنانے کے لیے
کم سے کم حمام دو رکھئے نہانے کے لیے
کچھ کھلا حصّہ رہے زلفیں سکھانے کے لیے
چار ہوں بڈ روم، کیونکہ چار کے قبضہ میں ہوں
میں اکیلا لشکرِ جرّار کے قبضہ میں ہوں
ہاں کچن میں، چار چولہوں کے لیے اِسپیس ہو
واش بیسن چار، لیکن ایک سی سر فیس ہو
ہو اگر اسٹور میں بھی ایک کھڑکی، خوب ہے
کیونکہ بازو کے مکاں والوں کی لڑکی خوب ہے
پچھلے حصّے میں کہیں اِک چور دروازہ رہے
بس "میری" "محبوبِ نو" کو جس کا اندازہ رہے
میں نے اک موریس بھی قسطوں پر خریدی ہے جناب
دیکھئے! دیجے مجھے گیراج بلیشہ لاجواب
کار کے ہمراہ جس میں اس کا شوفر بھی رہے
آٹھ لڑکے، ایک بیوی اور دُختر بھی رہے

غالب : ٹھیک ہے اب آپ تھوڑی دیر رُکیئے گا یہاں
میں ابھی "موزوں کیے دیتا ہوں" اچھا سا مکاں

. اور پھر غالب "زمینِ فکر" چمکانے لگے
. ایک گھنٹہ بعد ہی پھر اُس سے فرمانے لگے

غالب : لیجے صاحب، مکاں یہ آپ کا تیار ہے
اس میں ہر اک چیز ہے جو آپ کو درکار ہے

پرسپکٹیو ہے یہ میری شوخیٔ تحریر کا
آر۔سی پیرہن ہے، پیکرِ تصویر کا
اِس طرف بھی دیکھئے، یہ آپ کا بڈ روم ہے
خوبیاں کیا کیا ہیں اس میں، آپ کو معلوم ہے؟
میں نے رکھی ہے جگہ اس میں ڈبل بڈ کے لیے
خوب گنجائش ہے اُوپر آپ کے ہیڈ کے لیے
ایک پائیں باغ ہے جشنِ بہاراں کے لیے
اک سوئمنگ پول حُسنِ نیم عریاں کے لیے
سیڑھیاں بالائی منزل کی ہیں مثلِ کہکشاں
مثلِ دل محراب ہیں، پلکوں کے جیسی کھڑکیاں
یہ ورانڈہ ہے تمہاری بیویوں کے واسطے
اک نیا زنداں ہے گویا قیدیوں کے واسطے
اب ذرا سا غور باتوں پہ مری فرمایئے
میں جو کہتا ہوں ڈیکوریشن وہی کروایئے
سبزہ شاداب کی شطرنجیاں بچھوایئے
چوبِ صندل کی بنی سب کھڑکیاں لگوایئے
گیسوئے پُر پیچ وخم کی چلمنیں ڈلوایئے
سرخیٔ لب کی یہاں ڈسٹمپر نگ کروایئے
شب کو دیواروں پہ داغِ دل لگایا کیجئے
زخمِ دل کے پھول میزوں پر سجایا کیجئے
ایرکنڈیشنڈ ہوں کمرے، تو ایسا کیجئے
عاشقوں کے پھیپھڑے سیلنگ سے لٹکا دیجئے
ایک دن میں دو دفعہ کیجئے برش حمام کو
کیجئے گا سیلِ گریہ سے فلش حمام کو
مینٹیننس ہو تو یہ گھر جاں فزا بن جائے گا
ورنہ پھر یہ آپ سب کا مقبرہ بن جائے گا ■

شفیقہ فرحت

دُعا دیتے ہیں راہزن کو

شفیقہ فرحت، ایک طویل عرصے سے مزاحیہ مضامین لکھ رہی ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی تخلیقات، شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ آسان زبان اور دلکش پیرایہ بیان پر اُن کی گرفت، قاری سے ہمیشہ خراجِ تحسین وصول کرتی ہے۔ وہ بھوپال کے ایک کالج میں لکچرار ہیں۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۱ء میں ان کے سولہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "لو آج ہم بھی" خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ وہ مزاح نگاروں کی کُل ہند پیمانے پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں متعدد بار اپنے مزاحیہ مضامین سُنا چکی ہیں۔

ہر ذی عقل اور باشعور خواص اور بے عقل و بے شعور عوام ہر چور کو خواہ وہ ہیرا پھیری والا ہو یا اصل نسل خاندانی گالیاں دیتے ہیں مگر ہم دعا دیں ——!

اس لیئے نہیں کہ —— "رہا کھٹکا نہ چوری کا ——"

کہ وہ تو کبھی تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس لیئے کہ ایک معمولی سے کلاس فور قسم کے چور نے آن واحد میں بغیر کوئی یونین بنائے تن تنہا پورے محلہ کی کایا پلٹ کرکے رکھ دی۔ کلاس سینکڑوں محلہ سدھار کمیٹیاں اور سبھائیں برسوں میٹنگ کرتیں۔ مہینوں اسکیمیں بنائیں اور ہزاروں پرستاؤ سر دھنتی اور بے تکان سے پاس کرتیں تب بھی اتنا تو کیا اس کا دسواں بیسواں حصہ بھی نہ کر پاتیں ——!! جنم جنم کے باسی

اور کرم کرم کے لواسی اپنے اسی جانے پہچانے محلے کو کر جواب قطعی جانا پہچانا نہیں رہا۔ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہے ہیں اور خوب سمجھ سمجھ کر پھر آنکھیں بند کر رہے ہیں ——— !!

چوری کے جرم عزت مآب جناب راہزن صاحب کو (یہ خطاب ان کی لاثانی سماجی خدمات یعنی SOCIAL SERVICE کے اعتراف کا ثبوت ہے ——— !) جو سزا ملے وہ اپنی جگہ درست (بشرطیکہ پولیس اپنی دیرینہ روایتوں کو توڑ کر اسے گرفتار کرنے میں اور عدالت اسے مجرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے ——— !!) لیکن اس نیک کام کے صلے میں کہ جو تلوار کی دھار سے تیز اور بال سے باریک ہے اُسے بہت بڑا انعام ملنا چاہیئے۔ اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ ہار پھول پہنا کر سارے شہر میں اس کا جلوس نکالا جائے۔ بلکہ ممکن ہو تو دوسرے دیشوں اور پردیشوں کا ٹور بھی کروا دیا جائے اور دیش سیوکوں کی فہرست میں اس کا نام سنہری نہ سہی کالے حرفوں سے لکھ دیا جائے!

وہ راوی قصہ اصل و قصہ نقل کو یوں شروع کرتا ہے کہ موسم سرما کے ایک انتہائی خوشگوار مہینے میں ہمارے چھوٹے سے محلے میں کہ جس میں اچھے خاصے سند یافتہ شریف شرفا رہا کرتے تھے دن دھاڑے چوری کی وارداتیں کچھ ایسے زور و شور سے ہونے لگیں کہ جیسے باقاعدہ طور پر "چوری سپتاہ" منایا جا رہا ہو ——— !

اِدھر صاحب دفتر کو اور میم صاحب گپ شپ کو سدھاریں اُدھر چور صاحب گھر کو خانۂ بے تکلف اور خود کو مہمان بالکلف سمجھ کے وارد ہو گئے۔ اور روپیہ پیسہ زیور، برتن، گھڑی، ریڈیو، اچھے بُرے، دھلے بے دھلے کپڑے۔ ڈیکوریشن، پیسنز غرض جو ہاتھ لگا اور جس جس سے آپ کے ذوق کی تسکین ہوئی پہلے تو اسے شرف قبولیت بخشا اور پھر دال دلیہ۔ چائے شربت جو کچھ میسر آیا اس سے خود اپنی خاطر مدارات کی اور رخصت ہو گئے ——— : چور کیا تھا اچھا خاصا لوٹے کا جن اور علی بابا کا بھائی بند (کہ جنھیں جدید ترین اصطلاح میں کامیاب سیاست داں بھی کہا جاتا ہے ——— :) کہ جہاں سے چاہا نکل آیا۔ جہاں چاہا غائب ہو گیا۔ ہر بند تالے کو کھول لیا اور ہر کھلے تالے کو بند کر دیا ——— !

ابھی ان کے پانچ سات ہی سرکاری اور غیر سرکاری دورے ہوئے تھے (سرکاری دورہ وہ کہ جس کا تفصیلی پروگرام دورے کے بعد تھانے میں درج کرا دیا جائے ——— !) کہ محلے کے رنگ اور محلے والوں اور محلے والیوں کے ڈھنگ سب پہ انقلاب زندہ باد کی مہر لگ گئی۔ نہ وہ پہلا سا کس بل۔ نہ وہ اگلی سی اکڑ نہ وہ روایتی اور تاریخی عز و رسب تالوں کے ساتھ ٹوٹ کے بکھر گئے !

بنگلہ نمبر ایک کے مالک کی مونچھوں میں بنگلہ نمبر دو کے مکین کو دیکھ کر خود بہ خود لاتعداد بل پڑ جاتے تھے۔ کیوں کہ ان کے عہدے کا نمبر ایک اور ٹھپّہ سی کے عہدہ کا نمبر دو تھا ——— !

گنجے مہاشے کی چمکیلی چاند کو سنبھالنے والی گردن مٹاپے کی وجہ سے اکڑنے کی صلاحیت نہ رکھنے کے باوجود اس لئے اکڑی رہتی تھی کہ ان کی ڈگریوں کی لمبائی سب سے زیادہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر صحیح مردم شماری کی جائے تو محلے میں انسان کم اور بیوقوف زیادہ نکلیں گے۔ اور چونکہ صحبت ناجنس ہارٹ اٹیک کا شرطیہ اور آزمودہ سبب ہے پھر بھلا احمقوں سے بات کرنے کی حماقت کرکے

یہ رنگ لگائے ـــــ !

"با کمال" "بے کاروں" کو منہ نہ لگاتے تھے اور اسکوٹر اور سائیکل سوار پیادہ دستوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے ـــــ !

مہیلا سبھا کی داخلی اور خارجی پالیسیاں تو اس سے بھی شاندار تھیں۔ مسز لالانی اپنی لیٹسٹ ڈیزائن کی امپورٹیڈ ساڑیوں (جن میں اکثر شہر کے غیر معروف بازار کے فٹ پاتھ سے خریدی جاتی تھیں ـــــ !) کے سہارے "مس محلہ" کا خطاب حاصل کرنے کی دھن میں رہا کرتی تھیں۔ تو مسز ڈھاکی اپنے قیمتی زیوروں کے بل بوتے پر ـــــ !

اپنے فرنیچر پر اکڑتی تھیں تو کوئی اپنے ڈیکوریشن پیس پر ـــــ !

کو اپنے میاں کی افسری پر ناز تھا تو کسی کو اپنے نوکر کی وفاداری پر ـــــ !

لوگ ایک دوسرے سے بولیں تو کیوں۔ اور کس لئے ؟ اور جو کبھی بات کریں بھی تو یوں کہ جیسے آواز پر کرفیو لگا ہوا ۔ ۔ ۔ الفاظ پہ دفعہ ۱۴۴ ـــــ !!

مسکراہٹ ۔ سواس کا یہ عالم کہ

یوں مسکرائے جان سی کلیوں کی مٹ گئی

صدقے اس چوری کے رولر کے کہ بھانت بھانت کی اونچ نیچ مٹا کے سارے محلے کو کرکٹ گراؤنڈ بنا دیا ـــــ یا یوں کہیئے کہ محلے میں سوشلزم آ گیا ـــــ

آپ ہی سوچیے جب میز کی درازوں سے اور تجوریوں کے خانوں سے بلکہ گدوں اور تکیوں کے اندر سے پیسہ پر لگا کے اڑ گیا تو کون رہ گیا امیر اور کون بی۔ لو اسیر ـــــ ! اور جب آدرنیہ شریمان چور مہاراج نے سب کو بیوقوف بنا رکھا ہے تو ایک کلکٹر کی ڈگری کو کیا اور ایک ملی میٹر کی تو کیا ـــــ !

جب ساڑیاں ہی نہ رہیں تو فیشن کیسا اور "مس محلہ" مقابلہ کیا معنی ـــــ !! لہٰذا ۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

(اور محمودہ اور بی ایازی بھی ۔!!)

وہی جو ایک دوسرے کا نام تک جاننے سے انکار کرتے تھے ۔ یا ایک دوسرے کو دیکھ کر ناک اور بھوں کے زاویے کو ساٹھ ڈگری پینتالیس پہ لے آتے تھے ۔ گھل مل کر گھنٹوں باتیں کر رہے ہیں ۔ بیٹے بیٹیوں ۔ پوتے نواسیوں بلکہ مرغی اور بکریوں تک کی خیریت دریافت کی جا رہی ہے ۔ ایک دوسرے کے لا علاج امراض کے علاج کے سلسلے میں خاندانی نسخے بتائے جا رہے ہیں ۔ بیٹیوں کے لیے بر اور بیٹوں کے لئے دلہن (یعنی دختر) تلاش کیے جا رہے ہیں ۔

عورتیں دوسروں میں کیڑے نکالنے کے بجائے یا تو ان سے ہمدردیاں سمیٹ رہی ہیں یا الٹی پر ہمدردیاں نچھاور کر رہی ہیں یا تازہ ترین واقعات اور اقوال کی داستانیں اپنے ذوق اور حوصلے کے مطابق نمک مرچ لگا لگا کر بیاں کر رہی ہیں ۔

بزرگوں نے گھر کے چھوٹے بڑے ہر کام میں مین میخ نکالنا اور ہر دوسرے لمحے بچوں کو باسبب اور بلاسبب ڈانٹنا اور ہر آئے گئے کا حسب نسب پوچھ کر انکوری کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اور سر جوڑ کر جاسوسی کی اسکیمیں جاسوسی ناولوں کی درپردہ مدد سے بنانے لگے ہیں اور ساتھ ساتھ محلے کی ڈیفنس لائن بھی سنبھال لی ہے جس کے نتیجے میں انھیں اپنا چیک پوسٹ گھر کے برآمدے کے بجائے گلی کے نکڑ پہ بنانا پڑا ـــــ قومی یک جہتی کی ایسی شاندار مثال کا ہے کو کسی نے دیکھی ہوگی اور وہ بھی پلک جھپکتے ـــــ!

اللہ اللہ ہمارا وہ محلہ جو عاشق کے دل اور مفلس کے چراغ کی طرح شام سے ہی کچھ بجھا بجھا سا رہتا تھا جس کے اکثر بلب مجنوں کے سر کی طرح لڑکوں کے پتھروں کا نشانہ بن جاتے اب وہی محلہ دریائے لندن بنا تھا ـــــ کیوں کہ لڑکے جب سنگ اٹھاتے تو انھیں اپنا گھر یاد آجاتا ـــــ!!

چوری کے شبہ میں گھروں کے تمام بہانہ باز و حیلہ ساز نوکروں اور محلے کے اکلوتے کاہل جمعدار اور اس کی روپ متی بیگم سب کی حسب توفیق خاطر مدارات کی گئی لہٰذا ڈر کے مارے سب کے سب انتہائی شریف اور محنتی بننے کی کامیاب اداکاری کرنے لگے حتیٰ کہ روپ متی نے گھروں سے صابن۔ اور لپ اسٹک پاؤڈر بھی اُڑا کے لگانے کا پروگرام وقتی طور پر بند کر دیا ـــــ!

ہر قسم کے پھیری والوں کا داخلہ محلے میں بند ہو گیا۔ دو چار دن تو فضا کچھ اکھڑی اکھڑی سی اور دسترخوان سونے سونے سے رہے پھر گھر کے مَردوں کی غیرت کا تالاب موجیں مارنے لگا اور وہ خود سودا سلف لانے لگے۔ جس سے سُنا ہے گھر کے بجٹ پر خوشگوار اثرات پڑنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں ـــــ!! بلکہ رائے عامہ تو یہ ہے کہ اتنا سرپلس بجٹ صدیوں میں نہیں بن پایا تھا اب بننے کی اُمید ہے ـــــ!

اور بجٹ کیا اب تو ہر صورت سے بچت ہی بچت کے آثار ہیں۔

چوری کے صدقے خواتین دل مارے دم سادھے بیٹھی ہیں۔ نہ ساڑی کی فرمائش، نہ زیور کی ضد۔ نہ برتنوں کی خریداری نہ فرنیچر کی۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو وہ بغیر اناج کے کام چلانے کی یوجنائیں بنا لیتیں ـــــ!!

اور دنیا کا چھبیسواں یا ستائیسواں عجوبہ جو اس چوری کے طفیل رونما ہوا ہے وہ یہ کہ اب میزبانی اور مہمان نوازی کو محلہ بدر کر دیا گیا ہے۔ جی ہاں آخری چوری اس وقت ہوئی تھی جب صاحبِ خانہ اپنے طول طویل خاندان سمیت اپنے ایک دوست (کہ جس کے حق میں ان کی یہ ادا دشمنی سے کم نہ تھی ـــــ :) کے گھر کھانا کھانے تشریف لے گئے تھے ـــــ لہٰذا اب کوئی کسی کے گھر چائے تک پینے کا روادار نہیں ـــــ! بلکہ خود اپنے ہی گھر نوالہ اُٹھاتے جھرجھری آجاتی ہے ـــــ!!

اور خُدا اس نقب زنی اور قفل شکنی کو سلامت رکھے کہ اس کی وجہ سے اپنی تو پانچوں اُنگلیاں گھی میں ہیں . . .

ارے خدانخواستہ آپ کو یہ شبہ تو نہیں کہ چور اینڈ چور لمیٹیڈ کے شیئر ہولڈرس میں اپنا بھی نام ہے ـــــ! ورنہ پھر تو سر بھی کڑھائی میں نظر آئے گا ـــــ!

قصہ یہ ہے کہ اس سے پہلے ہر شخص اپنے گھر کے علاوہ ہر جگہ پایا جاتا تھا۔ اب اگر کسی سے کوئی کام ہے تو جلے پیر کی بلی کی طرح گھر گھر جھانکتے رہتے ہیں۔ پانچ منٹ کے کام پہ سو کے پانچ گھنٹے تو ادا ہی کرنے پڑتے تھے۔ اور خانہ بہ خانہ پھرنے کی

وجہ سے اکثر یہ بھی ہوتا کہ خود اپنے دروازے پر ہر دوسرے منٹ دستک کے ساز بج رہے ہیں۔

"ارے بھئی فلاں صاحب یہاں تو نہیں ـــــ!

"جی نہیں"

"مگر صاحب وہ اپنے گھر سے تو بہت دیر پہلے نکلے تھے کئی جگہ تلاش کیا مگر کہیں ملے نہیں شاید یہیں آئے ہوں۔ میں یہیں ان کا انتظار کیئے لیتا ہوں ـــــ!!

تھوڑی دیر بعد پتہ چلتا کہ انتظار کرنے والوں کی تعداد ملنے والوں کی تعداد سے تجاوز کر چکی ہے اور مہینے کے دوسرے ہفتے ہی میں ہمیں یہ بھی پتہ چل جاتا کہ ہمارا دیوالہ نکل چکا ہے ـــــ!!

نئی کتابیں اور رسالے الگ فریاد کرتے رہتے۔

اب نہ وہ ہنگامہ ہاؤ ہو ہے نہ وہ پیالیوں کی کھڑ کھڑاہٹ ـــــ

بس ہم ہیں اور ہمارا گوشۂ عافیت ـــــ

پھر کیوں نہ دُعا دیں راہزن کو ـــــ!!

■■

زندہ دِلانِ حیدرآباد کی پندرھویں ۱۵ سالانہ تقاریب کے موقع پر

نیک تمنائیں

عذرا پیلکو

وِنائیک راؤ بلڈنگ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون نمبر ۴۲۳۵۲ اور ۴۵۵۰۹

سر پٹ حیدرآبادی

محمد اسد حسن انصاری (اسد انصاری) اپنا مزاحیہ کلام، مشاعروں کی نکھری ستھری محفلوں میں ۱۹۶۱ء سے سنا رہے ہیں۔ مزاحیہ شاعری میں انھوں نے اپنا تخلص سرپٹ رکھا ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے یادگار مشاعروں میں بھی وہ باذوق سامعین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ وہ اپنے اشعار جھوم جھوم کر سینہ تان کر بلکہ ڈٹ کر سناتے ہیں۔ ان کے اشعار میں چونکا دینے والا عنصر موجود رہتا ہے۔ ان کی شاعری عصری سماج کے مسائل کا آئینہ ہے۔ ۱۹۱۹ء سے ان کی سنجیدہ شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔ سنجیدہ شاعری میں وہ آرزو لکھنوی، اثر لکھنوی اور سراج لکھنوی جیسے اردو کے کہنہ مشق شعرا کے شاگرد رہے ہیں، ان کی مزاحیہ شاعری کا پہلا مجموعہ "دھرگھسیٹے" جو تقریباً (۱۵۰) غزلیات پر مشتمل ہے، جولائی ۱۹۷۹ء میں شایع ہوا۔

چمچے

ہر بزم میں رنگ اپنا جما لیتے ہیں چمچے
چوری کے بھی اشعار سنا دیتے ہیں چمچے

معیارِ شرافت کا گرا دیتے ہیں چمچے
نظروں سے کمینوں کو چڑھا دیتے ہیں چمچے

روتے ہوئے انسان کو ہنسا دیتے ہیں چمچے
ہنستے ہوئے انسان کو رلا دیتے ہیں چمچے

وہ چمچے جو خود کو کبھی چمچے نہیں کہتے
چہروں سے نقاب ان کے اٹھا دیتے ہیں چمچے

اغیار تو اغیار ہیں اغیار کا کیا ذکر
چمچوں کو بھی چمچوں سے لڑا دیتے ہیں چمچے

چمچوں کی ہوا چلتی ہے چمچوں کی ہے دنیا
ہنگامہ زمانے میں مچا دیتے ہیں چمچے

کرتے ہیں یہ کوشش کہ نہ ہوں ختم فسادات
بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں چمچے

پھیلاتے ہیں تاریکی زمانے میں یہ ہر سو
جلتی ہوئی ہر شمع بجھا دیتے ہیں چمچے

ڈر آگ کے لگنے کا ہو جس شمع کی لو سے
اس شمع کی لو اور بڑھا دیتے ہیں چمچے

جس موڑ پہ رہرو کے بھٹکنے کا ہو خطرہ
اس موڑ پہ رہرو کو دغا دیتے ہیں چمچے

رہتی ہے انھیں دیکھنے والوں کی ضرورت
جنت بھی ہتھیلی پہ دکھا دیتے ہیں چمچے

کوئی نہ سنے یا سنے اس کی نہیں پرواہ
بے وقت کی شہنائی بجا دیتے ہیں چمچے

خوش رہنے نہیں دیتے کسی کو یہ ہمیشہ
ہر رنگ میں کچھ بھنگ ملا دیتے ہیں چمچے

مُردوں کے بہ ہر حال چرا لیتے ہیں کفن چور
زندوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں چمچے

منزل پہ پہنچتے ہیں گدھے رشوتیں دے کر
میدان سے سرپٹ کو بھگا دیتے ہیں چمچے

قطعات

کبھی وعدوں سے وہ اپنے مکر جاتے تو اچھا تھا
نہ کرتے رو رعایت کچھ بپھر جاتے تو اچھا تھا
بنا دیں گے مرے اور ان کی درگت سب مرے دشمن
مرے مرنے سے پہلے ہی وہ مر جاتے تو اچھا تھا

بے تحاشا عشق کر سکتا ہوں میں
جس حسیں پر چاہے مر سکتا ہوں میں
چال سرپٹ چلتا ہے گھوڑا مرا
کیا کسی ٹٹو سے ڈر سکتا ہوں میں

مصطفٰے علی بیگ

[۱۹۵۸ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔ ایس سی کامیاب کیا۔ ویر ہاؤزنگ کارپوریشن میں آفیسر ہیں۔ چند سال تک پیشۂ تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ طالب علمی کے زمانے سے اسٹیج کے اداکار ہیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ، ان کے فن میں نکھار آیا ہے۔ اینگلو اردو شاعر کی حیثیت سے ان کا اپنا لہجہ اور خاص رنگ ہے۔ اپنے مزاحیہ اردو اشعار میں موزوں انگریزی الفاظ کا اس بے تکلفی اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ شائقین اور قدر دانانِ فن، داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے ہیں اور اچھے خاکہ نگار بھی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی سے بھی دلچسپ پروگرام پیش کیا کرتے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے معتمد عمومی بھی رہ چکے ہیں۔ کل ہند پیمانے پر منعقد ہونے والے مشاعروں اور کلچرل پروگراموں میں، متعدد مرتبہ حصہ لے چکے ہیں۔]

○

پچھلے دنوں، فسادات کے دوران قاتل، بے خطا اور پُرامن شہریوں کا نام پوچھ کر چاقو زنی کر رہے تھے ان افسوسناک حادثات سے متاثر ہوکر قطعہ کہا گیا:

قطعہ

لائف اینڈ ڈیتھ بھی ہوگیا گیم
رئیلی رانٹ از اے میاٹر آف شیم
رام کہوں یا کہوں رحیم!!
قاتل پوچھ رہا ہے نیم!!

وہ بے وفا تھے راہ کی TURNING میں رہ گئے
ہم تو اکیلے LIFE کی BURNING میں رہ گئے
خالہ تو TIGHT گرل ہیں خوشیوں میں عید کی
افسوس اب کے خالو ہی PENDING میں رہ گئے
یاں کام نکلا کرتے ہیں BACK-DOOR سے
دیوانے MAIN ڈور کی WATCHING میں رہ گئے
شادی کے بعد وہ کئی بچوں کی ہیں MOTHER
غافل تھے ہم جو عشق کی LEARNING میں رہ گئے
سب کی ٹرین عشق کی منزل پہ جا پہنچی!!
ہم انتظارِ یار کی SHUNTING میں رہ گئے

———

گلیم میڈکی

جامعۂ نظامیہ کے منشی اور منشی فاضل ہیں سررشتۂ مال سے منسلک رہے اور حال ہی وظیفہ پر علحدہ ہوئے ہیں۔خود ان کا بیان ہے کہ " اصلاعی بود و باش اور گاؤں گاؤں کا پانی پینے کی وجہ سے رہی سہی علمی قابلیت بھی نذرِ دیہات ہوکر دہقانیوں کے ماحول میں گم ہوگئی تھی ۔اگرچکہ والد بزرگوار ایک جید عالم اور اچھے شاعر تھے چونکہ مجھ پر مزاح کا رنگ غالب تھا اس لیے سنجیدگی کے میدان سے گریز کرتا رہا۔ اگرچکہ سنجیدہ کلام بھی مزاحیہ کلام سے کئی گنا زیادہ ہے۔

ہٹتا نہیں ہے پیچھے میں کبھی خوف و خطر سے
واقف ہے زمانہ تو میرے عیب و ہنر سے
فولاد کا انسان ہوں پولیس میں ملازم
ڈرتا نہیں بیگم کے سوا شیر و ببر سے

○

اتفاقاً میں کسی مہینے اگر کم لاؤں پے
رات بھر ٹھہرائے رکھتی ہے مجھے ایک پاؤں پے
کم نہیں ہوں میں بھی یارو لینے اپنا انتقام
جم کے جوتے مارتا ہوں جاکے اُس کی چھاؤں پے

○

انصاف ہو اس دور میں وہ دَور نہیں ہے
جمہور ہے جمہوریہ کچھ اور نہیں ہے
پولیس بھی ہماری ہے عدالت بھی ہماری
قاتل کو سزا دینے کا دستور نہیں ہے

بھائی بھی اس زمانہ کا دشمن کے ناد ہے
سگی بہن بھی پیٹ کی سوکن کے ناد ہے
بیٹی پرائے گھر کی ہوئی اُس کا کیا گِلہ
گھر کی بہو بھی اپنی پڑوسن کے ناد ہے
جب سے رلا ہے نخی کو کالج میں داخلہ
ہرنی کے ناد دوڑتی ناگن کے ناد ہے
پڑھنے میں زیرو گانے بجانے میں فسٹ ہے
بیٹی شریف گھر کی میراثن کے ناد ہے
چونڈے میں پھول چہرے پہ پوڈر کی راک ہے
گلشن کے ناد سر ہے منہ آنگن کے ناد ہے
مُنہ میٹھا، بات میٹھی ہے، میٹھی ہے چال بھی
میٹھی شکر کی فیکٹری بودھن کے ناد ہے
بہو کو چرالو ساس کو کہتے ہیں ناپ لو
فطرت انوں کی تھالی میں بینگن کے ناد ہے
نانِ جوار اپنے پسینے کی لے گلیم
عزت سے گر ملے تو متنجن کے ناد ہے

مسیح انجم

مملکتِ نقلستان

مسیح انجم کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "سائیڈ سے چلئے" جنوری ۱۹۷۲ء میں اور دوسرا مجموعہ "در پردہ" ڈسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ "چاپلوسی" زیر ترتیب ہے۔

خود اُن کے خیال کے مطابق شہر حیدرآباد کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو "شعلہ بنا کر بھڑکایا"۔ اُن کے موضوعات، سماج کے مختلف طبقات اور مختلف مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی زندگی اور ان کی نگارشات کی مشترکہ خصوصیت سلیقہ ہے۔ وہ اپنی بات کو بہت سلیقہ اور شائستہ انداز میں کہتے ہیں۔ اسلوب نگارش شگفتہ ہے اور زبان سادہ و سلیس۔ نام مسیح الدین ہے۔ ۶/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو موضع ویلکٹور تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ کیا۔ پیشہ آبا مدرسی ہے۔ وہ بھی پیشہ تدریس سے وابستہ ہیں۔

جب ملک میں نقل مار کر ہر قسم کے امتحانات کامیاب کرنے والوں کی بہتات ہوگئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں نقال ہی نقال چھاگئے تو اُن میں سے چند اعلیٰ پائے کے نقالوں نے اپنی ایک سیاسی جماعت "فارغ النقل پارٹی" کے نام سے قائم کی اور پھر اپنی ایک علیحدہ ریاست "مملکتِ نقلستان" کا مطالبہ شروع کردیا۔ ابتداء میں اس تحریک کو بڑی شدت کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی لیکن ہر بار اس پارٹی نے اسی شدت کے ساتھ نعرہ بلند کیا ـــــ جتنا دباؤ گے تم اتنا ہی اُبھریں گے ہم"

بالآخر ارباب مقتدر کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ نقل مارتے مارتے اس پارٹی کے اراکین کی عقل ماری گئی ہے اور اب وہ کسی طرح ماننے والے نہیں تو اُنہوں نے تجرباتی اساس پر ایک علیحدہ ریاست "مملکتِ نقلستان" کے قیام کی منظوری دے دی۔ بس پھر کیا تھا۔ نقالوں نے تالیاں پیٹیں اور گنتی کے چند حقیقی دانشور اپنا اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔ نتیجتاً اُن کے سر کے رہے سہے بال بھی جھڑ گئے۔ چنانچہ

۱۴/مارچ کی رات کو [illegible]

بڑے دھڑلّے سے کیا گیا۔ اور دوسرے ہی روز ایک بہت بڑا بورڈ شہر کے بیچوں بیچ نصب کیا گیا، جس پر لکھا ہوا تھا:

"EXPERIMENTAL STATE TO PROMOTE ACTING AND DUPLICATING IN EACH AND EVERYFIELD"

قیام ریاست کے ساتھ ہی چیف منسٹری کے عہدہ کے لئے "فارغ النقل پارٹی" کے اراکین میں زبردست رسّہ کشی شروع ہوگئی۔ انھیں ایک ایسے لیڈر کی تلاش تھی جو کسی "چمن" میں پیدا ہوا ہو۔ تاکہ اس کے پرلوک سدھار نے پر تعزیتی جلسہ میں جب مقررین "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" پڑھیں تو یہ مصرعہ سو رگباشی پر مقام پیدائش کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک منطبق ہو، اور مقررین کی جہالت اور کم علمی پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد آخر ایک ایسا "دیدہ ور" مل ہی گیا جو "بڑی مشکل سے" گولی گوڑہ "چمن" میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو چیف منسٹری کی گدی پر بٹھایا گیا۔

گدی پر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا انقلابی قدم یہ اُٹھایا کہ سارے کے سارے قلمدان ہائے وزارت اپنے ہی پاس رکھ لئے۔ پارٹی کے اراکین نے جب اس غاصبانہ قبضہ کی جانب توجہ دلائی تو ہز ایکسلینسی نے مسکراتے ہوئے اپنے رفقاء میں قلمدانوں کی بجائے بٹوؤں کا بٹوارہ کیا۔ البتہ ایک خاتون وزیر کی خدمت میں خواتین کے بین الاقوامی سال کی اہمیت کے پیش نظر ازراہ قدردانی بٹوہ کی بجائے پاندان عنایت فرمایا تاکہ کسی ہنگامی اجلاس کے موقع پر ہنگامہ برپا ہوجائے اور ایک دوسرے پر دانت کچکچانے کی نوبت پیش آئے تو فوراً پان کے بیڑوں کا انتظام ہوسکے۔

اس طرح وہ خاتون "محکمہ سماجی بھلائی" کے پاندان کی مستحق قرار پائیں۔

محکمہ صحت وطبابت کا بٹوہ پارٹی کے ایک ایسے رُکن کو دیا گیا جو ہمیشہ کسی نہ کسی درد اور مرض میں مبتلا رہنے کی ایکٹنگ کیا کرتا تھا اور پارٹی میں "دائم المریض" کے نام سے مقبولیت حاصل کرچکا تھا۔ بٹوؤں کی تقسیم کے وقت وہ قوم کے درد میں مبتلا تھا۔

ـــــ محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ کا بٹوہ ایک ایسے رُکن کو دیا گیا جو موٹروں کے نقلی اسپیر پارٹس کے دھندے کے سلسلہ میں نقل مقام کرجاتا تھا۔

وزارت داخلہ کا بٹوہ پارٹی کے ایک سینیئر رُکن کے حصہ میں آیا جو پارٹی کے "داخل خارج رجسٹر" کے اندراجات کیا کرتا تھا۔

محکمہ مال کا بٹوہ جس رُکن کو ملا وہ اسے ایک گھنٹے تک بھی نہیں سنبھال سکا اور عجلت میں کھو ڈالا۔

اس کے بعد چیف منسٹر کو موزوں ترین رفقائے کار نہ مل سکے تو باقی سارے کے سارے بٹوے اپنے بریف کیس میں رکھ لیئے۔ دوسرے دن اخبارات میں جب وزراء کی تصاویر معہ بٹوہ و تعارف چھپیں تو عوام نے ایڈیٹروں کے نام احتجاجی مراسلے لکھے۔ لیکن اگلے ہی دن کے اخبارات کے ایک سطری اہم اداریہ نے سارے عوام کو خاموش کردیا کہ

"جیسی روح ویسے فرشتے"

مختلف محکمہ جات کے بٹوؤں کی تقسیم کے بعد نقلستان کی حکومت نے دیانت دار اور اصلی اسنادات رکھنے والے ملازمین کو سارے محکمہ جات اور دفاتر سے پاک وصاف کرنے کا تہیہ کرلیا کیوں کہ حکومت کو یہ خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ اصلی اسنادات رکھنے

زین اپنی اعلیٰ وارفع صلاحیت کی ٹارچ لے کر فارغ النعقل ملازمین کے کالے کرتوتوں پر ضرور روشنی ڈالیں گے۔ جس کی وجہ
اتہ میں غیر ضروری خلل پیدا ہو جائے گا اور کام میں رکاوٹ پیدا ہو گی لیکن جب مختلف محکموں اور دفتروں سے اِس قسم کے
ی صفائی کا کام شروع ہوا تو حکومت کے ہوش اُڑ گئے۔ کیوں کہ تحقیق کرنے پر کوئی ملازم ایسا نہ ملا جس نے اپنے طالب علمی
میں مختلف امتحانات کے موقعوں پر نقل نہ ماری ہو۔ بڑی مشکل سے گنتی کے چند ملازمین ایسے دریافت کئے گئے جو امتحانات
نے میں صرف فارمولے، مقولے، ضابطے، اصطلاحات، تعریفات اور سنہ وغیرہ پوائنٹس..... کے طور پر اپنے ساتھ رکھا
ے بالآخر اُن سے وضاحت طلب کی گئی کہ "آخر وہ کونسی رکاوٹ یا جذبہ تھا جو کھُلم کھُلا نقل مارنے سے روکتا تھا؟ اندرون
گھنٹے صاف صاف نہ بتلائیں تو بیرون دفتر کر دیا جائے گا اور سندیں ضبط کر لی جائیں گی!"

بے چارے اِس نامعقول ایکسپلینیشن (EXPLANATION) کا کیا معقول جواب دیتے!؟ نتیجتاً اپنی اپنی سندوں
میں لٹکائے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور بالآخر روپوش ہو گئے۔

اس کے بعد نقلستان کی حکومت نے ایک اور اہم حکمنامہ جاری کیا کہ آئندہ سے ریاست کے سارے کاروبار نقلی ہوا کریں گے
نامے نے تاجروں میں مسرت کی ایک زبردست لہر دوڑا دی۔ اِس سے پہلے کہ وہ خوشی سے پاگل ہو کر اپنا جامہ پھاڑ لیتے انھیں
ے گھاٹے کا خیال آیا اور اُن کے ٹریلین کے شرٹس پھٹنے سے رہ گئے۔ پہلے جو تاجر نقلی مال کو "اصلی مال کا لیبل لگا کر بیچا کرتے تھے
صرف لیبل بدلنے پر اکتفا کرنے لگے.....

اس طرح تاجروں کا کام صرف لیبل بدلنا رہ گیا تھا۔ بدی جب بدی کے ہی روپ میں پیش ہوتی ہے تو وہ "بدی" نہیں رہتی
ائی بن جاتی ہے۔ فریب جب فریب ہی کے روپ میں سامنے آتا ہے تو وہ فریب نہیں رہتا، حقیقت بن جاتا ہے۔ یہی حال اس
ں کا ہوا۔ عوام نقلی مال کو خریدتے ہوئے "نقلی" کا لیبل لگا دیکھ کر ایک قسم کی ذہنی آسودگی حاصل کرنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ
کو دُعائیں بھی دینے لگے کہ وہ کم از کم دھوکہ اور کونت کھانے سے تو محفوظ رہے۔

اِدھر عوام نے بھی اِس حکم نامے کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ کیوں کہ اس سے پہلے ان کی جو زندگی گزر رہی تھی وہ دو متضاد کیفیتوں
رتی۔ ایک اصل اور دوسری نقل۔ پہلے اگر کسی کی محبوبہ اپنے عاشق کو دغا دے کر کسی "بھگوڑے" عاشق کے ساتھ فرار ہو جاتی تو
شق کو یہ حق پہونچتا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کے سر بے وفائی کا الزام تھوپ دے۔ اگر کوئی دوست اپنے کسی دوست کو دوستی کی آڑ
ی کا خنجر گھونپ دیتا تو وہ قابل گردن زدنی قرار پاتا۔ مگر اس حکم نامہ کے بعد وہ قدریں یکسر بدل گئیں۔ قوم نے چولا بدلا! انسان
ہیں کھو گیا۔ مرد اپنے اپنے چہروں پر کئی چہرے چڑھائے گھومنے پھرنے لگے۔ مکر و فریب کا چہرہ، خونی چہرہ، شادی چہرہ، مردانہ
نی چہرہ اور دیہاتی چہرہ عورتیں بھی بھلا چپ کیسے بیٹھتیں۔ میک اپ تو وہ بہت پہلے سے کرتی چلی آ رہی تھیں لیکن اب وہ بھی چہرے بدلنے
ٹ سے بخوبی واقف ہو گئیں۔ ایکٹریس کا چہرہ، کال گرل کا چہرہ، ماڈل گرل کا چہرہ، "دَم مارو دَم" کا چہرہ، جیب کترن کا چہرہ،
ا چہرہ اور مردانہ چہرہ۔ لیکن ان تمام چہروں میں ممتا کا چہرہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ان چہروں کے چکر نے انسان کو یہاں تک گرا دیا

کہ اس کے دُم نکل آئی۔

"نقلستان" نے ریاست کے طلباء کو امتحانات میں نقل مارنے کی کھلی چھوٹ بھی دے دی۔ کیوں کہ سیاسی لیڈروں نے مملکتِ نقلستان کے قیام کی تحریک چلاتے وقت اسی نقل کا لالچ دے کر طلباء کو تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے لئے اُکسایا تھا۔ چنانچہ قیامِ نقلستان کے بعد یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں میں نقل عام ہوگئی۔ اور عام بھی اتنی کہ طلباء میں سوچ سمجھ کر نقل کرنے کی صلاحیت یکسر معدوم ہوگئی۔ امتحانی ہال میں دورانِ امتحان اگر کوئی طالب علم اپنے پن کو جھٹکتا تو ہال کے سارے طلباء اس کی نقل کرتے ہوئے اپنے اپنے پن جھٹکنے لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے کا سارا فرش نیلی روشنائی کے دھبوں سے داغدار ہو جاتا۔ اگر کوئی طالبہ اُکتا کر انگڑائی لیتی تو ہال میں موجود ساری لڑکیاں انگڑائیاں لیتیں۔ اگر کوئی طالب علم بیزار ہو کر پہلو بدلتا تو ہال کے سارے لڑکے پہلو بدلتے۔ اور اگر کوئی شرارتاً سو جاتا تو اس کی تقلید میں ہال کے سارے لڑکے اپنی اپنی نشستوں پر سو جاتے۔ یہی نہیں۔ اگر کسی لڑکے کا دورانِ امتحان مزاج خراب ہو جاتا اور وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر گھر کی راہ لیتا تو ہال کے سارے طلباء کے مزاج بگڑ جاتے اور وہ بھی اپنی اپنی سیٹ پر پرچہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے۔ شکر ہے کہ وہ پہلے لڑکے کے گھر نہیں پہونچتے تھے۔ ان کی ان حرکتوں کو دیکھ کر یوں لگتا کہ امتحانی ہالوں میں امتحانات نہیں ہو رہے ہیں بلکہ فزیکل ڈسپلے (PHYSICAL DISPLAY) ہو رہا ہے۔

اب مُمتحنوں کا کام صرف یہ رہ گیا تھا وہ پرچے جانچنے کی بجائے یہ دیکھیں کہ ایک پرچے کے جوابات دوسرے پرچے کے عین مطابق ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد وہ تصدیق کر دیتے کہ "نقل مطابق نقل درست ہے"۔ بالآخر اس لکھنے کی زحمت سے بچنے کی خاطر ممتحن حضرات نے اس تحریر کی مُہریں تیار کروالیں۔ اب ان کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ امتحانات کے زمانہ میں "نقل مطابق نقل درست ہے" کی مُہریں کھٹا کھٹ ثبت کریں۔ اس طرح وہ ممتحن کی بجائے "مہر مار" (بہ وزن چوڑی مار) بن گئے تھے۔

ادب اور شاعری میں بھی نقالی کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ جو شعرا غالب کی دو غزلوں میں ڈوب کر ایک تیسری غزل لے آتے تھے اب سالم کی سالم غزل مرغِ مُسلّم کی طرح ہڑپ کر جانے لگے مگر انھیں یہ جاننا چاہیئے تھا مرغِ مُسلّم تو آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے لیکن غالب مشکل سے بھی ہضم ہو نہیں پاتے۔ چنانچہ مشاعروں میں شعراء غزلیں پڑھتے وقت جب کبھی تلفظ کی غلطیاں کرتے تو سامعین ہوٹنگ کے انداز میں کہتے کہ "ذرا لہجے درست کیجئے اور 'بولتا قاعدہ' و 'رواں پڑھنے کی مشق کیجئے'۔ شاعروں نے اس ہوٹنگ سے بچنے کا ایک نیا طریقہ یہ ایجاد کیا وہ مشاعروں میں نقل کی ہوئی کاپیاں پمفلٹ کی شکل میں سامعین میں تقسیم کرنے لگے۔ اس طرح مشاعروں کے سامعین کی حیثیت قارئین کی سی ہوگئی۔ جب کوئی قاری کسی شاعر کے نقلی کلام سے متاثر ہو کر "مکرر ارشاد" کہتا تو شاعر ایک ادائے دلربائی کے ساتھ ایک اور کاربن کاپی قاری کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ جب قاری "ایک اور عنایت" ہو کہتا تو شاعر اپنی دوسری جیب میں سے ایک اور نقلی غزل قاری کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ بالآخر یہ کلام قارئین کے ہاتھوں ہوتے ہوتے ردّی کی دکان پر پہونچ جاتا یا پھر پان کی دکان پر بیڑے باندھنے کیلئے اس طرز نقالی سے ادب کو تو کوئی فائدہ نہ پہونچا البتہ نقل کرتے کرتے شعراء کی ہینڈ رائٹنگ کافی سنور گئی اور وہ فنِ کتابت کی ابجد سے واقف ہوگئے۔ جو ان کے لئے ذریعہ روزگار ثابت ہوا۔

جوں توں کر کے "مملکتِ نقلستان" نے اپنی نقلی کارگزاری کے پانچ سال مکمل کر لیئے۔ ان پانچ سالوں میں وہ تمام نقلی اور مکروہ چہرے جو پہلے سات پردوں میں چھپے تھے، کھلی چھوٹ مل جانے کی وجہ سے سارے کے سارے منظرِ عام پر آ گئے۔ جب انھیں حبس دوام کی سزا دینے کی نوبت آگئی تو انہوں نے تحریری معافی نامے داخل کیئے کہ آئندہ وہ با اُصول و باوقار شہری بن کر رہیں گے۔ یوں بھی حکومت کے پاس ان سارے مکروہ چہروں کی باضابطہ فہرستیں تیار ہو چکی تھیں۔ اور وقت پڑنے پر کسی بھی ملت میں ان چہروں کو ناکارہ پُرزوں کی طرح سماج سے نکال کر کچرے کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ ●●

زندہ دلانِ حیدرآباد کی پندرھویں سالانہ سہ روزہ تقاریب کے موقع پر ہماری

نیک تمنائیں

تاج ماربل ورکس

معظم جاہی مارکٹ جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد

فون نمبر 41982

پاگل عادل آبادی

دکن کے مشہور مزاحیہ شاعر پاگل عادل آبادی کا نام احمد شریف ہے۔ عادل آباد کے ایک مدرسہ میں پڑھاتے ہیں۔ شاعری کے تین مجموعے "الم غلم" "چوں چوں کا مربہ" اور "گڑبڑ گھٹالہ" شایع ہو کر مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ "اوٹ پٹانگ" زیر طبع ہے۔ مشاعرے خوب پڑھتے اور لوٹتے ہیں۔

غزلیں

ڈبوں کا دودھ پی کر بچے جو پل رہے ہیں
وہ سب جوان ہو کر بوڑھے نکل رہے ہیں

تھالی کا بن کے بیگن نانا پھسل رہے ہیں
نانی کی سہیلیوں پہ نیت بدل رہے ہیں

اس دور ڈالڈا کا یہ بھی اثر ہو شاید
شیراں دبک رہے ہیں گیدڑ اچھل رہے ہیں

مرغوں کی کچھ خطا ہے یا مرغیوں کی سوجھ
تہذیبِ نو کے انڈے گندے نکل رہے ہیں

اِن ہپیوں کو شاید یہ بھی خبر نہیں ہے
زلفوں کے گھونسلوں میں بلبل بھی پل رہے ہیں

فتنہ گری میں باوا کچھ کم نہیں تھے لیکن
باوا سے بڑھ کے چالو بیٹے نکل رہے ہیں

تم شوق سے کراؤ فیملی پلان پھر بھی
مانند کھٹملوں کے بچے اُبل رہے ہیں

فیشن کی دوڑ میں اب لونڈوں کی بات چھوڑو
خرّانٹ بڈّھے گھوڑے سرپٹ نکل رہے ہیں

پاگل تیری غزل کا اُلٹا اثر ہوا ہے
بہرے لپک رہے ہیں لنگڑے اچھل رہے ہیں

پھاڑ کر میرا کفن آدھا اِدھر آدھا اُدھر
رکھ دیا اُس نے رہن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

معتمد نے گھر خریدا صدر نے لی پھٹ پھٹی
ہو گیا چندہ غبن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

شیخ اور مُلّا کا قبضہ ہو گیا ہے طشت پر
لُٹ گیا سارا مٹن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

لیڈروں کا بس چلے تو بول کر گاندھی کی جے
بانٹ لیں گاندھی بھون آدھا اِدھر آدھا اُدھر

بیچ میں سے مانگ اُس نے یوں نکالی دوستو
لگ گیا جیسے گہن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

جوڑ کر دو کرسیوں کو نیم کے سائے تلے
سو رہا ہے گلبدن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

بیٹھتے ہی توڑ دی میری پلنگ اُس شوخ نے
ڈال کر اپنا وزن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

تھی غزل اُستاد کی چیلے نے محفل لوٹ لی
اعتبارِ فکر و فن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

نام پر مذہب کے پاگل دھرم کی بنیاد پر
بٹ گیا میرا وطن آدھا اِدھر آدھا اُدھر

اشرف خوندمیری

[۶۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ دوسری عالم گیر جنگ نے کئی مسائل پیدا کئے۔ گرانی، بتدریج آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ زندگی کی پیچیدہ گتھیاں، اُلجھنے اور اُلجھانے لگیں۔ پھر ملک تقسیم ہوا اب نئے مسائل اور حالات کا سامنا تھا لیکن اشرف خوندمیری نے استقلال کے ساتھ، ناموافق حالات کا مقابلہ کیا۔ اور اشہبِ فکر کو طنز و مزاح کے میدان کی طرف موڑ دیا۔ کلام سننے اور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک دنیا بازیچۂ اطفال ہے۔]

○

اَٹھّا چمّاں

گھنٹوں سے گھر کی ڈِڈّی[1] پو آنکھیاں چپکا کو رکھوں
کب سے تیری آس میں دِل کی پنتّی[2] سِلگا کو بیٹھوں
کِتّا ہونداچِتّا پڑکو اپنے خابوں[3] کی سِل پو
اُلفت کے کوئلے سے اَتّھے چِتّے کے چیرے[4] کھینچوں

پیار کے دس بارہ چِٹّے[5] پتّوں میں بن کو مَلمّاں
اَرماناں کے بیٹھ میں آجا کھیلیں گے اٹّھا چمّاں

رستہ تکتے تکتے تھک تھک کو ہار کو آنکھیاں بی تھک گئے
پیار کے بھکّے پیاسے انڑیاں حلق میں آکو تھج گئے
چلتے چلتے رُک گئے جب ٹھنڈی سانسوں کے بَھرّاٹے[6]
بجلی چمکی فیوز اُڑا ہور رستے کے لٹیاں نِج گئے

گُھپ ہندیرے میں خوشیوں کی سِلگا لے کو تو شمّاں[7]
اَرماناں کے بیٹھ میں آجا کھیلیں گے اٹّھا چمّاں

---

۱ کواڑ ۲ دِیا (چراغ) ۳ خوابوں ۴ خاکے ۵ بیج (اِملی کے) ۶ فرّاٹے ۷ شمع

مشکل سے اک جونک لگئے اپنی قسمت کے پھتر میں
ایسے موقعے پو نکو پڑ اِن کے آن کے چکر میں
چُپ چُپ کے یوں نکو ڈر اب کس کا بی ڈر نئیں ہے
گھر خالی بھنڈار پڑا اُئے ہور بیٹھ اکیلا ہوں گھر میں

ابّا بچپر کو ہور چھلّے کی داوت میں گئیں اماں
ارماناں کے بیٹش میں آجا کھیلیں گے اٹھا چماں

ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے یوں نکو برسا برساتاں
خالی بیلی کٹ کو گمنا رونے پلانے میں راتاں
ٹُسکا ٹُسکا گھانس چِڑا کو اُس کی اُنچی گریوں سے
پیار کے منٹے سلگا رہوں میں سیک لے تو اپنے ہاتاں

ٹھنکالے میں نکو جا کئیں ہو جائیں گا غم کا دماں
ارماناں کے بیٹش میں آجا کھیلیں گے اٹھا چماں

میرے سچے پیار کے موتی پو مار کو نفرت کے تھپیڑے
بھل گئی کٹ کو اگے بیٹھی تھی سو اُلفت کے دھیڑے
اب پچتاوے کی منڈی کو ڈال کو اپنے گھٹنوں میں
رہ رہ کو تو سوچتی ہوں گی کاں کی مصیبت میں سپڑنے

چھوڑ کو اپنے سارے گلابی لاڈوں کا یہ بتکماش
ارماناں کے بیٹش میں آجا کھیلیں گے اٹھا چماں

کالے گورے، چھوٹے بڑے سوب آجاتیں اک لیول میں
بھل کو بی اب نکو پڑ تو کِنتو میں ہور کیول میں
پیار کے دیوتا کے پیؤں پو آکو رکھ دے اپنے پھولاں
بھید بھاؤ کچ بی نیں ہے سوب آسکتیں اِس دیول میں

وڈر، موچی، بھولی، ہریجن، ریڈّی، بوتّن سوں کماں
ارماناں کے بیٹش میں آجا کھیلیں گے اٹھا چماں

---

۱ خوبصورت ۲ انگیٹھیاں ۳ موسم سرما ۴ دقت ۵ مُنہ ۶ مصیبت ۷ پھنس گئے ۸ مقامی ہندو عورتوں کا ایک کھیل

پرویز یداللہ مہدی

چولی دامن

اُن کا وطن حیدرآباد ہے۔ رہتے بمبئی میں ہیں۔ دس گیارہ برس سے ان کا اشہب قلم بڑی تیز رفتاری کے کرشمے دکھا رہا ہے۔ اب تک ڈراموں کے ایک مجموعہ (تو تو میں میں) کے علاوہ مضامین کے تین مجموعے چھیڑ چھاڑ، جوڑی کے غلام، ٹائیں ٹائیں فش زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ مزاحیہ شاعری میں حمایت اللہ قد آور شاعر سمجھے جاتے ہیں اسی طرح مزاحیہ نثر نگاری میں پرویز یداللہ مہدی قد آور ادیب ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کے سلسلے میں منعقد ہونے والے ادبی اجلاس میں پرویز یداللہ مہدی نے طنز و مزاح سے بھرپور مضامین سنائے ہیں جن کی زبان سلیس اور اندازِ بیان دل کو چھونے اور جھنجھوڑنے والا ہوتا ہے۔

نوٹ: زیرِ نظر مضمون ذہنی طور پر نابالغ حضرات ہرگز نہ پڑھیں ورنہ نتائج کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

پہلے پہل جب حضرتِ انسان کو ستر پوشی کا خیال آیا تو درختوں کی "چھال" اور جانوروں کی کھال پر نظرِ انتخاب پڑی، پھر کیا تھا اولادِ آدم درختوں اور جانوروں پر ٹوٹ پڑی، دیکھتے ہی دیکھتے چھالوں کے "کشتے" اور کھالوں کے "پشتے" لگ گئے۔ بے چارے درختوں اور بے زبان جانوروں کی دنیا میں گویا ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ مارے ڈر کے ان کی آئندہ نسل بے چھال اور بے کھال پیدا ہوتی، انسان کی تغیر پسند طبیعت نے خوب سے خوب تر کی تلاش شروع کر دی اور اس بہانے درختوں اور جانوروں کے سر سے بلا ٹلی تھوڑے ہی عرصے کی جستجو اور کھوج کے نتیجے میں کپڑا عالمِ وجود میں آیا اور انسان نے جو کہ فطرتاً چولے بدلنے میں یکتائے روزگار دیے بعد گا ہے اپنی اس نئی دریافت سے "چولے" بنائے اور اس کی نصف بہتر نے چولے کی "چولی" بنا ڈالی اور اس طرح چولی نے دنیا میں آنکھ کھولی جسے

دیکھ کر پاکبازوں کی دونوں اور نظربازوں کی ایک آنکھ بند ہوگئی۔ وسیع و عریض چولوں کی بھیڑ میں چولی اپنے اختصار کی وجہ سے کم خرچ بالانشیں کی تعریف کی اکیلی مستحق قرار پائی گویا لمبے چوڑے چولے منہ دیکھتے رہ گئے اور بالشت بھر کی چولی کو یہ رتبۂ بلند حاصل ہوگیا۔
چولی کی مختصر مگر جامع تعریف اس طرح بھی کی گئی ہے کہ وقتِ واحد میں یہ جامہ بھی تھی اور زیبِ جامہ بھی چولی کے بارے میں "بدمعاشی نکتۂ نظر" جو بھی رہا ہو لیکن معاشی نقطۂ نظر سے یہ اپنے وقت کا انتہائی مختصر مفید جامہ ہوا کرتی تھی کہ اس کی تیاری میں برائے نام کپڑا لگتا تھا بلکہ کپڑوں کی ایسی کترنیں جن سے دستیاں بھی بمشکل تیار ہوتی تھیں بڑی آسانی سے ان کی چولیاں بن جاتی تھیں اور غالباً چولی کی یہی واحد خوبی تھی، باقی خوبیاں تو اسے زیب تن کرنے والی شخصیت کی ہوتی تھیں۔ چند سخت جان قسم کے راویوں کا بیان ہے کہ بعض چولیوں پر، ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے کا گمان ہوتا تھا، ایسی چولیاں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کی منہ بولتی تفسیر بلکہ تصویر ہوا کرتی تھیں آگے چل کر اس قبیل کی چولیاں اپنے تنگ جغرافئے کے باوجود تاریخی حیثیت کی حامل ثابت ہوئیں یعنی ان کی وجہ سے ایسے ایسے حادثات رونما ہوئے جو بعد میں آنے والی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ بن گئے تاہم چولی چاہے تاریخی ہو یا جغرافیائی "تنگنائے غزل" کی صفت سے پوری طرح متصف ہوا کرتی تھی۔ شاعرانہ نظر اور عاشقانہ جگر رکھنے والے باذوق حضرات چولی کو چھوٹی بحر کی "مشاعرہ لوٹ" غزل کا مماثل بتاتے ہیں جو بڑی بڑی سخن گسترانہ باتوں کو بآسانی اپنے میں سمو لیتی ہے۔ چولی اپنی وضع قطع کے اعتبار سے عام لباس سے قطعی الگ ہوا کرتی تھی۔ اس کی وضع قطع میں دراصل وضع کا کم اور قطع کا زیادہ عمل دخل ہوتا تھا چنانچہ اس خصوصیت سے شر پسند خواتین نے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔ اس میں مزید کانٹ چھانٹ کی گئی اور انجام کار بے چاری چولی سمٹے تو دل عاشق کا منہ توڑ جواب ہوگئی یعنی صرف "چو" "رہ گئی" "لی" غائب ہوگئی۔ چولی کی اس فتنہ انگیز وضع قطع نے شرفا پر تو عالم نزع طاری کر دیا گویا ان بیچاروں کے حق میں مختصر سی چولی بندوق کی گولی کا کام کر گئی البتہ دل پھینک مردوں کے من کی مراد بر آئی، چولی ان کے واسطے آنکھ مچولی کا سبب بن گئی اور یہ کھیل ظاہر ہے غیرت مند مردوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا چنانچہ انہوں نے اس قدر واویلا مچایا کہ چولی پسند خواتین میں کھلبلی مچ گئی لیکن کٹی پھٹی چولی کسی صورت اپنی اصل کی طرف نہیں لوٹ سکتی تھی اس لئے شاطر خواتین نے چولی کے اختصار پہ ہاتھ بھر کا کپڑا ڈال کر اس فتنے کو پس پردہ کر دیا اور اس طرح دامن عالم وجود میں آیا اور یہیں سے چولی اور دامن کا ساتھ شروع ہوا ــــــ !!

چولی دامن کی باہمی جوڑی نے ثقہ قسم کے مردوں کو تو پُر امن کر دیا لیکن عاشق مزاج مردوں کا سارا سکون درہم برہم ہوگیا، دامن کی دیوار کے بیچ میں آ جانے سے چولی کے ساتھ نظروں کی ہولی کھیلنے کا سارا لطف غارت ہوگیا۔ عاشقوں کی قوم میں تو مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ یہ لہر دہلی یا کشمیر کی جان لیوا سردی کی لہر ثابت ہوتی اور عاشقوں کی اکثریت ٹھنڈے ٹھنڈے شہادت کا کولڈ ڈرنک نوش فرما کر ٹھنڈی ہو جاتی ــــ ایسی گرما گرم خواتین جنھیں کتّے بلّوں کے علاوہ عشاق پالنے کا محبوب مشغلہ بھی مرغوب ہوتا ہے۔ ان سے عاشقوں کی یہ حالتِ زار و قطار دیکھی نہ گئی لیکن اس دوران میں چولی دامن چونکہ "لازم و ملزوم" کے درجے پر پہنچ چکے تھے اس لئے کمالِ ہوشیاری و عیاری و مکاری سے کام لے کر ایک نیا حربہ ایجاد کیا یعنی عشق دشمن عناصر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دیدار کی پیاس میں تڑپتے بھوکے پیاسے عاشقوں کو "لازم" کی ہلکی سی جھلک دکھلا کر انھیں مزید تڑپاتیں ترساتیں، جلتی پر جی بھر کے تیل چھڑکتیں اور

جب عاشق بے چارے سیخ کے کباب کی طرح جل بھن کر بے ہوش ہونے کی تیاری کرتے فوراً ملزوم سے ہوا کر کے انھیں دوبارہ ہوش میں لے آتیں۔ لازم و ملزوم کے اس دہرے وار نے عاشقوں کا وہ حال کر دیا کہ ان میں اور سانپ کے منہ کی "چھچھوندر" میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہا۔ نامعقول عاشقوں کی بھی ہو بہو وہی کیفیت ہوگئی، اگلے تو کوڑھی نگلے تو اندھا والی۔

قبل اس کے کہ چولی دامن کا ڈبل گیم، عاشقوں کو کپڑے پھاڑ کر جنگل بیاباں کی راہ لینے یا معشوقۂ ستم ایجاد کے گھر میں دربان یا خانساماں کی حیثیت سے مستقل پناہ لینے پر مجبور کر دیتا۔ عشاق لوئین کے سرکردہ ممبر اپنی برادری کی بقا و سلامتی کے لئے اس دہرے کھیل کا پانسہ پلٹنے کی غرض سے آپس میں سر جوڑ کے توڑ جوڑ میں لگ گئے ۔۔ واضح ہو کہ عشاق لوئین کے یہ گھاگ ممبر آگے چل کر محبت کی تاریخ میں مجنوں صحرائی، فرہاد کوہساری، رانجھا سائیں اور مہیوال چرواہے کے نام سے بدنامی کی حد تک مشہور ہوئے ان عجیب الخلقت حضرات کا شمار اپنے اپنے وقت کے فل ٹائم عاشقوں میں ہوتا تھا، لمبی لمبی آہیں بھرنے، طویل طویل نالے کھینچنے اور نان اسٹاپ آنسو بہانے کے فن میں یہ اس قدر طاق و مشاق تھے کہ ان کی آہوں کی گرمی، نالوں کے بھپکارے آنسوؤں کے سیلاب سے انسان تو ایک طرف ندی نالے، جھاڑ پہاڑ تک لرزتے تھے۔ دامن بے چارا بھلا ان طوفانی صلاحیتوں کے آگے کیا ٹکتا۔

چنانچہ ان عشق پیشہ حضرات نے اس مہین دیوار کو ڈھانے کے لئے آہوں اور نالوں کے اسٹاک کو چھیڑے بغیر صرف آنسوؤں سے کام چلا کر یہ "شاعرانہ کوڑی" پھینکی۔ ؎

یوں ہی گر روتے رہے عاشق تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

اس شاعرانہ دھمکی پر اہل جہاں کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگی البتہ اہل جہاں کی ان نااہل دختروں میں ضرور سنسنی دوڑ گئی جو کسی نہ کسی اہل جہاں کی اہلیہ بننے کی تمنا میں ماہی بے آب کی طرح بے تاب تھیں۔ علاوہ ازیں عاشقوں کے جان سے ہاتھ دھونے سے زیادہ انھیں بستیوں کے ویران ہونے کا خوف تھا، انہی بستیوں میں چونکہ ان کے مائیکے بھی ہوا کرتے تھے اور سسرال بھی لہٰذا ناچار محبوباؤں نے چولی تو اپنے پاس رہنے دی۔ دامن کے دائمی حقوق عاشقوں کے نام منتقل کر دیے۔ دامن کے اپنے نام الاٹ ہوتے ہی عاشقوں نے اسے بچھا کر سجدۂ شکر ادا کیا اور اس دیوار کے گرنے کی مسرت میں باجماعت، خوشی کے آنسو بہائے کہ ہر حال میں آنسو بہانا عاشقوں کا شیوہ رہا ہے چنانچہ جب محبوبہ کی ہلکی سی جھلک نظر آتی یہ خوشی سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے اور جب تلاش بسیار کے باوجود اس کی جھلک سے بھی محروم رہتے تب ناامید ہو کر، گلا پھاڑ پھاڑ کر اڑلانے لگتے، البتہ پہلے ان کے بہائے ہوئے بیش بہا آنسو گندی نالی کے غلیظ پانی کی طرح ضائع ہو جاتے تھے اب وہی آنسو دامن میں محفوظ ہونے لگے اور یوں عاشقوں کے آنسوؤں کا مقدر تو چمک اٹھا لیکن بے چارے دامن کی تقدیر پھوٹ گئی، پہلے جو دامن چوبیس گھنٹے خوشبوؤں میں بسا سینے سے لگا رہتا تھا اب وہی آنسوؤں کا کھارا پانی پینے پر مجبور ہو گیا جس سے اس بے چارے کی شاندار صحت بھی برباد ہو گئی، رنگ بھی اڑ گیا مسلسل گریہ و زاری کے بوجھ نے دامن کے نہ صرف تن کو بلکہ من کو بھی بوجھل کر دیا۔ کل تک جس دامن کو پسار کر دعا سے لے کر بھیک تک ہر جائز و ناجائز چیز مانگی

دھنوائی جاتی تھی آج اسی پردہ وقت آگیا کہ بے چارا اپنی جان کی خیر منانے لگا ــــ سارے ستم، تمام صدمے تو اس نے چپ چاپ جھیل لیئے لیکن عاشقوں کے ترش آنسوؤں کو جذب کرتے کرتے اُس کا دم گھٹنے لگا، ہر گھڑی اُسے یہ انتظار رہتا کہ کبھی تو نچوڑ کر اسے ہلکا کیا جائے گا مگر افسوس ایسے حیات آفریں لمحے اس کی زندگی میں کم کم ہی آتے کیوں کہ عاشق بیمار کو کبھی کبھار ہی دامن کے حال زار پر ترس آتا اور وہ اسے نچوڑ کر ہلکا کرنے کی کوشش کرتا، اس میں بھی دامن کے تئیں عاشق کی ہمدردیاں برائے نام ہوتیں، اس عمل کے پیچھے دراصل یہ احساس کارفرما ہوتا ــــ کہ پتا نہیں کتنے فرشتے وضو کرنے کیلئے اس کے دامن نچوڑنے کے منتظر ہیں بے وقوف عاشق کو یہ نہیں معلوم کہ وضو کرتے ہی تمام فرشتے خدائے ذوالجلال کے حضور میں سجدہ ریز ہو کر گڑگڑاتے ہوئے اجتماعی طور پر یہی دُعا مانگتے ہیں کہ اے مالک کون و مکاں، یہ کیسے انسان کا نامۂ اعمال قلم بند کرنے کی ڈیوٹی پر ہمیں مامور کیا ہے تو نے، کم بخت روتا تو دن رات ہے بلکہ اس کے آنسوؤں کی یکساں جھڑی دیکھ کر ساون کا گھنگھور مہینہ اور سمندر کا کشادہ سینہ بھی اپنی کوتاہ دامنی پہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ تو نے اس بندے کو پتا نہیں کس مٹی سے بنایا ہے۔ جو رونے کے معاملے میں تو اس قدر فیاض اتنا شاہ خرچ ہے اور دامن نچوڑنے کے باب میں اس قدر بخیل اتنا کنجوس ــــ اس ڈیوٹی سے ہمارا جی اوب گیا ہے خداوندا ــ یا تو کہیں اور ہمارا ٹرانسفر کر دیجیو، یا پھر عاشق نا ہنجار کے دماغ سے عشق کا خناس دور کر دیجیو، جس پہ مرتا ہے اُسے مار دیجیو یا کسی بھلے مانس سے اس کی شادی کرا دیجیو!!

عموماً دیکھا گیا ہے کہ اس گڑگڑاہٹ آمیز دُعا کا آخری حصہ فوراً بارگاہِ خداوندی میں شرف قبولیت حاصل کر لیتا ہے اور وہ محبوبہ جو یہ قسم کھا چکی ہوتی ہے کہ چاہے آسمان گر پڑے، زمین پھٹ پڑے، عاشق کے نام پر سید صاحب کی بکری کی طرح عمر بھر بیٹھی رہے گی اچانک قسم توڑ کر عاشق کو بیچ منجدھار چھوڑ کر کسی بانکے شہزادے، وزیر زادے، کوتوال زادے یا کسی اور "زادے" کی زوجیت میں نہ صرف خوشی خوشی چلی جاتی ہے بلکہ یہ گانا بھی گاتی ہے ـــ

سیاں بھئے کوتوال ہمیں ڈر کاہے کا

اس کھلم کھلا بے وفائی پہ عاشق ستم رسیدہ ہرجائی محبوبہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ظاہر ہے اب وہ ایک معمولی معشوقہ نہیں رہی منہ کوتوال بن چکی ہے اس لیئے عاشق نامراد بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال کر انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش کرتا ہے یعنی اپنے بال نوچنے کے فرسودہ اور دقیانوسی عمل کو ترک کر کے محبوبہ دغاباز سے بطور نشانی ہتھیائے ہوئے دامن کی دھجیاں کر دیتا ہے۔ غریب دامن کے ساتھ صدیوں تک یہ بہیمانہ سلوک ہوتا رہا۔ نتیجتاً بے چارا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب بطور نمونے کے اس کا ایک تار بھی باقی نہیں، کچھ ایسا ہی انجام چولی کا بھی ہوا۔ دامن کی جُدائی کے غم میں بے چاری ویسے ہی بجھ گئی تھی، رہی سہی کسر معشوق کے جھوٹے قول و قرار کی طرح آئے دن بدلتے فیشن کی لہر نے پوری کر دی۔ اب چولی اور دامن کا استعمال صرف محاورے میں ہوتا ہے۔ وہ بھی غلط ہمارے ہاں عموماً دیرپا، طویل اور لمبی اِننگ (INNING) کے لیئے چولی دامن کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ چولی دامن اپنی اصلی شکل میں خود پائیدار ثابت نہیں ہوئے لہذا اس محاورے کا صحیح محل استعمال ناپائیدار اور موقتی ساتھ کے لئے ہی مناسب و موزوں ہے۔ مثال کے طور پر اس دور کے میاں بیوی کے ساتھ کو بلا جھجک چولی دامن کے ساتھ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو نکیئے مت،

آج کل یہی رشتہ، جو دنیا کا سب سے پرانا اور اولین رشتہ ہے، سب سے زیادہ ناپائیدار اور عارضی ہوگیا ہے۔ صبح کی ابتدائی ساعتوں میں جو مرد اور عورت رشتۂ مناکحت میں بندھتے ہیں شام کا جھٹ پٹا پھیلنے سے پہلے ہی اس بندھن کو توڑتاڑ کے آزاد ہو جاتے ہیں گویا سہرے کے پھولوں کی مہک ابھی ماند بھی نہیں پڑنے پاتی کہ بات طلاق تک پہنچ جاتی ہے ـــ شاید اس مثال نے آپ میں سے بہتوں کے معدے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، لیجئے ایک اور زود ہضم قسم کی مثال پیش ہے آپ کے اور ہمارے اس وقتی ساتھ پر غور فرمائیے جو اس مضمون بھر کا ساتھ رہا۔ اِدھر مضمون ختم اُدھر ہمارا ساتھ ہضم ـــ گویا ہمارا آپ کا یہ عارضی ساتھ، چولی دامن کا ساتھ ثابت ہوا۔ بقول شاعر ؎

چولی دامن کا ساتھ ہے پیارے
کس قدر بے ثبات ہے پیارے

▲●

سلسلہ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد

ممتاز مزاح نگار پروفیسر یداللہ مہدی کے مضامین کا تازہ مجموعہ

ٹائیں ٹائیں فش

گیارہ پُر از مزاح دلچسپ مضامین ـ صفحات : ۱۲۸

قیمت :ـ ۱۵ روپے مجلد خوبصورت ڈسٹ کور کے ساتھ

یہ کتاب بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

○

محمد صبغۃ اللہ بمباٹ

[اسٹیج کے اچھے اداکار، ریڈیو کے اچھے صداکار کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت کے مالک ہیں۔ ریڈیو اور اسٹیج کے کئی ڈراموں میں حصہ لے چکے ہیں۔ ریڈیو کے اناؤنسر بھی رہ چکے ہیں۔ شاعری میں سماج کے ساتھ ساتھ اپنے سر کو بھی نشانہ بناتے ہیں۔ مزاحیہ شاعر ہونے کے علاوہ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے ہیں — وہ آندھرا پردیش کے ضلع نلگنڈہ کے تعلقہ بھونگیر میں ۲۰ جولائی ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے حیدرآباد ایوننگ کالج سے بی۔ اے۔ کیا۔ کالج میں وہ دو سال تک بزم اردو کے صدر رہے۔ فزیکل ٹریننگ حاصل کی۔ مدرسہ آصفیہ (ملک پیٹ، حیدرآباد) میں فزیکل انسٹرکٹر ہیں۔]

لباس کا انتخاب

یہ دلہے ہے سلمٰی کی شادی ہے، ہم کو جانا ہے
مگر بتاؤ کہ ہم سب کو کیا پہننا ہے
کہا یہ پہلی نے بہنوں کی چاکلیٹی لباس
کہ ان کے بالوں کا رنگ بھی تو چاکلیٹی ہے
تو دوسری نے کہا اس کے معنیٰ یہ ہوں گے
پہننی ہوگی مجھے اُجلی سلک کی ساڑی
کہ ان کے بالوں میں اب چاندنی جھلکتی ہے
بڑی نمک سے کہا تیسری سہیلی نے
کہ ہم گئے تو سیاہ جوڑے میں
سیاہ بال ہیں ان کے، سیاہ چہرہ ہے
مگر تمہاری قسم دل کا وہ تو چندا ہے
جھجک کے چوتھی سہیلی نے زیرِ لب یہ کہا
ہمارے وہ جو ہیں ان کی تو صاف ہے چندیا
میں سوچتی ہوں کہ میرا لباس کیا ہوگا!

قطعات

(۱)

لوگ مرغے کھا گئے اپنی کڑھی باسی رہی
پی گئے پانی بھی پتھر اور ندی پیاسی رہی
آس میں خوشحالی کی، ایسے کلاٹیاں کھائے ہیں
سرگزیٹڈ ہوگیا تقدیر چپراسی رہی

(۲)

موج کرنا ہو تو آکاش میں بادل بن جا
اور نظروں میں سمانا ہو تو کاجل بن جا
ان کے در تک تو رسائی نہیں ممکن پھر بھی
ان کو بستر پہ ستانا ہو تو کھٹمل بن جا
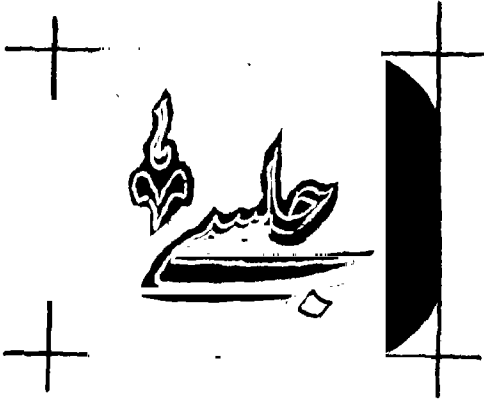
ڈاکٹر حبیب ضیاء

ڈاکٹر حبیب ضیاء جو اردو اورینٹل کالج حمایت نگر حیدرآباد میں اردو کی لکچرار ہیں۔ اُردو میں سنجیدہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ اجتماعات میں پچھلے تین چار سال سے طنز و مزاح سے بھرپور فکر انگیز مضامین سُنا رہی ہیں اور داد و تحسین حاصل کر رہی ہیں ادبی حلقوں میں وہ قدر اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ڈسمبر ۱۹۸۱ء میں ان کے ۱۵ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "گویم مشکل" شائع ہوا۔ اور اس سے چند سال پیشتر انہوں نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "مہاراجہ سر کشن پرشاد" کتابی صورت میں شائع کیا۔

ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے توقع ہے کہ ان کی معیاری نگارشات اور تخلیقات کا سلسلہ جاری رہے گا اور اس طرح اردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

جلسے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ باادب جلسے، بے ادب جلسے، تعزیتی جلسے، تہنیتی جلسے وغیرہ۔ یہ کبھی مقررہ وقت پر شروع نہیں ہوتے۔ سامعین ہر دفعہ دھوکا کھا جاتے ہیں اور وقت پر آ کر سیٹ سنبھال لیتے ہیں۔ پندرہ منٹ آدھا گھنٹہ، پون گھنٹہ پھر پورا ایک گھنٹہ۔ اتنی تاخیر کے بعد مختلف لوگ مختلف طریقے سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ سگریٹ پینے والے سگریٹ کے دھوئیں کا رُخ اپنے بازو والے کی طرف موڑ دیتے ہیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جو پانچ منٹ قبل بھلا چنگا بیٹھا سیاست پر بحث کرنے کے عارضہ میں مُبتلا تھا اب اسے کھانسی کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے

ایک جلسے میں مہمان خصوصی وقت مقررہ پر نہیں آئے۔ سامعین بھی بہت کم تھے دور تک خالی کرسیاں ہی کرسیاں تھیں سامعین کو بہلانے کے لئے کنوینر نے غائبانہ کامنٹری کچھ اس انداز سے دینی شروع کی۔

"حاضرین جلسہ اور خالی کرسیو"! ابھی کچھ دیر میں مہمان خصوصی آنے والے ہیں حیدرآباد کے پست قد ادیب بلند قامت شاعر کے نقاد، بے چوٹی کے دانشور سب ہی جلسہ گاہ میں آرہے ہیں۔ وہ دیکھئے! سامنے میز پر پانی رکھا ہوا ہے۔ بے حد صفائی سے کا ہے۔ ٹھنڈا بھی ہے۔ رنگ برنگی لباس پہنے شوخ و طرار لڑکیاں اس ناز و انداز سے پانی پی رہی ہیں کہ پانی کے بہانے بہت سے سامعین وہاں جمع ہوگئے ہیں۔ مہمان خصوصی کچھ دیر میں آنے والے ہیں وہ دیکھئے گیٹ میں ایک لاری داخل ہوئی ہے جو لوگ کھڑے ہوئے ہیں جلدی سے اپنی نشستیں سنبھال لیں ورنہ لاری سے جو لوگ آئے ہیں اُن کے کارن آپ لوگوں کو جگہ نہ ملے گی۔"

اکتاہٹ دور کرنے کے لئے جو حضرات اِدھر اُدھر ٹہل کر سگریٹ یا پانی پی رہے تھے جلدی سے نشستوں پر بیٹھ گئے۔ لاری قریب آئی تو پتہ چلا کہ مزید خالی کرسیاں آئی ہیں جلسہ گاہ میں جمانے کے لئے۔

ادھر کنوینر نے پھر کہنا شروع کیا "ابھی ابھی ٹیلیفون آیا ہے کہ مہمان خصوصی کچھ منٹ قبل نکل چکے ہیں۔ بس اب آنے والے ہیں۔ کچھ منٹ۔ کچھ گھنٹوں میں تبدیل ہوگئے۔ مہمان خصوصی کا دور دور تک پتہ نہ تھا سارے مقررین اپنی بھڑاس جو مہمانِ خصوصی پر نکالنے والے تھے معصوم اور بے قصور سامعین پر نکال کر چلتے بنے۔ مہمان خصوصی تین گھنٹے بعد آئے پتہ چلا کہ وہ دس منٹ قبل نکل تو چکے تھے لیکن حیدرآباد یا سکندرآباد سے نہیں بلکہ نلگنڈے سے نکلے تھے۔ خفیہ طور سے معلوم ہوا کہ اُنہوں نے مصلحتاً آنے میں دیر کی تھی اس جلسے کے تقریباً نصف مقررین ایسے تھے جو مہمانِ خصوصی سے اپنے مطالبات منوانے پر تُل کر آئے تھے مسئلہ اُردو کی روٹی کا تھا جسے بعض لوگ بے سوچے سمجھے حرام کی روٹی کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ بھی زندگی بھر اسی روٹی پر پلتے ہیں۔ بہرحال ایسے جلسوں میں دیر یا مہمانِ خصوصی کے دیر سے آنے یا سرے سے نہ آنے میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ ہوتا ہے۔

ہر جلسے کے مقرر الگ الگ ہوتے ہیں، ایک صاحب جو عام طور پر محنت کش طبقے کے لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے پہلی بار جلسے میں مدعو کئے گئے وہ انتہائی جوش و خروش سے تقریر کر رہے تھے ادبی جلسہ تھا یا ادب لوگ بیٹھے ہوئے تھے دوران تقریر اُنہوں نے سیدھی جانب بیٹھے ہوئے سامعین کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا:۔ "مثال کے طور پر یہ رکشے والے! انھیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر نصیب نہیں ہوتی نہ رہنے کا مناسب ٹھکانہ، یہ روکھا سوکھا کھا کر رکشہ ہی میں سو جاتے ہیں"۔ یہ سنتے ہی سامنے کی نشستوں سے ایک صاحب جو پھول دار شرٹ پہنے براؤن کوٹ ہاتھ پر ڈالے بیٹھے تھے غصّے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "ابے چُپ! کون بولتا میں بھکارہ کے رکشے میں سوتوں، پہلے چادر گھاٹ کی "نیاگرا" میں کھا کے رکشے میں سوتا تھا، اب ایر کنڈیشنڈ "نیاگرا" میں کھانٹ ہاتھ پر سوتوں ۔ تو میرے باپ کا نئیں ہے"۔ اس خیال سے کہ مزید بات نہ بڑھے منتظم جلسہ نے آگے بڑھ کر مقرر کا سیدھا مائیک سے باندھ دیا۔ تقریر میں روانی تھی۔ اِسی روانی میں موضوع بھی تیزی سے بدل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُنہوں نے بائیں طرف بیٹھے ہوئے سامعین کی جانب اشارہ کر کے کہا:

"مثال کے طور پر دیکھئے یہ لڑکیاں ان کا لباس ان کی چال ڈھال" اتنا سُننا تھا کہ ایک برقعہ پوش بے نقاب خاتون جو میک اَپ میں تھیں، اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ غصہ سے بولیں: "شرم نہیں آتی، میری عمر کا ... کو دیکھو" ___ منتظم جلسہ نے ...

سے مقرر کا دوسرا ہاتھ بھی مائیک سے باندھ دیا۔ دور بیٹھنے والے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ جذبات سے بے قابو ہو کر انہوں نے خود کو سنبھالنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے مائیک تھام لیا ہے۔

بعض لوگ جلسے تو منعقد کرتے ہیں انتہائی اہتمام سے لیکن مقررین کی اتنی طویل فہرست بناتے ہیں کہ اکثر شائقین تو اخبار میں فہرست پر نظر ڈالتے ہی گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ پندرہ سولہ ناموں کا اعلان وہ محض دھاک ڈالنے کے لئے کرتے ہیں ان میں سے آنے والے صرف چھ سات ہی ہوتے ہیں۔ حسب روایت جلسہ دیر سے شروع ہوتا ہے۔ ہر مقرر چاہتا ہے کہ وہ اپنی ساری علمیت اسی جلسہ میں بانٹ دے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہمانِ خصوصی کی باری آنے تک منتظمین کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا ہے ایک ایسے ہی جلسہ کا ذکر ہے ایک خاتون اپنا ایم فل کا مقالہ لے کر آئی تھیں۔ سامعین کی طرف سے خطرے کی گھنٹیاں بجنے کے باوجود وہ بغیر ڈنڈی مارے پورا مقالہ سنا رہی مائیک سے ہٹنا چاہتی تھیں۔ منتظم جلسہ نے ایک مرتبہ اشارتاً ان سے درخواست کی، اس پر انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ دوسری مرتبہ پھر وہ مائیک کے قریب آئے۔ اس دفعہ تو منتظم اور مقرر دونوں کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ منتظم کے کچھ کہنے سے پیشتر انہوں نے آنکھوں سے ایسی تیوری دی گویا کہہ رہی ہوں "ہٹ! یاں کس پہ رعب جماتے ہے" منتظم انتہائی درجہ شریف آدمی تھے بعد میں انہوں نے صرف یہ کہہ کر خود کو سنبھال لیا "سالی عورت تھی۔ نہیں تو ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیتا تھا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرد لوگ سالی اور عورت کا کتنا زبردست احترام کرتے ہیں۔

تعزیتی جلسوں کے مقرر بالکل الگ نوعیت کے ہوتے ہیں مائیک پر آنے کے بعد وہ عمداً بھول جاتے ہیں کہ جلسہ مرحوم سے متعلق ہے۔ ایک بہت بڑے مورخ اور [illegible] زیتی جلسہ تھا ایک صاحب تقریر کے لئے بلائے گئے تھے۔ انہوں نے کہنا شروع کیا، "مرحوم مجھے بہت اچھی طرح جانتے [illegible] کہا کرتے تھے کہ تو بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں نے مرحوم سے پڑھا بھی تھا۔ بی اے میں ان کی کلاس میں ایک دن بیٹھا تھا۔ وہ میری علمی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تو ہی وہ واحد انسان ہے جو تاریخ پر کتاب لکھ سکتا ہے"!

یہ صاحب مسلسل "میں میں" کئے جا رہے تھے کسی منچلے نے پیچھے سے پکارا "یہ ڈینگیں لکھ کے دے دو تمہارے جلسے میں سنا لوں گا"!

بعض جلسوں میں تقاریر ختم ہونے کے بعد اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک جلسے میں ایک مقرر کے مائیک سے ہٹتے ہی سامعین میں سے ایک صاحب نمودار ہوئے شیروانی کے کالر پر ڈیڑھ انچ میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ مائیک کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "میں صرف دو منٹ لینا چاہتا ہوں"!

سامعین ایسے لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں جنہیں کچھ کہنا نہیں ہوتا صرف مائیک پر آنے کا شوق ہوتا ہے ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک شریر لڑکے نے ان کی شیروانی کا دامن پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا "چچا! یہیں سے بولو"۔

اب رہے جلسے کے منتظمین۔ ان کا زیادہ وقت چونکہ اسٹیج پر گزرتا ہے اس لئے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جلسہ شروع ہونے سے دو گھنٹے قبل، دوران جلسہ اور پھر جلسہ ختم ہونے کے بعد تک یہ اسٹیج پر چلتے پھرتے بلکہ دوڑتے نظر

آتے ہیں ہر پانچ دس منٹ بعد وہ مہمان خصوصی یا صدر جلسہ کے پاس آکر آہستہ سے کچھ کہہ جاتے ہیں ایک منتظم اسٹیج پہ ضرورت سے زیادہ آکر مہمان خصوصی کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے ہم نے اپنے قلم کو بھیجا کہ جلدی سے بھید لے آئے۔ سُنا کہ وہ کہہ رہے تھے:

"میں کچھ نہیں بول رہا ہوں۔ آپ زور سے مُنڈی ہلائیے"۔

●•

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے مضامین

سمن زار

قیمت: ۸ روپے — بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

نیک خواہشات کیساتھ

فون: 53829
مکان: 51644

فون ۵۳۸۲۹
مکان ۵۱۶۴۴

اسٹینڈرڈ سینیٹیشن ہوم

STANDARD SANITATION HOME

577 - I - 4 ترپ بازار حیدرآباد 5

اسٹاکسٹ: ہیری نائیسر سینٹری ویر پائپ و پائپ فٹنگس کے ڈیلرز

بوگس حیدرآبادی

سید نصیرالدین احمد نام، بوگس تخلص۔ ۱۰ راکتوبر ۱۹۴۰ء کو شہر حیدرآباد کے محلہ کاچی گوڑہ میں پیدا ہوئے۔ فوقانی تعلیم کے زمانے میں سنجیدہ شاعری کی طرف طبیعت مائل ہوئی ۱۹۶۰ء میں طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھا، بوگس تخلص اختیار کیا ۱۹۶۴ء میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں بی۔ اے اور ۱۹۷۶ء میں ایم اے کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے نائب معتمد ہیں۔ یہ آدھی غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کا دیا ہوا مصرعہ اتنا جاندار ہوتا ہے کہ پوری داد وصول کرتے ہیں۔ بوگس اور غالبؔ کی مشترکہ غزلیں خوب ہیں۔ جگر تونسوی پر تحقیقی کام کیا ہے اور یہ کتاب شایع ہو چکی ہے۔

وہ دلہن ہماری بنتی جو اُسے بھی پیار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

نہ ہوا تقرر اپنا اسی غم میں مر گئے ہم
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

کوئی چاند کا مسافر وہیں جاکے مر بھی جاتا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

کئی بار ہیرو بن کر میں فلم میں مر چکا ہوں
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

○

یہ شخص جنس بدلتا ہوا لگے ہے مجھے
شریف خاں کبھی شرف النساء لگے ہے مجھے

نکاح ہو تو گیا دھوم دھام سے میرا
شبِ وصال سے اب خوف سا لگے ہے مجھے

کہا گئے تیری زلفوں کو لوگ کالی گھٹا
ترا وجود ہی کالی گھٹا لگے ہے مجھے

سراج نرملی

سید سراج الدین نام، سراج تخلص۔ سراج نرملی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ نرمل میں پوسٹل اسسٹنٹ ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعرے میں اپنا کلام سُنا چکے ہیں۔ اضلاعی مشاعروں میں بے حد مقبول ہیں۔ مزاح سے فطری لگاؤ ہے۔

واقعہ کو یہ ہے نفرت شاعری کے نام سے
اس لیے چڑ سی مجھے ہے، واقعہ کے نام سے

پڑھ کے، خبریں قتل و خوں غارت گری کی آئے دن
خوف سا ہونے لگا ہے آدمی کے نام سے

آپ، اداکارہ ہیں فیمس، میں ہوں شوہر آپ کا
مجھ کو دنیا جانتی ہے آپ ہی کے نام سے

ہیں مرے دشمن تو میرے لین میں نہ دین میں
دوستوں نے ہی ڈبویا دوستی کے نام سے

ایک پل بھی رہ نہیں سکتی بنا میک اپ کے تو
دشمنی سی ہے تجھے تو سادگی کے نام سے

کیجیے اِنوائیٹ، چل کر آئیں گے ہم سر کے بل
کون ہے؟ جو خوش نہ ہوگا پارٹی کے نام سے

جب سے میں نے کھائے سر پر مار سینڈل کے سراجؔ
کانپ سا جاتا ہوں میں تو عاشقی کے نام سے

○

حفیظ خاں مذاقؔ

[حیدرآباد وطن اور ۱۹۴۷ء سن پیدائش ہے۔ لاابیب کالج ہیں۔ مزاح سے فطری لگاؤ کم عمری ہی سے ہے۔ ڈرامہ سے بھی گہری دلچسپی رہی ہے بلکہ اسٹیج اور ڈرامہ اُن کی ہابی ہے۔ انھوں نے دو فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں مزاحیہ شاعری شروع کی۔ ایک طویل عرصے سے فائن آرٹس اکیڈمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں یونیٹی آنرز حاصل کیا۔ ان کا کلام ریڈیو سے بھی نشر ہوتا ہے۔ آندھرا پردیش کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصّوں میں بھی پروگرام پیش کر کے اپنے فن کی داد حاصل کر چکے ہیں۔ تخلص "سپاٹ" اب مذاقؔ میں تبدیل ہوگیا ہے]

ماڈرن محبوبہ

نوٹ: ایک معصوم سیدھے سادے لڑکے کی داستانِ محبت جس نے ایک "ماڈرن گھرانے" کی ماڈرن لڑکی سے محبت کی لیکن اُسے محبت کے بدلے میں کیا ملا۔

پھوڑوں کو دل کے پھوڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

منجے پھنسا کو اپنی محبت کے جال میں
موٹر بکا کو لا دیئیں لکڑی کی ٹال میں
میں ہوگیا کلاٹ سپولے کی چال میں

چالوں پہ چال موڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

راجیش کھنہ بول کو منجے پھسلا دیئیں
گڑ کا پلا کو پانی سڑک پو سلا دیئیں
پولس کے ہاتھوں میں منجے جھولا جھلا دیئیں

سب لگ گئے مکھوڑے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

بھائیاں تمارے بیانڈ ہمارا بجا دیئیں
دُولا بنا تے بولکو پورا سجا دیئیں
زخموں سے گومڑوں سے جسم و سجا دیئیں

یہ گت بنا کو چھوڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

فرمائشاں تمارے تو پورے کرا تھا میں
ٹیکساں بھی اپنے پیار کے دے کو مرا تھا میں
جو کچھ کمایا گھر میں تمارے بھرا تھا میں

کڑکا بنا کو چھوڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

اَمّاں کو اُن کی بالوں کا چُٹلا دلاوں کتے
ہاتھوں میں لاڑ بزار کی چُوڑیاں پناوں کتے
شہران کی لیجا کو میں لسّی پلاوں کتے

کب تک کا یہ ہتھوڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

ڈمپل تمہیں سمجھ کو میں چکّر میں پڑ گیا
میک اپ بغیر دیکھا تو بے موت مر گیا
۶۵ برس کے جلے میں جھنگر سپڑ گیا

پاپڑ بنا کو چھوڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

کیا موڈ بولوں اس کا فقط آگ ہے مذاقؔ
صورت سے بھولی پن کی بڑی گھاگ ہے مذاقؔ
یہ عاشقی تو جان کا وتیاگ ہے مذاقؔ

کیوں دل کا رشتہ جوڑ سے رے انجان آشنا

ارے بے ایمان آشنا

محمد برہان حسین

لندن سے ماہرِ ٹرافک کا اور آنا

محمد برہان حسین، ریجنل ریسرچ لیباریٹری حیدرآباد میں سائنٹسٹ کے عہدہ پر مامور ہیں۔ وہ اپنے اس پیشے میں گہری دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ فطری رجحان کی بدولت ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک کئی مزاحیہ مضامین لکھے ہیں، جو معیاری روزناموں اور ادبی ماہناموں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مزاح کی شائستگی ان کے مضامین کا واضح، اور نکھرا ستھرا لہجہ اور سلجھا ہوا اسلوب، ان کی شناخت کے ضامن ہیں۔ محمد برہان حسین کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "چند کلیاں نشاط کی" ـــــ گزشتہ سال یعنی اکتوبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ جس میں ان کے ۱۵ مزاحیہ مضامین اور مزاح نگار کی حیثیت سے ان کے مقام و مرتبہ کے تعلق سے فکر تونسوی، نریندر لوتھر، جیلانی بانو اور پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی گراں قدر آراء شامل ہیں۔ جن سے محمد برہان حسین کے فن کو سمجھنے میں اور ان کے مقام کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ ادبی اجلاس میں بھی انہوں نے اپنے مزاحیہ مضامین سنائے ہیں اور حاضرین و سامعین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

لندن سے ایک ماہرِ ٹرافک کو شہر حیدرآباد کی ٹرافک کے مسائل حل کرنے کے لئے بلایا گیا۔ وہ پہلی شام تھی ہم اس کو عابد روڈ کے چوراہے پر کھڑا کئے ہوئے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر ٹرافک کا نظارہ کرنے کے بعد کہا "ویل مسٹر! یہاں کی ٹرافک کا کیا مسئلہ ہے۔ . . . .

یہ تو کچھ خاص بات نہیں نظر آئی۔۔۔۔

ہم نے کہا "جی! یہ جو سامنے آپ کو بلڈنگ نظر آرہی ہے وہ پیالیس ٹاکیز ہے۔ یہ یہاں سے پورے دو کلومیٹر دور ہے"۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ "کیا آپ پوری طرح سنجیدہ ہیں"؟

ہم نے کہا۔ مسٹر وہاں جانے کے لئے آپ کو پہلے اس سے ایک کلومیٹر دور جانا پڑے گا پھر دوڑ کر واپس آنا پڑے گا"۔

"وہ کیوں"

"اس لئے کہ یہ وَن وے ہے"۔

"اوہ۔۔۔۔ ہاؤ فنی"

ہم نے کہا "یس ـــــ وری فنی"۔

ہم اس کو چارمینار لے گئے اس نے چارمینار کو دیکھنے کی بجائے سامنے بیچ سڑک پر بیٹھے ہوئے بیل کو دیکھا۔ اس سے تصاویر لیں پھر پوچھا "یہ بیل اصلی ہے"؟

ہم نے سینہ پھلا کر کہا۔ "جی ہاں۔ بالکل اصلی ہے"؟

اب ہم گولکنڈہ کی طرف اسکوٹر پر جا رہے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ سڑک سیاہ تھی اور اندھیرا تھا۔ دفعتاً اسکوٹر اُڑا معلوم ہوا کہ "اسپیڈ بریکر" تھا۔ منہ کے بل گرنے سے دانتوں سے خون نکلنے لگا تھا۔ لوگوں نے ہمیں اُٹھا کر سامنے ہوٹل پر پہنچا دیا۔ چائے پلائی گئی۔ پان والے نے ڈریس میں دیکھ کر مُفت پان پیش کیا۔ ہم نے منہ میں رکھ کر چبایا اور ہماری چیخ نکل گئی۔

"ارے میاں پان میں پتھر ہے"۔

پان والے نے اطمینان سے کہا۔ "دانت ہوگا صاحب دانت"

ہم نے پان اُگلا تو واقعی دانت نکلا۔

پان والے نے کہا "ہوتا صاحب" آپ کا اسپیڈ بریکر کا کیس ہے نا؟"

ہم نے چیخ کر کہا "اسپیڈ بریکر اس طرح بنایا جاتا ہے؟"

پان والا بولا "دیوار ہے صاحب نظر نہ آنے والی دیوار۔ صاحب اگر تانا شاہ قلعہ کے اطراف تین تین فصلیں بجائے ایسے گُپت "اسپیڈ بریکر بنا دیتا تو اورنگ زیب کی فوج کے گھوڑے ٹھوکریں کھا کھا کے اوندھے گرتے اور آدھی فتح ہو جاتی۔

لندن والے نے کہا "ہمارے یہاں تو اسپیڈ بریکر صرف اسکولوں اور دواخانوں کے آگے بنائے جاتے ہیں اُن پر پٹیاں ڈالی جاتی ہیں اور رات میں تیز روشنیوں کے مخصوص سگنل ہوتے ہیں"۔

ہم نے کہا: یہاں اُلٹا ہے۔ یہاں اسکولوں کے علاوہ گن فونڈری میں کوئی اسپیڈ بریکر نہیں۔ البتہ ہر گلی کوچہ

پھر ان کو سڑک کی سیاہی میں چھپا دیا جاتا ہے۔ بھئی کلائمکس اگر معلوم ہو جائے تو پھر مزہ کیا۔ اس جگہ سے روشنیاں ہٹادی جاتی ہیں گویا وہاں سے گاڑیاں نہیں گزریں گی بلکہ سہاگ رات منائی جائے گی۔"

لندن والے نے کہا "مگر ایسے اسپیڈ بریکرز سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا ہاں شادی سے پہلے فائدے اور شادی کے بعد نقصانات ہوتے ہیں۔"

وہ حیران ہو کر بولا "یہ کیا بات ہوئی ..... سمجھاؤ تمہارا مطلب۔"

ہم نے کہا "اب آپ سوچئے ایک آٹو رکشا میں ایک میل اور ایک فیمیل کزن سوار ہیں۔ دونوں قربت سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں مگر ہمت نہیں ہوتی۔ اتنے میں آٹو رکشا ایک اسپیڈ بریکر پر سے اُچھلا۔ فیمیل کزن۔ میل کزن پر آگرتی ہے۔ میل کزن اُسے تھام کر آٹو والے کو دکھاتا ہے۔"

آٹو والا کرکٹ کے امپائر کی طرف سگنل دیتا ہے۔

" اِٹ اِز یوُر وِکٹ سر۔"

" لندن والا ہنسا اور بولا اور شادی کے بعد؟"

ہم نے کہا ایک میاں بیوی ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔ بیوی کے گھر والے اس بات سے بے زار ہو چکے تھے۔ ایک دن اتفاق سے میاں کو ایک رشوت مل گئی۔ اُس نے اس خوشی میں بیوی کو بہت سے روپئے دیئے کہ وہ اچھے کپڑے اور چیزیں خریدلے۔ بیوی نے کہا "ہم کپڑے اور چیزیں خرید کر ذرا امی کے پاس بھی ہو آئیں گے۔"

شوہر نے کہا "ضرور چلی جانا۔"

بیوی نے خوب خریدی کرلی پھر آٹو میں سامان کی گٹھڑیاں اور ڈبے رکھے اور چلی۔ راستہ میں ایک اسپیڈ بریکر پر سے آٹو رکشا اُچھلا اور بیوی سڑک پر گر پڑی۔ پیشانی پر زخم لگا۔ اور خون نکلنے لگا۔ لوگوں نے زخم پر پٹی باندھی اور دوبارہ اسے مع سامان آٹو میں جمادیا۔

اب جو امّی کے گھر آٹو پہونچا تو بیوی یوں اُتری کہ سر پر کے زخم سے خون رِس رہا ہے۔ سامان کی گٹھڑیاں اور ڈبے ساتھ ہیں۔ بیوی کے بھائی نے جو یہ دیکھا تو سمجھا کہ بہنوئی نے اُسے مار کر سامان کے ساتھ گھر سے نکال دیا ہے۔ بس وہ چپکے سے پچھلے دروازہ سے نکل گیا اور بہنوئی کو چھرا گھونپ دیا۔"

دوسرے دن کی گفتگو کچھ اس طرح کی ہوئی۔

اُس نے کہا "دِل مسٹر! آپ کا شہر کا دو حصہ ہے ندی کے دو طرف ایک پُرانا شہر دوسرا کم پرانا شہر۔

ہم اس کم پُرانے شہر کی جدّت پر اچھل پڑے۔ ہم نے کہا "آپ کا مطلب پرانا اور نیا شہر ہے۔"

وہ بولا "نو نو، ہم اس کو نیا نہیں کہہ سکتا ..... آپ کے پُرانے شہر کی ٹرافک قابلِ دید ہے اور کم پُرانے شہر کی ٹرافک کم قابلِ دید"

ہم نے کہا "ارے یار تم تو الفاظ کا استعمال اس قدر احتیاط سے کر رہے ہو جیسے وصیت لکھا ہے ہو۔"

اُس نے کہا "بھئی ایک بات تو بتاؤ۔ یہ سنجے گاندھی کو فیملی پلاننگ کی کیوں سوجھی۔ وہ یہ مسئلہ تو یہاں کی ٹرافک پر چھوڑ سکتا تھا۔ بس تم لوگ ایک ہفتے کے لئے ٹرافک پولیس کو ہٹا دو۔ پھر دیکھو ٹکرا ٹکرا کر آدھی آبادی صاف ہو جائے گی۔

.....اچھا میں چند تجاویز پیش کرتا ہوں"

پہلی تجویز یہ ہے کہ آپ شہر کو ڈبل اسٹوری بنا لیجئے۔ جیسے ہم نے یورپ میں بنایا ہے۔ آپ دکانیں، سینما، ریلیں، زمین کے نیچے کر دیجئے اور سڑکیں اوپر"

ہم نے کہا "نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہاں سمنٹ اصلی نہیں ملتی اور نقلی سمنٹ بھی کنٹراکٹر کم مقدار میں ڈالتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین کے نیچے جو بھی جائے گا وہ اوپر کبھی نہ آئے گا۔

وہ بولا۔ او کے۔ آپ رکشے بند کر دیجئے کیوں کہ یہ سڑک کے بڑے حصّہ کو بڑی دیر تک گھیرے رہتے ہیں۔

ہم نے کہا "یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس شہر میں ہر گھنٹہ میں ایک درجن بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے آدھے رکشا چلاتے اور آدھے اُس پر سواری کرتے ہیں"

اُس نے کہا "اُو، وُو۔ تو آپ کم از کم سیکلیں بند کر دیجئے"

ہم نے کہا "ارے بھائی سیکلیں بند ہو گئیں تو یہاں تلنگانہ ایجی ٹیشن شروع ہو جائے گا"

"وہ کیا ہوتا ہے" اُس نے پوچھا۔

"دیکھو میاں انگریز! اس شہر کے لوگ سیکل کی بدولت ہر غم سے دور ہیں۔ نئے شہر کا آدمی دس پیسے دے کر دونوں پہیوں میں ہوا بھراتا ہے۔ اور پُرانے شہر کا ایک چکر لگاتا ہے اور پُرانے شہر کا آدمی خود ہوا بھر لیتا ہے اور پمپ والے کو پانچ پیسے دیدیتا ہے۔ پھر وہ ہے اور اُس کی سیکل"

وہ پوچھ بیٹھا "کم پُرانے شہر والا" ادھر پرانے شہر کو کیوں جاتا ہے؟

ہم نے کہا "مجبوری ہے میاں مجبوری۔ اگر وہ نئے شہر میں پاجامہ کا کپڑا خرید کر سلا بھی لے تو ناڑا خریدنے اُسے مدینہ بلڈنگ جانا ہی پڑتا ہے۔ تم کو ناڑے ناڑے کی آواز تو یاد ہوگی۔

وہ چونک کر بولا "اوہو ہو۔ یس۔ وہ آواز ادھر کم پُرانے شہر میں نہیں آئی۔

وہ بولا "اچھا تو پھر آپ اسپیڈ بریکر کو نکال ہی دیجئے اس سے ٹرافک کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔

ہم نے کہا "ہر اسپیڈ بریکر ایک میموریل ہے"

"میموریل؟ کا ہے کا؟"

"ارے صاحب جس طرح انگریز لوگ جنگ میں مرنے والوں کے میموریل بناتے ہیں نا؟ اسی طرح یہاں ٹرافک کے حادثہ میں جب کوئی مرتا ہے تو میونسپل کارپوریشن وہاں اس کی یادگار اسپیڈ بریکر بنا دیتی ہے۔

ہ غصّے سے بولا" پھر یہاں کی ٹرافک پولیس کیا کرتی ہے"۔
ہم نے کہا "وہ صرف پرسنل ٹیکس وصول کرتی ہے۔
اُس نے پوچھا "پرسنل ٹیکس کسے کہتے ہیں؟"
"وہ رقم جو سرکاری خزانے میں داخل نہیں کی جاتی"
ا۔ اچھا آخر میں۔ کم از کم آپ جانوروں کو تو سڑک پر سے ہٹا دیجئے آپ لوگ اتنی بھینسوں کا کیا کرتے ہیں۔ بھئی امریکہ والوں نے
کے ایک پورے صوبے کا نام نیواڈا رکھ لیا ہے حالانکہ یہ نام تو صد فیصد حیدرآباد کا حق ہے۔
ہم نے کہا "بھئی افسوس یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہاں جانوروں اور انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھئے بنڈی میں بیل
در رکشا میں آدمی۔ اگر ہم آدمی کو رکشا چلانے دیں اور بیل کو ہٹا دیں تو یہ بیل سے ناانصافی ہوگی۔ اور پاپ الگ لگے گا۔ اُس انگریز
کو ہمیں گلے سے لگایا اور آنکھوں میں آنسو لاکر کہا "یہ مسائل ٹرافک یہ تیرا بیان غالب"
ہم نے کہا "ماہر ٹرافک لندن۔ تمہاری تجاویز ہمارے لئے قابل عمل نہیں ہیں یہاں پر نہ تم کو اپنا پارس یا ورخرچ کرنے کی ضرورت ہے
۔اُس نے بگڑ کر کہا "واہ تو پھر مجھے اس گرم ملک میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔
ہم نے کہا" صرف اس لئے کہ ہماری ٹرافک پولیس کے سالانہ بجٹ میں رقم بچ گئی تھی اور سال ختم ہو رہا تھا۔ اب آئندہ سال
یں میں تم سے اِنہی مسائل پر مشورہ کرنے لندن آؤں گا۔۔۔ گُڈ بائی۔ خوش رہو اور ویٹ کرو"
وہ بولا "اوکے۔ ضرور آؤ لیکن واپس ضرور جانا"۔ ▲▲

زندہ دلانِ حیدرآباد کی پندرھویں سالانہ تقاریب پر نیک تمناؤں کیساتھ

یونائیٹڈ انڈسٹریز

1.7.1047 اعظم پورہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

فون نمبر 62020

آندھرا پردیش
اپنے شاندار ماضی کے احیا کا عہد کرتا ہے

قدیم زمانے میں آندھرا پردیش کو افراط و بہتات کی سر زمین کہا گیا ہے۔ دولت اور خوشحالی شجاعت اور دلیری یہاں کے لوگوں کا امتیازی نشان تھا۔ یہاں فنون و ہنرمندی کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ عظیم ستوا ہنساؤں، اکشیا واکوں، کاکتیاؤں اور وجیانگر کے بادشاہوں کے دور میں تلگو عوام کی عظمت کا چرچا ملک کے کونے کونے میں پھیل گیا تھا۔ شری این۔ ٹی۔ راما راؤ کے زیر نگرانی نئی حکومت نے ماضی کی خوشحالی کو دوبارہ حاصل کرنے اور قدیم عظمت کے احیا کا عہد کیا ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اور تین ماہ کی مختصر مدت کے دوران نئی حکومت نے مختلف دور رس نتائج کے حامل فیصلے کئے ہیں۔

- ریاست کے تمام کسانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے دھان پر فی کنٹل ۲۰ روپے کے حساب سے امداد کی منظوری۔
- کمزور طبقات کے لیے ۲ء۲ لاکھ مکانات کی تعمیر۔
- اگادی تہوار کے دن سے غریب عوام کو ۲ روپے فی کیلو چاول کی سربراہی۔
- جائداد میں خواتین کے مساوی حقوق کے لیے اسمبلی میں قرار داد کی منظوری۔
- آئندہ تعلیمی سال سے ترویتی میں عورتوں کی یونیورسٹی کا قیام۔
- اسکول جانے والے ۶۲ لاکھ بچوں کے فائدے کے لیے دوپہر میں کھانے کی سربراہی کا جامع پروگرام۔
- لیجسلیٹو کونسل اور سابق اراکین اسمبلی کو دیئے جانے والے وظائف کی برخواستگی و نیز سیاسی انحراف کے انسداد کے لیے اسمبلی میں قرار داد کی منظوری
- بے روزگار نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع میں اضافہ کی غرض سے سرکاری ملازمین کی وظیفہ پر علحدگی کی عمر کو ۵۸ سال سے گھٹا کر ۵۵ سال کر دیا گیا۔
- ریاست کی جانب سے چلائے جانے والے کارپوریشنوں کی تعداد میں کمی کر دی گئی جس کے

نتیجہ میں ۴ کروڑ روپے کی بچت ہوئی

● عوامی زندگی سے بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کا خاتمہ کرنے کے لیے "دھرما مہا ماترا" قائم کیا گیا۔

● اگادی تہوار سے تلگو کو سکریٹریٹ کی سطح تک سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ریاست کی ہمہ جہتی ترقی اور عوام کی خوش حالی کے لیے ایک ۱۵ نکاتی پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ یہ پروگرام ترقی کے بنیادی خاکہ کے طور پر تیار کیا گیا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ پینے کے پانی کی سربراہی۔ کمزور طبقات کی بہبودی۔ غریبوں کے لیے رہائشی مکانات کی فراہمی۔ دیہات کو بجلی کی سربراہی اور اصلاحات اراضی وغیرہ پر زور دیا گیا ہے

ان اقدامات سے حکومت کے اخلاص کا ثبوت ملتا ہے جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ حکومت اپنے عوام کی آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل سے اپنے آپ کو وابستہ کئے ہوئے ہے۔

(جاری کردہ)

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش

نیک خواہشات کے ساتھ

ارون موٹرز

19-2-227/B بہادرپورہ

آٹوموبائیل اسپیشلسٹ
اور
جنرل سپلائرز

ہر قسم کے جاب ورک انجام دیئے جاتے ہیں۔

آندھرا پردیش اسٹیٹ ویئر ہاوزنگ کارپوریشن حیدرآباد

فراہم کرتا ہے۔

۱. سائنٹیفک اسٹوریج : ساری ریاست میں تقریباً ۵۵ ویرہاوزز کی ایک زنجیر کے ذریعہ۔

۲. کریڈٹ سہولتیں : مصالحتی ویر ہاؤز رسید کی حوالگی کے ذریعہ

۳. ہینڈلنگ اینڈ ٹرانسپورٹ سہولتیں :۔ ڈپازٹرس کو اُن کی درخواست پر حقیقی مع نامل سپروائزری چارجس پر

۴. آرڈرلی مارکٹنگ : ہینڈلنگ، گریڈنگ، اسٹوریج اور اشیائے ماتحتاج کی تقسیم کے ذریعہ اہم مارکٹنگ اور کنزیومنگ سنٹرز پر ڈپازٹرس کے لئے سہولتیں۔

۵. انشورنس آف اسٹاکس : آگ اور سیلاب سے ہونے والے نقصانات کے مقابل جو ڈپازٹرس کی ضمانت دیتا ہے

۶. ڈس انفسٹیشن ایکسٹنشن سروس : کسانوں، تاجروں، کوآپریٹیوز اور حکومتی اداروں کی دہلیز پر کفایتی شرح پر

۷. ریزرویشن آف اسٹوریج اسپیس : ڈپازٹرس کی درخواست پر ضمانت کی بنیاد پر اسٹوریج کا اسپیس محفوظ کیا جاتا ہے۔

۸. اسٹوریج چارجس پر ربیٹ : ۱۲½٪ ربیٹ کوآپریٹیوز کو۔
۷۵٪ ربیٹ (پروڈیوسرس کو اجناس اور تجارتی فصلوں پر ۲ کنٹل کی حد تک)

ریاست کے ۵۵ مقامات پر

Phone : 61:

ASHOK ELECTRICAL COMPAN

1-7-574/25/F1, Zamistanpur, Hyderabad-500 048.

Manufacturers of

Electric Motors & Welding Transformers

	RANGES
Squirrel Cage, Totally Enclosed Fan Cooled type Induction Motors.	Single Phase—1/4HP to 1HP Three Phase—1HP to 20HP
A/c Welding Transformers OIL COOLED in Single Phase, Three Phase and Single - cum - Three Phase.	200 Amps, 250 Amps, 300 Amps, 350 Amps, 400 Amps, 450 Amps, and 600 Amps.

Also undertake repairs to all kinds of Electric Motors & Weldin Transformers.

Prop. G. PANDARAIAH
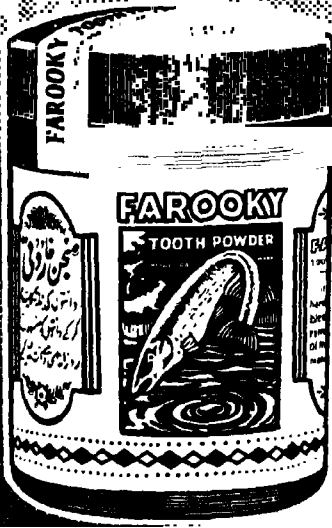
دن بھر کی خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے

مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دھن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ،

FTP U2 77

Courtesy . Deccan Chronicle

MAY 1983 **Rs. 3.00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۶ — مئی ۱۹۸۳ء — شمارہ ۵

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر:
سمیع جلیل

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل: شعیبہ

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد-۲

خط و کتابت کا پتہ
شگوفہ ۳۱- بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد-۱

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ ہارکو، سری نگر
۴۔ انڈین سیٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چیمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبّے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد-۲

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

زندہ دلانِ حیدرآباد — پندرھویں سالانہ تعاریب

قاضی جی دُبلے (رپورتاژ)

* * *

برق و شرر (مستقل فیچر)

ادب کا جغرافیہ

چورن (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ

امریکہ کی آٹومیٹک

آئی ٹسٹنگ مشین سے کروائیے

امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹکنالوجی کے

مستند تربیت یافتہ

معیاری چشموں

کی تیاری

کے لیے تشریف لائیے

غوری

اینڈ

کمپنی آپٹیشنس

ترپ بازار حیدرآباد

فون: ۴۲۱۲۷۰

کوالیفائیڈ آپٹیشنس اکادمی آف

آپٹیشنری (امریکہ)

اردو
ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر
عطا انصاری

ہندی
ڈاکٹر سریدھر
مشرا
رتی لال
شاہین

بنگالی
شانتی رنجن
بھٹاچاریہ

مراٹھی
ڈاکٹر
عبدالستار
دلوی

گجراتی
ڈاکٹر ...
زویری

کشمیری
ڈاکٹر
محمد زماں
آزردہ

پنجابی

انگریزی
ڈاکٹر ملک راج
آنند
ڈاکٹر سید حامد
حسین

تلگو

کنڑی
حمید الماس

ڈوگری

میتھلی
ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

ملیالم

سندھی

تامل

آسامی۔ اڑیا

"شگوفہ" کا
"ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب (حصۂ نثر)

بہت جلد شایع ہوگا

مہمان مدیر : **یوسف ناظم**

ساتھ ہی بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے اور "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

رشید احمد صدیقی پطرس فرحت اللہ بیگ عظیم بیگ چغتائی شوکت تھانوی فرقت کاکوروی کنہیا لال کپور بھارت چند کھنہ
کرنل محمد خان احمد جمال پاشا یوسف ناظم مجتبیٰ حسین وجاہت علی سندیلوی شفیقہ فرحت خواجہ عبدالغفور نریندر لوتھر رشید قریشی
برق آشیانوی مسیح انجم پرویز یداللہ مہدی

حصۂ معلومات اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی

مرتبہ : ادارہ "شگوفہ"

شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ـــــ (اداریہ)

زندہ دلان حیدرآباد کی پندرھویں سالانہ تقاریب ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو نمائش میدان پر اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ ۱۴ اپریل کو سہ روزہ تقاریب کا افتتاح حکومت آندھرا پردیش کے وزیر لیبر و ایمپلائمنٹ جناب یم راجندر راؤ نے کیا۔ اردو سے کما حقہٗ واقفیت نہ ہونے کے باوجود وزیر موصوف نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں تقریر کو ترجیح دی۔ جس کا حاضرین نے تالیوں کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ افتتاحی تقریر کے بعد لطیفوں کا ڈھائی گھنٹوں تک سلسلہ چلتا رہا۔ نمائش کلب کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اکثر نئے، تازہ اور دلچسپ لطیفے سنائے گئے۔ گھسے پٹے لطیفے سنانے والوں کو سامعین نے بروقت ٹوک دیا۔ ۱۵ اپریل کو ادبی اجلاس کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ حسب روایت ادبی اجلاس میں داخلہ شگوفہ کے سووینیر کی خریدی کے ذریعہ ہوا۔ ملک میں اپنی نوعیت کی واحد ادبی محفل ہے۔ جس میں شرکت کے لئے رسالہ خریدنے کی پابندی لگائی جاتی ہے۔ جن خواتین و حضرات کو دعوت نامے دیئے جاتے ہیں وہ بھی اکثر شگوفہ خریدتے دیکھے گئے۔

ادبی اجلاس کی صدارت برصغیر کے نامور افسانہ نگار انتظار حسین نے کی۔ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر نے مہمان خصوصی (پاسدر) کی حیثیت سے ایک دلچسپ مضمون پڑھا۔ اس اجلاس میں گیارہ مضامین پڑھے گئے۔ یہ پُرلطف محفل تقریباً ۲½ گھنٹے جاری رہی۔ جناب انتظار حسین کا صدارتی خطبہ، جناب ہاشم علی اختر، جناب رشید قریشی، ڈاکٹر حبیب ضیاء، پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم، برہان حسین کے مضامین زیر نظر شمارے میں شریک اشاعت ہیں۔

۱۶ اپریل کو منعقدہ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ بھی بے حد کامیاب رہا۔ باذوق سامعین کی بہت بڑی تعداد نے اس مشاعرہ میں شرکت کی۔ مشاعرہ میں سنائے گئے کلام کا انتخاب اس شمارہ میں شریک کیا گیا ہے۔

● زندہ دلان حیدرآباد کی مجلس عاملہ کے اجلاس نے جو جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ طے کیا ہے کہ اعلیٰ کے بے مثل طنز و مزاح نگار شاعر اکبر الہ آبادی کی صد سالہ تقریبات اہتمام کے ساتھ منائیں۔ اس خصوص میں تفصیلی پروگرام کا اعلان بہت جلد کیا جائے گا۔

انتظار حسین
(پاکستان)

خطبۂ صدارت

ادبی اجلاس منعقدہ ۱۵ر اپریل ۸۳ء

ایک افسانہ نگار غریب پاکستان کے شہر لاہور سے چلا ہرج مرج کھینچتا حیدرآباد پہنچا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے اسے پکڑا اور صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اسے کہتے ہیں خدا کی دین کہ آدمی آگ لینے کے لئے نکلے اور اسے پیمبری مل جائے۔ حیدرآباد شہر کا شوق دید کھینچ کر یہاں لایا تھا۔ وہ شوق بھی پورا ہوا۔ ساتھ میں صدارت بھی مل گئی ـــــ اور دو دو۔ واقعی سچ کہا کہنے والوں نے کہ حرکت میں برکت ہے۔ وطن سے قدم نکالا، دیارِ ہند میں نگر نگر گھومے تب مقدر کا ستارہ چمکا اور یہ دن خدا نے دکھایا کہ ہمیں بھی کسی نے عزت کے ساتھ پکارا اور کرسی صدارت پہ بٹھایا۔ لاہور میں تھے تو گھر کی مرغی دال برابر۔ یاروں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ یہ شخص تو بس کہانیاں لکھتا ہے۔ اور صحیح سمجھا۔ اپنی اوقات تو کہانی لکھنے کی حد تک ہی رہی۔ صدارت افسانہ نگاری نیا شد اس کے لئے آدمی کا شہر میں صاحب اعتبار ہونا لازم آتا ہے۔ مگر ہاتھی پہ بیٹھنے اور مسند صدارت سنبھالنے کا شوق کسے نہیں ہوتا۔ زمانے کے ساتھ اتنا ہی تو فرق پڑا ہے کہ ہاتھی کی جگہ موٹر آگئی ہے۔ مسند کی جگہ کرسی نے لے لی ہے۔ مگر شوق تو اپنی جگہ ہے۔ میں لاکھ اپنی بے نیازی دکھاؤں مگر کیا آپ کو یقین آئے گا۔ تو چلئے اعتراف کئے لیتے ہیں کہ شوقِ صدارت کہیں ڈھکا چھپا اپنے یہاں بھی تھا۔ مگر اصلی اور بڑی صدارت یعنی خطبۂ صدارت اور مائک ڈائس والی صدارت تو دور کی بات ہے ہفتہ وار ادبی نشستوں والی ملی دلی صدارت بھی مشکل ہی سے میسر آئی۔

بات یہ ہے کہ صدارت کے لئے فاصلہ بہت ضروری ہے۔ میں جب اپنے شہر کی ادبی انجمن حلقۂ ارباب ذوق میں شامل تھا تو ہم دوستوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ سالانہ اجلاس کی صدارت کسی ایسے معزز ادیب سے کرائیں جو ہماری ہفتہ وار نشستوں میں اور آئے دن ہونے والی محفلوں میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ ہم بہت سوچ بچار کے بعد کسی ایسی ادبی شخصیت کا نام تجویز کرتے جو اپنی تحریر سے زیادہ اپنی کم آمیزی کی وجہ سے شہر میں ممتاز ادیب کے طور پر جانا جاتا تھا۔ پھر ہم بہت ٹیلیفون کرنے کے بعد اس سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے اور اسے صدارت کی کرسی پر بٹھا کر سرکاٹے حلقہ سے سرخرو ہوتے۔ خیر یہ تو بڑی صدارت ہوئی۔ حلقہ پھر ہفتے اپنی محفل آراستہ کرتا تھا اور ہر ہفتہ ایک صدر کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اس قسم کے منی صدر کے لئے

بھی کوشش یہی رہتی تھی کہ گھر کی مرغی نہ ہو، تھوڑا عزت دار بھی ہو۔ بگر عزت دار صدارت کے لئے وعدہ تو کر لیتے تھے مگر بالعموم عین وقت پہ ٹیلیفون پر رابطہ پیدا کئے جانے پر کسی مصروفیت کا بہانہ کر کے طرح دے جاتے تھے اور پھر سکریٹری صاحب حاضرین میں سے کسی کو چن کر صدارت کی کرسی پہ بٹھا دیتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے منہ پھوڑ کر سکریٹری سے جو میرا عزیز دوست تھا کہا کہ ایسی پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ موصوف نہیں آتے ہیں تو اپنی جگہ خوش رہیں۔ جو موجود ہیں ان میں کسی کو صدر بنا دو۔ وہ بولا کہ آج حاضرین میں کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آرہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کسے صدر بنایا جائیگا۔ میں نے بے تکلفی سے کہا کہ یار قصہ ختم کرو، مجھے صدر بنا دو۔ سُن کے وہ ستم ظریف ہنسا جیسے میں نے تمسخر کیا تھا اور پھر ایک انٹلکچوئل کو صدر بنا دیا۔ واضح ہو کہ ایک انٹلکچوئل ایک سیدھے سچے افسانہ نگار اور شاعر کے مقابلہ میں زیادہ معزز ہوتا ہے اس لئے کہ وہ شاعری اور افسانے پر ایک ثقاہت کے ساتھ مدلل گفتگو کر سکتا ہے جبکہ شاعر اور افسانہ نگار خالی لکھتے ہیں۔ بولنے اور استدلال کرنے میں ان کی کچی ٹکیا ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ صدارت میرے لئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے اور کتنی مسرت کا باعث ہے۔ بہرحال یہ سب سفر کی برکت ہے۔ ہندوستان میں آکر میں تو گھر کی مرغی نہیں رہا۔ یہاں میں پاکستان سے لایا ہوا معزز مہمان ہوں۔ بس اسی چکر میں تابڑ توڑ صدارتیں کر رہا ہوں۔ مگر قسمت کی خوبی دیکھئے کہ جس جلسہ کی صدارت میسر آتی ہے وہ بیچ میں سے طنز و مزاح کا جلسہ نکلتا ہے۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ منتظمین جلسہ کی حسِ مزاح واقعی تیز ہے۔ مگر اسی کے ساتھ مجھے ایک سوال بھی پریشان کر رہا ہے۔ یہ کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کی اس قدر بہتات کیوں ہے۔ میں جب میر سیمینار میں شرکت کے لئے لاہور سے چلا تھا تو اس گمان میں تھا کہ ہندوستان کی اُردو دنیا خُدا خُدا کر کے غالب کے چنگل سے نکلی اور میری ہوئی۔ مگر یہاں آکر یہ کھلا کہ ہندوستان والے تو سودائی ہیں۔ جس نگر میں قدم رکھو پتہ چلے گا کہ ظرافت کا موٹا تہنا پھولا ہوا ہے، انشائیے لکھے جا رہے ہیں۔ طنز و مزاح کے سیمینار ہو رہے ہیں۔ لیجئے میں یہ تو بھول ہی چلا تھا کہ مجھے مزاح کو محفل مزاح نہیں کہنا ہے۔ ہوا یوں کہ پرسوں اترسوں پٹنہ میں اکبرالہ آبادی کے طنز و مزاح پہ مقالہ پڑھتے ہوئے ایک مقالہ نگار نے پہلے مِزاح کہا، پھر مَزاح کہا، پھر مُزاح کہا۔ اس پہ ایک تن چلے نے اُٹھ کر کہا کہ مقالہ نگار بہت کنفیوزڈ ہے۔ ایک مرتبہ اس نے مِزاح کہا، دوسری مرتبہ مَزاح کہا، تیسری مرتبہ مُزاح کہا۔ اصل میں یہ مِزاح ہے۔ یہ سُن کر میں کنفیوزڈ ہو گیا۔ آخر طے کیا کہ مَزاح صحیح ہے۔ مَزاح ہی کہنا چاہیئے۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ بہار کا داخلی مسئلہ ہے مجھ غیر ملکی کو اس میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیئے۔ عافیت اسی میں ہے کہ اس قضیئے میں غیر جانبدار رہو۔ تو غیر جانبداری کے تحت میں ایک دفعہ مزاح کہوں گا۔ دوسری دفعہ مزاح تیسری بار مزاح کہوں گا۔ ہاں پٹنہ میں جب اکبرالہ آبادی پہ مقالات ہو چکے اور اٹت مِمیلوں اور مزاحیوں کا دور شروع ہونے کو تھا تو ایک مزاح نگار بولا کل گیا جانا ہے۔"

گیا کا نام سن کر میں سراپا عقیدت بن گیا "اچھا آپ گیا جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں وہاں کل طنز و مزاح کانفرنس ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "طنز و مزاح کانفرنس گیا میں؟"

"جی ہاں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"
"تعجب کی تو کوئی بات نہیں۔ مگر گیا مہاتما بدھ کا نگر ہے۔"
"تو کیا مہاتما بدھ کے نگر میں ہنسنا منع ہے؟"

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ چپ ہو گیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اپنے شہر کے عجائب گھر میں گندھارا آرٹ کے بہت نگینے جمع ہیں۔ ان نگینوں کو دیکھتے ہوئے ایک نگینہ کو میں نے زیادہ دلچسپی سے دیکھا اور اپنے دوست سے کہا کہ "یار ذرا غور سے دیکھو مہاتما بدھ کے لبوں پر تبسم کی ایک کیفیت ہے؟"

وہ بولا "ہاں یہ لافنگ بدھا ہے۔"

اور اس خیال کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ آج گیا میں کتنے لافنگ بدھا اکٹھے ہوں گے۔ مگر میں مہاتما بدھ کا تصور ایک زیر لب تبسم کے ساتھ تو کر سکتا ہوں۔ قہقہوں کے ساتھ مہاتما بدھ کا تصور نہیں کر سکتا۔ مگر گیا کے بودھی برکش کو یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر میں گیا پہنچ سکتا تو اس کانفرنس کی بھی کسی نشست کی صدارت مجھے مل جاتی۔ خیر حیدرآباد کے زندہ دلوں کے اجلاس کی صدارت کے بعد اب مجھے کسی اور صدارت کی حسرت نہیں رہی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد میں مزاح نگاروں کی صف میں شمار ہونے لگوں گا۔ پچھلی مرتبہ جب میں دلی آیا تھا تو مجتبیٰ حسین نے بڑے خلوص سے مجھے دعوت دی۔ "انتظار صاحب، حیدرآباد چلیئے وہاں طنز و مزاح کانفرنس ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "مگر میں تو مزاح نگار نہیں ہوں۔ میری شرکت وہاں کس بہانے سے ہوگی؟"

"یہ آپ کی انکساری ہیں۔ آپ مزاح نگار ہیں۔"

میں نے بصد تشویش پوچھا "میرے کونسے افسانوں کی وجہ سے آپ کو مجھ پر یہ شک گزرا۔"

"افسانوں کے واسطے سے نہیں۔ آخر آپ کالم بھی تو لکھتے ہیں۔"

یہاں مجھے چپ ہونا پڑا۔ کالم نگاری میری دکھتی رگ ہے۔ طنز و مزاح اصل میں میری پیشہ ورانہ مجبوری ہے ؏

روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

اپنے پیشے کے تقاضوں کے زیر اثر مجھے اپنے کالم کو ایسا رنگ دینا پڑتا ہے کہ اس پر مزاح کا گمان گزرے۔ ممکن ہے کوئی پوچھے کہ تجھ قنوطیت پسند یاسیت زدہ افسانہ نگار کے پاس یہ نسخہ کہاں سے آیا۔ لیجئے میں بتائے دیتا ہوں۔ جب میں نے پہلے پہل لاہور میں قدم رکھا تھا تو جوش ہجرت میں ایک سانس میں کئی محاورے بول ڈالے۔ میں سمجھا تھا کہ لاہور کے دوست میری اردو سے مرعوب ہوں گے مگر وہ مرعوب نہیں محظوظ ہوئے۔ بولے "یہ کونسی اردو ہے؟" میں نے کہا "یہ میری نانی اماں کی اردو ہے۔" اس پہ وہ اور محظوظ ہوئے۔ بس میرے ہاتھ ایک ٹٹکا آ گیا۔ کالم میں ایک بھی محاورہ آ جائے تو یہ پورے لاہور کو ہنسانے کے لئے بہت کافی ہے۔ تو اس طرح میں ایک جعلی قسم کا مزاح پیدا کرتا ہوں لیکن اب جب میں زعفران زار حیدرآباد سے واپس جاؤں گا تو میرا خیال ہے کہ میں ایک کھرا مزاح نگار

بن چکا ہوں گا۔ لاہور کے ذکر پر یاد آیا کہ سر سید احمد خاں نے پنجاب والوں کو زندہ دل کہا تھا مگر حیدرآباد کے زندہ دل اس معاملہ میں سر سید احمد خاں کے شرمندہ احسان نہیں وہ اپنے زور پر زندہ دل بنے ہیں۔

لیجئے میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ وہ سوال تو وہیں کا وہیں رہ گیا کہ آخر ہندوستان میں طنز و مزاح پر اتنا زور کیوں ہے۔ میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ یار تم آئے دن طنز و مزاح کانفرنسیں کرتے ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس دوست نے جواب دیا کہ اصل میں ہم نقادوں سے بور ہو چکے ہیں۔

میں نے ٹکڑا لگایا "اور شاید مشاعروں سے بھی؟"

"ہاں شاید مشاعروں سے بھی"

شاید کیا واقعی۔ غالب نے یہ آموں کے متعلق دو شرطیں لگائی تھیں کہ میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ ہندوستان کے مشاعرے کم از کم دوسری شرط بدرجۂ کمال پوری کرتے ہیں۔ سو اس دیار میں کسی نہ کسی دن نثر نگاروں کا پیمانہ صبر سے لبریز ہونا ہی تھا۔ سو یہ نوبت آنی ہی تھی کہ حالا نثر من بشنو۔ اور یاروں نے صحیح سوچا کہ پبلک میں نثر کا کوئی برانڈ چل سکتا ہے تو وہ طنز و مزاح کا برانڈ ہے۔

مگر پھر مجھے ایک خیال اور آیا۔ کبھی کبھی درد و الم سے لبریز کسی بڑے تجربے کے بطن سے بھی تو یہ طرز اظہار جنم لیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے تجربے کے بطن سے جہاں مولانا حالی کی مرثیہ نگاری نے جنم لیا وہیں اکبر الہ آبادی کے طنز و مزاح نے بھی جنم لیا۔ اور پھر لوہا اور وہ پنج نکو پیدا ہو گیا جس نے حملہ کر کے مولانا حالی کو میدان پانی پت کی طرح پامال کر ڈالا۔

اکبر الہ آبادی کا حوالہ میں نے دے تو دیا ہے مگر اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ بامعنی مزاح صرف قومی یا سماجی صورت حال کے شعور کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے ایسی کوئی شرط نہ کبھی افسانے کے سلسلے میں مانی ہے اور نہ طنز و مزاح کے سلسلہ میں ماننے کے لئے تیار ہوں۔ ابھی چند دن پہلے جب میں مجتبیٰ حسین سے یہ پوچھ رہا تھا کہ خطبۂ صدارت کیسے لکھا جاتا ہے تو انھوں نے نمونتاً آپ کی اس کانفرنس کے کچھ اگلے پچھلے صدارتی خطبے مجھے دکھائے۔ ان خطبوں سے مجھے پتہ چلا کہ شاعری اور افسانے کی طرح طنز و مزاح سے بھی یہ تقاضے ہو چکے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی سماجی کوئی قومی کوئی انقلابی مقصد ہونا چاہئے۔ ما جو یہ وہ زمانہ ہے جب ادب کے سلسلے میں چاہئے کا لفظ بہت استعمال ہوتا ہے۔ ادب کو کیا ہونا چاہئے، کیا نہیں ہونا چاہئے۔ مگر میں ادب کے سلسلے میں صرف ایک چاہئے کا قائل ہوں۔ یہ کہ ادب کو کسی کے بتائے ہوئے چاہئے کا تابع نہیں ہونا چاہئے۔ اور مزاح نگار سے ایسا تقاضا یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص کھلکھلا کر ہنس رہا ہو اور آپ اسے ہنستے ہوئے ٹوک دیں کہ بھائی ہنس تو رہے ہو مگر یہ تو پہلے طے کر لو کہ تم کس نصب العین کو سامنے رکھ کر ہنس رہے ہو۔ اور اس قہقہے کی افادیت کیا ہے۔ سودا کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں تھا کہ آج یاروں کی ہجویں لکھ رہے ہیں کس مقصد کے تحت لکھ رہے ہیں، ان کی سماجی افادیت کیا ہے۔ وہ ایک مہذب زمانہ تھا۔ اور شاعروں سے ایسے غیر مہذب سوال نہیں کئے جاتے تھے۔ سودا کے پاس جس قسم کا بھی شعور یا احساس تھا باہر والوں کے کسی تقاضے کے بغیر خود سودا سے ہدایات لئے بغیر اور سودا کو اطلاع دیئے بغیر خفیہ خفیہ اپنے اردگرد کے حالات کو جتنا سمجھ رہا تھا اور [illegible] عمل کے

حوالے کر رہا تھا۔ سو اس تخلیقی عمل میں ہوایوں کہ ازادکی بجویں لکھتے لکھتے سوداؔ نے اپنے پورے عہدکی ہجو لکھ ڈالی کہ اب وہ اس عہد کی سماجی اقتصادی اور اخلاقی ابتری کی ایک دستاویز ہے۔ اور اسی عمل میں ایک معنی سے بھرپور علامت نے جنم لیا۔ ایک نحیف و نزار گھوڑا جو اپنے عہد کی ساری سیاسی افراتفری، اقتصادی بدحالی اور اخلاقی انحطاط کو سمیٹ کر مغلوں کی طاقت کے زوال کی علامت بن گیا۔ پیچرے میں یہاں تک لکھ پایا تھا کہ کاغذ ہی ختم ہو گیا۔ چلتی گاڑی میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ وہاں مزید کاغذ کہاں سے دستیاب ہو جاتا چلئے اچھا ہی ہوا۔ اس میں طرفین کا فائدہ ہے۔ میری مزید لکھنے سے جان بچ گئی۔ آپ مزید سننے سے بچ گئے۔ لکھنے والے کا بھلا سننے والے کا بھی بھلا

نئی حکومت نئی اداکاری — رشید عبدالسمیع جلیل

وہ ایک پنجہ سروں پر جو مسلط تھا زمانے سے
جب آیا سال نو تو ہٹ گیا بالکل ٹھکانے سے

وہ پنجہ آہنی تھا یا زنانی سوچنا کیا ہے؟
ہوا کیسی تھی اب کیسا ہے پانی سوچنا کیا ہے؟
کبھی زندہ ہوا ہے آنجہانی سوچنا کیا ہے؟
بلیک اینڈ وہائٹ تھی کیا کیا کہانی سوچنا کیا ہے؟
سیاسی جنگ فلم اسٹار نے جیتی ہے سیکل پر
لگا اسٹار ہینڈل سے مصری ہے فلم ہینڈل پر

اب اس سے کیا ریہرسل ہو رہی ہے یا ڈبل ایکٹنگ
سپھولے میں ہے شوٹنگ یلچیلیچرین آنجکلنگ
منسٹر بھی نئے میوزک ہے سب ہی اے ایم کی ڈائریکٹنگ
بلی بلڈنگ ہے اب سروں نہ چیٹنگ ہی ہی بیکنگ
ہے پکچر تلگو دیشم کا سنبھل کر دیکھنا ہوگا
ہمیں ہر شو کئی پہلو بدل کر دیکھنا ہوگا

سیاست میں اداکاری نہ ہو تو کیا سیاست ہے؟
حکومت اور درباری نہ ہو تو کیا سیاست ہے؟
گدھوں کی بار برداری نہ ہو تو کیا سیاست ہے؟
دغابازی و عیاری نہ ہو تو کیا سیاست ہے؟
یہ ساری مصلحت اندیشیاں صدیوں سے جاری ہیں
مگر انسانیت کے بھی زمیں پر کچھ پجاری ہیں

اگرچہ آتے آتے ہی ہزاروں کو بھٹا یا گھر
کہیں ایسا نہ ہو کھچڑی پکے اندر ہی اب اندر
بنالیں ایک نیا دیشم وظیفہ خوار سب مل کر
حکومت آندھرا پنشنرس کی قائم ہو بالآخر
لڑیں گے وہ الکشن ہنڈیوں پر اپنے پنشن سے
اگر بدیا ترا ہوگی تو غش کھائیں گے ٹنشن سے

ہمیں اب دیکھنا یہ ہے یہاں اردو کا کیا ہوگا؟
غزل کے بانکپن کا، حسن کا، جادو کا کیا ہوگا؟
بہت سامان زیبائش قد و گیسو کا کیا ہوگا؟
کھلے ہیں پھول گلشن میں مگر خوشبو کا کیا ہوگا؟
زبان یار من تلگو و من تلگو نمی دانم
نمی دانم، نمی دانم، نمی دانم، نمی دانم

چونکہ برخاستگی کی اطلاع زندہ دلانِ حیدرآباد کی جانب سے مراسلہ کی شکل میں نہیں ملی ہے۔ لہٰذا مجھے جلسہ گاہ میں پہونچ جانا چاہئیے اگر استقبال کرنے والے اس طرح کا برتاؤ نہ کریں جو مہمان خصوصی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور جس کا میں گزشتہ تین مہینوں میں کافی عادی ہو چکا ہوں تو میں خاموشی سے مجمع میں جا بیٹھوں گا اور زیادہ آزادی سے قہقہے لگا کے گھر واپس آجاؤں گا۔ اور اگر عہدہ واقعی برخاست نہیں ہوا ہے تو پھر مجھے اسٹیج پر بٹھایا جائے گا۔ اور اگر کرسیوں کی ساخت میں کوئی فرق نہ ہو تو جس طرح مجمع میں کسی جگہ بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح اسٹیج پر بیٹھنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بات اس لئے ذہن میں آئی کہ چند دن ہوئے ایک جلسے میں تین زرین کرسیاں ڈائس پر رکھی تھیں۔ دو بہت بڑی اور درمیان میں ایک بہت چھوٹی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ یہ جلسہ خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ہے اور شاید حکومت کی پالیسی بدل گئی ہے اور ہم دو اور ہمارے دو کی بجائے ہم دو اور ہمارا ایک آج کل کا چالو نعرہ ہے اور اسی مناسبت سے ڈائس پر کرسیاں رکھی گئی ہیں۔ کہ ہم دو اور ہمارا ایک لیکن دریافت پر معلوم ہوا کہ پہلے منتظمین جلسہ نے ایک مہمان خصوصی اور ایک افتتاح کنندہ کو دعوت دی تھی اور دو بڑی زرین کرسیاں منگوائی گئی تھیں لیکن پھر خیال ہوا کہ جلسہ کا صدر ہونا بھی ضروری ہے اب جو تیسری کرسی منگوائی تو چھوٹی سائز کی مل سکی اور چونکہ مجھ سے صدارت کے لئے کہا گیا تھا اس لئے چھوٹی کرسی درمیان میں رکھ دی گئی تاکہ نشستوں میں بے قاعدگی نظر نہ آئے یہ کرسی اتنی چھوٹی تھی کہ اس پر بیٹھنے کے بعد میز کے اوپر سے حاضرین کی شکل دکھائی دینے کے بجائے میری نظروں کے سامنے صرف میز کی سطح تھی اور مجھے حاضرین کو دیکھنے کیلئے بار بار کھڑے ہونا پڑا۔

پھر یہ خیال ہوا کہ اگر میں واقعی صدارت کر رہا ہوں تو مجھے تقریر کرنی پڑے گی اور اگر صرف مہمان خصوصی کی طرح بیٹھنا ہے تو تقریر کے بارے میں معذرت کرلی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک اور حالیہ تجربہ کی بنا پر یہ بات بھی غیر یقینی معلوم ہوئی۔ ہوا یہ کہ کوئی ایک مہینہ قبل میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں (TRANSCANDENTAL MEDITATION) کے ایک جلسہ کی صدارت کروں۔ مقرر امریکہ سے آئے ہوئے ایک سوامی جی ہوں گے جو دراصل ایک مشہور جوہری (ATOMIC) سائنس داں اور پروفیسر تھے لیکن اب انھوں نے سنیاس لے لیا ہے اور ان کے ساتھ کیلیفورنیا کے دو تین گورے چیلے بھی ساتھ آرہے ہیں۔ ہم لوگ آزادی کے چھتیس سال بعد بھی گورے آدمی سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گورے رنگ کا حجام بھی ہندوستان آجائے، تو ہر بڑے ہندوستانی کے گھر کا دروازہ اس کے لئے کھل جاتا ہے اور سوائے حجامت کے اس کو ہر کام کا ماہر فن سمجھا جاتا ہے خیر۔ میں نے جوہری توانائی، TRANSCENDENTAL MEDITATION اور گورے رنگ کے چیلوں سے متاثر ہو کر صدارت قبول کرلی۔ جلسہ گاہ جامعہ عثمانیہ کا ٹیگور آڈیٹوریم تھا۔ اور بقول ہمارے دعوت دینے والے بزرگ کے [illegible] بڑا ہال بھی سوامی جی کی شہرت کی وجہ سے حاضرین کے لئے کافی نہ ہو سکے۔

غرض مقررہ دن مقررہ وقت سے کوئی پندرہ منٹ پہلے سوامی جی اور ان کے دو گورے چیلے زعفرانی چادریں اوڑھے ہوئے ہمارے دفتر آپہونچے جہاں سے ہم ٹیگور آڈیٹوریم روانہ ہوئے۔ جلسہ گاہ میں سوائے مائک دینے والوں کے کوئی موجود نہیں تھا۔ اسٹیج پر دو زرین کرسیاں رکھی تھیں اور ہال بالکل خالی تھا۔ کوئی پندرہ منٹ انتظار کے بعد میں نے سوامی جی اور بیچارے

منتظم جلسہ کی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا کہ بہتر ہے کہ ایک سنہری کرسی نیچے منتقل کردی جائے جس پر سوامی جی بیٹھ جائیں گے اور میں بجائے صدارت کرنے کے جلسہ کا واحد مہمانِ خصوصی بن جاؤں گا۔ سوامی جی تقریر شروع کردیں اور لوگ آہی جائیں گے۔ ہم ہندوستانی وقت کو اپنی جگہ پر رکھتے ہیں اسی لئے وقت ہم کو ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ بہرحال سوامی جی نے تقریر شروع کی اور مزید سننے والوں کے انتظار کا خاطر خواہ ڈیڑھ گھنٹے تک TRANSCENDENTAL MEDITATION پر بولتے رہے جس کے گہرے اثر سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن چونکہ میں واحد مہمانِ خصوصی تھا میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ ان کو پتہ نہ چلے کہ میں سو رہا ہوں۔ تقریر ختم کرکے سوامی جی نے مجھے مہمان خصوصی سے ترقی عطا کرکے جلسہ کی صدارتی تقریر کرنے کی خواہش کی اور اس طرح مجھے دونوں کام کرنے پڑے۔

آخر میں جناب انتظار حسین صاحب سے معذرت کے ساتھ میں یہ عرض کروں گا کہ اگر وہ صدر ہیں تو میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بول رہا ہوں اور اگر میں صدر ہوں تو یہ میری صدارتی تقریر ہے۔

میں زندہ دلانِ حیدرآباد کا ممنون ہوں کہ اپنی زندہ دلی کے ثبوت میں انہوں نے ہم دونوں سے یہ اچھا عملی مذاق کیا ہے۔ میں صدر زندہ دلان حیدرآباد نوتن صاحب اور ان کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس دلچسپ تقریب میں مجھے شرکت کا موقع عطا فرمایا۔

سلسلہ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد

ممتاز مزاح نگار پرویز یداللہ مہدی کے مضامین کا تازہ مجموعہ

ٹائیں ٹائیں فش

گیارہ پُر از مزاح دلچسپ مضامین ۔ صفحات: ۱۲۸

قیمت: ۱۵ روپے
(مع خوبصورت ملٹی کلر ٹائیٹل)

یہ کتاب بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے

رشید قریشی

نئے زمانے کا دُلہا

پُرانے زمانے کا دلہا، دلہن کے گھر پہنچتا تھا تو اس پر سے بکرا اُتارا جاتا تھا۔ نئے زمانے کا دلہا شادی خانہ میں داخل ہوتا ہے تو دلہن کا باپ پکڑا جاتا ہے صدقہ کی اس جان بخش روح افزا اور حیات آفریں رسم کی انجام دہی سے پہلے دلہا والے دلہن کے باپ سے چند آسان شرطیں بھی منوا لیتے ہیں۔

- گھوڑے جوڑے کی رقم دلہا کے والد کو شادی سے ایک ماہ قبل یکمشت ادا کر دی جائیگی۔
- جہیز کا سامان منظورہ فہرست کے مطابق، مکان کے ایک علیٰحدہ حصہ میں جما دیا جائے گا اور دولہے والوں کو وقتاً فوقتاً اچانک معائنوں کی سہولت، خوش دلی کے مظاہرے کے ساتھ بہم پہونچائی جائے گی۔
- مہر شرعی ہوگا اور اس کی ادائی ہوگی عالم نزع یا حشر میں جو بھی پہلے واقع ہو۔
- چوتھی کا کھانا پورے لوازمات کا ہوگا اور اس فراوانی کا ہوگا کہ دلہا والوں کے مدعو اور غیر مدعو سارے مہمانوں کے لیے کافی ہو اور دلہا والے دوسرے دن کے لیے گھر کو بھی لے جا سکیں۔
- دلہن کے زیورات، دلہا کی والدہ کے حوالے کر دیئے جائیں گے تاکہ وہ ان زیورات کو اپنی طرف سے دلہن کو پہنا کر اُسے اپنی بہو بنالے۔
- دلہا کے لیے ۲۲ فٹ لامبی سرخ رنگ کی امپالا موٹر بھیجی جائیگی اور اُسے دلہا کے ماموں کی دکان پر پھولوں سے سجایا جائے گا۔

بینڈ والے من مانی فلمی دھنیں بجاتے بجاتے تھک کر ستانے ہی والے تھے کہ

دلہا کی موٹر گیٹ پر پہنچ کر رُک گئی۔ بینڈ پورے شور سے پھٹ پڑا اور دلہن کے مختلف رشتوں کے بھائی گیٹ بند کئے نذرانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ نوک جھونک میں بے تکلفی کا رنگ تیز ہونے لگا تو دلہا کے والد نے دلہن کے باپ کو پکارا! وہ بھاگا بھاگا گیٹ کے پاس آیا۔ التجائیں بے اثر ہوئیں تو اس نے گیٹ بند کرنے والوں سے وعدہ کیا کہ ان کا نذرانہ بھی وہی ادا کرے گا لیکن وہ منچلے وعدہ کی ضمانت پر اڑ گئے تو دلہن کے باپ نے اپنی دستی گھڑی ان کے حوالے کر دی تب گیٹ کھلا۔ دلہا کی موٹر اندر آئی۔ دلہا اُترا اور یوں نظر آیا جیسے پھولوں کا ایک ٹیلہ موٹر سے لڑھک کر زمین پر قائم ہوگیا۔ پھولوں کا ٹیلہ مسلسل ہلنے جلنے لگا کیونکہ کرایہ کی زریں شیروانی کے اندر، سابق دولہوں کی ناآسودہ آرزوئیں، پرانے جھینگروں کے نوزائیدہ بچوں کی طرح رینگ رہی تھیں اور سہرے کے اندر دم گھٹنے لگا تھا۔

دلہا کے والد محلہ کے ایک پہلوان کو مہمان بنا کر ساتھ لے آئے تھے۔ اشارہ پاتے ہی اس پہلوان نے آگے بڑھ کر دلہا کو اپنی گود میں اُٹھالیا۔ دلہا اس قدر بھاری بھرکم تھا کہ پہلوان کو اپنی پوری طاقت سے جھپٹنا پڑا اور اس جھپٹ میں دلہا کی زریں شیروانی کا پچھلا حصّہ سمٹ کر کمر سے اوپر اٹھا رہ گیا۔ یہ نمائش سب کی نظروں کا مرکز بن گئی۔ کیونکہ ایک طرف چہرہ سہرے میں پوشیدہ تھا تو دوسری طرف پشت بے لباسی میں جلوہ نما تھی۔ گویا آنگن ڈھکا اور پچھواڑہ کھلا تھا۔

پرانے زمانے کی بات ہے ایک نواب زادہ دونوں پاؤں سے معذور تھا، نوابوں کے لیے کوئی معذوری شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی، اس لیے نواب زادہ کی شادی قرار پا گئی۔ شادی کے دن دولہے نواب کو مسند نشین کرنے کے لیے گود میں اُٹھالیا گیا اور مشہور کیا گیا کہ باربرداری کا مقصد، زندگی کے ایک مشقت طلب آغاز کے لیے دلہا کو تازہ دم رکھنا ہے۔ یہ گود چڑھائی اس قدر مقبول ہوئی کہ شادی کی رسوم میں شامل ہوگئی۔

ایک دعوت میں ایک امریکن خاتون میرے بازو بیٹھی تھیں، دلہا آیا تو اپنی جگہ اڑا کھڑا رہ گیا۔ اس امریکن عورت نے مجھ سے پوچھا "یہ دلہا اندر کیوں نہیں آتا؟"

میں نے کہا "ہمارے ہاں دلہا آتا نہیں، لایا جاتا ہے۔"

اتنے میں ایک فربہ اندام شخص نمودار ہوا اور دُلہے کو اٹھا کر اندر لے آیا۔ میں نے مسکرا کر امریکن عورت کی طرف دیکھا تو اس نے معذرتی لہجہ میں کہا "مجھے افسوس ہے میں نے دلہے کے بارے میں غلط اندازہ قائم کر لیا دراصل وہ بیچارا پولیو کا مارا ہے"۔ میں نے وضاحت کی "نہیں محترمہ آپ کا اندازہ بالکل درست تھا یہ ایک ناقص العقل دلہا ہے جو جوانی میں بچپن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے"۔ وہ مسکرانے لگی "یہاں شادی کیا اتنی سخت آزمائش ہے کہ دلہا اپنے بچپن کی طرف بھاگ نکلنا چاہتا ہے؟" اس سوال کی میں نے یہ تشریح کی۔

"نہیں محترمہ یہ پرتھوی سوئمبر کی الٹی شکل ہے۔ وہاں دلہن کو لے بھاگنا تھا یہاں دلہے کو اٹھالیجانا ہے، ذرا دیکھئے دلہے کو اٹھانے والا اس فخریہ انداز سے چاروں طرف دیکھ رہا ہے جیسے جتا رہا ہو کہ دلہن والوں نے داماد کے انتخاب میں غلطی کی ہے"۔ وہ ہنس کر چپ ہورہی اور بحث وہیں ختم ہوگئی۔

نئے زمانہ کا دلہا اپنے دو پاؤں کے گھوڑے کی گردن اور کمر کو توڑتا ہوا مسند کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے سامنے اس کا چھوٹا بھائی مصری بادام کی کشتی اٹھائے، اٹھلاتا چل رہا تھا اور حاضرین پر سوالی نظریں ڈال رہا تھا "مانگ کیا مانگتا ہے؟"

دلہا کو اٹھانے والا پہلوان دغدغہ غبغب کا مریض تھا اور اسے بادام مصری کی کشتی کے سوا، کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ لوہے کی کرسی کے پائے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ گرا۔ دلہا اچھل کر، بادام مصری کی کشتی اٹھائے سامنے چلنے والے بھائی پر سوار ہوگیا اور دونوں زمین پر آرہے۔ دلہا کا بھائی چالاک تھا۔ گرتے گرتے اس نے بادام مصری کی کشتی کو اپنے سینے کے نیچے کھینچ لیا۔

سامنے کی صفوں والے مہمان پہلو بدل کر رہ گئے۔ چند غیر مدعو مہمانوں نے اپنی حیثیت کو معتبر بنانے کے لیے دلہا کو اٹھاکر پیدل پیدل مسند تک پہنچایا۔ دولہے کو اٹھانے والے پہلوان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ وہ خون تھوکتا زمین ہی پر پڑا رہا۔ ایک بچہ اس کے سرہانے آکھڑا ہوا۔ اور بہت غور سے اسے دیکھنے لگا... پہلوان نے گردن اٹھائی تو بچہ نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "کیا بہت مار لگا ہے؟"

پہلوان غرایا ۔۔ "ہاں" یہ آواز اس ڈکراہٹ سے ملتی جلتی تھی جو نعل بندی کے لیے زمین پر گرتے ہوئے بیل کے حلق سے نکلتی ہے۔

"تو پھر روتے کیوں نہیں؟ رو، روونا!" بچہ کا معصوم انداز میں اصرار تھا۔ پہلوان کا سر زمین سے لگ گیا اور اس پر تشنجی کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک.. دو.. تین.. چار.. بچہ دس سے بھی آگے نکل گیا لیکن پہلوان نے دوبارہ سر نہ اٹھایا۔

قاضی نے اپنا دفتر کھولا ہی تھا کہ دلہن کا بھائی حواس باختہ دوڑتا ہوا آیا اور اپنے باپ کو گھسیٹتا زنانے میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد دلہن کا باپ محفلِ عقد میں آیا تو اس کے چہرہ پر ایسی مُردنی طاری تھی، جیسے وہ اپنی موت کا اعلان کرنے آیا ہے۔ یکایک اُن کی آنکھوں میں وہ آگ بھڑکی جس سے آنسو ٹپکتے ہیں، وہ مسند کے تخت پر کھڑا ہوگیا۔

" حاضرین ابھی ابھی مجھے زنانے میں طلب کیا گیا تھا۔ وہاں دلہن کی والدہ محترمہ نے مجھ سے کہا ہے کہ خود ان کی بیٹی کی بھی نسبت طے پاگئی ہے اور ان کے دولہے والوں کا ان سے پچاس ہزار کا مطالبہ ہے،

انھوں نے یہ پچاس ہزار کی رقم مجھ سے مانگی ہے۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر اس رقم کا انتظام نہ ہو تو وہ شادی میں شریک نہیں ہوں گی اور فوری گھر چلی جائیں گی۔ میں دلہا سے پوچھتا ہوں اس بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ " دلہا نے سہرا ہٹا کر، اپنے والد کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کھنکار کر کہا " یہ انتظام تو آپ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ہم آپ کے گھر کے لیے ابھی خریدار مہیا کر دیں گے"۔۔۔ دلہن کا باپ دلہا کے والد کی طرف پلٹا " بھائی صاحب آپ کی بیگم جو رقم اپنی بیٹی کی شادی کے لیے مجھ سے مانگتی ہیں، اصولاً تو اس کا انتظام آپ کو کرنا چاہیئے ... میرا نمبر تو آپ کے انتقال کے بعد آتا ہے۔ اس وقت میں انشاءاللہ اپنی بساط بھر حاضر رہوں گا" دلہا کے والد کھڑے ہو گئے ... " کیسے قلاش ہیں یہ لوگ۔ ایک بچی کی شادی کے لیے پچاس ہزار نہیں دے سکتے۔ ثواب کے سودے کے لیے ایسا پس و پیش، استغفراللہ!" وہ دلہا کی طرف بڑھے " چلو بیٹے! جب تمہاری ماں ہی شریک نہیں رہیں گی تو ہم کیوں رہیں ..." دلہا مسند پر کھڑا ہو گیا اور گلابوں کی پنکھڑیاں جھڑ جھڑ کر اس کے قدموں میں بچھنے لگیں۔ ایک کونے سے بچے کے تلملا کے رونے کی آواز اٹھی جیسے کسی نے کس کے چٹکی بھری ہو ... ایک ضعیف العمر بزرگ اس روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھائے سامنے آ گئے اور بچے کو پچکارنے لگے " نہ رو ... میرے بچے نہ رو ... یہ خوشی کا موقع ہے ... نہ رو ... دیکھ ... اُدھر دیکھ ... ترا باپ دلہا بنا کھڑا ہے .. کیسا سجیلا دلہا ہے دیکھ ترا باپ! ... دیکھ!!" سارے مہمان اس بزرگ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے بچے کو اوپر اٹھایا " یہ بچہ اس دولہے کا بچہ ہے ... چار سال پہلے اس دولہے نے میری بیٹی سے شادی کی تھی اور چار مہینوں کے اندر اپنے پاس بلا لینے کی ڈھارس بندھا کر وہ اسے میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔ آج ٹیپ والے نے میرے پڑوسی کے نام کا رقعہ میرے گھر میں ڈال دیا تو میں بیٹے کو باپ کی شادی میں شریک رکھنے کے لیے یہاں لے آیا۔

دلہن کے باپ نے آگے بڑھ کر دلہا کے سر سے سہرا نوچ ڈالا اور لڑکھڑا گیا لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ اور کونے کی ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے آپ سے باتیں کرنے والوں کی طرح بار بار یہی جملہ دہرانے لگا " میں خوش ہوں، میری بیٹی ایک دھوکہ باز کے ہتھے چڑھ کر برباد نہیں ہوئی۔ میں خوش ہوں ... "

دلہا کے پہلے خسر نے بچے کو دُلہا کے کانپتے ہاتوں میں تھما دیا اور اسی وقت دلہا کے چھوٹے بھائی نے مصری بادام کی کشتی اچھال دی۔

مصری بادام بکھتے جاتے رہے۔ لوٹے جاتے رہے اور ماحول کی اس لطف انگیز تبدیلی نے سب کے ذہن سے اس اندوہناک حقیقت کو یکسر ہٹا دیا کہ .... ۲۴ کیلو وزنی سہرے کی ٹٹی کی آڑ میں ایک ۱۴۰ ڈبکا بٹھا تا کہ ایک معصوم لڑکی دلہن تو بنی، لیکن اس کی سجائی برات بکھر گئی اور وہ شادی خانہ سے بدون ہوئی اپنے ماں باپ ہی کے گھر کو واپس گئی۔

مسیح انجم

جانا ہمارا اپنے وطن کو، اور رول ادا کرنا قاضی کا!

(عرف قصہ ایک سفر کا)

گاؤں میں ہمارے ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔ اور اس شادی میں ہماری شرکت ضروری تھی۔ ویسے، اگر ہم شریک نہ بھی ہوتے تو شادی کے منسوخ یا ملتوی کئے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن ہم نے اس تقریب میں شرکت کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ شادی کے بعد پردۂ غیب سے ہمارے خیر مقدم کے آثار شاید نمودار ہوں۔ چنانچہ ہم نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ دوست کا ایک سوٹ کیس مانگ لائے۔ اپنے عقدِ مسعود کے موقع پر سلائی ہوئی لونڈ کی شیروانی زیب تن کی جسے پچھلے بیس سال سے صرف عیدوں کے موقع پر پہنتے اور سینت سینت کر رکھتے چلے آ رہے تھے۔ ان ساری سرگرمیوں کو ہماری بیگم بڑی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ہمارے چہرے پر غضب کی بشاشت رقصاں تھی۔ بالآخر بیگم سے ہمارے چہرے کی بشاشت دیکھی نہ گئی۔ پوچھ بیٹھیں "جس چہرے پر ٹھیکرے برسا کرتے تھے، آج اس پر ملاحت کیوں کھیل رہی ہے؟ اور یہ کہاں کا ارادہ ہے؟"

پہلی بار اپنی بیگم کے منہ سے ملیح کہلائے جانے پر ہم نے جوش میں کہہ دیا۔ "ہم جوش ملیح آبادی ہیں۔ اور اپنے معشوق سے ملنے جا رہے ہیں!" اس جملے پر، اگر کوئی پڑھی لکھی خاتون ہوتیں تو حضرت جوش مرحوم کی مناسبت سے فوراً انا للہ پڑھتیں۔ لیکن ہماری بیگم تو اردو شاعری اور لٹریچر سے خاصی دور رہی ہیں۔ چنانچہ جب ہم نے "ملاحت" کی مناسبت سے جوش میں "جوش ملیح آبادی" کہہ دیا تو بیگم نے ہمیں طعنہ دیا "آپ کو دیکھو، اور آپ کا جوش دیکھو! پرسوں ہی دو دانت گرے تھے، پرانی دیوار کی اینٹوں کی طرح! اور اب جوش کی بات کر رہے ہیں!"

ہم نے کہا "بیگم تم دانت کو جوش سے کیوں ملاتی ہو؟ دانت کا گرنا ایک الگ بات ہے۔ اور جوش ایک الگ چیز ہے۔ دانت تو پارہ کے استعمال سے کبھی جوانی میں گرنے لگتے ہیں!" بیگم نے حیرت سے کہا "اچھا تو یہ بات ہے! اب آپ پارہ کا کشتہ بھی استعمال کرنے لگے ہیں!" ہم نے جھنجھلا کر سوٹ کیس سنبھالتے ہوئے کہا "بیگم تم بات کو سمجھتی کیوں نہیں؟ میں نے ایک عام بات کہی تھی جو پارہ سے منسوب ہے۔ اب رہا معشوق کا معاملہ، تو جانِ من عرض ہے کہ معشوق کے لئے جنس کی کوئی قید نہیں۔

اور میں جس معشوق سے ملنے جا رہا ہوں، وہ میرا وطن ہے؟"

اچھے شگون سے نکلے تھے، اس لئے وقت پر بس ملی، جب ہم بس سے اُترے تو ہمارے استقبال کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ آدم نہ آدم زاد۔ وہ ایک چھوٹا سا بس اسٹاپ تھا۔ سوچ رکھا تھا کہ کوئی نہیں تو کم از کم ہمارے دوست ربانی صاحب تو ضرور بہ ضرور ہمیں لینے آئینگے، لیکن ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک تو گرما کا موسم۔ دوسرے مئی کا مہینہ۔ دن کے دس بجے ہی سے سورج سر پر شعلے برسا رہا تھا۔ اس بس اسٹاپ سے ہمارا گاؤں کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اور پیدل چلنا ایک مایہ ناز ادیب کے شایان شان نہ تھا۔ چنانچہ ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تاکہ کہیں کوئی سواری نظر آئے۔ اتفاق کہئے کہ تھوڑے سے فاصلے پر نیم کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں ایک شخص سستاتا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی ایک بیل گاڑی لینڈ کی ہوئی تھی۔ اور بیل جگالی کر رہے تھے۔ ہم نے اس شخص کے قریب جا کر فلم "دیوداس" والے دلیپ کمار کے انداز میں پوچھا "اے گاڑی والے! کیا دیلکنٹور چلوگے؟" آرام میں خلل پاکر موٹی موٹی مونچھوں والے گاڑی بان نے ہمیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ہم اپنی ساری ایکٹنگ بھول گئے۔ تب وہ اپنے لہجہ کو ملائم بناتا ہوا بولا "دُورا! (صاحب) یہ گاڑی کرایہ پر چلنے والی گاڑی نہیں۔ یہ تو کچرا منتقل کرنے والی گاڑی ہے"! (حالانکہ کچرے کا استعارہ ہمارے لئے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم ہم نے اپنے سراپا پر ایک تنقیدی نظر ڈالی) اب سوائے پیدل چلنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا، لیکن ایک مایہ ناز ادیب پیدل کیسے چل سکتا تھا۔ سواری نہایت ضروری تھی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے اُسی گاڑی بان کو راضی کیا۔ گاڑی والے نے "سشمیالو" کے درخت کی دو، تین لمبی لمبی ٹہنیاں توڑیں۔ اور پھر ان کی مدد سے گاڑی میں دو کمانیں بنائیں۔ اور پھر اپنی پگڑی کو اُتار کر اُن کمانوں پر ایک چھوٹا سا سائباں بنایا۔ اب ہم شادی میں کت شر کے بہانے، اپنا خیر مقدم کروانے، پگڑی کے سائباں تلے، کچرے کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ اُس گاڑی کی حالت اور بیلوں کی چال کو دیکھ کر اے حمید کے ایک انشائیے کا جملہ یاد آگیا: "گاڑی کا سب کچھ ہلتا تھا، لیکن گاڑی اپنی جگہ سے نہ ہلتی تھی"۔ جب تک باگ گاڑی بان کے ہاتھوں میں تنی رہتی بیل اپنی جگہ سے ہلنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ اور جیسے ہی وہ باگ ڈھیلی چھوڑ دیتا بیل پلٹ کر بھاگنا شروع کر دیتے بیلوں کا یہ سیاسی کھیل راستہ میں کئی جگہ جاری رہا۔ خیر بڑی مشکل سے گاؤں پہنچے۔ جیسے ہی بیل گاڑی دلہن والوں کے گھر پر پہنچی تو لڑکوں کا ایک شور اٹھا، ایک غلغلہ بلند ہوا "قاضی صاحب آگئے! قاضی صاحب آگئے!"

اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سارا قصور تو ہماری ڈاڑھی کا تھا۔ فسادات میں بھی ایسی ہی صورت حال پیش آتی ہے۔ ڈاڑھی والے کو دیکھنے کے بعد قاتل کو یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی کہ "آپ کا اسم شریف کیا ہے؟" اور اُس کا کام اس قدر آسان ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آپ کا کام تمام کر سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ فسادات میں داڑھی والے کا سڑک سے گزرنا گویا کلین شیو والے کے مقابلے میں زندہ رہنے کے پچاس فیصدی مواقع ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ہاں! تو بچوں کی آواز دل پر عورتوں نے ادھر اُدھر سے جھانکنا شروع کیا۔ کچھ عورتوں نے ہماری شان میں کچھ گستاخانہ ریمارکس بھی پاس کئے۔ اتنے میں ربانی بھاگے بھاگے مکان سے باہر آئے۔ اور قاضی کے بجائے ہمیں پاکر کچھ مایوس سے ہو گئے۔ پھر انہیں اچانک کچھ یاد آگیا۔ بولے "اچھا ہی ہوا تم ٹھیک وقت پر آگئے۔ دوپہر ہونے کو ہے۔ ابھی تک قاضی صاحب کا پتہ نہیں۔ سارے مہمان بے چین ہیں۔ شائد تمہیں قاضی بننا پڑے۔ یہاں تو ایسا کوئی آدمی نہیں جو یہ کام انجام دے سکے" [illegible]

دل میں تاشے اور دھپڑے بجنے لگے۔ زندگی میں دولہا کا رول تو ادا کر چکے تھے لیکن اب قاضی کا رول ادا کرنے کی بات پر بڑی وحشت سی ہو رہی تھی۔ یوں تو قاضی بننا کوئی معیوب بات نہیں۔ یہ تو بڑا معزز اور منفعت بخش پیشہ ہے۔ دیہات کے قاضی کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ یوں تو ہم نے کئی قاضی دیکھے ہیں۔ بلکہ خود اپنی شادی میں ایک قاضی صاحب کو بھی بھگت چکے ہیں جن کی عرصہ سے تلاش جاری ہے۔ لیکن اب ہم ایک ایسے قاضی صاحب کا ذکر کرنے جا رہے ہیں جو ہمارے گاؤں کی ہر شادی میں بعد عقد، تناول طعام کے موقع پر یہ کہا کرتے کہ گھٹے کا پرہیز ہے صرف شوربے سے کھاؤں گا۔ اور پھر شوربے کی آڑ میں ساری بوٹیاں ہضم کر جاتے۔ دیہات کے رہنے والے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ گاؤں میں شادی کے موقع پر بریانی اور "ڈم کا مرغ" کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ صرف بگھارا کھانا پکایا جاتا ہے اور گوشت کا سالن۔ اور پھر اس کے ساتھ کھٹی دال یا دالچہ۔ جہاں تک کھٹی دال کا تعلق ہے وہ بگھارے کھانے کے ساتھ وافر مقدار میں مہیا کی جاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر "گوشت کے ساتھ دال فری!" لیکن گوشت کے سالن پر کڑی نگرانی اور سخت "راشننگ" نافذ کردی جاتی ہے۔ غریب گھرانوں کی شادیوں میں تو مہمانوں کو صرف بوٹی سونگھ سونگھ کر تناول طعام سے فارغ ہونے کی نوبت آتی ہے۔ ایسے موقع پر بعض ہوشیار بزرگ بیماری کے بہانے دال کا پرہیز بتا کر "چھنا منڈ شوربا" حاصل کر لینے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ گاؤں کی دعوتوں میں بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ایک خرانٹ قسم کا آدمی ہر مہمان کی پلیٹ میں چمچے سے گوشت کا سالن ڈالتا چلا جاتا ہے۔ لڑکوں کی پلیٹوں میں تو صرف چمچہ جھٹک دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو گاؤں والے "سالن آتارنا" کہتے ہیں۔ اس معاملہ میں بڑی دھاندلیاں چلتی ہیں۔ بڑی PARTIALITY برتی جاتی ہے۔ مہمانوں کی صورتیں دیکھ دیکھ کر دوستی اور حیثیت کے مطابق سالن آتارا جاتا ہے۔ البتہ قاضی صاحب کے سامنے بڑی عقیدت کے ساتھ گوشت کے سالن کا کٹورا رکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ کٹورا سارے مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن کس مائی کے لال کی یہ مجال کہ اس کٹورے میں سے ایک بوٹی تو حاصل کر لے!؟ اگر قاضی صاحب کی بڑی نوازش ہوئی تو اللہ کے آزو بازو یا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک دو بزرگ مستفید ہوئے۔ ورنہ کٹورے میں کی ساری بوٹیاں قاضی صاحب کے پیٹ میں! ہاں تو ہم جن قاضی صاحب کا ذکر کر رہے تھے، ایک شادی کی دعوت میں ایک ہی دسترخوان پر وہ ہم سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا بچپن اور اُن کا بڑھاپا تھا۔ ان کے سامنے فراخ منہ سے بھرا کٹورا رکھا ہوا تھا۔ اور ادھر ہماری پلیٹ میں ایک بوٹی "آتاری" گئی تھی جو ہمیں چڑا رہی تھی۔ قاضی صاحب نے بسم اللہ کہہ کر کٹورے میں سے سالن لینے کا ارادہ جو کیا تو اس میں چمچہ نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ فوراً حکم دیا "نعمت خورہ لاؤ!" اب اس نعمت خورہ کی فارسی ترکیب قاضی صاحب جانیں یا آپ جانیں! ہمیں تو آتی فارسی نہیں آتی۔ ہم وہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اس فارسی ترکیب پر بطور پیری کاشن (PRECAUTION) منتظمین نے ایک دوسرے کے چہرہ کو دیکھا۔ ترسیل کا المیہ پیدا ہوگیا تھا! آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ ان اشاروں کی زبان کو سمجھتے سمجھتے تک ادھر کٹورا کبھی کا صاف ہو چکا تھا۔ ایک لائق و فائق منتظم نے بڑی دور کی کوڑی لائی۔ اپنے ماتحت کو سمجھایا "نعمت خورہ کا مطلب ہے بوٹیوں سے بھرا کٹورا" فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔ لیکن اس بار بھی قاضی صاحب کا نعمت خورہ کٹورے میں موجود نہیں تھا۔ قاضی صاحب نے پھر حکم صادر فرمایا کہ "نعمت خورہ لاؤ!" وہی صاحب پھر بھاگے۔ ہم تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب کی بار منتظم صاحب معہ نعمت خورہ اندر کہیں روپوش ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی بھی داد دینی پڑی کہ کٹورہ تو وہ ضرور لائے تھے۔ لیکن چال میں وہ پہلی سی پھرتی نہ تھی اور کٹورہ میں سالن کی مقدار یہ بتا رہی تھی کہ اب "نعمت خورہ" قریب الختم ہے۔ جب پانچویں بار بھی قاضی صاحب نے وہی نعمت خورہ کی رٹ لگائی تو ایک منتظم صاحب نے کہا کہ

"قاضی صاحب نعمت خورہ تو کبھی کا ختم ہو گیا اب صرف خالی دیگچی باقی رہ گئی ہے۔ حکم ہو تو اسے بھی پیش کر دوں"! تب قاضی صاحب نے خالص اُردو میں فرمایا کہ "اچھا حضت! نعمت خورہ کا مطلب ہے "چمچہ" کاش کے پہلے ہی اس کا مطلب پوچھ لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی!"

خیر! اب آپ نعمت خورہ والے قاضی صاحب کو چھوڑ دیئے۔ اب ہمارے قاضی بننے کا حال سن لیجئے۔ گیارہ سے بارہ بج گئے۔ لیکن قاضی صاحب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ادھر مہمانوں کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا ہمارے قاضی بننے کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے جا رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ قاضی صاحب آ گئے۔ ہماری جان میں جان آئی۔ چند آدمی قاضی صاحب کی پیشوائی کے لئے دوڑے۔ انھیں لا کر دلہا کے قریب بٹھا دیا گیا۔ قاضی صاحب نے اپنا بستہ کھولا اور سیاہہ نامہ نکالا۔ لیکن جب سیاہہ نامہ کی خانہ پُری کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کو اردو نہیں آتی۔ ہم نے کہا "اگر اُردو نہ آتی ہو تو تلگو میں خانہ پُری کریں"۔ جواب ملا اس کا مفہوم یہ تھا کہ تلگو میں بھی ایضاً ایضاً۔ ہم نے کہا "پھر تو انگریزی میں خانہ پُری کیجئے" انکشاف ہوا کہ انگریزی میں بھی ایضاً ایضاً۔ ان سارے حیرت انگیز انکشافات پر ہم قاضی صاحب کا منہ تکنے لگے۔ تب اُنھوں نے وضاحت فرمائی کہ اصل قاضی صاحب مستقر کی شادیوں میں مصروف ہیں۔ جب ان کی تشریف آوری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو پتہ چلا کہ صاحب موصوف نائب قاضی کی تعریف میں آتے ہیں اور صرف دستخط کرنا جانتے ہیں۔ اُنھوں نے ہم سے خواہش کی کہ سیاہہ نامہ کی خانہ پُری کریں۔ سیاہہ نامہ کی خانہ پُری کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ سو ہم نے اس کی خانہ پُری کر دی۔ اور قاضی صاحب نے اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس کے بعد ایجاب و قبول کا مرحلہ درپیش تھا۔ ہمیں اختلاج سا ہونے لگا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایجاب و قبول میں اسم عاقد، اسم عاقدہ، بینت، وکالت، مہر معجل یا موجل وغیرہ کچھ اس طرح تسلسل سے لانے پڑتے ہیں جیسے قصیدہ میں تشبیب کے بعد گریز، پھر اس کے بعد مدح، اور پھر اس کے بعد دعا اور دُعا کا آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ سارا مطلب و مفہوم ہی غارت ہو جائے۔ بہر حال کچھ ہو، ہم نے جوں توں ایجاب و قبول کر وا یا۔ ہم نے کیا کہا، دولہا نے کیا سُنا، کس نے کس کو قبول کیا، اللہ ہی جانے! جب اس مرحلہ سے بھی گزر گئے تو خطبۂ نکاح کی منزل آئی۔ قاضی صاحب نے بڑا آسان کام یہ کیا کہ زیور طبع سے آراستہ خطبے کی ایک کاپی ہمارے خدمت میں پیش کر دی۔ ہم نے سوچا، اب بہت ہو گیا۔ موٹی انگلی کے اشارے سے چھوٹی ضرورت کا بہانہ تراش کر فوراً بھاگ نکلنا چاہیئے۔ مگر بھاگتے کدھر سے؟ فرار کے سارے راستے مسدود تھے۔ اس سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں عربی نہیں آتی۔ ہمیں اتنی عربی تو آتی ہے کہ دیکھ کر پڑھ سکیں اور قبر میں منکر و نکیر کے سوالات کے جوابات دے پائیں۔ لیکن تنہائی میں عقیدت میں ڈوب کر آگے پیچھے ہلتے ہوئے پڑھ لینا ایک الگ بات ہے اور سارے حاضرین کے روبرو بانگ دہل پڑھنا بڑے دل گردہ کی بات ہے۔ آپ اُردو میں "موسِم" کو "موسَم" پڑھ کر یہ جواز پیدا کر سکتے ہیں کہ یہ غلط العوام صحیح ہے۔ اور "سمت" کو "سِمت" پڑھ کر قائل کرا سکتے ہیں کہ یہ غلط العام فصیح ہے، لہٰذا جائز ہے۔ اُردو میں شاعروں کی بیجا بات اسی "غلط العوام فصیح" اور "غلط العام فصیح" کی دعا قبول کا نتیجہ ہے۔ لیکن عربی میں آپ اس طرح کا جواز پیدا کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ خدا معاف کرے، مگر علماء آپ کو بخشیں گے نہیں۔ چنانچہ اسی اندیشہ کے پیش نظر ہم نے معذرت چاہتے ہوئے کہا "حاضرین! خدارا آپ ہمارا اس طرح امتحان نہ لیجئے۔ آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ ہم پکڑے جائیں گے اور علماء کے سامنے ہمارا کورٹ مارشل ہو گا۔ اگر آپ ہمارا امتحان ہی چاہتے ہیں تو اردو میں لیجئے۔ ابھی ادبی اجلاس کنڈکٹ کر کے دکھا دیں گے"۔ جناب صدر، جناب صدر" کی مسلسل رٹ لگائیں گے۔

خواتین و حضرات کہہ کر دکھا دیں گے۔ اگر مصرعہ اٹھانے کے لئے کہا جائے تو (پیٹ میں کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی) وہ بھی کرکے دکھا دیں۔ حتیٰ کہ شعر کی تقطیع تک کرکے یہ بتلادیں گے کہ کونسا شعر بحر سے خارج ہے اور کس شاعر کو شاعری کے رجسٹر سے خارج کر دینا چاہیئے"! لیکن کسی نے بھی ہمارے عذر کی سماعت نہ فرمائی۔ جب یہ تیر بھی نشانہ پہ نہ بیٹھا تو ہم نے ادباً گزارش کی کہ ہمیں کم از کم آدھے گھنٹے کا موقع عطا فرمائیں تاکہ ہجے درست کرکے رواں پڑھنے کی مشق کرلیں۔ ہماری یہ گزارش بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اب ایک آخری حربہ عذرِ شرعی کا باقی رہ گیا تھا۔ چاہا کہ برملا کہہ دیں کہ "طہارت سے نہیں ہوں!" لیکن داڑھی رکھ کر جھوٹ بولنے کے تصور سے کانپ گئے۔ ویسے، ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایجاب و قبول اور خطبہ نکاح کے موقع پر کوئی بھی شخص یہ جاننے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ قاضی صاحب کیا پڑھ رہے ہیں اور نوشہ کو کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی نظریں تو بادام، مصری اور کھجور کی پوٹلی تھامے ہوئے شخص پر رہتی ہیں۔ شادی شدہ جوڑوں کو "حجلۂ عروسی" یاد آتا ہے۔ چنانچہ وہ گھر پہنچنے کے بعد پھر سے حجلۂ عروسی کا اہتمام کرلیتے ہیں۔ ہم نے بوڑھوں کو تک محفلِ عقد سے واپس ہوتے ہوئے اپنی بیگمات کے لئے پھول خریدتے اور اپنے ہی مبارک ہاتھوں سے اُن کے بالوں میں سجاتے دیکھا۔ یہی نہیں بعض بزرگ تو اپنے حجلۂ عروسی کے مہمات اور فتوحات کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ اگر ان کی بیگمات سُن لیں تو فوراً اپنے شوہروں سے خلع لے لیں!

خیر، جب اہتمامِ محبّت کے سارے مراحل طئے پا چکے تو ہم کھڑے ہوگئے۔ کچھ نوجوانوں نے اپنے سروں پہ دستیاں اوڑھ لیں۔ اور کچھ ہپّی ہیرکٹ اسٹائل نوجوانوں نے اپنی گردنیں جھکالیں۔ اِدھر ہم پہ ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری تھی۔ دل میں آیا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ لیکن یہ رونے کا مقام نہیں تھا۔ ہم نے مطبوعہ خطبہ پر ایک نظر ڈالی۔ ایک عجیب طرح کا خوف طاری تھا کہ اگر تلفظ کی غلطی سے ساری دعاؤں کا مطلب غلط ہو جائے تو حشر میں شرمسار ہونا پڑے گا۔ اسی شرمساری کی کیفیت میں ہمارے منہ سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلا "ربّنا!"

چند آوازیں سنائی دیں "آمین!"

ہم نے فوراً گھبرا کر کہا "ابھی آمین کا وقت نہیں آیا!"

جواب میں سنائی دیا "آمین!"

ہم نے جھٹ کہا "ارے خدا کے بندو سمجھتے کیوں نہیں!؟"

بہت ساری آوازیں بلند ہوئیں "آمین! ثمہ آمین!"

ہم نے سوچا کہ اب حاضرینِ محفل کو سمجھانا گویا آسمان کے تارے توڑ لانے کے برابر ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی ساری قوت قوتِ گویائی پہ صرف کردی اور اللہ کا نام لے کر جو پڑھنا شروع کیا تو پتہ ہی نہ چلا کہ خطبہ کب ختم ہوا۔ دیکھا تو دولھا میاں قاضی صاحب کے پیٹ میں سر دینے کے لئے بڑے بے قرار نظر آ رہے تھے۔ لیکن اُدھر قاضی صاحب اپنی فیس، سوا کیلو چاول اور پانچ مٹھی بادام، مصری اور کھجور کو اپنے بستے میں باندھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا اور دھکے کھاتا باہر نکل آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے ان آنسوؤں کو بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے دامن میں جذب کیا اور بڑی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ان آنسوؤں کو کیا نام دوں!؟

■■

ڈاکٹر حبیب ضیاء

آٹو والے

زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ تیز رفتار زندگی کے اس دور میں انسان میں وقت کی قدر کرنے کا کچھ سلیقہ آگیا ہے۔ اسی وقت کی قدر کے لئے وہ عموماً بے بسی سے رکنے جانے والی بسوں کو دیکھنے کی بجائے آٹو میں سفر کرنے کو ترجیح دینے لگا ہے۔ سڑکوں پر جو آٹو چلتے دکھائی دیتے ہیں ان میں زیادہ تر انجن کی خرابی کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے من مانی تکلیف دہ آوازیں نکالتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ ان کی ناقابل برداشت آوازوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ نہ آوازوں پر پابندی ہے نہ میٹر پر۔ آٹو اور اس کے میٹر کی چال میں فرق یہ ہے کہ آٹو چلتا ہے، میٹر بھاگتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیز رفتار میٹر والے آٹو سے سابقہ پڑنے پہ میٹر میں بڑھتے ہوئے روپیوں پر نظریں جم جاتی ہیں اور خون کے دباؤ میں کمی یا زیادتی کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ خوش قسمتی سے ہمیں نئے انجن والے آٹو میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ ہماری مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم آٹو میں بیٹھے ہیں نہ آٹو آواز کر رہا تھا نہ آٹو والا۔ ہم مسافرین سے رہا نہ گیا ہم نے آٹو کے بارے میں آپس میں گفتگو شروع کر دی۔

"آٹو کتنا اچھا ہے"۔

"ہاں! آرام دہ بھی ہے!"

"ذرا سی بھی آواز نہیں ہو رہی ہے"۔

"جھٹکے بھی نہیں دے رہا ہے، ہمیں پہلی بار اتنے اچھے آٹو میں بیٹھنے کا موقع ملا"۔

یہ گفتگو آٹو والا سن رہا تھا۔ اس کا پیمانۂ خاموشی لبریز ہو کر چھلکنے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ آٹو کے ہینڈل سے مکمل طور پر ہٹا لیا۔ جیب سے سرخ رنگ کی کوستی نکالی اور آٹو کے سامنے لگے شیشے کو صاف کرنے لگا۔

اب ہماری حیرت بڑھ رہی تھی۔ وہ خوشی میں مست تھا۔ آٹو کا شیشہ صاف کرنے کے بعد اپنی ذات پر توجہ دینے لگا۔ یقیناً اپنے ہم نے صرف آٹو کی تعریف کا تھی آٹو والے کی نہیں لیکن اس نے بازو لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ہاتھ سے بال برابر کئے۔ اطمینان نہ ہوا! کنگا نکالا اور بال جمانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے دونوں ہاتھ آٹو کے ہینڈل سے الگ ہو جاتے۔ یعنی آٹو میں بیٹھے

والوں کو وہ مکمل طور پر خدا کی حفاظت میں چھوڑ دیتا ـــــ آٹو صاف کرنے اور بال سنوارنے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

آپ نے جو تعریف کی اس کا شکریہ۔ میرا آٹو آپ سے اچھا اور تیز چلتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہمیں "چل تو جلال تو"، پڑھتے رہنے کی ہدایت کی۔

اکثر آٹو والے انتہائی لاپرواہی اور تیز رفتاری سے آٹو چلاتے ہیں۔ ایسے آٹو میں بیٹھتے ہی زندگی اور موت کا فلسفہ یاد آجاتا ہے۔ یعنی زندگی ناپائیدار ہے اور آٹو میں موت یقینی ہے۔ اس کے باوجود آٹو میں مرنے کی بجائے گھر میں مرنے کو ترجیح دیتے ہوئے ہم آٹو والے سے رفتار کم کرنے کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی تیز رفتار آٹو کا ذکر ہے جس سے ہمیں سابقہ پڑا تھا۔ اس کے بریک بھی غالباً کنٹرول میں نہیں تھے۔ برق رفتاری سے چلاتے ہوئے اُس نے ایک ٹیکسی کو ٹکر دے دی۔ زوردار بریک جو لگا تو ہمارے دونوں گھٹنے سامنے لگے لوہے کے ڈنڈے سے جا لگے۔ شدید تکلیف کی وجہ سے ہم نے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ بچہ ساتھ تھا پریشانی سے اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہم نے آٹو والے سے کہا۔

"میرے دونوں گھٹنے پھوٹ گئے ہیں آٹو کی رفتار ذرا دھیمی کرو۔" اُس نے آٹو کی رفتار اور تیز کر دی جھنجلا کر کہنے لگا آپ کے گھٹنے پھوٹے ہیں مجھے تو سر پہ مار لگی ہے، میرا سر چکرا رہا ہے مجھے اس ٹیکسی والے کو پکڑنا ہے جسے میں نے ٹکر دی تھی"ـــ اس کے بعد آٹو والے نے آٹو کی رفتار اور تیز کر دی اور اس وقت تک ٹیکسی کا پیچھا کیا جب تک کہ دونوں کے راستے نہ بدل گئے۔

ہماری کچھ عادت سی ہو گئی ہے کہ آٹو میں بیٹھتے ہی آیتہ الکرسی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اس دن بھی یہی ورد تھا ٹیکسی سے ٹکرا کر جب آٹو رک گیا تھا اس وقت رفتار کم کرنے کی درخواست پر آٹو والے نے غصے سے کہا تھا۔ "اتر کر آٹو کے پیچھے لکھا ہوا شعر پڑھیئے"۔

آٹو پہ یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

موت کو میں گلے لگا لوں گا ؛ زندگی تیرا اعتبار نہیں۔

اس شعر کے پڑھنے کے بعد لاشعوری طور پر ولا یئودہ حفظہما وھو العلی العظیم کی بجائے بہ آواز بلند ہم نے یہ مصرعہ دہرانا شروع کر دیا ـــ موت کو میں گلے لگا لوں گی۔ . . . موت کو میں گلے لگا لوں گی۔ بازو بیٹھے ہوئے ہمارے بچے نے پوچھا "اماں! آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟ ہم نے کہا آیتہ الکرسی۔" بچے کو یقین ہو گیا کہ یہ خلل دماغ کی پہلی خطرناک علامت ہے ہمارے منع کرنے پر بھی بعد میں اُس نے رازدارانہ طور پر ہماری دماغی حالت کے بارے میں دماغ کے ڈاکٹر سے پوچھ ہی لیا۔

آٹو کے شعر پہ یاد آیا۔ ایک آٹو کے پیچھے یہ شعر درج تھا ؎

موت کیا شئے ہے تم کو کیا سمجھائیں ہم ؛ راستے میں مسافر کو نیند آگئی

تشریح:ـ آٹو والا مسافر سے کہتا ہے کہ لفظ "موت" کی تشریح میں کن الفاظ میں کروں۔ "راستے" کا استعمال یہاں ذومعنی ہے جس طرح دنیا سے آخرت تک کے سفر میں کسی بھی وقت آدمی کا آنکھیں موند لینا یقینی ہے۔ اسی طرح میرے آٹو میں بیٹھنے کے بعد کسی موڑ پر، کسی چوراہے پہ مسافر کو نیند آ سکتی ہے۔ نیند سے مُراد یہاں ابدی نیند ہے۔

ایک آٹو پر لکھا تھا ؎

آج عمل ہے حساب نہیں ؛ کل حساب ہے عمل نہیں

تشریح: آٹو والا پولیس والے سے کہہ رہا ہے کہ مسافر کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے اسے دھوکہ دینے اور سامان لے کر چلتے بننے / آج ہی کا دن ہے۔ آج کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آج عمل کا دن ہے۔ البتہ کل حساب ہوگا یعنی آپ مجھے تلاش کرتے نکلیں گے۔ اسی لئے جو کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیئے۔ اس قسم کے بہت دلانے والے اشعار آٹو پر خوش خط لکھے ہوتے ہیں۔ آٹو والے آٹو کی فنی خرا کو کبھی دور نہ کریں گے۔ نہ آٹو صاف رکھیں گے نہ اپنی زبان۔ اپنے یونیفارم کی صفائی اور اپنے اخلاق پر کبھی توجہ نہ دیں گے۔ لیکن جہاں تک موزوں اشعار کا تعلق ہے ان کے انتخاب میں وہ اپنی پوری توانیاں صرف کر دیتے ہیں۔

آٹو والوں سے جن لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے ان ہی کے دل جانتے ہیں کہ یہ مسافرین سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارا اسکوٹر کی اگلی سیٹ بیمار تھی ہمیں بہت زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ اس ہفتہ آٹو والے اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے "ہفتہ خوش اخلاقی" منا رہے تھے۔ ہم نے ایک آٹو میں بیٹھ کر خوشی خوشی کہا "رانی گنج" آٹو والا مسکرایا۔ انتہائی خوش اخلاقی سے بولا فوراً اتر جائیے میڈم ابھی اس طرف جانا نہیں ہے"۔ اتفاق سے اسی دن ایک آٹو والے نے قسم کھائی تھی کہ وہ بات نہیں کرے گا اور منہ پر پٹی باندھ کر آٹو چلائے گا۔ ہم اس آٹو میں بیٹھ گئے۔ منزل مقصود پہونچ کر ہم نے میٹر کے مطابق کرایہ اس کی طرف بڑھایا۔ آٹو والے نے سامنے چاقو کے ساتھ لگی پرچی کی طرف اشارہ کیا جس پر لکھا تھا۔

"میٹر سے تین روپے زاید دے کر خاموشی سے چلتے بنو۔ ورنہ بعد میں خیر نہیں"۔

ننانوے فیصد آٹو والے بڑے ہمدرد ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کے "آڑے وقت" کام آنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ کسی لڑکی کے اغواء کا معاملہ ہو یا کسی کو دور لے جا کر قتل کرنے کا منصوبہ ان کا بھرپور تعاون رہتا ہے۔ اکثر حاضر دماغ مسافر آٹو کے پچھلے حصے میں بھاری کپڑوں کا سوٹ کیس، زیورات کا بریف کیس اور اسی قسم کا قیمتی سامان رکھ کر اتر جاتے ہیں۔ بعد میں اخبار میں "سامان کی گمشدگی" کے زیر عنوان آٹو والے کو اطلاع دیتے ہیں :۔

" ایک عدد سوٹ کیس جس میں بھاری کپڑے تھے اور زیور کا بریف کیس، میں آٹو میں رکھ کر اترتے وقت لینا بھول گیا۔ آٹو والے صاحب سے درخواست ہے کہ نیچے دیئے ہوئے پتے پر سامان پہنچا دیں۔ سواری خرچ کے علاوہ پچاس روپیہ انعام دیا جائے گا"۔

کون سا بے وقوف آٹو والا ہوگا جو اپنا قیمتی وقت برباد کر کے ہزاروں روپے کا سامان واپس دے کر پچاس روپے خیرات لے جائے گا۔ آٹو کے پچھلے حصے میں وہ سامان اسی لئے سلیقہ سے جا کر رکھتا ہے کہ مسافر اُسے وہیں جا ہوا رکھ کر غفلت میں اتر جائے۔

ایک فیصد آٹو والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہزاروں کا سامان آٹو میں رکھا دیکھ کر چین کی نیند سو نہیں سکتے۔ ساری رات بے چینی سے ٹہل کر وہ صاحب سامان تک سامان سمیت پہنچ جاتے ہیں۔ اور انعام میں دیا ہوا پچاس یا سو روپے کا نوٹ بھی واپس کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی آٹو والے ایسے ہو جائیں تو سمجھئے کہ قیامت قریب ہے۔

رپورٹ

پندرھواں کُل ہند مزاحیہ مشاعرہ

زندہ دلان حیدرآباد کی پندرھویں سالانہ تقاریب کے تیسرے دن ۱۶ اپریل کی شب نمائش میدان پر کُل ہند مزاحیہ مشاعرہ زیر صدارت نواب شاہ عالم خاں صاحب منعقد ہوا۔ حکومت آندھرا پردیش کے وزیر خزانہ جناب ین بھاسکر راؤ نے مشاعرہ کا ٹھیک ساڑھے نو بجے افتتاح کیا۔ سامعین کی ریکارڈ تعداد اس وقت تک مشاعرہ گاہ پہنچ چکی تھی۔ نمائش میدان بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ لوگ اپنے غم اور زندگی کے مسائل سے بے نیاز قہقہوں اور مسکراہٹوں کی اس منفرد محفل شعر میں شرکت کے لئے جوق در جوق چلے آئے۔ صدر زندہ دلان حیدرآباد جناب نریندر لوتھر نے ابتدا میں سب کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ "زندہ دلان حیدرآباد کا قیام ۲۲ سال پہلے ہوا تھا۔ کم عمری کے دور میں ریاستی سطح پر مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔ پھر کل ہند پیمانہ پر تقریبات منعقد ہونے لگیں۔ اب ارادہ ہے کہ آئندہ سال ساری اردو دُنیا کے طنز و مزاح نگاروں کو مدعو کیا جائے حیدرآباد کو طنز و مزاح کا ہیڈ کوارٹر مانا جاتا ہے یہاں کے طنز و مزاح نگاروں نے ہندوستان اور بیرون ملک میں بڑا نام کمایا ہے۔ اردو میں کبھی ادیب اور شاعر "نام" کے سوا کچھ اور نہیں کماتے۔ لوتھر صاحب نے صدر مشاعرہ نواب شاہ عالم خاں اور مہمان خصوصی جناب ین بھاسکر راؤ وزیر خزانہ حکومت آندھرا پردیش اور سامعین کرام کا خیر مقدم کیا۔"

جناب ین بھاسکر راؤ وزیر فینانس حکومت آندھرا پردیش کا تالیوں کی گونج میں سامعین نے خیر مقدم کیا اُنھوں نے کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی پر مزاح تلگو میں لکھی اردو تقریر میں کہا۔

"میں زندہ دلان کا بہت شکر گزار ہوں کہ یہاں بلاکر عزت افزائی کی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ طنز و مزاح کا یہ ادارہ پچھلے بیس اکیس سال سے ہنسنے اور ہنسانے کا کام انجام دے رہا ہے۔ آج کے زمانہ میں دوسروں کو ہنسانا تو ایک طرف انسان خود بھی مسکرا نہیں پاتا۔ حالات کڑے ہیں، پیسے کی کمی ہے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے، گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ہنسنا کیسے ممکن ہے۔ پچھلے دو مہینے سے مجھ پر بھی لوگوں کی ہنسی کچھ کم کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ہمیں مجبوراً سرکاری

خرچ میں کمی کرنی پڑی تھی۔ لیکن اب نیا مالی سال شروع ہو چکا ہے۔ اب آپ مسکرانا شروع کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر چاہیں تو ابھی سے ہنسنا شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن فضول خرچی کے بغیر۔ میں فینانس منسٹر کی حیثیت سے یقین دلاتا ہوں کہ ہماری حکومت ہنسنے پر کبھی بھی ٹیکس نہیں لگائے گی۔ اردو میں طنز و مزاح کی روایت بہت پرانی اور مضبوط ہے۔ ہم اس شاندار ورثہ کو محفوظ رکھنے اور اس روایت کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ زندہ دلان کا کنبہ پھلے پھولے۔ اس میں فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں اور آپ لوگ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے آنسو پونچھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیں۔ میں اس مشاعرہ کا بخوشی افتتاح کرتا ہوں۔"

نواب شاہ عالم خاں صاحب نے اپنی مختصر صدارتی تقریر میں کہا کہ "یہ دور ایک پریشانی اور انتشار کا دور ہے۔ حقیقی مسرت اور سکون کسی انسانی چہرے کو نصیب نہیں۔ نسل انسانی تفکرات کے صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی ہنسی کا ماحول پیدا کر سکتا ہے تو بڑی بات ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد پچھلے کئی سال سے ایسی محفلیں سجاتے ہیں جن سے نئی روح پھونکی جاتی ہے۔ ہم ممنون ہیں زندہ دلان کے کہ ان کی وجہ سے سال میں ایک بار خوب ہنس لیتے ہیں۔ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو پریشانیوں کے درمیان ہنسی کے مواقع نکال لینا چاہیئے۔"

ان مختصر دلپذیر تقریروں کے بعد معتمد عمومی طالب خوندمیری نے کنوینر مصطفیٰ علی بیگ کو مائک اور مشاعرہ سنبھالنے کی دعوت دی۔ کنوینر نے مشاعرہ کے "اوپننگ بیٹسمین" معین امر بمبو کو دعوت کلام دی۔ معین امر بمبو نے تین چٹکلے اور پھر ایک نظم سنائی ان کا ایک چٹکلا ہے:

نکاح کے وقت ہی بیوی سنبھل جاتی تو اچھا تھا
بجائے راضی ہونے کے بدل جاتی تو اچھا تھا
اٹھا کر لایا جس دن گود میں میں اس قیامت کو
اسی دن یارو میری ماں ٹل جاتی تو اچھا تھا

بمبو کے بعد احمد سلطان نے کلام سنایا۔

ساری دولت دیش کی اب جاہلوں کے پاس ہے
اک سفارش ہی نہیں اب تو رشوت راس ہے
کیا ترقی ہے کہ چپراسی بھی بی اے پاس ہے
نان میٹرک جو منسٹر ہے ہمارا باس ہے

اس چٹکلے پر فینانس منسٹر جناب این بھاسکر راؤ نے فوری برجستہ کہا کہ وہ بی اے پاس ہیں!

احمد سلطان کے بعد ان پڑھ بھونگیری نے کلام سنایا۔ ان کے دو شعر سنیئے:-

بن بیاہی ہیں لڑکیاں لاکھوں
گھوڑے جوڑے کی مہربانی ہے
کار میں پھر رہے ہیں مولانا
یہ تو چندے کی مہربانی ہے

اس شعر پر بہت داد ملی۔

نئی حکومت اور نئی کارگزاری کے عنوان سے رشید سمیع جلیل نے آندھرا پردیش کی سیاسی تبدیلیوں پر ایک نظم سنائی۔ جو بہت پسند کی گئی۔

اس نظم کے آخری بند میں سمیع جلیل نے کہا:

ہمیں اب دیکھنا یہ ہے یہاں اردو کا کیا ہوگا
غزل کے بانکپن کا حسن کا جادو کا کیا ہوگا

بہت سامانِ زیبائش قد و گیسو کا کیا ہوگا
کھلے ہیں پھول گلشن میں مگر خوشبو کا کیا ہوگا
زبان یا یہ من تلگو دمن تلگو نمی دانم
نمی دانم نمی دانم نمی دانم نمی دانم

سمیع جلیل کے بعد بھلاداں نے کلام سنایا۔ بھلاداں کے ان دو اشعار پر قہقہے بکھر گئے :-

رات جب آپ مستی کا طوفان تھے
داڑھ کے درد سے ہم پریشان تھے
کئی بیوائیں پھر سے سہاگن بنیں
ہم پڑاتے جہازوں کے کپتان تھے

سراج نرملی نے ایک غزل اور چوے سنائے۔

ایج پچپن ہو تو سرکاری ملازم بوڑھا
ساٹھ کے سن میں بھی لیڈر تو جواں ہوتا ہے

مراد آباد سے پہلی بار حیدرآباد آئے ہوئے دلکش آفریدی نے پہلے چند قطعات اور پھر چند نظمیں پیش کیں۔
محمود نشتر کے بعد بزرگ شاعر سرپٹ حیدرآبادی اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے :

آتا ہے بے نقاب کوئی روز بام پہ
میرے بھی گھر کے سامنے ایک کوہ طور ہے

بوگس حیدرآبادی نے آدھی غزل پیش کی۔

میت کو کاندھا دیوے ہے لنگڑا رقیب بھی
"ہلتے ہیں خود بخود میرے اندر کفن کے پاؤں"

صبغت اللہ بھابٹ نے "خادم اردو زباں" کے عنوان سے ایک طنزیہ نظم سنائی :

کانفرنس اردو کی کہنے کو تو کرواتا ہے وہ
کھانا مندو بین کو ہندی کا کھلواتا ہے وہ

حفیظ خاں مذاق نے دکنی زبان میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ آندھرا پردیش کی بدلتی سیاست کے پس منظر میں نظم سنا کر بے حد داد حاصل کی :-

پچپن سال کی مار میں آکو ہوگیئے ہم بے کار
بیوی بھی اک نوٹس دیدی نکو اب یہ بار
نوکری گئی اب بیوی جارہی تسو ڈ دین ٹی آر
ہم بو چڑھا دو اپنی کار تم بھی ذرا سنو

مالیگاؤں کے ممتاز مزاحیہ شاعر مختار یوسفی نے قطعات سنا کر مشاعرہ میں جان ڈال دی۔ قطعات کے بعد سامعین نے فرمائش کر کے ان سے نظمیں بھی سنیں :

(۱)

میری بیوی غائب ہے پچھلے جمعہ سے
خبر اس کے ملنے کی جو کوئی دے گا۔
قسم کھا کے کہتا ہوں میں اپنے رب کی
اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

(۲)

کسی صاحب کو چسکا لگ گیا تھا شعر گوئی کا
انھوں نے سوچ کر اپنا تخلص رکھ لیا ابا
ہوئے مشہور پبلک میں مگر مشکل یہ آپہنچی
انھیں کہتی ہیں سب کے ساتھ ان کی اہلیہ ابا

گلیم میدکی نے چند قطعات کے علاوہ ایک نظم سنائی۔

مذاقاً دوست سے میں اپنے پوچھا
یہ تالو کون بکری چر گئی ہے
وہ بولا دیکھ کر تالو کو اپنی
کہو کیا بھابی اپنی مرگئی ہے

زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرہ میں پہلی بار بمبئی کے ممتاز

مزاحیہ شاعر دیوگوپال بھنڈا کو مدعو کیا گیا۔ ان کی نثری نظمیں سامعین نے تالیوں کی گونج میں سنیں:

ہم نے اپنی شادی کے لئے اخبار میں
اشتہار دیا۔
کنوارے پن سے گھبرا رہا ہوں
پتنی چاہیئے۔
دوسرے دن ہی جواب آیا۔
شادی کرکے پچھتا رہا ہوں
پتنی لے جائیے۔

دکن کے "خالص" شاعر اشرف خوندمیری نے اپنی نظم "ڈسکو براکھا" سناکر سامعین سے خوب خوب داد حاصل کی۔ نظم کا ایک بند ہے:

ایٹری کی تیٹری کھیل رہا کو تارئیں ڈسکو گانا
دل کی سلامی لے کو دے رہیں نظروں کا نذرانہ
آؤ یارو تم بھی سُن لیو پیار کا یہ افسانہ
کونی کونی ایج میں شادی کرتے جارئیں نانا
دولن ستر سال کی بھی دولا ستر سال کا نانا
تن دانا تن دانا دانا ...

پاگل عادل آبادی نے چند قطعات اور سامعین کے اصرار پہ دو غزلیں سنائیں۔ اور حاصلِ مشاعرہ رہے:

اُلٹی گنگا پھر سے بہائیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
اندر دل پہ مرغی کو بٹھا بیٹھا کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
نانا پکچر دیکھ کو آرئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
نانی کو اسٹوری سنا رئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
قبرستان آباد ہوا تھا جب وہ بیڑیاں دیتے تھے
اب تو انجکشن بھی لگا رئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
پنچایت کے ممبرین کو پنچایت سے ترول کرئیں
یم پی بن کو دلی جارئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی

ایک اور غزل سُنائی:

بڑا ڈاکٹر جب سے وارڈ میں آیا۔
مریضاں کفن سلارئیں ہلو ہلو۔
کیا سمجھا اور خازن نے چندہ۔
جمع جلدی جلدی غبن ہلو ہلو۔

کنوینر مصطفیٰ علی بیگ خود کو سب سے "اسمارٹ شاعر" کہتے ہوئے مائیک پر آئے:

لائف اینڈ ڈیتھ بھی ہوگیا گیم
ریلی ہٹ ازا سے میٹر آف شیم
رام کہوں یا کہوں رحیم
قاتل پوچھ رہا ہے نیم

بیگ نے پھر ایک غزل سنائی اور داد حاصل کی۔

ہیں منسٹر اسّی اسّی سال کے
ہم کو ففٹی فائیو میں پنشن آل رائٹ

خواہ مخواہ (بمبئی) کے کلام پر مشاعرہ گاہ داد و تحسین کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ چند قطعات کے بعد انہوں نے غزل سنائی:

اب ضعیفی میں میرے آیا ہے پھر لوٹ شباب
دور سے دیکھو ہنچے ہاتھ لگارئیں کا ٹیکو
میں سُلگ ہی نہیں سکتا تو جلوں گا کہاں سے
بھیگی یا ردو ہوں انکار بتارئیں کا ٹیکو
ملک میں ابتری پھیلی ہے مگر دُنیا کو
صلح اور امن کی تقریر سنارئیں کا ٹیکو
پھیر بدلیں گے کئی رہیں گی دنیا ہر دن
یہ ریہرسل ہے ابھی پھلالی جارئیں کا ٹیکو

ہم نئی پیچین سے تمہارا کیا بچپن سہے ؟

ہم پہ ہے عمر کی پابندی ، لگائیں کا ٹیکو

خواہ مخواہ نے سامعین کی فرمائش پہ ایک اور غزل "نیٹی بولے تو سنتے نیٹی" سنائی :

خواہ مخواہ کے بعد ناظر خیامی مرحوم کے بھائی ساغر خیامی مائک پہ آئے ۔ ساغر کا شعر سنانے کا انداز بالکل ناظر خیامی جیسا ہے ۔

ڈاکو کے سر کا مول تو ستر ہزار ہے

کیا ساکھ کوئی بیچے شرافت کی ناؤ میں

اس دور نامراد میں سر بھی شریف کا

بکتا نہیں ہے دوستو کدو کے بھاؤ میں

چند قطعات کے بعد ساغر خیامی نے دو نظمیں سنائیں :

ہیٹر سے شعلہ حسن کا بھڑکایا جائے گا

عاشق کو بھی مشین پہ تڑپایا جائے گا

طالب خوندمیری نے تلگو کے شاعر غلام یسین کی موت پر جنھیں حیدرآباد کے فساد میں قتل کر دیا گیا تھا ایک نظم سنائی ۔

بھیا کی اک کاپی لے کر کچھ اچھے سے نعرے اور کچھ پیار سے پیارے گیت لکھے تھے آزادی کے حب وطن کے یکجہتی کے ۔

آج اسی کاپی کا مجھ کو

ایک ورق گھر کے بکھرے سامان میں ملا ہے

جس پر تم نے یہ لکھا ہے ۔

ہندو مسلم سکھ عیسائی ۔

آپس میں ہیں . . . .

اس سے آگے جانے تم نے کیا لکھا تھا

مدھم مدھم پھیکے پھیکے لفظوں کو دیکھو

میں کب سے گھور رہی ہوں

لیکن ابا ! تو مجھ کو یوں لگتا ہے

الہ

ان کا پڑھنا بھی ناممکن سا ہے

کیوں کہ ان پر خون تمہارا پھیل گیا ہے

طالب خوندمیری نے ایک نظم "میوزیم" بھی سنائی :

دکن کے بلند قامت شاعر حمایت اللہ کے نام کے اعلان کا سامعین نے تالیوں کے ساتھ خیر مقدم کیا ۔ حمایت اللہ نے شوہر کی دوسری شادی کے خلاف عورت کے جذبات کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا :

مرے دل کو جلایا جی ماٹی ملا

سر پو سوکن کو لایا جی ماٹی ملا

مرے میں کیا کمی تھی جو لایا اسے

لایا ڈھمپٹی کو بسایا اسے

ہو کو جاؤ شیخ سدو کا سایہ اسے

دل کو آرے جلایا جی ماٹی ملا

جدید دکنی کے امام، بزرگ شاعر علی صاحب میاں نے پہلے چند چوسے اور پھر فرمائش پہ ایک نظم "تپنگ" سنائی۔ ان کا ایک حصہ ملاحظہ کیجیئے :

ٹھنکیاں کتوں میں زمانے کی تالو

جسے دیکھو بجتا ہوا ہو رہا لو

سدھرتی کے سالے تو سوال سے ہوتیں

بگڑتی کا بھونی نہ چھپا نہ خالو

ناگپور کے ممتاز شاعر ناظم انصاری کے بعد نامور شاعر ہلال سیوہاروی نے کلام سنایا :

دنگوں کا نام دے کے سیاست کے کھیل کر

برسوں میں چار روز میاں شور کیا رہا

دلی کے ایشیاڈ کی سب کو خبر ملی

میرٹھ کی کچھ خبر نہیں اسکو رکیا رہا

پھر ملی کانفرنس کے بعد سامعین کی فرمائش پر ہلال سیوہاروی نے اپنی نظم "خون" کی مانگ بھی سنائی رات کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ کا اختتام عمل میں آیا ۔

* مختار یونس
(مالیگاؤں)

لیڈر نیتا

کہتے ہیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم اپنے قوم و وطن سمیت آزاد ہو گئے تھے۔ مگر

ع سلامت رہیں رہنمایانِ قوم

کہ مہنگائی، فسادات اور کرپشن کے متعلق بولنے کی آزادی رکھتے ہوئے بھی آزادی سے بولنے کی ہمت نہیں۔ گویا ع ٹکٹ رکھتے ہوئے بھی بے ٹکٹ معلوم ہوتے ہیں۔

ہمیں خوف ہے کہ جس کے متعلق ہم کہنے والے ہیں اگر وہ کل برسرِ اقتدار آگیا تو ہمارا کیا ہوگا۔ آپ کہیں گے برخوردار جیل ہی تو جاؤ گے اور جب جیل سے چھوٹ جاؤ گے تو سیاست میں چمک جاؤ گے۔ اگر جواب میں بندہ عرض کرے، اگر جیل خانے میں ہم مجروح گھائل پوری ہو گئے تو ......

خدا کے فضل و کرم سے ہماری تقدیر میں ایک ٹائپ کے نہیں بلکہ دو قسم کے رہنما لکھ دیئے گئے ہیں۔ برایک کرسی والے اور بغیر دو کرسی کے لئے تڑپنے والے۔ کرسی والے نیتا کا دیدار پنج سالہ ہوتا ہے۔ اس کے یشن کرنا ہو تو پہلے قانونی لاٹھیوں کا ذائقہ چکھو ان کے سکریٹری سے وقت لو۔ الیکشن کے دوران یہ آپ کے ہوں کی طرف کوچ کریں گے۔ پدیاترا کریں گے۔ آپ کے دکھ درد کا انٹرویو بہ نفس نفیس لیں گے۔ الیکشن کی جیت کا ہار ابھی مرجھا بھی نہیں پاتا کہ یہ لیڈر پیادہ سے سوار ہو جاتے ہیں یہ عموماً سفر پر نظر تے ہیں۔ کبھی سرکاری جیپ میں، کبھی فرسٹ کلاس ریلوے کمپارٹمنٹ میں اور اکثر و بیشتر ہوا میں اڑتے ہیں انڈیا کے اڑن کھٹولے پر۔ ان کی زندگی ٹیکس فری ہوتی ہے۔ ٹیلی فون مفت، ٹیلی ویژن مفت، پانی اور بجلی مفت،

پاتے ہیں (سیاسی مفتی کہیں کے!) وزارت ملتے ہی قومی رہنما کی تمام سہولیات سینما اسکوپ ہوجاتی ہیں۔ بیرونی ملکوں کے دوروں کا دورہ پڑتا ہے۔ اخبارات ان کے فوٹو اور بیانات کے لئے شائع ہوتے ہیں۔ سرکاری نیوز ریل میں انھیں ہیرو کا رول ملتا ہے۔ تجارت پیشہ طبقہ انھیں اُدگھاٹن منتری بنا دیتا ہے۔ جس علاقے کا دورہ کرتے ہیں پولیس کی خوب ورزشش ہوتی ہے۔ ان کے مواگت پر ہزاروں خرچ ہوتا ہے۔ ہر ادارہ ان کے استقبال پر ہزار ہا روپے خرچ کرکے اپنے پھٹے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ کتنے ہی تعلیمی ادارے اور مالیاتی کمپنیاں ان کے اُدگھاٹنی احسان تلے دب گئے ہیں۔ گویا منسٹر کی آمد یعنی لکشمی دیوی کی رخصتی!

ہمیں ملازمت حاصل کرنے کے لئے انٹرویو دینا پڑتا ہے۔ امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ ٹریننگ کورس پورا کرنا پڑتا ہے۔ مگر سیاست میں ایڈمیشن کے لئے نہ کوئی فیس ہے نہ امتحان اور نہ ہی ٹریننگ کورس۔ بڑی انوکھی بات ہے کہ غلط کی نشانی (×) پاکر ہم اور تم امتحان میں فیل ہوجاتے ہیں مگر لیڈر الیکشن جیت لیتا ہے۔ جتنی زیادہ ضرب کی علامتیں ملتی ہیں اتنا ہی بڑا عہدہ ملتا ہے۔

کرسی نشین منسٹر کے محکمے آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ آج تعلیم کا محکمہ ہے تو کل صحت کا اور پرسوں زراعت کے میدان میں ہل چلوا رہے ہیں۔ پرسوں کے بعد کیا ہوگا؟ یہ وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کے موڈ پر منحصر ہے۔ نتیجہ میں ہر محکمہ کی کارکردگی متاثر ہوگی، پالیسیاں اور اسکیمیں بدلتی رہیں گی۔ سرخ فیتہ شاہی کے دفاتر میں کام کم ہوگا اور ادھورے فائلوں کے چار مینار ہر ٹیبل پر کھڑے ہوتے رہیں گے۔

اگر مرکز اور صوبہ میں ایک ہی سیاسی پارٹی حکمراں ہو تو وزیر اعلیٰ مرکز میں جنم لیتے ہیں اور صوبائی ایوان کے ممبران منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ صوبائی مہامنتری ہر معاملے میں مرکز کی طرف "قبلہ رخ" کرتا ہے۔ مرکز میں چاند نظر آتا ہے تو صوبے میں عید ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں حکمراں پارٹی کے نمائندے کھسیاکر مہامنتری کو بقرعید کا بکرا بنانے کی آئینی کوشش کرتے ہیں۔ اس عید اور بقرعید میں عوام کا محرّم ہوجاتا ہے۔

اگر مرکز اور صوبے میں مخالف سیاسی پارٹیوں کی حکومت ہو تو دونوں لیڈروں [illegible] کے ہندسہ کی طرح پالیسی رائج ہوجاتی ہے۔ دونوں اپنی غلطیوں کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہراتے ہیں۔ دونوں کا مشترکہ مغلیہ ڈائیلاگ ہوتا ہے۔

"عوام تجھے ہارنے نہیں دیں گے، ہم تجھے جیتنے نہیں دیں گے۔"

اب آئیے ان لیڈروں کی طرف جو کرسی سے محروم ہیں اور کرسی والوں کو مرحوم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اپوزیشن لیڈر ہیں۔ نکتہ چینی میں ایم اے ہیں، عوام کے دبے ہوئے مسائل کو زندہ کرنے میں پی ایچ ڈی ہیں۔ عوام کے جذبات میں آگ لگانے میں پٹرول اور حکومت کے اچھے کاموں میں بھی کیڑے نکالنے میں زندہ طلسمات نئی نئی تحریک ایجاد کرتے ہیں۔ جلسہ جلوس کے ایکسپرٹ ہیں۔ انھیں بھی عوام سے ہمدردی ہے۔ یہ عوام کی فلاح

چاہتے ہیں۔ یہ بھی ملک و قوم کی ترقی چاہتے ہیں مگر حکومت کی ارتھی اُٹھا کر۔ ان کی نظر میں عوام کے تمام مسائل کی جڑ حکومتِ وقت ہے۔ اور تمام عوامی مسائل کا حل یہی ہے کہ حکومت کو بدل ڈالو یا دوسرے الفاظ میں حکومت ان کے نام لکھ دو۔

آپ کو تنخواہ میں اضافے کے لئے تحریک کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر ایوان کے نمائندوں کی تنخواہ، بھتہ اور پنشن میں اضافہ کے لئے نہ گھیراؤ ہوتا ہے نہ دھرنا نہ ریلوے روکو نہ سڑک بند کرو۔ چپکے چپکے وزراء اور ایوان کے نمائندوں کا حال سدھر جاتا ہے، مستقبل روشن ہو جاتا ہے۔ اپوزیشن اور پوزیشن دونوں لیڈر من مانی پنشن رقم پاس کروا لیتے ہیں اور عوام حیران رہ جاتے ہیں۔

ہمارے قومی رہنما سیاست سے اس وقت ریٹائر ہوتے ہیں۔ جب موت کا فرشتہ ان کا گھیراؤ کرے یا دل کے کارخانے میں ہڑتال ہو جائے۔ آج کل سیاسی موت سے بچنے کے لئے پارٹی بدلنے کا سیاسی فیشن چل رہا ہے۔ آیا رام گیا رام کا منتر جپنے والے پہلے اِکّا دُکّا ہی تھے۔ اب تو ہول سیل کے حساب سے پوری منسٹری دَل بدلتی ہے۔ اسے گرگٹ ازم کہتے ہیں۔ ہمارا ہر لیڈر سیکولرزم اور سوشلزم پر ایمان کامل رکھتا ہے۔ مگر عملی طور پر چمچہ ازم پر اس کا وشواس ہے۔ ہماری سیاست چمچہ گیری سے شروع ہوتی ہے اور کفگیری پر ختم ہوتی ہے۔ سیاسی ورکر مقامی لیڈر کے سامنے اور مقامی لیڈر، صوبائی لیڈر کے سامنے کھنکتے رہتے ہیں۔ ریاستی لیڈر مرکزی لیڈر کا چمچہ ہوتا ہے۔ اور مرکزی لیڈر اپنے بیٹے کا ــــــ ڈھکن ہوتا ہے! جی ہاں! ان کے بیٹوں کے کارنامے اصلاحات درجہ رکھتے ہیں۔ اس فرزند ازم نے بڑے بڑے سیاسی جہاز غرق کر دیئے ہیں مگر سیاسی لیڈر کی کھال بہت لمبی اور موٹی ہوتی ہے۔ اس پر کسی بات کا کوئی اثر کبھی نہیں ہوتا۔

اب جنوب کی ریاستوں میں نیتا کی جگہ ابھی نیتا अभी नेता لے رہے ہیں۔ مدراس ٹائیگرز میں سیاست کی فلم جوبلی کر چکی۔ آندھرا پردیش میں ریلیز ہوئی ہے کرناٹک اور کیرالا کے اسٹوڈیو میں ہوریٹ شاٹ جا چکا ہے۔ اگر نیتا بدلنے کی وبا شمال میں چلی تو وہاں ڈاکوؤں کی بن آئے گی۔ یوپی، ایم پی اور راجستھان پھولن پارٹی کا قبضہ ہوگا۔ چنبل کی گھاٹی راجدھانی ہوگی اور ہمارے آج کے نیتا ریٹائر ہو کر تتری نائیں ہیں م کریں گے اور عوام؟ عوام کی ہتھیلی پر تو رعایا بننا لکھا ہے۔ رعایا کا کام ہے حکمرانوں کو رعایت ا، سو وہ کام بھی جاری رہے گا۔

○○ ⁘ ⁘ ⁘

اقبال شانہ

باہر جارہا ہوں میں

(باہر جانے والے شوہر کا اپنی بیوی سے خطاب)

ہزاروں پھول برساؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
مرے سینے سے لگ جاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
بہت لمبا سفر ہے اور مجھ کو دور جانا ہے
مرے نزدیک آجاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
وہاں سے تم کو ویزا بھیج دوں گا جانِ من فوراً
مرے پیچھے چلی آؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
وہاں سے میں مری آواز کا اک ٹیپ بھیجوں گا
ذرا بچوں کو سمجھاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
میں آتے وقت لے آؤں گا ٹی۔وی اور ویڈیو
تماشا دیکھتے جاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
ہمیشہ گھورتا ہے پان والا تم کو جانِ من
سنو تم پان مت کھاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
مرے پیچھے کبھی غیروں سے آنکھیں مت لڑانا تم
مرے سر کی قسم کھاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں
کرو جلدی مری ہمشیر کی شادی کی تیاری
خوشی سے جھومتے جاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں

مرے بیمار بچے اب کبھی بیمار نہ ہونگے
طبیبوں کو یہ بتلاؤ کہ باہر جارہا ہوں میں

صابرہ بہاری

من ترا حاجی بگویم ...

گفتگو یہ ہو رہی تھی دوستوں کے درمیاں
کون سا رستہ نکالیں ہم برائے عز و شاں
ثر نہیں دولت نہیں ہاتھی نہیں گاڑی نہیں
اور سلیقے کی ہمارے پاس اک باڑی نہیں
ہو طریقہ کون سا جس سے ہمیں عزت ملے
اس نمائش اور ریا کے دور میں شہرت ملے
اپنی اپنی رائے کا اظہار فرمایا گیا
کچھ زباں پہ ایسا ویسا ذکر بھی لایا گیا

آخرش یہ بات ٹھہری بس یہی اب یار ہو
من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

شکیل شاہجہاں کامٹوی

سچ سبھی پسند کرتے ہیں۔ جھوٹ کوئی پسند نہیں کرتا۔ سچ کے سچ ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ لیکن جھوٹ کے جھوٹ ہونے سو فیصد گارنٹی ہے۔ سچ کی ایک حد ہوتی ہے۔ جھوٹ لا محدود ہوتا ہے۔ سچ بے لوث ہوتا ہے۔ جھوٹ میں غرض پوشیدہ ہوتی ہے لیا ہوتا ہے۔ جھوٹ کے بہت سارے ساتھی ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک عقلمند آدمی نے کہا ہے کہ "جو اکثریت کہے یہ ضروری نہیں ہ سچ ہو ——"

جھوٹ بولتے وقت فرد، مقام، ماحول کے ساتھ ساتھ بیان میں روانی اور بے باکی کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اگر جھوٹ ندیشی سے کام لیتے ہوئے بولا جائے تو وہ سچ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے۔ —— ہمارے ایک پڑوسی جن کی شادی ہوئے تقریباً سال ہو رہے ہیں۔ لیکن ان دس سالوں میں ان کے ہاں کبھی آپس میں لڑائی جھگڑا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ ایک دن ہم نے ان دریافت کیا کہ آپ کی ازدواجی زندگی کی خوشحالی اور کامیابی کا راز کیا ہے۔؟ تو اُنہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اول تو یں اپنی بدصورت بیوی کو خوبصورت کہہ کر ہمیشہ جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ اگر سالن بے مزہ ہے تو زبان چٹخارتے ہوئے مزے دار دں۔ کبھی میری بیوی کھانا تیار کرنے سے معذرت چاہے تو میں "بھوک نہیں ہے" کا بہانہ کر کے ایک اور جھوٹ بول دیتا ہوں۔ درِاصل کامیاب ازدواجی زندگی کی بُنیاد جھوٹ پر ہے۔ اگر میں سچ کہنا شروع کر دوں تو میرا گھر جو امن و شانتی کا مندر ہے جنگ د ا میدان بن جائے گا۔"

تکلف میں نہ چاہ کر بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو کسی کے یہاں مہمان بننے کا شرف حاصل ہو اور صاحب خانہ چائے پینے کے لئے کہے تو آپ زیرلب مسکراتے ہیں۔ پھر وہی قدیم رسمی جھوٹ دہراتے ہوئے کہ "جی کچھ ہی دیر پہلے چائے پی ہے"۔ پیالی کی طرف بڑھا دیتے ہیں اگر حسب حیثیت چائے سے پہلے بسکٹ، سموسے وغیرہ پیش کئے جائیں تو آپ برجستہ کہہ دیتے ہیں

"اس کی کیا ضرورت ہے" جبکہ آپ کے دل کے اندر سے آواز آتی ہے "اسی کی تو ضرورت ہے" پھر باتوں ہی باتوں میں ساری پلیٹیں خالی کر دیتے ہیں۔ تکلف کے نشے میں ہمارے دوست اسلم میاں بھی ایک مرتبہ ایسا ہی خوبصورت جھوٹ بول بیٹھے تھے۔ جب وہ ہمارے ساتھ جبلپور گئے تھے۔ ہمارا قیام ایک شاعر دوست پرواز جبلپوری کے یہاں تھا۔ صبح بیدار ہوئے اور منہ ہاتھ دھوکر فارغ ہوئے تو پرواز صاحب نے ناشتے کے لئے کہا۔ ہم تو خاموش تھے۔ لیکن ہمارے دوست نے بغیر کچھ سوچے تکلف کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے جواب دیا "بھئی مجھے تو ناشتہ کرنے کی عادت ہی نہیں ہے"۔

"پھر بھی تھوڑا بہت تو ——— ؟" پرواز صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"جی سچ مچ میں ناشتہ نہیں کرتا۔" ہمارے دوست نے دوبارہ کہا۔

ہم نے اسلم صاحب کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دسترخوان تک تو چلئے اسلم میاں پھر ہم تکلف کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے۔ ہاں اور نہیں کے ملے جلے تاثر کے ساتھ دسترخوان پر پہونچ گئے۔ اور ناشتہ شروع ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اسلم میاں کے لقموں کی رفتار دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ صاحب جن کو ناشتہ کرنے کی عادت ہی نہیں تھی، ایسے کھا رہے تھے جیسے دوپہر کا کھانا کھا رہے ہوں۔ ناشتہ کے بعد ہم نے سرگوشی کے انداز میں کہا "آپ تو ناشتہ نہیں کرتے تھے نا ——— ؟" تو وہ مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولے "وہ تو تکلف میں کہہ دیا تھا"۔

بچے من کے سچے ہوتے ہیں۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے بچے جتنا صاف، پختہ، اور معیاری سچ بولتے ہیں۔ بڑوں کی زبان سے کم ہی سننے کو ملتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہم فارم پر دستخط کی غرض سے اپنے پروفیسر صاحب کے دولت کدہ پر پہونچے۔ مکان کے سامنے ان کا چھوٹا بچہ کھیل رہا تھا۔ ہم نے اسے بلایا اور پوچھا "تمہارے ڈیڈی گھر میں ہیں" بچہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہم نے پیار کرتے ہوئے کہا "جاؤ ڈیڈی سے کہو باہر کوئی بلا رہے ہیں"۔ بچہ خوشی خوشی اندر گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد باہر آکر ہم سے مخاطب ہوا اور اپنی مخصوص توتلی زبان میں بولا "ڈیڈی کہہ رہے ہیں۔ جاکر کہہ دو کہ وہ ابھی گھر میں نہیں ہیں"۔ بچہ کی زبان سے اتنا صاف اور معیاری سچ سن کر ہم کو ہنسی آگئی۔ اور ہم دروازے کے اوپر لگی ہوئی کال بیل کی بٹن کو حسرت سے تکتے ہوئے واپس ہو گئے۔

جھوٹ اپنی کوتاہیوں اور عیبوں پر پردہ ڈالنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ جھوٹ کا انداز بیان ہو بہو سچ جیسا ہونا چاہیئے۔ ایک صاحب ہیں بدقسمتی سے ہمارے دوست ہیں۔ ایک دن ہم نے پوچھا "کیا بات ہے آج کل تم آفس میں بہت اوور ٹائم کر رہے ہو گھر رات میں دیر سے پہونچتے ہو" انہوں نے حیرت سے تکتے ہوئے کہا "یہ آپ کو کس نے بتایا" "آپ کی بیگم صاحبہ نے"۔ ہم نے فوراً جواب دیا۔ یہ سنتے ہی وہ ہنس پڑے اور بولے یار ہم اپنی بیگم سے جھوٹ بولنا جائز سمجھتے ہیں۔ "وہ کیسے" ہم نے کرید نے کی کوشش کی تو انہوں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ایک دن میں بہت کوششوں کے بعد اپنی آفس کی ایک لڑکی کو فلم دیکھنے کے لئے راضی کرنے میں کامیاب ہوا۔ فلم دیکھ کر جب گھر پہنچا تو بیگم کے ایک ہی سوال پر سب کچھ صاف صاف اور سچ سچ کہہ دیا۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ "پھر کیا ہوا" ہم نے جھنجوڑتے ہوئے بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا "پھر کیا ہونا تھا بیلن کا استعمال روٹی کے علاوہ ہمارے سر پر بھی ہونے لگا۔ اب تم ہی بتاؤ ایسے ماحول میں کس طرح سچ بولا جا سکتا ہے۔ پھر قدرے بیزاری ظاہر کرتے

وئے آگئے بولے "یار ہماری بیگم اس لائق ہی نہیں ہیں کہ ان سے سچ کہا جاسکے۔ یہ سنتے ہی ہم کو ہنسی آگئی۔

"اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی "جی ہاں! اب کچھ ہمارے بھی اوصاف سُن لیجئے۔ ذرا فدلی اور بے باکی سے بھاری بھرکم قسموں استعمال کرکے کثرت سے جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر جھوٹ کا اختتام سچ پر ہوتا ہے۔ زندگی کتنا ہی خوبصورت جھوٹ سہی ن موت ایک اٹل سچائی ہے ـــــ ایک دن ہماری بیگم اس جائے فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئیں۔ ہم چھٹی کی عرضی لے کر ں پہنچے اور باس کے سامنے پیش کردیا۔ باس نے عرضی پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے حیرت اور استعجاب سے پوچھا" آج پھر تمہاری ی مرگئی "!! ہم سنجیدہ ہوکر آگے کہا" اس سے پہلے بھی تم چھٹی لینے کی غرض سے اپنی بیوی کو چار مرتبہ مار چکے ہو۔ لیکن اس مرتبہ کوئی چانس ں ہے۔ باس کی زبان سے نکلی ہوئی سچائی کی تلخی کو ہم برداشت نہ کرکے اور ہماری آنکھیں بھر آئیں۔" سر! اس مرتبہ واقعی میری بیوی نتقال ہوگیا ہے۔" ہم روندھی ہوئی آواز میں بولے اور باہر آگئے ـــــ !!

▲▼

اِدارہ شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجاسکتی ہیں۔

یکو لوے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/:	روپے
نفقط	یوسف ناظم	مضامین	۸/:	"
البتہ	"	"	۱۰/:	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/:	"
دھر گھیٹ	سرتیش حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/:	"
دمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/:	"
بالآخر	"	مضامین	۱۲/:	"
ی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵/:	"
عِن تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵/:	"
اہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰/:	"
دکلیاں نشاط کی	برہان حسین	"	۱۰/:	"
م مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیا	"	۱۲/:	"
ِ حاضر	بدُت خوشتر	"	۱۲/:	"
اماین فرش	پروفیسر یداللہ مہدی	"	۱۵/:	"

۸ /اکتوبر کی شام حسبِ پروگرام مع سوٹ کیس کے گھر سے نکل کر سیدھے مجرّد گاہ پہنچا تاکہ دفترِ شگوفہ یا فائن آرٹس اکیڈمی میں اپنا سوٹ کیس کچھ دیر کے لیے رکھ کر شادی میں شرکت کرسکوں۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے تک دونوں کمروں پر تالے پڑ چکے تھے البتہ "بھارت نیوز" کا دفتر کھلا تھا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی "نیوز رپورٹر" نے حیرت سے فرمایا ــــ "ارے آپ ابھی تک حیدرآباد میں موجود ہیں، آپ لوگوں کے بھوپال جانے کی نیوز تو اخباروں کو بھیج دی گئی ہے ــــ" میں نے جواباً کہا۔ "میاں اپنے یہاں کے اخباروں میں تو ان ادبی جلسوں اور مشاعروں کی خبریں بھی چھپ جاتی ہیں جو سرے سے ہوتے ہی نہیں ہماری تو صرف نیوز ہی ہماری روانگی سے قبل چلی گئی ہے خاطر جمع رکھو، ہم بھی جانے والے ہیں، نیوز آگے آگئے ہم پیچھے پیچھے، بلکہ بطور ثبوت کے یہ سوٹ کیس کچھ دیر کے لیے اپنے پاس رکھو، جو تمہیں یہ یقین دلاتا رہے گا کہ اب ہم بھی جانے والے ہیں۔"

سوٹ کیس "نیوز رپورٹر" کی تحویل میں چھوڑ کر میں بھاگم بھاگ نمائش کلب پہنچا اور ابھی آٹو سے اتر رہا تھا کہ رشید قریشی صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ آٹو کی طرف جھپٹے۔ پھر مجھے دیکھتے ہی اپنے مخصوص لب و لہجہ میں بولے ــ "آپ اب تشریف لارہے ہیں، اجی حضرت ادبی اجلاس تو کب کا ختم ہوگیا ــ" اتنا کہہ کر موصوف نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا ــــ رشید قریشی صاحب کا شمار حیدرآباد کے کہنہ مشق مزاح نگاروں میں ہے۔ جب ایک مزاح نگار، کہنہ مشقی کے درجہ پہ پہنچ جاتا ہے تو اس کی تحریروں سے عموماً مزاح غائب

ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سننے والوں کو ہنسانے کے لیے بے چارے کہنہ مشق مزاح نگار کو سامعین کی پسلیوں میں کہنی مارنی پڑتی ہے لیکن رشید قریشی صاحب کہنہ مشق مزاح نگار کے اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ کہنہ مشق مزاح نگار ضرور ہیں لیکن کہنی مشق نہیں۔ خوش گفتار لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ بات کرتے ہیں تو پھول جھڑتے ہیں جبکہ رشید قریشی صاحب بات کرتے ہیں تو پھول نہیں لطیفے جھڑتے ہیں۔ اور جب مسلسل باتیں کرتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کوئی مزاحیہ مضمون سنا رہے ہوں اور جب اپنا مضمون سنا رہے ہوں تو لگتا ہے جیسے باتیں کر رہے ہوں، اس پر کمال یہ کہ دونوں صورتوں میں ڈرامائی کیفیت "پیدا کرنے میں انہیں" ملکہ حاصل ہے۔ بلکہ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب میں موصوف کی یہ "ڈرامائی ملکہ" اکثر "ملکۂ وکٹوریہ" ثابت ہوئی ہے —— چنانچہ اس وقت بھی اپنی بات میں "ڈرامہ" پیدا کرنے کے لیے قریشی صاحب نے نمائش کلب کی مناسبت سے "ادبی اجلاس" کا شوشہ چھوڑا تھا۔ نمائش کلب سے ہم مزاح نگاروں ادیبوں کا بڑا اٹوٹ رشتہ ہے، اسی نمائش کلب میں ہر سال زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام، ادبی اجلاس برپا کیے جاتے ہیں، اسی نمائش کلب میں تمام مزاح نگار ہر سال "دلہوں" کی طرح سینکڑوں سامعین کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب نمائش کلب پر ہمیں سسرال سے ملی ہوئی سوغات کا گمان ہونے لگا ہے —— چنانچہ جس وقت ننھے ننھے سے برقی قمقموں سے جگمگاتی سسرالی سوغات

میں قدم رکھا۔ مبارکبادیوں کا راؤنڈ چل رہا تھا۔ میں نے فوراً مجتبیٰ حسین کو تاکا اور انہیں مبارکباد دے ڈالی، جواب میں مجتبیٰ نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ "مسیح انجم صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ تم لوگ یہاں سے سیدھے بھوپال جا رہے ہو، میری نیک خواہشات تم دونوں کے ساتھ ہیں، حیدرآباد کی لاج رکھنا، جشن کو کامیاب بنا کر محفل لوٹ کر لوٹنا۔"

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے میں مجتبیٰ کو حیرت سے دیکھتا رہا، شادی کے ہنگامے میں بھی انہیں بھوپال کی محفل طنز و مزاح کی فکر لاحق تھی، میں نے سوچا مسیح صاحب نے سچ ہی کہا تھا طنزیہ و مزاحیہ ادب کی ترویج تبلیغ و توسیع ترقی کے لئے مجتبیٰ حسین نے خود کو اس قدر وقف کر دیا ہے کہ طنز و مزاح کا "چلتا پھرتا وقف بورڈ" نظر آنے لگے ہیں ——!

شادی میں ادیبوں، شاعروں، مدیروں، صحافیوں، مزاح نگاروں کے علاوہ شہر کے شرفاء بھی بڑی تعداد میں نظر آ رہے تھے لیکن اس بھیڑ میں میری آنکھیں مسیح انجم کو تلاش کر رہی تھیں کہ اتنے میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادبی اجلاسوں کے ایک عدد "مستقل سامعین" میری طرف لپکے اور پھر از راہِ مذاق پوچھا —— "آج آپ کوئی مضمون نہیں سنائیں گے۔!"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "سناؤں گا —— لیکن آج نہیں ۱۰ر اکتوبر کی شام میں البتہ اس بار اجلاس کے مقام میں تھوڑا سا ردوبدل ہو گیا ہے یعنی نمائش کلب سے پورے ایک ہزار کلومیٹر دور،

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال میں سناؤں گا
اگر آپ کو میرا مضمون سننے کا اتنا شوق ہے تو پھر
اپنے ذاتی صرفے خرچے سے وہاں تشریف لائیے گا۔"
صرفے خرچے اور فاصلے کی بات سن کر حضرت
سامعین نے فوراً اپنے اور میرے درمیان کا فاصلہ
اس قدر بڑھایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مہمانوں کے ہجوم
میں غائب ہوکر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے،
ان کے اوجھل ہوتے ہی مسیح صاحب نمودار ہوئے
میں نے انہیں چھیڑنے کیلئے مذاقاً کہا — "آپ
تو ایک دم "چھڑے چھانٹ" نظر آرہے ہیں۔
کوئی رختِ سفر ساتھ نہیں، کیا صرف آنگ کے
جوڑے سے بھوپال چلنے کا ارادہ ہے ۔" میری
اس چھیڑ پر موصوف نے ذرا فاصلہ پر کھڑے
ہوئے اپنے فرزندِ ارجمند کی طرف بڑی بے نیازی
سے اشارہ کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر میں نے
سنجیدگی سے کہا ۔ "میں رختِ سفر کی بابت پوچھ
رہا ہوں اور آپ اپنے "لختِ جگر" کی طرف
اشارہ کررہے ہیں، کیا آپ کی فیروز اللغات میں
رختِ سفر اور لختِ جگر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں"
میری اس تشویشناک وضاحت پر موصوف نے
اپنے لختِ جگر کو سر سے پیر تک دیکھا، پھر اچانک ان
کا رنگ فق ہو گیا۔ لپک کر اپنے لختِ جگر کے قریب
پہنچے اور جھنجھلا کر بولے ۔ "میں نے جو ہینڈ بیاگ
تمہیں سنبھالنے کیلئے دیا تھا، کہاں چھوڑ دیا اُسے؟"
جواباً ان کے لختِ جگر نے بڑے اطمینان سے ان
کی توجہ ایک ستون کی طرف مبذول کروادی جس
کی آڑ میں ان کا رختِ سفر بحفاظت تمام رکھا ہوا
تھا، جو ایک عدد درمیانہ سائز کے ہینڈ بیگ پر
مشتمل تھا ——— مسیح صاحب نے لپک کر اپنا
رختِ سفر اُٹھایا اور یوں پیار سے اپنے سینے
سے چمٹا لیا جیسے لختِ جگر ہو اور لختِ جگر کو یوں
نظر انداز کر گئے جیسے "رختِ سفر" ہو۔
ہماری بھوپال روانگی کی "خبر" جو ابھی
تک بیشتر احباب و ہم قلم حضرات کے حق میں
"غیر مطبوعہ" تھی، مسیح صاحب کے "رختِ سفر" کی
وجہ سے "زیورِ طبع" سے آراستہ ہونے سے قبل
ہی آشکار ہو گئی۔ چنانچہ جیسے ہی ہماری رخصتی
کا وقت آیا، تمام احباب نے ہمیں اسی طرح
رخصت کیا جس طرح محاذِ جنگ پر جانے والے
ان سپاہیوں کو جن کی عملی تربیت ابھی "خام" ہو
ان کے متعلقین وسوسوں اور اندیشوں کے ساتھ
رخصت کرتے ہیں — !!!

* * *

ٹرین پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف
گامزن تھی۔ وہ مسافر جو سفر کی شروعات میں تھوڑی
سی جگہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے
آمادۂ پیکار تھے، اس وقت اُخوت اور اتحاد کا
بڑا عجیب و غریب مظاہرہ کر رہے تھے۔ کوئی کسی
کی گود میں سر رکھے اونگھ رہا تھا تو کسی نے اپنے
پاؤں پسار کر دوسرے جھونکے لگاتے مسافر کی
بغلوں میں حائل کر دیئے تھے اور اس طرح "بغلیں
در بغلیں" کی بھرپور عکاسی ہو رہی تھی، اطمینانِ

ڈبّہ کو یوں آپس میں شیر و شکر کی طرح دیکھ کر مجھے بزرگوں کا قول یاد آگیا کہ جب سفر کی نیت باندھ لو تو مسافری اور کافری کو ایک جان لو۔ وہ مسافر جو غالباً پہلی بار سفر کر رہے تھے کھڑکی سے باہر اندھیرے کی گود میں سوئے ہوئے مناظر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش میں معروف تھے جب کہ ہم دونوں اپنی اپنی برتھ پر نیم دراز ادھر اُدھر کی باتوں میں گمن تھے، ہماری خوش گپیاں اس قدر دلچسپ تھیں کہ کافی دیر تک ہمیں یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ ٹرین کسی اسٹیشن پہنچ کر بڑی دیر سے رُکی ہوئی ہے، جب اس طرف دھیان گیا تو میں نے نیچے جھانک کر اس مسافر سے جو ابتداء سے لے کر اب تک متواتر کھڑکی سے باہر ہی جھانکے جا رہا تھا دریافت کیا ــــ "جناب یہ کون سا اسٹیشن ہے۔" جواب میں مسافر نے فرمایا۔ "بابو صاحب میں اس طرف کو پہلی بار سفر کر رہا ہوں مجھے اِدھر کے اسٹیشنوں کے نام نہیں معلوم، ابھی پتہ کر کے بتاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے پلیٹ فارم پر بھاگتے دوڑتے کسی چائے والے سے رجوع فرمایا اور جو معلوماتِ عامہ اسے حاصل ہوئیں انھیں میری طرف منتقل کرتے ہوئے بولا ــــ "بابو صاحب یہ کسی قاضی صاحب کا اسٹیشن جان پڑتا ہے۔" میں نے فوراً اس کی تصحیح کی۔ "قاضی صاحب کا اسٹیشن نہیں قاضی پیٹ۔" وہ فوراً باچھیں پھیلا کر بولا۔ "ہاں ہاں، قاضی صاحب کا پیٹ ہی کہہ رہا تھا ...والا ..."

قاضی پیٹ کا نام سنتے ہی مسیح صاحب کو غالباً اپنے 'خالی پیٹ' کا خیال آگیا، انھوں نے فوراً اپنے رختِ سفر میں سے 'توشۂ سفر' برآمد کیا میں نے حیرت سے پوچھا ـ "کیا آپ شام میں گھر سے کھا کر نہیں چلے تھے؟"

وہ بولے ـ "شادی کے ہنگامے میں کھانے پینے کا ہوش ہی کسے تھا، بس صبح ہلکا سا ناشتہ کیا تھا، شام میں تھوڑی دیر کے لئے گھر گیا ضرور تھا مگر صرف سامان لینے کے لیے کیونکہ پھر بارات کے پہنچنے سے پہلے ہی مجھے نمائش کاب واپس پہنچنا تھا اس لیے گھر والی نے توشہ ساتھ کر دیا۔" دوستی کا حق ادا کرنے میں مسیح صاحب خود تو تکلیف میں پڑتے ہی ہیں۔ کبھی کبھی جس کے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں اسے بھی تکلیف میں ڈال دیتے ہیں چنانچہ اس وقت زبردستی اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر کے مجھے بھی تکلیف میں مبتلا کر دیا۔

پیٹ چاہے کسی قاضی کا ہو یا مزاح نگار کا کھانا پیٹ میں پہنچتے ہی آدمی نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم پر بھی غنودگی کا غلبہ ہونے لگا۔ ہم دونوں اپنی اپنی برتھ پر پوری طرح پھیل گئے۔ مسیح صاحب غالباً آنکھیں موندے ادبی محفلوں کو چٹکیوں میں لوٹنے کے سائنٹفک طریقوں پر غور فرما رہے تھے۔ یوں بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ ادبی اجلاسوں میں جو کامیاب مزاح نگار عوام میں قہقہے لٹا کر داد کے چھوارے، لوٹنے میں پیش پیش رہتے

ہیں ان میں مسیح صاحب اکثر آگے رہتے ہیں، البتہ بھوپال میں ہونے والی محفلِ طنز و مزاح کے بارے میں کم اور بھوپال شہر کے بارے میں زیادہ سوچ رہا تھا۔ ہمیشہ سے میرا یہ دستور رہا ہے کہ پہلی بار جس شہر کا قصد کرتا ہوں اس کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لیتا ہوں، بمبئی میں چونکہ ہر علاقے، ہر صوبے کے باشندے ٹھوک کے بھاؤ مل جاتے ہیں اس لیے کبھی مجھے اس تعلق سے مرکزی محکمۂ سیاحت کے انکوائری کاؤنٹر تک جانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی بلکہ خود اسی شہر کے کسی چلتے پھرتے انکوائری کاؤنٹر سے براہ راست ربط قائم کر کے اس جگہ کی تاریخ، جغرافیہ، سائنس کیمیا، طبیعات غرض سارے ہی مضامین و موضوعات کا احاطہ کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں لیکن بدقسمتی سے بھوپال کا یہ سفر "ادھوری معلومات" کی روشنی میں کرنا پڑا۔ حالانکہ بھوپال میں دو ایک ادبی شناسا دوست موجود ہیں جن سے زندہ دلانِ حیدرآباد کی ادبی تقریبات میں ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں لیکن اتفاق سے یہ ملاقاتیں اس قدر مختصر اور تشنہ رہی ہیں کہ نہ تو یہ احباب پوری طرح کھل سکے نہ ہی بھوپال کے کوائف کھلے ــــ علاوہ ازیں ان احباب کے ادبی شہ پاروں میں بھی بھوپال کم سے کم اور اردو ادب زیادہ سے زیادہ نظر آتا ہے۔ مثلاً ممتاز طنز و مزاح نگار، شفیقہ فرحت صاحبہ برسوں سے بھوپال میں رہتی ہیں لیکن ان کی تخلیقات علاقائی چھاپ سے بالکل پاک ہیں۔ ممتاز مزاح نگار دوست فضل جاوید بھی بھوپال میں ایک عرصہ سے رہتے چلے آئے ہیں لیکن موصوف بھی مقامی موضوعات پر قلم اٹھانا اپنے رتبے کے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔ کل ہند پیمانے پر سوچتے اور لکھتے ہیں، اس سے قطع نظر کچھ عرصہ قبل ان کے بارے میں یہ عقدہ بھی کھلا کہ موصوف کا تعلق دراصل دکن ہی سے ہے، ورنگل ان کا وطن ہے، نتیجتہً ان ہم عصر قلمکاروں کے ہوتے ہوئے بھی بھوپال سے میری عدم واقفیت کا وہی حال تھا جو کہ امریکہ کی دریافت سے پہلے کولمبس کی واقفیت کا تھا، البتہ امریکہ کو دریافت کرنے سے پہلے جس طرح کولمبس کو یہ غلط فہمی تھی کہ امریکہ دراصل "پراچین بھارت" ہے۔ اسی طرح بمبئی کے بیشتر باشندے بھوپال کے تعلق سے اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ بھوپال میں "قوالی" کی فصل سال کے بارہ مہینے لہلہاتی ہے اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ بمبئی کے باشندوں کو شکیلہ بانو بھوپالی کی "بھونچال انگیز قوالی" سننے کا اتفاق ضرور ہوتا ہے۔ قوالی کی بات پر مجھے قوالی کی وہ مخصوص محفلیں یاد آگئیں جن میں بعض دسن کاروں پر قوالی کی ڈراؤنی آواز سن کر وجد طاری ہو جاتا ہے جسے دکن میں "حال چڑھنا" کہتے ہیں، اور چڑھنے والی ہر چیز چاہے وہ نشہ ہو حال ہو یا آسیب، خطرناک ہوتی ہے۔ لہٰذا جب مجھے نیند نہیں آتی، جب ماضی مجھے پشیمان، حال ہلکان اور مستقبل پریشان کرتا ہے تب میں

اچھے خاصے حال کو بے حال کر دینے والی قوالی
کی محفلوں کا تصور کرتا ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں نیند کے مست جھونکے
مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ چنانچہ اس
وقت بھی میرا خیال بھٹکتے بھٹکتے جوں ہی قوالی
کے تصور سے ٹکرایا نیند کی پُرسکون وادی سے لپٹا
ہوا بلاوا آیا اور میں نے مختلف سمتوں میں قلانچیں
بھرتی ہوئی اپنی سوچوں کو فوراً شب بخیر کہا اور
نیند کی وادیوں میں گم ہوگیا ۔۔۔ !!

* * *

صبح میں آنکھ کھلنے تک ٹرین "ودربھ" کے
علاقے میں داخل ہو چکی تھی کیونکہ آنکھ کھلتے ہی جو
زبان سماعت سے ٹکرائی وہ ہندی، مرہٹی اور بنگالی
کا ملا جلا جوشاندہ تھی۔ زبانوں کے اس آمیزے کو
اہلیان بمبئی "بھیل بھال" کہتے ہیں۔ میں نے دیکھا
مسیح صاحب اپنی برتھ سے اُتر کر سیٹ پر بیٹھے اس
کھچڑی زبان کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے،
یوں بھی حیدرآبادی ناشتے میں عموماً کھچڑی کھٹے کا
عادی ہوتا ہے لیکن مختلف زبانوں کی یہ کھچڑی
پہلی بار سننے والے کے معدے کے ساتھ کچھ اچھا سلوک
نہیں کرتی اس لیے میں نے مسیح صاحب کی توجہ
اس طرف سے ہٹانے کے لیے، ضروریات سے فارغ
ہو کر ناشتے کے لئے تیار ہو جانے کا مشورہ دیا۔
ویسے بھی تھوڑی دیر میں ناگپور اسٹیشن آنے والا تھا۔

ناگپور کے سنترے ہندستان بھر میں مشہور
ہیں۔ تاہم اُردو کے کسی اُستاد شاعر نے ان سنتروں کی
تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ یہاں تک کہ
چچا غالب بھی اسے نظر انداز کر گئے۔ دراصل انہیں
آم اس قدر مرغوب تھے کہ جب شعر کہتے کہتے تھک جاتے
تو آم چوسنے لگتے اور جب آموں سے طبیعت سیر
ہو جاتی تو پھر سے شعرستان کی سیر کرنے لگتے۔۔
اگر ان کا کوئی مداح ناگپور کے سنترے ان کی خدمت
میں پیش کر دیتا تو یقیناً سنتروں کی شان میں مدح
کم از کم ایک آدھ قصیدہ ضرور موزوں فرما جاتے تھے
اور یوں سند باقی رہتی اور سنترے چوستے وقت کام
آتی تھی ۔۔۔ !!

ناگپور کے شہرت یافتہ سنتروں کے تعلق سے
ان زرین خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے مسیح صاحب
نے ناگپور اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے
سنترے خریدے، پھر ایک سنترے کا پوست بڑے
پیار سے اُتار کر کچھ پھانکیں میرے حوالے کیں اور
ایک پھانک اپنے منہ میں رکھی۔ لیکن اس پھانک
نے جس قسم کا غیر متوقع سلوک ان کے دہن مبارک
کے ساتھ کیا اس سے ان کے چہرے کے خطوط بگڑ گئے
منہ بنا کر استفسار فرمایا ۔۔ "یہ ناگپور ہی ہے نا۔؟"
جواب میں میرے حامی بھرنے پر، مزید منہ بگاڑ کر
بولے ۔۔ "مگر یہ سنترے ناگپور کے نہیں معلوم ہ؟"
میں نے ہنس کر کہا ۔ "دراصل دو نمبر کی دولت اور دو
نمبر کے کاروبار کی طرح اب پھل پھلاری بھی دو نمبر
کے ہونے لگے ہیں۔ اگر آپ کو ناگپور کے اصلی سنترے
کھانے ہوں تو بمبئی تشریف لائیے، بلکہ یہی نہیں
کشمیر کے اصلی سیب، حیدرآباد کے اصلی سیتا پھل، گویا

یے اصلی پایوس (آم) سبھی بمبئی کے مارکیٹ میں
بہ آسانی دستیاب ہوجاتے ہیں ۔"
وہ حیرت سے بولے "یعنی جو پھل کہیں اور
پیدا ہوتے ہیں، ان کی بڑے پیمانے پر کھپت بمبئی
کی مارکیٹ میں ہوتی ہے ۔"
"جی ہاں ۔" میں نے ان کی بات کی تائید
کرتے ہوئے کہا ۔ "اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے
کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

پھولا پھلا وہ پھل جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

مسیح صاحب فوراً بولے ۔ "چمن سے نکل کر
سرخرو ہونے کا یہ عمل اب صرف پھولوں اور پھلوں
تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب تو اس نے حیدرآباد کی
غریب، نادار اور کنواری لڑکیوں کو بھی اپنی لپیٹ
میں لے لیا ہے، یہ بات آپ سے کچھ چھپی ڈھکی نہیں
ہے، جوڑے گھوڑے اور جہیز کی فرسودہ لعنتوں میں
برسوں سے جکڑی ہوئی حیدرآبادی لڑکیوں کی کھپت
متحدہ عرب امارات کی منڈیوں میں ان دنوں شباب
پر ہے ۔"

جو بات ناگپوری سنتروں سے شروع ہوئی تھی
اس نے خاصا سنجیدہ رُخ اختیار کر لیا تھا اس لئے
ہم نے چُپ چاپ ناشتے کئے۔ ہم نے دو لقمے زہرمار
کیے اور پھر پلیٹ فارم پر نصب کردہ "واٹر کولر" سے
ٹھنڈا پانی پیا، جس کے بارے میں مسیح صاحب نے
تبصرہ فرمایا۔ "ناگپور کے سنتروں سے تو یہاں کا پانی
زیادہ میٹھا اور خوش ذائقہ ہے۔" چنانچہ ٹرین کے
دوبارہ اسٹارٹ ہونے سے پہلے مسیح صاحب نے ایک
بار پھر اور بھرپیٹ، پانی پیا اور یوں ناگپور کے
سنتروں کی تلخی و ترشی کو کم کرنے کی کوشش کی۔
البتہ باقی ماندہ سنتروں کے ساتھ میں نے جوابی
کارروائی کے طور پر یہ کیا کہ انہیں سیٹ پر پھیلا کر
یوں انجان بن گیا جیسے ان سنتروں سے ہمارا کوئی
تعلق نہ ہو ـــــ مجھے توقع یہ تھی کہ کوئی نہ کوئی
ضرورت مند انہیں ضرور اُٹھا لے گا، لیکن دیگر مسافروں
نے ان باقیماندہ، سنتروں کے ساتھ وہی سلوک کیا
جو ووٹ حاصل کرکے الیکشن جیتنے کے بعد اکثر لیڈر
حضرات پسماندہ علاقوں کے افراد کے ساتھ کرتے ہیں
یعنی کسی نے بھی ان باقیماندہ، سنتروں کو اُٹھانے یا
اپنانے کی کوشش نہیں کی ـــــ ابھی سنترے
کی تلخی کا مزا پوری طرح زائل بھی نہیں ہوا تھا کہ
ڈبے میں ایک اور تلخ تماشا شروع ہوگیا۔ ناگپور
اسٹیشن ہی سے ہمارے ڈبے میں ٹھگوں کا ایک
جتھا سوار ہوگیا تھا جس کے ڈبے میں سوار ہوتے
ہی "کوچ کنڈکٹر"، حسبِ معاہدہ یوں غائب ہوگیا
جیسے لاحول پڑھتے ہی شیطان، لہٰذا بدمعاشوں
کے اس گروہ نے دن دھاڑے، دھاندلی شروع
کردی، ایک ٹھگ نے تاش کے تین پتے نکالے اور
پھر پانچ کے دس، دس کے بیس کی ہانک لگاتے
ہوئے اُلٹ پھیر شروع کردی۔ ابتدا میں اس کے
ساتھی دیگر مسافروں کو ورغلانے اور اُکسانے کیلئے
پتوں پر رقمیں لگانے لگے۔ روپیہ ویسے بھی انسان
کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے اور ضرورتیں آکٹوپس

(octopus) عرف ہزارپا کی طرح ہوتی ہیں' ایک ضرورت پوری کیجیے' دوسری ضرورت ہزارپا کی بجلی ٹانگ کی طرح اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتی ہے' چنانچہ روپیہ حاصل کرنے کے لیے انسان جائز ناجائز ہر طریقے کو اپنانے سے گریز نہیں کرتا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ضرورت مند" مسافر" ٹھگوں کے اس جتھے کے ہتھے چڑھ گیا' چار کے آٹھ اور آٹھ کے دس بنانے کے لالچ میں اس نے اندھا دھند رقم جھونکنی شروع کر دی اور جب دس پندرہ منٹ کے قلیل وقفے میں اپنی کل پونجی مبلغ تین سو روپے گنوا بیٹھا تب اسے ہوش آیا لیکن اس وقت تک آدم خور چڑیاں سارا کھیت چُگ کر اُڑ بھی چکی تھیں' یعنی اگلے سگنل پر گاڑی کی رفتار کم ہوتے ہی سارے ٹھگ غائب ہو چکے تھے۔ (اس مخصوص سگنل پر گاڑی کی رفتار کا کم ہونا بھی غالباً ازروئے معاہدہ ہی تھا) ٹھگوں کے غائب ہوتے ہی ڈبے کا کنڈکٹر نمودار ہوا' (ظاہر ہے معاہدے کی مدت ختم ہو چکی تھی) لٹے ہوئے مسافر نے جب اسے رو رو کر اپنی بپتا سنائی تو بجائے اس کے کہ وہ ان ٹھگوں کے خلاف کوئی زبانی کارروائی ہی کرتا' اُلٹا بے چارے مسافر کو ڈانٹنے' پھٹکارنے لگا۔ کنڈکٹر کے اس بیمانہ سلوک پر دیگر مسافروں نے جب اُسے اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی تو سرکاری کرمچاری بے بسی اور لاچاری کا ڈھونگ رچا کر ایک بار پھر غائب ہو گیا — اب ایلیان ڈبہ نے ایک ایک کر کے اس تازہ ترین موضوع پر تبصرہ فرمانا شروع کر دیا۔ گویا سانپ نکل جانے کے بعد اب ہر مسافر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق لکیر پیٹنے کے عمل میں مصروف ہو گیا جس سے بور ہو کر میں اپنی برتھ پر چڑھ گیا اور ایک آدھ جھپکی لینے کی کوشش کرنے لگا۔ ——!!

(باقی آئندہ)

ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کی

دو کتابیں

فقط — اور — البتّہ

(قیمت ۸ روپے) (قیمت ۱۰ روپے)

بتوسط "شگوفہ" حاصل فرمائیں

نعیم زبیری

دکھشن مدھیہ ریلوے کا اُردو ٹائم ٹیبل

یا طوطِ طنغ آمن کا عکسِ تحریر؟

ریلوے بک اسٹال پہ فلمی پرچوں کے جلوے میں "دکھشن مدھیہ ریلوے" کے اُردو ٹائم ٹیبل کو دیکھا پڑا دیکھ کے مارے مسرت کے باچھیں کھل گیئں۔ نہایت تیزی سے جھپٹا مار کے اس ڈر کے مارے خرید لیا کہ اسٹاک کم رہ گیا ہے کہیں ختم نہ ہو جائے لیکن جب مدراس میں بیٹھے بیٹھے حیدرآباد کی ٹرین کا وقت معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تو یقین مانئے کہ اگر شکست تسلیم کرکے ہوٹل کے مینیجر سے ٹائم نہ پوچھ لیتا تو ٹرین نیلور پہنچ چکی ہوتی اور میں ابھی "دکھشن مدھیہ ریلوے" کے اُردو ٹائم ٹیبل صفحات پہ پھیلے ہوئے کیڑوں مکوڑوں میں اپنی ٹرین کو ٹٹولتا رہتا۔

ایک خوبی اس ٹائم ٹیبل میں بہرحال ہے۔ مجھے اپنے بعض دوستوں کے خراب اردو خط سے بڑی شکایت تھی جو اب دور ہوگئی ہے۔ کیوں کہ دراصل اب پتہ چلا کہ "خراب خط" کسے کہتے ہیں۔

آندھرا کے ایک شہر میں ایک درگاہ شریف کے باب الداخلہ پہ پینٹر کو اُردو میں نام پینٹ کرتے دیکھ کر بڑی حیرت اور خوشی ہوئی تھی۔ لیکن گڑبڑ صرف یہ تھی کہ اردو سے نابلد پینٹر بے چارہ ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ کو دیکھ دیکھ کر اردو کا بورڈ بائیں سے دائیں طرف لکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ٹائم ٹیبل بھی کسی ایسے کاتب صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو اُردو کو بائیں سے دائیں طرف لکھتے ہیں۔

اگر آپ کو "موسمیائی کرسی" اور "ٹائر موسمیائی" جگہ جگہ پڑھ کے یہ خیال ہو کہ ٹائم ٹیبل کے ایڈیٹر صاحب اس ٹائم ٹیبل میں انگریزی کے الفاظ لکھنے کے قطعی قائل نہیں ہیں اور ہر لفظ کا ترجمہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو فوراً اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیجئے کیوں کہ یہاں "۲ برتھوں والے کمپارٹمنٹ" اور "ٹریول بیگ جیسی" عام فہم ترکیبیں بھی ملتی ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بجائے "ایئر کنڈیشنڈ" نے اُن حضرات کا کیا بگاڑا تھا کہ اُنھوں نے جگہ جگہ "موسمیائی" کا استعمال کیا ہے۔ "تکلیف" کی اصطلاح

استعمال کرتے کرتے اچانک ہم بے چاروں کا خیال بھی آگیا ہے چنانچہ ایک جگہ قوسین میں تکلمہ فیس مطلباً "سپلیمنٹری چارج" لکھ کے ہم جیسوں کی جہالت کو کم کیا گیا ہے۔

بہرحال ــ ریلویز نے اُردو پہ یہ احسان تو کیا ہے کہ ایکسو صفحہ سے زیادہ موٹا ایک ٹائم ٹیبل چھاپ دیا ہے ۔لیکن اس معاملے میں اُردو والوں کی مدد لے لی جاتی تو شاید کوئی قباحت نہیں تھی ۔ فائدہ یہ ہوتا کہ یہ ٹائم ٹیبل اردو ہی میں چھپ جاتا ۔ اور ضرورت پڑنے پر اُردو والے اس میں اپنی مقدور کے مطابق ٹرینوں کے اوقات دیکھ لیتے ــ اور ایک اور بات جو سمجھ میں نہیں آسکی وہ یہ ہے کہ ان بیچارے "دکھشن مدھیہ ریلوے" والوں کو کسی نے یہ کیوں نہیں بتادیا کہ اردو کے کاتب اور پریس اس ریلوے کے ھیڈ کوارٹر میں موجود ہیں اور اس کے لئے "پہاڑی دھیرج" دلی ۲ والے نارائن اینڈ سنس کو زحمت دینے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

●●

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

لمسا چاکلیٹ چائے اور

لاسا اسپیشل چائے نے اپنے

۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ مکمل کرلئے ہیں۔

LASA
SUPER BLEND
TEA

برق آشیانوی

برق وشرر
مستقل فیچر

زندہ دِلانِ حیدرآباد اور پلین کا اغواء

ایک مقامی اخبار میں یہ خبر جلی حروف میں صفحۂ اول پر درج تھی۔

زندہ دلان حیدرآباد اور پلین کا اغوا۔

۳۱ مارچ ۱۹۸۳ء۔ اے۔ ایف۔ نیوز سروس کے مطابق ۳۰ مارچ کی صبح پانچ بجے ایر لائنس کا طیارہ بمبئی کے ہوائی اڈے سے پرواز کر کے عرب ممالک کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس طیارے سے زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادیب و شعراء سفر کر رہے تھے جنہیں عرب ممالک میں طنز و مزاح کے جشن برپا کرنے کے لئے مختلف حکومتوں نے مدعو کیا تھا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی اس "ٹیم" میں مجتبیٰ حسین، رشید قریشی، نریندر لوتھر، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، برق آشیانوی، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، اسماعیل ظریف، سرپٹ حیدرآبادی، اشرف خوندمیری، حفیظ خاں مذاق، گلیم میدکی، پاگل عادل آبادی، آن پڑھ، رؤف رحیم، رشید عبدالسمیع جلیل وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ پلین کی پرواز کے کچھ ہی دیر بعد مصطفیٰ علی بیگ اور حمایت اللہ میں کچھ سرگوشی ہوئی۔ اچانک مصطفیٰ علی بیگ نے اپنی جیب سے ایک امریکی ساختہ ریوالور نکالا اور سیدھے پائلٹ کے پاس پہونچ گئے۔ اور دیکھتے دیکھتے سب نے پلین کا اغوا کرلیا۔ حمایت اللہ نے نریندر لوتھر صاحب کے پاس پہنچ کر کہا۔ "لوتھر صاحب پلین کا اغوا کرلیا گیا ہے ہم زندہ دلان حیدرآباد کے کچھ مطالبات ہیں جب تک ہمارے مطالبات پورے نہ ہوں گے ہم پلین کو اپنے قبضہ میں رکھیں گے۔ چونکہ آپ ہمارے صدر ہیں اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اغوا کنندگان کی صدارت قبول فرمائیں اور مطالبات پیش کریں۔" لوتھر صاحب اسکیم سے واقف نہ تھے اس لئے بہت گھبرائے اگر واقف ہوتے تو ممکن ہے کہ وہ ساتھ ہی نہ آتے۔ انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ اقدام ایک قسم کا جرم ہے۔ بھلا میں کیسے اس میں حصہ لے سکتا ہوں۔ آپ برق آشیانوی صاحب کو اس کام لئے مقرر کر دیجئے۔ وہ وظیفہ یاب ہیں۔ اگر اُن کا وظیفہ بند ہو جائے تو میں کوشش کر کے جاری کروا دوں گا۔ مگر برائے خدا مجھے اس میں نہ ڈالئے۔ البتہ آپ مجھے فوراً یرغمالیوں میں شریک کر دیجئے۔"

چنانچہ حمایت اللہ نے برق آشیانوی کو اپنا نمائندہ منتخب کر لیا اور لوتھر صاحب کو بر عنالیوں میں شریک کر دیا گیا۔ ادر مطالبات کی فہرست برق صاحب کے حوالہ کر دی جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے ہمیں اس فرد یا جماعت کا نام بتایا جائے جس نے یہ فیصلہ کیا کہ طنز و مزاح دوسرے درجے کا ادب ہے۔

۲۔ اس فرد یا جماعت کو یہ اختیار کس نے دیا کہ طنز و مزاح کو دوسرے درجہ کا ادب قرار دے۔

۳۔ وہ کونسی تاریخ تھی اور کونسا سنہ جبکہ متذکرہ صدر فیصلہ کیا گیا۔

۴۔ وہ کونسا مقام تھا جہاں یہ فیصلہ ہوا۔

۵۔ کیا کوئی تحریری تحریک یا قرار داد متذکرۂ صدر فیصلہ سے متعلق منظور ہوئی تھی۔

۶۔ اگر ایسی کوئی تحریک یا قرار داد منظور ہوئی تھی تو کن دانشوروں نے اس کو منظور کیا تھا۔

۷۔ اگر دانشوروں کی محفل میں قرار داد منظور ہوئی تھی یا بصورتِ دیگر دانشوروں کے پاس بھیج کر اس کو منظور کروا لیا گیا تھا تو اُن تمام دانشوروں کے نام بتائے جائیں۔

۸۔ اگر وہ دانشور زندہ ہوں تو انہیں ہمارے حوالہ کیا جائے۔

۹۔ اگر چند دانشوروں کا انتقال ہو گیا ہو تو اُن کے مزارات کے پتے بتائے جائیں۔ تاکہ اُن پر کانٹوں کی مالا چڑھا کر "ایصالِ ثواب" کی دُعا مانگی جائے۔

۱۰۔ اگر ایسی کوئی باقاعدہ تحریک نہیں چلائی گئی اور نہ ہی کوئی قرار داد منظور ہوئی تھی تو اُن تمام لوگوں کو ہمارے حوالے کیا جائے جو طنز و مزاح کو درجۂ دوم کا ادب کہتے ہیں یا لکھتے ہیں۔

۱۱۔ اگر طنز و مزاح کو وہ دوسرے درجہ کا ادب سمجھتے ہیں تو اُن دانشوروں کے خیال میں درجہ اول کا ادب کون سا ہے۔ کیوں کہ یوسف ناظم نے پس تحقیق یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو میں اول درجہ کا ادب پیدا ہی نہیں ہوا۔

۱۲۔ اُن تمام دانشوروں سے ایک تحریری دستاویز لے لی جائے کہ وہ یوسف ناظم سے اتفاق کرتے ہیں۔

۱۳۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے تو طنز و مزاح کو درجہ اول کا ادب قرار دیا جائے (کیوں کہ درجۂ اول کے ادب کی جگہ خالی ہے) اور سنجیدہ ادب کو دوسرے درجے کا ادب قرار دیا جائے۔

۱۴۔ طنز و مزاح کو درجۂ اول کا ادب قرار دینے کی غرض سے ان تمام دانشوروں سے تحریری دستاویز حاصل کر لی جائے کہ انہوں نے یہ ہوش و حواس بلا جبر و کراہ اور بہ رضا و رغبت اس فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے تاکہ سند رہے اور بر وقت کام آئے۔

۱۵۔ اُن تمام دانشوروں کو جو حیات ہیں اور جنھوں نے طنز و مزاح کو درجہ دوم کا ادب قرار دیا ہے ایک سال سزائے قید با مشقت صادر فرمائی جائے۔ مشقت کی نوعیت یہ ہو کہ وہ اس ایک سال کے دوران طنز و مزاح کی کم از کم ایک تخلیق پیش کرنے میں کامیاب ہوں۔

۱۶۔ جب سزا کی میعاد ختم ہو جائے اور وہ اپنی ناکامی کا اقرار کر لیں تو ان سے یہ تحریری دستاویز حاصل کر لی جائے کہ سنجیدہ ادب درجہ دوم کا ادب ہے۔

۱۷۔ قدرتی طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ درجہ اول میں تعداد کم ہوتی ہے۔ اور درجہ دوم میں تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی میدان میں کیوں نہ ہو۔ پہلی مثال تعلیم کے میدان میں ملتی ہے کہ درجہ اول میں کامیاب ہونے والے اسٹوڈنٹس، (اسٹوڈنٹس ہم نے اس لئے لکھا ہے کہ یہ لفظ طلباء و طالبات دونوں پر صادق آتا ہے) کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور درجہ دوم میں کامیاب ہونے والوں کی تعداد بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری مثال ٹرین کے فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے کوچس میں ملتی ہے۔

۱۸۔ طنز و مزاح وہ مقدس صنفِ ادب ہے کہ جس کے میدان میں آج تک عریاں یا فحش نگاری نے قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی ایسے پاک و صاف ادب کو درجہ دوم کا ادب قرار دینا ایک سنگین گناہ ہے جس سے دانشوروں کو بہ خضوع و خشوع توبہ کر کے اپنی عاقبت درست کر لینی چاہیئے۔

اس کے بعد مصطفےٰ علی بیگ نے طیارہ کو زبردستی بمبئی کے ایرپورٹ واپس لا کر اتروا لیا۔ طیارہ کو حراست میں لے لیا گیا تو برق آشیانوی نے مطالبات کی فہرست پیش کی اور کہا کہ جب تک ہمارے مطالبات منظور نہ ہوں اس وقت تک طیارہ ہمارے قبضے میں رہے گا چنانچہ ملک کے منتخب دانشوروں کی ایک جماعت کو طلب کر لیا تاکہ کسی مناسب سمجھوتے پر فیصلہ کرنے کے لئے کہا گیا۔ جب ان کے سامنے مطالبات کی فہرست پیش ہوئی تو بات چیت کے ذریعہ مسئلے کا حل تلاش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ دانشوروں کی جانب سے ایک صاحب کو منتخب کر کے برق آشیانوی سے بات چیت کرنے کے لئے بھیجا گیا اور نہایت ہی خوشگوار فضا میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ لیکن تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے بعد کچھ تلخی پیدا ہو گئی تو مصطفےٰ علی بیگ نے اپنا پستول حمایت اللہ کے حوالہ کیا اور آگے آ گئے اور پھر غالب صدی تقاریب کا دلچسپ ایٹم پیش کر کے فضا کو خوشگوار بنا دیا۔ اس کے بعد مزید چھ گھنٹے تک دونوں طرف سے بحث ہوتی رہی اور کسی فیصلے کے بغیر ملتوی ہو گئی۔ اور اجلاس دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرے دن پھر گفتگو کا آغاز ہوا۔ سات گھنٹے کی طویل اور بلا وقفہ بات چیت کے بعد جانبین نے ایک مشترکہ بیان جاری کر دیا۔ مشترکہ بیان حسب ذیل ہے :۔

"سنجیدہ ادب اور طنز و مزاح کے علمبرداروں کے نمائندے ایک طویل بات چیت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس طرح افسانہ نگاری، تنقید، تحقیق، سوانح نگاری، تذکرہ نویسی، سنجیدہ شاعری، وغیرہ کو مختلف اصنافِ ادب کا نام دیا گیا ہے اسی طرح طنز و مزاح کو بھی ایک صنفِ ادب قرار دیا جائے۔ اور طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب کہنے یا لکھنے کو قانونی جرم قرار دیا جائے۔ اس فیصلے کی زبانی یا تحریری خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ سخت سزا کا مطلب یہ ہے کہ مسلسل ایک سال تک ان کی لکھی ہوئی تخلیقات خود ان کو سنائی جائیں۔"

زندہ دلانِ حیدرآباد اپنے مطالبات کو خوش آئند فضا میں منوالینے کے بعد ملین کے اغوا سے دست بردار ہوکر خلیجی ممالک کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

اس خبر کو پڑھ کر ہم چراغ پا ہوگئے کیوں کہ ہم اللہ اللہ کرتے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور اخبار میں ہمارے نام سے ایک جھوٹی خبر شائع ہوگئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک من گھڑت قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔ چوں کہ (GOOD FRIDAY) کی تعطیل تھی اُمید تھی کہ مصطفیٰ کمال صاحب دفتر شگوفہ میں شگوفے کی کیاریاں بیٹھے ہوں گے ہم نے فون اُٹھایا اور ان سے دریافت کیا کہ آج اخبار میں جو خبر شائع ہوئی ہے اور اس میں خواہ مخواہ ہمارا نام شریک کر دیا گیا ہے یہ معاملہ کیا ہے۔ جواب میں کمال صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستے رہے جیسے اُن پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اِدھر ہم غصہ میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ جب وہ اپنی ہنسی پر کچھ قابو پاگئے اور کچھ بولنے کے قابل ہوئے تو کہا۔

"برقی صاحب۔ آپ اتنی جلدی کیسے بھول گئے۔ اخبار میں جو خبر شائع ہوئی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ ملین کے اغوا میں آپ نے جو رول ادا کیا ہے اس کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا جارہا ہے۔ اب تک آپ کے نام سے کئی مبارکباد کے ٹیلیفون آچکے ہیں۔" ہم غصے میں بپھر گئے اور جھلا کر کہا "مذاق چھوڑیئے۔ آخر ایسی جھوٹی خبریں شائع کروانے کا کیا مقصد ہے؟" کمال صاحب نے پھر ایک افلاک شگاف قہقہہ بلند کیا۔ افلاک شگاف ہم نے اس لئے کہا ہے کہ یہ قہقہہ "فلک شگاف" قہقہے سے کئی گناہ زیادہ بلند تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک فلک نہیں بلکہ ہفت سماوات کو چیر کر آگے نکل گیا تھا۔ اس پر ہمیں اور بھی غصہ آیا۔ ہم نے ڈانٹ کر کہا "اب آپ کی نجات اسی میں ہے کہ فوراً اس من گھڑت قصے میں میری شرکت کی تردید کروا دیجئے۔ ورنہ میں (جو بھی اس کا ذمہ دار ہے) اس کے خلاف قانونی کارروائی کروں گا۔" اب کمال صاحب سیدھے راستے پر آگئے کہ گویا ہماری دھمکی کچھ کام کرگئی۔ چنانچہ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "برقی صاحب ہوسکتا ہے کہ جس طرح اسلامیہ کالج ورنگل کے مشاعرے کی صدارت کے بعد آپ بیمار ہوگئے تھے اور دو دن کی یادداشت مٹ گئی تھی۔ اسی طرح اب پھر شاید آپ کی یادداشت پر حملہ ہوا ہے۔" ہم نے کہا۔ جی نہیں۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ یہ سب کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔" کمال صاحب نے کہا "جی۔ اب آپ صحیح صورتِ حال کو سمجھ رہے ہیں۔ یہ بالکلیہ شرارت ہے۔ غالباً آپ نے نیوز کے شروع میں اس پر غور نہیں کیا کہ یہ اے۔ ایف۔ نیوز سروس کی خبر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپریل فول نیوز سروس ہے۔ آج اپریل کی پہلی تاریخ ہے اسی لئے یہ بے سر و پا نیوز شائع ہوئی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آپ بھی اس کا شکار ہوگئے۔ ●●

سلیمان خطیب کا مستند کلام **کیوڑے کا بن** قیمت: ۱۵/- روپئے

رشید الدین

مزاح نگاری میں نئے رجحانات

اُردو میں مزاح نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے اور جدید طرز کی مزاح نگاری تو حال حال میں شروع ہوئی ہے لیکن یہ صنف بہت زیادہ مقبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مزاح انسانی جبلت میں شامل ہے۔ مزاح کی حس انسانی وصف ہے۔ ہر جاندار میں مزاح کی حس نہیں ہوتی۔ اسے صرف انسان ہی کو ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کی [illegible] اردو میں بھی یہ صنف بہت مقبول ہے۔

لیکن اس کی مقبولیت کے باوجود اُردو میں مزاحیہ ادب دیگر اصناف کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور مزاح نگاروں کی تعداد آج بھی اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مزاح ایک مشکل صنف ہے۔ ایک تو ہر شخص اس ذوق سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی تو یہ نازک معاملہ ہے۔ مذاق ایک دو دھاری تلوار ہے جس کی ضرب سامنے والے پر کاری پڑے تو ٹھیک ورنہ خود مذاق کرنے والا اس کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ آپ اپنا منہ چڑانا ہو جاتا ہے۔

پھر اس میں توازن کی بڑی اہمیت ہے۔ ذرا مزاح معیار سے گرا اور اس میں پھکڑ پن آ گیا۔ ذرا احتیاط سے کام لیا تو سپاٹ پن کے شکار ہو گئے۔ شگفتہ مزاح ان دونوں کے بین بین ہوتا ہے اور ایک طرح سے یہ پُل صراط پر سے گزرنے کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف کے مقابلہ میں مزاح کم لکھا جاتا ہے اور صرف مزاح لکھنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

اُردو میں مزاح نگاری اخبارات کی دین ہے۔ سب سے پہلے اُردو میں مزاح اخباروں کے کالم میں لکھا جانے لگا۔ اُردو کی مشہور مزاحیہ تصنیف "فسانہ آزاد" لکھنؤ کے رسالہ "اودھ پنچ" کے کالموں میں چھپی۔ بعد میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کو خیال ہوا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے کتاب کی شکل اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس صنف کو پڑھتے ہوئے ایک قاری کو بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود اس کی اہمیت مسلمہ ہے اور یہ اُردو کی پہلی باقاعدہ

مزاحیہ تصنیف کہی جاسکتی ہے۔ مزاح میں چٹخارہ دار زبان کے استعمال کی روایت اسی کتاب کی وجہ سے پڑی۔

بعد میں اور بھی مزاح نگاروں نے اردو میں کالم نگاری کی جن میں لق لق اور سند باد جہازی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخبارات میں مزاحیہ کالم نگاری آج بھی جاری ہے اور بعض مزاح نگاروں نے اس میں خاصی شہرت پائی ہے مثلاً مجید لاہوری، کنھیا لال کپور، ابن انشاء اور فکر تونسوی وغیرہ۔ اردو کے موجودہ دور کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے بھی اپنی مزاح نگاری اخبار کے کالم ہی سے شروع کی۔

اردو کے پہلے باضابطہ مزاح نگار پطرس ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ بھی لکھا، خوب لکھا ہے۔ اور دراصل ان ہی سے جدید مزاح نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ پطرس جن کا اصل نام احمد شاہ بخاری تھا صرف ایک کتاب مضامین پطرس کے خالق ہیں جس میں ان کے چند مضامین شامل ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا نام آج اردو کے مزاح نگاروں میں سرفہرست ہے۔ پطرس نے اردو مزاح نگاری میں جو بنیاد ڈالی تھی اسے رشید احمد صدیقی نے آگے بڑھایا۔

رشید صاحب کے بعد بہت سے مزاح نگار تیزی سے میدان میں آئے جن میں شوکت تھانوی، شفیق الرحمن، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، غلام احمد فرقت کاکوروی اور کرشن چندر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان مزاح نگاروں نے اردو مزاح کے سرمایہ میں اضافہ کیا اور اپنے قارئین کی دلبستگی کی نیز بہت سے نئے مزاح نگاروں کو اس لائن میں آنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ راقم الحروف نے کنھیا لال کپور سے مزاح لکھنے کی ترغیب حاصل کی۔ ان مزاح نگاروں سے پہلے اردو مزاح نگاری ایک روایتی ڈگر پر چل رہی تھی۔ انہوں نے اسے نئے زمانے اور نئے حالات سے روشناس کرایا اور اسے ایک عام قاری کی صنف بنایا۔

لیکن ان کے بعد جو مزاح نگار آئے انہوں نے مزاح نگاری کو جدید رجحانات سے ہمکنار کیا۔ اور اسے ایک ترقی یافتہ اور نئے زمانے کے شایان شان صنف بنادیا۔ نئے مزاح نگاروں کی غالب تعداد کا تعلق پاکستان سے ہے جن میں ابن انشا، کرنل محمد خاں اور مشتاق احمد یوسفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ مزاح نگار ہیں جنھوں نے اپنے سفرنامے اور سوانح حیات بھی مزاح میں لکھے ہیں۔ ہندوستان میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین خاص طور پر ایسے مزاح نگار ہیں جنھوں نے اردو مزاح کو نئے امکانات سے آگاہ کیا۔ ان دونوں مزاح نگاروں نے خاص طور پر خاکہ نگاری میں نام پیدا کیا اور اپنے ہم عصروں کے خاکے نہایت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔

متذکرہ بالا مزاح نگاروں کے پاس عصری آگہی اور فکری آسودگی ملتی ہے۔ نئے زمانے کے حالات اور تقاضے ان کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ اردو مزاح میں جو نئے رجحانات پیدا ہوئے ہیں ان میں نثر کو آسان بنایا گیا ہے۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت سے احتراز کیا گیا ہے اور نہایت آسان اور دلنشین انداز میں اپنی بات بیان کی گئی ہے۔ پہلے مزاح نگار زبان کی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے تھے اب مزاح نگار واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ بیوی سے جھگڑے، سالے سے تکرار اور دوست کے تذکرہ سے نئے مزاح نگار دور رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مبہم الفاظ کا استعمال بھی نہیں ہوتا۔

جدید مزاح ایک طرح سے عوامی ہو گیا ہے جس میں خواص کے لطیفے، واقعات اور اذکار نہیں ملتے۔ جو کچھ آج کے انسان پر گزرتی

ہے اور جن چیزوں سے اسے سروکار ہوتا ہے یہ مزاح نگار ان سے بحث کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے تذکرے اور کردار دوں کے ذکر ان مزاح نگاروں کے پاس نہیں ملتے جو اس دنیا میں ہیں بلکہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہوتے ہیں۔

ایک طرح سے آج کا مزاح زندگی سے بہت قریب آگیا ہے۔ یہ آج کے عام آدمی کے مسائل سے بحث کرتا ہے اور اس کے کردار اور واقعات ہوجو یہ دنیا ہی کے ہوتے ہیں۔ آج کے مزاح میں ایک قسم کی آفاقیت آگئی ہے۔ اور یہ زیادہ عملی ہوگیا ہے آج کا مزاح نگار خیالی گھوڑے نہیں دوڑاتا بلکہ عمل کے رتھ پر سوار ہوتا ہے جو ظاہر ہے زیادہ پُر لطف اور پُر مسرت نہیں ہے۔ ایسا مزاح پڑھ کر ایک قاری صرف زیرِ لب مسکرا سکتا ہے قہقہہ نہیں لگا سکتا اور بعض اوقات ایک کسک اور ایک تکلیف بھی محسوس کرتا ہے کیوں کہ جدید مزاح نگار جن حالات اور واقعات کا آئینہ دکھاتے ہیں قاری خود ان ہی میں رہتا ہے۔ اس طرح اب مزاح زندگی سے زیادہ قریب آگیا ہے۔

اُردو میں اب پہلے کے مقابلہ میں زیادہ مزاح نگار میدان میں آگئے ہیں۔ خصوصاً ہمارا شہر حیدرآباد مزاح نگاروں کے معاملہ میں بڑا خوش قسمت رہا ہے۔ یہاں سے اردو کا ایک مستقل مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" بھی پابندی سے نکلتا ہے جو تا حال اُردو کا واحد مزاحیہ رسالہ ہے۔ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی جو ایک نئی نوج سامنے آئی ہے اس میں "شگوفہ" اور اس کے ایڈیٹر مسٹر مصطفٰے کمال کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ حیدرآباد میں نئی پود کے جو مزاح نگار ابھرے ہیں ان میں مسیح انجم اور پرویز یداللہ مہدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن سے آئندہ اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

ویسے بحیثیت مجموعی حیدرآباد کے علاوہ سارے ہندوستان اور پاکستان میں مزاح نگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور مزاح کا معیار بھی پہلے سے زیادہ بلند ہوا ہے۔ اس طرح اردو میں مزاح نگاری کا مستقبل روشن ہے اور اس صنف کے تعلق سے اس قسم کی تشویش کی ضرورت نہیں ہے کہ پُرانے مزاح نگاروں کے خلاء کو کون پُر کرے گا یا یہ کہ مزاح کے گرتے ہوئے معیار کو کس طرح بلند کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اردو مزاح نگاروں نے وقت کی رفتار کو پہچانا ہے اور نئے رُجحانات کو گلے لگایا ہے۔ ■■

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے مضامین

سمن زار

قیمت : ۸/- روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

زندہ دلان بہار کا قیام

۱۳ر اپریل کو ۲ بجے دن گیا کے مقامی شمسی بلڈنگ کے تاریخی اُردو ہال میں بہار کے طنز و مزاح نگاروں کی پہلی تنظیمی میٹنگ زیر صدارت جناب سید محمد حسنین صاحب صدر شعبۂ اُردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا منعقد ہوئی جس میں بہار کے طنز و مزاح نگاروں کے علاوہ گیا کے اہل قلم ذوق حضرات، صحافی اور بیرون صوبہ کے مشہور و معروف مزاح نگاروں نے مدعوئین خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اس میٹنگ میں زندہ دلان بہار کے دستور (مسودہ) کی روشنی میں مندرجہ ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۔ جناب ڈاکٹر جگدیش چندر کندرا آئی۔اے۔ایس (ایڈیشنل چیف سکریٹری بہار)۔ صدر

۲۔ جناب شفیع مشہدی صاحب (پٹنہ) نائب صدر

۳۔ ” جوہر سیوہانی صاحب (سیوان) ”

۴۔ ” تمنا مظفر پوری (گورارو گیا) جنرل سکریٹری

۵۔ ” ڈاکٹر کمال الدین صاحب (دربھنگہ) سکریٹری

۶۔ ” قمر الزماں قمر صاحب (رانچی) ”

۷۔ ” نعمان ہاشمی صاحب (گیا) خازن اور

۸۔ ” علامہ اسرار جامعی صاحب (پٹنہ)

۹۔ ” رشید عارف صاحب (پٹنہ)

۱۰۔ ” پروفیسر حامد چیروی صاحب (چھپرہ)

۱۱۔ ” پروفیسر منظور ہاشمی صاحب (گوپال گنج)

۱۲۔ ” اچانک بہاری (گریڈیہہ)

۱۳۔ ” پروفیسر مسرور آروی صاحب (آرہ)

۱۴۔

۱۵۔ جناب سید نواب حسن صاحب (گیا)

۱۶۔ ” پروفیسر تاج الانور صاحب (گیا)

۱۷۔ ” پروفیسر طارق جمیل صاحب (پورنیہ)

۱۸۔ ” جہانگیر انس صاحب (سیوان) سبھی ممبران۔

(بہار کے بقیہ ضلعوں سے رابطہ قائم کر کے ان مقامات سے بھی کم از کم ایک رکن لیا جائے گا)

انتخاب کے بعد دستور کا مسودہ پڑھ کر سنایا گیا اور باتفاق رائے منظور ہو گیا۔ چند اور بھی تجاویز پاس ہوئیں۔

شام ظرافت:۔ شام ۷ بجے ہادی ہاشمی اسکول کے رنگین روشنی سے جگمگاتے ہوئے میدان میں ملک کے مشہور و معروف مزاح نگاروں نے اپنی تخلیق پیش کر کے سامعین کو لوٹ پوٹ کر دیا۔

جناب تمنا مظفر پوری۔ ڈاکٹر کمال الدین اور جناب یوسف ناظم صاحب نے اپنی نثری تخلیق سے محفل کو زعفران زار کر دیا۔

جناب منت ظہیر، نواب حسن نواب، نعمان ہاشمی، قمر الزماں قمر، مجیب الرحمٰن بزمی، صابر بہاری، رشید عارف، علامہ اسرار جامعی، جوہر سیوہانی، نرگس سیوانی، اعجاز فاروقی، مشتاق پردیسی، آفتاب لکھنوی، ناظم انصاری اور پاکستان سے آئے ہوئے بزرگ مہمان شاعر حضرت شہر گیاوی نے محفل کو قہقہہ زار بنا ڈالا۔

زندہ دلان بہار کا دفتر فی الحال گیا میں ہوگا اور خط و کتابت کا مندرجہ ذیل پتہ ہوگا۔

تمنا مظفر پوری،
جنرل سکریٹری زندہ دلان بہار مقام و ڈاکخانہ
گورارو ضلع گیا۔ ۸۲۴۱۱۸۔

(تمنا مظفر پوری)

○

Postal Regd. No. H HD 6
SHUGOOFA Hyderabad-1
May 1983 Phone 57716

JUNE 1983

Rs. 3-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جون ۱۹۸۳ء

جلد ۱۶ شمارہ ۶

ایڈیٹر:۔ سید مصطفےٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل: شعیب

منیجر: سمیع جلیل

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۔ ۲

خط وکتابت کا پتہ:

شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱

ڈسٹری بیوٹرس برائے :

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ ہارکو، سری نگر
۴۔ انڈین یسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیلو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ جیمین وہائٹ روٹس
۱۰۔ سیل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان :
پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۲

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

یادِ رفتگان

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

ادب کا جغرافیہ

مالِ مفت (انشائیے)

مرا شہر ڈ لوگاں سو معمور کر (حیدرآباد)

قاضی جی دبلے (رپورتاژ)

پھُوَڑ (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ
امریکہ کی آٹومیٹک آئی
ٹسٹنگ مشین سے کروایئے

امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹکنالوجی کے
مستند تربیت یافتہ

معیاری چشموں کی تیاری
کے لیے تشریف لایئے

غوری
اینڈ
کمپنی آپٹیشین

ترپ بازار حیدرآباد

فون : ۴۲۱۲۷

کوالیفائیڈ آپٹیشینس اکادمی
آف آپٹیشنز (امریکہ)

★

"شگوفہ" کا

"ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب

(حصۂ نثر)

بہت جلد شائع ہوگا۔

مہمان مدیر: یوسف ناظم

اردو	ہندی
ڈاکٹر محمد حسن ڈاکٹر ظ۔ انصاری	ڈاکٹر سریدھر مشرا رتی لال شاہین
انگریزی	**مراٹھی**
ڈاکٹر ملک راج آنند ڈاکٹر سید حامد حسین	ڈاکٹر عبدالستار دلوی
گجراتی	**بنگالی**
ڈاکٹر سکھانیا زویری	شانتی رنجن بھٹاچاریہ
کشمیری	**پنجابی**
ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	پروفیسر راز سنتوکھ سری اور گرنام سنگھ تیر
کنڑی	**میتھلی**
حمید الماس	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

ساتھ میں

بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے اور

"بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

رشید احمد صدیقی   پطرس   فرحت اللہ بیگ   عظیم بیگ چغتائی   شوکت تھانوی   فرقت کاکوروی   فکر تونسوی
کنہیا لال کپور   بھارت چند کھنہ   احمد جمال پاشا   یوسف ناظم   مجتبیٰ حسین   وجاہت علی سندیلوی   شفیقہ فرحت
خواجہ عبدالغفور   نریندر لوتھر   رشید قریشی   برق آشیانوی   مسیح انجم   پرویز یداللہ مہدی۔

★ اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی   مرتبہ: ڈاکٹر ضیاالدین انصاری (علی گڑھ)

شگوفہ ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

یوسف ناظم

کہنے جاتے تو ہیں پر
دیکھیے کیا کہتے ہیں

یہ خبر اُردو دنیا میں بڑے افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ
نامور شاعر سکندر علی وجدؔ کا ۱۶ ارمئی کو اورنگ آباد میں انتقال ہو گیا۔ دکن کے
اس عظیم شاعر کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کا ایک
مضمون شریک اشاعت ہے۔ یہ مضمون اورنگ آباد میں دسمبر ۸۲ء میں منعقدہ
جشنِ وجدؔ میں پڑھا گیا تھا۔ (ادارہ)

وحیدؔ صاحب ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ۲ سال کے اندر ہی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ وہ زمانہ تھا ہی شاید بڑے واقعات کا۔ دیجاپور میں جس کا اصلی نام بیضاپور اور ریلوے اسٹیشن کا نام روٹے گاؤں ہے اردو کے ایک بڑے شاعر کا پیدا ہونا اتنا ہی اہم واقعہ ہے جتنا جنگِ عظیم کا ہونا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اردو کے بڑے شاعر، ادیب اور محقق چھوٹے چھوٹے شہروں بلکہ دیہات میں جنم لینا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں ایسی جگہوں پر پولیوشن کم ہوتا ہے لیکن آپ ہی بتائیے کہ گونڈہ بھی کوئی جگہ تھی اصغر صاحب جیسے شاعر کے پیدا ہونے کی۔ ڈپٹی نذیر احمد اچھے خاصے معقول آدمی تھے لیکن وہ گونڈے سے بھی زیادہ بے ڈھنگے نام کے موضع میں پیدا ہوئے۔ وہ ضلع بجنور میں کوئی جگہ تھی ریہڑ۔ ریہڑ بھی کوئی نام ہوا! مولوی عبدالحق کو اپنی ولادت کے لئے ہاپڑ نام کی جگہ موزوں معلوم ہوئی۔ خود پریم چند بنارس کے کسی بے نام گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اب ہندوستان کے نقشے میں ڈھونڈنے بیٹھیے، یہ جگہیں کیا مجال جو مل جائیں۔ یہ جگہیں تو ریلوے ٹائم ٹیبل میں بھی جگہ نہیں پاتیں۔ ایسے لوگوں کا خاصہ یہی رہا ہے کہ وہ اسی طرح چپکے چپاتے پیدا ہو جاتے ہیں اور خاموشی ہی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر لگا کر اعلان نہیں کرتے کہ دیکھو میں کام کر رہا ہوں۔ اور نہ اپنا کوئی پی۔ آر۔ او مقرر کرتے ہیں۔ وجد صاحب بھی ان لوگوں کی دیکھا دیکھی اوٹے گاؤں میں پیدا ہوئے اور خاموشی کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ تشہیر کی انہیں ضرورت

پیش نہیں آئی۔ شہرت ان کے پاس خود ملزم کی طرح اور عمر قید کی سزا کی مستوجب قرار پائی۔ جو لوگ کاسۂ دریوزہ گری لے کر نہیں گھومتے، گولڈ کپ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ (خواہ سونا کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو جائے۔)

وجد صاحب کی خاموشی مترنم خاموشی تھی جس کا سلسلہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوا۔ ان کا ترنم دوسروں کو خاموش کر دیتا تھا۔ بالکل ساکت۔ اور لوگ ان سے ایلورا، اجنتا اور تاج محل سنا کرتے تھے۔ یہ بات تو لوگوں کو وجد صاحب کی وجہ سے معلوم ہوئی کہ ایلورا، اجنتا اور تاج محل دیکھنے کی نہیں سننے کی چیزیں ہیں۔ لوگ دور دور سے ریل کا ٹکٹ لے کر اورنگ آباد اور حیدرآباد جاتے اور ان سے یہ چیزیں سنتے تھے۔ رقاصہ کو بھی انھوں نے (کسی مصلحت کی بناء پر) سننے کی چیز بنا دیا تھا۔ آپ بھی سنیئے۔

بدن زندگی کا چھلکتا پیالا چمن کی بہاروں نے پھولوں میں پالا
لبوں کو نزاکت کے قالب میں ڈھالا امنگوں کی لہروں پہ باہر نکالا
نگاہوں کی جنت دلوں کا اجالا جمالِ اجنتا، جلالِ ہمالا

اٹھی موج مے کی طرح انجمن میں
تڑپنے لگیں بجلیاں جان و تن میں

قد دلربا حسن بے باک چنچل ہلالی بھنویں روئے روشن پہ بیکل
مدیر ابھرے نین مستی سے بوجھل لطافت مجسم، جوانی مکمل
نظر شعر، رفتار نغمہ مسلسل چھنکتے ہیں گھنگھرو چھنکتی ہے پائل

عجب رنگ سے رقص کر من رہی ہے
سر بزم قوس قزح بن رہی ہے

"رقاصہ" کو اس سے پہلے کسی نے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ویسے سراپا کے موضوع پہ کئی بے سر و پا نظمیں موجود ہیں۔

یہاں ایک واقعہ سن لیجئے۔ ۱۹۵۹ء کا ہے۔ ایک مرتبہ اتفاق یہ ہوا کہ وجد صاحب بمبئی سے اورنگ آباد جا رہے تھے۔ میں بھی گاؤں جا رہا تھا اور حسن اتفاق سے (اس میں واقعی حسن تھا) اسی ٹرین سے ستارہ دیوی آگرہ جا رہی تھیں۔ وہ ریلوے پلیٹ فارم پر چلتی بھی تھیں تو معلوم ہوتا تھا رقص کر رہی ہیں۔ (فن اسے ہی کہتے ہیں) ایک کمپارٹمنٹ میں سفر شروع ہوا اور میں نے وجد صاحب سے کہا کہ اگر آپ نے انھیں آج "رقاصہ" نہیں سنائی تو آپ کی نظم ضائع جائے گی اور شاید ان کا رقص بھی۔ اور یقین مانیئے ستارہ دیوی جو ہیں ہی سیماب صفت، نظم سن کر اضطراری طور پر بیٹھے بیٹھے رقص کرنے لگیں۔ میں تو تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا، لیکن اس کے بعد ان دونوں فنکاروں میں کیا باتیں ہوئیں، تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ لنچ کے وقت دونوں البتہ ڈائننگ کار میں ساتھ نظر آئے۔

وجد صاحب سے میری واقفیت تو خیر اتنی پرانی نہیں لیکن دید و شنید بہت اور ضرورت سے زیادہ پرانی ہے۔ میں جب

اپنے وطن، جالنہ کے تحتانیہ مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ حضرت وجد بھی وہیں کے مدرسہ فوقانیہ میں زیر تعلیم تھے۔ یہ وہاں کیوں گئے تھے، تاریخ اس بارے میں بھی خاموش ہے لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ انھوں نے میری میٹرک جالنہ ہائی اسکول ہی سے کامیاب کیا اور میں اس بات پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ میرے وطن کے مدرسہ فوقانیہ کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ وجد صاحب اورنگ آباد سے میٹرک میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ وہ فٹ بال بھی کھیلا کرتے تھے (اور فٹ بال ہی وہ تنہا کھیل ہے جس میں سر کا بھی استعمال کیا جاتا ہے) وہ صوبہ داری ٹورنامنٹ میں دیہاپور کی نمائندگی کرتے تھے۔ ممکن ہے اپنی ٹیم کے کپتان بھی رہے ہوں کیونکہ کسی اور کی کپتانی میں تو کھیلنا انھیں گوارہ نہ ہوتا۔

کیا تلخ و دل گداز حقیقت ہے زندگی

دل چسپ و دل نواز فسانہ چلا گیا

یہ میرا نہیں انھیں کا شعر ہے۔

جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ وجد صاحب اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹر کا امتحان کامیاب کرکے حیدرآباد چلے گئے ہیں اور تحقیق سے یہ بات سچ ثابت ہوگئی تو میں نے اورنگ آباد کالج میں داخلہ لیا کیوں کہ میں ان سے ہمیشہ محتاط ہی رہا ہوں اور آج بھی جب کہ پانچ دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، موصوف مجھے مدرسہ تحتانیہ ہی کا طالب علم سمجھتے ہیں اور یہی نہیں کہ ان کی یہ رائے یا اس قسم کی رائے صرف میرے بارے میں ہے، بہتوں کے بارے میں وہ ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بُری رائے رکھتے ہیں اور اسے اپنی رائے نہیں فیصلہ سمجھتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بھی میں اُس وقت شریک ہوا جب یہ یونی ورسٹی کو خیرباد کہہ چکے تھے، لیکن ان سے رسمی اور باضابطہ تعارف جامعہ عثمانیہ کی نئی عمارت کے افتتاحی جشن کے موقع پر ہوا اور وہ کافی چیں بہ جبیں ہوئے کیوں کہ میرا تعارف ایک شاعر اور اورنگ آباد کالج کے مندوب کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اسے اُنہوں نے اپنی ہتک پر محمول کیا۔ انھیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب باتیں میری یادداشت میں محفوظ ہو رہی تھیں۔ ان کی پانچویں مشہور نظم "جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں کا پیغام" اسی وقت کی پیداوار ہے اور مجھے پھر فخر کرنے دیجئے کہ یہ نظم بھی اُنہوں نے مجھ سے ملنے کے بعد کہی۔ انسپریشن کے بغیر اچھی نظم کہنا مشکل ہوتا ہے اور اچھی نظمیں مجھے دیر تک یاد رہتی ہیں۔

نونہالانِ چمن! اہلِ ہُنر جاتے ہیں　　　جوش زن قلب میں ہے شوق سفر جاتے ہیں
صورت خاک رہے مثل شرر جاتے ہیں　　　یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کدھر جاتے ہیں

لو چلا قافلۂ کوہ کنِ خانہ بدوش
کل سے ہو جائیں گی تیشوں کی صدائیں خاموش

جوش واخلاص سے کی کوشش پیہم ہم نے   نظم کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کوہِ غم ٹوٹ پڑے پر نہ کیا غم ہم نے   کردیا قوم کا اک خواب مجسم ہم نے
ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

جب میں جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوگیا اور میری دوستی وجد صاحب کے جگری دوست اشفاق حسین مرحوم سے ہوگئی تو وجد صاحب کو میرے ساتھ اپنے رویئے میں نرمی برتنی پڑی مجبوری آدمی سے کیا نہیں کرواتی۔ وجد صاحب کے دوستوں میں تنہا اشفاق حسین تھے جن کے آگے مشرقی تہذیب، مغربی طریقہ خورد ونوش شمالی اور جنوبی رکھ رکھاؤ سب کے سب دھرے رہ جاتے تھے۔ وجد صاحب کا حیدرآباد سول سروس میں انتخاب ہوچکا تھا اور وہ حیدرآباد کے مشہور و معروف ہوٹل ویکاجیز میں قیام پذیر تھے۔ ویکاجیز میں ان دنوں صرف امرا اور کبھی کبھی شرفا جایا کرتے تھے۔ طلبہ کا جانا بہرحال بعید از قیاس تھا۔ لیکن میں اشفاق حسین مرحوم کے ہمراہ ضرور جایا کرتا تھا۔ وجد صاحب ان دنوں اپنا کلام صرف اشفاق حسین کو سنایا کرتے تھے۔ کوئی اور فرمائش کرتا تو اس کی طرف حیرت سے دیکھتے تھے صرف وہ مردِ آہن اشفاق حسین تھا جسے وجد صاحب اصرار کرکے اپنا کلام سناتے اور اس کی معقول قیمت ادا کرتے تھے۔ میرے لیئے الگ سے پیسٹری اور چائے آتی تھی جسے میں اخلاقاً نہیں، انتقاماً نوشِ جاں کیا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسا واقعہ صرف دو یا تین مرتبہ ہی ہوا۔

سول سروس میں منتخب ہوجانے پر آدمی سویلین کہلاتا ہے۔ میں کہ جس کی انگریزی اُردو کی طرح کمزور تھی، سویلین کے معنی غیر فوجی کے سمجھتا تھا۔ لیکن وجد صاحب نے میرے غلط تصے بھی غلط کردیئے۔ انھیں منصفی کے لیئے منتخب کیا گیا تھا اور حیدرآباد میں۔ انصاف رسانی کے محکمے کے عہدہ داروں کا غیر معمولی حد تک کم آمیز ہونا ضروری تھا۔ (حیدرآباد میں انصاف رسانی اور آب رسانی کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا) وجد صاحب کو جو کہ پہلے ہی سے الگ تھلگ رہنے کے شوقین تھے، منصف بننے کے بعد اور بھی کم آمیز بلکہ ناآمیز ہوگئے۔ کسی کو بھی ملنے کا موقع دیتے تو اس سے پہلے ہی کہہ دیتے شاعری کی بات مت کرنا۔ وہ بے چارہ چپ بیٹھا رہتا۔ کیوں کہ قانون کی بات تو وہ کرتے سے رہا۔ میں نے تو ایک مرتبہ کہا بھی کلام الٰہی سننے کی لوگوں کو اتنی سہولت حاصل ہے لیکن آپ کا کلام سننے میں آتنی دقتیں پیش آتی ہیں نہیں سمجھے۔ اس لیئے نہیں سمجھے کہ یہ بات میں نے اُن سے کبھی کہی ہی نہیں۔ ہر شاعر میں انا ہوتی ہے لیکن الف سے ہوتی ہے، ان کی انا، عین سے تھی۔

وجد صاحب کو اپنی ٹریننگ کے سلسلے میں عالم جوانی میں لکھنؤ جانا پڑا اس وقت ان کی شہرت وہاں پہلے پہنچ چکی تھی۔ کیوں کہ شہرت ٹرین سے سفر نہیں کرتی۔ لکھنؤ میں دکن کے اس شاعر نے وہ رنگ جمایا کہ جعفر علی خاں اثر جیسے مسلّم الثبوت استاد کو کہنا پڑا "وجد کی نظمیں، اجنتا، تاج محل، علی ساگر، عبدالرزاق لاری باقی رہنے والی چیز ہیں"۔ میرا خیال ہے اور غالباً صحیح خیال ہے کہ وجد دکن کے پہلے اور تنہا شاعر ہیں جو شمال کی طرف گئے ورنہ عام طور سے شاعر، شمال سے دکن آیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں وجد صاحب اس لئے بھی بیچین تھے کہ ان کے پرستاروں کی کمی نہیں تھی اور ان میں ایک سے ایک قدآور شخصیت موجود تھی اور ان میں سروجنی نائیڈو بھی تھیں جنھوں نے ان کے بارے میں کہا تھا "وجد کی مشہور نظم اجنتا حسن خیال، زور بیان اور رفعتِ فکر کا شاہکار ہے" محترمہ نے تعریف تو وجد صاحب کی کی اور سر فخر سے ہمارا اونچا ہوا اور مجھے تو دہی عالیہ ہائی اسکول کی پری میٹرک کی تعلیم والی بات یاد آگئی۔ بنیادی تعلیم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سروجنی نائیڈو کون تھیں، سبھی جانتے ہیں، لیکن یہاں مجھے ذراسی آزادی چاہیئے۔ اتفاقاً پاکستان کے ایک ادیب مختار مسعود کی کتاب "آوازِ دوست" نظر سے گزری۔ ایک پیراگراف دیکھ کر دل اچھل پڑا۔ چند جملے آپ بھی سنیئے۔

"کعبۂ دل میں ایک روز جھانکا تو دیکھا کہ ایک صنم نے وہاں گھر کر لیا ہے ہمیں گمان تھا کہ دورِ آزری ختم ہوئے مدت بیت چکی ہے اور اس عرصے میں دل اگر صحنِ مسجد نہ بن سکا تو کیا غم، کم از کم بت کدہ تو نہیں رہا۔ اب جو یہ گمان غلط نکلا اپنے ہی بارے میں لاعلمی پر تشویش ہوئی۔ یہ کس کا بت ہے جو اب تک سلامت ہے اور نہاں خانۂ دل میں کیسے آن چھپا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو یہ بت ایک دلوی کا نکلا۔ دبلی پتلی، بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن، بالوں میں گھنگھر اور چھوٹا سا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا ہے، جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار، بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے، ساری کا پلّو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے صورت من موہنی، پہلی نظر میں پُر اثر، دوسری میں پُر اسرار۔ میں نے جب بھی اس بت کو دوسری بار نظر بھر کر دیکھا تو صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک بھاری سالخوردہ معمر عورت نے سلک کی سلیٹی ساری باندھی ہے۔ پلّو سر پر ہے اور نصف چہرہ اس میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ایک خوش نما قوس بنائی اور اسے ابرو کے سامنے لا کر سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی کے اراکین کو جو وکٹوریہ گیٹ میں صف بستہ کھڑے تھے یوں آداب کیا گویا وہ مسلّم تمدن کا مرقع ہے یا شائستگی کا مجسّمہ۔ آداب کرتے ہوئے ساری کا پلّو چہرے سے ڈھلک گیا تو ہم نے پہچانا یہ سروجنی نائیڈو ہیں۔"

سروجنی نے تقریر شروع کی اور ان کے پہلے ہی فقرے پر سب لوگ چونک اٹھے۔ پہلی بات پوری ہوئی تو ہم لوگ دنگ رہ گئے اور سروجنی کے ساتھ آنے والوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کہنے لگیں میں آج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں کئی لوگوں کے مشورے کے خلاف اور چند لوگوں کی دھمکی کے باوجود حاضر ہوئی ہوں۔ مجھے علی گڑھ کی ضلعی اور یوپی کی صوبائی کانگریس نے پہلے مشورہ اور پھر حکم دیا کہ تم مسلم یونی ورسٹی کا دورہ منسوخ کر دو۔ انھیں یہ بات بھول گئی کہ گورنر کی حیثیت سے میں اب کانگریس کی ممبر نہیں ہوں لہٰذا ان کی رائے کی پابند ہوں نہ ان کے ضابطے سے مجبور اور میں کسی کی دھمکیوں کو کب خاطر میں لاتی ہوں۔ میں حاضر ہو گئی ہوں۔ بلبل کو چمن میں جانے سے کون روک سکتا ہے۔ ہم نے بلبلِ ہند کی بات سنی تو خدا کا شکر بجا لائے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وجد صاحب کا وطن جیسا کہ اس کے محلِ وقوع سے ظاہر ہے اورنگ آباد سے ۲۸ میل اس طرف ہے یعنی بمبئی کی طرف۔

اس لئے بھی کی کوشش بہت پہلے انھیں بھی کھینچ لے گئی۔ وہ کچے دھاگے میں بندھ کر ادھر نہیں گئے لیکن شرعی رشتے میں بندھ چلے گئے۔ اس میں بھی اُنہوں نے احتیاط یہ کی کہ ایسے مکان کا انتخاب کیا جو ۴ منزلہ تھا اور آج کی ۱۰ منزلہ عمارتوں سے بھی زیادہ اُونچا تھا۔ علاوہ ازیں اس میں لفٹ بھی نہیں تھی۔ کوئی ان سے ملنے جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس عمارت میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ یہ مکتبہ جامعہ کے نزدیک تھا اور وحید صاحب جو اپنی تنخواہ صرف دواؤں اور کتابوں کے نسخوں پر خرچ کیا کرتے تھے، پیدل ہی چل کر مکتبہ جامعہ جاتے تھے اور سڑک پار کرنے میں اتنا وقت صرف کرتے تھے کہ دُکان بند ہو جاتی تھی۔ اس کا صلہ انھیں ایک دن اچھا مل گیا۔ جے جے اسپتال کے نکڑ پر بڑی احتیاط سے سمٹے سمٹائے کھڑے ہو کر یہ سوچ رہے تھے کہ ۴۰ منٹ ہو گئے ہیں اب سڑک پار کر لینی چاہیئے کہ اتنے میں ایک نوجوان سیکل سوار نے ان کے ٹکر ماری اور اتنی زور سے سیکل کا پیڈل ان کی پنڈلی میں لگا کہ وحید صاحب لہولہان ہو گئے۔ یہ تو خیر ہوا، لیکن اس نوجوان نے بجائے اس کے کہ ان سے معافی مانگتا یا ہمدردی کرتا، ان سے کہا "حضرت دیکھ کر نہیں کھڑے ہوتا"۔ وحید صاحب کو کئی انجکشن لینے پڑے۔ کچھ تو ڈاکٹر نے دیئے اور کچھ اُنھوں نے اپنی پسند سے لئے۔ وحید صاحب دواؤں کا انتخاب بھی اپنی پسند سے فرماتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے ان کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر موثق الدین کو ترکِ وطن کرنا پڑا۔

بمبئی میں اُنھوں نے ایک کار بھی رکھی تھی لیکن کوئی شوفر ان کے یہاں ۱۵ دن سے زیادہ نہیں رہا اور جتنے دن رہا دہیں ستم ہائے صاحبِ کار رہا۔ کیوں کہ یہ کار میں کبھی نچلے نہیں بیٹھے ہدایت کار کی طرح بیٹھتے اور دورانِ سفر میں شوفر کے کندھے سے اپنا ہاتھ ہرگز نہیں ہٹاتے اُن کے سبھی شوفر شولڈر پین (SHOULDER PAIN) کا شکار ہوئے اور آخر ایک دیدہ دلیر شوفر نے ایک دن ان سے کہے بغیر ان کی کار فروخت کردی اور اپنے استعفےٰ کے ساتھ ایک قیمتی چک بھی ان کی نذر کر دیا۔ یہ خود اپنی کار بیچتے تو شاید ہی انھیں اتنی قیمت ملتی کیوں کہ انھیں صرف تاؤ آتا ہے بھاؤ تاؤ نہیں آتا۔ اس دیدہ دلیر، بلکہ دیدہ ور شوفر کی وجہ سے کئی لوگوں کی جان بچی ورنہ ان کی ہدایتوں کی روشنی میں تعجب تو اس بات پر ہوتا تھا کہ کوئی ایکسی ڈنٹ کیوں نہ ہوا۔

ان کی وجہ سے ہیر آئیل کی صنعت کو بھی ہمیشہ خطرہ رہا۔ جب یہ ناندیڑ میں تھے تو ایک نوجوان لیکن مسکین شاعر کی ان کے ہاں بہت آمد و رفت تھی ایک دن بدقسمتی سے اس نے لوہا نگار ان کے گھر کا رُخ کیا۔ وحید صاحب کو چاہیئے تھا یعنی انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ اس شاعر کو واپس کر دیا جاتا لیکن اُنہوں نے اپنی نظروں کے سامنے اس کا سر صابن سے دھلوایا اور خوش ہوتے رہے۔ یہ جب تک ناندیڑ میں رہے، وہ شخص سر کے سفید بالوں ہی پر قانع رہا حالانکہ یہ اس کے کھانے کھیلنے کے دن تھے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور قومی مسئلہ تو اس وقت کھڑا ہوا جب وحید صاحب نے اپنا مجموعۂ کلام "بیاضِ مریم" خود اپنے دستِ شفقت سے لکھ کر چھپوایا اور ہندوستان کے سارے خوشنویس سہم کر رہ گئے۔ وحید صاحب اس وقت ایم۔ پی تھے اور لوگوں کو روزگار فراہم کرنا یا کم سے کم کوشش کرنا ایک ایم۔ پی کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بہرحال شکر ہے کہ بات صرف ایک مجموعۂ کلام کی کتابت تک محدود رہی انھیں خود بھی اندازہ ہو گیا کہ خوشنویسی شوق کی چیز نہیں، عرق ریزی کا کام ہے وحید صاحب کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ یہ بے حد خوش خط ہیں اور زمانۂ طالب علمی میں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے جعلی خط

لکھ لکھ کر لوگوں کی ملازمت کی سفارش کیا کرتے تھے اور مولوی صاحب کو صرف اس وقت پتہ چلتا تھا جب وہ غرض مند شخص اپنا کام ہو جانے پر اُن کا شکریہ ادا کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

وقار صاحب کے اس ۷۰ سالہ جشن پر میں اس لئے بھی خوش ہوں کہ میں جو ہمیشہ ان کی ہی سُنتا رہا ہوں آج کچھ کہہ سکا۔ غالب نے کہا ہے

زباں اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی

(اورنگ آباد میں یہ ۱۲ دسمبر کو جشن وقار کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا)

■■

میر کے سرہانے

راجہ مہدی علی خاں

بڑا جیا دل نہ اس کمرے میں تولو
نہ چاہی کے لئے تکیہ ٹٹولو
بڑی سردی ہے دروازہ نہ کھولو
سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

یہ تڑپے دن میں اور راتوں کو جاگے
ابھی سے لڑکیوں کے پیچھے بھاگے
بٹے راتوں کو یہ آنکھوں کے دھاگے
ہے مجنوں طفل مکتب اس کے آگے
کسی لیلیٰ پہ عاشق ہو گیا ہے
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

موئے عطار کے لڑکے سے یاری
ہوئی جب اس کی اس نے آنکھ ماری
نہ اس ظالم نے کچھ کی پردہ داری
اٹھا کر منہ پہ دے ماری پٹاری
خیالوں میں اسی کے کھو گیا ہے
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

میمونہ وحید

(ریسرچ اسکالر، جامعہ عثمانیہ)

مزاح کی تعریف

"مزاح نگاری کا بُنیادی کام ہنسانا ہے۔ اگر مزاح کے پیدا کرنے والا ہنسانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے تو پھر اسکا مزاح "مزاح" نہیں رہتا۔ اس لئے مزاح کی تعریف کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خود "ہنسی" کیا ہے۔ یہ کیوں اور کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ تب ہی کہیں مزاح کی تعریف یا مزاح کو سمجھنا ممکن ہوسکتا ہے۔

ہنسی کے متعلق بھی مختلف نظریئے ملتے ہیں۔ اور ہنسی کی بھی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ قدیم ترین زمانے سے ہنسی کی تعریف کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس طرح سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ یونان ہے۔ اسی طرح سے ہنسی کی اولین تعریف ہم کو یونانیوں کے پاس ہی ملتی ہے مشہور مفکر و فلسفی ارسطو نے ہنسی کے بارے میں کہا تھا کہ "ہنسی کسی ایسی کمی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آتی ہے۔ جو درد انگیز نہ ہو۔"

ارسطو نے اس طرح سے ہنسی ہی کی نہیں مزاح کی بھی تعریف کی ہے کیوں کہ مزاح بھی بنیادی طور پر کسی کمی یا بدصورتی کو دیکھنے اور دکھانے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ارسطو نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ یہ کمی یا بدصورتی ایسی نہ ہو جو ہمارے لئے درد انگیز ثابت نہ ہو۔

ہابس کے نظریہ کے مطابق ہنسی احساس برتری کا دوسرا نام ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ہنسی کچھ نہیں سوائے اس جذبۂ افتخار یا احساسِ برتری کے جو دوسروں کی کمزوری یا اپنی گزشتہ خامیوں کے باعث معرضِ وجود میں آتی ہے۔" [1]

ہنسی کے جذبے کے پیچھے عام طور پر جذبۂ افتخار یا احساسِ برتری کام کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبۂ ہنسی کی طرح بعض دفت وقتی ہوا کرتا ہے۔ ہم جب اپنی خامیوں پر بھی ہنستے ہیں۔ تب بھی ہم اپنے آپ کو اپنے پچھلے "میں" سے برتر سمجھتے ہیں۔

ہنسی کی ایک تعریف کانٹ نے کی ہے۔ اس کے نزدیک:۔

"ہنسی اُس وقت نمودار ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے
اور ہماری توقعات اچانک ایک بلبلہ کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائیں" لے

یہاں بھی وقتی یا اچانک طور پر ہم جس احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ ہنسی کو پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنسی کسی چیز کی عدم تکمیل، ادھورے پن، یا توقع کے اچانک ختم ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہنسی ہی نہیں غم یا رنج کی کیفیت بھی بعض وقت کسی کام کے یا توقع کے اچانک ٹوٹنے یا ختم ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنسی اور غم کا محرک بعض وقت ایک ہی بات ہوتی ہے۔ لیکن مختلف طبیعتیں اس سے مختلف انداز سے متاثر ہوتی ہیں

ہنسی کی ان مختلف تعریفوں سے یہ بات صاف طور پر نمایاں ہے کہ ہنسی کے پیچھے انسان کے مختلف جذبات کام کرتے ہیں۔ انسانی جذبات اور احساسات میں ہنسی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

ہنسنا انسان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ یہ ایک ایسا انسانی فعل ہے۔ جو انسان اور انسانیت کے لئے مخصوص ہے کسی اور جاندار یا جانور میں ہنسنے کا عمل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زندگی کے ارتقاء میں ہنسی کو جو امتیاز حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے مشہور سائنسداں چارلس ڈارون بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ ہنسی ایک عضویاتی مظاہرہ ہے۔ اس کے دوران انسان کی جو جسمانی کیفیت اور حالت ہوتی ہے۔ اُس کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

"ہنسی کے دوران منہ پھیل جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے اور اوپر کی طرف ہٹ جاتے ہیں۔ اس طرح اوپر والا ہونٹ قدرے اور اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اور شدید ہنسی کے دوران تو سارا جسم کانپنے لگتا ہے۔ سانس میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور آنسو نکلنے لگتے ہیں۔" لے

ہنسی لازمی طور پر خوشی کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ ہنسی کے بھی مختلف روپ ہوا کرتے ہیں۔ انسان مختلف احساسات کے اظہار کے لئے ہنسی سے کام لیتا ہے۔ بعض وقت وہ نفرت کے اظہار کے لئے ناپسندیدگی اور تحقیر کے لئے بھی ہنستا ہے اور یہ ہنسی "زہرخند" کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے ہنسی اور خوشی میں جو فرق بتایا ہے اس کو بھی پیش نظر رکھنے اور نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ آرتھر کوئسلر نے اسی فرق کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"خیالات و احساسات ایک خوبصورت تصویر کو دیکھ کر یا ایک اعلیٰ نظم کو پڑھ کر ہمارے دلوں میں ضرور متحرک ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا خاص عضویاتی مظاہرہ پیدا نہیں ہوتا جو ہنسی کے وقت معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اور یہ چیز محض ہنسی سے

CHARLES DARWIN "EXPRESSION OF EMOTIONS" P 208
------ " ------ ED 1914 P 2[illegible]

مخصوص ہے کہ انسان ایک لطیفہ کو سن کر یا پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کا
اتنے نمایاں انداز میں اظہار کرتا ہے۔" ؎۱

ہنسی کی وجہ سے انسان کی جو عضویاتی کیفیت ہوتی ہے اس کی تشریح ڈارون کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی کی ہے جیسے گریگ کا کہنا ہے:۔

"دروازے پر سے چھلانگ لگانے یا بندوق کی لبلبی دبانے سے ذرا قبل آپ ایک لمبا سانس لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے سینے میں روک کے رکھتے ہیں۔ ہنسی کے وقت بھی آپ اسی طرح ایک لمبا سانس لیتے ہیں مگر اسے روکنے کے بجائے آپ اسے آواز کے چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی صورت میں خارج کر دیتے ہیں۔" ؎۲

ہنسی کے تعلق سے جو مختلف نظریات یا ہنستے وقت انسان کی جو جسمانی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا اظہار اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ ہنسی ایک ایسا انسانی عمل ہے۔ جس کو بروئے کار لانے میں انسان کے مختلف جذبات کام کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہنسی پیدا کرنے میں مضحک اشیاء کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور مزاح کی وجہ سے بھی ہنسی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہنسی اور مزاح میں بے حد قریبی تعلق ہے۔ بعض وقت تو یہ مترادف بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ ہنسی کی تشریح کرتے ہوئے مزاح کی توضیح کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ

"ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں۔ وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی ناتمامی ہے۔ اس لئے ہنسی کے مواقع کم نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت مسلم ہے۔ ہم محض اسی ناتمامی کا احساس کر سکتے ہیں یا احساس کے ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔" ؎۱

ہنسی میں جس طرح سے عدم تکمیل، بے ڈھنگا پن، ناموزونیت یا ناتمامی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اسی طرح سے مزاح اور ظرافت کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے فرقت کاکوروی نے لکھا ہے کہ

"دراصل ہنسی جس سے ظرافت کے پودے کی آبیاری ہوتی ہے ایک فطری جذبہ ہے۔ جو مخصوص لمحات زندگی میں ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔" ؎۲

؎۱ "سخن ہائے گفتنی" از کلیم الدین احمد ص۵۔ ؎۲ اردو ادب میں طنز و مزاح از فرقت کاکوروی ص۲۳۔

؎ "The Psychology of Laughter Comedy" by J.Y.T. Greig p 214

؎ Insight and Out Look by Arth Koessler p 30 [illegible]

ہنسی اور مزاح دونوں ہی تعمیری کام کرتے ہیں۔ ان کے ذریعہ زندگی کی ناہمواریوں اور ناتمامیوں کو دور کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں سلیقے کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ کیوں کہ سماج کے بے ڈھنگے پن کا جب مضحکہ اڑایا جاتا ہے، افراد سماج دونوں اپنے اپنے طور پر اصلاح کرنے کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔ اس طرح سے ہنسی اور مزاح ایک بڑی سماجی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ہنسی کی اس تعمیری صلاحیت کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ بلکہ ہر اس فرد کو نشانۂ تمسخر بھی بناتی ہے۔ جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے"۔ [1]

یہی وجہ ہے کہ مزاح کے تعلق سے بھی تقریباً وہی باتیں کہی جاتی ہیں۔ جو ہنسی کے تعلق سے کہی جاتی ہیں۔ ہنسی جس طرح سے سماج میں ایک تعمیری کام انجام دیکر سماج کو بے ڈھنگے پن، عدم تکمیل یا ناہمواریوں سے بچاتی ہے۔ اسی طرح سے مزاح بھی بالکل یہی کام انجام دیتا ہے۔ اسٹیفن لیکاک نے مزاح کی تعریف کسی جگہ یوں کی ہے :-

"مزاح کیا ہے؟ زندگی کی ناہمواری اور شعور کا نام ہے۔ جس کا فنکارانہ اظہار ہوجائے"۔ [1]

اس بیان سے ہنسی اور مزاح کا فرق بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اصل میں مزاح اور ہنسی میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ہنسی میں فنکارانہ اظہار نہیں ہوتا۔ لیکن مزاح لازمی طور پر فنکارانہ نوعیت رکھتا ہے۔ مزاح اس طرح سے دو کام انجام دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ ہنسی پیدا کرکے مسکراہٹوں سے انسان کو روشناس کرکے انسانی زندگی میں خوشی اور انبساط کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف فنی محاسن اور فنی رکھ رکھاؤ سے کام لے کر فن سے پیدا ہونے والی مسرت اور خوشی کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بڑی عمدگی سے تعمیری کام انجام دیتا ہے۔ اور زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں کی نشاندہی کرکے اُن کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے لئے یا یوں کہنا چاہئیے کہ مزاح جس ماحول میں پرورش پاسکتا ہے، وہ ایک خاص قسم کا ماحول ہوتا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جب تک ایسا ماحول یا سماجی فضاء پیدا نہ ہو مزاح پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ :

"دراصل خالص مزاح کے نشو و ارتقاء کے لئے سکون و عافیت کی ایک ایسی فضاء درکار ہے، جس میں لوگ ماحول سے بدظن نہ ہوں۔ بلکہ زندگی کی مضحک کیفیات اور افراد کی مخصوص ناہمواریوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں خالص مزاح زندگی سے والہانہ اُنس کا نتیجہ ہے۔ اور اس کی نمود کے لئے گھر کے اندر اور باہر ایک ایسی پرسکون فضاء درکار ہے جس میں فرد کے محظوظ ہونے کے فطری میلان کو تقویت مل سکے"۔ [1]

لیکن یہ سماجی ماحول اور خوشگوار فضاء ظاہر ہے کہ ہر مزاح نگار کو نصیب نہیں ہوتی اور اس لئے مزاح کا تعلق سماج سے زیادہ فرد کے انفرادی رویہ پر ہوا کرتا ہے۔ خالص مزاح پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ماحول پُرسکون ہو۔ زندگی اور ماحول میں

---

[1] بحوالہ اردو ادب میں طنز و مزاح" از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ — اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۵۔

عافیت کا احساس کارفرما ہو۔ ایک حقیقت ہے کہ ایک ہی ماحول سے مختلف افراد مختلف انداز سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جب کہ خالص مزاح اُس دور میں یا اُس ماحول میں پرورش پاتا رہا ہے۔ جب کہ سکون و عافیت کا فقدان تھا۔ زندگی میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔ افراد اپنے ماحول سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن ایسے زمانے میں بھی خالص مزاح پیدا ہوا ہے۔ اُس کی سب سے روشن مثال مرزا غالب کی مزاح نگاری ہے۔ اسی وجہ سے ایسٹ مین نے جو مزاح کی تعریف کی ہے۔ وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ وہ مزاح کو انسانی جبلت قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"مزاح کھیل کی جبلت PLAY INSTINCT ہے۔ اور اس کا بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو صدمے یا مایوسی کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے۔" [1]

اس تعریف کے مطابق مزاح اسی ماحول میں پرورش پا سکتا ہے یا پایا جاتا ہے۔ جہاں سکون و عافیت کی بجائے صدمے یا مایوسی کا دور دورہ ہو۔ کیوں کہ ہنس کھیل کر اپنے ماحول کا مقابلہ کرنا یا مایوسی اور صدمے کو جھیل جانا ایسے میں ہی ممکن ہے ایسٹ مین نے مزاح کے تعلق سے چار شرطیں بیان کی ہیں۔ اس کے خیال میں مزاح انہی صورتوں میں ممکن ہے:۔

"الف:۔ اشیاء صرف اس وقت مزاحیہ رنگ اختیار کرتی ہیں جب ہم خود مزاح کے موڈ میں ہوں۔ اگر ہم بہت سنجیدہ ہوئے تو مزاح کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔

ب:۔ جب ہم مزاح کے موڈ میں ہوتے ہیں تو خوشگوار چیزوں کے ساتھ ساتھ ناخوشگوار چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

ج:۔ ہنسی کھیل کا رجحان، بچپن کا امتیازی نشان ہے اور بچوں کی ہنسی مزاح کو اس کے سادہ ترین انداز میں پیش کرتی ہے۔

د:۔ بالغوں میں ہنسی کھیل کا یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ لہٰذا وہ ناخوشگوار اشیاء کو مزاحیہ رنگ میں دیکھنے اور اُن سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔" [1]

البتہ وزیر آغا کا یہ خیال صحیح ہے کہ مزاح کے ذریعہ انسان زندگی کی ناہمواریوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"خالص مزاح کے فروغ کے لئے زندگی اور اس کی ناہمواریوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرنا اور روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو کائنات کے وسیع تر نظام کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنا نہایت ضروری ہے۔" [2]

خالص مزاح کے لئے ایک خاص فلسفیانہ بے تعلقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا انسان جو دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہو اور جس کے لئے دنیا اور کاروبارِ دنیا ایک تماشہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ مزاح کی تخلیق آسانی سے کر سکتا ہے۔ یا پھر ایک ایسا انسان جو خوش رہنے سے زیادہ خوش کرنے کا فن جانتا ہو، وہ بھی مزاح پیدا کر سکتا ہے۔ مزاح انسان کی زندگی کو گوارا بنانے کے لئے ضروری ہے۔

---

[1] بحوالہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" از ڈاکٹر وزیر آغا ص ۲۵ [2] ...

اس لئے بھی کہ زندگی درد و غم سے معمور ہوتی ہے۔ جب زندگی میں درد و غم انسان کو یوں گھیر لیتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کو اس درد و غم سے محفوظ رکھنے کے لئے مزاح کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرائڈ نے کہا ہے کہ:-

"انسان درد و غم سے بچنا چاہتا ہے اور مسرت و خوشی کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس لئے مزاح اصل میں زندگی سے فرار کی بھی ایک صورت ہے۔"[1]

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے استاد محترم ڈاکٹر یوسف سرمست نے کہا ہے کہ:-

"مزاح یا خوشی زندگی کی حقیقت نہیں زندگی سے فرار کا ایک راستہ ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقت کی ٹریجڈی موت ہے۔ یہ اتنی مستقل اور اتنی مستحکم حقیقت ہے کہ جس سے کہیں بھی اور کسی طرح بھی مفر نہیں۔ انسان کی زندگی آغاز سے انتہا تک غم کی پرچھائیوں سے مملو ہوتی ہے۔ انسان روتا ہوا آتا ہے۔ اور رُلاتا ہوا جاتا ہے۔ حد درجہ خوشی میں بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں غم کا یہ استقلال صرف مسرت کو اہمیت ہی نہیں دیتا خود اسے زندگی بنا دیتا ہے۔"[1]

مزاح انسانی ذہن میں یا انسانی زندگی میں جو تازگی پیدا کرتا ہے اس سے متعلق حالی نے لکھا ہے:-

"مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، ایک سہانی خوشبو کی لپٹ، جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفر اور حکماء بلکہ اولیاء و انبیاء نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے۔"[2]

اس طرح سے مزاح زندگی اور ماحول میں، افراد میں، سماج میں، خوش دلی، خوش مزاجی اور زندہ دلی پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ مزاح سے زندگی میں مفاہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی زندگی میں جو کوتاہیاں، خامیاں یا خرابیاں ملتی ہیں۔ اُن کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور اُس کو خوش دلی اور ہنستے کھیلتے دور کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے مزاح ایک شائستگی اور تہذیب کی علامت بن جاتا ہے۔ انسانی تمدن میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزاح کی ترقی آہستہ آہستہ ہوئی اور انسان جیسے جیسے مہذب اور شائستہ ہوتا گیا، اس کی مزاح کی حس بیدار ہوتی گئی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"حسِ مزاح شائستگی کا تحفہ ہے۔ تہذیب افراد و اقوام کو اقدار کا ضابطہ اور توازن کا احساس قبول عام کی سند پاتا ہے۔ اور پوری قوم کا مزاح بن جاتا ہے۔ تو تنگ نظری کی بجائے وسعت نظر، ضابطہ پرستی اور کٹرپن کی جگہ خوش طبعی اور آزادئ فکر کا چلن ہوتا ہے۔ تو حس مزاح کی بنیاد ہے۔"[1]

مزاح میں یہی وجہ ہے کہ ہمدردی کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ مزاح انسان کی دل جوئی کرتے ہوئے اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میلر کے نزدیک:-

---

[1] رسالہ "نگار" نیاز فتحپوری جنوری ۱۹۶۳ء مضمون ڈاکٹر یوسف سرمست ص۱۱، [2] "مقالات حالی" از حالی ص۱۳۹

"مزاح زندگی کے بارے میں وہ رجحان ہے جو زندگی کی خامیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لے کر اُن کو ہنسی اور کسی حد تک ہمدردی کے ساتھ واضح کرتا ہے"۔ ۱؎

مزاح کے ذریعہ صرف انسان تفریح ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ غیر محسوس طور پر اپنے خیالات کو بہتر انداز سے بدلتا ہے۔ ہاسن نے اسی وجہ سے کہا ہے کہ:۔

"مزاحیہ یا ظریفانہ ادب محض تفریح دماغ کا کام نہیں کرتا بلکہ تزکیۂ خیالات کا کام بھی انجام دیتا ہے"۔ ۲؎

اس طرح سے مزاح انسانی معاشرہ میں اور انسانی زندگی میں بڑے غیر محسوس طور پر اور انتہائی خوشگوار انداز میں تعمیری کام انجام دیتا ہے۔ پاٹس کے کہنے کے مطابق:۔

"مزاح ہمارے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس کو ہم نہ صرف انسانی معاشرہ میں منتشر طاقتوں کے خلاف بلکہ زندگی کے ان گوشوں کے خلاف بھی جو احساسِ شکست اور پریشانی حالی کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ آزما سکتے ہیں"۔ ۳؎

اس طرح سے مزاح کی اہمیت و ضرورت زندگی میں، معاشرہ میں، بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ مزاحیہ ادب زندگی کی قدروں کو بلند کرتا ہے۔ ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اُن کی تعمیر و تشکیل میں اہم حصّہ ادا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ادب میں مزاح کی ایک خاص اہمیت اور وقعت ہے

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

LASA
LASA SUPER BLEND

لسا چاکلیٹ چائے اور
لاسا اسپیشل چائے نے اپنے
۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ مکمل کر لیئے ہیں

۱؎ TAYLOR, W.H.- JONATHAN SWIFT P.264 ۲؎ بحوالہ "اردو شاعری میں طنز و مزاح" از محمد یونس نعیمی ص ۲۷ تا ۲۸،

اُونچی دُکان

ہمارے شہر میں ایک رئیس ہیں۔ نام ہے انیس کالے۔ چوں کہ امیر و کبیر آدمی ہیں اس لیے بڑی عالیشان کوٹھی ہے اور اسی مناسبت سے اس کی سجاوٹ بناوٹ رنگ و روغن آرائشی سامان اور فرنیچر ہے۔ اب یہ ایک اتفاق ہے کہ ہمارے گھر کے ہر فرد کے خواب اُن کی کوٹھی سے جا ٹکراتے ہیں۔ اور پھر یوں ہوا کہ ان کی طول طویل کوٹھی کی بنیادوں پہ ہم نے اپنے دو کمروں کے مکان کو فٹ کرنا شروع کر دیا اب آپ جانیئے کہ اینٹ پتھر کے مکان کو ربڑ کی طرح تو کھینچنے سے رہے نتیجہ میں ہر دفعہ ہمارے سروں پہ سے انڈوں کی ٹوکری گر پڑی۔

ایک بار جب اپنے گھر کی لُونا گی پلاستر جھڑی دیواروں کو کھرچ کھرچ کر چونے میں نیل ڈلوا کر سفیدی کروائی اور تین روپے میٹر کی جھر جھری سی جالی کے پردے لگے تو سعید بھائی نے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر کہا "بھئی واہ! اب تو گھر انیس کالے کی کوٹھی سے مقابلہ کر رہا ہے۔"

"بالکل! اور کیا۔ ۔ ۔ لگ ہی نہیں رہا کہ ہم اپنے گھر میں ہیں۔" نعمان نے فوراً تائید کی۔

"ارے بھئی انیس کالے بھی تو اسی دنیا کے انسان ہیں اور ہم بھی آسمان سے نہیں ٹپکے اور پھر اچھے انداز سے زندگی گزارنے کا حق ہر شخص کو ہے۔" بھائی جان زیادہ پڑھے لکھے تھے انہوں نے منطقی انداز پر وضاحت کی تو سبھی قائل ہو گئے۔ غرض تین چار روز تک گھر کا ہر فرد ننھے ٹیٹو سمیت بے حد خوش رہا اس خیال سے کہ ہمارے گھر اور انیس کالے کی کوٹھی میں اب معمولی ہی سا فرق رہ گیا ہے۔

لیکن چوتھے یا چھٹے دن (صحیح یاد نہیں) پڑوسی نے اپنی دیوار میں کیل ٹھونکی تو ہماری دیوار کا کچھ پلاستر پہلے ذرا اور پھر تقریباً ایک مربع فٹ جھڑ کر نیچے بیٹھے ٹیٹو کی گود میں آگرا۔ ٹیٹو پہلے تو ہڑبڑائے پھر چلا کر بولے "چچا جان چچا جان شاید دیوار گر رہی ہے۔"

"چپ بے ہودہ" ندیم میاں نے اسے ڈانٹا اس طرح کبھی دیوار گرتی ہے لیکن سب کی نظریں اس حصۂ دیوار پر تھیں جس نے پڑوسی کی چوٹ سے زخم کھایا تھا۔ ندیم میاں کے چہرے پر صدمے کے زیادہ آثار تھے کیوں کہ چالیس پچاس روپے خرچ کر کے گھر کو کوٹھی بنایا اُن ہی نے تھا۔ لہٰذا ان کا دل رکھنے کے لیئے پہلے پڑوسی کو گالیاں دی گئیں اور پھر سارے زمانے کو۔ پڑوسی کو بُرا بھلا کہنے کو ممی نے روک دیا کیوں کہ وہ ایک ہی بدمعاش آدمی تھا البتہ زمانے پر تبرّہ بازی میں سارا گھر با جماعت شریک ہوا۔

دوسرے دن ممی بازار سے پان میں کھانے والے چونے کے چار ڈبے لائیں اور دیوار کا زخم بھر دیا لیکن چونا کم پڑ جانے کی وجہ سے آس پاس کی دیوار کی سطح سے چونے والی جگہ اندر کو ڈبک گئی۔ جیسے کسی بھوکے انسان کا پیٹ کئی دن کی بھوک سے اندر کو ہو جاتا ہے۔ شام کو ندیم میاں کالج سے لوٹے تو دیوار کی اس عجیب و غریب صورت دیکھ کر بڑے دکھی ہو گئے۔ گردن جھکا کر چند منٹ کچھ سوچا کئے اور پھر اُٹھ کر باہر نکل گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک مربع فٹ لمبی چوڑی ایک سینری جو لکڑی کے فریم میں جڑی ہوئی تھی لے کر آئے اور دیوار پر اس جگہ لگا دی جو حصہ مستقل فریاد کر رہا تھا لیکن پلاستر کچھ اس بے تکے انداز پر ابھرا تھا کہ سینری کے داہنی طرف کھرچی ہوئی دیوار کی ایک نوک سی نکلی ہوئی تھی۔ اور صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ کھرچی ہوئی نوک صرف اسی صورت میں چھپ سکتی تھی جب سینری کا فریم تھوڑا سا ٹیڑھا لگایا جائے لیکن مشکل یہ تھی کہ ٹیڑھا فریم دیکھ کر ٹینو میاں کی ہنسی رکنے میں نہیں آ رہی تھی ایک ساتھ اٹھی اٹھی کئے جاتے تھے۔ جب ندیم میاں نے ذرا غصّے سے گھورا تو وہ اپنا منہ دبا کر اپنی ممی کی گود میں گھس گئے۔ میں نے ندیم میاں کا دل رکھنے کو کہا "سینری ہے تو اچھی یہ بات میں نے اس لئے کہی تھی کہ سینری بنانے والے نے ہر کسی کی ذاتی پسند کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ یعنی بل کھاتا ہوا دریا اس پر پُل، پُل پر دھواں اڑاتی ریل گاڑی۔ ریل سے دو انچ اوپر لکڑی کے پنکھوں والا وہ ہوائی جہاز جو رائٹر برادرز نے پہلی بار بطور مشق اُڑایا تھا۔ ہوائی جہاز سے ذرا سا ہٹ کر چودھویں کا چاند اور چاند کے عین نیچے کنواں، کنوئیں پر ایک البیلی مٹیار، دوسرے کنارے پر ایک بنگلہ اور اس کے سامنے بہتے پانی میں ایک بحری جہاز جس کے عرشے پر ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے مسافر۔ غرض سینری کے جس حصے پر نظر پڑتی تھی دل کو فرحت ملتی تھی اور دماغ کو طمانیت۔

بھائی جان نے بغور سینری کا معائنہ کیا اور بولے "آپ سے پہلے گھر میں کوئی ایسا فریم لگانے کا خیال ہی نہیں آیا حالانکہ انیس کالے کے ڈرائنگ روم میں آرٹ کے دو تین نمونے لگے ہوئے ہیں۔"

"مگر وہ کچھ سمجھ میں نہیں آتے۔" سعید بھائی نے آہستہ سے کہا۔

"ہماری یہ سینری تو سمجھ میں آ رہی ہے" نعمان نے پرجوش انداز سے کہا۔ "اس لحاظ سے ہمارا یہ فریم زیادہ بہتر رہا۔" ندیم نے کسی قدر دبے ہوئے لہجے میں کہا تو بھائی جان نے زور زور سے ہاتھ ہلا کر کہا "یقیناً.... یقیناً اس کی تو ایک ایک بات سمجھ میں آ رہی ہے۔" ندیم میاں کا چہرہ مارے خوشی کے سُرخ ٹماٹر ہو گیا۔ کہ کسی معاملے میں تو انیس کالے کو ڈی فیٹ دی۔

اگلے دن جو بھائی جان آفس سے لوٹے تو کمرے میں گھستے ہی خوشی سے بے حال ہو کر بولے "بھئی واہ! یہ صندوقوں

پر گدے بچھا کر صوفہ خوب بنا واقعی گھر میں ایک صوفے کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ سعید بھائی فخر سے پھول گئے کیوں کہ یہ کارنامہ انھیں کا تھا۔ بھائی جان نے چشمہ اتار کر بغور صوفہ کو دیکھا پھر چشمہ لگا کر سعید بھائی کو دیکھا اور کچھ رُک کر بولے "صندوق میں سے کپڑے نکالنے میں تھوڑی سی دشواری ہو جائے گی۔

"نہیں ـــ کوئی خاص نہیں ـــ سعید بھائی ذرا جھینپ کر بولے" رات کو سونے کے لئے تو گدے نیچے اُتریں گے ہی تبھی کپڑے نکال لیا کریں گے!" "بالکل ـــ یہ بہت مناسب رہے گا۔" نعمان نے تائید کر کے گویا سعید بھائی کو ڈھارس دی اور سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ مسئلہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے حل ہو جانے پر سب کے چہروں پر رونق سی آگئی۔ سعید بھائی نے فوراً ہی ایک لطیفہ سنایا اور ساتویں یا آٹھویں بار سننے کے باوجود اس پر سب بہت زور زور سے ہنسے۔

صاف گو ٹینو ایک دن ندیم میاں سے بولے چچا جان دوسری سنیری لائیے یہ والی ٹھیک نہیں ہے دیوار کا اکھڑا ہوا حصہ تو نظر آتا رہتا ہے۔

"چپ رہو ـــ تم بے کار کی خرچے والی باتیں مت کیا کرو۔ ندیم نے بُرا مانا تو بھائی جان نے ٹینو کو آنکھیں دکھائیں لیکن ٹینو ایک ہی فتنہ تھے بدلہ لینے کو بولے "پاپا خالی سنیری سے کیا ہوتا ہے انیس انکل کے گھر میں کھانا کھانے کی میز کتنی اچھی ہے جس پر جام جیلی مکھن اور بہت سارے فروٹ رکھے رہتے ہیں۔ اور ندیم میاں جیسے نیند سے چونک پڑے بھائی جان نے بھی سوچنے کے انداز میں کنپٹی بجانی شروع کر دی۔ نعمان نے جیسے ہی ماحول کو میز کے حق میں پایا تو ٹینو کی پشت تھپ تھپا کر کہا "یار ٹینو تم ہو بہت گہرے واقعی زمین پر بیٹھ کر کھانے سے پینٹ کی کریز بھی خراب ہوتی ہے اور سچ پوچھو تو کھانے کی قیمت آدھی رہ جاتی ہے" "یہ تو بات ہے ہی۔ سعید بھائی زور زور سے سر ہلانے لگے زمین پر بیٹھ کر کھانے میں مرغ بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا اور میز کرسی پر دال روٹی بھی لوگ فخر سے کھلا دیتے ہیں۔

اس وقت تو ندیم کچھ چپ سا ہو گیا کیوں کہ انیس کالے کا پلڑا پھر کچھ بھاری ہو گیا تھا۔ سعید بھائی کے جوش پر بھی کچھ اوس سی پڑ گئی تھی۔ لیکن تیسرے دن ندیم میاں گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک مزدور کے سر پر میز بھی تھی۔ سب نے حیرت سے ندیم کو اور پھر میز کو دیکھا۔ اپنا خواب اس طرح پورا ہوتے دیکھ کر سب کے چہروں پر ایک دم سرخی دوڑ گئی۔ ندیم میاں سب کے چہرے دیکھ کر خود کو ہیرو سے کم نہیں سمجھ رہے تھے۔ بھائی جان نے پلنگ پر لیٹے لیٹے غور سے دیکھا چشمہ اتارا پھر لگایا کچھ دیر اُسے ناک پر درست کرتے رہے ان کے ہاتھ مارے خوشی کے کپکپا رہے تھے۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے اوہو . . . . بھئی خوب . . . . واہ واہ کھلنے کی میز آئی ہے۔ ٹھہرو ندیم ذرا ٹھہرو میں آتا ہوں یہ کہہ کر وہ اٹھے اور ان کے پیچھے سبھی دوڑ پڑے کسی نے میز کی ٹانگ پکڑی کسی نے تختہ کو سہارا دیا کوئی مزدور کی کمر کو سہارا دینے لگا۔ عجب خوشی کا عالم تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھال کے . . . آہستہ ذرا دیکھ کے . . . ندیم میاں کی ہدایات ساتھ ساتھ جاری تھیں۔ اور پھر سب نے بہت سنبھال کر بڑے اہتمام سے پانچ سات منٹ میں میز کو نیچے رکھا۔ تازہ روغن کی ہوئی میز میں سے تارپین آئل کی تیز بو اٹھ رہی تھی، سعید بھائی بو کو نتھنوں میں ٹھونس کر بولے

"جب گھر میں کوئی نئی چیز آتی ہے تو ایک ننھی سی خوشبو پھیل جاتی ہے"
"کتنے کی ملی ۔۔۔؟" ابا نے میز کی خستگی دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔
"مہنگی ہی ملی ہے ۔۔۔" ندیم اپنی لائی چیز کو بے حد قیمتی گردانتے تھے۔
"اب میں اپنے کالج کا کام اسی پر کرلیا کروں گا۔ نعمان نے پیار سے میز پر ہاتھ پھیرا۔
"ہاں ۔۔۔ میں بھی اپنا ہوم ورک اسی پر کروں گا۔ ٹیپو بھی ٹپکے۔
"ابھی کچھ نہیں ہو سکتا ۔۔۔" ندیم میاں جو کافی دیر سے میز کا ایک کونہ پکڑے کھڑے تھے سب سے نظریں چرا کر بولے ...
"کیوں .... کیوں .... سب نے ایک ساتھ سوال کیا۔
"کیوں کہ یہ ابھی تین ٹانگوں کی ہے۔ ندیم نے چوتھی ٹانگ کوٹ میں سے اٹھا کر سعید بھائی کو دکھائی آپ تو کالج میں کارپنٹری بھی سیکھتے ہیں اسے اچھی طرح ٹھونک دیجئے ۔۔۔ یہ راستہ ہی میں نکل گئی۔
"یہ تو میں بھی کر دوں گا ۔۔۔ بھائی جان نے چشمہ آگے پیچھے کھسکا کر میز کی ٹانگ کو گھورا۔ جاؤ ٹیپو بھاگ کر بازار سے تین انچی کیل تو لے آؤ ابھی ایسی بنا دوں گا لوہا ہو جائے گی" ۔۔۔ ندیم کا چہرہ خوشی سے کھل رہا گیا۔
"بھئی اگلے اتوار کو انیس کالے صاحب کی دعوت ہونی چاہیئے۔ بھائی جان نے سب کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھا۔"
"ہاں اور کیا، اب تو ڈائننگ ٹیبل بھی موجود ہے اور پھر تین کرسیاں بھی پہلے ہی سے گھر میں موجود ہیں۔" نعمان نے کہا اور بھابی آپ بریانی پکائیے گا۔"
"لیکن ہم تو گھر ہی کے آٹھ ممبر ہیں۔" سعید بھائی فکرمندی سے بولے۔
"دو اسٹول بھی تو موجود ہیں ۔۔ ٹیپو بھی بولے۔
"اوہ تو کوئی ضروری ہے کہ سب ایک ہی وقت میں کھانا کھائیں اور سوائے اتوار کے تم سب تو یوں بھی الگ الگ ہی کھاتے ہو۔ ممی سمجھایا تو سب کی سمجھ میں آگیا۔ کہ قسطوں میں کھالیا جائے گا یا کچھ ممبر نیچے بیٹھ جایا کریں گے۔
غرض دوپہر کو کھانے کا پروگرام اسی میز سے متعلق رہا۔ بھائی جان ہتھوڑی اور کیلیں لے کر میز پر ٹوٹ پڑے اب شامت یہ آن پڑی کہ کون سے پانچ افراد میز پر بیٹھیں۔ بہت غور و فکر کے بعد سعید بھائی، میں اور ٹیپو نیچے بیٹھ کر کھانے کے لئے چن لئے (ٹیپو میاں کو ایک کیڈبری کا لالچ دیا گیا) ابا، ممی، بھائی جان، بھابی، نعمان اور ندیم اوپر بیٹھے۔ ندیم بولا کہ ہر روز باری سے بیٹھیں میں نے پلیٹیں لا کر میز پر رکھیں تو ندیم نے ٹوکا "ذرا آہستہ رکھو میز ہے کوئی پہاڑ تو ہے نہیں کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے" میں نے غور سے دیکھا تو میز لرز رہی تھی۔
بہرحال پھر سب آکر بیٹھ گئے۔ بھائی جان اپنے آپ کو انیس کالے پوز کر رہے تھے۔ اسی طرح سب کی باتوں پر تکلیف مسکرانا، بار بار رومال سے ہونٹوں کے کنارے پونچھنا اور بڑی آہستگی سے نوالہ منہ میں رکھنا۔ ندیم ہر نوالے پر سب کے چ

کو دیکھتے اور پھر بڑے فخر و غرور سے سارے گھر پہ نظر ڈالتے۔ کھانا کافی خوش دلی کے ساتھ جاری تھا۔ ہم نے بڑی طمانیت اور سیری کے ساتھ دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور زور سے الحمد للہ کہتے ہوئے اٹھے لیکن ان کے ہا ایک جھٹکے سے ہوا میں جھول گئے کیوں کہ میز ٹانگیں پھیلائے زمین پر پڑی تھی اور بقیہ لوگ بڑے اطمینان سے کرسیوں اور اسٹولوں پر بیٹھے تھے جیسے یہی کچھ دیکھنے کی تمنا عرصے سے رہی ہو۔ ہاتھوں میں سب کے نوالے ضرور تھے مگر سا سے پلیٹیں غائب تھیں۔

ٹینو نے پہلے کچھ بوکھلا کر ادھر اُدھر دیکھا اور اپنے سامنے پڑے چاولوں کے ڈھیر پہ غور کیا پھر اُن کا چہرہ سرخ ہ اور آخر قق قق... قق کر کے زبردست قہقہہ ابل پڑا۔ سعید بھائی جو اس حادثے کو ناگہانی ہی سمجھ رہے تھے بولے "بھئی ہ نے ہر معاملے میں ایمان داری سے انیس کالے کو شکست دینی چاہی تھی مگر یہاں انھوں نے ہمیں چاروں خانے چت کر دیا"!

نامور مزاح نگار یوسف ناظم

کے مضامین کے دو مجموعے

فقط ○ البتّہ

قیمت: ۸ روپے قیمت: ۱۰ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل فرمائیں

جوہر سیوانی

کون کہتا ہے کہ شیخ اپنے نہاں خانے میں ہے
وہ تو اسمگلنگ میں پھر پکڑا گیا تھانے میں ہے

میکشوں کی جنت الفردوس میخانے میں ہے
اور جنت ہر جُواری کی جوا خانے میں ہے

پی رہے ہیں عالمِ مستی میں حضرت جھوم کر
آج کل تو شیخ جی کی توبہ پیمانے میں ہے

سر کسی حجام کے آگے کبھی جھکتا نہیں
کم سے کم یہ فائدہ تو ہپّی بن جانے میں ہے

ملک میں ہو امن تو اہلِ سیاست کی ہے ہار
جیت اُن کی نفرتوں کی آگ بھڑکانے میں ہے

آپ جب اُترے ہیں میدانِ سیاست میں جناب
آبرو تو یہ الکشن جم کے لڑ جانے میں ہے

جال میں پھنسنے چلی آتی ہیں چڑیاں خود بخود
کھینچنے کی کتنی طاقت جال کے دانے میں ہے

سو رہے ہیں اب محلے والے شب میں چین سے
خوف تھا چوری کا جس سے بند وہ تھانے میں ہے

گیسوؤں کو آپ نے زنجیر پہنا دی ہے کیوں
گیسوؤں کی شان مثلِ موج لہرانے میں ہے

چور بھی چاہے چُرانا تو چرا سکتا نہیں
آپ کی یادوں کی پونجی دل کے تہہ خانے میں ہے

زندگی کی زُلف کیا سُلجھائے گا وہ آدمی
منہمک جو گیسوئے محبوب سلجھانے میں ہے

چیخ کر اسٹیج پر پڑھنا ہے ہوٹنگ کا سبب
کامیابی تو ترنم سے غزل گانے میں ہے

ایک اک شاعر سرِ محفل ہوا جاتا ہے ہوٹ
اِس قدر تاخیر کیوں جوہر کے اب آنے میں ہے

○

نشاط امروہوی

گلے میں ڈال کے پستول، وہ مرے گھر کے
لگا رہا ہے جو چکّر ضرور گڑبڑ ہے

زمانہ کہتا ہے جس کو غلام جورو کا
کھڑا ہے گھر کے وہ باہر ضرور گڑبڑ ہے

بر اجمان تھا کُرسی پہ جو وزارت کی
نچا رہا ہے وہ بندر ضرور گڑبڑ ہے

جو سیر کرتا تھا بگھی میں آٹھ گھوڑوں کی
چرا رہا ہے وہ خچّر ضرور گڑبڑ ہے

ہماری شکل اُتاری تھی جس نے شیشے میں
دکھا رہا ہے وہ پتھر ضرور گڑبڑ ہے

نشاط جس نے نوازا تھا دستِ شفقت سے
وہی ہے جیل کے اندر ضرور گڑبڑ ہے

بانو سرتاج
★
(چندراپور)

کرائے کا مکان

ہمیں ریسٹ ہاؤس پہنچے آدھا گھنٹہ ہوا تھا کہ ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر دس منٹ پر ہمارے نام فون آنے لگے.... جی نہیں.... ہم یکایک کوئی اہم شخصیت نہیں بن گئے تھے بلکہ ہمیں کرائے پر مکان چاہیئے تھا..... شوہر نامدار کے ٹرانسفر کا آرڈر ملتے ہی ہم نے اُس شہر کے اپنے اور ان کے تمام دوستوں، شناساؤں اور محکمے کے متعلقہ اشخاص کو مکان تلاش کرنے کے لئے لکھ دیا تھا۔ ہمارا خیال تھا (اور ہے) کہ اس کل یگ میں سچا دوست پہلے ہی مل جائے اچھا مکان نہیں ملتا۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانا مکان چھوڑنے اور نیا مکان ڈھونڈنے میں ہمیں کم و بیش ایک ہی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

ہمارے ٹرانسفر کی خبر یا یوں کہیئے کہ ایک مکان خالی ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے اور پوچھنے لگے...." آپ کب جا رہے ہیں ؟" (مکان کب خالی کر رہے ہیں ؟)

"ارے آپ گئے نہیں ؟" (خواہ مخواہ مکان پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں)

"کیا آپ نے مکان کسی دوسرے کو دلوا دیا ؟" (رشوت لے کر مکان کا سودا تو نہیں کر لیا ؟)

"آپ کو وہاں مکان مل گیا ؟" (یہاں سے سدھارئیے کسی طرح)

"آپ کو تو وہاں گورنمنٹ کوارٹر ملے گا ؟" (یہاں کسی کا حق کیوں مار رہے ہیں آپ)

تنگ آکر راتوں رات سامان پیک کر کے نئے شہر کی طرف کوچ کیا۔

بڑے شہروں میں گورنمنٹ کوارٹرس کے الاٹمنٹ کا حال نہ پوچھئے۔ جب تک نمبر آتا ہے تب تک افسر کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔ نئے کوارٹر تعمیر ہوتے ہیں کلاس تھری اور کلاس فور کے لئے اور ان میں گھس جاتے ہیں کلاس ون اور کلاس ٹو آفیسر کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔

شوہر نامدار کے اور ہمارے خیر خواہوں نے ریسٹ ہاؤس میں آکر جن مکانات کی نشاندہی کی انھیں ہم نے تین حصّوں میں تقسیم کیا . . . .

نمبر ایک ! جن کے ملنے کی اُمید ہے۔

نمبر دو ! جن کے ملنے کی قطعیٔ اُمید نہیں۔

نمبر تین ! جن کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

جن مکانات کے ملنے کی اُمید تھی انھیں پھر تین حصّوں میں رکھا۔

نمبر ایک ! جو معقول ہیں لیکن کرایہ بہت ہی نا معقول ہے۔

نمبر دو ! جو قطعیٔ نا معقول ہیں پھر بھی کرایہ بہت زیادہ ہے۔

نمبر تین ! جن کا کرایہ مناسب ہے اور مکان بھی عمدہ ہے۔

تیسری کیٹگری میں سے کچھ چنندہ مکانات کو دیکھنے کی مہم ہم نے شروع کی اور چوتھا مکان ہمیں پسند آگیا۔ مکان ہوادار اور کشادہ تھا۔ اچھی لوکیلیٹی میں تھا۔ کرایہ واجب تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مالکِ مکان بات چیت سے نہایت مہذّب اور معقول آدمی معلوم ہوتا تھا۔

شہر سے باہر ایک پُر فضا مقام پر ایک کالونی میں تھا یہ مکان قرب و جوار میں شاپنگ سنٹر، بیوٹی پارلر، لیڈیز کلب، مٹن اور سبزی مارکٹ، بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ سہولت کی ہر 'دُکان' مُہیا تھی۔ سائیں بابا کا ایک نہایت عالیشان مندر زیر تعمیر تھا اور اپنی ناتمام حالت میں بھی زائرین کی خاصی تعداد کے لئے توجہ کا مرکز تھا۔ ہمیں مکان میں شفٹ ہوئے دس روز ہوئے تھے کہ ایک روز شام ۵ بجے ہم نے دستک سُن کر دروازہ کھولا تو ہماری مکان مالکن دس بارہ عورتوں اور بیس پچیس بچوں کے جلوس کی قیادت کرتی ہوئی دکھائی دیں۔ ہمیں خیال ہوا مکان خالی کرانے کو مورچہ لے کر تو نہیں آگئیں۔ مگر اُنہوں نے باچھیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے ہماری غلط فہمی دور کر دی . . . بولیں "بہن جی، ہم سب سائیں بابا کے مندر میں ڈبّہ پارٹی پر آئے تھے۔ یہ سب ہماری سہیلیاں، سجا، کی مسنٹر (ممبر) ہیں۔ ہم نے سوچا ان لوگوں کو اپنا گھر دکھادیں۔" "ضرور ضرور . . ." ہم نے بے حد خوش دلی سے اُن لوگوں کا استقبال کیا۔ پچیس پچاس گلاس شربت تیار کر کے پلایا اور ننھے مُنوں کو ٹافیاں دیں۔

مکان مالکن کی سہیلیوں نے ڈرائنگ روم سے لے کر لیٹرین تک اور کچن روم سے اسٹور روم تک تمام کمروں کا باقاعدہ انسپکشن کیا۔ بس کچن کے ڈبوں، الماری کے خانوں اور میز کی درازوں میں جھانکنا باقی رہ گیا تھا . . . . خدا خدا کر کے وہ لوگ رخصت ہوئیں تو گھر ہمیں سونا سونا لگنے لگا . . . . بس ایسا لگتا تھا کہ لڑکی کی رخصتی کے بعد دوسرے مہمان بھی بہ عجلت تمام روانہ ہو گئے ہوں۔

دو تین روز بعد مکان مالکن صاحبہ کے پھر درشن ہوئے . . . "یہ میری موسی کی جٹھانی کی بھتیجی بہو مالتی ہے . . . . یہ مالتی کی ساس اور یہ مالتی کی نند کی ساس ہمارے گھر مہمان آئے تو کہنے لگے اپنا مکان دکھاؤ۔ سو ہم انھیں لے آئے جی"۔

حالانکہ ہم بار بار خانہ تلاشی دینے کو تیار نہ تھے پر کیا کرتے کرایہ دار تھے۔ تلاشی کے لئے ہری جھنڈی دکھادی اور ہماری سانسیں کر کس کر شروع ہوگئیں۔ وقفے وقفے سے اُن کے ریمارکس ہمارے کانوں میں پڑ رہے تھے.... کچھ اس طرح......
ہلکے رنگ کے ٹائلس لگے۔ خوبصورت ہیں پر بچوں والے گھر میں تو گہرے رنگ کے ٹائلس لگوانا چاہئیے تھا.... نئے فیشن کے گھروں میں پوجا گھر کا طاق اوپر بنوانا چاہئیے تھا... سامنے کا آنگن بڑا رکھ کر کیا فائدہ ہوا؟ پیچھے کا آنگن بڑا رکھا ہوتا تو سبزیاں لگائی جاسکتیں... باتھ روم میں ٹائلس کیوں نہیں لگوائے؟ مکان کیا بار بار بنتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ....

دو گھنٹے بعد مکان کی سیاحت سے جب وہ لوگ لوٹیں تو ہم اکیا ون بار دل ہی دل میں طے کر چکے تھے کہ اب مکان مالکن کو اس دھاندلی کی اجازت آئندہ ہرگز نہیں دیں گے۔ ہم نے شوہر نامدار سے کہا..."آپ مکان مالک سے شکایت کریں۔ اپنے مہمانوں کو لاکر ہمیں ڈسٹرب کرتے ہیں یہ اچھی بات ہے کیا؟" وہ بولے..."بڑے ارمانوں سے مکان بنوایا ہے۔ اپنی خوشی میں سب کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔"

"خود ہی آکر کیوں نہیں رہ جاتے یہاں؟ پھر چاہے جس کو انٹرٹین کرتے رہیں۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ دس روز سکون سے بیتے ہوں گے کہ پھر ایک دن گیارہ بجے ہماری مکان مالکن اپنی بیٹی اور چار نواسے نواسیوں کو لے کر آدھمکیں... آتے ہی ریکارڈ کی طرح بجنے لگیں...."بہن جی یہ میری بیٹی مینا ہے۔ مینا کی چھوٹی بیٹی پیٹ میں تھی تب مینا یہاں آئی تھی۔ اپنے مکان کا سلیب ڈال رہا تھا اُن دنوں... گرہ پرویش کے سمے بے چاری آ نہیں سکی کیوں کہ بٹیا انہی دنوں پیدا ہوئی تھی۔ اب آئی ہے تو ضد کرنے لگی... اماں نئے مکان میں لے چلو.... ایک دن وہاں رہوں تو چین آئے..."

ہماری جان نکل گئی کھانا بن چکا تھا۔ ہم باورچی خانے کے کاموں سے ابھی ابھی فارغ ہوئے تھے.... نیم مُردہ سے کچن میں پہونچے اور اُن سب کے لئے کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوگئے... اچانک چھن کی آواز پر دوڑ کر ڈرائنگ روم میں پہونچے تو دیکھا شیشے کا ایک قیمتی گلدان شہید ہو چکا ہے۔ بچوں کو ہلکے سے سرزنش کر کے لوٹے تو سبزی جل چکی تھی... جھنجھلا کر دوسری سبزی نکالی تھی کہ پھر ایک دھماکا ہوا.... پھر جھنجھناہٹ.... چیخ.... شور....

شام کو ہنستے چہرے سے انہیں الوداع کہنے کے بعد مکان کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کل جمع دو گلدان اور تین گلاس ٹوٹے ہیں۔ ایک ٹیوب لائٹ فرش پر ریزہ ریزہ پڑی اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے والی دیوار پر ہماری امپورٹیڈ لپ اسٹک سے بھالو اور بیل کے بڑے بڑے سر بنے ہیں۔ آنگن کے حوض کا نچلا منہ غائب ہے... حوض خالی ہو کر آنگن کو سمندر میں بدل چکا ہے۔ فریج میں دودھ کی بوتل سے دودھ غائب ہے اور پودوں کے تمام پھول ٹوٹے پڑے ہیں۔

ہمارا دل جل کر خاک ہوگیا۔ ہماری آہیں دوسرے روز مکان مالک کو ہمارے در پہ لے آئیں۔ ہم نے اُن سے شکایت کی۔ بولے...
"کون جی؟ کون سے لوگ؟"
"وہی جنھیں آپ لوگ مکان دکھانے لاتے ہیں۔"

"ہم کہاں لاتے ہیں جی؟"

"آپ کی شریمتی جی تو لاتی ہیں!"

"کس کو لائیں؟" انہوں نے معصومیت سے پوچھا۔

"آپ کے محلے کی پوری پول کو لائیں۔"

"کون سی پول جی؟"

"ارے وہی اڑوس پڑوس کی ساری خواتین ....." ہم نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"خواتین یعنی کون؟ ہم سمجھے نہیں جی؟"

"ہم چڑ گئے۔" آپ کے گھر کے آزو باز و کی گیتا بائی، دتسلا بائی، بھترا بائی.... وغیرہ....

"اِن ناموں کی تو خاص ہمارے محلے میں کوئی استری نہیں ہے جی؟"

"تو دوسرے محلوں سے پکڑ کر لاتی ہوں گی؟" ہمارا غصہ اپنی حد پار کر رہا تھا۔

"ہماری شریمتی جی کو اتنا ہی کام ہے کیا؟" وہ تیور بدل کر بولے۔

"اور نہیں تو کیا کام ہے؟ اُس دن بھی اپنی جیٹھانی کی بہو کی ساس نندوں کی بارات لے کر آئی تھیں؟"

"کیا کہتی ہیں جی۔ ہمارا تو کوئی بڑا بھائی نہیں ہیں؟"

"اف وہ! ہم کیا آپ کے خاندانی رشتوں پر ریسرچ کر تے بیٹھے تھے۔ ہوگی کوئی رشتے کی جیٹھانی۔ کچھ ایسا ہی رشتہ بتایا تھا۔ ہمیں یاد نہیں۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔ تین بھائیوں میں ہم اکیلے پتر جنمے ہیں جی؟" وہ شان سے بولے۔

"پھر اُس دن آپ کی شریمتی جی آپ کی بیٹی اور چار بچوں کو لے کر آئیں؟"

"اِس! چار بچوں کو لے کر آئی؟ ہماری بیٹی مینا؟" انھوں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں.... ہماری کراکری توڑ دی.... پودے برباد کر دیئے.... ڈریسنگ ٹیبل کے سامان کا ستیاناس کر ڈالا۔"

"اوہ!" مالک مکان کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

لوہا گرم ہوتے دیکھ کر ہم نے لہجے کو اور زیادہ پُر تاثر بناتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بچوں کے کھلونے توڑ دیئے اُنہوں نے ... قلمدان کی سیاہی اوندھا دی .... بیڈ روم کی اُجلی چادروں پر پاؤں کے نقش اتار دیئے....." وہ بدستور کسی سوچ میں گم تھے ... سر اُٹھا کر پوچھا۔ "مینا کے ساتھ دو لڑکے دو لڑکیاں تھیں؟"

"نہیں تین لڑکے ایک لڑکی تھی۔"

"سب سے بڑا بچہ کون تھا؟"

"لڑکا تھا۔"

"ارے وہ کہاں گئی پھر؟"

"گھر گئی اور کہاں جاتی؟ ہمارا سبجا سجایا گھر الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور پوچھتے ہیں کہاں گئی۔ کیا ہمارے گھر مستقل رکھنے کا ارادہ تھا انھیں۔" ہم جلے کٹے لہجے میں بول گئے۔ "وہ بات نہیں بہن جی۔" وہ اپنی توند سنبھالتے کھڑے ہو گئے۔ "مجھے فکر اس بات کی ہے کہ مینا کی بڑی لڑکی کہاں گئی؟۔ پانچ بچے ہیں اس کے۔ آخر اُسے کہاں چھوڑ آئی ہوگی وہ ...؟"

ہم نے سر تھام لیا۔

اب ہم اپنے فرصت کے اوقات میں ٹیلیفون نزدیک لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک بار پھر اپنی جان پہچان کے سب لوگوں سے کہتے ہیں ... کوئی مکان خالی ہو تو بتاؤ ... لیکن خیال رہے۔ ہمیں وہ مکان چاہیئے جس کا مالک دوسرے شہر میں رہتا ہو!

●●

سلسلہ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد

ممتاز مزاح نگار

پرویز یداللہ مہدی کے مضامین کا تازہ مجموعہ

ٹائیں ٹائیں فش

گیارہ پُر از مزاح دلچسپ مضامین۔

صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۱۵ روپئے

مجلد خوبصورت ڈسٹ کور کیساتھ

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے۔

نامور مزاح نگار

خواجہ عبدالغفور

کے مضامین

سمن زار

قیمت:

۸ روپئے

غزلیں

عقیل ظریف

نئے ماحول پہ ڈسکو کی گھٹا چھائی ہے — شہر میں اپنے یہ باہر سے وبا آئی ہے

اس نئے دور میں درزی کی بھی بن آئی ہے — ایک پتلون کی سو روپئے سلوائی ہے

نہ تو ہمدرد ہے سالا نہ کوئی بھائی ہے — مطلبی دور ہے ہر فرد تماشائی ہے

پینا کھانا کبھی چھوڑا ہے کسی نے یارو — خواہ مخواہ بھائی نے کل جھوٹی قسم کھائی ہے

ہم کو آپس میں لڑا دیتی ہے ظالم اکثر — بازو بنگلے میں پڑوسن جو نئی آئی ہے

باپ سے لڑتے تھے اب بیٹا ہے حاوی اُن پر — بھائی نے اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے

دودھ میں پانی نہیں، پانی میں ہے دودھ شریک — اصلی مسکہ کہیں ملتا ہے نہ بالائی ہے

دیسی صنعت کے پرستار ہیں وہ بھی لیکن — خاص ان کے لیے باہر سے گھڑی آئی ہے

آخری ہفتے میں تھا گھر میں خزاں کا منظر — پہلی تاریخ سے پھر گھر میں بہار آئی ہے

آر سی سی کا یہ گھر ہے کہ کبوتر خانہ — نہ تو دالان ہے اس میں نہ ہی انگنائی ہے

شاعری کھیل نہیں ہے کوئی بچوں کا ظریف
ترے اشعار میں بس قافیہ پیمائی ہے

رؤف رحیم

ہے بوجھ جو دل پر اُسے کم کرتے رہیں گے — شاعر ہیں تو ہر ناک میں دم کرتے رہیں گے

یہ پارٹی اچھی ہے نہ وہ پارٹی اچھی — لیڈر کو ضروری ہے اودھم کرتے رہیں گے

چولہا ہی جلانا ہو کہ بچوں کو سُلانا — جو حکم دے وہ تیری قسم کرتے رہیں گے

احباب کو لے ڈوبیں گے احوال سُنا کر — وابستوں کو وابستۂ غم کرتے رہیں گے

لے آئیں گے سامان کو کسٹم سے بچا کر — اس طرح سے ہم سیرِ حرم کرتے رہیں گے

بیٹے جو چلے جائیں گے سسرال کے گھر کو — ہم باپ ہیں اولاد کا غم کرتے رہیں گے

یہ روزِ ملاقات ہی معلوم تھا ہم کو — معشوق جو ہیں آپ ستم کرتے رہیں گے

ناقوس ہیں مندر میں نہ مسجد میں اذاں ہے — بس تذکرۂ دیر و حرم کرتے رہیں گے

اوزان سے خارج ہو کہ معیار سے باہر — کچھ بھی ہو غزل ہم تو رقم کرتے رہیں گے

انیس احمد خان
(نئی دہلی)

"اور بھی غم ہیں ......"

ہمارے ملک میں ایندھن کے روپ میں چار چیزیں کام میں لائی جاتی ہیں .... لکڑی، کوئلہ، مٹی کا تیل اور ہر بجن —— ویسے گیس اور بہوئیں بھی اسی میں گنی جاتی ہیں۔ لیکن گیس کم ملتی ہے اور بہوئیں .... لوگوں کا گھریلو معاملہ ہے۔

کیا کہا ...... آپ کو ہماری بات پر یقین نہیں آرہا ہے ......

مگر صاحب ہمارے گاؤں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ...... گرمی کی ایک شام جب ٹھاکر دیوان سنگھ کے سر پر بھنگ کا آدھ پاؤ وزنی گولہ گھومنے لگا تو انہیں اپنی غریب رعایا کی فکر ستانے لگی اور یہ سوچ کر کہ سکھئی چمار کل سے اپنی مجوری کے واجب دام مانگ رہا ہے اور وہ اسے اتنا دے نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ ان کے کل کی ریت تھی کہ پیڑھیوں سے جو روایات چلی آرہی تھیں انہیں توڑا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ سکھئی چمار پردادا کو ان کے زمیندار پردادا جو ایک پیسہ روز بیگار دیا کرتے تھے اتنا ہی ٹھاکر دیوان سنگھ سکھئی چمار کو دینے پر مجبور تھے۔ لہٰذا اپنی اس مجبوری پر ان

کی آنکھیں بھر آئیں۔ جب یہ غم انھیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں ہوا تو وہ اپنے چار پانچ کارندوں کو ساتھ لے کر لٹھ اور سکھی چمار کے گھر جا پہنچے۔ اپنے کارندوں سے اس کی جوان بیوی کو گھر سے باہر نکلوایا اور سکھی چمار کو گھر کے اندر ہی بند کر دیا اور کہا۔

"ابے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سکھی۔ تو بے گار اور دھاڑی جیسی معمولی چیزیں مجھ سے مانگتا ہے جو کہ میں تجھے اپنی چند مجبوریوں کی وجہ سے دے نہیں سکتا۔ مگر آج میں تجھے "موکش" جیسی انمول شئے پردان کرتا ہوں جو تیرے سارے سکھ اور سارے دکھ ہر لے گی۔

یہ کہہ کر سکھی چمار کی جھونپڑی میں آگ لگا دی۔

زمیندار دیوان سنگھ کے اس 'نروان پروگرام' میں سکھی کے گھر کے ساتھ ساتھ آدھی ہریجن بستی جل کر خاک ہوگئی۔ اور تقریباً اتنے ہی ہریجنوں کو 'موکش' نصیب ہوا۔ جو باقی بچے ان میں سکھی کی جوان بیوی بھی تھی جس کو زمیندار صاحب نے رحم کھا کر اپنے گھر میں ڈال لیا۔

اس 'بہتی' میں ہاتھ سینکنے کے لئے ہمارے نیتا بھلا کب پیچھے رہ سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے برسوں سے سوئے ہوئے معمولی سے گاؤں میں آمد و رفت کی ایسی ریل پیل مچائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مقدس مقام بن گیا۔

یہ سب دیکھتے ہوئے مقامی پولیس کو نیتاؤں کے خیر مقدم اور ان کی حفاظت کی خاطر وہاں ایک عارضی کوتوالی قائم کرنی پڑی۔ خوانچے والوں نے شہر سے آکر خوانچے بچھا لئے۔ اور تمبو شامیانے والوں نے روز ہونے والے جلسوں کے پیشِ نظر گاؤں میں اپنی ایک برانچ قائم کر لی۔

مگر اس دن گاؤں میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رونق تھی۔ حکومت کے ایک بہت بڑے نیتا تشریف لا رہے تھے ـــــ مقررہ وقت سے تقریباً آدھا دن کی دیر کے بعد وہ تشریف لائے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے جلی ہوئی ہریجن بستی پر تازہ رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ بطور خراج پیش کیا۔ اور سیدھے بھاگے اسٹیج پر چڑھ کر مائک پکڑ کر بھاشن دینا شروع کر دیا۔

اپنے حق پر مرنے والے سکھی چمار! اور دیگر چمارو۔ تمہارا پیارا راج دُلارا نیتا تمہیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ تم نے اپنی قربانی دے کر جو مثال قائم کی ہے اس کی ہم قدر کرتے ہیں اور اسی کے پیشِ نظر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جلد ہی یہاں پر ایک خوبصورت شہید سمارک بنوایا جائے۔ سرکار کی طرف سے یہاں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگا کرے گا۔ کیونکہ سے

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

تالیاں بج اٹھیں۔ تالیاں جب کچھ دیر بج چکیں تو انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر انھیں بریک لگانے کا اشارہ کیا

اور آگے کہا — "اے شہیدو! تم نے اس ناپاک دھرتی پر اپنا خون بہا کر اسے پاک کر دیا ہے۔ اس کے لیے ہم تمہارے بہت ممنون ہیں۔ تمہاری یہ قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور جلدی ہی اسی طرح آپ کے خون سے پورا بھارت مقدس مقام کی مانند پاک ہو جائے گا۔ اور پھر ہم تم پر ناز کر سکیں گے۔"

ان کی یہ لیڈرانہ تقریر جب حد سے تجاوز کر گئی تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑے ہو کر پوری قوت سے چیخ کر کہا۔ "محترم آپ جو کہہ رہے ہیں وہ تو ٹھیک ہے آپ سے پہلے آنے والوں نے تو اس میں غیر ملکی ہاتھ کا اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا اور کچھ تو اب تک اس غیر ملکی ہاتھ کا پتہ لگانے کے لیے غیر ملکوں کو بھی سدھار چکے ہوں گے مگر حضور آپ میں سے کسی نے اس غریب کی جوان بیوہ کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ زمیندار دیوان سنگھ اب تک دندناتا گھوم رہا ہے۔"

میرے الفاظ اسٹین گن کی تڑتڑاہٹ کی طرح ہواؤں میں گونج اٹھے۔ پورے مجمع میں ایک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ نیتا جی کچھ دیر کو سٹپٹائے لیکن فوراً چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے بولے . . . .

دوستو! اسے کہتے ہیں جمہوریت۔ ہمیں جو بات یاد نہیں تھی عوام نے یاد دلائی۔ ہم اپنی پیاری جنتا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور پولیس کو فوراً یہ ہدایت جاری کرتے ہیں کہ وہ فوراً سے بیشتر اور منٹ سے پہلے سکھئی چمار کی جوان بیوہ کا پتہ لگائے جسے ہم شہر لے جا کر ایک اچھی سی نوکری دیں گے۔ بعد میں زمیندار دیوان سنگھ کا دندناتا بھی بند کر دیں گے۔ جے ہند . . . . جے ہند۔!

اور وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس چلے گئے۔ میں بھی اپنے دل سے ذمہ داری کا ایک بہت بڑا بوجھ اتار کر نوکری پر شہر واپس آگیا۔ ایک دن میں دفتر جانے کے لیے پارلیمنٹ اسٹریٹ کے بس اسٹاپ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا . . . تبھی ایک جوان مگر پھٹے حال عورت آئی۔ وہ خوبصورت تو تھی مگر چوسے ہوئے آم کی طرح لجلجی اور گندی۔ آنکھیں کیچڑ سے بھری تھیں۔ بالوں میں دھول اور پسینے کی وجہ سے جوگیوں جیسی لٹیں بن گئی تھیں۔ اس نے میرے سامنے بھیک کے لئے ہاتھ پسار دیا۔ میری نظر جیسے ہی اس کے چہرے پر پڑی میں چونک گیا

"ارے تم . . . . تم تو سکھئی کی گھر والی ہو نا۔"

"ہاں بھیا! میں سکھئی کی گھر والی ہوں۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو نیتا جی نے . . . . . . ؟"

"ہاں بھیا! مجھے نیتا جی نے زمیندار کے گھر سے پولیس کے ذریعہ آزاد کرا دیا تھا۔ پولیس نے مجھے پندرہ دن تھانے میں رکھا اور ان پندرہ دنوں میں پندرہ سو مرتبہ میرے جسم کے ایک ایک حصے کو نوچا گیا۔ جب میرا جسم کسی قابل نہیں رہا تو پولیس نے مجھے شہر میں لا کر اسپتال میں بھرتی کر دیا۔ جہاں سے مجھے دو دن بعد ہی چلتا کر دیا گیا۔"

"مگر یہ تو سراسر ناانصافی ہے ......"

"ناانصافی کہاں بیٹا! یہ تو بھاگیہ کا لیکھا ہے۔ ویسے آج کل میری جندگی بڑے چین سے گذر رہی ہے۔ دن بھر بھیک مانگتی ہوں۔ کسی ڈھابے میں روکھا سوکھا کھالیتی ہوں۔ اور رات کو پھر اپنے بدن کا لالچ دے کر کسی بھی دکاندار سے اس کے تختے پر سونے کی جگہ مانگ لیتی ہوں۔ ہم جیسوں کو اور چاہیے بھی کیا۔ پیٹ بھر روٹی اور سر چھپانے کو .... اتنا کہہ کر اس نے روکھی ہنسی ہنس کر آنسو پونچھ لئے اور ہاتھ پسارے آگے بڑھ گئی۔

اس بات کو مہینوں گذر گئے۔ اس کے بعد چند اور جگہ ہریجن بستیوں کو اجاڑا گیا۔ انھیں زندہ جلایا گیا۔ میں نے یہ تمام خبریں اخباروں میں پڑھیں اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ اوراق پلٹ دیئے۔ کیونکہ...

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

**

ہند و پاک کے عظیم طنز و مزاح نگار شاعر رضا نقوی واہی کے فن اور شخصیت پر ماہنامہ

نکھارِ ادب ایک نادر تحفہ پیش کر رہا ہے۔

رضا نقوی واہی نمبر

★ اس نمبر میں رضا نقوی واہی کی شاعرانہ بصیرت، فکر و فن، ادبی مقام و مرتبہ اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر سیر حاصل مضامین کے علاوہ واہی صاحب کی بہترین اور معرکۃ الآرا نظموں کا انتخاب بھی شامل ہوگا۔

★ عمدہ کاغذ، اعلیٰ کتابت و طباعت اور خوبصورت پلاسٹک کور سے مزین

صفحات : ۲۰۰ قیمت : ۲۰؍ روپئے

منیجر **نکھار پبلی کیشنز** مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

بابو۔ آر۔ کے (ایم اے)
★
(مہاراشٹرا)

خرمستئ طبیعت

ہم نے ایک دن خوشگوار موڈ میں خرمستیاں کرنے کی ٹھانی۔ یوں سوچا کہ میاں باعزت۔ باوقار اور بااصول ہو کر تو بہت جی لیئے۔ خودداری۔ نیک نیتی اور راست گوئی کے تمام چولے پہن کر دیکھ لیئے لیکن زندگی بے کیف ہی رہی اس لئے کیوں نہ اب شاعر بن کر ہی اپنی مٹی خراب کرلی جائے۔ شاعری کے لئے طبیعت کو بہت رجوع کیا۔ خیالات کو مجتمع کر کے ایک آدھ شعر موزوں کرنے کی لاکھ سر توڑ سعی کی لیکن بات نہیں بنی۔ اب ان حالات میں سوچنا شروع کیا تو اس نتیجہ پر پہونچے کہ شاعری حالات اور ماحول سے متاثر ہو کر کی جاتی ہے۔ یہ خیالات اور احساسات کی ترجمان ہوتی ہے۔ داخلی کیفیات اور خارجی اثرات شعرگوئی میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔

اس لئے احساسات کو بھڑکانے تصورات کو جگانے اور خیالات کو ورغلانے کے لئے ہم نے شعر کے نزول تک بیگم کو سج سنور کر اپنے روبرو بٹھائے رکھنے کا ارادہ یوں کیا جیسے شیر کے شکار کے لئے گائے یا بکری کو بطور چارہ۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہم نے بیگم سے کہا۔ ارے بھئی سنتی ہو! اب ہم آج سے شاعر بن جانے والے ہیں۔ یہ سُن کر وہ حسب معمول چراغ پا ہو کر بھڑک اٹھیں۔ لے ہے۔ اب لے دے کر بس یہی تو کمبختی کا ایک پخ تم میں باقی رہا تھا سو اب وہ بھی لگا چاہتا ہے۔ کیوں اپنی دنیا بگاڑ کر عاقبت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ ذرا تو ہوش سے کام لو اور دنیا کے بیشتر شعراء کو تو دیکھو کہ بھلا ان میں سے کوئی سکھی یا مطمئن بھی ہے؟ ان میں کوئی معقول انسان ہونے کا دعویدار بھی ہے۔ ہم نے کہا خیر اب جو بھی ہو۔ صبر کرو۔ دنیا کی کوئی طاقت چاہے انٹی ہو یا ود مانی۔ ہمیں شاعر بننے سے نہیں روک سکتی۔ اس لئے اب بیگم آپ یوں کریں کہ بن سنور کر ہمارے روبرو مونالیزا کی قاتلانہ مسکراہٹ تاج کا شاہانہ غرور اجنتا کی مورتیوں کا دلکش روپ لئے خاموش ادائے دلبری کے ساتھ براجمان رہیئے اور پھر دیکھئے کہ اشعار کیسے پھوٹ پڑتے ہیں۔ آج اردو نظم ہماری ذات اور آپ کے سراپے کے طفیل مالامال ہوا چاہتی ہے۔ آج دنیا دیکھے گی کہ حقیقت میں اردو کا طلسم کیا ہوتا ہے۔ حافظ شیرازی اور سعدی کے ثنا خوانو۔ چھوڑو لپٹے ڈھکوسلے اور اب اس نومولود شاعر کے گُن گاؤ اور سر دھنو۔

کچھ دیر میں بیگم بن سنور کر آئیں۔ ہم نے جلوؤں کی فتنہ سازیوں اور حسن کی شعلہ سامانیوں کو احتراماً چور نگاہوں سے یوں

... لمحہ جل ہی نہ جائے۔ لیکن ان کے سراپے کی ہلکی سی جھلک کی تجلی ہی جملہ اوسان خطا کر گئی وہی گندے کپڑے۔ ہاتھوں آٹا دیمک کی طرح چپکا ہوا۔ چہرے پہ ہُو کا عالم۔ کاجل کا اہتمام اس طرح کہ آنکھوں سے بچ بچ کے تمام چہرے پہ نمایاں۔ لپ اسٹک ... استعمال لبوں کی حدود کو تھوڑی میں زبردستی یوں ضم کر گیا جیسے چین کے خود ساختہ نقشے میں تبت۔ وہ کہنے لگیں لیجئے حاضر اب شرمایئے غالب، مومن اور میر کی روحوں کو اور غزل کے آنسو رلایئے ان کے مداحوں کو۔ جی بھر کے خوب شعر موزوں کیجئے۔ بیگم ... طرح بن سنور کے آنے پہ طبیعت بُری طرح جھنجھلا اُٹھی۔ ہم نے کہا دیکھو ذرا عقل سے کام لو، ہمیں غزل کہنی ہے مرثیہ نہیں۔ بے سلیقے سے بن سنور کر ہمارے روبرو آؤ۔ ویسے تو ہم خود ہی سخت مشکل میں ہیں جو محبوبہ کا کام بیوی سے لے کر فن سخن کے جذبوں کو تاراج کر کے عصمت فن کو بے آبرو کر رہے ہیں۔ اس لئے اب تم پر یہ لازم آتا ہے کہ اگر تم محبوبہ نہ دکھائی دو تو کم از کم ... جیسی ہی یا اس کے اریب قریب سی کوئی شئے نظر آؤ اس قدر بھی تو نہ ڈراؤ۔ اس حالت میں تمہیں محبوبہ یا بیوی کہنا تو کجا عو... کہنا بھی صنفِ نازک پہ تہمت دھرنا ہوگا۔ اگر تمہارے بننے سنورنے کا یہی انداز رہا تو پھر شعر کیا خاک موزوں ہوں گے حافظہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

اسی دوران چاروں پانچوں بچوں کا غول یہ غل مچاتا بیگم پر چڑھ دوڑا کہ آج اپنے ابا اپنی امّی پہ شاعری کرنے ہیں۔ بچوں کی آمد نے سارے موڈ کا خانہ خراب کر دیا۔ غصے میں مٹھیاں بھینچ گئیں۔ ہونٹ کپکپا اُٹھے۔ بیگم کو کھا جانے والی ... سے دیکھا لیکن وہاں دیکھنے لائق تھا بھی کیا؟ وہی گندے اور بوسیدہ کپڑوں میں ڈھیلے ڈھالے غیر متناسب اعضاءِ قدیمہ ... پہ جھریوں کے جھولتے جھومر۔ بیگم کی اس حالتِ ملعونہ کو بغور دیکھتے ہوئے ہم نے کہا۔ بخدا اب تو تم آثارِ قدیمہ کی کوئی پرانی ... بوسیدہ عمارت محسوس ہوتی ہو اور تمہارے گرد چیلیں کرتے تمہارے یہ کالے کلوٹے بچے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ... یہ عمارت کے گرد ابابیلیں منڈلا رہی ہوں۔

بیگم بچوں کو ڈرا دھمکا کر اپنا آنچل درست کرتے ہوئے بڑے دُلار سے گویا ہوئیں۔ کہئے نا اب شعر۔ کر دیجئے نا ... شرما دیجئے نا اردو ادب کے دیو ہیکل شعراء کو۔ ہم نے غصے کو پیتے ہوئے کہا۔ بھاڑ میں جائے اردو نظم اور ... ہو تم بھی۔ غصے سے ہماری آواز کپکپا اُٹھی۔ تھوڑے توقف کے بعد بیگم سے مخاطب ہوئے کہ شعر تو ہم بعد میں کہہ ہی لیں گے لیکن اب سب سے پہلے تو تمہیں آثارِ قدیمہ کی نادر شئے Declare کر دے کے اس گھر سے اٹھوا دیں گے پھر ... کسی معقول محبوبہ کی تلاش کر کے شعر گوئی کے لئے سازگار ماحول پیدا کریں گے۔

سلیمان خطیب کا مستند کلام کیوڑے کا بن قیمت: ۱۵ روپے

غزلیں

مہمل لکھنوی

توقع غم گساری کی غلط ہے گورے گالوں سے
میں اپنا دکھڑا رو لیتا ہوں اپنے جیسے کالوں سے

محل میں اُن کے جتنے لیمپوں کے شیڈ دیکھو گے
انھوں نے سب وہ بنوائے ہیں میرے دل کے چھالوں سے

ہیر اسٹائل ان کا روز ہوتا ہے نئے ڈھنگ کا
ہم ہی محروم ہوتے جا رہے ہیں سر کے بالوں سے

مسائل حل کہاں ہوں گے کہ اربابِ حکومت جب
پکڑنا چاہتے ہیں مچھلیاں مکڑی کے جالوں سے

مرا مُنہ بند کرنا ہے تو کوئی عہدہ دے دیجئے
طریقہ یہ موثر ہے بہت گو دریچ کے تالوں سے

بہت ہی لو پریشر خون کے رشتوں میں ہوتا ہے
ملے دو بول ہمدردی کے رستہ چلنے والوں سے

رقیبِ سرخ رو نے رائے موسمیات کی لے لی
ہم اُن سے ملنے میں اٹکے نحس اور سعد فالوں سے

سمرقند و بخارا بخشنا آسان تھا حافظ
مرا محبوب تو ہے تِل کا لڈو اپنے خالوں سے

نصیب اچھا ہے اے مہمل کہ تو حمالی کرتا ہے
زمانہ فائیلیں اُٹھوائے ہے نازوں کے پالوں سے

محمد اصغر محی الدین جنید

جانِ من اب تجھے ہوا کیا ہے
تجھ میں ٹیئں کی یہ صدا کیا ہے

جان تجھ پر نثار کردوں گا
خالی مرنے سے فائدہ کیا ہے

پیار کرتے ہو پیار کی لے جنید
تم نہیں جانتے سزا کیا ہے

مجیب الرحمٰن بزمی

نہ دن کو چین نہ شب کو قرار گرمی میں
لباسِ جسم بنا خار دار گرمی میں

زباں سے کیوں نہیں ٹپکے یہ لار گرمی میں
کھلی فضا میں ہے بوئے اچار گرمی میں

لباسِ گرم تو بھاڑے پہ لے لیا تھا مگر
کہاں سے لاؤں میں پنکھا اُدھار گرمی میں

حیدر بیابانی

نصیحت پر تری میں عادتاً کرتا گیا ہاں ہُوں
مگر سر میں نہیں تھی کان پر کیا رینگ پاتی جُوں

محبت کی گرامر سیکھ آیا ہوں میں کالج سے
مرا کیا ہاتھ پکڑیں گے نرے جاہل میاں مجنوں

مرا کمرہ بنا ہے ماڈرن میوزک کا اک کیسٹ
کبھی کھٹیا کی ہے چرچوں کبھی بچوں کی ہے پاں پوں

تری عادت کہاں سے ہوگئی کتے کی دُم جیسی
زمیں میں گاڑ دو اس کو مگر نکلے وہ جُوں کی توں

وہ دعوت اک عداوت تھی شکم کیا سیر ہو پاتا
تھی اتنی مرچ سالن میں کہ میں کرتا رہا شوں شوں

نہاری کلیجے نہ مرغ و ماہی ہے
اے گرانی تیری دہائی ہے
سوکھی روٹی کبھی تو دلیہ کبھی
کیسی قسمت یہ ہم نے پائی ہے
اپنے حصّے میں اُبلی دال کا کف
ان کے حصّے میں گھی ملائی ہے
مل کے رہ تھانہ دار خالو سے
اس میں پیارے تیری بھلائی ہے
پینٹ بھی تنگ ہے بلوز بھی تنگ
نئے فیشن کی یہ سلائی ہے
شج گئے جوڑ جوڑ یکتاؔ کے
کیسی تم نے دوا پلائی ہے

یوسف یکتا

طالبؔ عرفانی

لو آج پی کے بھنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
گردش میں ہے پلنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
جس کو تمہاری گلیوں میں گاتے پھریں گے لوگ
آج ایسی اک دبنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
وہ اور ہیں جو کہتے ہیں تنہائی میں غزل
یارو بجاؤ چنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
یہ وقت مرثیوں کا نہیں کچھ تو سوچئے
کیوں کر رہے ہو تنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
زندہ ہوں میں تو غرق تھا لفظوں کی جھیل میں
تم کس لیے ہو دنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
خاموشیوں میں ایک بھی مصرع نہ ہو سکا
ہونے دو پھر سے جنگ غزل کہہ رہا ہوں میں
طالبؔ میں کیا کروں کہ میرے دوستوں کے ساتھ
بگڑے ہیں جب سے ڈھنگ غزل کہہ رہا ہوں میں

کرشن پرویز

گو نظامِ نو وطن میں آگیا فرق کچھ آیا نہیں اطوار میں
کوئی شنوائی نہیں ہوتی یہاں اس قدر اندھیر ہے سرکار میں
جب کیا انکار رشوت سے تو پھر کھوگئی فائل مری انبار میں
چند سکوں میں پھسل جاتے ہیں لوگ پختگی ہے کس قدر کردار میں
گرم ہے بازار رشوت کا یہاں
ڈوب جائے ہر صدا جھنکار میں

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں....
شہر حیدرآباد پر مضامین کا ایک نیا سلسلہ

ٹر رے فیک

عنوان پڑھنے میں آپ کو تکلیف اور جھنجھلاہٹ ہوئی ہوگی۔ ہمارے مضمون کا عنوان "ٹریفک" ہے۔ ہم نے دانستہ
ریر ٹریفک کو "ٹر رے فیک" لکھا ہے تاکہ حیدرآبادی ٹریفک کی صحیح کاغذی عکاسی ہو سکے۔ غلط املا کی طرح ہمارے
ہر کی ٹریفک بھی غلط، تکلیف دہ، مشکل، بے ہنگم اور TERRIFIC (خطرناک) ہوتی ہے۔

تیز اور سبک رفتاری ٹریفک کی شان ہوتی ہے لیکن حیدرآبادی ٹریفک کی بات ہی کچھ اور ہے تیز رفتاری دور
ہی ہماری ٹریفک کی کوئی رفتار ہی نہیں ہے تیز اور نہ ہی سست ہماری ٹریفک چلتی بھی نہیں بلکہ گرتے اٹھتے، سنبھلتے اور
م کرتے ہوئے رینگتی ہے اور اکثر اوقات رینگتے رینگتے تھک کر رُک جاتی ہے ٹریفک رکنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں لیکن
بیشتر ٹریفک بغیر کسی وجہ کے بھی رک جاتی ہے۔ ہمہ اقسام کی سواریاں مختلف سمتوں سے آپس میں بھڑ جاتی ہیں۔ ہر ایک
ی جلد نکلنے کی کوشش میں پھنس کر رکاوٹ کا باعث بن جاتی ہے۔ رکی ہوئی ٹریفک کو صاف کرنے کے لئے پولیس کے
، ہارن کے شور میں بے بسی اور لاچارگی سے سیٹیاں بجاتے ہوئے ہوا میں ڈنڈے گھماتے ہیں یہ منظر ہمیں گاؤں کی
لاتا ہے جہاں بعض اوقات مختلف سمتوں سے آنے والی بھیڑ، بکریوں کے جھنڈوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر
ہے مجبور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال شہر میں بھی پیش آتی ہے۔ جلوس، شادیوں کی باراتیں اور چند لوگوں
ساتھ چلنا بھی ٹریفک کے لئے وبالِ جان ہوتا ہے۔ چند ایک دلچسپ واقعات بھی ٹریفک کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ جیسے
الے خاں کا قوت باہ کے لئے حلوہ بیچتے وقت لوگوں کا جمع ہونا اور کھیل تماشا کرنے والوں کے اطراف بچے اور نوجوانوں کا
ا۔ شادیوں کے موسم میں ہمارے شہر میں ٹریفک کی ناکہ بندی کرلی جاتی ہے۔ وہ سڑک جسے آپ برسوں سے اپنے دفتر جانے
استعمال کرتے آرہے ہیں، اچانک شامیانے میں غائب ہو جاتی ہے اور "آیا بنا آیا ہریالا بنا آیا" والا ریکارڈ آپ کی
رنے لگتا ہے اس وقت آپ کو اس تقریب میں شرکت کرتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود کو جانا پڑتا ہے...
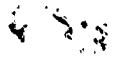
تک اپنے مقام کو پہونچنا پڑتا ہے۔ ہمارے شہر میں ملازمین دفاتر میں کام کرتے ہیں اور اپنے مطالبات منوانے کے لئے دفاتر کے آس پاس راستوں پر مظاہرہ کرتے ہوئے ٹریفک کی ناکہ بندی کرتے ہیں۔ طلباء کا حال کچھ اس سے زیادہ ہی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا شمار شہر کے اہم دفاتر کے سامنے سے گزرنے والی ٹریفک میں ہوتا ہے۔ اس سڑک پر ہفتہ میں چار دن ٹریفک بند رہتی ہے۔ دو دن بھوک ہڑتالی اور مطالباتی کیمپ ٹریفک کی رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ اب باقی رہا صرف ایک دن۔ اس روز شہر کا ... یہ چھرا ... ہوتا ہے۔

عام زندگی میں سوشلزم کا دور تک پتہ نہیں ہے وہ صرف ایک نعرہ بن کر رہ گیا ہے لیکن ہماری ٹریفک سوشلزم پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ بیل بنڈی کے پیچھے فیٹ کار بہ صد احترام رینگتی نظر آئے گی۔ ٹھیلہ کے ساتھ قدم ملا کر کئی ٹن بوجھ اٹھائے لاری چلتی دکھائی دے گی۔ رکشہ اور موٹر سیکل میں دوڑ ہوگی۔ ہم نے ایک وقت پیادے کے پیچھے ایک کار کو چلتے ہوئے دیکھا ہے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پانچ سالہ بچہ کا نمائش سے پلاسٹک کی گاڑی خرید کر رسی سے کھینچ لے جا رہا ہے۔ الغرض ہماری سوشلسٹ ٹریفک میں ہر قسم کی سواری (تیز اور سست رفتار، نئی اور پرانی، آرام اور تکلیف دہ، مسافر بردار اور مال بردار) ایک ہی رفتار سے ایک ہی سڑک پر چلتی نظر آئے گی۔ اکثر و بیشتر ہماری ٹریفک میں انسان اور جانور کا فرق مٹ جاتا ہے انسان کے ساتھ جانور بھی ٹریفک کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ہماری ٹریفک شور شرابہ والی ٹریفک ہے۔ پیادے سے لے کر ہر قسم کی سواری آواز کرتی ہے۔ بعض وقت ٹریفک کی آواز پر صور اسرافیل کا گمان ہوتا ہے۔ گھبرا کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بیل بنڈی، روڈ رولر کھینچتی چلی آرہی ہے۔ معمولی موٹر سیکل بھی ایسی آواز کرتی ہے جیسے مخالف ملک کا ٹینک دندناتا حملہ کرنے آرہا ہو۔ زور دار آواز سے کان کے پردے لرز اٹھتے ہیں آس پاس کی عمارتیں کپکپا اٹھتی ہیں۔ اس کے باوجود موٹر سیکل سوار اطمینان سے گاڑی میں لگے ریڈیو سے گانا سنتا اور سفر کا لطف اٹھاتا ہوا گزر جاتا ہے۔ ٹریفک میں سواریوں کے شور شرابہ کے علاوہ ہارن کی آوازیں بھی ہوتی ہیں۔ سنا ہے کہ غیر ممالک میں کسی کے پیچھے یا کسی کے لئے ہارن بجانا باعث تضحیک ہے اور ایک خطرناک صورتحال سے دوچار کرسکتا ہے۔ ہمارے یہاں کا دستور ہی نرالا ہے مختلف قسم کے ہارن مختلف اوقات اور مختلف سڑکوں کے لئے سواریوں میں لگے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی پسند اور عادت و اطوار کے لحاظ سے بھی چند ایک ہارن لگے ہوتے ہیں جنھیں وقت بے وقت ضرورت بلا ضرورت بجایا جاتا ہے بعض کے دوران ڈرائیور سب سے زیادہ ہارن کا ہی استعمال کرتا ہے۔ بعض وقت ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ہارن سواری میں نہیں سر پر بج رہا ہے۔

ہماری ٹریفک کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ سواریاں چلتے ہوئے ٹریفک کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑتی یا گراتی ہوئی گزرتی ہیں ہر سواری کم سے کم دھواں ضرور چھوڑتی ہے۔ بعض سواریوں کے انجن پر گیس پلانٹ کا گمان ہوتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ کبھی بھی سفید اور اجلے کپڑے پہن کر کھلے بند حیدرآباد کی ٹریفک میں نہ نکلیں۔ ہم سے اس طرح کی غلطی ایک وقت ہو چکی ہے۔

ں کا اشتہار بنے ایک سواری کے پیچھے اتراتے چل رہے تھے کہ انجن نے دھواں چھوڑا۔ کھانستے ہوئے ہم غبارِ ٹریفک سے نکلے
رنے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ سفید کپڑے تو خیر سے سیاہ ہو چکے تھے لیکن ہمارے چہرے کی رنگت بھی کئی دن تبدیل رہی۔
ار سواریاں دھواں چھوڑنے کے علاوہ اپنے مال کا کچھ نہ کچھ حصہ سڑک پر گراتی ہوئی گزرتی ہیں جس سے پیچھے آنے والوں کو کبھی
دئیے بچانا پڑتا ہے۔ چند ایک سواریاں تیل گرا کر اپنے پیچھے آنے والی ٹریفک کو چاروں خانے چت کرتی ہیں۔

پیدل ٹریفک کے لئے فٹ پاتھ بنے ہوتے ہیں۔ ہمارے شہر میں پہلے تو فٹ پاتھ ہیں ہی نہیں اور جہاں ہیں وہ قابلِ استعمال
دتے ہیں۔ فٹ پاتھ چلنے کے علاوہ ہر کام کے لئے ہوتا ہے۔ فٹ پاتھ پر کئی خاندان بسیرا کئے ہوتے ہیں۔ جانور باندھے جاتے
ڑیاں ٹھہرائی جاتی ہیں۔ دکان اور بازار لگائے جاتے ہیں کھیل تماشے دکھلائے جاتے ہیں۔ جلسے منعقد کئے جاتے ہیں
اکی جاتی ہیں غرض شہر کے فٹ پاتھ کسی طرح سے پیدل راہ گیر کے لئے قابلِ استعمال نہیں رہتے اسی لئے پیادے ٹریفک
ہنی سواریوں کے ساتھ خود بھی پریشان اور دوسروں کے لئے بھی دردِ سر ہوتے ہیں۔ ویسے اگر آپ فٹ پاتھ پر چلنا چاہتے
ہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چلتے چلتے چڈی، بنیے کی دکان کو پھاندنا ہوگا، طبلہ کی ٹکر سے بچنے کے لئے کٹ مارنا
نا، آرام کرتے ہوئے کتوں سے ہوشیار رہنا ہوگا، کہیں سے پھینکے ہوئے کچرے کو برداشت کرنا ہوگا، کسی کے پان کی پیک
سے رنگین کرنے ہوں گے، فٹ پاتھی دکانداروں سے بزنس خراب کرنے کی پاداش میں گالیاں سننی پڑیں گے اور فقیر سے پیر نہ
نے یا پکڑوانے کی کوشش میں فٹ پاتھ کی خاک چاٹنی ہوگی۔

ہمارے شہر کی ٹریفک ممنوعہ کام کرنے پر مصر رہتی ہے "نو پارکنگ" جگہ پر سواریوں کو ٹھہرائیں گے، غلط سمت سے راستہ
گے، ممنوعہ سڑکیں استعمال کریں گے، سڑک پار کرنے کے لئے منتخب جگہوں کا استعمال نہیں کریں گے، ٹریفک سگنل پر توجہ نہیں
ئے اور ہلمٹ نہیں پہنیں گے۔ اس طرح ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کو روکنے اور عوام کو قانون پر عمل کرنے کے
یفک پولیس کا محکمہ ہوتا ہے۔ یہ محکمہ سیٹی بجاتے، ڈنڈے لہراتے اور چالان کرتے ہوئے بھی ٹریفک کو ممنوعہ کام سے باز
میں ناکام ہے اسی لئے شاید اب ٹریفک پولیس "ٹریفک ویک" "ٹریفک پندرھواڑہ" مناتی ہے۔ اس دوران پولیس عوام
بجائیں کرتی ہے انھیں سمجھاتی مناتی ہے اور چھوٹے بچوں سے غیرت دلاتی ہے پھر بھی جیسے ہم نے کبھی نہ سدھرنے کی قسم
ا ہے۔

ٹریفک نقطہ نظر سے ہم نے عوام کو دو طرح کے خیالوں کا حامی پایا ہے ٹریفک برائے زندگی اور زندگی برائے ٹریفک۔ "ٹریفک
زندگی" خیال کے حامی محتاط قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر طریقہ سے اپنی زندگی کو ٹریفک سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔
کم سفر کرتے ہیں۔ ڈرائیونگ کے لئے دوسروں کی خدمات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اپنے ایک دوست کا تذکرہ
ہیں بعض دفتر سے موپیڈ ملنے پر اسے چلانے کے لئے ذاتی خرچہ پر ایک ڈرائیور رکھا ہے۔ ایسے حضرات ڈرائیور کو دقت
ت مشورہ دے کر تنگ کیا کرتے ہیں۔ پیدل چلتے وقت بھی کافی گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ چاروں طرف دیکھنے کے علاوہ

اوپر بھی دیکھ کر گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں دوسرا خیال "زندگی برائے ٹریفک" کے حامی لوگ اکثر نوجوان ہوتے ہیں ۔ اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں. جس سے خود ان کی اور دوسروں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تیز رفتاری سے کوئی حادثہ نہ ہوا تو اسے ڈرائیونگ کہتے ہیں جو ایک فن ہے اس کے برخلاف حادثہ ہونے پر بدقسمتی کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے.

حیدرآبادی ٹریفک کی خطرناک خوبی حادثات ہوتے ہیں. بغیر کسی وجہ سے لے کر کئی وجوہات کی بناء پر حادثات ہوتے ہیں ہمارے یہاں سڑک کے کنارے لگے پوسٹرس ٹریفک کی توجہ گھورتے ہوئے حادثہ کی وجہ بنتے ہیں. ایک وقت لاری ڈرائیور کی آنکھیں ہیما مالنی کو گھورتی رہیں. ذہن "شعلے" فلم میں الجھا رہا اور لاری سامنے کی دکان میں گھس پڑی تھی ۔ ہماری سوشلسٹ ٹریفک بھی حادثہ کی ایک وجہ ہوتی ہے. ایک حادثہ میں اسکوٹر والے گدھے سے ٹکرا کر ہاسپٹل کی طرف سے اوپر کی راہ لی جب کہ گدھا دولتی جھاڑتے ہوئے ٹریفک میں گم ہوا ۔ وجہ کچھ بھی ہو ہمیشہ حادثہ کا نشانہ زندگی بنتی ہے. اسی لئے کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے ۔

یوں تو سفرِ حیات کا خاصہ طویل تھا
ہم بیک بدہ کی راہ سے ہو کر گزر گئے

■■

غزل

بلین نظام آبادی

ڈسکو میرا معشوق بھی کب تیغ بکف ہے
ایک ہاتھ میں بنگی ہے تو ایک ہاتھ میں دف ہے

اس حال میں گزری ہیں تیرے ہجر کی گھڑیاں
پینے سے جو فرصت ملی پتوں میں شغف ہے

شادی کو جو پوچھا تو کہا اس نے یہ ہنس کر
مشتاقوں کی فہرست سے یہ نام حذف ہے

ساقی کی عنایت کا بھرم کھول رہا ہوں
ساغر میں میرے بیر نہیں بیر کا کف ہے

سمجھا تھا کہ کیوں تو نہیں عشاق کی صف کا
پوچھا تو کہا جی نہیں عشاق کی صف ہے

تین نظمیں

مصطفیٰ جمیل

دُعا

پیارے اللہ میاں
سُن لو میری دُعا
میری امّی نے کل
یہ بتایا مجھے
ساری دنیا کو تم
دیتے ہو روٹیاں

پیارے اللہ میاں
کل سے بھوکا ہوں میں
گھر میں بیٹھا ہوں میں
کھیل سکتا نہیں
سُن لو میری "دُعا"
میرے ابّا کو کل
اتنی خیرات دو
وہ ہنستے ہوئے گھر کو جلدی سے آئیں
مجھے اور امّی کو روٹی کھلائیں ..

بھوکوں کی دھرتی

میں اپنے کمرے میں تنہا
نظم لکھ رہا تھا
تخیّل کے آکاش پر اُڑ رہا تھا
تفکّر کے ساگر کی تہہ میں چلا تھا
میں لفظوں کے اژدہام میں کھو گیا تھا
نئے ڈھنگ سے میں نظم لکھ رہا تھا
نظم کا تھا عنوان "بھوکوں کی دھرتی"
میں لکھنے چلا تھا کہ یہ زندہ لاشیں
جو روٹی کو کب سے ترستی ہیں یارو
یہ بچے جو روٹی کا گر نام سُن لیں
تو روتے ہوئے سہم جائیں ذرا دیر
(مگر ان کی قسمت میں روٹی نہیں ہے)
میں ان کے مسائل کا حل چاہتا تھا
میں لکھنے چلا تھا کہ یہ بھی ہیں انساں
انھیں زندہ رکھنا ضروری ہے یارو
نئے ڈھنگ سے میں نظم لکھ رہا تھا
تخیّل کے آکاش پر اُڑ رہا تھا
نظم کا تھا عنوان "بھوکوں کی دھرتی"
کہ اتنے میں میرے ہی بچے نے آ کر
کہا "ڈیڈی تم کب سے خط لکھ رہے ہو
اٹھو اور جلدی سے بازار جاؤ
میں کل سے ہوں بھوکا مجھے کچھ کھلاؤ" ..

اپنا مرثیہ

آج اس کی موت پر آنسو بہاتے ہیں سبھی
دوست، دشمن، خون کے رشتے تمام
غم میں ہیں ڈوبے ہوئے اُس کے ہمسائے تمام
مرنے والا اپنے حلقہ میں بہت مقبول تھا
دوسروں کی خدمتوں میں اس قدر مشغول تھا
فکر تھی خود کی اُسے نہ گھر کا اپنے تھا خیال
کٹ چکے تھے اس طرح سے اس کے کتنے ماہ و س
آج لیکن وہ مرا تو راز یہ سب پر کھلا
اس کی بیوہ نے بھی لوگوں سے رو کر یہ کہا
"خدمتوں کا میرے شوہر کی صلا سب دیکھئے
دفن کرنے کے لیے سب لوگ چندہ دیجئے" ..

نور محمد یاس

قطعات

نامور شاعر

خدا کی حمد نہیں گُن بتوں کے گائیں گے
وقارِ دیر و حرم کی ہنسی اُڑائیں گے
یہ اپنے شہر کے ہیں ایک نامور شاعر
انہیں شراب پلاؤ غزل سنائیں گے

○

سوشیل اپیل

کہا اک پہلواں سے ہم نے بارے
سماجی جانور ہو تم، کہو، ہاں!
تو اس نے دانت پیسے اور بولا
چبا ڈالوں گا تم کو چپ رہو ہاں!

○

اقبال بھی...

شعروں کا ہم اُس کے نہ بتا پائیں جو مطلب
ہرگز نہ سمجھنا کہ یہ اِدبارِ یقیں ہے
اقبال کو سمجھے گا بھلا کیا کوئی، جب خود
"اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے"

غزل

عالم تاجپوری

نہ کپڑا ہے نہ روٹی اور مکاں ہے
مگر خوش حال یہ ہندوستاں ہے
میں بوڑھا ہوں مگر وہ نوجواں ہے
دعا لوگو کرو کل امتحاں ہے
فقط میک اَپ سے لگتی ہے کنواری
مگر وہ درجنوں بچوں کی ماں ہے
اُدھر پنجاب میں شعلہ ہے بھڑکا
اِدھر آسام سے اُٹھتا دھواں ہے
سنوارا جس نے میری عاقبت کو
اُسی کا نام تو فیشن جہاں ہے
نمازوں کی کریں تلقین کیسے؟
سنیما ہال میں ہر نوجواں ہے
محبت نے بنایا ہے پٹیچر
بڑی لمبی ہماری داستاں ہے
یہ اندازِ حکومت توبہ توبہ
کہ خوں سستا مگر راشن گراں ہے
حسینوں نے کبھی پوچھا نہ عالم
تمہارے دل میں صیغۂ دل کہاں ہے

پرویز یداللہ مہدی

(چوتھی قسط)

حیدرآباد - بھوپال - حیدرآباد

(سفرنامہ)

ھلکی سی جھپکی گہری نیند میں تبدیل ہو گئی ہوتی اگر بھوک کی شدت اور گرمی کی حدت نے مجھے بیدار نہ کر دیا ہوتا۔ دھوپ کی تمازت سے ڈبہ خاصا گرم ہو گیا تھا شاید سورج عین سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس دوران میں ٹرین نے بھی خاصی مسافت طے کر لی تھی اور اس وقت کسی اسٹیشن پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے ہی ڈبے کا جائزہ لیا۔ جانے پہچانے چہروں کے بیچ کچھ نئے چہروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ البتہ ڈبے کی زبان پر بھارت کی سرکاری زبان کا پوری طرح غلبہ ہو چکا تھا۔ اچھی خاصی عام فہم زبان "شدھ" بھاشا میں تبدیل ہو چکی تھی، گویا ڈبے کے "واتاورن" میں خاصا "پریورتن" ہو چکا تھا۔ جو نئے مسافر مزید ڈبے میں سوار ہو رہے تھے ان کا اسٹائل بھی بڑا "شدھ" تھا۔ یعنی ڈبے میں داخل ہونے کے بجائے "پرویش" کر رہے تھے، مسیح صاحب بھی برتھ پر لیٹے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، میں نے ان سے براہ مذاق کہا۔ "شریمان مسیح انجم ہو رہے، لگتا ہے ریل گاڑی، مدھیہ پردیش کی سیما میں پرویش کر چکی۔"

شریمان جی نے بھی جواباً اسی شدھ اسٹائل میں اُتر دیا۔ "ہاں جی، بلکہ ٹرین کو مدھیہ پردیش کی سیما میں پرویش کیے کافی سمے ہو چکا ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "بھوجن کے بارے میں کیا وچار ہے۔ یہاں تو پیٹ چوہوں نے "مہابھارت" کا ابھیاس دُہرانا شروع کر دیا ہے۔" بھوجن کے حوالے پر مسیح صاحب ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھے اور بولے "میرے پیٹ کی بھی ہو بہو یہی کیفیت ہے بلکہ لگتا ہے جیسے پانی پت کے میدان سمیت ظہیر الدین بابر اور ابراہیم لودھی دونوں معہ اپنی فوجوں کے میرے پیٹ میں داخل ہو گئے ہیں ——" اس تاریخی انکشاف کے ساتھ مسیح صاحب نے فوراً ایک چھلانگ لگائی اور برتھ سے نیچے اتر گئے۔ میں نے بھی جوابی چھلانگ لگائی لیکن ابھی ہم دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ ٹرین نے بھی چھلانگ لگائی اور رینگنے لگی۔ مسیح صاحب نے ایسی تکلیف دہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے ان کے پیٹ میں منتقل شدہ پانی پت کے میدان میں مغل فوجوں نے اچانک اپنی توپ سے گولہ داغ دیا ہو، اور میرے چہرے

کے تاثرات سے بھی یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے بھیم نے پوری قوت سے میرے پیٹ میں اپنا گدر گھما دیا ہو۔

ہم دونوں کسی پسپا فوج کے ہارے ہوئے سپاہیوں کی طرح واپس اپنی اپنی نشستوں پر پہنچ گئے اور پیٹ میں ہو رہے گھمسان کے رن کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لئے بھاگتے دوڑتے مناظر کا نظارہ کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں مدھیہ پردیش کے گھنے جنگلات کا میلوں لمبا سلسلہ شروع ہو گیا، وندھیاچل اور ست پوڑہ، کی ترائی میں حد نظر تک پھیلے ہوئے اونچے گھنے گھیر دار درختوں کے بیچ خالی زمین کا ایک اِنچ ٹکڑا نظر نہیں آتا تھا گویا گھنے جنگلات کا یہ سلسلہ بھی بالکل اسی شدھ بھاشا کی طرح تھا جو "آکاش وانی" اور "دور درشن" کے قومی پروگرام کے تحت نشر ہونے والے "سماچاروں" میں بلا ناغہ بلا تکلف بولی جاتی ہے۔ جس میں ڈھونڈے سے بھی ایک عام فہم لفظ نہیں ملتا، چنانچہ یہ بھاشا، دھرتی پر رہنے بسنے والے انسانوں کی زبان سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ سچ مچ "آکاش وانی" معلوم ہوتی ہے اور "آکاش بانی" سن کر مجھ پر تو کپکپی طاری ہو جاتی ہے کیونکہ اس ناقابلِ فہم زبان کے پردے میں مجھے صورِ اسرافیل کا غلغلہ سنائی دیتا ہے۔ اچھا خاصا کروڑوں میل دور آکاش پر جگمگاتا سورج خواہ مخواہ سوا نیزے پر نظر آنے لگتا ہے۔ میدان حشر کی نفسا نفسی، پکڑ دھکڑ بلا وجہ اپنے آس پاس بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ میری سوچیں بھاشا کے راکٹ پر سوار ہو کر زمین آسمان کے قلابے ملانے لگی تھیں حالانکہ

پرانی کہاوت ہے بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا۔ یہ سچ ہے کہ بھوکے پیٹ انسان بھجن تو نہیں گا تا لیکن فلسفے کی دال ضرور بگھارتا ہے، اس سے پہلے کہ فلسفے کی دال کا یہ بگھار میرے ہاضمے کے ساتھ کوئی ناوا جبی سلوک کرتا، اگلا اسٹیشن آگیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو ہنکاتے ہوئے پلیٹ فارم پر اُترے اور پھر کینٹین کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے۔ جب کافی دیر تک نظروں کے ساتھ خود کو بھی دوڑانے کے باوجود کینٹین کا سراغ نہ پاسکے تو "قوت شامہ" کا سہارا لیا، دور کہیں سے پکوان کی بُو اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی چنانچہ اسی سمت دوڑنا شروع کیا۔ (ریلوے اسٹیشنوں پر جو کھانا ملتا ہے اس میں خوشبو نہیں ہوتی، صرف بُو ہوتی ہے مسافروں کی اکثریت چونکہ مختلف علاقوں، موسموں اور زبانوں کے اس قدر نفسیاتی جھٹکے کھا چکی ہوتی ہے کہ جسمانی اور ذہنی تھکن کے ساتھ ساتھ ان کی جمالیاتی حِس تک بے جان ہو جاتی ہے، چنانچہ مسافروں کے لئے "خوشبو" اور "بو" میں تمیز کرنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے اور ریلوے کینٹینوں کے ٹھیکیدار مسافروں کی ہنگامی کمزوری کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔) قوت شامہ کی رہنمائی میں بالآخر ہم پلیٹ فارم کے اس گوشے تک پہنچ گئے جہاں یہ بُو بھپکارے میں تبدیل ہو گئی تھی، ایک بند کمرے سے پکوان کی بو اور دھوئیں کے کثیف بادل ایک ساتھ اُٹھ رہے تھے لیکن "ڈائننگ ہال" کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ چنانچہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے کے بعد میں نے ایک میلے کچیلے سے وردی پوش شخص کو تاکا اور پوچھا۔ "بھیا کینٹین

کدھر ہے ؟" اس نے بڑی بے نیازی سے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے کی جانب اشارہ کردیا۔ اب پھر بھاگ دوڑ شروع ہوئی، خوش قسمتی سے پلیٹ فارم کے اگلے سرے پر نہ صرف یہ کہ ایک عدد ڈائننگ ہال موجود تھا بلکہ کچھ مسافر بھی جلدی جلدی کھانا زہر مار کررہے تھے۔ ہم نے فوراً ایک ٹیبل سنبھالی اور بیرے کو آواز دیا ہی چاہتے تھے کہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے ٹوکا "شریمان جی پہلے ٹکٹ لائیے" ہم نے حیرت سے پوچھا "کیسا ٹکٹ" وہ بولا "کھانے کا ٹکٹ" "کیا آپ نے ڈبے میں کھانے کا ٹکٹ نہیں خریدا ؟" ہمارے انکار میں گردن ہلانے پر وہ مزید بولا "بابو صاحب، یہاں کھانا پہلے سے بُک کئے ہوئے آرڈر پر سپلائی کیا جاتا ہے، آپ ایسا کیجیے، ہمارے باورچی خانے جاکر ترنت آرڈر بُک کرکے آئیے"۔ میں نے پوچھا "آپ کا باورچی خانہ کہاں ہے ؟" اس نے جواب میں اسی سمت اشارہ کیا جہاں سے ہم کچھ دیر پہلے اپنی قوت شامہ کے سہارے شامتِ اعمال کے نتیجے میں یہاں پہنچے تھے۔ اب پھر وہ ہمیں وہیں بھجوا رہا تھا کہ ہم پر یہ ثابت ہو جائے کہ صرف دنیا ہی گول نہیں ہندوستان کے ریلوے پلیٹ فارم بھی گول ہوتے ہیں۔ کینٹین سے بھوکے پیٹ باہر نکلتے ہی مسیح صاحب جھنجھلا کر بولے "محض دو لقمے زہر مار کرنے کے لیے دوبارہ اس اولمپک دوڑ میں حصہ لینا سراسر حماقت ہے تین تو بج ہی گئے ہیں، دو گھنٹوں میں ہم بھوپال پہنچ جائیں گے وہیں جاکر لنچ اور ڈنر ایک ساتھ کھالیں گے"۔ اتنا کہہ کر وہ قریب لگے پانی کے نل کی طرف لپکے، اور پھر نل کی ٹونٹی سے منھ لگانے سے پہلے مزید فرمایا۔ "آج شاید پانی پی پی کر پانی پت کی اس جنگ کو ٹھنڈا کرنا لکھا ہے مقدر میں"۔ مقدر کے آگے کس کی چلی ہے جو ہماری چلتی سو میں نے بھی مسیح صاحب کی تقلید میں نل کی ٹونٹی سے منھ لگا دیا۔ یہی سوچتے ہوئے کہ آج اگر مقدر ہی کی چلنی ہے تو چلنے دو، جب تک چلی چلے۔ مقدر کے اس چلی چلاؤ کے بیچ اچانک ٹرین چل پڑی۔ پلیٹ فارم پر ایک بھگدڑ مچ گئی جسے دیکھ کر مسیح صاحب اس قدر حواس باختہ ہوئے کہ کسی اور کمپارٹمنٹ کو اپنا ڈبہ سمجھ کر سوار ہو گئے ---- یوں بھی ٹرین کے کمپارٹمنٹ اور ہاؤزنگ بورڈ کی کالونیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہاں ہر فلیٹ پر اپنے فلیٹ کا دھوکہ ہوتا ہے اور یہاں ہر کمپارٹمنٹ اپنا کمپارٹمنٹ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ مجھے چونکہ بمبئی کی رہائش میں اس قسم کے بے شمار دھکے کھانے کی وجہ سے خاصہ تجربہ ہو چکا ہے اس لئے مسیح صاحب والی غلطی کا مرتکب ہونے سے بال بال بچا۔ مجھے اصل میں سامان کی فکر تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ سامان سے زیادہ سامان میں محفوظ مضامین کے پلندوں کی فکر تھی کیونکہ مضامین کے بغیر بھوپال میں ہماری حیثیت اس باشندے کی سی ہو جاتی جو بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے کسی غیر ملک میں پہنچ گیا ہو۔

سامان کا جائزہ لینے کے بعد ڈبے کے آخری سرے کی طرف چلا آیا۔ ایکسپریس ٹرینوں میں عموماً ریزرویشن والے ڈبے ایک جھولتی ہوئی راہداری کی مدد سے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں تاکہ مسافر

چلتی ٹرین میں بھی آسانی سے اِدھر سے اُدھر اپنی آمد و رفت جاری رکھ سکیں اور ٹرین میں بھی "گھر آنگن" کا لطف لے سکیں۔ اتفاق سے مسیح صاحب اگلے ہی کمپارٹمنٹ میں تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بے بسی سے دیکھا کیونکہ جو راہداری، دونوں ڈبوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی تھی، کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ، ہوچکی تھی کہ اسے دیکھ کر "پُل صراط" کا تصور جاگ اُٹھا۔ جس پر سے کم از کم ہر مسلمان کا روزِ حشر کی تمام تر حشر سامانیوں سے گزر چکنے کے بعد گزرنا ازبس ضروری ہے، تاہم پل صراط پر سے گزرتے ہوئے انسان کو اس پل سے اتنا خطرہ لاحق نہیں ہوگا جتنا کہ خود اپنے اعمال سے، یعنی خود اپنے ہی بداعمال کی وجہ سے اس کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ جب کہ ٹرین کا یہ پُل صراط، ٹرین کی موجودہ رفتار سے دوگنی رفتار میں حرکت کر رہا تھا اور خود اس کے اپنے "اعمال" اس قدر خراب تھے کہ اس کے لئے اپنا توازن قائم رکھنا دشوار دکھائی دے رہا تھا۔ ایسی خطرناک صورتحال میں اس پر سے گزر کر اپنے توازن کو خطرے میں ڈالنے کی حماقت بھلا ہم سے سرزد ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اگلے اسٹیشن تک دونوں الگ الگ کمپارٹمنٹ میں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ہمارے درمیان ہلتا جھولتا، کانپتا تھرتھراتا "پُل صراط" اپنے پل پل بگڑتے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش میں عجیب و غریب آوازیں نکالتا لایعنی بولیاں بولتا رہا، جن پر مجھے آکاش وانی سے نشر ہونے والے شدھ سماچاروں کا دھوکہ ہوتا رہا۔ ||

ٹرین کا اگلا پڑاؤ "اٹارسی" جنکشن تھا۔

مسیح صاحب کی دوبارہ اپنے کمپارٹمنٹ میں آمد کی خوشی میں، میں نے گرم گرم جلیبیاں خرید کر ان کا اور اپنا منہ میٹھا کیا۔ ٹرین نے ایک بار پھر روانگی کی طرح ڈالی اور ہماری منزلِ مقصود کا فاصلہ، وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ گھٹنے لگا۔ ہم نے بھی اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹا، ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوئے اور پھر سامان سمیت دروازے کے قریب پہنچ کر یوں اکڑ کر کھڑے ہوگئے جیسے بھوپال اسٹیشن پر مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی کی استقبالیہ کمیٹی ہار پھول اور بینڈ باجے سمیت ہماری راہوں میں پلکیں بچھائے کھڑی ہی تو ہوگی — دھیرے دھیرے بستی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ پھر بستی کے ان ہی آثار کے بیچوں بیچ دو عدد بلند و بالا مینار مردانہ وار آسمان سے آنکھیں ملائے ہوئے نظر آئے۔ میں نے مسیح صاحب کی توجہ اِن میناروں کی طرف مبذول کرواتے ہوئے کہا۔

"یا تو تاج محل نقلِ مقام کر کے آگرے سے بھوپال پہنچ گیا ہے یا پھر ہماری ٹرین ہی شارٹ کٹ کے ذریعے بھوپال کے بجائے آگرے پہنچ گئی ہے۔"

میرے اس اندیشے پر، مسیح صاحب غور سے ان میناروں کی طرف دیکھنے لگے پھر اچانک گڑبڑا کر بولے۔ "وہ دیکھو، تمہارے دریافت شدہ تاج محل سے ذرا فاصلے پر ایک اور شاندار تاج محل نظر آ رہا ہے۔" میں نے ان کی اس ترکی بہ ترکی دریافت پر اسی سمت غور سے دیکھا، واقعی ایک اور تاج محل جیسی عمارت نظر آ رہی تھی، مسیح صاحب ٹھوس لہجے میں بولے: "جہاں تک

میری معلومات کا تعلق ہے۔ آگرے میں صرف ایک ہی
تاج محل ہے اور تاج محلوں کا یہ جوڑا، یقیناً اس بات
کا ثبوت ہے کہ یہ آگرہ نہیں بھوپال ہے، اور اگر
بفرضِ محال یہ بھوپال نہیں بھی ہے تو کم از کم آگرہ ہرگز
نہیں ہو سکتا ۔۔!"

ٹرین بے شمار پٹریاں بدلتی ہوئی اسٹیشن کی
حدود میں داخل ہوئی اور میں نے جس شہر کو تاج محل
کی ہمشکل عمارت کے دھوکے میں خواہ مخواہ آگرہ سمجھ
لیا تھا اور جسے مسیح صاحب نے تاج محل نمبر دو دریافت
کر کے میری غلطی کی اصلاح فرما کر اسے بھوپال یا اسی
قبیل کا کوئی شہر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی وہ بالآخر
بھوپال ہی نکلا کیونکہ پلیٹ فارم پر جگہ جگہ لگے ہوئے
بورڈ پر یہی نام زیورِ طبع سے آراستہ نظر آیا۔ اور خوشی
کی بات یہ تھی کہ وہ ایک جگہ اُردو رسم الخط میں بھی نظر
آیا۔ اگرچہ کہ اس کی نوک پلک خاصی بگڑی ہوئی تھی
تاہم ماں چاہے زرق برق لباس میں ہو یا پیوند زدہ
لبادے میں لپٹی لپٹائی۔ ماں بہرحال ماں ہوتی ہے۔
اتنی ہی پیاری، اتنی ہی قابلِ تعظیم۔

میں نے پلیٹ فارم کے ہجوم میں استقبالیہ کمیٹی
کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ساتھ میں کان بھی کھڑے
کر لئے تھے، بینڈ باجوں کی گھن گرج سننے کے لیے لیکن
بینڈ باجا پلیٹ فارم کے بجائے ڈبے کے اندر ہماری
پُشت پر شروع ہو گیا۔ جس دروازے میں ڈٹا دیکھ
کر اُترنے والے مسافر ہٹو، بڑھو، اُترو کے نعرے لگاتے
ہوئے ہماری پیٹھ کو بینڈ سمجھ کر اپنے ہاتھوں سے
ٹھونکنے بجانے لگے۔ یہ "اُلٹا استقبال" دیکھ کر ہمیں
مجبوراً استقبالیہ کمیٹی کی تلاش کو کچھ دیر کے لیے
بالائے طاق رکھ کر پلیٹ فارم پر کودنا پڑا۔

ابھی ہم نے چند قدموں کا ہی فاصلہ طے کیا
تھا کہ سامنے ہی ایک شناسا چہرہ اپنے "سراپا" کے نظر
آیا۔ میں نے مسیح صاحب کی توجہ اس طرف مبذول
کراتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ۔ "ذرا ان
صاحب کی طرف دیکھئے، بالکل محکمۂ ریلوے کے نامور
شاعر فکری بدایونی کی کاربن کاپی معلوم ہوتے ہیں۔"
مسیح صاحب چونکہ پہلے ہی اس شخص کا بہ نظر غائر
جائزہ لے چکے تھے، اس لئے ٹھوس لہجے میں بولے۔
آپ جسے فکری بدایونی کی کاربن کاپی سمجھ رہے ہیں
وہ بذاتِ خود اوریجنل درخواست ہے۔ بلکہ میرا دعویٰ
ہے کہ اس مخصوص جُثّے اور اوریجنل قدوقامت کی
نقل کم از کم اُردو ادب کی موجودہ اُمّت میں ملنا مشکل
ہے۔" مسیح صاحب کے اس اوریجنل ریمارک پر
میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "تو پھر بھوپال اسٹیشن
پر فکری بدایونی کی موجودگی اس بات کا کھلا ثبوت
ہے کہ موصوف آج کل بھوپال میں تعینات ہیں اور
مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی نے ان کی بھوپال میں
موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر انہیں یقیناً ہمارے استقبال
کے لیے بھیجا ہے کیونکہ موصوف ہمیں اچھی طرح
جانتے ہیں ۔۔!!"

ہماری سرگوشیوں کے دوران فکری بدایونی
ہمیں دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا ان کے چہرے پر وہ تمام
تاثرات ایک ایک کر کے نمودار ہونے لگے جو عموماً
اس وقت نمودار ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے مخصوص

"منفرد" قدوقامت" کے توسط سے دنیا کے ہر
اونچے اور قدآور شخص کو یہ چیلنج کرنے پر اتر آتے
ہیں کہ اے مورکھ آدمی، مغرور کی طرح آسمان کو چھونے
کی کوشش مت کر، بلکہ دردمند انسان کی طرح زمین کی
طرف دیکھ کہ ایک دن تجھے اسی ماٹی میں مل کر ماٹی
ہوجانا ہے ۔ ان "ناصحانہ" تاثرات کے ساتھ نکہت
بدایونی نے ہماری طرف پیش قدمی کی۔ معمول کے
مطابق "خود اعتماد" قسم کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں
پر کھیل رہی تھی۔ پھر مصافحے کے لیے بڑی ہی خوداعتمادی
سے ہماری طرف ان کا ہاتھ بڑھا۔ خوداعتماد مصافحے
کے بعد وہ مجھ سے خوداعتماد قسم کا معانقہ بھی کرنا چاہتے
تھے لیکن میری خوداعتمادی کو اپنے غیر ضروری حد تک
نکلے ہوئے اونچے قد کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح رکوع
میں جاتا دیکھ کر موصوف نے ازراہ ترحم معانقے کے
خیال کو ترک کر دیا۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ
موصوف نے ہمارے ساتھ ہی سفر کا آغاز کیا تھا۔ البتہ
ہماری منزل آچکی تھی اور ان کی منزل ابھی دور تھی کہ
موصوف دلی تشریف لے جارہے تھے اور دلی ویسے
بھی دور ہے ـــــ اس اطلاع کے ساتھ استقبالیہ
کمیٹی کے تصور پر پانی پھیر کر موصوف پانی پینے کے لیے
نل کی طرف بڑھ گئے۔ اور ہم دونوں اور یکجنل استقبالیہ
کمیٹی کی طرف سے بالکل مایوس ہو کر آگے بڑھنے لگے
مگر اندر ہی اندر جھنجھلاہٹ برابر جاری تھی۔ ٹھیک ہے
اگر بھوپال میں ہار پھول کی خوشبو اور بینڈ باجے کے
شور شرابے سے مہمانوں کا استقبال کرنے کا رواج نہیں
ہے۔ کم از کم استقبالیہ کمیٹی تو بھیج دی جاتی خالی ہاتھ ہی
سہی۔ اس اندرونی کشمکش کے دوران اچانک
"زندہ باد، زندہ باد" والا فرسودہ مگر آزمودہ استقبالیہ
نعرہ سماعت سے ٹکرایا اور مسلسل ٹکراتا چلا گیا۔ میں
نے فرطِ مسرت سے کپکپاتے ہوئے لہجے میں مسیح
صاحب کو مخاطب کیا۔ "مبارک ہو، جس استقبالیہ
کمیٹی کو ہم پلیٹ فارم پر تلاش کر کے مایوس ہو گئے
تھے وہ لگتا ہے اسٹیشن کے باہر ہماری جے جے کار
کر رہی ہے، گویا وہی بات ہوئی بچہ اسٹیشن کی بغل
میں اور ڈھنڈورہ پلیٹ فارم پر ـــ"

میری اس توجہ دہانی پر مسیح صاحب نے اپنے
"قابلِ استعمال" کان کا رخ "قطب نما" کی سوئی
کی طرح" نعرے بازی کی سمت گھمایا۔ (موصوف کا
دوسرا کان، مدت ہوئی دنیا ترک کر چکا ہے،
چنانچہ ایسی کوئی بات جو نظر انداز کر دیئے جانے
کے لائق ہوتی ہے اسے لوگ عموماً ایک کان سے
سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں جب کہ مسیح
صاحب ایسے موقعوں پر اپنے "ناقابلِ استعمال" کان
کی مدد سے اُسے سنے بغیر ہی اڑا دیتے ہیں)۔ موصوف
نے آواز کی لہروں سے اپنے قابلِ استعمال کان کا
ربط قائم کیا ہی تھا کہ نعرے بازی کے ریکارڈ کا رخ
یکسر بدل گیا ـــ "زندہ باد" کا "میگھ ملہار" "مردہ باد"
کے "دیپک راگ" میں تبدیل ہو گیا۔ جے جے کار
کی جگہ ہاہاکار شروع ہوگئی۔

مسیح صاحب نے تمسخرانہ نظروں سے میری
طرف دیکھا جیسے انھیں میرے دونوں کانوں کی
سماعت پر شبہ ہو۔ پھر ایک فخریہ مسکراہٹ ان

کے ہونٹوں پر پھیل گئی، جیسے کہہ رہے ہوں۔
"بچو میرا ایک ہی کان تمہارے دونوں کانوں پر بھاری ہے ——
مجھے اپنے کانوں کی سماعت سے زیادہ، استقبالیہ کمیٹی کی حماقت بلکہ جہالت پر غصہ آنے لگا۔ میں نے سوچا، بڑی نامعقول استقبالیہ کمیٹی ہے جو پہلے تو "زندہ باد" کے نعرے بلند کرکے آؤ بھگت کرتی ہے پھر اچانک "مردہ باد" کی راگنی چھیڑ کر "جاؤ بھگت" کا ڈرامہ شروع کر دیتی ہے۔ تجسس اور تحیر نے اس 'دو غلی' استقبالیہ کمیٹی کا قریب سے جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ جب اس کمیٹی کے درشن کئے تو عقدہ کھلا کہ جسے میں اتنی دیر سے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی استقبالیہ کمیٹی کا تصور کر رہا تھا وہ دراصل کسی مزدور یونین کی احتجاجی میٹنگ تھی۔ لیجئے کھودا پہاڑ' اور نکلی مزدور یونین کی احتجاجی میٹنگ۔ ویسے بھی ان دنوں احتجاج، جلسے، جلوس، مورچے، ہڑتالیں، بند، فسادات کی جیسے ملک بھر میں ایک باڑھ سی چلی ہے، جسے دیکھیے توڑ پھوڑ، خون خرابے اور نعرے بازی میں مصروف ہے، وہ چاہے مہنگائی کی صلیب پر ٹنگے عوام ہوں یا حکومت کے شاطر سربراہان —— سبھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس کارِ خیر میں ملوث ہیں۔ بلکہ دونوں ہاتھوں سے خود اپنے گھر کو آگ لگا کر، گھر پھونک، تماشا دیکھ رہے ہیں اور بی جمالو جس کا صدیوں سے بھُس میں چنگاری ڈال کر تماشا دیکھنا پیشہ رہا ہے۔ خود گھر کے بھیدیوں کو اپنے 'منصب' پر فائز دیکھ کر محوِ حیرت ہوتی جا رہی ہے کہ دنیا کو کیا سے کیا ہونا چاہیئے تھا اور کیا ہو گئی ہے —— !!!

(باقی آئندہ)

. . .　　. . .　　. . .

ممتاز مزاح نگار لئیق صلاح کے انشائیے

سُنی سُنائی

قیمت: دس روپے　　بتوسط: شگوفہ

نعیم زبیری

یہ دیواروں کے قاتل

کیا انھیں پھانسی کی سزا نہیں دی جاسکتی؟

لڑکپن میں تھوڑی سی فارسی پڑھی تھی۔ جواب یاد نہیں ہے لیکن ایک آدھ مقولے کا ترجمہ ضرور یاد رہ گیا ہے۔ مثلاً "دیوار احمق کا کاغذ ہوتی ہے" اور فارسی پڑھانے والے مولوی صاحب مقولوں کے معاملے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ اگر کبھی کوئی دیوار پہ طبع آزمائی کرتا ہوا پکڑا جاتا۔ تو اسے نہایت سخت قسم کے "ٹارچر" کا سامنا کرنا پڑتا۔ جس میں کنکر والی گوشمالی بھی شامل تھی۔ یعنی مختلف اسلحہ میں سے وہ اپنی جیب سے ایک کنکری نکالتے اور کان کی لو پہ رکھ کر اس بری طرح دباتے کہ چیخوں کی آوازیں گھر تک پہنچ جاتیں۔ میں بھی ان ہی لوگوں میں سے ہوں جو اس قسم کے غیر انسانی رویے کے خلاف شدید قسم کی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی، دل ہی دل میں سوچتا ہوں۔ کاش۔ وہ کنکر والی گوشمالی جاری رہتی!! ۔ کیوں کہ سڑک پہ چلتے چلتے کسی کو اپنے گھر پہ چونا ڈلواتے ہوئے دیکھتا ہوں تو دل اس بیچارے کی سادہ لوحی پہ بھر آتا ہے۔ ابھی چونا ڈالنے والا کاریگر مزدوری لے کے گھر تک بھی نہیں پہنچے گا۔ کہ لوگ اپنے ہاتھوں میں مختلف رنگ نسل۔ سائز۔ اور سیاسی، مذہبی، اور تجارتی برش لے کر دوڑ پڑیں گے۔ "فلاں کو ووٹ دو"۔ "فلاں تیل دماغ کے لئے اچھا ہے"۔ "فلاں صاحب کی میٹنگ میں شرکت کیجئے"۔ "فلاں جلوس فلاں وقت فلاں جگہ سے نکلے گا"۔ "اسلام خطرہ میں ہے"۔ "ہندو سنسکرتی نشٹ ہو رہی ہے"۔ "مسیح آرہا ہے"۔ "سرف سے کپڑے صاف دھلتے ہیں"۔ "ٹی وی توڑ دیجئے"۔ "فلاں ٹی وی خریدیئے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

الیکشن اور دیواروں کی تباہی کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ مزید دہرانا مسخرہ پن ہوگا لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ ایک تنظیم لنگوٹ باندھ کر ایک کوچی اور چونا لے کے حیدرآباد کی سڑکوں پہ نکل پڑی تھی لیکن جتنی تیزی سے وہ بیچاری نعروں پہ چونا پھیرتی تھی، اتنی ہی تیزی سے نعرہ بازوں کی ایک نئی فوج ہاتھوں میں برش لئے آگے بڑھ کے نئی نئی تحریروں سے دیواروں کو آراستہ کر رہی تھی۔ بلکہ سنا تو یہ ہے کہ نعروں کو مٹانے والے دل جلے والنٹیروں کے نام دیواری مشتہرین کی طرف سے تنبیہ کے خط بھی وصول ہوتے تھے۔

ایک صاحب نے تو تھیٹر کے دیواروں پر کالا رنگ کر دالیا۔ لیکن دوسرے دن انھوں نے دیکھا کہ مشتہرین نے سفید رنگ سے نعرے اور اشتہار لکھ دیئے ہیں۔

ایک اور صاحب کی ادا مجھے نہایت پسند آئی اور شکست کے اعلان پر کچھ ترس بھی آیا۔ انہوں نے یہ کیا کہ دیوار پہ چونا ڈلوایا۔ اور پھر خود ہی ایک پینٹر کی مدد لے کے مٹائے ہوئے نعروں کو سلیقے سے ایک طرف لکھوا دیا۔ لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ دوسرے دن اس طرح خستہ لگی ہوئی جگہ پر پھر ایک جلوس میں شرکت کی دعوت دے دی گئی تھی!!

۸۷

- کیا ہندوستانی مسلمان قومی دھارے میں شامل نہیں ؟
- ملک کی اس دوسری مذہبی اکثریت کا "ہندیانا" کیا ناگزیر ہے ؟
- کیا مسلمان ملک دشمن ہیں ؟

ایسے تمام سوالات اور خدشات کے بے لاگ اور دو ٹوک جواب کے لئے جرنلسٹ قلم کار چندر سری واستو کی نئی تصنیف پڑھئے

مسلمان اور سیکولر دھارا

تیزی سے اشاعت کے مراحل میں

صفحات : (۳۵۰) ــــــــ قیمت : ۲۵ روپے

دیدہ زیب ٹائٹل

اس کتاب کے لئے اپنا آرڈر بنام رضا علی خاں پبلیشر معرفت نہرو اسٹڈی گروپ، ۱۷، بیچلرس کوارٹرس جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد کے نام روانہ کیجئے۔

بہزاد فاطمی

(بہار)

بال کی کھال

(تبصرہ)

جوہر ظرافت
مجموعہ کلام جوہر سیوانی

سرزمین بہار کے معروف و مقبول مزاحیہ شاعر جوہر سیوانی کا مجموعۂ کلام "جوہرِ ظرافت" بہار اردو اکاڈمی پٹنہ کے مالی تعاون سے دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل اس کتاب کی قیمت پندرہ روپے، موجودہ حالات اور کتابت و طباعت کی دشواریوں کے پیشِ نظر زیادہ نہیں ہے۔ کتاب کی ابتدا خود مصنف کے ایک مختصر مضمون سے ہوتی ہے جس میں وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی شاعری کے متعلق کہتے ہیں "میرے تخلیقی سفر کا آغاز والد مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے ہوا۔ ابتداً مشاعروں میں اپنے شوق سے جایا کرتا تھا، جہاں میری مزاحیہ شاعری پسند کی جاتی تھی۔ لیکن اب مشاعرے میرا پیچھا کرتے ہیں۔ ملک کے طول و عرض سے دو چار مشاعروں کے دعوت نامے آتے رہتے ہیں جن کی راہ میں اگر ملازمت کی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں تو ان مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتا ہوں"۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جوہر سیوانی بمصداق ؎ یکے در گیر و محکم گیر، بجز ظریفانہ شاعری اور کسی صنفِ سخن میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن کی شاعری کی مقبولیت و شہرت مشاعروں ہی کی رہینِ منت ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ محض ایک "مشاعرہ باز" شاعر ہیں۔ بلکہ رضا نقوی واہی کے قول کے مطابق "جوہر سیوانی کی شعری پھلجھڑیوں میں یہ باتیں (زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں اور سماج کے چند بھیانک پہلوؤں کا سراغ) کہیں واضح، کہیں مبہم طور پر ہمیں نظر آتی ہیں"۔

غزل کی طرح مزاحیہ شاعری بھی جتنی آسان اور سہل سمجھی جاتی ہے اُتنی ہی مشکل اور دشوار ہے۔ بدقسمتی سے غزل کا معاملہ تو شروع ہی سے یہ رہا کہ ؎

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری
اول بہ شگوں گرد طوافِ قفس ما

مزاحیہ شاعری کا معاملہ برعکس ہے۔ وجہ چاہے جو

کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ مزاح نگار شعراء کی فہرست خصوصاً بہار میں نہ تو اتنی طویل ہے اور نہ سرمایہ ہی اتنا زیادہ کہ خزف ریزوں کے انبار سے جواہر پاروں کا علیحدہ کرنا دشوار ہو جائے۔ غزل کی طرح، مزاحیہ شاعری کا بھی ایک مخصوص مزاج و آہنگ ہے۔ اِن دونوں صنفِ شاعری کے نرم و نازک الفاظ میں مخصوص اشاریت اور تہذیب ہوتی ہے جن کا لحاظ کئے بغیر لبِ ناطقہ کو حرکت دینا کلام کو مبتذل، رکیک اور عامیانہ بنا دیتا ہے۔ جوہر سیوانی کے کلام کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اُنہوں نے ابتذال اور رکاکت سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مزاحیہ شاعری کا مقصد محض تضحیک و تمسخر نہیں۔ واہی نے اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ابھی اُن کا فن تشکیلی مرحلہ میں ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری کا کینوس محدود نظر آ رہا ہے" لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس محدود کینوس میں بھی ایسے اشعار کی جلوہ گری ہے جن میں طنز و مزاح کا حسین و دل کش امتزاج موجود ہے۔ مثال کے طور پر میں چند ہی اشعار پر اکتفا کرتا ہوں ؎

ہم سازکی دوکاں میں صنم ڈھونڈھ رہے تھے
اور گھر میں نمازی کے وہ ہم ڈھونڈھ رہے تھے

آج بھی فٹ پاتھ پہ ہے زندہ لاشوں کا ہجوم
دیکھئے سرکار کی آبادکاری ہائے ہائے

آئینہ پہ برہم ہیں تصور اس کا بھلا کیا
شکل اس نے دکھا دی ہے بگاڑی تو نہیں ہے

کچھ رات تھی باقی تو کہا شیخ نے ہنس کر
"رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے"

گلستاں پہ مساوی حق ہے دونوں کا مگر یارو
عجب تقسیم ہے یہ آم اُن کا گٹھلیاں میری

ہر بزم میں ملتا ہے اُسے مرغِ مسلم
نیتا کو کہاں قلتِ اجناس لگے ہے

رفع حاجت سے شرا ہوں یہ کہہ کر
دوستو اپنا یہ ہندوستان ہے

جو آج بنے پھرتے ہیں اسلام کے خادم
کل جا کے دری بار میں رَم ڈھونڈھ رہے تھے

لے اُڑی تیز ہوا پھوس کا چھپر ورنہ
کوٹھری اپنی ہوا دار کہاں تھی پہلے

تیل مسجد کے چراغوں کا لگایا ہوگا
شیخ کی ڈاڑھی چمکدار کہاں تھی پہلے

کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محض تفننِ طبع کے طور پر کہے گئے ہیں۔ ان تفریحی اشعار کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسے گراں بار زندگی کے رہگزار میں نخلستان کا جلوہ حاصل کلام یہ ہے کہ جوہر کی شاعری کا مطالعہ دل چسپ بھی ہے اور تفریحِ قلب کا باعث بھی۔

▲▼▲

پاگل عادل آبادی کا نیا مجموعہ
گڑبڑ گھوٹالا
قیمت: ۱۵ روپئے

خرافات

مراسلے:

ڈیئر مصطفیٰ کمال۔ تسلیمات

ماہ مئی ۱۹۸۳ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ طنز و مزاح نمبر نکالنے کا اعلان دیکھ کر دل باغ باغ ہو اُٹھا۔ نثری حصہ اس دفعہ قابل صد تحسین ہے۔ کیا وجہ ہے کہ غزلیں اور نظمیں رسالے میں برائے نام ہیں۔

کریک بتیاوی

محترم داہی صاحب کے یہاں شگوفہ کا سالنامہ نظر سے گزرا۔ کارٹونوں کی برجستگی نے حسن کو چاند چاند لگا دیئے ہیں۔ ہندوستان کے مزاحیہ ادب سے متعلق مجوزہ خاص نمبر کے اعلان پر بھی نظر پڑی۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، پٹنہ

مصطفیٰ بھائی! آداب!!

ہر ماہ "شگوفہ" کو منظر عام پر لانے سے قبل کسی اچھے سے عامل کو دکھلایا کیجئے تاکہ وہ ہر بلا سے محفوظ رہے اور اسے اپنی جانب سے دو۔ چار روپے زیادہ دیں تاکہ کوئی کسر نہ باقی رہ جائے۔

انصاری اصغر جمیل، ناگپور

گرامی قدر آداب!

فروری کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ آپ نے ایک اچھا پرچہ ترتیب دے کر قارئین کے لئے پیش کیا ہے اس کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں منظومات میں رضا نقوی واہی کی نظم "انجمن زن مریداں" اور برق آشیانوی کی نظم مرحوم شوہر کی تصویر کو دیکھ کر، خوب ہیں۔ یوسف ناظم، رؤف خوشتر، صباح الدین ہاشمی کے انشائیے بھی مزے کے ہیں۔ پرویز یداللہ مہدی کی تحریر پڑھ کر ایکبار پھر جی خوش ہوگیا جناب برق آشیانوی کا خط خاصے کی چیز ہے۔ محمد اسد اللہ کا لکھا ہوا اصغر کا خاکہ بھی پُر لطف ہے مجھے اُمید ہے کہ آئندہ بھی ہم سے حُسن ترتیب کی داد وصول کریں گے۔

سید حسن عباس، سیوان

صد سلام و رحمتِ فراواں!

شگوفہ عرصہ سے زیر مطالعہ ہے۔ سالنامہ ۱۹۸۳ء نظر نواز ہوا۔ اس کی بہترین تزئین و تجمیل کے لئے مبارکباد خواجہ صاحب، لوتھر جی، مجتبیٰ حسین، ناظم صاحب اور مہدی لائق صد تحسین ہیں۔ بعض خواتین مزاح نگاروں کی نگارشات بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

ڈاکٹر محمد عزیز الرحمٰن، بھاگلپور۔

مکرمی و محترمی۔ آداب، تسلیمات!

سالنامہ بہت پسند آیا۔ آپ لوگوں کی محنت و محبت کا قائل ہونا پڑا۔ ویسے بھی اک زمانہ قائل ہے "اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ"۔

محبوب مانجھومی، بلاسپور

محترمی تسلیم!

ادھر "شگوفہ" میں مزاح نگار پیدا ہوتا جارہا ہے صنفِ مزاح کو ادب میں داخل نہیں کیا گیا ہے، یہ اردو ادب کے قانونوں کا دوش ہے ورنہ مزاح نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ہندوستان میں طنز و مزاح کا واحد رسالہ "شگوفہ" ہی ہے اب اردو ادب میں صنفِ مزاحیہ کو نہ صرف قبول ہی کیا جائے گا بلکہ اس کی قدر کا اعتراف بھی کیا جائے گا۔ "اور یہ "شگوفہ" ہی کی دین ہے۔ **غالب حسین، پٹنہ،**
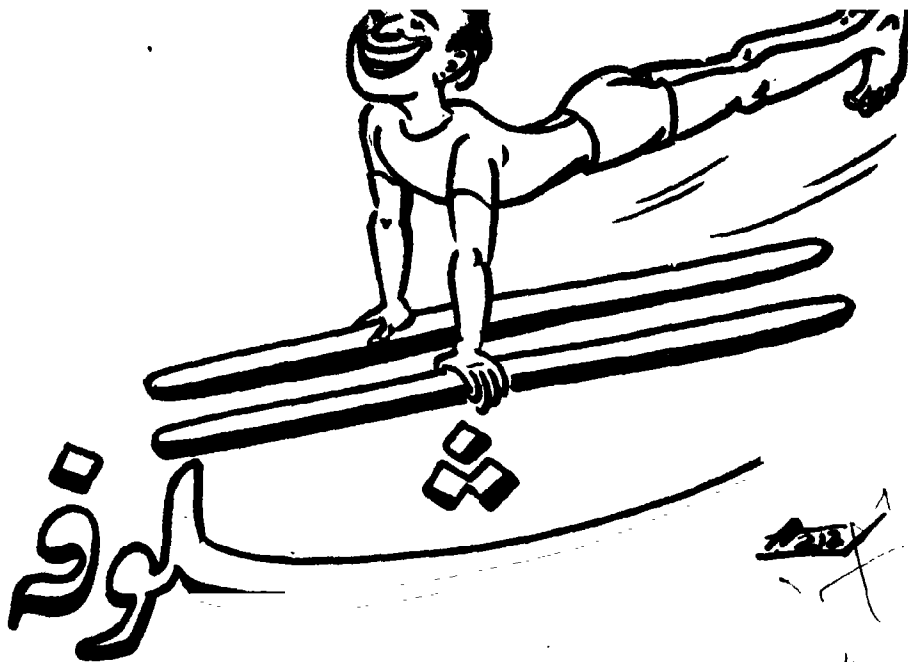
شگوفہ
STILL NO SIGNS OF ARRIVAL
THE MONSOON?
NO... THE WATER TANKER!
shoeb
Courtesy : Deccan Chronicle

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

جلد ۱۶ ——— جولائی ۱۹۸۳ء ——— شمارہ ۷

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: مسیح جلیل

ٹائیٹل: شعیب

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے۔ انفرادی ۲۵ روپیہ
بیرونی ممالک ۹۰ روپیہ
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۲۱ - ٹیچرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱۔ فون: 57776

عید مبارک

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ پارکو، سری نگر
۴۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک جونان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چیمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سیل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچیے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان:
پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

فہرست

آپ سے ملیئے

مالِ مفت (انشائیے)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

قاضی جی دُبلے ـــ (رپورتاژ)

برق و شرر (مستقل فیچر)

۲ ـ باتیں ـــ

پھُورت (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ
امریکہ کی آٹومیٹک
آئی ٹسٹنگ مشین
سے کروائیے
امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل
ٹکنالوجی کے مستند تربیت یافتہ
معیاری چشموں کی
تیاری کے لیے
تشریف لائیے
غوری
اینڈ
کمپنی آپٹیشن
ترپ بازار حیدرآباد
فون : 42127
کوالیفائیڈ آپٹیشن اکاڈمی آف
آپٹیشنری (امریکہ)

"شگوفہ" کا

"ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب

(حصہ نثر)

بہت جلد شائع ہوگا۔

مہمان مدیر ____ یوسف ناظم

اردو: ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر ظ۔ انصاری

ہندی: ڈاکٹر سرید حرمشرا، رتی لال شاہین

انگریزی: ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر سید حامد حسین

مراٹھی: ڈاکٹر عبدالستار دلوی

گجراتی: ڈاکٹر سکھانیا زویری

بنگالی: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

کشمیری: ڈاکٹر محمد زماں آزردہ

پنجابی: پروفیسر پیاز سنگھ سری، گرنام سنگھ تیر

کنڑی: حمید الماس

میتھلی: ڈاکٹر امجاد علی ارشد

ساتھ میں

بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے

اور "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں۔

رشید احمد صدیقی، پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، فرقت کاکوروی، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، وجاہت علی سندیلوی، شفیقہ فرحت، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، رشید قریشی، برق آشیانوی، مسیح انجم اور پرویز ید اللہ مہدی ____

★ اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری (علی گڑھ)

شگوفہ ۳۱- مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

خواجہ عبدالغفور ([illegible])

پیاز کے چھلکوں کا ملا دوپیازہ

فکر تونسوی۔ بقول خود یہ تو نقلی نام ہے اور اصلی نام کافی واہیات ہے، فکر نے لکھا ہے کہ اگر یہ تونسہ میں نہیں پیدا ہوئے ہوتے تو لاڑکانہ میں ہوتے یا کہیں اور۔ مقام پیدائش سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ اپنی جائے پیدائش کو بہت متبرک سمجھتے ہیں کہ وہاں ایک بہت بڑے بزرگ خواجہ نظام الدینؒ رہتے تھے جن کا تعلق خواجہ سلیمانؒ سے تھا، کہا جاتا ہے کہ ملک کی تقسیم کے وقت خواجہ صاحب نے اعلان کیا کہ اس علاقہ میں کسی ہندو کا قتل و خون ہوا تو مسلمانوں کو میری بد دعا لگے گی، چنانچہ وہاں پر امن و امان رہا۔

فکر کے ساتھ لاہور میں قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، احمد راہی وغیرہ سب ہی تھے، ان میں سے کسی نے اس کی ذمہ داری لی کہ لاہور سے ۳۰ میل تونسہ جا کر فکر تونسوی کی بیوی کو لاہور لائیں، چنانچہ جب یہ پہنچے خواجہ صاحب کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ ہندو خاتون کو لینے آئے ہیں تو انہوں نے کہہ دیا کہ کوئی ہندو عورت مسلمان مرد کے ساتھ نہیں جائے گی، خاتون کو سرحد پر پہنچا کر فکر صاحب کے حوالے کریں گے، چنانچہ یہی ہوا اور فکر اگست سے دسمبر تک لاہور میں ڈٹے رہے۔ اس وقت یہ ماہنامہ ادبِ لطیف کے دفتر میں کام کرتے تھے۔

اسی دوران ان کے دفتر میں ایک جوشیلا مسلمان شخص گھس آیا اور فکر سے کہنے لگا، باہر آؤ آج ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، ساحر لدھیانوی اور دیگر احباب نے کہا، یہ ہندو نہیں ہے مسلمان ہے اگر تصدیق چاہتے ہو تو شاہی امام [illegible] گے، اس شخص نے کہا، اچھا تو کلمہ پڑھو، فکر نے بڑی روانی سے کلمہ سنایا اور پھر سب کے سب [illegible] ہوئے کہ وہ مسلمان شخص بھی [illegible]

جب یہ تعلیم کے لیے تونسہ سے ملتان گئے اور ایف اے کی جماعت میں داخلہ لیا، اس زمانے میں قیام و طعام اور تعلیم کا ماہانہ ۲۰، ۲۵ روپے سے زیادہ خرچ نہیں ہوا کرتا تھا لیکن خاندانی مجبوریوں کے تحت انہیں واپس جانا پڑا اور یہ اپنی تعلیم

سے محروم رہ گئے لیکن یہ گھر نہیں لوٹے بلکہ ملتان کے ایک پریس میں نوکری کر لی چونکہ پریس کی تنخواہ سے گذر بسر مشکل تھا یہ پریس کے مالک کے گھر کا کام کاج بھی کرتے رہے، اور کچھ ترقی کی سوجھی تو سرمہ نور چشم بنانے والوں کے اشتہار دیواروں پر لکھتے رہے، ساتھ ساتھ ریڈیو پر بھی کچھ پروگرام ملتے رہے غرض کہ ان کا حوصلہ ہمیشہ اونچا رہا اولالعزمی کے ساتھ زندگی کی گتھیاں جھیلتے رہے۔ شادی کے وقت یہ بات چھڑی کہ آریا سماجی طریقے پر ہو کہ سناتن دھرمی، لڑکی والوں کے طور طریقے پر بحیثیت دلہا کے ان سے جب دریافت کیا گیا تو بولے مجھے تو دلہن چاہیئے آریہ سماج ہو کہ سناتن دھرم اور لڑکی والوں کی مرضی سے بیاہ رچایا گیا۔

ان کی قلمی کاوشیں ابتداً شعری تھیں ۱۹۴۳ء میں حلقۂ ارباب ذوق کی نشست میں انھیں بھی مدعو کیا گیا کہ اس مجموعہ میں ان کا کلام بھی شریک تھا یہ لاہور کے دیہاتی انداز میں شلوار قمیص اور کوٹ پہن کر پہنچے کوٹ کی جیب پر ان کی بیوی کے ہاتھوں سے کڑھا ہوا پھول بھی تھا انہوں نے اپنا دعوت نامہ بتایا لیکن ان کی اس ہئیت اور لباس کو دیکھ کر کسی نے بھی یہ نہیں یقین کیا کہ یہی شخص تو نسوی ہیں اور اتنی قدر عمدہ نظم ان ہی کی تخلیق ہے۔ انہوں نے انگریزی وضع قطع کا شہری لباس پہننا شروع کیا۔

ایک عرصہ تک یہ شاعری کرتے رہے لیکن ان کا خود کہنا ہے کہ وہ کسی کے پلّے نہیں پڑتی تھی اور لوگ انھیں شاعر نہیں مانتے تھے، جب یہ ملک کی تقسیم کے بعد دہلی آئے تو انہوں نے جو دُکھ صدمے اُٹھائے اور غارت گری دیکھی تو شاعری سے دل بجھ گیا اور یہ طنز و مزاح کے میدان میں اتر آئے اور غازی بن گئے۔

شاعری بند کرنے کی ایک اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جب ان کی شادی ہو گئی تو اُنہوں نے سوچا کہ بیوی اور شاعری ایک ساتھ نہیں رہ سکتے جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی ہیں۔

ان کا پہلا اور آخری مجموعۂ کلام 'بیولے' کے نام سے ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوا جس کے مقدمہ میں کنھیا لال کپور نے لکھا تھا، فکر دل نہیں دماغ کی شاعری کیا کرتے ہیں، سیاسی، سماجی، مذہبی رومانی شاعری سے ان کا تعلق نہیں، ہمیشہ یہ اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہیں چاہے وہ شعری تخلیق ہو کہ نثری،

ان کے فکر کی ترجمانی حسب ذیل منقولات کرتے ہیں:۔

سچائی اور دوستی میں بڑا فرق ہے۔

چونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے ہم نے روح ایجاد کر لی ہے اور اس کو لافانی کر دیا۔

ماضی کی قبر پر بیٹھ کر مستقبل کی مجاوری کرنا منفعت بخش ہے۔

خدا خود بھی پروپیگنڈہ کا سہارا لیتا ہے جب اس نے آفاق کی تخلیق کی تو اس نے اپنے پبلسٹی ایجنٹوں کی معرفت باقاعدہ اشتہار دیا کہ یہ میری بہترین تخلیق ہے۔

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں،

جیتے جی ہی لوگوں سے تعریف اور گالیاں سُننا چاہتا ہوں۔

انہوں نے مزاحیہ لغت کے کئی ابواب لکھے ہیں یہ کبھی ایک جگہ شائع ہو جائیں تو مزاحیہ ادب میں خاطر خواہ اور دلچسپ اضافہ ہوگا۔

یہ جب ہندوستان پہنچے تو دہلی میں ایک پلاٹ گل مہر پارک میں الاٹ ہوا انہوں نے جب نقشے وغیرہ منظور کرلئے تو لوہے کا کوٹہ بھی حاصل کیا یہ متعلقہ دفتر پہنچے اور منظوری کا مراسلہ بتاکر لوہے کا پرمٹ مانگا، دفتر والوں نے پوچھا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ آپ ہی فکر تونسوی ہیں، انہوں نے اپنی کتابیں اور بہت سارے حوالے دیئے لیکن کسی نے ان کی بات نہیں مانی، یہ مایوس ہوکر اس دفتر سے واپس ہونے لگے تو دفتر کے چپراسی نے ان کو الگ لے جاکر کہا، صاحب مجھے پانچ روپیہ دیجئے میں تصدیق کئے دیتا ہوں کہ آپ ہی فکر تونسوی ہیں،

انہوں نے سوچا سرکاری دنیا میں ان کی شخصیت صرف پانچ روپے کی حیثیت رکھتی ہے اور مناسب یہی سمجھا کہ مانگی ہوئی رقم دے کر پرمٹ لے لیں،

دلی ریڈیو سے یہ اپنے مضامین نشر کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے دلی ریڈیو کے ساغر نظامی صاحب کے پاس اسکرپٹ بھیج دیا اور ریکارڈنگ کے وقت پہنچے تو دیکھا کہ ساغر صاحب نے ان کے اسکرپٹ میں کئی جگہ سرخ روشنائی سے نشان کئے تھے۔ فکر صاحب کو کچھ اچھا نہ لگا، ساغر صاحب نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا خط کشیدہ حصہ بھی پڑھ لینا ہمیں اسکرپٹ پر قلم چلانا ہوتا ہے وہ ہم نے کیا۔ آگے آپ کی مرضی،

دہلی میں نشہ بندی ہوئی تو مے خانے بھی بند ہوگئے کچھ احباب ایک دفتر کے بند ہونے کے بعد اس کے احاطہ کے اندر برآمدہ میں اکٹھے ہوتے اس میں مخدوم محی الدین، راج کمل، مخمور وغیرہ بھی تھے پہلا جام تیار ہوا ہی تھا کہ پولیس کا سپاہی ڈنڈا بجاتے ہوئے وارد ہوا اور تحکمانہ انداز میں للکارا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ؟ پہلے تو سب گھبرائے لیکن فوراً ہی ایک پیگ تیار کرکے اس کی خدمت میں پیش کردیا۔ وہ بھی نہ معلوم کب کا تشنہ تھا رندوں میں شریک ہوگیا، نہ معلوم یہ نشست کب تک چلتی مگر اس دفتر کے ایک بڑے افسر جو دیر تک اندر بیٹھے کام کررہے تھے باہر نکلے اور ان کو بھگا دیا۔ مخدوم نے برف اٹھایا کسی نے بوتلیں سنبھالیں کوئی کچھ ترتیں کرد[illegible] کا مے خانہ جام و سبو کے ساتھ برخواست ہوگیا۔

فکر صاحب نے نام ہی کچھ ایسا رکھا ہے کہ بہت سوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں اکثر ہوا یہ ہے کہ کسی محفل میں مسلمان ہوں اور نماز کے وقت جب تیاریاں ہوتی ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے، فکر صاحب چلئے نماز کا انتظام برابر کے کمرہ میں ہے ایک بار یہ [illegible] وہاں حیدرآباد کے اجلاس کے لئے آگئے تو انہوں نے نریندر لوتھر کے گھر قیام کیا میزبان کی بیوی نے دیکھا کہ یہ باقاعدہ پابندی سے صبح غسل [illegible] ان سے پوچھ گئیں انہوں نے پوچھ کیا ڈالا، فکر صاحب آپ مسلمان ہوتے ہوئے بھی روزانہ [illegible]

انہوں نے [illegible] [illegible] [illegible] کی حیثیت سے [illegible] سال تک لکھتے رہے [illegible] [illegible] کی حاضری اور [illegible] کی علامت تھی انھیں کالم لکھنے کبھی کسی قسم کی دشواری نہیں محسوس ہوئی خیالات دماغ میں آتے رہتے اور قلم چلتا رہتا، کہتے ہیں ایک دن انہیں [illegible]

سوچنے پر بھی کوئی موضوع نہیں مل رہا تھا یہ اپنے آپ سے بولے دماغ تو صفر ہو گیا ہے اور جیسے ہی صفر کا لفظ زبان پر آیا وہی ایک عنوان بن گیا اور انہوں نے صفر کو آگے پیچھے لگا کر اپنا کالم تیار کر لیا۔

ابتداً انہیں اس کا بالکل احساس نہ تھا کہ ان کے کالم اتنے مقبول اور ہر دلعزیز ہیں کہ جس محلہ میں اخبار کی ایک کاپی پہنچ جاتی ہے وہاں آٹھ دس آدمی اکٹھے ہو کر کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کالم کو پڑھوا کر بڑی دلچسپی اور پابندی سے سنتے، جیسے کہ پرانے زمانے میں کتھا داستان ہوا کرتے تھے۔ ایک دن اسی طرح کے کچھ لوگوں نے ان کو تلاش کر کے درخواست کی کہ کسی دن وہ خود ان کے محلے میں جا کر اپنا کالم سنائیں چنانچہ یہ ایک حلقہ ذوق میں گئے تو کئی محلوں میں سے فرمائشیں اور درخواستیں آتی رہیں اور یہ اپنی سہولت سے ان کی تعمیل کرتے رہے۔

ایک دن ان کے اخبار میں ایک اشتہار شائع ہوا، گم شدہ بھینس کی تلاش، اس میں بھینس کی خصوصیات وغیرہ کی طرف اشارے تھے، اس دن انہوں نے اس کو موضوع بنا کر اپنا کالم لکھ ڈالا۔ جس دن یہ شائع اس دن اخبار کے منیجر نے ان کو بلا بھیجا اور اس گم شدہ بھینس کے مالک تشریف فرما تھے، جو بہت ہی ناراض تھے اور غصہ کر رہے تھے کہ ان کی بھینس کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی توہین کی گئی اس وقت تو کسی نہ کسی طرح بات رفت گذشت ہو گئی لیکن دو دن بعد اس بھینس کے مالک نے دفتر آ کر ان کا شکر ادا کیا کہ اشتہار کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے کالم کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی بھینس مل گئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ گھٹیا شاعر تو اچھا بڑھیا نثر نگار بن سکتا ہے چنانچہ طنز و مزاح کو اپنا کر انہوں نے ہزاروں صفحے لکھ ڈالے اور کروڑوں مداح پیدا کئے خود رو رو کر اوروں کو ہنساتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں رلانے کا فن اپنایا ہے۔ جدت اور تازگی کی تلاش نے انہیں ادبی موت کا شکار نہیں ہونے دیا نہ ہی جمود طاری ہوا ہے اور نہ اس کا امکان ہے، پیاز کے چھلکے چھیلتے ہیں اور تہہ بہ تہہ نچلی پرت سے تازگی ابھرتی ہے اس لئے اپنے نکاہی کالم کو پیاز کے چھلکے کا مستقل عنوان دے رکھا ہے اور اس حساب سے پرت در پرت فکاہات مطائبات مضحکات طنزیات ادھیڑتے ہیں، جن کو پڑھ کر لوگ کہتے ہیں :-

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

انہوں نے کبھی روپیہ پیسہ کی پروا کی نہ اس کی لالچ رہی لیکن اپنی قلمی صلاحیت کو انہوں نے مفت نہیں بانٹا اور نہ کم اڈوانس روپیہ مانگا، ان کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی آیا تھا کہ بیوی نے کہا چولہا جلانے کے لئے لکڑیاں نہیں ہیں اور نہ گھر کی جیب میں کچھ تھا کہ جس سے لکڑیاں خرید کر لائیں، یہ کہتے ہیں کہ وہ دن ان کی زندگی کا بڑا اداس دن تھا کہ انہیں کچھ کتابیں کے ہاتھ بیچنا پڑیں۔ کچھ عرصہ قبل تجویز ہوئی کہ ایک فنکشن کیا جائے اور روپیہ جمع کر کے ان کو حوالے کیا جائے، کسی نے یوں ہی موثر آجائے گی تو فکر صاحب کیا کریں گے؟ یہ بولے، سبزی ترکاری اس میں رکھ کر محلہ محلہ بیچتا پھروں گا۔

فکر کی تخلیقات میں قابل ذکر ہیں :-

زور خطابت، کچھ اپنی کچھ پرائی، شوخئ گفتار، عرق انفعال، پیاز کے چھلکے (آٹھ اخباری کالم) ماڈرن الہ دین، وارنٹ گرفتاری عالم بالا، ایک ماتم، فکرنامہ،

یہ فکر نہیں دراصل مفکر ہیں اس لئے انھوں نے فکرنامہ تصنیف کر ڈالا ان کے مزاح کی خوبی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہدف ملامت بناتے ہیں، لوگوں کو چڑاتے نہیں، یہ بسیار نویس اور زود نویس ہیں اس کے باوجود طنز و مزاح کا اعلیٰ ترین معیار برقرار رکھا ہوا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو طنز نگاری آج آخری لمحوں میں ہے اور فکر تونسوی کو آخری طنز نگار کہا جارہا ہے جو خود ہی نہایت گہرے طنزیہ انداز میں پوچھ رہا ہے،

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد؟

●●

قتیل شفائی (پاکستان)

تیری مرضی بیس لکھ یا بست لکھ
جو بھی لکھوائے تری دانست لکھ

کچھ لکھاڑی جس کو لکھتے ہیں نشست
تو شکاری ہے تو اس کو شست لکھ

ق۔ ط۔ مشکل پڑیں گر "قسط" میں
اپنی آسانی کی خاطر کِست لکھ

ایک کا مطلب چھلانگ اک دھات ہے
تجھ پہ چھوڑا جَست لکھ یا جِست لکھ

جب غزل کہنی ہو شاگردِ قتیل
قافیوں کی پہلے اک فہرست لکھ

(ردِّی سے)

سرپٹ حیدرآبادی

سرپٹ حیدرآبادی اور غالب دہلوی

بڑھاپا موجبِ تسکیں ہے نوجواں کے لیے
نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لیے

بموں پہ بم، یوں ہی برساؤ، میری جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی، آسماں کے لیے

ملال و حزن ہے، سرپٹ کے خانداں کے لیے
بنا ہے عیش، تجمل حسین خاں کے لیے

ارادہ ہے کہ، کروں میں بھی اپنا دست دراز
درازدستیٔ قاتل کے امتحاں کے لیے

اٹھا کے لکڑی، بڑھا مارنے جو میری طرف
اٹھا اور اٹھ کے قدم، میں نے پاسباں کے لیے

خدا کرے کہ، بلاؤں میں تو بھی گھر جائے
بلائے جاں ہے ادا تیری، اک جہاں کے لیے

یہ سننے والوں کی خواہش ہے ذم بھی مدح میں ہو
کرے قفس میں فراہم خس، آشیاں کے لیے

یہ کس نے، شکر و شکر نگر کا نام لیا
کہ میرے نطق نے، بوسے مری زباں کے لیے

زمیں کو مارے نہ ٹھوکر تو، اور کیا کرے وہ
بنا ہے چرخِ بریں، جس کے آستاں کے لیے

چرا کے بھر لیے سب، تم نے اپنی افشاں میں
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

تمام خون کروں کیسے، نذرِ خنجرِ ناز
رکھوں، کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لیے

ہے میرے واسطے بے کار، چلّو بھر پانی
سفینہ چاہیئے، اس بحرِ بیکراں کے لیے

ہیں، خضر، زیست میں بھی شاہ، بعدِ مرگ بھی شاہ
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

میرا کلام ہے سنجیدہ بھی، مزاحیہ بھی
کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لیے

سنائیں بزم میں سرپٹ سب اپنا ذاتی کلام
"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"

قطعات

آج بوڑھے ہیں وہ، جو کل تھے جوان
تیر، جو کل تھے آج ہیں وہ کمان
ایرکنڈیشن، کل جو تھی بلڈنگ
ہے وہی آج، ٹوٹا پھوٹا مکان

جو کہتے ہیں اپنے کو امامِ ہستی
دراصل وہ ہوتے ہیں غلامِ ہستی
جس کو وہ سمجھتے ہیں تجلّی دن کی
ہے درشکمِ روز، وہ شامِ ہستی

محمد برہان حسین

بدل گیا یہ زمانہ ... کیسا

آج سے تیس چالیس سال قبل کی ایک گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

"ارے یہ لڑکی کس کی ہے"۔ چھوٹی بیگم نے اپنے لڑکے کے خیال سے منّو بیگم سے پوچھا۔

"جی! نواب زناٹ جنگ کی سگی بھتیجی ہے؟"

"ہاں لیکن اس کے باپ کیا ہیں کون ہیں؟"

"جی۔ وہ زناٹ جنگ بہادر کے سگے یعنی حقیقی بھائی ہیں دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں"۔

چھوٹی بیگم نے جھنجھلا کر کہا "اری منّو! وہ خود کیا ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟

منو بیگم نے کہا "جی! وہ باغبانی کرتے ہیں، کتے پالتے ہیں اور نواب کے بھائی ہیں۔ اب کریں گے کیا؟"

کسی نے کہا "سنتا ہے زناٹ جنگ کے ایک بھائی سکریٹریٹ میں میعفہ دار ہیں"۔

منّو بیگم نے کہا "ہاں ہاں۔ ان سے بھی اس لڑکی کی رشتہ داری ہے لیکن دور کی"۔

"دور کی کیا مطلب۔ وہ تو زناٹ جنگ کے سگے بھائی ہیں۔ انہی کی لڑکی تو ہے"۔

"ہاں انہی کی لڑکی ہے لیکن۔ زیادہ رشتہ داری نہیں ہے یعنی میرا مطلب ہے"

چھوٹی بیگم نے کہا "ہاں بھائی۔ ہمارے بھی قریبی رشتہ دار ہیں جن کو رشتہ دار بولتے ہوئے شرم آتی ہے۔ غفور حسین ہی کو دیکھو۔ تعمیرات جیسے زرخیز محکمہ میں برسوں ملازم رہا۔ اچھے عہدہ پر رہا لیکن اوپر کی کمائی کا نام نہیں۔ بیوی بچوں کو روتی ہی اور خود جنت میں محل پانے کی امید میں زندگی تمام ایمانداری کی نذر کردی۔ میرے سسر نواب غلام صمدت جنگ کبھی ان کو رشتہ دار نہیں سمجھتے تھے۔ ہم نے بھی ان کے بچوں کو اپنی رشتہ داری سے خارج کر دیا ہے"۔ وہ زمانہ بڑے خاندانوں، بڑے ناموں اور بڑی حویلیوں کا تھا۔ جتنی بڑی حویلی اتنا ہی بڑا نام اور اتنی ہی دولت اور خاندان۔

تیس پینتیس سال میں زمانہ نے پلٹا کھایا۔ لوگ جنگ بہادروں کا نام عزّت سے لیتے تھے اب یہ نام بے کاری، بے ہنری، تن خوری کی علامت بن گئے۔ اب نواب کا مطلب ایک ایسا انسان بن گیا ہے جس کے پاس پرانی دیوڑھی ہے بہت سا پُرانا سامان اور خاندان کا نام ہے۔ اور بس!

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایک واقعہ لکھا کہ دہلی میں اُن کی کسی مغل نسل کے نوجوان سے بحث ہوئی تو اس نے کہا بخدا اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو مجھے زندگی بھر دہلی کا تخت نہ ملے"۔

یہ زمانہ تو عام آدمی کا ہے۔ اِس وقت پان کی دوکان اور ڈاکٹر کی ڈسپنسری کی آمدنی برابر ہے۔ پھر معمولی ٹائپسٹ ڈپلومار کھنے والے باہر کے ملکوں میں اس قدر کار ہے ہیں کہ ڈگری رکھنے والے، ڈگری چھپا کر چھوٹی چھوٹی ملازمتیں قبول کرنے لگے۔

ان حالات نے رشتہ داریوں کو ایک نیا موڑ دیا۔ ایک گفتگو ملاحظہ ہو۔

"اوہو! چنو بیگم! تمہاری بچّی اچھی نکلی جی۔ کیا کہیں رشتہ کی بات چیت ہوئی"

"نہیں آپا! ابھی کوئی جلدی نہیں ہے"

"دیکھو میرے بھائی کا بچّہ ڈاکٹر ہے وہ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی۔

چنو بیگم بولیں" نہیں آپا۔ اس کے باپ کسی عرب میں نوکری والے سے اس کی شادی کریں گے"۔

آپا بولیں" ارے۔ وہ کیا ہے جی معمولی پڑھے لکھے لوگ عرب گئے ہیں اچھے لوگ کیوں جاتے۔ دیکھو اگر تمہارا بیل اچھا ہے تو اُسے یہیں کوئی خرید لے گا اس کو نارسنگی کے بازار لے جانے کی کیا ضرورت ہے"

چنو بیگم بولیں" مگر آپا! اگر نارسنگی میں خراب بیل کی اتنی قیمت ملتی ہے کہ اچھے سے اچھے بیل کی اِدھر نہیں مل سکتی تو آپ بیل کو کہاں لے جائیں گے"۔... اس میں شک نہیں اس کے پاس بڑی ڈگری ہے مگر میری مانو تو یہ ڈگری چھپا کر رکھ دو کبھی زمانہ بدلے گا اس کی قدر کھلے گی اب تو اس لڑکے کو میٹرک کے سرٹیفکٹ پہ عرب میں سیلزمین کرا دو۔ پھر شادی کا پیام بھجواؤ۔

ہماری پڑوسن مسز محسن، بڑی ہمدرد خاتون ہے۔ اُن کی خادمہ گوری بی کثیر الاولاد ہے اور شوہر ڈرائیور ہے۔ مسز محسن نے بڑی کوششوں سے اُس کے شوہر کو عرب بھجوایا۔ شوہر نے پہلے ہی مہینہ سے تین ہزار روپئے اپنے گھر بھجوانے شروع کر دیئے۔ چند ماہ میں گوری بی کے لئے نوکری کرنا دوبھر ہو گیا۔ ایک دن گوری بی نے دھنیا دھوپ میں سکھانے رکھا اور وہ نالی میں گر گیا۔ مسز محسن نے باز پرس کی تو گوری بی نے کہا" دس روپئے کے دھنیئے کے لئے آپ مجھے ڈانٹ رہی ہیں میں دس کے بیس دیدوں گی"۔

آخر ایک دن گوری بی نے صاحب کی آمدنی پوچھی تو مسز محسن نے کہا" یہی کوئی آٹھ ہزار روپئے"!

گوری بی نے کہا" واہ بی بی۔ کیا انصاف ہے۔ دس ہزار آمدنی والے کی بیوی کو آٹھ ہزار آمدنی والی بیوی کی غلامی کرنا پڑتا ہے۔ بی بی صاحب کو اُدھر کوئی کام نہیں مل سکتا کیا؟ عرب کو بھجوانا تھا اُدھر معمولی کام بھی کرے تو اس سے زیادہ پیسہ مل جاتا ہے۔

موجودہ ماحول میں رشتہ داروں کی شادیوں میں جانا اور بلانا دونوں ہی مسئلہ بن گئے ہیں۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہیں عرب سے آتے ہیں تو بچوں کو ہماری تنخواہ کے برابر عیدی دے کر چلے جاتے ہیں۔ اور جب وہ اپنے بچہ کی سالگرہ کرتے ہیں، تو ہم لوگ ہاتھ میں پیسے رکھنے کے خیال سے پریشان ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ایک بھتیجہ کی شادی میں جو عرب میں ٹائپسٹ ہے مظفر بھائی نے پچیس روپے سلامی دی۔ دوسرے دن جب تحفے اور سلامیوں کا حساب کتاب ہورہا تھا تو ہر لفافہ سے نوٹوں کی بارش ہورہی تھی اتنے میں ہماری بھتیجی نے ایک لفافہ سے پچیس کے نوٹ نکالے اور نعرہ لگا "اے یہ پچیس کس مفلس نے رکھے؟" لفافے پہ نام پڑھنے سے پہلے ہی دوسری بھتیجی نے نعرہ لگایا" ابا کے کوئی قلاش رشتہ دار ہوں گے"، اور جب نام پڑھا گیا تو رشتہ داری اور افلاس دونوں کی تصدیق ہوگئی اور ہنسی کا دورہ پڑا۔

چھوٹی بیگم کے دولڑکے عرب میں تھے اور وہ اب خود کو بڑے لوگوں میں شمار کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ اس وقت ایک رشتہ دار کی لڑکی کے مانجھے کی تقریب میں آئی ہوئی تھیں۔ اترتے شباب پر فارن میک اپ چڑھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیہ سے لگی ہوئیں۔ تین ہزار کی ساڑی اور تین ہزار کا زیور پہنے بیٹھی تھیں۔ ان کی نند غریب فاطمہ بی، اپنی شادی کی گھسی ہوئی ساڑی پہنے داخل ہوئیں اور پان زدہ اونچے دانت دکھاتے ہوئے چھوٹی بیگم سے کہا "اوہو، بھابی۔ کہیئے بیٹے، داماد خوش ہیں، کہاں ہیں آپ کے پاس کرسالے ہیں؟"
چھوٹی بیگم کو ان کی بے تکلف گفتگو بری لگی اور کوئی جواب نہ دیا۔ فاطمہ بی کھسیانی ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ایک گوشہ میں قمر جہاں بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے اشارہ سے اسے بلالیا اور کان میں کہا "تم کیوں ان سے بولیں۔ اُن کو اللہ میاں تری دے رہا ہے مگر سمجھ نہیں رہے ہیں"

فاطمہ بی نے کھسر پھسر شروع کی "کیا ہوا؟" قمر جہاں نے کہا "بیٹی کی شادی میں ....
فاطمہ بی باقی جملہ نہ سن سکیں چونکہ بازو سے ایک لڑکا چیختا ہوا دوڑا۔ فاطمہ بی نے بھنّا کر کہا "توبہ۔ کیا شور ہے بھائی۔ چلو اُدھر بیٹھ کر سکون سے بات کریں"

قمر جہاں نے کہا "یہیں بیٹھو۔ اس ہنگامہ میں ہم لوگ سب کی برائیاں کریں گے اور کوئی نہ سن سکے گا نہ سمجھ سکے گا۔ الگ بیٹھیں گے تو بعد میں مجھے عورتیں الگ الگ پکڑلیں گی "کیا بول رہی تھی وہ کٹنی" "کیا لگا رہی تھی وہ گھر اجاڑن"
فاطمہ بی جو رکوع تک اٹھ گئی تھیں پھر بیٹھ گئیں۔ "تو پھر بولو نا جلدی ان کی ٹنگ کون توڑا"
قمر جہاں بولیں "میں ان کی بیٹی کو اپنے منجھلے کے لئے مانگی تھی۔ تو جواب ملا آپس میں شادیاں کرنے سے خاندان بڑھتا نہیں۔ ..... لیکن معلوم ہوا کہ ان کا ارادہ دوسرا ہی تھا..."
فاطمہ بی بولیں "اچھا ہی خیال تھا نا"
قمر جہاں بولیں "اری دیوانی۔ یہ جتنے نئے نئے مالدار بنے ہیں ان میں یہ بڑا احساس ہے کہ پرانے خاندانی مالدار لوگوں کو جو عزت سوسائٹی میں ملتی ہے وہ انھیں نصیب نہیں ہے۔ اس لئے ایسے لوگ ان خاندانی مالداروں سے رشتہ

کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور پھر آج کل ہر ماں باپ ایک لاکھ روپیہ جمع کرکے لڑکی کے لئے ڈاکٹر تلاش کرتے ہیں؟

فاطمہ بی نے کہا "تو یہ کیا لمبی بات کرتے بیٹی! اصل لوگ تو ملنے کی بات بولو جلدی۔"

قمر جہاں نے کہا "تو چھوٹی بیگم بھی اونچے اڑنے کی کوشش میں زناٹ جنگ کی حویلی تک جا پہنچیں۔ ان کے دو لڑکے عرب میں ہیں۔ بڑا بی کام ہے اور چھوٹا ڈاکٹر ہے۔ چھوٹی بیگم نے اس قدر جہیز کی پیشکش کی کہ وہ راضی ہوگئے لیکن چھوٹی بیگم ڈاکٹر لڑکے کو مانگتی تھیں اور زناٹ جنگ کی بیگم یا بیوہ بی کام لڑکے کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔

اس کشمکش کا نتیجہ بڑا خطرناک نکلا۔ ہوا یہ کہ شادی "ادھر کے" ہوگئی لڑکا آیا، شادی ہوئی اور لڑکا ایک ماہ بعد لڑکی کے ساتھ عرب واپس ہوگیا۔ پندرہ بیس دن بعد لڑکی کا خط آیا "امی اپنے کو دھوکہ ہوگیا، میرا دولہا یعنی اُنھوں .... ڈاکٹر نہیں ہیں اگرچہ زناٹ جنگ کے ہی لڑکے ہیں۔"

چھوٹی بیگم نے کہرام مچایا، خوب دھمکیاں دیں لیکن اپنے ہی گھر میں زناٹ جنگ کی اونچی حویلی میں سناٹا ویسے ہی قائم رہا۔

■■

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

لاسا اسپیشل چائے
اور
لمسا چاکلیٹ چائے
اپنے
۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ
مکمل کر لیے ہیں

LASA
TEA

ڈاکٹر آفتاب احمد
(مونگھیر)

مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ زندہ دلی سے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟ ہاں اتنی بات ضرور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ خود کو زندہ دلوں میں ضرور سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ جو لوگ زندہ ہیں ظاہر ہے کہ ان کا دل بھی زندہ ہی ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے مُردوں کو بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے میرے شہر کے ایک معروف مقام پر کسی عاشقِ نامراد کا مزار ہے۔ اس مزار کے قریب سے جب بھی کسی کا فرادا حسینہ کا گزر ہوتا ہے تب مزار کے اندر سے سرد آہوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں جتنے منہ اتنی باتیں سننے میں آئی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ شہیدِ حسن کی زندہ دلی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مرحوم کی زندہ دلی ہی ہے جو مرنے کے بعد بھی اسے خطروں سے کھیلنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔

دراصل زندہ دلی کی ترکیب بھی غالبؔ کی شعری تراکیب کی طرح کسی حد تک پیچیدہ ہے اور مختلف شارحین نے اس کا مفہوم اپنے مزاج کے مطابق نکالا ہے۔ بہرحال زندہ دلی میرے نزدیک ایڈونچر سے شوق کا نام ہے۔ کہتے ہیں زندگی کا اصل مزہ ایڈونچر میں ہی ہے۔ گویا انسان کی زندگی میں ایڈونچر نہیں تو سمجھ لیجئے کچھ بھی نہیں۔ مسائل کے گرد چکر لگاتے لگاتے انسان کا گردشِ مدام سے گھبرا جانا بالکل فطری عمل ہے کیوں کہ وہ پیالہ و ساغر تو ہے نہیں۔ لہٰذا عقل مند لوگ مسائل کے گرد طواف کرنے کے بجائے نت نئی معلومات کے حصول میں مصروف رہتے ہیں۔ ایڈونچر کیا ہے، خطروں سے کھیلنے کا نام ہے۔ اس کھیل کا ایک مزے دار پہلو یہ ہے کہ جب کوئی خطرہ سے کھیلتا ہے تو دوسروں کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خطرہ اس کے لئے فٹ بال کی مانند ہوتا ہے جسے وہ ٹھوکر لگا کر کسی دوسرے کی طرف سرکا دیتا ہے۔

ایک واقعہ سنئیے: ایک بار میں ایک پسنجر ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ (میں اردو میں بھی سفر کر رہا تھا اور انگریزی میں بھی "SUFFER" کر رہا تھا)۔ ریل کے ڈبے میں بھانت بھانت کے مسافر سوار تھے۔ ضعیف العمر، ادھیڑ، نوجوان، عورتیں، بچے۔ ظاہر ہے نوجوان جہاں کہیں بھی ہوں گے زندگی کی رمق وہاں آ ہی جاتی ہے۔ ریل گاڑی کی رفتار کے متعلق میں صرف یہ کہوں گا

کہ وہ بیل گاڑی سے زیادہ تیز چلتی تھی۔ پھر اس کے چلنے اور رکنے میں بھی بڑی ہم آہنگی تھی۔ یعنی یہ کہ اگر گاڑی دس منٹ چلتی تو اس کے بعد دس منٹ سستانے لگتی۔ یعنی راستے میں رک کر دم لینا اس کی فطرت تھی۔ بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ اس کی اس فطرت پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اس کے برخلاف نوجوان بڑے اطمینان سے سفر کر رہے تھے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس خلائی دور میں نوجوانوں کا یہ اطمینان کیا معنی رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں نوجوانوں کا نظریہ یہ تھا کہ جتنا زیادہ وقت ان کا ریل پر گزرے گا ان کے ٹکٹ کے پیسے اتنے ہی زیادہ وصول ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہ نوجوان کاہل یا سست ہرگز نہ تھے بلکہ وہ ایڈونچر کے دلدادہ تھے۔ جس کسی بھی اسٹیشن پر گاڑی رکتی وہ اترتے، ادھر اُدھر ٹہلتے، وہاں سے متعلق معلومات فراہم کرتے، چائے، سگریٹ یا دیگر اشیاء خریدتے اور جب گاڑی چلنے لگتی تو وہ لپک کر سوار ہو جاتے۔ گویا وہ زندگی کا اصل لطف اٹھاتے ہوئے بڑے مزے سے سفر کر رہے تھے لیکن ڈبے میں سوار ایک بزرگ ان کی اس حرکت سے سخت ناخوش نظر آرہے تھے۔ جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو وہ ازراہ ہمدردی نوجوانوں کو چلتی ہوئی ٹرین پر سوار ہونے سے باز رہنے کی تاکید کرتے ہوئے حفظ ماتقدم اور احتیاط پر ایک لمبا سا لکچر جھاڑ دیا۔ ان کے اس لکچر کا اثر کچھ الٹا ہی ہوا۔ نوجوانوں میں سے ایک جو شاید ادب کا طالب علم رہا ہوگا، ان بزرگ سے بڑے مودبانہ انداز میں کہا کہ حضور زندگی تو حرکت و عمل کا ہی دوسرا نام ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیں یہی درس دیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں تک عقل سے کام لینے کی بات ہے تو اس ضمن میں میں کہوں گا کہ عقل ہماری رہنمائی کرتی ہے یہ تو صحیح لیکن ہم ہر معاملہ میں اس کی رائے کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اقبال ہی کا شعر ہے ملاحظہ ہو ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

نوجوان نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جب تک انسان خطروں سے کھیلنے کا عادی نہ ہوگا کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ اقبال کے اس شعر کو مثال کے طور پر پڑھا جاسکتا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تقریر نے نوجوانوں میں نیا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ نوجوانوں نے اپنے نمائندے کی تقریر کی داد ہم آواز ہو کر نعرۂ مستانہ کی صورت میں دی۔ ادھر موصوف کے چہرے پر ویسی ہی جھلاہٹ اور بوکھلاہٹ طاری تھی جو اس پلیئر کے چہرے پر ہوتی ہے جسے امپائر خواہ مخواہ ایل۔ بی۔ ڈبلیو آؤٹ قرار دے دیتا ہے۔

خطرات سے خط اٹھانے کا شوق صرف یونیورسٹیوں کے طالب علموں ہی کو نہیں بلکہ دیہات میں رہنے والے بوڑھوں، ادھیڑوں، نوجوانوں، عورتوں اور بچوں کو بھی یکساں طور پر ہے۔ اگر آپ بس پر سفر کرتے وقت سونے کے عادی نہ ہوں گے تو علاقوں کے لوگوں (بلا تفریق عمر و جنس) کو کسی گھنے درخت کے سائے میں سڑک پر بیٹھے ہوئے، سوئے ہوئے، گفتگو کرتے

ضرور دیکھا ہوگا۔ شاید اُس حرکت کو آپ ان کی بے تہذیبی یا بدتہذیبی سمجھتے ہوں۔ لیکن حقیقتاً ان کا یہ عمل ایڈونچر سے ان کی دلچسپی کا مظہر ہے۔ ان لوگوں کو سڑک کے کنارے یا کبھی کبھی عین وسط میں (جہاں کہیں بھی درخت کا سایہ ہو) بیٹھ کر سڑک پر جانے والی تیز رفتار گاڑیوں کے گزرنے سے ہوا کا جو جھونکا گزرتا ہے اس سے محظوظ ہونے کا بڑا شوق ہے۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے ذرا سا خطرہ مول لیتے ہیں اور بس۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی حادثہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے شوق کی تکمیل بہرحال مقدم ہے۔ زندگی کا مزہ لوٹنا ہے تو خطرات سے کھیلنا ہی پڑے گا۔

میرے ایک دوست ہیں جنھیں خطرات سے کھیلنے سے خاصی دلچسپی ہے۔ لیکن ان کا دائرہ محدود بھی ہے اور عجیب و غریب بھی۔ انہیں لوگوں کو قرض دینے اور پھر اس کی وصول یابی میں زور آزمائی کرنے کا شوق ہے۔ خطروں سے کھیلتے ہوئے انھیں ٹھوکریں بھی بہت لگی ہیں۔ جیسی کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کے کھلاڑیوں کو بھی تو چوٹیں لگتی ہیں۔ پھر "خطرے" کے کھلاڑی کو چوٹ لگنا تو کوئی غیر معمولی بات ہوئی نہیں۔ بہرحال اب قرض کی وصول یابی میں وہ خاصے مشاق ہوگئے ہیں۔ ان کے پاس ایسے ایسے گر ہیں کہ صدیوں پرانا قرض بھی قرض داروں کے خاندان والوں سے وصول کر سکتے ہیں۔ یہ بات میں نے دوستی کی بنیاد پر نہیں کہی ہے بلکہ خود موصوف کا ہی یہ دعویٰ ہے۔ شاید اس دعویٰ کو آپ شاعرانہ تعلّی سے مطابقت رکھنے والی کوئی شئے تصوّر کریں۔ لیکن میرے نزدیک ان کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ کیوں کہ انھوں نے خود ناچیز کی کئی بار مدد کی ہے اور ہر بار مجھے ان کے توسط سے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگر آپ کو کبھی ضرورت پڑے تو میں ان کا نام اور پتہ بتا دوں گا آپ اطمینانِ خاطر رکھئے۔ بس شرط صرف یہ ہے کہ آپ بے خوف ہو کر زندہ دلی کا مظاہرہ کریں اور خطرات سے کھیلتے ہوئے اپنے واقف کاروں کو دل کھول کر قرض دینا شروع کردیں۔

خطروں سے کھیلنا ہی زندگی ہے، اس امر سے تو آپ بھی اتفاق کرنے لگے ہوں گے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور زندہ دلی کچھ اور نہیں خطرات سے کھیلنے کو کہتے ہیں۔ جس شخص کو خطرات سے کھیلنے کا شوق نہیں وہ نہ خود زندہ کہلانے کا مستحق ہے اور نہ ہی اس کا دل۔ ظاہر ہے جب دل ہی زندہ نہ ہوگا تو زندہ دلی کا مظاہرہ وہ کیا کرے گا۔

زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے۔ مفکرین کا کہنا ہے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ ہر عمل کا ردِ عمل موافق ہی ہو۔ کبھی کبھی بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے، ولی بات ہو جاتی ہے۔ اللہ والوں کا خیال ہے کہ انسان تو مجبور محض ہے اور دنیا کے کارخانہ کا ہر ذرّہ ذرّہ خدا کی مرضی سے چلتا اور بند ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سارا credit اور Discredit اللہ میاں کو جاتا ہے۔ لیکن جب انسان زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرات سے کھیلتا ہے تو معاملے کی نوعیت کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر نتیجہ خاطر خواہ نکلا تو credit انسان کے کھاتے میں چلا جاتا ہے۔ ہر ذی شعور انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ credit حاصل کرے۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرے اور قدم قدم پہ خطرات سے کھیلنے کا خود کو عادی بنالے۔ کیوں کہ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ انسان credit حاصل کرسکتا ہے اور discredit سے خود کو سوفی صدی محفوظ رکھ سکتا ہے۔ آخر میں میں آپ کو صرف یہ مشورہ دوں گا کہ پُرخطر راہ پر چلنے سے جب کوئی آپ کو باز رکھنے کی تاکید کرے تو ایک سالک کی طرح لاحول پڑھنے کے بجائے یہ مصرعہ پڑھیئے گا۔ مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔ ■■

...نہ بنے

نظر برنی

قصۂ "جیب کٹی" اس کو بتائے نہ بنے
رعبِ بیگم کے سبب ہونٹ ہلائے نہ بنے
اپنے دامن کو بہانوں سے سجائے نہ بنے
"نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے"

اُس کی پھونکوں سے بجھا اپنا چراغِ محفل
تاش بازی بھی ہوئی جام ہوئے لاحاصل
میری بربادی میں سسرال ہوئی ہے شامل
"میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے"

رازِ خفتہ کو مرے پھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کہیں وہ اپنی قسم توڑ نہ دے بھول نہ جائے
رُخِ تقدیر مرا موڑ نہ دے بھول نہ جائے
"کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے"

ایسی وحشت کا بُرا ہو کہ بھلے ہیں تو کیا؟
ایسی عجلت کا بُرا ہو کہ بھلے ہیں تو کیا؟
ایسی ہیبت کا بُرا ہو کہ بھلے ہیں تو کیا؟
اس نزاکت کا بُرا ہو کہ بھلے ہیں تو کیا؟
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

اپنی بیگم کی طرف پھر سے ہوا ہوں راغب
ایک روح ایک نفس بن تو گئے دو قالب
آخرش عشق بڑھا حُسنِ بلا کی جانب
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے"

غزل

پاگل عادل آبادی
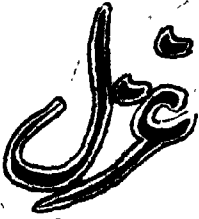
آتا ہے نظر یہ بھی تماشا مرے آگے
پکڑے ہے گلا باپ کا بیٹا مرے آگے

کل تک جو نظر آتا تھا چوزہ مرے آگے
وہ آج نظر آتا ہے گینڈا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا شان ہے سسرال میں میری
سالا مرے پیچھے ہے تو سسرا مرے آگے

سڑکوں پہ نظر آتے ہیں ایسے بھی تماشے
مجنوں کو تھپک دیتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ہر شو کی، ہر اک کیو میں مجھے روز ہی یارو
آتا ہے نظر شیخ کا کنبہ مرے آگے

میں کھا کے کڑی ٹوٹنے والا تو نہیں ہوں
بہتر ہے کہ رکھ دیجئے مُرغا مرے آگے

پچھلے کی ہے ہڑبونگ تو چھٹّی کی ہے گڑبڑ
چلتا ہے شب و روز یہ لفڑا مرے آگے

کالج میں مرے نام کے اب بجتے ہیں ڈنکا
ٹیچر بھی ہلا لیتے ہیں چمچے مرے آگے

قوال کی محفل ہو کہ ہو محفلِ جاناں
چندے کا نظر آتا ہے ڈبا مرے آگے

پاگل کا زمانے نے لہو چوس لیا ہے
ورنہ وہ تھا قربانی کا دُنبہ مرے آگے

ڈاکٹر سمیع بن سعد
لکچرار ۔ مدرسہ بہادر یالیہ ۔ اِراق.

★

خدا بخشے مولانا حالی فرما گئے ہیں ؎

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا ٭ آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

ہم اس شعر پر یہ شوشہ چھوڑ سکتے ہیں ؎

لنگڑا، طوطا پری، دلفریب ٭ آم کی بھی ہیں سیکڑوں قسمیں

لیکن یہاں نہ ہمیں آم کی اقسام گنوانی ہیں نہ اس کا شجرۂ نسب بیان کرنا ہے، یہاں تو اس کی ذات والا صفات کا ذکر مقصود ہے ورنہ یہ مضمون آم پر انشائیہ نہ ہو کر بوٹانی کا کوئی ڈزرٹیشن یا تھیسس بن جائے گا۔ تو صاحب! آم کی تعریف ہمارے گڈن میاں نے جن الفاظ میں کی ہے وہ تمام تعریفوں پر بھاری بلکہ جامع اور مانع ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ صاحب "آم آم ہے اور بس" تو ہمیں بھی یہاں آم کھانے سے کام رکھنا چاہیئے۔ قسمیں گنوانے سے کیا فائدہ۔ دروغ برگردن راوی' (بے چارے کی گردن پر دروغ کا ہمالیہ جمع ہو چکا ہوگا۔ جو اٹھتا ہے ایک وزن کا اضافہ ہی کر جاتا ہے) روایت ہے کہ جب حضرت آدم کو جنت سے رخصت کیا جانے لگا اور روح ارضی ان کے استقبال کو بے چین ہونے لگی تو خاک سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کو جنت سے جدائی کے اس رنج والم میں بھی اس بات کا خیال رہا کہ جنت کے کچھ پیڑ پودے زمین پر بھی لے چلیں تاکہ شغل ارض داری یعنی باغبانی قائم رہے ورنہ وہاں کریں گے کیا؟ تو انھوں نے مختلف میوے پوشیدہ طور پر اپنے ساتھ لے لئے ایک بغل میں آم کی گٹھلی بھی دبا لی۔

آم جنت کا میوہ ہو نہ ہو، ہندوستان کا تو خاص میوہ ہے۔ اور از شمال تا جنوب اور مشرق تا مغرب ہر ہندوستانی آم سے نہ صرف واقف ہے بلکہ اس سے صد درجہ شغف بھی رکھتا ہے چاہے اسے آم کہئے۔ چاہے انبہ۔ چاہے کچھ اور وہ ہے آم ہی۔

آم سے جب اولادِ آدم کو رغبت ہوئی تو اپنی فطرت کے عین مطابق چپکی نہ بیٹھ سکی اور آم پر بھی اس نے دستِ شفقت رکھا۔ اس کی قسمیں پیدا کیں۔ پیوندکاری کی، اسے ہر جگہ لگایا۔ یہاں تک کہ کھانے کے ساتھ آم ادب کے دسترخوان پر بھی داخل ہے۔

ادب میں آم کا ذکر اتنی کثرت سے ملتا ہے کہ شک ہوتا ہے کہیں آم نے اپنی پبلیسٹی کا باقاعدہ انتظام تو نہیں کر رکھا ہے۔ کیوں کہ آج کل ہر سیاسی لیڈر اپنی شہرت کے لئے کہیں تو بچکانہ حرکت کرتا ہے یا پھر جا و بے جا کام کرتا ہے۔ یا پھر کوئی سنسنی خیز بیان دے مارتا ہے، حاصل کچھ نہیں ہوتا لیکن شہرت مل جاتی ہے۔ وہ بھی وقتیہ — جیسے ہٹلر نے تو اپنی شہرت کے لئے گوئیلز کو اپنا پبلیسٹی منسٹر مقرر کر دیا تھا اور وہ جا و بے جا ہر جگہ ہٹلر کا نام ضرور داخل کرتا تھا کبھی کبھی اس سے عجیب بوالعجبی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ مثلاً ایک اعلان کی سرخی تھی — ہٹلر — کتے جرمنی میں بہت ہو گئے ہیں۔ مطلب تو یہ تھا کہ ہٹلر نے ایسا کہا ہے لیکن بیچ کا وقفہ پریس میں چھپ نہ سکا تھا۔ ہمیں شک ہے کہ اسی طرح آم بھی جا و بے جا دخل انداز ہو کر اپنی پبلیسٹی کرتا ہے۔

آم کی مشہور اقسام کا ذکر تو علم نباتات کی کتب میں تفصیل سے موجود ہے۔ لیکن عام آدمی کو تو اسے کھانے سے کام ہونا چاہئے اور اسے ہوتا ہے۔ اس کا شجرۂ نسب دیکھ کر بھلا وہ کیا کرے گا۔ پھر بھی مشہور اقسام کے نام بازار میں سننے کو مل جاتے ہیں۔

لنگڑا :- نہ جانے اس کا نام لنگڑا کیسے ہوا۔ پہلے تو ہم سمجھے شاید یہ ان کا تخلص ہو گا۔ کیونکہ تخلص اتنا عام ہے کہ ہمیں شک ہونے لگتا ہے۔ پھر سوچا کوئی خوبی ہوگی۔ آخر اس نام کی کوئی وجہ تسمیہ تو ہوگی ہی۔ جیسے مرزا چپاتی جو ہر جمعرات کو چپاتیاں تقسیم کرتے تھے۔ مرزا کدال جن کی ناک کدال جیسی تھی۔ تیمور لنگ جن کے پیر میں لنگ تھا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد ذہن کے لائٹ لگے کہ شاید یہ آم تیمور لنگ کو بہت پسند ہوگا۔ یا پھر اسی نے اس کو لگایا ہوگا۔ کیوں کہ اس زمانے میں لوگ صرف پیڑ لگاتے تھے اکثر کے پھل نہیں کھاتے تھے۔ مشہور حکایت ہے کہ ایک بادشاہ نے دورانِ سفر دیکھا کہ ایک بوڑھا آم کا پودا لگا رہا ہے۔ اس نے پوچھا بڑے میاں تم تو اس کے پھل نہیں کھا سکو گے، پھر کیوں محنت کر رہے ہو۔ اس بوڑھے نے کہ حکایات لقمان کا عالم فاضل تھا جو جواب دیا وہ تمام انسانیت اور اس کی بقا کے لئے سبق بن گیا اور بنا رہے گا جب تک درجہ اول و دوم کی کتب تیار ہوتی رہیں گی۔ لیکن آج کا حکمراں اگر بوڑھے کو اس قسم کی حرکت کرتا پاتا تو ان کے درمیان اس قسم کا مکالمہ ہوتا۔

بڑے میاں تم تو زندہ نہیں رہو گے۔ آم کا درخت کیوں لگا رہے ہو۔ بوڑھا حضور! یہ ہائی برڈ آم ہے۔ ابھی چند روز میں فصل دینے لگے گا۔ حاکم — ! اچھا بڑے میاں، لیکن تم نے اس کی پرمیشن لی ہے کیا۔ یہ غیر قانونی ہے۔ تمہیں PENALTY بھرنی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ انکم ٹیکس بھی، — بوڑھا۔ لیکن حضور آم تو نہیں آئے۔ حاکم — ! آم آئیں نہ آئیں۔ ہم سمجھ جائیں گے آگئے ہیں فوراً انکم ٹیکس ایڈوانس میں بھر دیجئے۔

ملغوبہ :- جسے ہم عام لوگ ملاوٹ کہتے ہیں۔ جب صاحب ہر چیز میں ملاوٹ ہونے لگی ہے تو آم کہاں محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ حیدرآباد دکن کا آم ہے۔ مشہور ہے کہ حیدرآباد کے مشہور سائنس داں آم یار جنگ نے مختلف آموں کا رس جمع کیا۔ اور ایک کھوکھلے چھلکے میں بھر کر اسے دوبارہ بو دیا جو پھل نکلا وہ ملغوبہ کہلایا۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ یہ خام ہی نام ہے۔ بطور مجموعہ قسم کی کوئی شئے نہیں۔

طوطا پری :- "یہ ہندوستان ہے پیارے" پھر اس قسم کا نام یہاں نہ ملتا تو امر تعجب خیز تھا۔ لال پری۔ طوطا پری یہ نام سن کر ہی ہم کوہ قاف میں پہنچ جاتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرتے ہیں جو شہزادوں نے بھی نہ کی ہوگی۔

گھر جاکر جب بیگم اپنی حقیقت سے واقف کراتی ہے تب معلوم ہوتا ہے اس میں نہ کوئی خوبی طوطے کی ہے اور نہ پری کی۔ بس آم ہے۔

ہاپوس:۔ عروس البلاد دکن میں اس کا بڑا چرچا ہے۔ ہم نے بھی کھائے مزہ نہ آیا۔ لوکل چھوٹا سا آم، جو سرا سر گٹھلی ہوتا ہے اور جس کے گرد رس کا لیپ ہوتا ہے اُسے چوسنے میں جو مزہ ہے وہ کسی اور آم میں کہاں۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی قسمیں ہوں گی۔ افسوس ہم نے دیکھی، سنی، چکھی نہیں ہیں اس لئے گنانے سے فائدہ؟

اب ذرا عام زندگی میں آم کی آمد و رفت، اور اس کے سیزن کا ذرا سا نقشہ سن لیجئے۔ آم کا بازار جہاں لگتا ہے وہاں گہما گہمی کا عجیب عالم رہتا ہے جس طرف دیکھئے چھوٹے، بڑے، ہرے، پیلے کالے آموں کے ڈھیر ہیں۔ مکھیاں جھنجھنا رہی ہیں۔ کچلے آم پڑے ہیں۔ سڑے آم الگ ڈھیروں میں ہیں کہ ان کے شوقین بھی موجود ہیں۔ آم والوں کی چیخ و پکار الگ ہے کہیں وزن سے بک رہے ہیں کہیں ایک ایک کے بھاؤ سے۔ ہمارے علاقے میں سترہ کا پہاڑہ ہے۔ دو سترہ ۲۵ کہلاتے ہیں غرض آم والا ایک نمونہ آم کا ہاتھ میں لئے ہر ایک آنے جانے والے کو رس چکھا رہا ہے۔ ہتھیلی پر رس ڈالتا ہے لوگ تبرک کے طور پر چاٹ لیتے ہیں۔ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ گڈن میاں نے گزشتہ سال آم کھانے کی یہی ترکیب نکالی تھی۔ بڑی سی تھیلی لئے بازار پہنچ جاتے، ہر دکان پر آم چکھتے آگے بڑھ جاتے اور ایک دو گھنٹہ بعد تمام بازار کے آموں کا مزہ لے کر پیٹ بھرے واپس آ جاتے۔ اس سال نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ دکانداروں نے انھیں آم چکھانے بند کر دیئے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے گھر روزانہ بازار کا سا نقشہ رہتا اور بیگم الٹے لٹکائے ہوئے آموں سے نظر اتارتی ہیں کیونکہ کبھی انھیں کھٹے آم لے کر دھوکہ کھانا پڑتا ہے۔ اس بازار پر آموں کی عجیب بوطاری رہتی ہے جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے بیان نہیں۔ غرض میں کیا کہوں یہ بھی تو اک تماشا ہے!!

اور اب ادب اور آم کے باب زریں کی طرف آیئے۔ ادب اور آم، آم اور ادب ایسا لگتا ہے لازم و ملزوم ہوگئے ہیں غالب نے آم کیا کھائے، ہر شاعر آموں کا شوقین ہو گیا ہے۔ یہ ہم ہندوستانیوں کی فطرت میں شمار ہے۔ کوئی چیز ہمارے مزاج کے موافق ہو نا موافق ہم اس کی پرواہ کئے بغیر تقلید شروع کر دیتے ہیں۔ چاہے اچھا خاصا آدمی کارٹون کیوں نہ دکھائی دے۔ ہم تقلید نہیں چھوڑیں گے۔ ہاں صاحب! غالب کے آموں سے متعلق لطائف یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ گدھا انھیں نہیں کھاتا۔ غالب نے آم کی تعریف بھی بڑے فلسفیانہ انداز میں کی ہے۔ میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ اور جسے آم مل جائے اُسے کیا چاہئے وغیرہ ان کے مطابق آم پر کھانے والے کا نام لکھا ہے انھیں یہ فلمی گانا یاد نہیں ہوگا۔

دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام ۔ قطرے قطرے پہ لکھا ہے پینے والے کا نام

آم پر بھی لکھا ہے کھانے والے کا نام ۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وغیرہ وغیرہ

اسی طرح اکبر الہ آبادی کو بھی آم کا بہت شوق تھا۔ پیام یار کے ایڈیٹر کو انھوں نے اپنی مشہور فرمائشی نظم آموں کے بارے ہی لکھی تھی ؎

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے ۔ اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے

ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں ۔ پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں ۔ تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

وغیرہ وغیرہ

اقبال کو بھی آموں سے بے حد رغبت تھی۔ ڈاکٹر نے انھیں آم کھانے سے منع کیا تو انھوں نے اصرار کر کے ایک آم کھانے کی اجازت حاصل کی اور ایک کلو کا بلیٹی آم پلیٹ میں رکھ لیا کہ یہ بھی واحد آم ہے۔

اب ہمارے غزل گو ہوں یا مزاح نگار یا فلسفی یا شاعر۔ مذکورہ بالا بزرگوں کی تقلید میں آم کے شوقین بن گئے۔ اسی طرح جس طرح جگر و جوش غالب کی مئے نوشی کی تقلید کرتے تھے نتیجہ یہ کہ جہاں مشاعرہ ہوا۔ شعراء نے نخرے شروع کئے اور جام مٹے اور آم کی فرمائش شروع کردی۔ نتیجہ یہ کہ مشاعرے والے پہلے ان دو چیزوں کا انتظام کرتے ہیں بعد میں سامعین کا شطرنجیوں کا۔ روشنی کا وغیرہ وغیرہ کا۔

آم نے ادب میں کافی اضافہ کیا۔ منتخب الحکایات کے ساتھ آم کا ذکر لغت میں بہت ملتا ہے۔ وہاں آم کے بارے میں کئی محاورے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ بلکہ گڈن میاں کو تو شک ہے کہ لغت نویسوں نے جہاں عام کا لفظ لکھا ہے اس کا مطلب بھی آم ہی ہے۔ مثلاً جلسۂ آم۔ دعوتِ آم۔ آم لوگ۔ آم پبلک وغیرہ لیکن ایسے محاورے بھی ہیں جہاں آم واقعی کھانے کا آم لگتا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ آم کھانے سے کام پیڑ گننے سے مطلب۔ آم کھائے گٹھری ڈنڈ بھرے باغبان اپنے آم کو کھٹا کون کہے وغیرہ۔

آم کھانے کے بھی کچھ آداب ہیں جو دعوت عام میں برتے جاتے ہیں لیکن یہ میں صرف اسی وقت بتا سکتا ہوں جب مجھے اس کا عملی مظاہرہ کرنے کا موقع ملے۔ تو قارئین بتلایئے آپ کی کیا رائے ہے۔

صلائے آم ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے ــــ میں منتظر ہوں۔

□□

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کے دو مجموعے

فقط البتہ

۸/- روپے ۱۰/- روپے

معرفت ماہنامہ شگوفہ عابد روڈ

سید مصطفیٰ تاج

(بھوپال)

ٹی وی اور بی وی

ٹی وی (T.V) اور بیوی (B.V) میں مناسبت کا اندازہ تو اُن کو ہی ہو سکتا ہے جن کے پاس خوش قسمتی یا بدقسمتی سے
[ن] ہوں ۔ اور صاحب، جس نے اپنی بیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اس کی سگی بہن ٹی وی کو بھی اپنے گھر میں
[لے] لیا ہے .... تو پھر یقین جانیئے، تیسری بہن جن کا شبھ نام ٹی بی (T.B) ہے، وہ بھی بن بلائے مہمان کی طرح کسی وقت بھی
[آپ] کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر آپ کے گھر میں داخل ہو جائے گی۔

یہ تینوں بہنیں ۔ T.V . B.V . T.B ۔ ایک ماں کی جائی ہیں .... اُن کی عادت، خصلت، طور طریق، صورت
[،] سب ایک جیسی ہے .... آپ پر، آپ کے گھر پر، آپ کے ذہن پر اور آپ کے جسم پر اُن کی حکومت آپ کی آخری سانس
[تک] رہتی ہے .... یہ دوسری بات ہے کہ یہ کبھی کبھی آپس میں کام بانٹ لیتی ہیں۔

آپ کو اگر میری بات پر یقین نہ آئے تو تجربہ کر لیجئے۔

ذرا آپ اپنے ٹی وی کا انٹینا ہلا کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو اپنی بیوی کی تصویر نظر آنے لگے گی۔ وہ بھونچال آئے گا، وہ بادل گرجیں
[گے]، وہ طوفان سر اٹھائے گا کہ خدا کی پناہ !! ۔ کبھی حلق سے آواز نکلے گی، کبھی ہونٹوں سے سلب ہوگی، منہ بھی ٹیڑھا ہوگا، زبان
[قینچی] کی طرح چلے گی، کمر میں سیکڑوں بل پڑ جائیں گے۔ آنکھیں مٹکنے لگیں گی۔ ہاتھ پیر وسلی کی طرح چلنے لگیں گے، گردن ساڑھی کی
[طرح] ڈولے گی ۔ غرض کہرام مچ جائے گا۔

اب جب تک آپ اپنے انٹینا کا رُخ دوسرا سبھا یعنی ٹی وی ریلے اسٹیشن کی طرف نہیں موڑیں گے یہ طوفان نہیں تھمے گا۔
اب اگر آپ نے اپنی بیوی کا انٹینا ہلا دیا تو .... تو .... تو .... آسمان گر جائے گا، زمین پھٹ جائے گی۔ بادل کی
[گرج] سے زیادہ برتن پھوٹنے کی آوازیں آئیں گی۔ ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کے خاندان کے تمام بزرگوں کی ساری آواز دل
[میں] گھلا کر دس بعد ایکشن ٹرو کاپی کر کے آپ کو سنائی دے رہا ہے ۔ اب جب تک آپ اس کے انٹینا کا رخ پکچر ہاؤس کی طرف

نہ موڑیں یہ طوفان کسی طرح رُکنے کا نام نہ لے گا۔

تو آپ نے دیکھ لیا کتنی مناسبت ہے T.V اور بیوی میں! آپ ذرا سی T.V کی ناب غلط موڑ دیجئے، تصویر تڑپ کرنے لگے گی۔ میکانک کو آپ قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں کہ آپ نے صرف ناب موڑی تھی، لیکن صاحب! اسے یقین نہیں آئے گا۔ بلکہ وہ اُلٹا آپ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اِدھر اُدھر اُنگلی گھما کر بتاتے جائیں گے کہ سارے کنکشن ڈسٹرب ہو گئے، والو ڈھیلے ہو گئے، ٹیوننگ غلط ہو گئی۔ اور آخر کار آپ بے بس ہو جائیں گے۔

اِدھر آپ اُن کی دوسری بہن B.V کا پرائیوٹ صندوق اپنی گمشدہ رسید تلاش کرنے کی خاطر کھول لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ آپ چاہے قرآن سر پر اٹھالیں یا ان کے سر کی قسم کھا کر کہیں کہ میں نے تو صرف مکڑی کا عطردان کھولا تھا اپنی رسید دیکھنے کے لئے! مگر کیا مجال جو وہ آپ کی بات پر یقین کرلیں.... وہ تو یہی کہے جائیں گی کہ: "میرے سارے کپڑے گڈ مڈ کر دیئے، سب سامان اُلٹ سلٹ کر دیا۔ اس کتاب میں میرا سو کا نوٹ رکھا تھا وہ بھی نہیں مل رہا ہے.... لونگ، الائچی کا پورا ڈبہ بھرا تھا، آدھا رہ گیا.... اب یہ بھی لے جاؤ، سب اپنے دوستوں کو کھلا دو۔ وقت بے وقت اپنی عزت چھپانے کے لئے کوئی چیز گھر میں چھپالو تو وہ بھی نہیں رہنے دیتے۔

اب مجبوراً سارے الزام اپنے سر ڈال کر غصّہ میں گھر سے باہر نکلنے میں ہی عافیت ہے!

تو صاحب! آپ نے دیکھا، کتنی مناسبت ہے T.V میں اور B.V میں.... اور دیکھئے بیوی کے رشتہ دار اور سہیلیاں اور میکے والے آپ کی بیوی سے ملنے آتے ہیں۔ گھر آپ کا ہے مگر آپ کو بالکل نو لفٹ کر دیا جاتا ہے۔ بس آپ کی بیوی سے بات کریں گے ان کی تعریف کریں گے، اُن کے بچوں کی تعریف کریں گے، ان کے سلیقے کی تعریف کریں گے.... ہاں آپ کا بھی خیال اُن کو اس وقت آئے گا جب آپ کی بیوی آپ کو حکم دیں گی کہ: "ارے بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اُن کے لئے کچھ ناشتے واشتے کا سامان لاؤ".... تب کہیں ایک آواز آئے گی کہ: "بیچارے بہت اچھے آدمی ہیں!"

بالکل اس طرح ٹی وی دیکھنے والوں کا تعلق بھی آپ سے زیادہ آپ کے ٹی وی سے رہتا ہے۔ اِدھر آپ کا ٹی وی کھلا اور پڑوس کی عورتوں اور بچوں کی "یلغار" شروع ہوئی!.... آپ سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں، صرف ٹی وی سے ہے یا آپ کی مہربان بیوی سے! آپ کو نو لفٹ مگر آپ کے گھر کی ہر چیز کو اس طرح استعمال کریں گے جیسے اُن کی اپنی ہو۔ کسی نے صوفہ کھینچا، کسی نے کرسی کوئی اسٹول پر اچک گیا۔ کوئی سلائی مشین پر! کوئی ٹیبل کا سامان سرکا کر جم گیا تو کوئی ــــــ خیر یہ ذکر چھوڑیئے۔ صورت حال یہ ہے کہ بیوی ایک پاؤں سے ناچ رہی ہیں۔ کسی کو تکیہ دے رہی ہیں، کسی کے پیچھے کشن ٹھونس رہی ہیں ــــ اور اگر حسنِ اتفاق سے اتوار کو فلم دیکھنے آپ کے سسرال والے آگئے تو پھر آپ کو بھی چکری کا ناچ ناچنا پڑے گا۔ کبھی دوڑتے ہوئے چائے کے دور لا رہے ہیں، تو کبھی جلدی جلدی اسٹو میں ہوا بھر رہے ہیں۔ کبھی کسی بچے کو لئے صحن میں ٹہل رہے ہیں تو کبھی کسی کو پیشاب کرا رہے ہیں.... اور پھر یہ طوفان ڈھلنے کے بعد بھی سکون نہیں ملے گا۔ اُن لوگوں کے جاتے ہی گھر کی صفائی میں جُٹ جائیے۔ ٹوٹے ہوئے گلدان کو جوڑنے کی کوشش کیجئے، پھولوں کی پتیاں سمیٹ کر انھیں حسرت سے دیکھئے۔ ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور پیالیوں کو جھاڑئے

لرن رکھیئے۔ اور ناک بھوں نہ چڑھائیے ورنہ سمجھ لیجئے آپ کی بیوی کا انٹینا اپنی جگہ سے سرک جائے گا اور آپ کو پھر اُس کا
پھر ہاؤس یا کافی ہاؤس کی طرف موڑنا پڑے گا۔

ہمارے یہاں ٹی وی میں اسٹیبلائزر لگانا بھی ضروری ہے جو کرنٹ کو کنٹرول کرتا ہے۔ انٹینا کا حل تو آپ نے نکال لیا
کا رخ ٹی وی اسٹیشن کی طرف کر دیا اور بی وی کے انٹینا کا رخ پکچر ہاؤس یا کافی ہاؤس کی طرف موڑ دیا لیکن یہ اسٹیبلائزر جو والیوم کنٹرول کرتا ہے اسکا کیا
۔ کیوں کہ بیوی کی آواز کبھی کبھی اتنی خطرناک حد تک اونچی ہو جاتی ہے کہ چھتیں ٹوٹنے لگتی ہیں اور کبھی اتنی مدھم ہو جاتی
خود اُن کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے!

میں نے ایک ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب! سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے آپ لوگوں کے پاس ہر قسم کی
ین آگئی ہیں جیسے سانس میں گڑبڑ ہے تو آکسیجن کی مشین لگا دی، خون کا دباؤ کم ہے تو ڈرپ لگا دیا، دل کی دھڑکن تیز ہو
کو کنٹرول کرنے کی مشین لگا دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب یہ آواز کنٹرول کرنے والی مشین ۔۔۔ میرا مطلب ہے بیوی کی آواز اور
کنٹرول کرنے کے لئے کوئی اسٹیبلائزر جیسی مشین بھی آپ نے ایجاد کی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مایوسی کے ساتھ گردن ہلا دی اور جب میں مایوس ہو کر جانے لگا تو انہوں نے
کے انداز میں مجھ سے کہا کہ بھائی اگر آپ کو کہیں ایسی مشین مل جائے تو وہ خرید لینا، مجھے بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔ اور
جب تک آپ کو یہ مشین نہ ملے آپ اپنی جھکی ہوئی گردن اور نیچی نگاہوں سے اس کا کام لے سکتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے اگر
ن پر کنٹرول نہ بھی ہوا تو پکچر ٹرپ نہیں ہوگی اور نہ ہی تصویر لہرائے گی۔

اور پھر رازدارانہ لہجہ میں بولے: "اگر آپ نے یہ احتیاط نہیں برتی تو یقین جانیئے تیسری بہن بھی آپ کے گھر وارد ہو جائیگی۔
نام T.B ہے اور جس کے آنے کے بعد ہر چیز اجاڑ ہو جاتی ہے آپ کے دالو آہستہ آہستہ ویک ہو جائیں گے۔ پھر چاہے آپ
لائزر لگوائیں یا انٹینا میں بوسٹر لگوائیں۔ چاہے انٹینا کا رُخ ودھان سبھا کی طرف کریں یا لوک سبھا کی طرف، پکچر آنا تو دور کی
ہے، آپ کے T.V میں کرنٹ بھی نہیں آئے گا۔

تو میرے بھائی میں یہ کہہ رہا تھا کہ T.V، B.V اور T.B ایک ماں کی جائی ہیں۔ ایک کو اٹھاؤ تو دوسری کو بٹھاؤ اور دوسری
تو تیسری کو اٹھاؤ۔

اور دیکھئے بیوی کو معمولی بیماری ہو جائے تو احتیاط سے سہارا دے کر، رکشا میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لیجانا پڑتا ہے
ٹر صاحب جیسے ہم سے زیادہ بیوی کے کل پرزوں سے واقف ہیں۔ جو چاہتے ہیں مرض بتا دیتے ہیں اور جتنی قیمتی دوائیں
ہیں دے دیتے ہیں۔ انکا پر بھی بس نہیں چلتا تو چلتے وقت پری کاشن دیتے ہوئے کہتے ہیں اچھی غذا اور آرام کی
ت ہے اور ایک ٹیپ کا بند بھی لگا دیتے ہیں کہ "انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیجئے۔"

آیئے اب دوسری بہن کا حال بھی سُن لیجئے۔ وہ اُن سے زیادہ نازک مزاج ہیں ذرا آپ نے طاقت سے اُن کی نا...

ری۔ بس جہاں ہیں وہیں سانس روک کر کھڑی ہو جائیں گی۔ اب اُن کو بھی رکشا میں بٹھا کر نہیں بلکہ گود میں رکھ کر میکانک کے
ں لیجائیے۔ میکانک صاحب ایک اچٹتی ہوئی نظر اُن پر ڈالیں گے اور جو چاہیں گے فالٹ نکال دیں گے، جتنے چاہیں گے پیسے
لیں گے اور بغیر چوں چرا آپ کو ان کا حکم ماننا پڑے گا اور وہ بھی ڈاکٹر کی طرح آخر میں ایک ہی بات کریں گے:
"ذرا احتیاط سے استعمال کیجئے۔ نازک مشین ہے"

اور تو اور صاحب ایک جان لیوا خبر اور کچھ دنوں سے سننے میں آرہی ہے کہ ہمارے گھر میں اب سالی یعنی T.V کے سا
بہت جلد ہی سالے صاحب یعنی V.C.R خاں بھی تشریف لانے والے ہیں۔ جن کے استقبال کی بڑے زور و شور سے تیاریا
ہو رہی ہیں۔

خدا آپ لوگوں پر اور سب کے صدقے میں اس خاکسار گنہگار پر رحم فرمائیے۔ (آمین) ○

اِدارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
○ کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/-	روپے
○ نقط	یوسف ناظم	مضامین	۸/-	"
○ البتہ	" "	"	۱۰/-	"
○ سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-	"
○ دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-	"
○ آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	"
○ بالآخر	" "	مضامین	۱۴/-	"
○ سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۵/-	"
○ رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵/-	"
○ خواہ مخواہ	رشیدالدین	"	۱۰/-	"
○ چٹکیاں نشاط کی	برہان حسین	"	۱۰/-	"
○ گویم مشکل	ڈاکٹر مجیب ضیاء	"	۱۲/-	"
○ غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲/-	"
○ ٹائیں ٹائیں فش	پروفیسر یداللہ مہدی	"	۱۵/-	"

رؤف خوشتر
لیکچرر گورنمنٹ کالج بیدر

پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی نگاہیں جس طرح عالمی بنک پر مرکوز ہوتی ہیں بالکل اسی طرح میری نگاہیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی لمبی لمبی زلفیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ اُس کی پُشت میری طرف تھی۔ جب اس نے رخِ جمال میری طرف موڑ دیا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی حسین دوشیزہ نہیں بلکہ ایک نوجوان تھا۔ جس کو اب تک میں زلفوں والی حسینہ سمجھ بیٹھا تھا۔

بُرا ہو اس جدید فیشن کا جس نے مرد و زن میں سارا فرق مٹا دیا ہے اور مساوات کی لہر خواتین کے علاوہ اب مردوں کے شانوں پر زلفوں کی صورت میں لہرا رہی ہے۔

ایک دن ہم نے ایک زلفِ دراز، ہپّی قسم کے نوجوان سے اس کے روزمرّہ پروگرام کے متعلق پوچھا۔ کہنے لگا صاحب اِس حُلیے کے لئے گھنٹوں ریاضت کرنا پڑتا ہے۔ جب کہیں قطرہ گہر بن کر سامنے آتا ہے۔ جس طرح رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، جھانسی کی رانی اور شریمتی اندرا گاندھی کو آہنی خاتون بننے کے لیئے مستقل مزاجی، عالی ہمتی، اور جہدِ مسلسل کے زیورات سے خود کو لیس کرنا پڑا۔ اسی طرح ہم نوجوانوں کو صنفِ نازک کے قریب تر ہونے کے لئے بڑے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"الارم رکھ کر صبح چار بجے اٹھنا، تیز بلیڈ سے شیو بنوالینا، ایک ایک بال کو چہرے سے یوں اکھاڑنا جیسے حکومت سماج کی برائیوں کی بیخ کنی کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ شیو کے بعد چہرہ پر کریم ملنا۔ پھر غسل خانہ کی طرف لپکنا۔ پانی میں خوشبودار سیال ملانا۔ جسم پر خوشبودار مصالحہ دصابن استعمال کرنا۔ غسل کے لیئے دو گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔"

"پھر قدآدم آئینہ کے روبرو مختلف زاویوں سے خود کو سنوارنا، پاوڈر چہرہ پر تھوپنا، ہونٹوں پر ہلکی سی سُرخی لگانا، پھر فراک نما شرٹ اور شلوار نما ڈھیلی ڈھالی پتلون زیب تن کر کے شوخ رنگ کا مفلر گلے میں لپیٹ کر چھماتے سینڈل پہن کر باہر نکلنا۔ اب آپ ہی بتائیے اتنی مصروفیت کے بعد ہمیں پڑھنے اور دوسرے کاموں کے لئے وقت کہاں بچا رہتا ہے؟"

میں اس کا گڑگڑاتے والا پروگرام سُن کر جھوم جھوم اُٹھا اور بے اختیار کہہ اُٹھا۔

سارے جہاں سے اچھا یہ نوجواں ہمارا

ایک طرف تو ان نوجوانوں کی زلفیں پریشان ہیں تو دوسری طرف اُن کے ماں باپ الگ پریشان ہیں۔ سنا گیا ہے کہ یہ صنفِ نو سوائے زلفوں کے کوئی اور بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھانے کے لئے تیار نہیں۔

مجھے ایک ہندو دوست کی لڑکی کی شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ وہاں عصری سہولت کے مدِنظر دولہا میاں کی دراز زلفوں سے دلہن کی ساڑی کے پلّو کو باندھا گیا تھا۔ حاضرین اس کو اگنی پھیرے کی بجائے 'زلفی پھیرے' کہہ رہے تھے۔ شامیانہ کے اونچے ڈائس پر دولہا اور دلہن کے دو بورڈ رکھے گئے تھے۔ غالباً اس لئے کہ شرکاء کو پریشانی نہ ہو کہ دولہا کون ہے اور دلہن کون؟ القصہ جب رخصتی کا وقت آیا تو حسبِ روایت دولہا میاں کو اپنی دلہن اٹھا کر لے جانا تھا لیکن دولہا میاں اتنے نرم و نازک تھے کہ وہ بمشکل سوٹ اور بوٹ اٹھائے ہوئے تھے۔ اور جن کے سہرے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے پھولوں کو زلفوں میں ٹانکا گیا تھا۔ بھلا ایسا دولہا کیسے دولہن کا بار برداشت کر سکتا ہے۔ مجبوراً نوکر کی خدمات حاصل کرنی پڑی اور وہ اپنے قوی بازوؤں میں دولہن کو اُٹھا کر شبستان تک چھوڑ آیا۔ میں سوچتا رہا کہ یہ نئی نسل کہاں کہاں تک منت کشِ خادم ہوتی رہے گی۔

میرے ایک عزیز ہوٹل کے منیجر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب دو شخص ان کے یہاں قیام کے لئے آتے ہیں تو بڑی پریشانی ہوتی ہے کہ یہ دونوں دوست ہیں یا میاں بیوی۔ اگر شوہر و زن ہوں تو رجسٹر ان کے سامنے رکھتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ آپ میں جو بھی شوہر ہیں اپنا نام درج کیجئے۔

اس سلسلے میں ایک عجیب اشتہار نظر سے گزرا۔ نفسِ مضمون یوں تھا۔

"ضرورت ہے ایک صحت مند لڑکا نما لڑکی کی جو میرے لڑکے کی شریکِ حیات کے علاوہ آیا کے فرائض بھی انجام دے سکے۔ سارے کام خود کرسکے لڑکا نازک ہے۔ اور مشکل سے کلرکی کرتا ہے۔ ملازم پیشہ خاتون کو ترجیح دی جائے گی۔ تاکہ ہمارا نورِ نظر لختِ جگر ملازمت سے سبکدوش ہو جائے۔ اس کا وزن زلفوں اور اونچے جوتے سمیت ۹۰ پونڈ بال چاندی میں سفید ہوئے ہیں تو کیا ہوا خضاب پابندی سے لگاتا ہے۔ دانتوں کے دو سیٹ رکھتا ہے کھانے اور مسکرانے کے لئے علٰحدہ علٰحدہ۔ یہ اُونچا سُنتا ہے۔ اور نمبر والے سیاہ چشمہ سے اپنی ایک چشم کی بدولت سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ ہمیشہ چھڑی لئے گھومتا ہے۔ اس لئے کہ کُتّے اور بچے عجیب مخلوق سمجھ کر تنگ کرتے ہیں۔"

ایسے نوجوانوں کی تعداد میں برابر کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جب بھی محلہ کے کسی موڑ پر اپنی نازک اور پتلی کمر کو بَل کھاتے زلفوں کو لہراتے ہوئے یہ تیسری صنف نکلتی ہے تو بچے گانا شروع کرتے ہیں۔

نیم گرل، نیم گرل
یورپ کی نقل نیم گرل
صحت نہ عقل نیم گرل
سو و نہ اصل نیم گرل

کاف ۔ ایک ۔ عابدی
(بھاگلپور)

رُوداد ۔ ایک جدید مجنوں کی

ہندوستانی ادب پر تو عورت چھائی ہوئی ہے ۔ ہم نے کچھ افسانے اور ناول پڑھے ۔ اور کچھ شاعری کا مطالعہ کیا ۔ کیوں نہ اپنے دل کو ایک ناری کے خیال سے سجالیں ۔ حالاں کہ ناری کا خیال آتے ہی ناری کی تپش محسوس ہوتی ہے وہ اس لئے محلے کے بہت سارے گھروں سے ہر روز آواز کی چنگاری بلند ہوتے دیکھتا ہوں ۔ لیکن خدا بھلا کرے ان ادیبوں کا جنہوں نے اس مخفی راز کو فاش کر دیا کہ ہند کی سرزمیں پر جوانان ہند جوان ہوتے ہی گنگنا نا شروع کر دیتے ہیں کہ ؎ ۔

دل پہ دستک سُنائی دیتی ہے
کون میرے مکاں کے باہر ہے

القصہ مختصر میرے بودے ذہن نے بھی ہندوستانی ادب کو یاد کرنے کی رٹ لگانی شروع کر دی اور میں گنگنا اٹھا ؎

دل کی کتاب پر کوئی تصویر چھوڑ دے
کب سے ہمارے ذہن کا کمرہ اُداس ہے

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عشق کی تیاری کے لئے کتابوں کو چھوڑنے لگا ۔ تھیوری مکمل کرنے کے بعد پریکٹیکل کے لئے چوک کے گرلس اسکول کو منتخب کیا (کیوں کہ اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ عشق کی ابتدا اسکول سے ہوتی ہے) اپنی تازدل سے پلی دادا میاں کی یاد سائکل نکالی اور پہنچ گیا دشتِ جنوں کی سیاحی کی ابتداء کرنے کے لیئے ۔ گھڑی نے ڈانٹ پلائی " اتنی جلدی ابھی تو جنت کا دروازہ کھلنے میں ایک گھنٹہ باقی ہے پان کی دوکان پر وقت گذارنے کے لیئے کھڑا ہوگیا ۔ سگریٹ خرید کر ہونٹوں میں لگائی اور آئینہ میں اپنا تھوبڑا دیکھ کر گنگنا اٹھا ؎ ۔

بڑی فرحت ہے اس میٹھے زباں میں
محبت کے سوا کیا ہے جہاں میں

یکایک اسکول کے دروازے نے پری پیکروں پلس دلہ ذا دلیوں کو اگلنا شروع کر دیا۔ دماغ اؤٹ آف کنٹرول بسو نچنے سمجھنے کی قوت ماؤف۔ منتخب کرنے کی طاقت سلب ہوگئی کبھی سوچتا اس کا پیچھا کروں کبھی سوچتا اُس کا۔ یک بارگی میں نے دیکھا ایک نقاب اٹھا چنچل آنکھیں بجلی گرائیں۔ لب مسکرا دیئے جواباً میں نے پورے دانت دیکھا دیئے۔ ابھی میں سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک رکشہ ویلن بن کر آیا اور پلک جھپکتے اُسے اپنے اندر سما کر چل پڑا۔ میں نے اپنی حالت درست کی اور سائکل پیچھے لگا دی۔ اس پری وش کو پھر سے دیکھنے کی چاہ میں کچھ اسپیڈ اور تیز کی۔ رکشہ سے آگے نکل مڑ کر جو دیکھا تو حواس خبط ہوگئے۔۔۔ اس آہو چشم کے ہاتھ جبیں پہ سلام کے لئے اٹھے ہوئے تھے۔ سلام کا جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ رکشہ سے رومال ہلتا نظر آیا۔ رومال رکشہ سے باہر کی طرف ہلتا دیکھ کر میرا دل خوشی سے قطب مینار ہوگیا۔ رومال فوراً اچک لیا۔ ایک ہلکی سی تعریفی چیخ کانوں میں گونج اٹھی گویا اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

اپنے پہلے عشق کی کامیابی پر خوشی سے پھول کر کُپّا ہوا جا رہا تھا۔ رکشہ جب ایک گلی میں مڑا تو میں بھی گھس پڑا۔ دیکھا کہ توبہ شکن گلبدن سیم تن ماہ رو ماہ ناز مہ جبیں نازنیں جانِ تمنا جانِ بہار جانِ ادا جانِ صبا دل رُبا مہ لقا کافر ادا پری پیکر وغیرہ وغیرہ اتر کر ایک مکان میں داخل ہونا چاہتی تھی کہ میں نے بلند آواز میں نعرہ لگایا "جانِ جگر سلام تو لیتی جانا" اتنا کہکر مڑنا چاہتا تھا کہ آنکھوں کے آگے قوس و قزح رقص کرنے لگے۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ ڈسکو ڈانس کی لائٹنگ ہو رہی ہے لیکن ایک کرخت آواز نے کانوں میں گرم سیسہ ڈال دیا "جانِ جگر سے مل چکے اب خادمِ جگر سے ملو"۔ منگیتر میری اور جانِ جگر تم کہو گے ساتھ ہی ایک پچاس پونڈ کا گھونسہ ذری مل گیا۔ میں نے منمناتے ہوئے کہا "جناب۔۔جناب آپ غلط سمجھ رہے ہیں میری کوئی غلطی نہیں۔ انہوں نے خود مجھے متوجہ کیا مجھے سلام کیا۔ یہ رومال بطور نشانی دی" غلط بالکل غلط" پردے کی آڑ سے جواب موصول ہوا میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "آپ نے اسکول کے سامنے نقاب ہٹا کر مسکراتے ہوئے مجھے اشارہ نہیں کیا تھا؟"

غلط میں نے اپنے رکشہ والے کو بلایا تھا۔

آپ نے رکشہ پر مجھے سلام نہیں کیا تھا؟

غلط میری پیشانی پر جو بال آگئے تھے اسے ہٹا رہی تھی۔

آپ نے یہ رومال مجھے نہیں دیا تھا کہہ دیجئے یہ بھی غلط ہے۔

بالکل غلط۔۔۔ میں نے آپ کو رومال نہیں دیا تھا بلکہ ناک صاف کر کے سکھا رہی تھی کہ آپ نے اچک لیا۔۔۔ کھول کر دیکھ لیں ابھی بھی اس میں گندگی ہوگی۔

اس کے بعد کیا ہوا نہ پوچھیں۔۔۔ اب تک ہلدی چونے سے بدن تپا ہوا ہے۔ اور ہر روز رومانی ادیبوں کو مغلظات نذر کر رہا ہوں!

■■

مرزا کھونچ۔ بیتیا

"بس ایک بار"

میری اکلوتی نصف بہتر! آخر تمہیں میرے شاعر بن جانے پر اعتراض کیوں ہے؟ اے میرے منّے کی ماں! تم کیا جانو شاعری کیا چیز ہوتی ہے؟ تمہیں خالہ نصیبن کی لگائی بجھائی، سہیلیوں سے ساڑی پر بحث اور میری جیب کی پیمائش سے فرصت کہاں کہ دنیا کے دوسرے مسئلوں پر غور کرو۔ میں جب کبھی کوئی حسین شعر گنگناتا ہوں تو تم تڑاخ سے پوچھ بیٹھتی ہو۔ "کیوں جی کس منہ جلی کی تعریف ہو رہی ہے؟ تبھی تو میں کہوں کہ آخر میاں آج کل صفائی ستھرائی پر کیوں دھیان دے رہے ہیں" کیسے کہہ دوں کہ یہ شاعر بننے کے آثار ہیں۔ بیگم! اگر میں شاعر بن گیا تو تمہارے حسن پہ وہ قصیدہ خوانی کروں گا کہ تم دنیا کا آٹھواں عجوبہ بن جاؤ گی۔

شاید تمہیں نہیں معلوم، جاؤ جا کر میرے دوستوں سے پوچھو۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے اندر شاعر بننے کی صلاحیت ہر طرح سے موجود ہے (لکھر سے لے کر جیب تک)۔ اور فلمی شاعر بننے کی صلاحیت تو بدرجہ اتم موجود ہے۔ تم ہی بتاؤ جس دن میں فلمی شاعر بن گیا کیا تمہارے پاؤں زمین پر رہیں گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ ہوگا یوں کہ تم ہمیشہ سر پہ پیر رکھ کر چلتی نظر آؤ گی۔ تمہارا یہ کہنا بجا ہے کہ میں فلم نگری میں جا کر کسی کو دل نہ دے بیٹھوں۔ گھبراؤ نہیں، تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اگر خدانہ خواستہ یہ حادثہ ہو بھی گیا تب بھی تم گھاٹے میں نہیں رہو گی۔ تمہارے لئے ایک ہیرو ضرور ڈھونڈ دوں گا۔ پھر تمہاری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ انسان جب تک ایک کا پتی رہتا ہے تب تک کوئی حادثہ نہیں ہوتا! جہاں وہ لکھپتی بنا، حادثات کے دور شروع ہو جاتے ہیں۔

اگر میں شاعر بن گیا اور تمہارے والد جنت سدھار گئے تو میں اپنی شاعری کے سہارے ایک ایسا مرثیہ مرتب کروں گا کہ دنیا کا ہر فرماں بردار شوہر ان پر آٹھ آٹھ آنسو ضرور بہائے گا اور ان کی مغفرت کی دعائیں مانگے گا۔ پھر تو بیویاں مجھ جیسا شوہر چراغ لے کر ڈھونڈتی پھریں گی جو ان کے شوہری فرض کو چار چاند لگا سکے۔

میری شریک حیات! میری شاعری کی اہمیت کا اندازہ تمہیں اس وقت ہوگا جب تم کسی کی شادی، یا کسی کی چھٹی کے جشن میں

شامل ہوں گی۔ تمہاری سہیلیاں مجھ سے ایک سہرا، ایک بدائی، ایک مبارکبادی اور ایک گالی لکھوانے کی فرمائش کریں گی۔ اور تم اُن سے کہوگی کہ "انھیں آل انڈیا مشاعرہ اور ریڈیو سے فرصت ہی نہیں ملتی" کیا اُس وقت تمہارا سر فخر سے اُونچا نہیں اُٹھ جائے گا۔ اور اس وقت تمہیں ہائی ہیل سینڈل پہننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

قسم خُدا کی بیگم! تمہارے دہلیزی کُتّے کی وفاداری پہ ایک ایسا قصیدہ لکھوں گا کہ توبہ بھلی! کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے قصیدے کو پڑھ کر رسم عام ہو جائے کہ ہر بیوی ایک عدد شوہر کے ساتھ ساتھ ایک عدد کُتّا بھی پالنا شروع کر دے۔ شوہر کی وفاداری پہ شک کیا جا سکتا ہے مگر کُتّے کی وفاداری پر نہیں۔

اے میرے دل کی دھڑکن! ایک اچھا سا اُستاد ہاتھ آگیا ہے۔ جلدی سے ہاں کہہ دو۔ ورنہ ممکن ہے کہ اُستاد میرے ہاتھ سے نکل جائے اور تمہاری سہیلی کا شوہر اُس کی شاگردی نہ قبول کرلے۔ کیا تمہیں عزت نہیں چاہیئے؟ کیا تمہیں شہرت کی چاہت نہیں ہے کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے حُسن کی چمک گھر کی چار دیواری میں ماند پڑ جائے! تم دیکھتی رہو اور تمہاری سہیلی تم سے کوسوں دور نکل جائے! بعد میں تم اُس کی شہرت اور اس کی عزت سے حسد کرنے لگو۔ اُس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا تمہاری عاقبت خراب ہوگی۔

بس دیکھتی کیا ہو، مجھے شاعر بن جانے دو۔ میرے لئے نہیں، اپنے لئے، اپنے والد کے لئے اپنے کُتّے کے لئے مکھ پتی بننے کے لئے میری راہ میں رُخنے مت ڈالو۔ میں جب کاغذ قلم لے کر بیٹھوں تو نوکر کے رہتے ہوئے سودا سلف کے لئے مجھے بازار مت بھیجو۔ کم سے کم تین مہینے تک تم مجھ سے کسی چیز کی فرمائش مت کرنا تاکہ میں ذہنی یکسوئی برقرار رکھ سکوں میرے بکھرے خیالات یکجا ہو جائیں، پھر دیکھو میں کیا کیا گُل کھلاتا ہوں۔

بس ایک بار شاعر بن جانے دو! بس ایک بار!

●●

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے مضامین

سمن زار

۸/- روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جا سکتی ہے

محمد علی اکبر ، چنچل گوڑہ حیدرآباد

جلسہ گاہ اور ہم

حال ہی کی بات ہے کہ میرے شوہر کے ایک قریبی دوست نے انھیں اردو کی چند کتابوں پر تبصرہ لکھ کر ایک جلسہ میں پڑھنے کے لئے راضی کر لیا۔ میرے شوہر جو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے اب ڈاکٹر صاحب بن گئے ہیں اپنی شہرت کے قائل ہیں۔ ان کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اردو کے میدان میں وہ ابھی رینگ رہے ہیں، چلنا بھی نہیں سیکھا ہے، پتہ نہیں ان کی کوشش کہاں تک کامیاب ثابت ہوگی۔

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو میں نے تو ان سے ہزار بار یہی کہا کہ آپ نہ تو شاعری کر سکتے ہیں اور نہ ہی مُنّی بیگم کی طرح غزلیات گا سکتے ہیں پھر آپ کو کون پسند کرے گا۔

ان کے مہربان دوست نے ایک بڑے سے جلسہ کا انتظام کروا دیا خوبصورت دعوت نامے چھپوا کر تقسیم کر دیئے گئے اور یار بار صحافیوں کو زحمت دے کر سارے اخبارات میں یہ خبر شائع کرا دی گئی کہ ڈاکٹر صاحب چند کتابوں پر تبصرہ پڑھنے والے ہیں اور سامعین سے کثیر تعداد میں شرکت فرمانے کی گزارش بھی کی گئی تھی۔ پندرہ دن کی طویل تیاری اور کوشش کے بعد وہ دن آخر آ ہی گیا۔

ڈاکٹر صاحب کا حال پتلا ہو چلا تھا تین وقت کے بجائے صرف ایک وقت کے کھانے پر اکتفاء کر لیتے چائے کی اتنی کثرت کہ شکر بلاک منگانی پڑتی۔ کمرہ کا دروازہ بند، بچوں پر ہر لمحہ گرم کبھی کسی کی پیٹھ لال کر دیتے تو کبھی کسی کے گال۔ میرا نمبر نہیں آیا۔ مجھ سے ڈرتے جو ہیں۔

خدا خدا کر کے پانچ درجن فل اسکیپ کاغذ خراب کرنے کے بعد کہیں وہ تبصرہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، وہ اس تبصرہ میں طنز کے تیر و نشتر ہی نہیں بلکہ تلوار اور بندوق بھی استعمال کر گئے تھے۔ اب مسئلہ سوال اسٹیج پر پڑھنے کا۔ حضرت اتنے بولڈ تو تھے نہیں کہ فٹافٹ پڑھ ڈالتے۔ وہاں بھی میری موجودگی ضروری تھی۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نور جہاں کی مدد کے بنا کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی میری
کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں بالکل انگریزی وقت کے مطابق اس جگہ پہنچے جہاں پر جلسہ ہونے والا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ڈاک
اور تبصرہ کا نام سن کر سامعین بڑی تعداد میں جمع ہوں گے لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو نقشہ ہی کچھ اور تھا مجھے یقین نہ ہو سکا کہ یہ
ہے۔ کیونکہ وہاں میرے اور ڈاکٹر صاحب کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، یہ پہلا موقع تھا
اُردو کے ادبی جلسہ میں شرکت کے لئے پہنچی تھی۔ بیچارے ڈاکٹر صاحب کے دوست منتظم جلسہ آنکھیں داخلہ گیٹ کی طرف لگ
سامعین کا انتظار کرتے نظر آرہے تھے۔

جلسہ گاہ میں قاعدہ و قوانین کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ مائیک اور چائے کا بھی معقول انتظام کیا گیا تھا لیکن پینے والے ندا
پریشانی اس وقت کم ہوئی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مقرر کو سواری خرچ دیا جائے گا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ ہم نے تو سواری کا
کچھ خرچ ہی نہیں کیا ہے پھر یہ۔۔۔ سواری۔۔۔ خرچ۔۔۔ میری سانس جو پریشانی سے پھول رہی تھی پیسوں کا نام سن کر تھمنے
صدر صاحب کی آمد پر جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا اور منتظم جلسہ نے صدر جلسہ کا تعارف کرایا اور پھر ڈاکٹر صاحب
بارے میں چند الفاظ کہتے ہوئے انھیں مائیک پر طلب کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بدن میں رعشہ چھوٹ گیا۔ ہاتھ پیر کانپ گئے
بدل چکی تھی۔ لیکن میں نے مسکرا کر ہمت دلائی دوسرے ہی لمحہ ڈاکٹر صاحب مائیک کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور جب ان
نکلی تو کہنے لگے "خواتین" (وہاں خواتین تو تھیں نہیں صرف میں ایک خاتون تھی) وحضرات خیر حضرات کا لفظ تو ٹھیک ہی تھا
سامعین میں پانچ حضرات موجود تھے۔ تقریر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ خود کا خیال کئے
تمام لوگوں پر اپنے طنز کے بم برساتے رہے جو مزاح کے میدان میں نئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے لکھنے کا انداز ایک دم سخت ا
ہوتا ہے سننے والا سخت ناراض ہی نہیں بلکہ دشمن ہو جاتا ہے۔ خیر گزری کہ جلسہ گاہ میں کوئی صاحب کتاب موجود نہ تھے
صاحب کو نفٹی کی رفتار سے گھر پہنچانا پڑتا اور میں ان کے پیچھے ہوتی۔ میرا خیال تھا کہ صاحب کتاب چار افراد جلسہ گاہ آ
فرما لیتے تو یقیناً سامعین کی تعداد میں تقریباً صدفی صد اضافہ تو ہو جاتا۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بعد صدر صاحب کی باری تھی صدر صاحب مائیک پر رونق افروز ہوتے ہی ہیں تنقید پر تنقید فرما
مجھے ہرگز پسند نہ تھا لیکن کرتے کیا صدر صاحب کی تقریر بالکل فائنل ہوتی ہے۔ مجھے غصہ آگیا لیکن یہ غصہ اس لئے ٹھنڈا ہوا
سواری خرچ ہماری جیب میں تھا۔

جلسہ کے اختتام پر میں نے منتظم جلسہ سے درخواست کی کہ آپ اگر جلسہ کروانا ہی چاہتے ہوں تو بہتر ہوگا کہ تبصرہ
مضمون کی بجائے منی بیگم کی غزلیات یا پھر امیتابھ بچن کے کوئی پروگرام ہی رکھ لیا کریں۔ پھر آپ کو سامعین کا انتظار کرنا پڑے۔
نہ ہی پریشان ہونے کی ضرورت ہوگی۔ ادبی ذوق باقی نہ رہا اردو کا پرچار تو بہت ہوتا ہے صرف اخباروں اور رسالوں
ہی لیکن عمل کے میدان میں جب پرکھا جاتا ہے تو صرف پانچ سامعین محفل میں موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہماری ادبی

اور پھیکی نظر آ رہی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی یہی مشورہ دیا کہ آپ مہربانی فرما کر تنقید کے میدان کو چھوڑ دیجئے اور تبصرہ کو خدا حافظ کہئے جس میں لوگوں سے داد و تحسین کی بجائے تھو تھو ملے گی۔ آپ کے مشہور ہونے کا ایک ہی راستہ یہ ہے کہ یا تو آپ کرکٹ کے کھلاڑی بن جائیے یا صرف ستار اور سارنگی اٹھا لیجئے۔ ▫▫

شگوفہ پبلیکیشنز کی مطبوعات

ماہنامہ "شگوفہ" کا بے مثال
ضخیم ترین اور منفرد

ڈرامہ نمبر

مہمان مدیر: ساگر سرحدی

اردو، انگریزی، روسی اور مختلف ہندوستانی زبانوں کے ڈرامے

ق: ۲۰ روپے مجلد ۳۵ روپے (۳۵۶ صفحات)

ماہنامہ شگوفہ کا

کنہیا لال کپور نمبر

مہمان مدیر: خواجہ عبدالغفور

کنہیا لال کپور کے آٹھ منتخب مضامین، کالموں اور خطوط کا انتخاب
کپور کی شخصیت اور فن پر بھرپور مضامین

قیمت ۱۰ روپے بشمول ڈاک خرچ

اسرار جامعی

بجلی ہوئی فیل

لو! وقت ہوا رات کا، اور آہ! ندارد
بجلی ابھی آئی تھی، ابھی واہ ندارد
اس تیرگی میں ہوش ہے واللہ ندارد
اسرار اندھیرے میں جو کچھ جھیلنا ہے جھیل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

غائب ہوئی بجلی تو ہوئی فکر کی لَو تیز
لوگوں نے اُسی وقت کیا طنز کو مہمیز
تم لاکھ کرو اپنی طبیعت کو سخن خیز
ممکن نہیں اس وقت تخیل کی منڈھے بیل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

ہمدم نے کہا آج اندھیرے میں ہی کھاؤ
کچھ کیڑے مکوڑوں کو بھی سالن میں ملاؤ
بے خرچ مزہ مرغِ مسلّم کا اُڑاؤ
یہ ظلم بھی میں جان پہ خود اپنی گیا جھیل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

جب موم کی بتی ہی نہ ڈھبری نظر آئی
اک پوری کتاب اک نئی کاپی ہی جلائی
تب علم کی دولت سے ذرا روشنی پائی
دس بیس کتابوں کو جلایا تو بچا تیل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

ہر صورت معشوق طرحدار ہے بجلی
اسرار کے گھر میں بھی پر اسرار ہے بجلی
ہر روز سرِ شام ہی بیمار رہے بجلی
چلتے ہوئے اک بارگی رک جاتی ہے یہ ریل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

بجلی کے چلے جانے سے ٹکرا گئے کچھ لوگ
کپ چائے کی شیروانی پہ چھلکا گئے کچھ لوگ
تاریکی میں جیب اپنی کترا گئے کچھ لوگ
ہر روز مرے شہر میں ہوتا ہے یہی کھیل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

نزدیک کے ہوٹل میں بھی جانا نہیں ممکن
احباب سے گپ جاکے لڑانا نہیں ممکن
حد یہ ہے کلام اپنا سنانا نہیں ممکن
بجلی نے تو واللہ ہمیں بھیج دیا جیل
بجلی ہوئی پھر روزِ گزشتہ کی طرح فیل

عابد معز

چائے خانے

ے کاری اور بے روزگاری سے جو چیزیں پھلتی پھولتی ہیں ان میں چائے خانے پیش پیش ہوتے ہیں۔ چائے خانے وہ مقامات
در جن "ہر کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے" قسم کے لوگ کئی گھنٹے بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے ہیں اور محفل برخواست کرتے
دو پیالی چائے پیتے ہیں۔ چائے خانوں کے ساتھ پان کے ڈبوں کا ہونا ضروری ہے۔ دونوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہوتا
ے شہر میں چائے خانے معہ پان کا ڈبہ ہر فرلانگ پر ملتے ہیں جو دن کے چوبیس گھنٹے، مہینے کے تیس دن اور سال کے بارہ
ہتے ہیں۔ لائیسنس ضبط ہونے پر بھی چائے خانے بند ہوتے نظر نہیں آتے۔

پائے خانے پر بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوتا ہے۔ ڈھیر سارے رنگوں سے بورڈ کو جاذب نظر تو نہیں پنچ رنگی ضرور بنا دیا جاتا
ہی سائن بورڈ چائے خانے کی بہترین شئے ہوتا ہے وہ بھی اس لئے کہ بورڈ چائے خانے کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ سائن بورڈ
۔ چائے کی پتی، مشروبات اور بسکٹ تیار کرنے والی کمپنی اپنے حرچہ وخرچہ پر اپنے اشتہار کے لئے تیار کرواتی ہے۔ چائے
سی کونے میں صلہ احسان بنا ہوا ہوتا ہے جس کا بدلہ چائے خانے والے اشتہار والی شئے کو اپنے پاس نہ رکھ کر چکاتے
ے چائے خانے کا صرف دروازہ نظر آتا ہے۔ اندر اندھیرا زیادہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی چیز باہر نظر نہیں آتی۔
یں داخل ہوتے ہی دروازے کے پاس ٹھہر جانا پڑتا ہے۔ آنکھیں چائے خانے کی محدود روشنی سے سمجھوتہ نہیں کرپاتیں۔
وس ہونے کے بعد دروازہ کے دونوں جانب دو بڑے شوکیس نظر آتے ہیں۔ ایک شوکیس میں سلیقہ سے کراکری سجی ہوتی
ا چائے خانے میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ نمائشی ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کراکری شاید چائے خانے کی ملکیت بھی
سرے شوکیس میں مختلف کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں یقیناً بکاؤ ہوتی ہیں لیکن اتنا کم بکتی ہیں کہ ان
اشیاء کا گمان گزرتا ہے۔ یہ شوکیس مکھیوں اور جھینگروں کا بھی مسکن ہوتا ہے۔ اسی شوکیس کے پیچھے ایک لمبا
ازہ، اور لحیم شحیم آدمی جس کی توند سانس کے ساتھ شوکیس کو آگے اور پیچھے دھکیلتی ہے بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ آدمی

آدمی نما گوشت کی دکان چائے خانے کا مالک ہے۔ مالک کی توند دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ چائے خانے کی ہر اچھی چیز اسی کی نذر ہوتی ہے۔ مالک کی ایک جانب ٹیلیفون کا آلہ رکھا ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک چھوٹا پنکھا چلتا رہے گا جو اس سیٹھ کے لئے اپنی تنگ دامنی کا شکوہ مختلف قسم کی آوازیں نکال کر کرتا ہے۔

چائے خانے میں قدم رکھتے ہی گاہک کا استقبال مکھیاں گلے اور گال کو چوم کر کرتی ہیں تو مچھر ہاتھ اور پیر کو کاٹ کر کرتے ہیں۔ چائے خانے کے اندر بہت احتیاط سے قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ فرش چکنا ہوتا ہے اور اس پر چائے اور پانی ہمیشہ گاہک کو چاروں خانے چت کرنے کے لئے موجود رہتا ہے۔ ایک بار تیزی سے ہم چائے خانے میں داخل ہوئے تھے جس کا نتیجہ ہماری چال سے ظاہر ہے۔ چائے خانے میں داخل ہونے کے بعد گاہک گرمی سے بے بس ہو کر اُوپر دیکھتے ہیں۔ چائے خانے کی چھت کے بیچ میں صرف ایک عدد پنکھا ہوتا ہے جو چلتا نہیں بلکہ ٹہلتا ہے۔ اسی نعمت مترقبہ کے نیچے کئی لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ نو وارد گاہک حتی الامکان ایسی میز پسند کرنا چاہے گا جو کھڑکی کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن چائے خانے میں کھڑکیاں ہوتی ہی نہیں ہیں۔ بعض گاہک دروازہ کی راہ سے آکر کھڑکی سے نکل جاتے ہیں۔ اسی لئے احتیاطاً چائے خانوں میں کھڑکیاں نہیں لگوائی جاتیں۔ نووارد گاہک گرمی سے پسینہ میں شرابور ہو جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی جگہ ملے بیٹھ جاتا ہے۔ چائے خانے کی کرسیاں مخصوص اور بہت نازک ہوتی ہیں۔ جلد ہی چار سے تین اور دو پایہ والی کرسیاں بن جاتی ہیں۔ پھر بھی چائے خانے کے مالک کو یہی لنگڑی کرسیاں عزیز ہوتی ہیں۔ مالک انھیں دیوار، میز یا کسی پتھر کے سہارے گاہک کو گرانے کے لئے کھڑا کرتا ہے۔ گاہک ان کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے بار بار گرتے ہیں یا پھر ایک بار گرنے کے بعد میز یا کسی دوسری جگہ پر بیٹھتے ہیں۔ بعض گاہک مالک چائے خانہ پر بھی بیٹھنے دوڑ پڑتے ہیں۔ خیر سے کوئی کرسی ٹھیک رہی اور گاہک ہاتھ پیر پھیلا کر آرام سے بیٹھنا بھی چاہے تو بیٹھ نہیں سکتا۔ بیرا آکر وارننگ دے جاتا ہے "صاحب ٹھیک سے بیٹھو۔ کرسی نئی ہے"۔ وارننگ ملنے کے بعد گاہک صرف کرسی سے آرام حاصل کرنے کے بجائے میز کا بھی سہارا لینا چاہتا ہے ہاتھ رکھتے ہی میز گاہک کی گود میں آنے کے لئے جھولنے لگتا ہے۔ گاہک غصے سے میز کی اس بدتمیزی کو دیکھتا ہے اور اس کا غصہ حیرت میں بدل جاتا ہے۔ "چار لکڑیوں پہ ایک پتھر" یہی تعریف چائے خانے کی میز کی ہوتی ہے۔ لکڑی کئی جگہ سے تڑکی ہوئی ہوتی ہے تو پتھر چند ایک ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ پتھر پر نقشہ، نام، لکیریں اور تصویریں کندہ ہوتی ہیں۔

چائے خانے میں بیٹھتے ہی گاہک سے شناورت کے لئے مکھیاں میز پر آکر اٹکھیلیاں شروع کر دیتی ہیں۔ کھٹمل خفیہ طور پر اور مچھر کانوں میں سریلے راگ الاپتے ہوئے للکار کر کاٹنے لگتے ہیں۔ گاہک اِدھر اُدھر کھجاتے اور بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بیرے کو تلاش کرتے ہیں۔ بیرا نظر نہیں آتا لیکن اسے تلاش کرنے کی کوشش میں گاہک پورے چائے خانے کا جائزہ لے لیتا ہے۔ چائے خانے کی دیواروں کے لئے ہمیشہ ہی گہرے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں۔ گہرے رنگ کے استعمال سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ پہلا فائدہ، گہرے رنگ سے گرمی میں اضافہ ہوتا ہے جو گاہک کو زیادہ دیر چائے خانے میں بیٹھنے نہیں دیتی۔ دوسرا فائدہ، گہرا رنگ

چائے خانے میں کم روشنی کا باعث بنتا ہے۔ کم روشنی میں گاہک اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں کر پاتا۔ چائے خانے کی دیواروں پر چند ایک تختیاں لگی ہوتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے "یہاں ملازموں کو روز تنخواہیں دی جاتی ہیں"۔ "مذہبی و سیاسی گفتگو نہ کیجیے"۔ "زائد شکر اور پیالی طلب نہ فرمائیں"۔ "وقت کی قدر کیجیے"۔ "دوسروں کے لئے جگہ بنائیے"۔ "یہاں پکوان اصلی گھی سے ہوتا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ محکمہ بلدیہ کی جانب سے دیا ہوا لائیسنس بھی دیوار پر لٹکایا جاتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کے اطراف بھی مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ کہیں کونے میں اگر بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ چائے خانے میں خوشبو انھیں اگربتیوں سے ہوتی ہے ورنہ چائے خانے کی ایک مخصوص بو ہوتی ہے جو چائے خانے میں زیادہ دیر بیٹھنے پر گاہک کے پاس سے بھی آنے لگتی ہے۔ چائے خانہ کے ابتدائی حرف کی مناسبت سے اسی حرف کا سکہ چلتا ہے۔ سب سے زیادہ استعمال ہونے والی شئے "چائے" ہوتی ہے ہر میٹھی چیز کو "چیونٹیاں" لگتی ہیں پکوان کی جگہ پر "چوہے" بکثرت پائے جاتے ہیں۔ چائے خانے کی دیواروں پر "چھپکلی" اور چھت پر "چمگادڑ" موجود رہتے ہیں۔ البتہ دیواروں پر چونا نہیں ہوتا۔

چائے خانے میں بیٹھنے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد گاہک کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اسی دوران گاہک آپس میں محو گفتگو ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت ہم بیرے کا انتظار کرتے ہوئے اونگھنے لگے تھے کہ ایک زوردار گھنٹی بجی جس کی آواز پر صورِ اسرافیل کا گمان ہوا۔ ہم گھبرا کر اٹھ بیٹھے تمام گناہ یاد آنے لگے۔ میدانِ حشر کے تصور سے کپکپی طاری ہوگئی۔ کچھ وقت گزرنے اور حالت سنبھلنے کے بعد پتہ چلا کہ چائے خانے کا مالک "باہر والے" کو بلانے کے لئے مسلسل گھنٹی بجا رہا تھا۔

چائے خانے کی میز صاف کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایک لڑکا میلا اور گیلا کپڑا لئے آتا ہے۔ میز کو صاف کرنے کے بجائے اور خراب کر جاتا ہے۔ میز صاف ہونے کے بعد سے ایک نئی قسم کی بو بھی آنے لگتی ہے۔ گاہک چائے خانے کے معیارِ صفائی پر غور کرنے لگتا ہے کہ اسے ایک کڑک دار آواز سنائی دیتی ہے "بولو۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔" گاہک گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ ایک نوجوان میلے پتلون کے پینچے چڑھائے، شرٹ کے تمام بٹن کھولے گردن میں لال دستی ڈالے، سر میں تیل ڈالنے کے بجائے تیل میں سر ڈبوئے، کان میں بیڑی رکھے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کے گلے میں ایک تھیلی جس میں ڈھیر سارے سکّے ہوتے ہیں لٹکتی رہتی ہے۔ یہ حضرت چائے خانہ کا بیرا ہے۔ گاہک کے خاموش رہنے پر بیرا چلا چلاتے ہوئے چیختا ہے "بولو صاحب" گاہک کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلتی ہے "پانی" بیرا پکار کر کہتا ہے "نیچے عقل کے کچے صاحب کی ہڈی ٹھری کو پانی پلا" کچھ ہی دیر میں ایک لڑکا پانی لئے آتا ہے۔ چائے خانوں میں پانی سپلائی کرنے کا ایک مخصوص اسٹائل ہوتا ہے۔ پانی کے گلاسوں میں انگلیاں اور ہاتھ ڈبو کر پیش کیا جاتا ہے۔ پانی پلانے کے لیئے الگ سے ایک لڑکا موجود رہتا ہے۔ جو ایک ہاتھ میں چار تا پانچ گلاس جس میں ہر گلاس میں ایک انگلی ڈوبی رہتی ہے بہ آسانی لے آتا ہے۔ گلاسوں کے کم ہونے پر ہر گلاس میں ایک سے زائد انگلیاں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ پانی والا پانی کے گلاس میز پر رکھنے کے بعد اپنی انگلیوں اور ہاتھ کا پانی گاہک پر چھڑکتا ہے۔ پانی میں ساری بحری مخلوق (جو گلاس میں سما سکتی ہے) موجود رہتی ہے اس طرح کا پانی گاہک کو استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن گاہک بیچارے کریں بھی کیا؟ ہمارے چائے خانوں کی صفائی کا معیار یہی ہے۔ گاہک پانی پینے کے لئے ہچکچاتا ہے کہ پانی والا آ کر کہتا ہے "صاحب پانی پی لو۔ گلاس چاہیئے" اور وہ پانی پینے تک گاہک کی جان

برکھڑا رہے گا۔ چائے خانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں پانی گرم اور چائے ٹھنڈی ملتی ہے!

بیرے بخوبی جانتے ہیں کہ گاہک اپنا وقت گزارنے کے لئے چائے خانے آتے ہیں۔ اسی لئے جب تک انھیں بلایا نہ جائے وہ گاہک کے پاس دوبارہ نہیں آتے لیکن آواز سے اپنی موجودگی کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ ایک چائے، دو چائے، تین ایک پونہ، پہلے سے دیکھو، دوسرے سے پچاس وغیرہ وغیرہ۔ ایک وقت ہم ایک چائے خانہ صرف اور صرف چائے اور بسکٹ کی غرض سے گئے تھے۔ بہت مشکل سے بیرے کو ڈھونڈ پایا۔ جناب بیرا ایک کونے میں کھڑے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ وقت گزاری کے لئے بیڑی پیتے ہوئے بالوں میں کنگھی کر رہے تھے۔ کافی انتظار کے بعد ان سے ہماری نظریں ملیں۔ ہم نے انھیں اشارے سے بلایا۔ وہیں سے انھوں نے ڈانٹ کر کہا "ٹھہرو" ہم گردن نیچی کئے بیروں کے سدھار کے بارے میں سوچنے لگے تھے کہ چلمچیوں کی جھنجھناہٹ ہوئی۔ گردن گھما کر دیکھا تو بیرا کھڑا تھا۔ ہم نے ہمت کر کے پوچھا "تازہ کیا ہے" جواب ملا "ہر چیز! ہر چیز! یہاں صرف گاہک باسی ہوتا ہے"۔ ہم نے بیرے کو ٹالنے کے لئے جلدی کہا "چند بسکٹ اور چائے" بیرا چائے خانے کے اندھیرے میں گم ہوا صرف اس کی آوازیں آنے لگیں "چار چائے لا پانچ میں ایک پونہ لا . . ." بیرا "چائے لا" کی ہانک لگاتا رہا لیکن چائے لاتا وہی رہا۔ ہم بسکٹ اور چائے کے انتظار میں اونگھنے لگے تھے ایک پلاسٹک کے ٹکڑے میں چند بسکٹ آکر میز پر گرے۔ گردن اُٹھا کر دیکھا تو بیرا ایک ہاتھ میں چند پلاسٹک کی پلیٹیں اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں چار تا چھ چائے کی پیالیاں اور دس تا پندرہ خالی کپ لئے گاہکوں کو ان کی مطلوب اشیاء سپلائی کر رہا تھا۔ بسکٹ منہ میں رکھا ہی تھا کہ واہ واہ کا شور بلند ہوا۔ چائے خانے کے ایک کونے میں ایک شاعر لہک لہک کر اپنا تازہ کلام سنا رہے تھے۔ پتہ چلا کہ شاعر صاحب کو چائے خانے کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ اسی چائے خانہ کی چائے پی کر کلام کہتے ہیں۔ شاعر صاحب کے کلام سے محظوظ ہوتے ہوئے بھی ہم بسکٹ کو چبا نہ سکے حالانکہ ساتھیوں میں ہمارے دانتوں کی دھوم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پلاسٹک کی پلیٹ کو بسکٹ کی بہ نسبت بہ آسانی چبایا جا سکتا تھا۔ بسکٹ کو چبانے کی کوشش میں پہلو بدلتے ہوئے ہماری نظر ایک کھدر پوش لیڈر پر بھی پڑی جو میز پر چڑھے اپنے حامیوں کو چائے پلا کر دھواں دھار تقریر سے چائے کا معاوضہ وصول کر رہے تھے۔ چائے خانے کو اس لیڈر کی سیاسی پارٹی سے وابستگی ہے۔ بازو، میز پر اخبار کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملا۔ اسے اُٹھا کر دیکھنے سے پتہ چلا کہ وہ آج کے اخبار کا ایک حصہ ہے۔ ایسے ہی چند اور ٹکڑے لوگوں کے پاس نظر آئے جنھیں بڑے انہماک سے پڑھا جا رہا تھا۔ اخبار کے ٹکڑوں پر پانی (جس کے عموماً دھبے نہیں پڑتے) اور چائے کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ایک جگہ تو پیک بھی موجود تھا۔

بسکٹ کھانے کی کوشش میں ہمارے دانت اور مسوڑوں میں درد ہونے لگا۔ بسکٹ کھانے کی کوشش ترک کر کے چائے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چائے کے رنگ کو دیکھا تو جوہڑ کا گندہ پانی یاد آیا چائے خانے کے اس جوہڑ کے گندے پانی میں چاند یا کسی اور شئے کے عکس کو دیکھنے کے بجائے ہم نے آنکھ بند کر کے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ اُس وقت کی جسمانی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ روحانی طور پر ہم نے محسوس کیا کہ دوزخ میں گنہگاروں کو جو پانی پینے کے لئے دیا جائے گا وہ یہی چائے ہوگی۔

ہمت اور محنت کے باوجود بھی ہم چائے کا دوسرا گھونٹ حلق سے نہ اُتار سکے۔ ایک ہی گھونٹ میں دوزخ کی حقیقت عیاں ہونے پر ہماری حالت غیر ہونے لگی۔ جلد سے جلد چائے خانے کے باہر آنا چاہا۔ تیر کی طرح اٹھے اور کاؤنٹر کے پاس سیٹھ کے سامنے پہنچے بیرے کی آواز بھی ہمارے پیچھے آئی۔ سیٹھ نے ہاتھ پھیلایا۔ اور ہم نے بیرے کی آواز کی بجاآوری کر دی۔ چائے خانے سے باہر آنے اور ہوش ٹھکانے لگنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم نے چائے اور بسکٹ کی دو گنے سے زائد رقم ادا کردی

سلسلہ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد

ممتاز مزاح نگار پرویز یداللہ مہدی کے مضامین کا تازہ مجموعہ

ٹائیں ٹائیں فش

قیمت ۱۵ روپے
مجلد خوبصورت ڈسٹ کور کے ساتھ۔

گیارہ پُر از مزاح دلچسپ مضامین۔ صفحات ۱۲۸۔ بتوسط شگوفہ حاصل کی جا سکتی ہے

شگوفہ پبلیکیشنز کی نئی پیش کش

ممتاز مزاح نگار رؤف خوشتر کے مضامین کا مجموعہ

غبارِ حاضر

شائع ہو چکا ہے۔

پیش لفظ، جناب مجتبیٰ حسین ★ آراء، جناب ذکری تولسوی، جناب یوسف ناظم ؛ صفحات: ۱۱۲ قیمت ۱۰ روپے

ناشر شگوفہ پبلیکیشنز ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد

سراج زملی

بل کیا، بل کیا، بل کیا، بل کیا
چل دیا، چل دیا، چل دیا، چل دیا
وائف کی لائف انشور کرواکے دے
سنکھیا، سنکھیا، سنکھیا، سنکھیا
لاکے مرغی کا سالن ہیں دے دیا
شکریہ، شکریہ، شکریہ، شکریہ
شاعری پروفیشن ہے میں لکھتا نہیں
شوقیہ، شوقیہ، شوقیہ، شوقیہ
انڈیا سے گیا، گلی ڈنڈے میں ہار
زامبیا، زامبیا، زامبیا، زامبیا
لے کے آیا ہے واپس غزل میری آج
ڈاکیہ، ڈاکیہ، ڈاکیہ، ڈاکیہ
یوز کیجے اگر بال جھڑنے لگیں
یوریہ، یوریہ، یوریہ، یوریہ
اس بڑھاپے میں بھی ہے کلام آپ کا
شوخیہ، شوخیہ، شوخیہ، شوخیہ
پھٹ گیا وہ بھی تھا ایک اکلوتا جو
بوریہ، بوریہ، بوریہ، بوریہ
تھی گھڑی وہ تو منحوس جبکہ تجھے
دل دیا، دل دیا، دل دیا، دل دیا
میرے معشوق کو لے کے کل ہی سراج
چل دیا، چل دیا، چل دیا، چل دیا

نشے میں چُور جو پایا گیا ہوں
اٹھا کر بار سے لایا گیا ہوں
عدالت میں کہا ملزم نے جج سے
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
بھلا آنے کی پھر جراءت ہو کیسے
گلی میں تیری پٹوایا گیا ہوں
نیا کچھ ہے نہیں یہ جیل خانہ
ہزاروں بار میں آیا گیا ہوں
بتاؤں کیا، بلا ہے کیا! وطن میں
اک اک لقمے کو ترسایا گیا ہوں
چلا جاتا ہوں یونہی بن بلائے
ہر ایک دعوت میں، میں پایا گیا ہوں
لہو ارزاں ہے پانی سے سراج اب
خود اپنے خون میں نہلایا گیا ہوں

○

لائف اپنی خراب کون کرے
پوسٹ آفس میں جاب کون کرے
محکمہ ڈرائی ہے، بیوی بچوں کو
مبتلائے عذاب کون کرے
دیجئے کچھ تو، پاس کردیں گے
مفت میں کامیاب کون کرے
شعر کہنے کی کس کو فرصت ہے
وقت اپنا خراب کون کرے
سچ بتانا سراج ہے پر کسی
جھوٹ کو بے نقاب کون کرے

لیڈری لیڈری ہے کیا کہیئے
رابری، رابری ہے کیا کہیئے
جسم فربہ ہے اُن کا اور اپنی
لاغری لاغری ہے کیا کہیئے
بی اے پڑھ کر بھی اپنی قسمت میں
ویٹری ویٹری ہے کیا کہیئے
چھٹیاں بیس دن مہینے میں
ٹیچری ٹیچری ہے کیا کہیئے
شام ہوتے ہی گھر پہنچنا ہے
شوہری شوہری ہے کیا کہیئے
کیا بتائیں کہ وائف کیسی ہے
سرپھری سرپھری ہے کیا کہیئے
پہلی بیگم بلا ہے پہلی تو
دوسری دوسری ہے کیا کہیئے
پانچ سو کے ہزار ہوتے ہیں
تاجری تاجری ہے کیا کہیئے
اے سراج ان کی شان و شوکت تو
ظاہری ظاہری ہے کیا کہیئے

پرویز یداللہ مہدی

حیدرآباد بھوپال حیدرآباد

چوتھی قسط

(سفرنامہ کم رپورتاژ)

استقبالیہ کمیٹی کے فراق میں متعدد دھوکے اور لاتعداد دھکے کھاتے ہوئے ہم بالآخر اسٹیشن سے باہر نکل آئے اور اتفاق سے ایسی جگہ پہنچے جہاں سامنے ہی امید کی ایک نئی کرن کی صورت ٹیلی فون بوتھ کھڑا تھا۔ میں نے مسیح صاحب سے کہا ـ "لگتا ہے اردو اکیڈیمی کی استقبالیہ کمیٹی ہم سے زیادہ اہم مہمانوں کے استقبال میں کہیں مصروف ہے اسی لئے ہم سے ربط نہیں پیدا کر سکی، چلئے ہم ہی اس سے ربط قائم کرتے ہیں آپ کے پاس جو دعوت نامہ ہے اس پر اکیڈیمی کا فون نمبر یقیناً درج ہوگا ـــ ذرا نکالیے دعوت نامہ"۔

مسیح صاحب نے فوراً بیگ کھولا، فائل نکالی، پھر فائل میں سے دعوت نامہ نکال کر اسے بغور دیکھا پھر بچوں کی طرح چہک کر بولے۔ "واقعی آپ کا خیال ٹھیک نکلا، اس پر فون نمبر لکھا ہے۔ اب خدا کرے کہ فضل تابش صاحب سے فون پر بات ہو جائے۔"

میں نے دعوت نامہ ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "اگر فضل تابش صاحب اس وقت وہاں نہ بھی ہوئے تو کوئی اور صاحب ضرور موجود ہوں گے۔"

مسیح صاحب پر تفکر لہجے میں بولے۔ "کسی اور صاحب سے وہ بات نہیں بنے گی جو فضل تابش صاحب سے بات ہونے پر بنے گی۔ میں نے تو پچھلے ہفتے بھر میں موصوف کا نام اتنی بار سنا ہے کہ مجھے خواہ مخواہ یوں لگ رہا ہے جیسے میں ان سے خواہ مخواہ کئی بار مل چکا ہوں، بلکہ خواہ مخواہ ان سے اچھی خاصی دوستی بھی ہوگئی ہے۔"

"ٹھیک ہے ـــ" میں نے انہیں خواہ مخواہ تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اس بات پر خواہ مخواہ اکیڈیمی فون کرکے فضل تابش صاحب سے خواہ مخواہ ربط قائم کرنے کی کوشش کر دیکھتے ہیں۔" اتنا کہہ کر

بں نے ٹیلی فون بوتھ کا رُخ کیا، مسیح صاحب نے ہانک لگا کر پھر میرے بڑھتے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیں فرمایا — "بالفرض اس وقت اگر اکیڈیمی میں کوئی موجود نہ بھی ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ فضل جاوید صاحب کا پتہ بھی میں اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔"

مسیح صاحب دراصل مجھے تسلی دینے کے بہانے خود اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے خواہ مخواہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے کہ بھوپال میں اللہ کے فضل سے دو عدد "فضلاء" ایسے موجود ہیں جن کے ہوتے ہم یہاں بھر کے اعد سے آمل پر [illegible] رہیں گے۔" اتنا کہہ کر میں فوراً ٹیلی فون بوتھ کی طرف لپکا تاکہ مسیح صاحب کو مزید مین میخ نکالنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

اتفاق سے پہلی ہی مرتبہ ڈائیل کرنے پر اکیڈیمی کا نمبر لگ گیا، اور دوسرا اتفاق یہ کہ لائین پر خود فضل تابش موجود تھے۔ ہماری آمد کی خبر پر موصوف نے حیرت و مسرت کا ملا جلا اظہار کیا — حیرت یوں کہ وہ اگلے روز ہماری آمد کے متوقع تھے، اور مسرت انہیں یوں ہوئی کہ ہم ان کی توقع سے ایک روز پہلے ہی پہنچ گئے تھے، میں نے جواباً ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ہمیں کم ازکم اس لائق تو سمجھا کہ بذریعہ فون ہی 'ریسیو' (Recieve) کرنے کا شرف بخشا۔ جواب میں موصوف نے فرمایا کہ بذریعہ فون انھوں نے صرف ہماری آمد کی اطلاع ریسیو کی ہے۔ البتہ اگلے دس منٹوں میں ہمیں بنفس نفیس بذریعہ کار، ریسیو کرنے پہنچ رہے ہیں۔

جب میں نے اس "لاسلکی" گفتگو کا نچوڑ مسیح صاحب کے آگے رکھا تو وہ تشویش ناک لہجے میں بولے۔ "اسٹیشن کے اس شور و غل اور چہل پہل میں وہ ہمیں پہچانیں گے کیسے؟ آپ نے کم ازکم کوئی نشانی تو بتادی ہوتی، جیسی کہ عموماً جاسوسی فلموں میں ایسی نازک سچویشن کے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ جب فریقین کے مابین پہلی پہلی بار ملنے کا پروگرام طے ہوتا ہے تب شناختی علامت کے طور پر کوئی نہ کوئی نشانی آپس میں طے کرلی جاتی ہے۔ جیسے کالے رنگ کے کوٹ پر لال رنگ کی ٹائی، یا پھر سفید دستانے والے ہاتھ میں سُرخ یا کالا گلاب —!"

مسیح صاحب کے اس تشویشناک شوشے پر میں نے اپنی تمام تر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ایسی خصوصی نشانیاں عموماً ترقی یافتہ ممالک کے خوشحال باشندوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ جب کہ ہم ترقی پذیر غریب ملک کے باشندے ہیں، اس پر اُردو والے ہیں۔ اُردو والوں کی خستہ حالی اور ان کا حلیہ بشرا ہی ان کا شناختی نشان ہوتا ہے۔ اُردو والا چاہے کشمیر کا ہو یا کنیا کماری کا، اس کی زبان، اس کا کلچر، انگیری کلچر، اس کی تاریخ جغرافیہ، اس کا درد و کرب، یہاں تک کہ اس کی نشست و برخاست تک مشترک ہوتی ہے — تم دیکھنا فضل تابش صاحب ہمیں دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔" ان زور دار تفصیلات کے ساتھ میں آگے بڑھ کر سڑک کے کنارے ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں سے

میں خود بھی دور دور تک دیکھ سکتا تھا اور لوگ بھی دور دور سے مجھے بہ آسانی دیکھ سکتے تھے، لیکن مسیح صاحب سے میرا اس طرح کھڑا ہونا دیکھا نہیں گیا چنانچہ مجھ سے دو قدم آگے کھڑے ہوکر تحکمانہ لہجے میں بولے۔ "اردو والوں کے تعلق سے جو جو نشانیاں اور علامتیں آپ نے ابھی ابھی بیان فرمائیں، ان پر آپ سے زیادہ میں پورا اترتا ہوں۔ آپ اپنے بھاری بھرکم جُثّے کے باعث کسی زاویے سے ادیب نظر نہیں آتے، تاہم اگر کسی نے اندازے کی غلطی سے آپ کو ادیب سمجھ بھی لیا تو شاید تامل، تلگو، مرہٹی، گجراتی یا اسی قبیل کی کسی اور خوش حال زبان کا ادیب سمجھے گا اُردو کے ادیب آپ کسی صورت نظر نہیں آتے۔"

اس سے پہلے کہ اس زبردست طنز کے جواب میں میں اپنا داغ داغ جگر دکھا کر اپنے آپ کو خالص اُردو والا ثابت کرتا، ایک کار ہمارے بالکل پاس سے گزری اور ذرا سا آگے جاکر رُک گئی ــــ پھر دروازہ کھلا اور جو شخص اس میں سے برآمد ہوا اس کا حلیہ اور شکل وصورت ضرور شاعرانہ تھی لیکن چال ڈھال بڑی ذمہ دارانہ تھی۔ میں نے مسیح صاحب سے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اگر میرا اندازہ غلط نہ ہو تو یہی مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی کے سکریٹری فضل تابش صاحب ہیں۔" اُدھر سے سکریٹری اکیڈیمی ہذا بھی اندازے سے ہماری جانب بڑھے، اور اس طرح اٹکل سے لگائے ہوئے ہر دو کے اندازے درست ثابت ہوئے، نہ تو انہیں کوئی ثبوت پیش کرنا پڑا کہ وہی ہمارے میزبان ہیں اور نہ ہی ہمیں یہ حلف اُٹھانا پڑا کہ ہم ہی وہ مہمان ہیں جو آپ کی دعوت پر آپ کے شہر تشریف لارہے ہیں۔ پہلے پُرخلوص مصافحہ ہوا، پھر برادرانہ معانقہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اجنبیت کی گھٹن، اپنائیت کی فضا میں بدل گئی۔

راستے میں تابش صاحب نے بتلایا کہ اکیڈیمی کی سہ روزہ تقاریب کا آغاز آج صبح یادِ ملا رموزی کے سلسلے کی منعقدہ سیمینار سے ہوچکا ہے، اگلے روز محفل طنز و مزاح ہوگی اور تیسرے دن انعامی تقاریب کا اہتمام ہوگا۔ باتوں باتوں میں ہم لوگ ہوٹل نالندہ پہنچ گئے جہاں ہمارے قیام و طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔

ہمیں ہوٹل میں چھوڑ کر سکریٹری صاحب دیگر مصروفیات نبٹانے روانہ ہوگئے۔ البتہ جاتے جاتے تاکید کر گئے کہ تھوڑا سا آرام کرکے رات کے کھانے سے فارغ ہوکر تیار رہیں کیونکہ آٹھ بجے کار ہمیں دوبارہ لینے آئے گی تاکہ ہم بھی اکیڈیمی کی طرف سے منائی جانے والی "شبِ غزل" میں شریک ہوسکیں۔

تازہ دم ہونے کی نیت سے نہا دھوکر باہر نکلے تو دم اور بھی ہونٹوں پر آگیا تب یاد آیا کہ ناگپور پر کیے ہوئے "بریک فاسٹ" کے بعد سے پیٹ میں ایسا بریک لگا ہے کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل "فاسٹ" (روزہ) چل رہا ہے چنانچہ فوراً ڈائیننگ ہال کا رُخ کیا اور پھر اس وقت تک کھانے کی میز پر ڈٹے رہے جب تک کہ اگلا پچھلا حساب صاف نہیں ہوگیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے سات کا عمل ہوچکا تھا، اکیڈیمی کی کار کے آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ اور تھا، لہٰذا سگریٹ کی تلاش وطلب میں باہر نکلے ـ اسی بہانے آس پاس کی گلیوں میں تھوڑی سی سیر گشتی کرنے کا موقع ملا۔ آڑھی ٹیڑھی

گلیوں کی تنگی و تنگ دامانی اور دوکانوں کی وضع قطع دیکھ کر حیدرآباد کے سلطان بازار کی دکانیں، بڑی چادرڈی کی تنگ گلیاں اور بمبئی کی عبدالرحمٰن اسٹریٹ کی رونق یاد آگئی۔ البتہ بھوپال کی ان گلیوں میں دیگر تجارت پیشہ حضرات کے مقابلے میں ٹیلر عرف درزی حضرات اکثریت میں نظر آئے، اور میری ناقص معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ جس شہر کو میں قوالوں اور قوالیوں کا شہر سمجھتا تھا اس کی تعمیر میں درزیوں کا بھی ناقابلِ فراموش حصہ ہے — یوں بھی قوالوں اور درزیوں میں کم از کم اتنی مماثلت تو پائی جاتی ہے کہ قوال حلق پھاڑ کر دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں، اور درزی کپڑا پھاڑ کر اپنے لئے روزی مہیا کرتے ہیں۔

ہم اپنا مختصر سا دورہ پورا کرکے ہوٹل لوٹے ہی تھے کہ ہمیں لینے کے لئے کار بھی پہنچ گئی۔ البتہ اس بار فضل تابش صاحب کی جگہ ایک خوش شکل نوجوان ہماری رہنمائی کے لئے تشریف لائے تھے۔ تعارف کا تبادلہ ہوا تو پتہ چلا کہ موصوف اکیڈمی میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز ہیں اور ایم۔ اے۔ انصاری کہلاتے ہیں۔ میں نے بے تکلفی کی فضاء قائم کرنے کے لئے ان کے نام کے تعلق سے شوشہ چھوڑا — "آپ کو تو بچپن ہی میں نام رکھائی کے وقت ایم۔ اے کی ڈگری عطا کر دی گئی ہے، اگر آپ اپنے نام کے ابتدائی حروف کی جگہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے ایم۔ اے۔ انصاری کے بجائے انصاری ایم۔ اے کرلیں تو آپ کا نام خاصہ بارعب اور ڈگری یافتہ ہو جائیگا۔" میری اس مزاحیہ وضاحت پر انصاری صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور فوراً اپنا دستی پاندان میری طرف بڑھا کر فرمایا۔ "اسی بات پر پان نوش فرمایئے۔"

میں نے جواباً پان نوش فرمانے سے پہلے پاندان کا جائزہ لیا۔ دونوں طرف سے کھلنے والے اس خوبصورت دستی پاندان میں ایک طرف چونا کتھا لگے پان کے پتے، بڑے سلیقے سے چنے ہوئے تھے تو دوسری طرف چھوٹے چھوٹے مختلف خانوں میں پان کے دیگر لوازمات محفوظ تھے۔ انصاری صاحب کے پاندان کو دیکھ کر مجھے تخلص بھوپالی کی پاندان والی خالہ کی یاد آگئی۔ اگرچہ اس وقت نہ تو تخلص صاحب اس دنیا میں ہیں نہ ان کی پاندان والی خالہ، مگر لگتا ہے ان کا پاندان بھوپال کے گھر گھر میں موجود ہے — میں نے تخلص بھوپالی مرحوم اور ان کی پاندان والی خالہ کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے پان کا ایک بیڑہ اپنے منھ میں رکھا اور پھر ہمارا قافلہ بھوپال کے "ٹیگور بھون" کی طرف روانہ ہوگیا — !!!

ان دنوں "شبِ غزل" یا "شامِ غزل" منانے کی وبا بڑے شہروں میں خاصی عام ہو گئی ہے۔ گھروں ہوٹلوں، کلبوں، محلوں ہر جگہ "شبِ غزل" کا طوطی بول رہا ہے۔ کسی کے آنے کا "صدمہ" ہو یا جانے کی "خوشی" فوراً ایک آدھ غزل گانے والے کو کہیں سے پکڑا اور شبِ غزل منالی، گویا شبِ غزل نہ ہوئی، ہر مرض کی دوا "زندہ طلسمات" ہوگئی۔ اگر شبِ غزل کی مانگ اسی طرح بڑھتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ مشاعروں کی پوری طرح چھٹی کر دے گی، غزل کو ساز پر گانے والے گلوکار "گلا بازی" سکوں میں رولتے رہیں گے اور غزل کو اپنے خون سے سینچنے والے شاعر، خون تھوکتے ہوئے موت کے ساگر میں ڈوبتے رہیں گے — ابھی

حال ہی میں شبِ غزل کا ایک نیا چونکا دینے والا پہلو سامنے آیا۔ میرے ایک شناسا جن کے والد کا کچھ روز پیشتر ہی انتقال پُر ملال ہوا تھا، گھر پر تشریف لائے اور والدِ مرحوم کے جہلم کا دعوت نامہ دیتے ہوئے بڑے اصرار کے ساتھ بولے ۔ "اگر آپ کسی وجہ سے والدِ مرحوم کے جہلم میں نہیں آسکے تو اس کے اگلے روز ضرور تشریف لا یئے گا ۔ مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کیلئے شبِ غزل کا بطورِ خاص اہتمام کیا ہے ۔ خدا بخشے والد مرحوم شبِ غزل کے شیدائی تھے، شہر میں ہونے والی ہر اچھی بُری شبِ غزل میں بڑے شوق اور پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے ۔" میں حیرت اور تعجب سے مرحوم کے لائق اور سعادت مند فرزند کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، اگلے زمانے میں لوگ ایصالِ ثواب پہنچانے کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کیا کرتے تھے اور اب یہ وقت آگیا ہے کہ ایصالِ ثواب پہنچانے کے لئے "غزل خوانی" کا اہتمام ہونے لگا ہے ۔

دراصل شبِ غزل منانے کے پیچھے اب نہ تو غزل سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ رہا ہے نہ شب کے مزے لوٹنے کی تمنا، بلکہ اس قسم کی شبوں یا شاموں کا اہتمام محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس بہانے تمام یاروں، دوستوں اور شناساؤں سے ایک ہی جگہ ایک ساتھ ملاقات بھی ہو جاتی ہے اور اپنی امارت اور شان کا خاصا رعب بھی پڑتا ہے۔ گویا شبِ غزل بے چاری بھی اب تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے کے زمرے میں آگئی ہے ۔ البتہ مدھیہ پردیش اُردو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام منائی جانے والی شبِ غزل میں شرکت کے پیچھے ہمارا مقصد ذرا مختلف تھا، حالانکہ اس بہانے مقامی ادیبوں، شاعروں اور ادب نوازوں سے ملنے کی خواہش ضرور تھی لیکن بنیادی مقصد اہلیانِ بھوپال کے ذوق اور شوق کا اندازہ لگانا تھا یعنی کس طرح داد دیتے ہیں، کیسے "ہوٹ" کرتے ہیں تاکہ اگلے روز منعقد ہونے والی محفلِ طنز و مزاح میں سامعین کے مذاق کے مطابق مضامین پیش کر سکیں ۔

ٹیگور بھون سے متصل کشادہ میدان میں وسیع پنڈال سجایا گیا تھا تاکہ شبِ غزل کے شائقین کو تنگ دامانی کا شکوہ نہ ہو۔ ہمارے پہنچنے تک پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے جیسے ہی ٹیگور بھون کی دھرتی پر قدم رکھا ایک پنڈال شگاف قہقہے سے ہمارا سواگت کیا گیا۔ میں نے انصاری صاحب کی توجہ قہقہے کی طرف مبذول کرواتے ہوئے کہا ۔ "لگتا ہے ہمارے پہنچنے تک سامعین کے بے حد اصرار پر شبِ غزل کی جگہ شبِ لطیفہ شروع ہو گئی ۔" انصاری صاحب نے ہنس کر فرمایا ۔ "گھبرایئے مت یہ شبِ لطیفہ نہیں شبِ غزل ہی ہے۔ ہم لوگ اس سے پہلے بھی کئی بار شبِ غزل منا چکے ہیں اور اس سے زیادہ تعداد قہقہے بھی سُن چکے ہیں۔ دراصل بھوپال کے لوگ اُس شب غزل کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں فنکار بڑی فنکاری سے ہر غزل سے پہلے اور غزل کے بعد اچھے اچھے لطیفے سناتے ہیں ۔ بلکہ اکثر سامعین تو صرف لطیفے سننے کے لئے ہی پوری غزل کو برداشت کرتے ہیں ۔" انصاری صاحب کی بات پر مسیح صاحب بڑے ہی مفکرانہ لہجے میں بولے ۔ "غزل کے ساتھ لطیفے

کا یہ گٹھ جوڑ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تہواروں کے موقع پر گھی کا بڑا ڈبہ خریدنے پر اسٹیل کے جھارے یا چمچے کی مفت پیشکش، دراصل آج کا انسان اس قدر دکھی پریشان مایوس اور ہراساں ہے کہ ہر مسئلے، ہر بات کا سلسلہ کسی نہ کسی لطیفے سے جوڑ کر اپنے آپ کو بہلائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بازار سے جب اچانک شکر غائب ہو جاتی ہے تو وہ اس وقت تک پھیکی چائے حلق سے نیچے نہیں اُتار پاتا جب تک کہ شکر پر لطیفہ نہیں جوڑ لیتا۔ اسی طرح بڑھتی ہوئی گرانی اور چڑھتی ہوئی قیمتیں جب اس کی قوتِ خرید کا مذاق اُڑاتی ہیں، تو وہ گرانی پر لطیفے جوڑ کر اپنے پرانے پیوند زدہ سوٹ میں دانت کٹکٹاتے ہوئے گلابی جاڑوں کی باڑھ اپنے ناتواں جسم پر جھیل جاتا ہے، غرض یہ کہ آج کا مجبور انسان ہر چھوٹی بڑی محرومی کا مقابلہ لطیفے کی ڈھال سے کرتا ہے، یہی وجہ ہے جو آج کا متوسط طبقہ لطیفے جوڑتا، لطیفے اوڑھتا اور لطیفے پہنتا ہے۔

مسیح صاحب لطیفوں کے معاملے میں بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں، بلکہ اس تعلق سے وہ موقع محل کے بھی قائل نہیں چنانچہ کسی کی خیر مقدمی تقریب ہو یا تعزیتی جلسہ ہر جگہ لطیفے سنانے کی گنجائش نکال لیتے ہیں —— مجھے ڈر تھا کہ لطیفوں پر اتنا زبردست لیکچر جھاڑنے کے بعد وہ نمونتاً دو چار لطیفے ضرور سنائیں گے، لیکن خدا نے میرے حال پر اپنا فضل فرمایا اور فضل تابش صاحب کو وہاں بھیج دیا موصوف کے ساتھ کچھ اور احباب بھی تھے جن کے بر موقع، موقعۂ واردات پر پہنچ جانے کی وجہ سے میں مسیح صاحب کے لطیفوں کی زد سے بال بال بچ گیا —!!

ان دنوں اگرچہ کیلنڈر کی رُو سے اکتوبر کا مہینہ چل رہا تھا لیکن بھوپال کی گرمی کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا جیسے یہاں کے تمام کیلنڈروں میں اکتوبر پر اپریل قابض ہو گیا ہو۔ اندر پنڈال میں گرمی کی شدت سے شبِ غزل، چونکہ خاصی تپ رہی تھی اس لئے ہم نے پنڈال سے دور کھلے سبزہ زار میں اپنا الگ ڈیڑھ اینٹ کا پنڈال لگا لینا مناسب سمجھا۔ ماحول میں ابھی تھوڑی سی اجنبیت باقی تھی اس لئے آتے جاتے لوگوں کے چہرے پڑھنے لگے چنانچہ کتابی، حسابی، شرابی، کبابی، ہر قسم کے چہروں کے مطالعے میں ایسے ڈوبے کہ اجنبیت کے بادل دیکھتے ہی دیکھتے چھٹ گئے۔ ہر چہرہ شناسا، ہر صورت جانی پہچانی لگنے لگی یوں لگ رہا تھا جیسے یہ چہرے یہ صورتیں ہم برسوں سے اپنے آس پاس دیکھتے چلے آئے ہیں۔ نتیجہ اس اپنائیت کا یہ ہوا کہ کچھ فاصلے پر جو صاحب کھڑے غزل کم سن رہے تھے سر زیادہ دُھن رہے تھے ان کے بارے میں مسیح صاحب نے فرمایا۔ "ذرا اس شخص کو غور سے دیکھو، بالکل اظہر افسر صاحب کا ڈپلی کیٹ لگ رہا ہے" اتنے میں ایک اور دبلے پتلے لمبے سے موصوف بیگ ہاتھ میں لٹکائے جھومتے جھولتے، اظہر افسر صاحب کے ڈپلی کیٹ کے قریب پہنچے اور پھر گردن کو ہلکے سے خم کر کے گفتگو کرنے لگے۔ میں نے مسیح صاحب سے کہا "ذرا ان موصوف کو ملاحظہ فرمائیے 'موسم سنگ' کے خالق مضطر مجاز صاحب کا ڈپلی کیٹ لگتے ہیں۔" مسیح صاحب نے فوراً میری بات کی تائید کی۔ 'ڈپلی کیٹوں' کی اس تشـ

پریڈ میں ایک اور شناسا صورت نمودار ہوئی۔ میں نے مسیح صاحب سے بے ساختہ کہا۔ "ذرا اس شخص کو دیکھو ہوبہو یوسف ناظم صاحب کی 'ٹروکاپی' معلوم ہوتا ہے۔ شکل صورت، ہیر اسٹائل چشمہ یہاں تک کہ چال ڈھال بھی ناظم صاحب سے خطرناک حد تک ملتی جلتی ہے، خاص طور سے ذرا چال ملاحظہ فرمایئے۔ لوگ عموماً دوسروں کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں لیکن ناظم صاحب کی چال کا کمال یہ ہے کہ اپنے ایک قدم سے اپنا ہی دوسرا قدم ملا کر اس طرح چلتے ہیں جیسے چل نہیں رہے ہوں اُڑ رہے ہوں اور ان کا یہ ڈپلی کیٹ بھی، ہو بہو ان ہی کی چال چل رہا ہے۔"

مسیح صاحب نے حیرت سے کہا۔ "یہ تو بالکل نقل مطابق اصل دکھائی دیتا ہے۔ مجھے تو یہ شخص ڈپلی کیٹ کم اور یوسف ناظم صاحب کا جڑواں بھائی زیادہ لگتا ہے، ہو سکتا ہے یہ شخص فلمی جڑواں بھائیوں کی طرح ناظم صاحب سے بچپن ہی میں بچھڑ کر بھوپال میں آبسا ہو۔" ہماری یہ قیاس آرائیاں جاری ہی تھیں کہ یوسف ناظم صاحب کے جڑواں بھائی کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ پہلے تو موصوف نے دور ہی سے ایک عدد سلام ہماری طرف اُچھالا، پھر ہمارے قریب پہنچ کر بولے۔ "تو آپ لوگ بھی موجود ہیں یہاں"۔ ناظم صاحب کے ہم شکل کی آواز بھی ان سے اس قدر ملتی جلتی تھی کہ میں نے سوچا اگر ایک بار خود ناظم صاحب کا سامنا اپنے ڈپلی کیٹ سے ہو جائے تو وہ بھی بادی النظر میں اس شخص کو اصلی یوسف ناظم اور خود کو اس کا ڈپلی کیٹ تصور کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ڈپلی کیٹ یوسف ناظم نے مزید فرمایا۔ "میں آج شام میں یہاں پہنچا ہوں لیکن ابھی تک فضل تابش صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی، پتہ نہیں موصوف کس خرابات میں چھپے بیٹھے ہیں۔" جیسے ہی ڈپلی کیٹ کی بات ختم ہوئی فضل تابش صاحب لان پر نمودار ہوئے اور انہیں دیکھتے ہی ڈپلی کیٹ ناظم صاحب اُدھر ہی ہو لئے۔ اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت اور خفت سے دیکھا کیونکہ جسے ہم ناظم صاحب کا ڈپلی کیٹ، ہم شکل اور جڑواں بھائی سمجھے ہوئے تھے وہی دراصل اوریجنل یوسف ناظم تھے۔ گویا یوسف ناظم کے جڑواں بھائی بھی خود یوسف ناظم ہی نکلے — یوں بھی اللہ تعالیٰ بعض مخصوص چہرے بنانے کے بعد غالباً ان کی ڈائی (DYE) ضایع کر دیتا ہے۔ اس لیے ان کی 'ڈپلی کیٹ کاپی'، کے غلطی سے بھی دنیا میں پہنچ جانے کا امکان نہیں رہتا۔ کم از کم اپنے ہم جنسوں میں ایسے چہروں کی نقل نہیں ملتی، ہاں شاید مخالف جنس میں مل جائے تو مل جائے۔ اس کے لیے بھی ڈھونڈنے والی نظر چاہیے۔

ڈپلی کیٹوں کے سلسلے میں یہ آخری جھٹکا ایسا زبردست تھا کہ ہم نے وہاں سے رخصت ہونے ہی میں عافیت جانی۔ البتہ شبِ غزل کے توسط سے ایک اور عقدہ یہ کھلا کہ بھوپال صرف قوالوں اور درزیوں ہی کا شہر نہیں بلکہ 'ڈپلی کیٹوں' کی بستی بھی ہے —— !!!

* * *

(باقی آئندہ)

* * * * *

دعوت بہ چہلم

شاداب بے دھڑک
مدراسی

پی کھا کے مغفرت کی دعا دے کے جائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

جینے کی آرزو میں مرا ہوں میں بے دھڑک
مرحوم ہو کے آج جیا ہوں میں بے دھڑک

اس جشنِ انتقال کی خوشیاں منائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

چہلم کا یہ پلاؤ نہایت لذیذ ہے
جو سیر ہو کے کھائے وہ میرا عزیز ہے

گر ہو سکے تو ساتھ میں چورن بھی لائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

جیتے جی ایسی دعوت و عزت کہاں ملی
ہمدرد دوستوں کی عنایت کہاں ملی

اب مر گیا ہوں شوق سے جلسے منائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

شاعر مرا ہے اردو کا ماتم کناں ہے شہر
"مُردوں کے سلسلے میں بڑا مہرباں ہے شہر"

شوہر کی شاعری کے مزے اب اڑائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

بیگم یہ داد خواہوں کی ہے داد لیجئے
اردو اکیڈمی کی وہ امداد لیجئے

ہاں اس رقم سے گردی کا برقع چھڑائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

جو آگیا اسے مرا مُردہ کہے سلام
حق سب کو ہے کرے مری تعریف میں کلام

مسٹر کو لائیے کہ منسٹر کو لائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

ہڑتالیں کر کے میری وصیت سنائیے
ڈسکو کی دھن میں مرثیہ شاعر کا گائیے

چندے کا ڈبہ پیٹ کا طبلہ بجائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

مر جاؤ بعد مرنے کے ویلکم بھی ہے بہت
لاشوں کے کاروبار میں انکم بھی ہے بہت

چھپوائیے کتابیں خطابیں دلائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

جلسے بھی تعزیت کے کئی نام کے ہوئے   مرنے کے بعد ہم تو بڑے کام کے ہوئے

اب بے دھڑک کی نیکیاں ساری گنائیے   چہلم میں آئیے مرے چہلم میں آئیے

برق آشیانوی

برق و شرر
(مستقل کالم)

(مستقل فیچر)

ایک انگریزی اخبار میں یہ روح فرسا خبر پڑھ کر ہمیں حیرت ہی نہیں بلکہ بے حد رنج ہوا کہ لندن کے ایک ہوٹل میں جھینگر اور چوہے نظر آنے پر وہاں کی عدالت نے ہوٹل کے مالک کو ایک ہزار پونڈ جرمانہ کی سزا دی یہ صریحاً ظلم بلکہ ستم ہے۔ لندن ں عدالت کو چاہیئے کہ کسی جرم کی سزا دینے سے قبل دنیا کے حالات کو پیش نظر رکھے۔ بالخصوص ہمارے ملک سے تو واقف دنا چاہیئے جس پر تقریباً دو سو سال تک انگلستان نے حکومت کی۔ نہ صرف واقف ہونا چاہیئے بلکہ سبق حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ حالانکہ ہمارے ملک نے پوری دیانت داری کے ساتھ انگریزوں سے کئی سبق سیکھے سوائے ایک سبق کے جو بہت مشکل تھا۔ جو کہ انگریزوں کی صحبت میں تقریباً دو صدیاں گزارنے کے بعد بھی ازبر یاد نہ ہو سکا۔ سوال یہ ہے کہ وہ مشکل سبق کیا تھا تو ض ہے کہ وہ مشکل سبق "وقت کی پابندی" تھا جو پورے کا پورا یاد کرنا تو درکنار اس کا نصف یا کم از کم ربع حصہ بھی یاد نہ ہوا ں کی وجہ سے آج ہمارے ملک کا بڑے سے بڑا لیڈر اور چھوٹے سے چھوٹا ٹیچر اس سبق کو یاد نہ کر سکا طلبہ کا تو ذکر ہی کیا ھوں نے اسکول کو گھر کا دیوان خانہ سمجھ رکھا ہے کہ جب جی چاہا آئے اور جب جی چاہا مارننگ شو دیکھنے کے لئے نکل گئے۔ غرض کہ ہم نے انگریزوں سے وقت کی پابندی اور صفائی کے سوا ہر سبق سیکھا۔ مثلاً پتلون ہی کو لیجئے جس کے بارے میں ایک شعر کو ہرت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے ؎

زالفِ "ہندی" سے لگا رہتا ہوں ✽ آدمی نہیں ہوں "پتلون" ہوں میں

نے تو انگریزوں سے پوری ایمان داری کے ساتھ کئی باتیں سیکھیں لیکن افسوس اُن انگریزوں کی بے ایمانی پر ہوتا ہے کہ انھوں نے ہم چھ نہیں سیکھا۔ کچھ نہیں تو کم از کم شیروانی یا دھوتی پہننا ہی سیکھ لیتے تو ہمارے دل کو کچھ سکون ملتا۔ تاہم ہمارے ملک کے جدید محققین ق کی ہیزدوڑ میں مصروف ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں کہ اہل مغرب کی کئی ایجادات و اختراعات اور اقتصادی ی و سماجی رسم و رواج ہمارے ملک ہی سے ان لوگوں نے سیکھے ہیں البتہ ہم نے بھلا دیئے ہیں۔

غرض لندن کی عدالت کو چاہیے تھا کہ ہندوستان جیسے ممالک کے حالات کو نظر میں رکھتی۔ ہمارے ملک میں جھینگر اور چوہے تو ہوٹلوں اور کچن میں اس طرح رہتے اور بستے ہیں جیسے یہ اُن کے آبائی مکان ہیں۔ نہ صرف رہتے اور بستے ہیں بلکہ اشیائے خوردنی میں عام طور پر نظر آتے ہیں۔ بیرے سے شکایت کی جاتی ہے تو وہ جھینگر کو اس کی ٹانگیں پکڑ کر اور چوہے کو دُم پکڑ کر باہر پھینک دیتا ہے اور وہی پلیٹ پھر گاہک کو پیش کر دیتا ہے۔ ابھی حال کی بات ہے کہ ماہ اپریل میں ہم اپنے دہلی دورے کے دوران مہاراشٹرا کے ایک بس اسٹانڈ کے قریب کی کچھ پاک صاف ہوٹل میں پیٹ کے دوزخ کی آگ بجھانے کے لئے داخل ہوئے منہ ہاتھ دھونے کے لئے جب واش بیسن پر پہنچے تو وہاں سے کچن صاف نظر آرہا تھا اس سے بھی صاف یہ نظر آرہا تھا کہ ایک بہت بڑے بگونے میں بھرے ہوئے تازہ تازہ دودھ کو ایک کتا پی رہا تھا۔ ہمیں کندراہٹ محسوس ہوئی ہم نے ہوٹل کے منیجر سے شکایت کی تو اس نے مسکرا کر جواب دیا "صاحب کتا ایک وفادار جانور ہے اس کا جھوٹا پی کر آدمی میں وفاداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس دور میں جنس وفا" کس قدر گراں ہو گئی ہے۔ جتنے لوگ اس دودھ سے بنی ہوئی چائے پئیں گے اُن میں دوستوں رشتہ داروں بلکہ ملک سے بھی وفاداری کا جذبہ پیدا ہو جائے گا" ہم یہ جواب سُن کر ہوٹل سے باہر آئے اور کچھ پھل اور میوے خریدے اور دوران سفر اسی سے اپنا پیٹ بھر لیا۔

یہاں تک تو ہوٹل کی بات ہوئی۔ اب اسپتالوں کی سنئے۔ ہماری ریاست کے سب سے بڑے اسپتال میں جب ہم شریک تھے تو دیکھا کہ ہمارے سرہانے دیوار میں ایک بل یعنی سوراخ ہے جس میں رات ہوتے ہی جھینگروں کی ایک فوج نکل کر نہ صرف غذائی اشیاء بلکہ ان کا بس چلتا تو ہمیں بھی کھا لینے کو تیار تھی۔ کتے اسی آزادی کے ساتھ پورے وارڈوں میں پھرتے اور مریضوں کی غذا کو ایسی بے تکلفی سے کھا لیتے جیسے یہ سب ان کی تواضع کے لئے ہی موجود ہے۔ اسپتالوں سے آگے بڑھیئے تو محلے کے آوارہ کتے انداز سے گھروں میں اور کچن میں داخل ہو جاتے ہیں جیسے یہ اُن ہی کا گھر ہے اور ہم اُن کے مہمان ہیں۔ جب اُن کتوں کو باہر تشریف لیجانے کی شرافت کیساتھ گزارش کی جاتی ہے تو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ کیوں نہ تم خود ہی گھر سے باہر نکل جاؤ پھر جب "لاتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانتا" کے مقولے کو یاد کر کے ہم اُن کی تواضع اینٹ پتھر اور کچھ نہ ملے تو جوتوں سے ہی کرتے ہیں تو تب کہیں وہ گھر سے جاتے ہیں۔ اس بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ لندن کی عدالت اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے ہمارے ملک کی مثالوں کو سامنے رکھ کر بلکہ ہم سے سبق سیکھ کر ایک ہزار پونڈ کا جرمانہ معاف کر دے بلکہ ہماری سفارش تو یہ ہے کہ ایک ہزار پونڈ کا انعام دے۔ ■

نامور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے مکان کا پتہ بدل گیا ہے قارئین نیا پتہ نوٹ فرمالیں۔

مجتبیٰ حسین، IV/4 NIE، NCRTC کیمپس، آربندو مارگ، نئی دہلی ۱۶ ۰۰ ۱۱

نعیم زبیری

ٹریفک کانسٹبل وٹامن کی کمی کا شکار

"چپ ۔ پولیس والا لے جائے گا پکڑ کے"

بس اسٹاپ میں کھڑی ہوئی اماں نے روتے ہوئے بچے کو ڈرایا ۔ میری نظر بے اختیار اس نہایت ہی پلپلے اور توندیل کانسٹبل کی طرف اُٹھ گئی جو ایک دوسرے میں گڈ مڈ ٹریفک سے قطعی بے نیاز ایک لاری ڈرائیور سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھا ۔ مجھے حیرت ہوئی ۔ کہ بچہ ڈر کے چپ ہو گیا!! مطلب یہ کہ اس دو سال کے بچے کو یقین تھا کہ پولیس کانسٹبل جسے عام طور پر حیدرآبادی دکھشوا سامنے "جمعدار صاب" اور غیاب میں گالی کے نام سے یاد کرتا ہے ــــــــــ فوراً ہی لاری ڈرائیور جیسی عمدہ غذا کو چھوڑ کے اسے چپ کرانے کا فرض پورا کرنے کے لیئے دوڑا چلا آئے گا:

دوسرے شہروں کی نفسیات سے جہاں ایک آدھ ہی دن کے لئے کبھی کبھار چلا جاتا ہوں میں زیادہ واقف نہیں ہوں کیونکہ کسی دوسری جگہ کے کانسٹبلوں کو میں نے دن دھاڑے لاری والوں کی طرف اس بُری طرح رال ٹپکاتے ہوئے لپکتے نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے اُن لوگوں نے کوئی نسبتاً زیادہ ماڈرن، مہذب اور سائنٹیفک طریقے اختیار کر لیئے ہوں گے لیکن میرے شہر کا کانسٹبل اس معاملہ میں "مجھا میٹھے پن" کا جسے ریاکاری کہتے ہیں قائل نہیں ہے ۔ وہ راست معاملے کا قائل ہے ۔ ہمارے جمعدار صاحب اگر لاری نظر آجائے تو پھر خواہ ساری ٹریفک ایک دوسرے میں مپیس کے آفس کے کلرکوں کی میزوں پر پڑے ہوئے فائیل ٹیگس کا جسے میرے ایک مزاح نگار دوست "ٹیاگس" لکھیں گے!) الجھا ہوا گچھا ہی کیوں نہ بن جائے ۔ ان کی توجہ کو سڑک کی طرف اس وقت تک واپس نہیں لایا جاسکتا جب تک کہ معاملات تشفی بخش طور پر طے نہ ہو جائیں ۔

مجھے اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہے کہ چوراہوں پر کھڑا کانسٹبل مشین کی طرح ٹریفک کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جانے کے اشارے کیا کرتا تھا ۔ اور اب تو ویسے بھی کانسٹبل کو زیادہ ایکسرسائز کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں رہی ہے کہ ہر اہم چوراہے پر ٹریفک سگنل لگا دیئے گئے ہیں۔ کہیں آٹو میٹک ۔ اور کہیں غیر آٹو میٹک ۔ تاکہ ٹریفک کانسٹبل صاحب نہایت آرام سے

اپنے دوستوں سے محوگفتگو رہیں اور جب جی چاہے بٹن دباتے رہیں۔ لوگ تو اپنے راستے پہچانتے ہی ہیں۔ لیکن اب بھی بعض مقامات آ؎ دفعاں ایسے بھی ہیں جہاں سگنل نہیں پہنچے ہیں۔ یا اگر ہیں تو اندھے۔ کیوں کہ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ میں فیل ہونے والے طالبعلموں نے حسبِ توفیق ۱۰، ۱۵ یا ۲۰ نشانات کے مطالبات کے دوران انھیں پھوڑ دیا ہے۔ ایسی جگہوں پر کانسٹبل مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں اس خیال سے کہ تنہائی میں کانسٹبل اکتا نہ جائے۔ ایک آدھ اور کو بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس ڈر سے کہ کہیں ٹریفک میں خلل نہ واقع ہو۔ چوراہے سے ذرا ہٹ کے پرائیویٹ معاملات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً اپنی مخصوص سیٹی بجا دیتے ہیں۔ جو مجرم ضمیر ہوگا، اس سیٹی کو سنتے ہی خود بدک جائے گا۔

ہمارے ٹریفک والے چند سال پہلے اتنے بے نیاز، تھکے ہوئے، اور نحیف نظر نہیں آتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب سائیکل پر ڈبل سواری چلانا نہایت خطرناک جرم تھا۔ اور اس قسم کے عادی مجرموں کو پکڑ کے جمدار صاحب کے جسم میں کچھ حرارت، کچھ چستی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور اب مصیبت یہ ہے کہ اس سارے معاملے میں نقصان پبلک کا اور خصوصاً ہم جیسی احمق پبلک کا ہوا ہے کیوں کہ ڈبل سواری والوں کی تاک میں رہنے کے لیۓ جمدار صاحب کو ذرا متحرک رہنا پڑتا تھا۔ یہ نہیں کہ اکتائے ہوئے سڑک کے کسی کونے میں کھڑے ہیں اور کاریں اور آٹو رکشائیں ہمارے اوپر سے چلی جا رہی ہیں۔

اب اس کا اُپائے کیا ہو؟ ۔ یا تو یہ کہ ڈبل سواری پہ پھر سے پابندی عائد کر دی جائے۔ یا پھر جمدار صاحب کو "نان پریکٹسنگ الاؤنس" جاری کیا جائے!!

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی دلچسپ کتابیں

آدمی نامہ ○ بہر حال ○ بالآخر

۹/- روپے ۹/- روپے ۱۴/- روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جا سکتی ہے

ڈاکٹر بیک کانٹ

لطیفے

①

جب مشہور مصور پکاسو سے پوچھا گیا کہ "آپ واقعی معجزہ کو مانتے ہیں؟" تو اس نے جواب دیا "ہاں یقیناً۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشہور مصور روڈین خود ایک معجزہ تھا۔"

سوال کرنیوالے نے وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا کہ "آخر روڈین کے تصویریں واقعی معجزہ ہیں؟" پکاسو نے جواب دیا "ویسا نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ معجزہ تو یہ ہے کہ روڈین نے تو صرف دو ہزار تصویریں بنائی تھیں لیکن آج کوئی چار ہزار تصویریں اس کے نام سے منسوب ہیں۔ یہی میرے خیال میں ایک معجزہ ہے۔"

②

ایک ناپسندیدہ ہمعصر ادیب کی موت پر مشہور فرانسیسی ادیب اور فلسفی والٹیر سے لوگوں نے خواہش کی کہ ایک تعزیتی پیام جاری کرے۔ والٹیر نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس ناخوشگوار رسم سے اپنا دامن بچائے مگر یار دوستوں نے بہرحال اپنی چلائی اور چاروناچار والٹیر کو ایک پیام لکھنا ہی پڑا۔ اپنے مختصر سے تعزیتی نوٹ میں والٹیر نے لکھا کہ "مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ موسیو بلاٹنگ اس دنیا سے چل بسے۔ وہ ایک وطن پرست باصلاحیت ادیب، وفادار دوست، محبت کرنے والے شوہر اور باپ تھے۔ اگر واقعی وہ مرحوم ہو چکے ہیں تو مجھے اس بات پر یقین کرنے کو ئی تامل نہیں کہ وہ تنہا ان ساری خوبیوں کے حامل تھے!"

③

ایک امریکی اسکول میں استاد نے طالب علم سے پوچھا "جان کل تم اسکول سے کیوں غیر حاضر تھے؟"

"جناب کل ہماری فیملی میں ایک فرد کا اضافہ ہوا اور ہم سب کل گھر پر خوشی منا رہے تھے"۔ اس پر استاد نے استفسار کیا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے گھر میں بھائی کا اضافہ ہوا یا بہن کا؟" "نہیں جناب نہ بھائی نہ بہن" لڑکے نے جواب دیا "دراصل میری ماں نے آخر کار شادی رچالی"۔

④

"وہ کل آنکھ مارا!" ایک ایسا شعبدہ گر جملہ ہے جس کے ہر لفظ کے بعد "بھی" کا اضافہ جملہ کو نئے معنیٰ عطا کرتا ہے۔

⑤

اٹلی کے ساحل پر دو پولیس کانسٹبل گھوم رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا "مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس صوفیہ لارین میں کون سی خاص بات ہے؟! اس کی زلفیں، ہونٹ رخسار، آنکھیں اور جسم چھین لو تو پھر کیا بچ رہتا ہے!؟" دوسرے کانسٹبل نے فوری جواب دیا۔ "میری بیوی"!

پاگل عادل آبادی کا نیا مجموعہ

گڑبڑ گھٹالا

قیمت : ۱۵ روپے

⑤

خرافات

(مراسلے)

● جناب سید مصطفیٰ کمال صاحب!

ماہ جون کا شگوفہ موصول ہوا۔ یوسف ناظم اور پرویز یداللہ مہدی کے ساتھ کئی اور طنز نگاروں کے مضامین پڑھے، بہت مزا آیا۔ شگوفہ کے ذریعہ ادب میں طنز و مزاح کی جو آپ خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔

انیس احمد خاں (نئی دہلی)

● زندہ دلانِ حیدرآباد کی تقریبات کی کامیابیوں پر مبارکباد۔ چارمینار کے سائے تلے ایسے شاندار فنکشن ہر سال ہوتے ہیں جسے دیکھنے سے ہماری آنکھیں محروم ہیں۔ بہرحال شگوفہ میں رپورتاژ پڑھ کر آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ گیا۔ عبدالسمیع کا "زبان یارمن تلگو" بے حد پسند آیا۔ رشید قریشی کا دلہا پر مضمون مزاح سے پُر اور طنز سے لبریز ہے۔ شگوفہ ہمیشہ تر و تازہ رہے یہی دعا ہے۔

مختار یونس (مالیگاؤں)

● کئی ماہ بعد شگوفہ میرے ہاتھ لگا اور رات ہونے تک تمام مزاحیہ مضامین و غزلیں "چاٹ" ڈالا۔ بہت لذیذ، بہت عمدہ، ہر شگوفہ ذائقہ دار ہے۔ نہ جانے یہ شگوفہ کیسے کیسے لوگوں کے دلوں کو ہمیشہ ہنسنے پر

پر مجبور کرتا ہے۔ میری نظر میں یہ واحد مزاحیہ رسالہ ہے اور وہ بھی اردو کا جو سرزمینِ حیدرآباد سے شائع ہو کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مزاح پھیلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اور ترقی عطا فرمائیں۔ آمین

محمود انصاری (ناگپور)

● برادرم سید مصطفیٰ کمال صاحب!

سلام و خلوص: شگوفہ کا سالنامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ "شگوفہ" اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ سالنامہ کی شکل میں اور بھی توانا۔ تندرست اور جاذب نظر ہوتا جا رہا ہے۔ شگوفہ کو پُرشباب بنانے پر میری طرف سے بہت بہت مبارکباد قبول کریں۔

مجیب الرحمٰن بزمی، جمشید پور

● جون کے شمارے میں خواتین کا حصہ زیادہ ہے۔ عابد معز نے ٹرافک کو "ٹریفک" خوب بنایا۔ شگوفہ کے سرورق خوب ہوتے ہیں۔ شعیب کے یہ کارٹون اُردو میں آسکتے تو اچھا تھا۔

میر محمد سلیم (رائچور)

★

ادارۂ شگوفہ کی جانب سے
قارئین کرام کی خدمت میں
عید الفطر کی
پُرخلوص مبارکباد ——

15822/68
Copy 7
SHUGOOFA Hyderabad-1
Postal Regd. No. H. HD 6
July 1983 Phone : 67716

زندہ طلسمات سردرد، کھانسی، زکام سے فوراً آرام دیتا ہے ـــ اور کئی امراض مثلاً پیچش، ہیضہ فلو وغیرہ کے لئے ـــ کامیاب علاج!

تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات
حیدرآباد-۵۰۰۰۱۲

زندہ دلانِ حیدرآباد
AUGUST 1983
Rs.
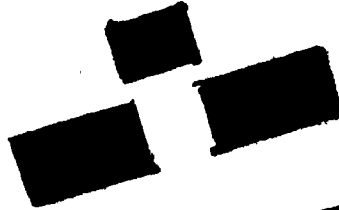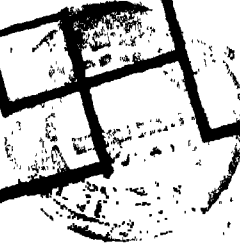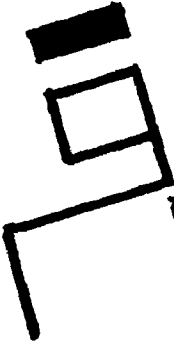
جلد ۱۶
شمارہ ۸

اگست ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

منیجر: سمیع جلیل

سرورق: طالب

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے
بیرونِ ہند: ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ:
"شگوفہ" ۳۰۳، بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۱ فون: 57716

سالگرہ اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

۱۔ ڈسٹری بیوٹرس برائے :

۱۔ موہن میکن بریویریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ پارکو، سری نگر
۴۔ انڈین ایسٹ کمپنی
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ سیڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیسیز ہوٹلس اینڈ ٹائیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چینین وہائٹ روٹس
۱۰۔ سل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی وغیرہ)

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان :

پوران داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

دخل در نامعقولات (ڈراما)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

مالِ مفت (انشائیے)

قاضی جی دُبلے (رپورتاژ)

دو باتیں

چوٹ (نظمیں)

اپنی بصارت کا معائنہ

امریکہ کی آٹو میٹک

آئی ٹسٹنگ مشین سے کروائیے

امریکہ کی اڈوانس آپٹیکل ٹکنالوجی

کے

مستند تربیت یافتہ

معیاری چشموں

کی تیاری

کے لیے تشریف لائیے :

غوری

اینڈ

کمپنی آپٹیشنس

ترپ بازار حیدرآباد

فون : ۴۲۱۲۷

کوالیفائیڈ آپٹیشنس اکادمی آف

آپٹیشنری (امریکہ)

★

"شگوفہ" کا "ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب

(حصۂ نثر)

نومبر ۱۹۸۳ء میں شایع ہوگا۔

زبان	مرتب
اردو	ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر ظ انصاری
ہندی	ڈاکٹر سریندر رتی لال ہنرا شاہین
بنگالی	شانتی رنجن بھٹاچاریہ
مراٹھی	ڈاکٹر عبدالستار دلوی
گجراتی	ڈاکٹر شکنیا جوہری
کشمیری	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ
پنجابی	پروفیسر گرنام سنگھ تیر، پروفیسر راز سنتوک سری
انگریزی	ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر سید عابد حسین
تلگو	ڈاکٹر راما راؤ
کنڑی	حمید الماس
میتھلی	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
سندھی	ڈاکٹر ارجن داس
اڑیا	اسمٰعیل آذر
تامل	ایس۔ ایم۔ حیات

مہمان مدیر: یوسف ناظم

ساتھ میں بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے اور "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

رشید احمد صدیقی، پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، فرقت کاکوروی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، بھارت چند کھنہ، فکر تونسوی، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، وجاہت علی سندیلوی، شفیقہ فرحت، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، رشید قریشی، برق آشیانوی، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی

★ حصۂ معلومات اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی

مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

قیمت: بیس ۲۰ روپے

شگوفہ: ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ ۵۰۰۰۰۱

ساگر سرحدی

پھر کون آیا

(ایکانکی)

کردار

۱۔ راجیش
۲۔ راجکماری
۳۔ نیتا
۴۔ ہریش

راجیش کا گھر۔ دائیں جانب ہریش کا کمرا ہے۔
بائیں جانب راجیش اور راجکماری کا۔
بیچ کا کمرا ڈرائنگ روم ہے۔

راجکماری (اندر سے) ـــــ لے ہونے والے مُنّے کے باپو!

راجیش ـــــ بن گئی ہے چائے راجکماری جی۔ شادی نے باورچی بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

راجکماری ـــــ (آتے ہوئے)۔ مجھے تو چکر آتے ہیں۔

راجیش ـــــ یہ چکر تو تمہیں دس سال سے آ رہے ہیں، گریں تو تم ایک بار بھی نہیں۔

راجکماری ـــــ گرم کیوں ہو رہے ہو جی!

راجیش ـــــ ٹھنڈا ہو ہو کر گرم ہوا ہوں۔

راجکماری ـــــ شرم نہیں آتی بیمار آدمی کو ڈانٹ رہے ہو۔

راجیش ـــــ یہ بیماری تو تمہیں ہر دوسرے مہینے ہو جاتی ہے۔ پوری بھر املی کھا گئی ہو، چاٹ، مٹی، جانے کیا الا بلا۔ آج تک وہ پاجی منا نہ ہوا۔

راجکماری ـــــ مُنّے کو گالی نہ دو!

راجیش ـــــ مُنّے کو نہیں تمہیں دے رہا ہوں۔

راجکماری ـــــ اتنا تنگ آ گئے ہو تو دوسری کر لو۔

راجیش ـــــ مجھے کوئی راجہ مہاراجہ سمجھ رکھا ہے ـــــ

دن بھر چاول آٹا، مرچ مسالہ بیچتا رہتا ہوں۔ شام کو جی چاہتا ہے کہ میرے کانوں میں میٹھی سی آواز گونجے "بابو"۔ آتے ہی تمہارا یہ بول سنائی دیتا ہے۔ (نقل کرتے ہوئے) ہونے والے منّے کے بابو!

راجکماری ـــــ اس طرح تنگ کروگے تو میں مائیکے چلی جاؤں گی۔

راجیش ـــــ کتنے دنوں بعد واپس آؤگی۔

راجکماری ـــــ ارے تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میں سچ مچ جا رہی ہوں۔ معلوم ہے میں دس دن کے لئے جاتی ہوں گھبرا اٹھتی ہوں۔ میرا من تو اس گھر میں ہے نا۔

راجیش ـــــ کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ وہاں میرے جیسا ٹٹو نہ ملتا ہوگا۔

راجکماری ـــــ ہائے ہائے کیسی باتیں کرتے ہو۔

راجیش ـــــ میں سوچتا ہوں اتنی مایا کا کیا ہوگا۔

راجکماری ـــــ میرے چار بھائی جیتے رہیں۔

راجیش ـــــ اتنا کچا نہیں ہوں، ان گدھوں کو ایک کوڑی نہ دوں۔ اپنا بھائی بھی اُلّو نکلا۔

راجکماری ـــــ اسے کیوں کوس رہے ہو!

راجیش ـــــ وہی اُلٹا سیدھا نکلتا تو اڑا کر ختم کر دیتا۔ ایک دم آگیاکاری۔ لچھمن سروپ۔ ہر مہینے الو کی دُم دو سو روپے اور بھیج دیتا۔

راجکماری ـــــ (ذرا اُرک کر)۔ ہونے والے منّے کے بابو۔

راجیش ـــــ کیوں ہونے والے منّے کی ماتاجی۔

راجکماری ـــــ تم ہریش کی شادی کا کیا کر رہے ہو؟

راجیش ـــــ اس کی شادی ایسی دھوم دھام سے کروں گا کہ اپنے محلّے کا وہ دس منزلوں والا ہوٹل سا لگے گا۔

راجکماری ـــــ لڑکی دیکھی ہے۔

راجیش ـــــ لڑکیاں تو سڑکوں پر روز ہی دیکھتا ہوں لیکن جچتی کوئی نہیں۔

راجکماری ـــــ ہونے والے منّے کے بابو!

راجیش ـــــ کیوں جی؟

راجکماری ـــــ میری چھوٹی بہن ـــــ

راجیش ـــــ تم اپنے گھر کا ذکر نہ کرنا۔ میرا بس چلے تو تمہارے گھر کی گلی تو کیا تمہارے شہر میں جانے کی آگیا نہ دوں۔

راجکماری ـــــ کیوں، ایسا کیا ہے!

راجیش ـــــ پوچھتی ہو ایسا کیا ہے۔ میں کم اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔ دس سال ہوئے گھر میں ایک بچہ نہیں۔ جہاں تمہاری موسی کی لڑکی بیاہی گئی وہاں بچوں کی کمی پوری کرنے کے لئے کتّے پال رکھے ہیں۔ تمہارے چاچے کی لڑکی جہاں بیاہی گئی ہے وہاں انھوں نے بلّیاں پال رکھی ہیں۔

راجکماری ـــــ پچھتاؤگے ـــ

راجیش ـــــ ارے چھوڑو۔

راجکماری ـــــ ہریش کوئی ایسی ویسی پکڑ کے لے آئے گا۔

راجیش ـــــ ارے میرا بھائی ہے ـــ میری آگیا کے بغیر ایک قدم نہیں چلتا۔

راج ـــــ ارے لڑکا جب لڑکی کو دیکھتا ہے تو ماں باپ کو بھول جاتا ہے۔ اور پھر تم تو بھائی ہو۔

راجیش ـــــ ہریش ایسا لڑکا نہیں ہے۔ وہ لڑکی کو دیکھتا ہوگا تو فوراً بھائی کو یاد کرتا ہوگا۔

[دروازے پر دستک ہوتی ہے]

راج ـــــ یہ صبح صبح کون آ گیا۔

راجیش ـــــ ارے وہ دھوبی ہوگا۔ کم بخت آئے آج۔ ہر دھلائی میں ایک کپڑا خراب کر دیتا ہے ـــ آج دیکھتا ہوں۔

[ہاتھ میں جوتا لیتا ہے]

راج ـــــ ارے جوتا نیچے رکھو ـــ لنگور لگتے ہو۔

راجیش ـــــ اور کیا فلم ایکٹر لگوں۔

[اس کی بیوی دروازہ کھولتی ہے۔ نیتا داخل ہوتی ہے۔ وہ بیٹڈلوم کی کسی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہے۔ شلوار بھی گہرے خوبصورت رنگ کی ہے۔ کالا دوپٹہ گلے میں پڑا ہے۔ نہایت ماڈرن لڑکی ہے۔ بڑے وقار کے ساتھ آتی ہے]

نیتا ـــــ راجیش کمار کھنّہ کا گھر یہی ہے۔

راجیش ـــــ جی ہاں، مجھے راجیش کمار کھنّہ کہتے ہیں ـــ یہ میری دھرم پتنی راجکماری کھنّہ ـــ فرمائیے۔

[نیتا اٹیچی کیس نیچے رکھتی ہے۔ آگے بڑھ کر راجیش کے پاؤں چھوتی ہے پھر راجکماری کے]

راجیش ـــــ ارے ... یہ ... یہ کیا کرتی ہیں آپ ...

راجکماری ـــــ ارے میرے پاؤں نہ چھو ـــ مجھے پاپ لگے گا۔

راجیش ـــــ آپ کون ہیں؟

نیتا ـــــ میں دہلی سے آئی ہوں۔

راج ـــــ ڈیرہ دون سے کیوں نہیں آپ!

نیتا ـــــ ہریش جو دلی میں رہتے ہیں۔

راجیش ـــــ تم ـــ میرا مطلب ہے آپ ہریش کو جانتی ہیں۔

نیتا ـــــ میں ہریش کی پتنی ہوں۔

دونوں ـــــ ہیں ـــ !!!

نیتا ـــــ دو ماہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔

راجکماری ـــــ کوئی بچہ!

راجیش ـــــ لیکن ....

نیتا ـــــ وہ کمرہ ہریش جی کا ہے نا؟

راجیش ـــــ ہاں ....

نیتا ـــــ اُس کی میز پر آپ کی تصویر ہے نا ـــ؟

راجیش ـــــ ہاں۔

نیتا ـــــ آپ چلّاتے بہت ہیں نا ـــ؟

راجیش ـــــ ہاں۔

نیتا ـــــ مجھے سب معلوم ہے۔ وہ مجھے گھر کی ایک ایک چیز بتلاتے رہتے ہیں۔

[وہ اُسی گمبھیرتا سے اٹیچی اٹھاتی ہے۔ اور ہریش کے کمرے میں چلی جاتی ہے]

راجکماری ـــــ لو سنو ـــ بڑا بھائی بنا پھرتا تھا ـــ آ گیا بہو۔

راجیش ـــــ میں اس کا خون پی جاؤں گا ـــ میں اسے گولی سے اڑا دوں گا۔ دو پیسے کا خط بھی نہ لکھا پاجی نے۔

راج ـــــ خط پانچ پیسوں کا ہوتا ہے۔

راجیش ـــــ میں چاہتا تھا کہ دھوم دھام سے شادی ہو۔ یہ شادی کی ہے کہ رجسٹری لیٹر لکھ دیا ہے۔

راج ـــــ میں نے کہا تھا۔

راجیش ـــــ ارے تم تو کہتی رہتی ہو۔

راج ـــــ ایک بات بتاؤں۔

راجیش ـــــ جلدی بتاؤ۔

راج ـــــ مجھے یہ لڑکی بیاہتا نہیں لگتی۔

راجیش ـــــ تمہیں کیسے معلوم؟

راج ـــــ میں عورت بھلا۔ سب جانتی ہوں۔ مرد جب عورت کو چھو لیتا ہے تو وہ اس طرح نہیں لگتی۔

راجیش ـــــ کیسے لگتی ہے؟

راج ـــــ تم سمجھا کرو نا۔

راجیش ـــــ تو؟

راج ـــــ مجھے تو کوئی جاسوس لگتی ہے۔

راجیش ـــــ ارے چور ڈاکو نہ ہو ـــ پہلے زمانے میں لڑکیاں دل چرایا کرتی تھیں۔ آج کل پہلے زیور پر ہاتھ صاف کرتی ہیں اور دل اگر پڑا مل بھی گیا تو وہیں تکیے کے نیچے رکھ دیتی ہیں۔

راج ـــــ اے جی! اُس کمرے میں میرا ہار ہے۔

راجیش ـــــ میری نئی دھوتی بھی ہے۔

راج ـــــ ارے تمہاری دھوتی کا وہ کیا کرے گی!

راجیش ـــــ لہنگا بنائے گی۔

راج ـــــ تم تو نکمے رہتے ہو ـــ لے جی پولیس کو خبر دو۔

راجیش ـــــ کیا خبر دوں۔

راج ـــــ چور آگیا ہے۔

راجیش ـــــ اور یہ بھی کہوں کہ چور نے آکر پہلے پرنام کیا ہے ـ دیکھوں تو وہ کیا کر رہی ہے۔

[دونوں کمرے میں جھانکتے ہیں۔ اندر سے میرا بھجن کی آواز آرہی ہے۔ نیتا گنگنا رہی ہے]

راجیش ـــــ چور آتے تو سُنا ہے گانا گاتے پہلی مرتبہ سُنا۔

راج ـــــ کوئی جادو ٹونے والی نہ ہو ـــ آج کل لڑکیاں جانے کیا کیا کرتی ہیں۔

راجیش ـــــ مجھے تو اس نمک حرام پر غصّہ آرہا ہے شادی کرنی تھی تو اطلاع تو کر دیتا۔

راج ـــــ شادی اُس کی نہیں ہوئی۔

راجیش ـــــ ہیں!!! تب تو دال میں ضرور کالا ہے ـــ لیکن اس کو یہ کیسے معلوم ہوا یہ کمرہ ہرلش کا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ اور میں چلّایا کرتا ہوں۔

راج ـــــ کہانا، جادو ٹونے والی ہے ـــ دیکھنے میں سندر، کام میں چھو منتر۔

راجیش ـــــ ارے میں دیکھتا ہوں ـــ اے لڑکی' کیا نام ہے تیرا۔

[نیتا داخل ہوتی ہے۔ سفید ساڑی میں ہے۔ دلہن کی طرح آنکھیں جھکائے کھڑی ہوتی ہے۔ ساڑی کا پلو سر پہ ہے]

نیتا ـــــ کہئے۔

[راجیش پھر بوکھلا جاتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور انداز دیکھ کر بے حد متاثر ہوتا ہے راجکماری اُسے گھورتی ہے]

راجیش ـــــ میں کہہ رہا تھا۔ ۔ ۔ کہ اُس نے شادی کی چرچا بھی نہیں کی۔

نیتا ـــــ وہ آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں ـــ شادی کا ذکر کرتے شرماتے تھے۔

راجیش ـــــ وہ تو ٹھیک ہے۔

نیتا ـــــ میرا سر درد کر رہا ہے ـــ سفر سے آئی ہوں۔

راجیش ـــــ ارے تم منہ کیا دیکھ رہی ہو ـــ بہو گھر میں پہلی بار آئی ہے۔ چائے تو بنا لاؤ جلدی۔ اور دیکھو ـــ وہاں اناسین کا پیکٹ بھی پڑا ہوگا۔ ۔ ۔

[راجکماری بوکھلائی ہوئی رسوئی کی طرف جاتی ہے]

راجیش ـــــ لیکن تمہارے آنے کی اطلاع تو دینی چاہئے تھی۔

نیتا ـــــ وہ آپ کو تار دینے والے تھے ـ میں نے خود

نہ کیا تھا۔

راجیش ـــ کیوں؟!؟

نیتا ـــ (ہنستی ہے) میں نے سوچا آپ مجھے دیکھ کر حیران ہوں گے۔

راجیش ـــ تمہیں جھجک نہیں ہوئی ـــ ڈر بھی نہ لگا۔

نیتا ـــ وہ آپ کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ آپ بہت اچھے ہیں۔

راجیش ـــ (خوش ہوکر) ہی۔۔۔ ہی۔۔ ہی۔ (ہنستا ہے)

نیتا ـــ وہ ہمیشہ آپ کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ مجھے دیکھ کر خوش ہوں گے۔

اجیش ـــ ہاں ـــ ہاں۔۔۔ میں اتنا خوش ہوں۔۔ میں ا خوش ہوں۔۔۔۔

یتا ـــ آپ کی قمیص کے بٹن نہیں ہیں۔

جیش ـــ ٹوٹ گئے ہیں۔

تا ـــ لائیے، میں لگا دیتی ہوں۔

جیش ـــ تم ـــ!

تا ـــ لائیے نا۔

[راجیش قمیص اُتارتا ہے]

ا ـــ سوئی ـــ؟

اجیش خود لپکتا ہوا۔ سوئی دھاگا اور بٹن لاتا ہے۔ نیتا ے انہماک سے بٹن لگاتی ہے۔ راجیش بڑا مسرور ہے]

یش ـــ تمہاری جیٹھانی تو میرا کوئی کام نہیں کرتی۔

ا ـــ اچھا!

یش ـــ دماغ چاٹتی رہتی ہے۔

ـــ آپ بھی تو بہت چلّایا کرتے ہیں۔

راجیش ـــ ہاں ـــ وہ۔۔۔۔

نیتا ـــ کیوں چلّاتے ہیں؟

راجیش ـــ ارے وہ پھوہڑ ہے ـــ بے وقوف ہے۔

نیتا ـــ ہریش جی مجھے بھی کہتے ہیں۔

راجیش ـــ کیا تمہیں!

نیتا ـــ ہاں ہاں۔۔۔

راجیش ـــ اس کی یہ مجال نہیں تمہیں ـــ

نیتا ـــ لیکن میں برا تھوڑا مانتی ہوں۔ ہر پتی اپنی پتنی کو پھوہڑ کہتا ہے۔

راجیش ـــ لیکن اسے تمہیں نہیں کہنا چاہیئے۔

نیتا ـــ کیوں، مجھے کیوں نہیں کہنا چاہیئے۔

راجیش ـــ تم اتنی اچھی ہو ـــ

[نیتا ہنستی ہے۔ اسے قمیص دیتی ہے۔ راجکماری چائے لاتی ہے۔ راجیش اپنی قمیص لے کر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نیتا اناسین کھاتی ہے ـــ چائے کا گھونٹ لیتی ہے]

نیتا ـــ آپ تو بڑی اچھی چائے بناتی ہیں۔

راج ـــ پسند آئی؟

نیتا ـــ واقعی بڑی اچھی ـــ

راج ـــ یہ تو کبھی تعریف نہیں کرتے۔

نیتا ـــ اچھا ـــ

راج ـــ ہاں۔ روز کبھی کہیں گے شکر نہیں ہے۔ کبھی پتّی کم ہے۔

نیتا ـــ آپ آلو کا بھرتہ بھی اچھا بناتی ہیں نا!

راج ـــ تمہے کس نے کہا ـــ

نیتا ـــ ہریش روز آپ کا گن گان کرتے ہیں۔

راج ـــ اچھا۔

نیتا ــــ ہاں روز کہتے ہیں میری بھابی بڑی اچھی ہے۔ میرا بڑا خیال رکھتی ہے۔ آپ آلو کا بھرتہ کھلا دینا مجھے۔

راج ــــ ہاں ... ہاں۔ میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے لئے بناؤں گی۔

نیتا ــــ میں آپ کے لئے ساڑی لائی ہوں۔

راج ــــ میرے لئے ــــ!

نیتا ــــ ہاں۔ اگر آپ کو پسند آئے تو۔ میں ابھی لاتی ہوں۔

[نیتا جاکر ساڑی لاتی ہے۔ ساڑی بڑی قیمتی ہے۔ راجکماری بہت خوش ہے]

راج ــــ ارے کتنی سندر کتنی خوبصورت ــ

نیتا ــــ پسند ہے نا آپ کو ــ

راج ــــ ارے اتنی اچھی ہے ــ میرے دل کا رنگ ہے۔

نیتا ــــ آپ پہنیں گی تو یہ اور اچھی لگے گی۔

[راجکماری ہنستی ہے]

راج ــــ تم تو دل موہ لیتی ہو ــ بھی تو ہریش ریجھ گیا نا۔

نیتا ــــ اجی وہ تو بچھے ہیں۔

راج ــــ کیوں؟

نیتا ــــ آج کل زمانہ بدل گیا ہے۔

راج ــــ کیسے؟

نیتا ــــ پہلے لڑکے لڑکیوں کا پیچھا کرتے تھے۔ آج کل لڑکیاں لڑکوں کا پیچھا کرتی ہیں۔

راج ــــ اچھا!

نیتا ــــ ہاں ــ میں روز ملنے جاتی تھی ــ صاحب منہ پھلائے کھڑے رہتے تھے۔ فلم کی دعوت دیتی تھی کام کا بہانہ کرتے تھے ــ ایک دن کیا ہوا ...

راج ــــ کیا ہوا؟

نیتا ــــ میں انھیں اوکھلا لے گئی۔ شاید یہ منظر کا اثر تھا۔

راج ــــ کیسا منظر؟

نیتا ــــ شام تھی، ہوا تھی۔ اوکھلے کا پانی گیت گا رہا تھا۔

راج ــــ پھر؟

نیتا ــــ اچانک بول اٹھے ــ مجھ سے شادی کرو گی ــ

راج ــــ آگیا نا قابو!

نیتا ــــ مجھے وہ اس وقت بڑے سندر لگے ــ لال لال ہو رہے تھے ــ کچھ بے وقوف سے لگ رہے تھے ــ

راج ــــ اور اس دن طے ہوگیا ــ

نیتا ــــ ہاں، میں نے فوراً کہا ــ دونوں میں بندوبست کرلیا ــ وہ کہتے رہے آپ کو بلا لیں۔ بھائی صاحب کو بھی لیکن میں کوئی خطرہ نہ لینا چاہتی تھی۔ میں انھیں اتنا پسند کرتی ہوں کہ میں نے جلدی سے شادی رچالی۔

راج ــــ تمہارے ماتا پتا ــ

نیتا ــــ ان کو تو ابھی تک معلوم نہیں۔

راج ــــ کیا ــــ چھپے چوری شادی کی۔

نیتا ــــ ہاں، کورٹ میں۔

راج ــــ اگر انھیں پتہ چل گیا تو ــ

نیتا ــــ تو ... تو تالی بجائیں گے ــ معلوم ہے میرے پتا جی ایک مل کے مالک ہیں۔

راج ــــ ہیں!!!

نیتا ــــ ہماری پانچ گاڑیاں ہیں۔

راج ــــ ارے باپ رے۔

نیتا ــــ انھیں پتہ چل جاتا تو انرتھ ہو جاتا ــــ اس لئے میں نے جلدی کی۔

راج ــــ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ!

[دونوں ہنستی ہیں۔ راجیش آتا ہے]

راجیش ــــ خوب ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔

دونوں ــــ ہیں . . .

[دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور سنجیدہ ہو جاتے ہیں]

نیتا ــــ میں آپ کا کمرہ دیکھوں؟

راجیش ــــ ضرور ــــ ضرور ــــ تمہارا ہی تو گھر ہے۔

[نیتا راجیش کے کمرے میں جاتی ہے]

راج ــــ دیکھو بہو رانی میرے لئے ساڑی لائی ہے۔

راجیش ــــ تبھی تو ہنسی کے فوارے نکل رہے تھے۔

راج ــــ تمہیں کیوں برا لگتا ہے۔

راجیش ــــ ساڑی دے کر ایسے پھسلائے گی کہ ہار نمائب ہو گا۔

[نیتا دروازے پر]

نیتا ــــ کمرے کو سجایا نہیں آپ نے؟

راجیش ــــ ارے یہ کیا سجائے گی۔

نیتا ــــ میں گلدان آپ کے کمرے میں لے جاؤں؟

راجیش ــــ ہاں ہاں . . .

[وہ گلدان لے کر جاتی ہے]

نیتا ــــ سنئے۔

راجیش ــــ ہاں۔

نیتا ــــ آپ کے کمرے میں دو پلنگ کیوں رکھے ہیں؟

راجیش ــــ ہیں ــــ وہ . . . ویسے ہی

[دونوں بوکھلا رہے ہیں]

نیتا ــــ کمرہ چھوٹا ہے ــ ایک ہی پلنگ کافی ہے۔

[وہ راجیش کے کمرے میں چلی جاتی ہے]

راجیش ــــ کیوں جی، ایک ہی پلنگ کافی ہے۔

راج ــــ ہٹو، مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔

راجیش ــــ کیا بہو آئی ہے ــ گھر کی حالت ہی بدل رہی ہے۔

راج ــــ کچھ دیر میں گھر ہی بدل جائے گا۔

راجیش ــــ کیسے؟

راج ــــ ایک کام کیوں نہیں کرتے۔

راجیش ــــ کیا؟

راج ــــ کم از کم پولس کو اطلاع تو دے دو۔

راجیش ــــ کیسی اطلاع!

راج ــــ کہ ایک لڑکی آئی ہے اور ہمیں اس پر شک ہے۔

راجیش ــــ شک ہے تو نکال باہر کریں۔

راج ــــ باہر کیسے نکال دیں اسے ــ مجھے تو جادوگرنی لگتی ہے ــ تمہارے سامنے جب آتی ہے تم ہنسنے لگتے ہو۔

راجیش ــــ اور تم اپنا منہ نہیں کھول دیتیں۔

راج ــــ میں کیا کروں۔

راجیش ــــ میں بھی کیا کروں۔

راج ــــ انرتھ ہو گا۔

راجیش ــــ بڑا انرتھ ہو گا ــــ ہریش کو کیسے جانتی ہے؟

راج ــــ ارے لڑکیوں کا کیا ٹھکانہ ــــ مسکرا کر دیکھا راز پوچھ لیا۔

راجیش ـــــ تم میں تو ایسا کوئی گُن نہیں۔

راج ـــــ ارے یہ گُن نہیں ـ دُکھ ہے دُکھ۔

راجیش ـــــ اب کیا کریں۔

راج ـــــ بیٹھے بھجن کرو ـ مجھے ڈر ہے کہ کچھ ہو کر رہیگا۔

راجیش ـــــ اُس اُلّو کے پٹھے نے خوب تماشہ کیا ہے ہمارے سامنے۔

راج ـــــ اپنے باپ کو کیوں گالی دیتے ہو۔

راجیش ـــــ اپنے باپ کو دیتا ہو تو تمہارا کیا۔

راج ـــــ مجھے کیا ـ ایک اور دو۔

راجیش ـــــ نہیں دیتا۔

راج ـــــ نہ دو۔

راجیش ـــــ غصہ دلاؤ گی۔

راج ـــــ مجھے چکر آتے ہیں۔

راجیش ـــــ پھر دورہ شروع ہو گیا۔

راج ـــــ اسے دورہ کہتے ہو ـ کتنے کٹھور ہو ـــــ سارا جیون یہاں بتایا ـ جلایا۔ ذرا ہمدردی بھی نہیں۔

راجیش ـــــ موٹی تازی تو ہو۔

راج ـــــ اوپر سے لگتی ہوں نا ـ بیچ میں بالکل کھوکھلی ہوں۔

راجیش ـــــ کھوکھلی تو ہو ہی۔

راج ـــــ چار چپاتیاں زیادہ ہوتی ہیں ـــ

راجیش ـــــ اور آدھا سیر چاول بھی ہوتے ہیں۔

راج ـــــ ہائے ہائے نوالے گنتے رہتے ہو ـــ

راجیش ـــــ دیکھو تم کتنی مورکھ ہو ـــ گھر میں چور گھس آیا ہے اور تم اپنا جھگڑا لئے بیٹھی ہو۔

راج ـــــ دیکھو تو کیا کر رہی ہے۔

[دونوں جھانکتے ہیں]

راجیش ـــــ ارے وہ دراز ٹٹول رہی ہے۔

راج ـــــ ارے اس میں میرے دو ہزار روپے ہیں۔

راجیش ـــــ دو ہزار۔

راج ـــــ ہاں ہاں۔

راجیش ـــــ ویسے تو کبھی نہیں بتایا۔

راج ـــــ میں نے ... میں نے چھپا کر رکھے تھے۔

راجیش ـــــ شرم نہیں آتی ـ مجھ سے میرے روپے چھپا کر رکھتی ہو۔

راج ـــــ گھر تھوڑے لے جاتی ہوں۔

راجیش ـــــ کیا معلوم ـــ تمہارے وہ چار گدھے بھائی

راج ـــــ دیکھو میں رو دوں گی۔

راجیش ـــــ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔

راج ـــــ لیکن اب تو وہ لے جائے گی۔

[نیتا داخل ہوتی ہے]

نیتا ـــــ آپ نے دراز میں روپے رکھے ہیں۔

راج ـــــ ہاں . . . . وہ . . .

نیتا ـــــ دراز میں پیسے نہیں رکھنے چاہئیں۔ الماری میں رکھنے چاہئیں ـ لیجئے۔

راجیش ـــــ (روپے لے کر) ہاں ہاں... الماری میں رکھنے چاہئیں۔

[نیتا پھر اندر جاتی ہے]

راجیش ـــــ دیوی آئی ہے گھر میں ـــ پہلے ہی دو ہزار روپے کا فائدہ۔

راج ـــ ہائے میرے دو ہزار روپے!

راجیش ـــ نیت خراب ہوگی تو بھگوان ایسا ہی کریں گے۔

[دروازے پر آواز آتی ہے۔ "ٹیلی گرام"]

راجیش ـــ ٹیلی گرام!

[دروازے پر جاکر دستخط کر کے ٹیلی گرام لیتا ہے]

راجیش ـــ میرے تو ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

اج ـــ پڑھو تو۔

اجیش ـــ بھگوان کرے تمہارے گھر والوں کی طرف سے ہو۔

اج ـــ (روتے ہوئے) ہیں... ہیں... میرے گھر
الے فالتو ہیں کیا۔

جیش ـــ پھر کس کو ماروں

ج ـــ دشمنوں کا سوچو۔

جیش ـــ دشمن مریں گے تو تار یہاں کیوں آئے گی۔

ج ـــ اب کیا کریں۔

یش ـــ نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا۔

ج ـــ گھر میں تو یہی جادوگرنی آئی ہے۔ میں کہتی ہوں نکال
رد ـ نہیں تو کوئی اور آفت آئے گی۔

یش ـــ پہلے اسے باہر کروں کہ پہلے تار کھولوں۔

ـــ پہلے اسے باہر کرو۔

یش ـــ ایسا ہی کرتا ہوں۔

[نیتا باہر آتی ہے]

ـــ اوہ، کتنی مٹی ہے! ـ ارے کیا ہوا، کیا ہے آپ
تھ میں؟

یش ـــ (بوکھلا کر) کچھ نہیں! کچھ نہیں ـــ

ـــ کہاں ہے! آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔

[وہ بڑھ کر تار لیتی ہے]

راجیش ـــ ہاتھ نہ لگانا۔

نیتا ـــ (تار لے کر) آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے بچھو
یا سانپ ہو۔

[وہ تار کھولتی ہے۔ پڑھ کر نہایت سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ دونوں
اس کو سنجیدہ دیکھ کر رونے لگتے ہیں]

نیتا ـــ (سنبھل کر) کیا ہوا آپ کو؟

راجیش ـــ شبھ تو ہے نا؟

نیتا ـــ اُف او ـ میں کہتی ہوں، حد ہے ـــ وہ آ رہے ہیں۔

راج ـــ یعنی ـ؟

نیتا ـــ ہرش جی۔

راجیش ـــ کب؟

نیتا ـــ (گھڑی دیکھ کر) بس پہنچ گئے۔

راجیش ـــ میں نے کہا تھا نا۔ وقت بے وقت یہ رونے لگتی
ہے۔ جاہل کہیں کی ـ میرا بھائی آنے والا ہے۔ دو سال کے بعد
کتنا شبھ سماچار ہے۔

[نیتا اب بھی خاموش ہے]

راجیش ـــ لیکن تم کیوں ناراض ہو۔

نیتا ـــ کون میں ـ نہیں تو۔

راجیش ـــ تمہیں اس کے آنے کی خبر نہ تھی؟

نیتا ـــ یہ بات انھوں نے مجھے نہیں بتائی تھی۔

راجیش ـــ اب مزا آئے گا۔

نیتا ـــ ہاں بڑا لطف رہے گا۔

راجیش ـــ تم گھڑی گھڑی کیا کر رہی ہو؟

راج ـــ کیا کروں میں۔

راجیش ــــ ارے دعوت کا بندوبست کرو۔ اس کے دوستوں کو خبر کرو۔

راج ــــ پکاؤں کیا؟

راجیش ــــ سب کچھ پکاؤ ــ شاندار دعوت کرو۔ بینگن کا بھرتہ۔ دہی کا رائتہ۔ کابلی چنے۔

[وہ دونوں اندر جاتے ہیں۔ نیتا اپنا اٹیچی لیتی ہے۔ جو جوڑا پہن کر آئی تھی اسے جلدی سے اٹیچی میں ڈال کر نکل جاتی ہے۔ وہ دونوں اسی طرح بحث میں مشغول باہر آتے ہیں]۔

راج ــــ کھانے پر کس کس کو بلاؤں؟

راجیش ــــ سب کو بلاؤ ــــ وہ گوردھن داس ــ اور وہ لڑکی کیا کرتی ہے آج کل؟

راج ــــ کونسی؟

راجیش ــــ وہ جو ہریش کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

راج ــــ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

راجیش ــــ کیا بکتی ہو!

راج ــــ ارے تم اس دنیا میں تھوڑے رہتے ہو ــــ دنیا ترقی کر رہی ہے۔

راجیش ــــ تین سال میں تین بچے ــــ خوب ترقی ہے۔

[ہریش داخل ہوتا ہے]

راجیش ــــ او ہریش۔

[ہریش دونوں کے پاؤں چھوتا ہے۔ راجیش اُسے گلے لگاتا ہے]۔

راجیش ــــ ٹھیک تو ہو نا۔

ہریش ــــ جی ــــ بھابی میں آپ کے لئے ساڑی لایا ہوں۔

راجیش ــــ میاں بیوی دونوں کتنا خیال رکھتے ہیں۔

ہریش ــــ اور بھائی صاحب، آپ کے لئے گرم کوٹ کا کپڑا۔

راجیش ــــ ہی... ہی... بہت پیسے خرچ کرتے ہو اس کی کیا ضرورت تھی ــــ کیوں... جی... ہریش تم نے ہمیں بتا دیا ہوتا۔

ہریش ــــ کیا بھائی صاحب۔

راجیش ــــ ہم اتنے بڑے نہیں ہیں۔

ہریش ــــ کون کہتا ہے۔ مجھے جتنا پیار آپ سے ملا ہے کسی بھائی کو نہیں ملتا۔

راجیش ــــ پھر تم نے ہم پہ بھروسہ کیوں نہیں کیا!

ہریش ــــ کس بات کا بھروسہ؟

راجیش ــــ دیکھا اب بھی چھپا رہا ہے۔

راج ــــ شرما رہا ہے۔

راجیش ــــ اس بات میں شرم کیسی۔ دنیا کرتی ہے اور اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔

ہریش ــــ بھائی صاحب، آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے کچھ خبر نہیں۔

راج ــــ ہیں!!!

راجیش ــــ حد ہوگئی۔

ہریش ــــ بات کیا ہے؟

راجیش ــــ تم نے شادی نہیں کی؟

ہریش ــــ کیسی شادی؟

راجیش ــــ ارے بھائی شادی شادی ہوتی ہے ــــ کیسی شادی کا مطلب۔

ہریش ــــ کمال کرتے ہیں ــ میں آپ کی اجازت کے بغیر شادی کر سکتا ہوں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔

راجیش ــــ ہائے لُٹ گئے۔

راج ــــ ہائے برباد ہوگئے۔

راجیش ــــ میرے روپے۔

راج ــــ میرے گہنے۔

(دونوں الگ الگ کمروں میں بھاگتے ہیں۔ پھر مخالف کمروں میں جاتے ہوئے ٹکرا جاتے ہیں۔ ہرش بوکھلایا ہوا ہے)

راجیش ــــ وہ غائب!

راج ــــ غائب!!

راجیش ــــ میں نے کہا تھا نا کہ چور ہے۔

راج ــــ میں نے کہا تھا نا کہ جادوگرنی ہے۔

راجیش ــــ ہائے مارے گئے۔

راج ــــ اب کیا کریں۔

(دونوں پھر بھاگتے ہیں ــ راجیش دو ہزار کے نوٹ لاتا ہے۔ راجکماری گہنوں کا ڈبہ)

راجیش ــــ یہ بھی معلوم نہیں کیا گم ہوا ہے۔

راج ــــ پولیس کو خبر تو دے دو۔

راجیش ــــ وہ گئی کیسے!

راج ــــ بس ہوا ہوگئی!!

راجیش ــــ ایک لڑکی آئی تھی ــ اس نے کہا تھا کہ اُس نے تم سے شادی کی ہے۔

ہرش ــــ کیا نام تھا اُس کا؟

راجیش ــــ ارے نام ــ نام بھی تو نہیں پوچھا۔

ہرش ــــ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔

راجیش ــــ (راجکماری سے) تم نے پوچھا تھا؟

راج ــــ نہیں تو ــ ایسی چکنی چپڑی باتیں کرتی تھی کہ ہم دونوں بے وقوف بن گئے۔

ہرش ــــ کیسی تھی وہ؟

راج ــــ تھی تو سُندر۔

راجیش ــــ ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھی ــ اچھا قد تھا

ہرش ــــ بولنے میں ــ میرا مطلب ہے ــ مزاج میں۔

راجیش ــــ مزاج میں تو بڑی اچھی تھی ــ سچ مانو ہرش، من ہی من میں میں بہت خوش تھا۔ ایسی بہو گھر میں آئے تو گھر سورگ بن جائے۔

راج ــــ میرے لئے اتنی سندر ساڑی لائی ہے دیکھوں تو ہے یا لے گئی۔

(ہرش ساڑی لیتا ہے۔ گمبھیر ہو جاتا ہے)

ہرش ــــ اور کچھ کہتی تھی۔

راج ــــ وہ ادکھلا کا ذکر کرتی تھی ــ بڑی سندر باتیں کرتی تھی ــ ہم دونوں کا من موہ لیا تھا۔

ہرش ــــ ہاں وہ بالکل جادوگرنی ہے ــ من موہ لیتی ہے۔ اسی لئے ہر بازی مار لیتی ہے۔

راجیش ــــ تم جانتے ہو اسے!

ہرش ــــ ہاں ــ وہ نیتا تھی ــ وہ بہت بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں ــ مجھ سے شادی کا کہنے لگی تو میں نے کہا ہم لوگ امیر نہیں ہیں معمولی سا گھر ہے۔ سادھارن آدمی ہیں۔ ہمارے گھر میں تم نہ پاؤگی۔ جلد بھاگ جاؤگی۔

راجیش ــــ تو؟

ہرش ــــ تو اس نے کہا تھا کہ میں تمہارے گھر میں رہوں گی۔ میں تمہارے بھائی، تمہاری بھابی کا من جیت لوں گی۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا ....

راجیش ــــ کیا؟

ہرش ــــ کہ پریم میں بڑی شکتی ہے۔ پریم سب کچھ کر سکتا ہے۔

راجیش ــــ تم گدھے ہو!

راج ــــ بالکل بدھو ہو!!

ہرش ــــ میں نے اس سے کہا کہ میں بھائی صاحب اور بھابی کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں میرے لئے ماں باپ کے برابر ہیں۔

راجیش ــــ وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اتنی اچھی لڑکی ــــ گھر کو سورگ بنا رہی تھی۔

راج ــــ آتے ہی کام میں جٹ گئی تھی۔

[تینوں ایک منٹ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ نیتا دروازے پر آکھڑی ہوتی ہے]

ہرش ــــ نیتا

راجیش ــــ بہو!

نیتا ــــ (سنجیدگی سے) میں نے سوچا کہ قسمت کا فیصلہ سنتی جاؤں۔

ہرش ــــ شرمندہ نہ کرو نیتا۔

راجیش ــــ تم جیسی لڑکیاں ہندوستان میں ہوں تو کنوارے یوں مارے مارے نہ پھریں۔

راج ــــ تم اس گھر میں بھاگیہ بن کر آؤ گی۔

راجیش ــــ تم لوگوں کی شادی میں ایسی دھوم دھام سے کروں گا کہ دنیا یاد کرے گی۔ اور آج بھی ــ تم یہاں کیا کر رہی ہو جی ــ دعوت کا بندوبست نہیں کرنا کیا۔ چلو۔ چلو۔

[وہ دونوں رسوئی میں جاتے ہیں]

ہرش ــــ تمہاری عزت کرنی چاہئے نیتا۔

نیتا ــــ بس یہی کہنا ہے؟

ہرش ــــ آتے ہی سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ چمتکار کرتی ہو تم

نیتا ــــ میں تم سے اس وقت کچھ اور باتیں سننا چاہتی ہوں۔ رات کی طرح ملائم، دن کی طرح گرم۔

ہرش ــــ یہ موقعہ میں ہاتھ سے جانے نہ دوں گا۔

[ہرش نیتا کی طرف بڑھتا ہے۔ راجیش کی آواز آتی ہے۔ ہرش رک جاتا ہے]

راجیش ــــ (اندر آتے ہوئے) ارے ابھی لے آتا ہوں بھئی ــ سب کچھ لے آتا ہوں ــ ہاں نیوتا بھی دیتا آؤں گا۔

راج ــــ (اندر سے) ارے ہونے والے منے کے پاپو۔

راجیش ــــ ہاں ہونے والے منے کی ماتا جی۔

راج ــــ (اندر سے) تھوڑی املی بھی لیتے آنا۔

راجیش ــــ تھوڑی کیوں۔ ڈھیر ساری لیتا آؤں گا ــــ ایک بوری بھر تو کھا گئی ہو ــ چل بھئی، ہونے والے منے کے پاپو ــــ

[ہرش اور نیتا ایک دوسرے کی طرف پیاس بھری نظروں سے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ راجیش باہر جاتا ہے]

پردہ ــــ

خط و کتابت میں سہولت کے لئے قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

(ادارہ)

عابد معز

حیدرآباد کی سڑکیں

ہمارے مضمون کا عنوان "حیدرآباد کی سڑکیں" ہے جو غلط ہے۔ جناب والا ہمارے اور قلی قطب شاہ کے شہر میں سڑکیں ہیں کہاں؟ اس شہر میں صرف اور صرف راستے ہیں۔ اور ہر راستہ کسی چھوٹے یا بڑے حادثہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لئے جب کوئی اجنبی کسی حیدرآبادی سے دریافت کرتا ہے "یہ سڑک کہاں جاتی ہے"؟ اسے جواب ملتا ہے "یہ سڑک کہیں نہیں جاتی، یہیں پڑی رہتی ہے لیکن اس پر سفر کرنے والے عالم بالا کو پہنچائے جاتے ہیں"۔ اس لحاظ سے ہمارے مضمون کا عنوان "حیدرآباد کے (خطرناک) راستے" ہونا چاہیئے تھا۔ ہماری سادگی کا اندازہ لگائیے کہ ہم ان خطرناک راستوں کو سڑکیں کہتے ہوئے کئی برسوں سے دھوکہ کھاتے چلے آرہے ہیں۔

راستوں پر مسافرین کی سہولت کے لئے سڑکیں بنوائیں جاتی ہیں۔ سڑکیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ مٹی کی سڑک، سنگ سیلو کی سڑک، ڈانبر کی سڑک، سمنٹ کی سڑک وغیرہ۔ ہمارے شہر میں بھی مختلف راستوں پر مختلف قسم کی سڑکیں بنوائی گئی ہیں۔ ہماری سڑکوں کی انفرادیت رہی ہے کہ ان سے راہ گیروں سے زائد سڑکیں بنوانے اور مرمت کرنے والوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ سنگ سیلو کی سڑکیں آس پاس کے گھروں میں فرش کا مسئلہ بھی حل کرتی ہیں۔ راہ گیروں کو سڑکیں استعمال کرنے کی پاداش میں نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سنگ سیلو کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھائے بغیر چل نہیں سکتے سڑکوں پر پیدل چلنا ایک آرٹ ہوتا ہے۔ کبھی ٹھوکر کھا کر سنبھلنا پڑتا ہے تو کبھی گر کر اٹھنا پڑتا ہے۔ کبھی چھلانگ لگانا پڑتا ہے تو کبھی اچھلنا اور کودنا پڑتا ہے۔ کبھی ایک ٹانگ سے لنگڑانا پڑتا ہے تو کبھی پیروں اور ہاتھوں سے جانوروں کی طرح بدکنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں پیدل چلنے سے بہترین کوئی ورزش نہیں ہے۔ اگر آپ اس مقولہ کی حقیقت جانچنا چاہتے ہیں تو ضرور بہ ضرور حیدرآباد کی سڑکوں پر پیدل چلا کیجئے۔ ورزش کے علاوہ بعض اوقات آپ کی مرمت بھی ہو جائے گی۔ گھٹنے اور کہنیاں چھل جاتی ہیں۔ پنڈلیوں پر ورم آجاتا ہے۔ اعضاء شکنی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اسکوٹر استعمال کرنے والوں کے لئے ٹائر اور ٹیوب سب سے بڑا مسئلہ بنتے ہیں۔ مضبوط سے مضبوط ٹائر اور ٹیوب بار بار پنکچر ہو کر بہت جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ اکثر اسکوٹر پنکچر ہو کر گاڑی، سوار پر سواری کرنے لگتی ہے۔ ہم بطور حفظ ما تقدم ہمیشہ چار ٹائر اور ٹیوب ساتھ رکھتے ہیں۔ پتہ نہیں کب اور کہاں گاڑی پنکچر ہو جائے۔ ٹائر اور ٹیوب ساتھ رکھنے پر ہمارے پڑوسیوں کو ہم پر ادیب کے بجائے

پرانے ٹائر اور ٹیوب کے بیوپاری کا گمان ہونے لگا ہے، ٹائر اور ٹیوب کے بعد فارک، شاک آبزاربر اور سسپن سر وغیرہ خراب ہوتے جاتے ہیں میکانک حضرات گاڑیوں میں اور بھی کئی خرابیوں کے لئے ہمارے شہر کی سڑکوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہم وکالت کرتے ہیں کہ اسکوٹروں کے فاضل پُرزے بنانے والی کمپنیاں ہماری سڑکوں کی نگہداشت کرنے والوں کو کمیشن دیں۔

ہمارے شہر کی سڑکیں بہت حساس اور نازک طبیعت کی مالک ہیں۔ گرمی ان سے برداشت ہو نہیں پاتی۔ انھیں پسینہ آتا ہے گرمی سے پھیل جاتی ہیں اور حتی الامکان سواری سے چمٹ جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بارش کا موسم سڑکوں کے لئے کافی خطرناک ہوتا ہے۔ تھوڑی سی بارش بھی سڑکوں کو بہالے جاتی ہے۔ بعض سڑکیں بارش کے موسم میں سڑکیں نہیں رہتیں، اپنا وجود گنوا کر تالاب بلکہ ندیاں بن جاتی ہیں۔ سرما کے موسم میں سڑکیں سردی میں بڑی بڑی ٹھٹھر جاتی ہیں۔ سڑکیں حساس ہونے کے علاوہ نحیف، کمزور اور ناتواں بھی ہیں۔ آخر بیچاری سڑکیں کہاں تک اپنے سینہ پر بوجھ برداشت کریں گی۔ زائد بوجھ سے سڑکیں جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہر روز سڑکوں کے دامن میں کئی گڑھے تولد ہوتے ہیں جن کا دردِ زہ مسافرین کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہماری بات کا یقین نہ آئے تو آپ آٹو رکشہ میں صرف چند فرلانگ کا سفر کیجئے گا!

ہماری سڑکیں عجیب وغریب اور بے ہنگم ہوتی ہیں۔ اکثر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک کشادہ سڑک چلتے چلتے پتلی گلی بن جاتی ہے اور کبھی تنگ اور تاریک گلی میں سے ایک میدان نکل آتا ہے۔ پرانے شہر کی گلیاں تو وبال جان ہوتی ہیں۔ نیا اور پرانا آدمی ان گلیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ تبھی تو صبح کا بھولا بھٹکا شام کو گھر آئے تو اسے حیدرآباد کے راستے کہتے ہیں۔ بعض راستے پُر اسرار طریقے سے ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی راستے کا اختتام کسی گھر کے صحن میں ہوتا ہے تو کوئی راستہ کسی کے بیت الخلاء تک لے جاتا ہے ان راستوں سے اجنبی تو کیا خود ہم بھی بڑے پریشان رہتے ہیں۔ حالانکہ ہم یہیں پیدا اور بڑے ہوئے ہیں۔ شاید اسی لئے غیروں میں حیدرآباد کی بریانی، شیروانی اور (راستوں کی) پریشانی کافی مشہور ہے۔

سڑکیں اپنے شکم میں بہت ساری فاضل اور فضول اشیاء لئے ہوتی ہیں۔ کرنٹ اور ٹیلیفون کے تار، نل کے پائپ اور ڈرینج کا ناقص نظام سڑک کے نیچے موجود رہتے ہیں۔ ان تمام محکمہ جات میں ہم آہنگی نہیں رہتی۔ وقت بے وقت اور ضرورت بلاضرورت سڑک کے شکم کو بے دردی سے چیر پھاڑ کر کرنٹ، ٹیلیفون، نل اور ڈرینج کے نظام کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ چیر پھاڑ سے جو زخم بنتے ہیں وہ کبھی مندمل نہیں ہوتے بلکہ ناسور بن جاتے ہیں۔ اکثر رستے رہتے ہیں۔ پانی اور غلاظت جوالا مکھی بن کر ابل پڑتے ہیں۔ سڑک ڈوب جاتی ہے۔ گندگی کا راج ہوتا ہے چو طرف بدبو پھیل جاتی ہے۔ ایسے وقت ہمیں ان ممالک کی شدت سے یاد آتی ہے جہاں کی سڑکوں پر عطر چھڑکا جاتا ہے۔

بارش کے دوران ہماری سڑکوں کا حال قابل دید ہوتا ہے۔ بارش کے پانی کی نکاسی کے لئے کوئی صورت نہیں ہوتی ہے بوندا باندی سے ہی سڑک پانی میں ڈوب جاتی ہے گھٹنوں بلکہ بعض جگہ کمر تک پانی جمع ہو جاتا ہے۔ پیدل راہ گیروں کو نیم برہنہ ہو کر چلنا اور تیرنا پڑتا ہے۔ گاڑیوں میں پانی گھس جانے کی وجہ سے وہ معطل ہو جاتی ہیں۔ سڑکیں ندیاں بن جاتی ہیں۔ پانی آس پاس کے

مکانات اور دوکانات میں گھس پڑتا ہے۔ ہر قسم کا سفر رک جاتا ہے صرف پانی کا سفر جاری رہتا ہے۔ بس رلیے اور چوراہے نما کے سنگم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ انھیں مشکلات کے پیش نظر ہمارے ایک دوست بارش میں بڑبڑاتے ہیں یا میرے مولا! شہر میں بارش کی ضرورت ہے اور نہ ہی کا قدر ہوتی ہے۔ تو اپنی اس رحمت کو یوں شہر میں برسا کر ضائع نہ کر۔ بارش کی ضرورت کھیتو اور باؤلیوں میں ہوتی ہے۔ تو بارش کو وہیں لے جا! میرے خدا تو پانی کے عذاب سے شہر کو محفوظ رکھ!

کہتے ہیں پیدل راہ گیروں کے لئے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے شہر میں فٹ پاتھ کہیں بھی نظر نہیں آتے کہیں کسی سڑک پر فٹ پاتھ کے دھندلے نشان ضرور نظر آتے ہیں۔ فٹ پاتھ کے بجائے سڑک کے کنارے ہر قسم کی فرشی دکان، کھیل، تماشہ، ٹھیلے اور بازار لگے ہوتے ہیں۔ چند ایک خاندان بھی فٹ پاتھ پر بسیرا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیکل، رکشہ، آٹو رکشہ، موٹر، لاری وغیرہ بھی سڑک کے کنارے ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ہونا تو یوں چاہیئے کہ ضرورت کے لحاظ سے سڑکوں کی چوڑائی میں اضافہ ہو، لیکن آبادی اور ٹریفک میں اضافہ کی ستم ظریفی سے سڑکیں سکڑتی جاتی ہیں۔ دو رخی سڑکیں سکڑ کر یک رخی بن جاتی ہیں تو یک رخی سڑکیں مزید سکڑ کر ممنوعہ بن جاتی ہیں۔

سڑک پر سواریوں کی رفتار کو قابو میں رکھنے کے لئے دانستہ طور پر اسپیڈ بریکر بنائے جاتے ہیں۔ ہماری نظر میں اسپیڈ بریکر بنانا غیر دانشمندانہ قدم ہے اس لئے سڑکوں پر نادانستہ طور پر کئی اسپیڈ بریکر بلکہ سواری بریکر بنتے رہتے ہیں۔ دانستہ طور پر بنے ہوئے اسپیڈ بریکر کے لئے اشارہ موجود رہتا ہے جس پر عمل کرنے سے سواری کو نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مشکل نادانستہ یا قدرتی طور سے بنے اور بنائے گئے اسپیڈ بریکر اور بغیر اشارے والے اسپیڈ بریکر سے ہوتی ہے۔ ایسے اسپیڈ بریکر یکلخت سے نمودار ہوتے ہیں راہ گیر لڑکھڑاہٹ میں ایکسیڈنٹ کر بیٹھتا ہے ایسے اسپیڈ بریکر، سواری بریکر اور راہ گیر بریکر بلکہ بعض مرتبہ لائف بریکر بن جاتے ہیں۔

ہمارے شہر کی سڑکیں کھمبوں کی سڑکیں ہیں سڑک پر کئی کئی کھمبے رہتے ہیں۔ کرنٹ اور ٹیلیفون کے کھمبے، غیر مقدمی کمان کے کھمبے، سڑک اور گلی کے ناموں کی تختیوں کے کھمبے اشتہارات کے کھمبے، ٹی وی اور ریڈیو کے کھمبے، پتنگ لوٹنے کے کھمبے اور بلا مقصدی کھمبے۔ غرض سڑک پر کھمبے ہی کھمبے بکھرے نظر آتے ہیں۔ سڑک پر سفر کرتے ہوئے مسافرین کھمبوں سے ٹکرا جاتے ہیں تو سواریاں کھمبوں میں اٹک جاتی ہیں۔ "کھمبوں کی سڑکوں" کے علاوہ ہماری سڑکوں کی طبی افادیت بھی ہے سڑکیں زود ہضم اور قبض کشا ہوتی ہیں۔ جب ہم بدہضمی اور قبض کی شکایت لئے ڈاکٹر سے رجوع ہوتے ہیں تو ہمیں سڑکوں پر چند میل چہل قدمی کا پر خلوص مشورہ دیا جاتا ہے۔

ہمارے شہر میں سڑکوں کی نگہداشت ایک نامور محکمہ کرتا ہے جسے حرف عام میں "کھایا پیا اور چلدیا" کہتے ہیں۔ اس محکمہ کی کارکردگی کے تعلق سے ہم ایک واقعہ بیان کریں گے جس کی تشہیر غلط ہو چکی ہے۔ ایک شرابی و کبابی ایک گڑھے کے پاس کھڑے ہو کر گڑھے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "پچیس، پچیس!!" ایک صاحب کو تشویش لاحق ہوئی اس نے

لڑھے کے قریب جاکر استفسار کیا۔ شرابی وکبابی نے انھیں گڑھے میں دھکا دے کر کہا چھبیس! چھبیس!! یہ لطیفہ نہیں بلکہ ہمارے شہر کا سچا واقعہ ہے وہ دراصل شہر کی مشہور شاہراہ پر ڈرینج کے مین ہول کے پاس محکمہ کھایا پیا اور چلدیا کا ایک باہوش وحواس ملازم بیٹھا مین ہول میں گرنے والوں کی گنتی کر رہا تھا چھبیس چھبیس!

قصہ مختصر حیدرآباد کے شہری سڑکوں کی وجہ سے کافی حیران اور پریشان رہتے ہیں سر سے کفن باندھے گھر سے نکلتے ہیں۔ واپسی تک زندہ رہنے کی امید نہیں رہتی ناامیدی اور مایوسی کی وجہ زندگی سے بے وفائی کی آس نہیں بلکہ ہمارے شہر کی سڑکیں ہیں۔ ●○

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	صنف	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/-	روپے
فقط	یوسف ناظم	مضامین	۸/-	〃
البتہ	〃 〃	〃	۱۰/-	〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸/-	〃
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-	〃
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	〃
بالآخر	〃 〃	مضامین	۱۴/-	〃
سُنی سُنائی	لئیق صلاح	〃	۱۵/-	〃
رقصِ تماشائی	وجاہت سندیلوی	〃	۱۵/-	〃
خواہ مخواہ	رشید الدین	〃	۱۰/-	〃
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	〃	۱۰/-	〃
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	〃	۱۲/-	〃
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	〃	۱۲/-	〃
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	〃	۱۵/-	〃
چیتا پچہ	مسیح انجم	〃	۱۲/-	〃
بہرحال	مجتبیٰ حسین	〃	۷/-	〃

فیاض احمد فیضی
(بمبئی)

ماڈرن عید کارڈ

ذیل میں کچھ جدید طرز کے عید کارڈز کے نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔ عید کارڈ بنانے والی کمپنیوں کے لئے اطلاعاً عرض ہے کہ ابھی ان مضامین کے حقوق بحق مصنف محفوظ نہیں کروائے گئے ہیں، ان کا جی چاہے تو ان مضامین کا استعمال وہ اپنی کمپنی کے عید کارڈوں میں مصنف کا شکریہ ادا کئے بغیر ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کی جائے گی۔

(۱)۔ محبوبہ کے نام

جانِ آرزو ! سلام و پیار

سب سے پہلے ہماری جدائی کی اس پہلی عید کی سینکڑوں ہزاروں مبارکباد قبول کرو کہ یہی رسمِ دنیا، موقع اور دستور ہے۔ اس لئے کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک محبوب سے گلے ملنے کی سخت ممانعت ہے۔ شادی کے بعد گرچہ اس کی اجازت ہے مگر اس وقت تک یہ خواہش باقی کہاں رہ جاتی ہے!

یاد ہے پچھلے سال ہمارے عشق کا چرچا سُن کر تمہارے ابّا نے اپنا ٹرانسفر دلّی کروالیا تھا۔ اور عین بقرعید کے دن تم زار و قطار روتے ہوئے بمبئی شہر اور مجھے چھوڑ گئی تھیں۔ آج عید کے دن بھی موسلا دھار بارش مجھے تمہارے آنسوؤں کی یاد دلا رہی ہے۔ مگر اس بارش میں وہ بات کہاں جو تمہارے آنسوؤں میں تھی۔ کاش تمہارے ابّا مجھ سے خفا نہیں ہوتے اور مجھے دلّی تک کا ہوائی جہاز کا کرایہ بھجوا دیتے تو میں اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتا۔ خُدا انھیں عقلِ سلیم عطا کرے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میری نظر ان کی دولت پر ہے۔ کوئی انھیں سمجھائے کہ ایک چھوٹے سے فلیٹ، فریج، ٹی وی (رنگین)، گیس کا چولھا، اسکوٹر اور تمہارے زندگی بھر کے ساتھ کے علاوہ میں نے کسی کی کبھی توقع نہیں کی۔

سب کچھ خُدا سے مانگ لیا تم کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

دعا کرو کہ یہ عید کارڈ میرا آخری عید کارڈ ہو۔ تمہارے ابا اور حالاتِ زمانہ ہمارے لئے ساز گار ہو جائیں۔ اور ہم اگلی عید جہیز میں ملے سازوسامان سے آراستہ فلیٹ میں انتہائی سادگی مگر مسرت و شادمانی سے بھرے دلوں کے ساتھ منائیں۔

صرف تمہارا

(۲) دوست کے نام

پیارے دوست!

آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں پھر نہ جانے کیسے، کس کو عید کا چاند دکھائی دے گیا۔ ممکن ہے کسی نے اپنے پڑوس کی چھت پر دیکھ لیا ہو۔ میں تو جب بھی کبھی چاند کو دیکھتا ہوں بے اختیار تمہاری یاد آجاتی ہے۔ پچھلے سال چاند رات ہی کو تم نے مجھ سے سو روپے قرض لئے تھے۔ جو آج تک باقی ہیں۔ بینک میں ہوتے تو آج ایک سو بارہ روپے ہو جاتے۔ اگر کسی اچھی کمپنی کے شیئرز خرید لئے ہوتے تو نہ جانے سو روپے کی رقم کتنے سو روپوں کے برابر ہو گئی ہوتی۔ خیر دوستی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

اس سال روزے بڑے آسان گزرے موسلادھار بارش کی وجہ سے چھتری کی آڑ میں ہی بڑے آرام سے سگریٹ پی لیتا تھا۔ ہوٹلوں میں رمضان کے مہینے میں لال پردے لگانے کا رواج بھی اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ پھر یوں بھی بارش کے دنوں میں کوئی بھی پردہ' پردہ کہاں رہ جاتا ہے۔ بھیگنے کے بعد تو پردے کے پیچھے کا منظر اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ پھر تراویح اور سحری کے اوقات میں آوارہ گردی کرنے کا مزہ بھی اس سال خوب رہا۔ کاش کہ تم بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔

عید کی مبارکباد قبول کرو۔ تمہارے منی آرڈر کا منتظر۔

تمہارا دوست۔

(۳) ۔ سہیلی کے نام

پیاری سہیلی ۔!

عید پھر آئی ہے اور تمہاری معطّر یادیں ساتھ لائی ہے۔ پچھلے ہفتے میرے بھائی نے بہت ہی قیمتی سینٹ کی بوتل مسقط سے بھیجی ہے۔ اچھا ہے تم یہاں نہیں ہو ورنہ مارے جلن اور حسد کے تمہاری تو عید خراب ہی ہو جاتی۔ لندن سے میری بھابی نے خاص طور پر میرے لئے آسمانی رنگ کا غرارہ سوٹ بھجوایا تھا۔ اس پر میں نے گہرے نیلے رنگ کی بہت خوبصورت ایمبرائیڈری کروائی ہے جس کا ڈیزائن ایک پاکستانی عورتوں کے رسالے سے میں نے لیا تھا۔ عید کے دن تصویر کھینچوا کر ضرور تمہیں بھیجوں گی۔

اُمید ہے یہ عید کارڈ تمہیں پسند آئے گا۔ میں نے صرف تمہارے لئے ساڑھے چار روپے والا کارڈ خریدا ہے۔ ورنہ دوسری سہیلیوں کو تو میں نے صرف سوا روپے والے کارڈ بھجوائے ہیں۔ سبجی میں رمضان کے آخری ہفتے میں چوڑیوں اور عید کارڈ کی خریداری میں بہت مزہ آتا ہے۔ نہ جانے کہاں سے نئے نئے ہینڈسم دوکاندار اور خریدار فٹ پاتھ پر اُگ آتے ہیں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ میں نے تو بڑی مشکل سے چار روز میں آدھ درجن عید کارڈ اور درجن بھر چوڑیوں کی خریداری کی۔ وہ عید کارڈ والا تو مجھ سے کہنے لگا۔

ایک کارڈ اور مفت میں لے جائیے۔ پتہ نہیں مجھ سے تنگ آگیا تھا یا پھر متاثر ہوگیا تھا۔ مجھے بڑی شرم آئی۔ میں نے کہا۔ رہنے دیجئے اب یہ کارڈ میں کیسے بھیجوں گی۔ فوراً کہنے لگا، مجھے ہی بھجوا دیجئے گا۔ عمر ذرا اس کی زیادہ تھی۔ میں نے کارڈ واپس کر دیا۔

خدا کرے ایسی عیدیں تمہاری اور میری زندگی میں بار بار آئیں۔ عید مبارک۔

(۴) والد کے نام

محترم والد صاحب

السلام علیکم۔

عید مبارک ہو۔ آج آپ کا پانچسو روپے کا منی آرڈر اور عید کا چاند تقریباً ساتھ ساتھ ہی آئے، اور میری خوشیاں دو بالا ہوگئیں لیکن ہمیشہ کی طرح میں پہلے ہی ساڑھے چار سو روپئے دوستوں سے قرض لے کر خرچ کر چکا ہوں۔ اب بقیہ پچاس روپوں میں عید، اور وہ بھی آپ کی شفقت کے سائے سے محروم عید منانے میں بھلا کیا لطف آئے گا۔ براہ کرم اپنے آفس سے ایڈوانس تنخواہ حاصل کر کے کچھ مزید رقم بھجوائیں۔ آج کل ہماری یونیورسٹی میں ہڑتال چل رہی ہے۔ اس لئے خرچ کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میری پڑھائی بند ہے جی نہیں آج کل میں انگریزی کے سبق آموز جاسوسی اور رومانی ناولوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہاں جتنی تعلیمی فلمیں لگی ہوئی ہیں وہ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ آپ نے فلم 'گاندھی' کی بہت تعریف لکھی ہے لیکن مجھے تو بالکل پسند نہیں آئی۔ میں تو پورے چار گھنٹے تک اصل فلم شروع ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

دعا کیجئے کہ میری تعلیم جلد از جلد پوری ہوجائے تاکہ میں کسی عرب ملک کی ملازمت حاصل کر کے اس سے بہتر کارڈ آپ کو بھجوا سکوں آمین۔

(۵) بڑی بہن کے نام

محترمہ ہمشیرہ صاحبہ!

ابھی افطار کرنے کے بعد میں نے مغرب کی نماز جیسے ہی ختم کی، پڑوس سے رحیمن خالا آگئیں اور کہنے لگیں، بیٹا زرا ٹی وی تو آن کرو۔ آج 'چھایا گیت' جلدی ہی شروع ہو رہا ہے۔ یہ رحیمن خالا وہی ہیں جنھوں نے آپ کی شادی سے پہلے دولھا بھائی کے گھر والوں سے جاکر کہہ دیا تھا کہ لڑکی کی ایک آنکھ میں کچھ خرابی ہے۔ ابھی چھایا گیت کا تیسرا ہی گانا چل رہا تھا کہ ایکدم سے مسلسل پٹاخوں کے چھوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ رحیمن خالا تو فوراً خفا ہوگئیں کہ ہمیشہ اچھے گیت پر ہی گلی کے لڑکے کچھ نہ کچھ ہنگامہ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ خالہ، عید کا چاند ہوا ہے تو لگیں مجھے مبارکباد دینے۔

آپ جب سے یہاں سے گئی ہیں مجھے ہر عید میں آپ کی یاد ستاتی ہے۔ میں چونکہ اب گھر میں اکیلی ہوں اس لئے اب مجھے عید میں من پسند کپڑے پہننے مل جاتے ہیں۔ ورنہ پہلے تو ہمیشہ ابا سب سے اچھا کپڑا آپ کو لاکر دے دیتے تھے۔ پھر بھی سوچتی ہوں کہ آج بھی تو آپ سسرال میں ایک سے بڑھ کر ایک، مجھ سے دس گنا بہتر عید کے جوڑے سلواتی ہوں گی۔ سچ آپا، میں نے آپ کی شادی کے لئے

ہر ہر نماز میں کتنی دعائیں مانگی تھیں۔ میری تو کوئی چھوٹی بہن بھی نہیں ہے۔
کاش کہ میں آپ کے عید کے جوڑے سے گلے مل کر آپ کو مبارکباد دے سکتی۔ خدا ایسی خوشیوں سے مالا مال عیدیں آپ کی زندگی میں بار بار لائے۔

(۶) چھوٹے بھائی کے نام

برادرِ عزیز!

خوش رہو!

عیدِ سعید کے اس پُرمسرت موقع پر تم کو میری طرف سے مبارکباد۔ عید کا یہ خوشیوں بھرا دن رمضان کے بابرکت مہینے کے بعد ہم سب کے لئے گویا انعام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تمہیں باقاعدہ روزے رکھنے چاہئیں اور دین داری کی طرف مائل ہونا چاہئے۔ اپنے شہر میں تو رمضان کی خوب رونقیں رہتی ہیں، اور رمضان کا صحیح لطف وہیں آتا ہے۔ یہاں بحرین میں اس مرتبہ اتنی سخت گرمی پڑی کہ میں باوجود کوشش کے ایک سے زیادہ روزے نہیں رکھ سکا۔ حالانکہ میں نے احتیاطاً پہلے ہی ایک مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ دن بھر اپنے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں پڑا ویڈیو پر دنیا بھر کی فلمیں دیکھتا رہتا تھا۔ ایک روزہ رکھ لینے میں مشکل بس یہ ہوئی کہ میں مرزا غالبؔ کی طرح ایک نہیں رکھا کہ لوگوں سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اپنے شہر اور اپنے محلے کے رمضان کی رونق اور عید کی چہل پہل کی یاد جب بھی آتی ہے، دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔
یہاں عید کی نماز علی الصبح ہوتی ہے۔ اور تم تو جانتے ہو کہ میں صبح جلدی نہیں اٹھ سکتا ہوں خدا ہم سب کو پنجگانہ نماز کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ تم نے بمبئی میں عید کی نماز کہاں پڑھی۔ ضرور لکھ بھیجو۔ ایک مرتبہ پھر دعاؤں کے ساتھ، تم کو عید کی ڈھیر ساری۔

(۷) جنرل عید کارڈ (منظوم)

محترمی!

آیئے،
آپ اور ہم
سب مل کر
عید کی خوشیوں کو
آپس میں اس طرح تقسیم کرلیں
کہ یہ دھرتی بن جائے خوشیوں کا گہوارہ
ہر چہرہ مسکرانے لگے
اور ہر فرد گنگنانے لگے
عید مبارک، عید مبارک، عید مبارک

کہ ... دولت بے شمار

وہاں لوگوں کے بارے میں سوچیں

جو دیکھتے ہیں صرف خواب، دولت کے

اور بن جاتے ہیں رمضان کے فقیر

کہ اپنی کالی دولت کی خیرات سے

سنہری موقع ہے یہ امیروں کے لئے

گناہوں کو دھونے کا، اور کمانے کا ثواب

کہ ہر قسم کی دولت

جب حد سے گزر جاتی ہے

تو بن جاتی ہے اِک عذاب

اس لئے وہ لوگ

کہ جن کے پاس بیویاں ہیں

تین یا چار

وہ ان لوگوں پر رحم فرمائیں

جو سرگرداں ہیں ایک بیوی کی تلاش میں۔

اور پھر گھبراتی ہے جن کی سیدھی نظر

'ضرورت رشتہ' کے کالم پر

اور بچے ہیں جن کے بے شمار

جن کو خطرہ ہے کسی ایمرجنسی کا

وہ اپنے [illegible] بچوں کو

(بخشنے [illegible] سکتی ہو)

[illegible]

بخش دیں، ان گھروں کو

جن کی ہر دعا کی ابتداء
ہوتی ہے ایک بچے کی دُعا سے
جن کے دیوار و در ترستے ہیں
بچوں کی قلقاریوں سے، شیطانیوں سے

آیئے!

آپ اور ہم
سب مل کر
عید کی خوشیوں کو
آپس میں اس طرح تقسیم کریں۔
کہ یہ دھرتی بن جائے خوشیوں کا گہوارہ
ہر چہرہ مسکرانے لگے
اور ہر فرد گنگنانے لگے
عید مبارک، عید مبارک، عید مبارک

(۸) پردھان منتری کا عید کارڈ پڑوسی ملک کے سربراہ کے نام

محترمی!

آج ہمارے ملک میں عید الفطر کا تیوہار بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا ہے۔ اور ہمارے ہندو اور مسلمان بھائی آج کے لئے فسادات کو بھول کر ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہیں۔ عیدگاہوں کے آس پاس پولیس والوں کو بھی فائرنگ کی پریکٹس سے منع کر دیا گیا ہے۔ ادھر کئی برسوں سے سُوّر بھی عیدگاہوں کا رخ نہیں کرتے۔ آپ یہاں آج ہوتے تو دیکھتے کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کی کتنی بڑی تعداد نئے کپڑے پہنے ہوئے خوشحال دکھائی دیتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ملک میں عید کل منائی جائے گی۔ کاش آپ کے علمائے دین نے ہمارے علمائے دین کی بات مان لی ہوتی اور ہم ایک ہی دن ایک ساتھ عید مناتے۔ یہ عید کارڈ ہم جان بوجھ کر آپ کی عید سے ایک روز پہلے بذریعہ ٹیلی گرام بھجوا رہے ہیں۔ آپ تو ہمارے ملک کے محکمۂ ڈاک و تار کی خوش انتظامی سے واقف ہی ہیں۔ یہ ٹیلیگرام آپ کو کل یعنی آپ کی عید کی شام تک ضرور مل جائے گا ــــــ ہم اس پُرمسرت موقع پر آپ سب کو اپنی طرف سے، اپنے بیٹے کی طرف سے اور بھارت ماتا کے کروڑوں ہندو مسلمان سپوتوں کی طرف سے عید کی مبارکباد اور شبھ کامنائیں بھیجتے ہیں۔ قبول فرمائیے، جے ہند۔

بانو سرتاج
(چندرپور)

چائے

چائے ہندوستانی عوام کا مرغوب ترین مشروب ہے۔

اپنے ہوم ٹاؤن میں چائے پتّی کی شکل میں پائی جاتی ہے مگر وہاں سے در بدر ہو کر رفیوجی کیمپ یعنی دکان تک آتے آتے اکثر ڈسٹ میں بدل جاتی ہے۔ چائے دو صورتوں میں یعنی کھلی یا پیک بند ڈبوں میں خریدی جا سکتی ہے۔ چائے چاہے کیسی بھی خرید کا چائے اس میں ملاوٹ ضرور ہوتی ہے یعنی زیادہ تر حصہ استعمال شدہ چائے کا ہوتا ہے کبھی کبھی بالکل اصلی بغیر ملاوٹ کی چائے بھی ایک آدھ ڈبّے میں نکل آتی ہے۔

خوشبو کے لحاظ سے چائے کو کم خوشبو والی چائے اور زیادہ خوشبو والی چائے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر کی خوشبو صرف باورچی خانے تک محدود رہ کر چائے تیار کرنے والے ہی کو محظوظ کرتی ہے۔ آخر الذکر کی خوشبو قید و بند کی زنجیریں توڑ کر مہمان خانے تک پہنچتی ہے اور مہمان کی تسکین کا باعث بنتی ہے ... وہ دل ہی دل میں کہہ اٹھتے ہیں ؎

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

ذائقے کے لحاظ سے چائے میٹھی یا نمکین ہوتی ہے۔ ہندوستان میں زیادہ تر لوگ گڑ یا شکر کی چائے پیتے رہیں۔ ہندوستانی نئے نئے تجربات سے گریز کرتے ہیں نمکین چائے وہی لوگ پیتے ہیں جو اتفاقیہ شکر کی جگہ نمک پڑ جانے سے نمکین چائے کے ذائقے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر مزید تجربات کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ لیمو کی دو بوندیں نمکین چائے کا لطف دوبالا کر دیں گی چائے کو نمک اور لیمو کا مرکب بنا کر پیتے ہیں۔

رنگت کے اعتبار سے چائے کالی یا گوری ہوتی ہے۔ گوری چائے کالے لوگ پیتے ہیں اور کالی چائے گورے لوگ، وہی جو اس خرافات کو ہندوستان میں لائے تھے۔ ہندوستانیوں نے قیاس کیا ہوگا ضرور ہی گورے لوگوں کی گوری رنگت کا راز چائے میں مضمر ہے (جبھی تو انھوں نے ہندوستان [illegible] نہیں سکھایا) اس نے خوب دودھ ڈال کر چائے پینے کا رواج ہوا ...

(مگر رہے کالے کے کالے ہی)

افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چائے تر و تازہ ہونے کے لئے شوق کے لئے یا ایک قسم کا نشہ حاصل کرنے کے لئے (بقول امجد خاں، بحوالہ کوئی فلمی میگزین) پی جاتی ہے۔ چائے بطور دوا بھی استعمال ہوتی ہے جب اس میں سونٹھ وغیرہ کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ عموماً چائے نہ پینے والے اشخاص بھی اس چائے کو پیتے ہیں اور پھر کبھی نہ پینے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔

مزاج کے اعتبار سے چائے گرم یا ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور سردیوں میں سرد چائے جو لوگ اس نکتے سے واقف نہیں ہیں وہ گرمیوں میں چائے کی عادت ترک کردیتے ہیں اور سردیوں میں کسر پوری کر لیتے ہیں۔ اکثر شاعر جب کسی کو غزل سنانے کے لئے ہوٹل لے جاتے ہیں تو آرڈر گرم چائے ہی کا دیتے ہیں مگر جب تک غزل پوری ہوتی ہے چائے ٹھنڈی اور سننے والے کا مزاج گرم ہوجاتا ہے۔

اوقات کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم بڈ ٹی ہوتی ہے جو صبح سویرے بستر پر نیم دراز حالت میں پی جاتی ہے۔ اس چائے کو پینے سے پہلے منہ دھونے کی سخت ممانعت ہے کیوں کہ اس طرح سے اس قیمتی مواد کے ضائع ہوجانے کا ڈر رہتا ہے جو نظام ہاضمہ اور دانتوں کی باہم کوششوں سے رات بھر میں تیار ہوتا ہے۔ اس مواد کا چائے کے ساتھ پیٹ میں جانا صحت کے لئے نہایت فائدہ مند ہے.... ایک سہ پہر کی چائے ہوتی ہے جو عموماً تنہا نہیں پی جاتی۔ اکثر و بیشتر احباب کو مدعو کر لیا جاتا ہے اور اتنا کھلایا پلایا جاتا ہے کہ چائے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میٹنگ کے دوران پی جانے والی چائے تھکے ہوئے اعصاب کو چست بنا کر بحث کے نئے پوائنٹ ڈھونڈنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ٹی بریک کی اصطلاح ہمارے یہاں کافی جانی پہچانی ہے۔ رفتہ رفتہ یوں ہوتا ہے کہ جب چائے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے فوراً میٹنگ بلائی جاتی ہے۔

چائے تیار کرنے کا طریقہ مدنظر رکھا جائے تو ایک طریقے میں چائے کی پتی (یا ڈسٹ) کا بندھوا مزدوروں کی طرح نچوڑ نچوڑ کر عرق نکالا جاتا ہے اور جب تک وہ واقعی بے کار نہیں ہوجاتی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اس طرح کی چائے تیار ہونے پر ہوٹلائی سائز کے کپوں میں نہ رکھی ہو تو برساتی نالے کے گاڑھے رنگ دار پانی کا شبہ دیتی ہے۔ یہ چائے مزدوروں اور موٹر اور ٹرک ڈرائیوروں کی پسندیدہ ہوتی ہے۔ دوسرے طریقے میں چائے کی پتی کو گرم پانی میں ڈال کر اس کا رنگ اترنے کا انتظار، محبوب کی آمد کی طرح کیا جاتا ہے۔ یہ کام ذرا صبر طلب ہوتا ہے اور جو مہمان بہت دیر تک بیٹھنے کا قصد کر کے آتے ہیں انھیں بھگانے کے لئے سود مند ہوسکتا ہے۔ یہ چائے صاف شفاف ہوتی ہے۔ واضح رہے اس استعمال شدہ چائے کی پتی سے ملازموں کی چائے تیار کی جاتی ہے۔

چائے پیش کرنے کا انداز دیکھا جائے تو ہمارے یہاں بنی بنائی چائے پیش کرنے کا رواج ہے۔ یہ چائے باورچی خانے سے بنائی گئی ساسر میں سجاتی مہمانوں کے سامنے پیش ہوتی ہے مہمان کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ موقع محل کو دیکھتے ہوئے اس چائے کو طشتری میں ڈال کر سُڑک سُڑک کر پئے یا چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہے۔ ایک دوسرے طریقے میں چائے اسپیشل پاٹ میں لئے چائے دانی، شکر دانی، دودھ دانی وغیرہ میں ہوتی ہے۔ مہمان کے سامنے ہی میزبان اُن سب کو جمع کر کے چائے کی شکل دیتا ہے تاکہ

سسندو ہے اور ملاوٹ کا شبہ نہ کیا جائے۔ اس چائے کو نفاست سے پیا شرط ہے۔

طبقات کے لحاظ سے چائے عوام اور خواص کے خانوں میں بانٹی جا سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں عوام کافی صد زیادہ ہے۔ خوا دیسے بھی چائے کے علاوہ کافی شربت، شراب سے شوق فرماتے ہیں۔ عوام کے لئے چائے ہی سب کچھ ہے۔ عوام کی چائے و چائے ہے جس میں شکر، دودھ، چائے کی پتی سب کچھ مناسب مقدار میں ہوتا ہے اور جو واقعی چائے کہی جا سکتی ہے۔ عام لوگوں کے یہاں ہر کسی کو چائے پیش کی جاتی ہے۔ مہمانوں کو جن سے عقیدت کا اظہار مقصود ہو اُس کی چائے میں مٹھاس زیادہ کردی جاتی ہے۔ کپ بھی خاصا بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ ایک گھونٹ لیا اور کپ کا پیندا نظر آنے لگا... خواص گہرے ملکی رنگوں کی نسبت ہلکے انگلش کلر زیادہ پسند کرتے ہیں۔ خواص کی چائے میں پتی کم ڈالی جاتی ہے۔ دودھ اُسی حد تک ڈالا جاتا ہے جس حد تک چائے کا مزا پسِ پُشت جا پڑنے کا خطرہ نہ ہو۔ پانی ضرور بھرپور ہوتا ہے مگر کپ کبھی اُوپر تک نہیں بھرا جاتا کہ یہ بدتمیزی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ملازم غلطی کر ہی بیٹھتے ہیں اور کپ میں اُوپر تک بھری ہوئی چائے مہمان کو پیش کردی جاتی ہے.... واللہ اعلم بالصواب۔

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

چاند بیوی

اسمٰعیل آذر

ایک مُدت سے مرے دل کو بڑا ارمان تھا
اپنی بیگم کو میں سمجھوں چاند کوہستان کا

پر زباں اس خوبصورت لفظ کی حامل نہ تھی
دوسرے لفظوں میں گھر والی ہی اِس قابل نہ تھی

یوں تو میں نے بخش ڈالے تھے اسے کتنے خطاب
اس کی فطرت کے مطابق بن سکے جو کچھ جناب

پیار سے اس کو پکارا 'جانِ من'، 'جانِ جہاں'
تجھ سی پیاری بنتِ حوّا اور دُنیا میں کہاں

خود غرض، منحوس، پھوہڑ بھی کہا دورانِ جنگ
بنتِ فتنہ، بی جمالو، نک چڑھی، توپ تفنگ

جانے کب کی بات ہے لیکن پتہ پرسوں چلا
ابن آدم کا قدم اب چاند پر ہے جا پڑا

چاند پر جاتے ہی اس نے چاند کا کھولا بھرم
بھلا یہ تو بیگم آذر پہ گیا ہے بیش و کم

اس کا کہنا ہے حقیقت چاند کی ہے مثل ڈھول
دھوم ہے جس کی زمانے میں مگر اندر سے پول

چاند پر آتی ہے مانگے کے اجالے سے بہار
جس طرح میک اپ سے گھر والی کے مکھڑے پر نکھار

کہتے ہیں ذی رُوح کوئی بھی نہیں سکتا وہاں
میرا گھر بھی کو نسا آیا بڑا جنّت نشاں

میں نے سوچا ہرج کیا جو کہہ دوں بیگم کو قمر
جب قمر، قمر النساء دونوں ہیں بے برگ و شجر

چاند کہتے اب اگرچہ رک نہیں سکتی زباں
احتیاطاً پھر بھی لے لیتا تھا اس کا امتحاں

ڈر تھا بیگم جانتی ہوگی اگر سب کچھ کہیں
چاند کہنے کا مزہ ٹل جائے گا فوراً وہیں

لے کے پھر نام خُدا آواز دی ـــ "اے مہ لقا
کھیر جو شب کو پکائی تھی ادھر بھی ہو عطا"

اِتنا کہنا تھا کہ طوفانی گھٹا سی چھا گئی
ہاتھ میں کیا کیا لئے صاحب قیامت آگئی

باندھ کر پلو کمر میں بولی غُـراتے ہوئے
"آپ کو کچھ شرم بھی آتی ہے اتراتے ہوئے

کس لئے جی بج رہی ہیں پیار کی شہنائیاں
کیا کہیں جانے کی پھر ہونے لگیں تیاریاں

پھر کسی نے بھیج دی کیا دعوتِ شعر و سخن
کروٹیں لینے لگا ہے آپ کا دیوانہ پن

دیکھتی ہوں کیسے لے جاتی ہے یہ دیوانگی
آج یا تو میں رہوں یا آپ کی فرزانگی

کھیر رکھی ہے کچن میں سیدھے اٹھ کر جائیے
دال چولہے پر ہے تھوڑی آنچ بھی بھڑکائیے

نفیس احمد خاں
(نئی دہلی)

.....اور 'وہ' سیاسی ہو گئے...

ہندوستانی سیاست میں بھیڑ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ خواہ بس کے انتظار میں کھڑی بھیڑ ہو یا ریل گاڑیوں کا ٹکٹ لیتی ہوئی سواریوں کی یا راشن کی دکان کے سامنے راشن والے کے دیدار کو ترستی ہوئی عقیدت مندوں کی۔ ہر بھیڑ کے اپنے بے ترتیب سیاسی تجربے ہوتے ہیں۔

ہندوستانی سیاست ایک ایسی دلیسی کُتیا ہے جو کبھی بھی کسی بھی وقت مع اپنے مالک کے کسی کو بھی بھنجوڑ سکتی ہے "۔

یہ فقرہ میں نے راشن کی بھیڑ سے چرایا تھا جہاں راشن کم اور لوگ زیادہ تھے۔ وہیں پر ایک سرکاری نیتا بھیڑ کو سمجھا رہے تھے کہ ہماری پارٹی غریبی ہٹانے میں اس لئے تاخیر برت رہی ہے کہ کہیں جلد بازی میں غریبی کی جگہ کوئی ایسی چیز نہ ہٹ جائے جس کا ہمیں زندگی بھر افسوس ہوتا رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی اُدھیڑ بن میں ایک روز دفتر سے گھر میں داخل ہوا تو گھر والی کو پورے صوفیانہ موڈ میں دیکھ کر میں نے آسمان کی طرف رحم طلب نظروں سے تاکا اور ڈرتے ڈرتے ان کی جانب نظریں گھمائیں تو انھوں نے بغیر کسی تمہید کے چودھویں صدی کے خاتمے اور کسی بھی لمحے قیامت کی آمد کی اطلاع دے دی۔ میں نے شکر منایا کہ چلو سستے چھوٹے کہیں وہ مٹی کا تیل لانے کا حکم دے دیتیں تو.... مگر کیا کریں دن کا سنتا دات کو خواب بن کر نازل ہوتا ہی ہے۔ لہٰذا کافی رات تک قیامت کے ہی خواب آتے رہے۔ بڑی مشکل سے نیند آئی تھی کہ زوردار دھڑ دھڑاہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے دیر نہ لگی کہ قیامت آ ہی گئی۔ اچھل کر بستر سے نیچے کود پڑا۔ اور چیختا ہوا گھر کے پچھواڑے سے محلے والوں کو قیامت کی خبر دینے کے لئے بھاگنا چاہا لیکن میری بیوی کو شاید یہ خدمتِ خلق گوارہ نہ ہوئی اس لئے جھنجھوڑ کر ہوش میں آنے کے لئے کہا۔ جب نیند کا غلبہ اور میں کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو انھوں نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے قیامت کا صحیح راستہ بتادیا۔ اپنے اس ڈرپوک پن پر نظر پڑتے ہی میری شرمندگی اور بڑھ گئی۔ میں صبح صبح دروازے پر دستک دینے والے کی کرتوت پر اپنے آپ کو کوستا ہوا آگے بڑھا اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا تو دیکھا کہ سامنے پورے بجوش و

دخرگوش سے اپنی باچھیں پھیلائے ڈھلے ڈھلائے بدو بھائی کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے بغیر کسی تمہید کے مبارکا
تین بم ایک ساتھ پھوڑ دیئے۔ میں مجسم سوالیہ نشان بنا ان کی طرف تاک رہا تھا کہ انھوں نے جھٹ اطلاع دی کہ ..؟
وہ... سیاسی ہوگئے۔"

یہ خبر سن کر مجھے اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت ہوئی جتنی کہ ہندوستان میں بے روزگاری اور مہنگائی کے ایک
ہونے پر بھی نہ ہوتی۔ بات دراصل یہ تھی کہ "وہ" ایک بہت ہی سیدھے سادے اور نیک انسان تھے کسی سرکاری دفتر میں
کلرک تھے۔ اور ان کی ایمانداری کی ضمانت محلے کے لالہ کی دکان پر ان کا ادھار کھاتہ تھا جو کبھی بند ہونا نہیں جانتا تھا
ان کی وہ سائیکل تھی جو کہ بقول محلے کے منچلے بزرگوں کے ان کے پڑدادا کی پہلی جنگِ عظیم میں بطور انعام ملی تھی۔

میں نے بدو بھائی سے جب اس حادثے کی تفصیل جاننی چاہی تو انھوں نے اپنے فخریہ انداز کو ادھر چوڑا کر کے
کانفرنس کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے لیڈر کی طرح سنجیدہ ہوکر فرمایا :-

اب آپ سے کیا بتائیں صاحب۔ ہم لوگ یہ کوشش کافی دنوں سے کر رہے تھے۔ ان کے پاس مستقل محلے کی دستخطا
اور وفد بھیجے جارہے تھے لیکن وہ راضی ہی ہوکے نہیں دے رہے تھے۔ مگر جب ان کے پاس مستقل چندہ اگاؤ کمیٹی کے
میاں مذہبی رہنما منحوس شاہ اور دادا پیاؤ سنگھ پہلوان پہنچے تو بھلا ان کے آرگومینٹ سے کیسے موبلائیز نہ ہوتے۔ اور
ان پر ترس کھاکر ساتھ ہی محلے کی عزت رکھنے کے لئے سیاسی ہونا منظور کرلیا۔"

نہ جانے کیوں مجھے "وہ" کے اوپر بڑی شدت سے ترس آنے لگا کہ لو ایک شریف آدمی تھا بیچارہ ... گیا!! لیکن
بنانے کی آپ لوگوں کو کیا ضرورت پڑگئی ؟" میں نے بدو بھائی سے پوچھا۔

بدو بھائی نے میری ناسمجھی پر تقریباً افسوس سا کرتے ہوئے کہا اور کچھ زیادہ ہی ڈپلومیٹک انداز میں مسکرائے
کیا۔" ارے آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ بھائی وہ کچھ تھے ادھر ہیں کوئی چاہیئے تھا لہٰذا ان سے اچھا اور کون ملتا ...؟
کی بات پوری طرح سیاست میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ جملہ سنتے ہی میری روح کلبلا اٹھی۔ بدو بھائی نے میری یہ کیفیت
بھانپ بات آگے بڑھائی۔

" بھئی آج شام کو وہ اپنے گھر کی منڈیر سے محلے کو خطاب کرنے والے ہیں۔ آپ ضرور تشریف لائیے گا ... یہ تاریخی
دیکھنے کا موقع ہے کہیں "

ٹھیک چار بجے میں دھڑکتے دل کے سے "ان" کے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ ا
ان کے گھر جاتے ہوئے مجھے کبھی ایسا کچھ نہیں لگتا تھا۔ ان کے گھر کے پچھواڑے دو بڑی بڑی مٹ میلی چاندنیاں بچھا کر
کا انتظام کیا گیا تھا۔ جس کے اوپر اسی رنگ کے ہر سائز کے ننگے، ادھ ننگے بچے گبر سنگھ کے ڈائیلاگ دہراتے ہوئے
دھینگا مشتی کر رہے تھے۔ ایک طرف غفور چائے والے کی دکان سے اٹھائی گئی بینچ پڑی ہوئی تھی جس کے اوپر دی

لگا ہوا تھا۔ جہاں صرف بددو بھائی جو خاصد حد سنجیدہ ہو رہے تھے، اُکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انھوں نے ذہین سے باآواز بلند مجھے پکارا اور دی۔آئی۔پی گیلری میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں ان کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے محلے کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ کچھ لوگ خوش تھے اور کچھ پریشان۔ کیوں کہ ان کی سمجھ میں یہ ماجرا نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ میرے ہی جیسے عام لوگ تھے۔ سامنے مُنڈیر کی جس دیوار سے وہ خطاب کرنے والے تھے، گوبر اور سفیدی سے لیپ پوت کے صاف کی گئی تھی جس پر موٹے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "سیاست تمہاری زرخرید ہے"۔ تھوڑی ہی دیر میں جب پچھواڑہ پاس میں بہتی ہوئی نالی تک پوری طرح بھر گیا تو اسی وقت ایک آدمی ہانپتا ہوا بددو بھائی کے پاس آیا اور ان کے کان میں کوئی خبر انڈیلنے لگا۔ جسے سُن کر بددو بھائی کی آنکھیں چمکنے لگیں ہونٹ مسکرانے کے لئے پھڑکنے لگے اور سینہ کچھ کہنے کے لئے دھڑکنے لگا۔ وہ اچھل کر کھڑے ہوئے اپنے تہمد کو علی الاعلان کھول کر کچھ ٹائیٹ کیا، شور مچاتی ہوئی بھیڑ کی جانب اشارہ کرکے کہنا شروع کیا۔

" بھائیو! دیکھا آپ نے اپنے ان، کی تعریف۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ جس چھاپے خانے میں 'وہ' کا پہلا سیاسی انقلابی خطبہ چھپ رہا تھا وہ مشین ٹوٹ گئی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ ایسا کیوں ہوا۔ تو اس کا ایک ہی جواب ہے کہ ہمارے "ان" کی تقریر کا کڑا پن اور بلندی وہ بے زبان مشین نہ برداشت کرپائی ۔۔ اور بے چاری ٹوٹ گئی۔ بھائیو! دیکھا آپ نے اپنے لیڈر کا پہلا کارنامہ کیسا حیرتناک ہے!! مگر آپ گھبرائیں نہیں ہمارے سیاسی بھائی کبھی لکھی لکھائی اور چھپی چھپائی تقریروں کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کو زبانی بھی بہت کچھ یاد ہے۔ جس کا مظاہرہ ۔ وہ ۔ چند ہی لمحوں میں اس مُنڈیر پر نمودار ہوکر کریں گے۔ اور بتلائیں گے کہ آج دیش کو ان کی ضرورت اچانک کیوں آن پڑی ۔۔!"

پورا پچھواڑہ تالیوں، نعروں اور بچوں کی ملی جلی کلکاریوں سے گونج اٹھا۔ یہ سب ابھی رُک بھی نہیں پایا تھا کہ میری نظر سامنے منڈیر پر پڑی وہاں جو کچھ بھی دیکھا اُسے دیکھ کر میرے پیٹ کے اندر کئی قہقہے کھولنے لگے۔

مُنڈیر پر "وہ" برسوں پرانا سفید کرتا پاجامہ، جو کہ صاف کرنے کی کوشش میں مٹ میلا ہوگیا تھا، پہنے کھڑے نظر آئے۔ ان کا چہرہ سنجیدگی اور مسکراہٹ ایک ساتھ لانے کے چکر میں اور نے رونے کو ہو رہا تھا۔ ناک کے اوپر ان کا اپنا پرانا چشمہ لگا ہوا تھا جو کہ گھبراہٹ کے پسینوں سے پھسل پھسل کر ناک کی پھننگی تک آرہا تھا۔ سر پر جھک جھک کرتی ہوئی بالکل تازہ خریدی ہوئی گاندھی ٹوپی لگی ہوئی تھی انھوں نے مُنڈیر پر پرائیشن کھڑے ہوکر ایک عجیب سے انداز میں بھیڑ کی طرف ہاتھ اُٹھایا جو کہ بیک وقت نمسکار، آداب اور سیلوٹ لگ رہا تھا۔ آخر اُنھوں نے کھانس کھنکار کر اپنی تقریر شروع کی۔

" بھائیو! بہنو! اور ننگ دھڑنگ بچو! انھیں ہمارا نمسکار، دھمسکار، چمسکار، گمسکار، دکھ تو! نمسکار کے ساتھ میں نے تین اور اِسکار جوڑ کر ملک کی سیاست کو تین نکاتی موڑ دیا ہے۔ ہم آپ کے سامنے صرف تقریر فرمانے نہیں آئے ہیں بلکہ نعروں کے ساتھ ساتھ کچھ حل بھی لے کر آئے ہیں جن میں پہلا ہے غریبی ہٹاؤ کے بارے میں۔ اس کا واحد طریقہ ہے سیاسی ہو جانا اب آپ مجھے دیکھئے میں سیاسی ہو گیا جلدی ہی منتری ہو جاؤں گا۔ پھر وہ دن دور نہیں جب میری ہی کیا میرے تمام رشتہ داروں کی غریبی

دُور ہوجائے گی۔ (تالیاں اور زندہ باد کے نعرے) اپنی خواہشوں کو عملی جامہ پہناتا ہے تو سیاسی ہو جایئے۔ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ مرنے کے بعد یہیں محلے میں میری ایک پکی سمادھی بنائی جائے گی۔ جس کے اوپر نئی اٹیلس سائیکل کے اوپر سوار گھر واپس آتا ہوا میرا ایک کنگ سائیز مجسمہ بھی لگوایا جائے گا۔ (تالیاں۔ جس کی پہل بدو بھائی کر رہے تھے)

آج سے پہلے سیاست میرے نزدیک س۔ ی۔ ا۔ س۔ ت سے زیادہ نہیں تھی لیکن جب مجھے اس کی خفیہ خوبیوں کا پتہ چلا تو میں نے ان پانچوں حروف کو یکجا کر دیا اور خود سیاسی ہو گیا۔ اب میں صرف محلے کا فرد نہیں رہا ہوں بلکہ نیشنل پراپرٹی بن گیا ہوں۔ (تالیاں اور زندہ باد کے نعرے) میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے لئے، یعنی اپنے محلے کے لئے ایک لائبریری دواسپتال اور تین قبرستان بنواؤں گا اور رہی دعا آپ کی تو آپ کو دفن بھی کراؤں گا۔ میں پورے شہر میں محلہ باد پھیلاؤں گا۔ دھنیہ باد"۔

یہ کہہ کر وہ منڈیر سے کود کر گھر کے اندر چلے گئے۔ میں نے آس پڑوس میں وی۔ آئی۔ پی بنچ پر بیٹھے بدو بھائی چینی لال، نتھو شاہ اور پیارا سنگھ پر ایک نظر ڈالی۔ ان کے چہرے خوشی اور فخر کے مارے پھٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے ان تمام وی آئی پیز کی اس حالت کی تاب نہ لاکر گھر کی طرف سرپٹ دوڑ لگائی اور ۔ "وہ" سیاسی ....

■■

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی کتابیں

بہرحال ۷/ روپے

بالآخر ۱۲/ روپے

آدمی نامہ ۹/ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجا سکتی ہیں

جہانگیر انسؔ

ہم بھی صاحبِ تصنیف ہوگئے

دس پندرہ اُلٹے سیدھے مضامین لکھ کر اور انھیں تیسرے درجہ کے رسائل میں شائع کرا کر ہم خود کو مستند ادیب
سمجھنے لگے اور ہمارے دل میں شدت سے یہ خواہش پرورش پانے لگی کہ اپنی ایک کتاب شائع کرا کر "صاحبِ تصنیف" حضرات
کی صف میں آجائیں تاکہ ہمارا شمار بھی "چوٹی کے ادیبوں" میں ہونے لگے اور اکادمی، انجمن، اور علمی و ادبی اداروں کی رکنیت اور
انعاموں پر ہمارا بھی حق ہو جائے۔ لیکن اردو کے "تاریک مستقبل" اور اردو داں طبقہ کی "بدذوقی" کے سبب اپنی اس
خواہش پر عمل کرنے کا حوصلہ ہم نہیں کر پا رہے تھے۔

وقت کے ساتھ اردو کے "تاریک مستقبل" کو "روشن مستقبل" میں تبدیل ہوتے یعنی بک اسٹالوں پر اردو کی کتابوں
کو بڑھتے دیکھ کر اور اردو داں طبقہ کی "بدذوقی" کو "خوش ذوقی" میں بدلتے دیکھ کر "صاحبِ تصنیف" بننے کی ہماری
خواہش جب حد سے سوا ہوگئی تو ہم نے اپنی ایک کتاب شائع کرانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اس سلسلے میں جب ہم نے اپنے ادبی سرپرست "علامہ گرگٹ" سے مشورہ کیا تو انہوں نے ہر ممکن امداد اور تعاون کا
وعدہ فرما کر ہمارا حوصلہ دوچند کر دیا۔ ہمارے ادبی حریف شیخ فتین کو جب یہ خبر ملی تو اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ لیکن ہم
حوصلہ شکن باتوں کو کہاں خاطر میں لانے والے۔ ہمارے سر پر "صاحبِ تصنیف" بننے کا بھوت سوار ہو چکا تھا اور یہ کوئی معمولی
بھوت نہیں تھا جو "شیخ فتین" یا "مولوی مسکین" کی جھاڑ پھونک سے اتر جاتا۔

جب ہم نے "صاحبِ تصنیف" بننے کا فیصلہ کر لیا تو سب سے پہلا مسئلہ سرمایہ کا پیدا ہوا کیوں کہ آج جینے کے لئے
ہی نہیں بلکہ مرنے کے لئے بھی کافی روپیہ (کریا کرم کے لئے) کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ہم تو "صاحبِ تصنیف" بننے کا عظیم کارنامہ
انجام دینے جا رہے تھے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کا سب سے سہل راستہ اکادمی کا دروازہ نظر آیا۔ اگر اکادمی کی نظرِ کرم ہوگئی
تو سرمایہ کی قلت کا مسئلہ بس یونہی چٹکیوں میں حل ہو جائے گا۔ جبکہ ایک ادنیٰ آدمی سے لے کر حکومت تک "امداد" کی محتاج

ہے تو ایک ادیب اس سے کیسے مبرّا رہ سکتا ہے۔ دل نے کہا "اکادمی کی نظرِ کرم کیوں نہیں ہوگی آج جب کہ اکادمیوں کے طفیل باصلاحیت فنکاروں کے ساتھ ایرے غیرے نتھو خیرے بھی جنھیں مضمون لکھنا تو کجا، قلم پکڑنا بھی نہیں آتا، صاحبِ تصنیف بلکہ صاحبِ تصانیف بن گئے ہیں تو تم خیر سے دس پندرہ مضامین پیش کر کے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کر چکے ہو۔۔۔" دل کے فیصلے پر ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ باقی رہا پچیس فیصد سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ، اس کے لئے بیوی کے زیور پر نظر گئی۔ زیور تو آخر بکس میں بند رہتے ہیں اور خواہ مخواہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ٹیکس ادا کرنے کی مصیبت سے بھی ہم بچ جائیں گے اور چور اچکوں کا خوف بھی ختم ہو جائے گا لیکن بیوی سے زیور حاصل کرنا بھی ایک مسئلہ تھا اور یہ تمام مسئلوں سے بڑا مسئلہ تھا کیوں کہ عورتیں جان دینا گوارا کر لیتی ہیں لیکن زیور نہیں۔ پھر بھی بیوی کو "دوہرے زیور" بنوانے کی لالچ دے کر ہم نے راضی کر لیا۔ شوہر کی خوشی میں خوش رہنے والی اور شوہر کے "نام" کے لیے اپنا زیور تک قربان کر دینے والی بیوی واقعی خدا کی نعمت ہے۔ ایسی بھولی اور معصوم بیوی خدا ہر شوہر کو دے۔ آمین۔

اشاعتِ کتب کے سلسلے میں مالی امداد حاصل کرنے کے لیے اکادمی میں کتاب کا مسودہ داخل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ایک معین وقت ہوتا ہے اور وہ وقت ختم ہونے کے قریب تھا لیکن ہم نے ابھی تک مسودہ تیار نہیں کیا تھا۔ اس پریشانی کا ذکر جب ہم نے "علامہ گرگٹ" سے کیا تو انھوں نے ہماری سادہ لوحی پر مسکراتے ہوئے فرمایا "صرف قلم گھسا کر کوئی بڑا ادیب نہیں بن جاتا اس کے لیے دنیا داری سیکھنی پڑتی ہے۔ یہ مسئلہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایک موٹی سادی کاپی پر کتاب کا نام لکھ امدادی فارم پر اخراجات کا تخمینہ لکھ کر داخل کر دو، بعد میں مسودہ تیار ہوتا رہے گا۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا "لیکن مسودے کے بغیر۔۔۔"

علامہ گرگٹ نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا "اب بھی "مولوی مسکین" کی طرح بات کئے جا رہے ہو ارے میاں وہی سادی کاپی مسودہ کا کام دے گی۔"

ہم نے حسبِ سابق حیرت سے پوچھا "لیکن ہم نے سنا ہے کہ اکادمی مسودہ کو تبصرہ کے لئے کم از کم دو "مستند" ادیبوں کے پاس بھیجتی ہے اگر ان کا تبصرہ موافق ہوا تو امداد دیتی ہے ورنہ نہیں۔"

علامہ گرگٹ نے پہلے ہی کی طرح مسکراتے ہوئے کہا "میاں اس کی فکر تم چھوڑ دو، میرا اثر و رسوخ کب کام آئے گا، سب کچھ چلتا ہے تمھیں امداد دلانا میرا ذمہ۔"

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد ہم نے علامہ گرگٹ سے کتاب کے مضمون اور نام کے متعلق استفسار کیا۔ انھوں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "اردو قاری اب "باذوق" ہو گئے ہیں آج کا دور تنقید کا دور ہے نکتہ چینی کا دور ہے، زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی آج تنقید کا درجہ سب سے اونچا ہے بک اسٹالوں پر دیکھتے نہیں سو میں اسّی کتابیں تنقیدی ہیں اس لئے تمھاری کتاب بھی تنقیدی ہی ہونی چاہیے۔" اپنی بات ختم کر کے علامہ گرگٹ کچھ دیر تک عالمِ مراقبہ میں رہے اس کے بعد فرمایا "کتاب کا مضمون خواہ جیسا ہو لیکن "نام" زوردار ہونا چاہیے کیوں کہ آج کل لوگ کام نہیں "نام" دیکھتے ہیں۔ اور نام کا فیصلہ ہم نے کر لیا ہے "اردو شاعری میں شہوانیت کا غلبہ"۔"

علامہ بہت دور کی کوڑی لائے تھے۔ آج کے انسانوں کی دکھتی رگ کو انہوں نے پکڑا تھا اور ان کے پسندیدہ موضوع کا انتخاب کیا تھا۔ ہمیں بھی یہ نام پسند آیا۔

علامہ گرگٹ کے مشورہ کے مطابق ہم نے اکادمی میں مسودہ (اگر واقعی اسے مسودہ کہا جائے) داخل کر دیا۔ ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد ہم نے "باذوق" دوستوں کے گھروں کے چکر لگانا شروع کیئے۔ کسی کے یہاں کوئی شعری مجموعہ مل گیا کسی کے یہاں کچھ تنقیدی کتابیں یکجا ہو گئیں تو ایک دن تمام کتابوں سے مطلب کی باتیں چن کر ہم نے اپنی کتاب کا مسودہ تیار کر لیا۔ علامہ گرگٹ کو جب ہم نے یہ مسودہ دکھایا تو انھوں نے پڑھے بغیر اس کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیئے ہم ہونق بنے ان کی تعریف سنتے رہے۔ جب وہ تعریف کرتے کرتے تھک گئے تو ہم نے ادب سے سوال کیا "مسودہ پڑھے بغیر آپ نے اتنی تعریف کر دی کہ ہم ابھی سے ہی خود کو صاحب تصنیف سمجھنے لگے۔"

علامہ ہماری طرف پر فخر انداز سے دیکھتے ہوئے بولے "مسودہ کی نہیں بلکہ میں تمہارے حوصلہ کی تعریف کر رہا تھا۔ واقعی تم ایک عظیم قلمکار بننے کے قابل ہو۔ مضمون کوئی چیز نہیں ہوتا اصل چیز ادیب کا حوصلہ ہوتا ہے۔ کتاب کے اندر کیا ہے اسے بہت کم لوگ دیکھتے ہیں مضمون میں اگر تسلسل ہے اور ان کے مزاج کے مطابق ہے تو مصنف ان کی نظر میں عظیم ہے اگر مضمون میں تسلسل نہیں ہے اور ان کے مزاج سے الگ ہے تو اسے جدید ادب قرار دے کر خاموش ہو جاتے ہیں، برائی نہیں کرتے اس لیئے کہ اس طرح انھیں اپنی قابلیت کا بھرم کھل جانے کا خوف ہوتا ہے۔ آج کل اکثر لوگ کتاب کا صوری حسن دیکھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مقدمہ اور پیش لفظ سرسری طور سے دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے کتاب خریدنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ اسے پڑھا بھی جائے۔ کتاب صرف پڑھنے ہی کے کام نہیں آتی بلکہ گھر کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے، سماج میں رتبہ بڑھانے اور دوسروں پر علمیت کا رعب جمانے کے بھی کام آتی ہے۔

پیش لفظ لکھنے کا فیصلہ علامہ نے خود کیا اور مقدمہ اور تعارف لکھوانے کے لیئے انہوں نے تین چار مستند اہل قلم کے نام خط لکھ دیا۔ ان کے حکم کے مطابق مقدمہ لکھوانے کے لیئے ہم نے پہلے "سرمد مینوی" کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ "سرمد مینوی" نے پہلے تو ٹرخانا چاہا لیکن جب ہم نے ان کی خدمت میں علامہ کے خط کے ساتھ ایک کیلو اصلی دیسی گھی اور ایک کیلو دیہاتی شہد کا ڈبہ پیش کیا تو وہ موم ہو گئے۔ ہم نے مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے مسودہ واپس کر دیا اور اپنی ڈائری میں کتاب کا نام درج کرتے ہوئے فرمایا ایک مہینے کے بعد آکر اپنی کتاب کا معرکتہ الآرا مقدمہ لیجا ییے گا لیکن اس دن بھی ایک کیلو اصلی گھی اور ایک کیلو شہد لیتے آئیے گا۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا "مسودہ پڑھے بغیر مقدمہ آپ کیسے تحریر فرمائیں گے۔"

سرمد مینوی نے علامہ کی طرح معنی خیز انداز [illegible] ہے "جس کے بعد انہوں نے اپنی ڈائری دکھاتے ہوئے کہا "انتیس مسودوں پر مقدمہ [illegible] پہلے بک ہو چکا ہے آپ کا نمبر تیسواں ہے میں روز کسی نہ کسی کتاب پر مقدمہ لکھتا رہتا ہے۔ اگر تمام مسودوں کو پڑھنے لگوں تو ہمارا کیا حال ہو جائے گا لیکن آپ مطمئن رہیئے آپ کی کتاب پر ایسا مقدمہ لکھوں گا کہ لوگ پہلے ہی اصل

مضمون پڑھنے کے لئے کتاب نہ خریدیں لیکن مقدمہ پڑھنے کے لیئے ضرور خریدیں گے۔

مقدمہ کا معاملہ بحسن وخوبی طے ہوجانے کے بعد تعارف لکھوانے کے لیئے ہم ایک اور نامور اہل قلم "گیسو کنگھی نگری" کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گیسو کنگھی نگری نے بھی سرمہ نینوی کی طرح پہلے ٹرخانا چاہا لیکن ہم نے جب ان کی خدمت میں بھی علامہ کے خط کے ساتھ ایک جاپانیز سگریٹ کیس اور ایک ڈبیہ امریکن سگریٹ (یہ سگریٹ کیس اور سگریٹ ہمارے ایک عزیز نے جو حال ہی میں مشرق وسطی سے آئے تھے تحفتاً دیا تھا) کا نذرانہ پیش کیا تو وہ رضامند ہوگئے۔ ہم نے اپنے متعلق اہم باتیں انھیں بتانا چاہیں لیکن اُنہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا "علامہ گرگٹ نے اپنے خط میں آپ کا تعارف لکھ دیا ہے اسی کی بُنیاد پر میں آپ کا "تعارف نامہ" اتنا دھانسو لکھ دوں گا کہ آپ کی شخصیت دوبالا ہو جائے گی اور جب آپ اپنے تعارف نامے سے اپنا موازنہ کریں گے تو تعارف نامہ کے سامنے آپ کی شخصیت بونا نظر آئے گی۔"

سرمہ نینوی کی طرح گیسو کنگھی نگری نے بھی ایک مہینہ بعد "تعارف نامہ" دینے کے لیئے بلایا یہ اور بات ہے کہ "مقدمہ" اور "تعارف نامہ" ہمیں تین مہینے بعد ملا اور اسے حاصل کرنے کے لیئے سرمہ نینوی اور گیسو کنگھی نگری کے دولت خانوں پر سیکڑوں دفعہ حاضری دینی پڑی۔

اِدھر ہم اُن کاموں میں مشغول تھے اُدھر علامہ گرگٹ اکادمی سے مسودہ پر مالی امداد منظور کرانے میں مصروف ———— غرض کہ دونوں مراحل ایک ہی ساتھ انجام پائے۔

مسودہ ہر لحاظ سے مکمل ہوجانے اور اکادمی سے مالی امداد حاصل ہوجانے کے بعد "کتابت" کا کام شروع ہوا۔ لیکن یہ مرحلہ اکادمی سے مالی امداد حاصل کرنے اور نامور اہل قلم حضرات سے "مقدمہ" اور "تعارف نامہ" لکھوانے سے ذرا سخت قسم کا تھا۔ غلطی سے ہم نے کاتبوں کو اپنے جیسا ہی انسان سمجھ لیا تھا لیکن تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایسی مخلوق ہے جس کا موازنہ انسانوں سے کیا جاسکتا ہے نہ فرشتوں سے۔ کاتبوں نے ناز نخرے دکھانے میں نئی نویلی دلہنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کام اپنا تھا اس لیے ان کے ناز نخروں کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ ہاں اتنا فائدہ ہمیں ضرور ہوا کہ ہم صبر ایوب کی حقیقت سے واقف ہوگئے کاتب دن بھر میں جو کتابت کرتے رات میں ہم اس کی پروف ریڈنگ کرتے۔ بہ الفاظ دیگر سولی پر چڑھتے، ہاں پروف ریڈنگ بھی سولی پر چڑھنے سے کم جان لیوا کام نہیں۔ پروف ریڈنگ میں کاتب کی ایسی ایسی موشگافیوں کا سامنا کرنا پڑا کہ اگر ہم پر "صاحب تصنیف" بننے کا بھوت سوار نہیں ہوتا تو ہم واقعی پاگل ہو جاتے۔

کتابت کے بعد طباعت کا مرحلہ سامنے آیا۔ یہ مرحلہ بھی جوں توں کرکے گزرا۔ علامہ گرگٹ نے سرورق کے لیئے ایک مشہور آرٹسٹ سے جدید آرٹ کا ایک شاہکار پہلے ہی بنوا لیا تھا اس کا بلاک بھی تیار ہوگیا تھا۔ جلد بندی، وغیرہ کا کام ہم نے علامہ کے ذمہ کردیا۔ علامہ نے اپنے اس فرض کو اس طرح نبھایا کہ کتاب جب مکمل ہوکر سامنے آئی تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے، ہمارے ادبی حریف "شیخ فنتینی" اور "مولوی مسکین" بھی کتاب کا صوری حسن دیکھ کر عش عش کر اٹھے اور علامہ گرگٹ کی

اہمیت کے قائل ہو گئے۔

خیر صاحب، خدا کے فضل و کرم، اپنی عقل اور علامہ گرگٹ کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے ہم "صاحب تصنیف" ہو گئے علامہ کے مشورے کے مطابق اردو کے مشہور رسائل کو دو دو جلدیں تبصرہ کے لئے ارسال کر دی گئی ہیں۔ نامور اہل قلم حضرات کی خدمت میں تحفتاً ایک ایک جلد بھیجی گئی ہے۔ مشہور بک اسٹالوں پر بھی برائے نمونہ ایک ایک جلد روانہ کر دی گئی ہے اگرچہ اس واقعہ کو ایک سال گزر چکا ہے لیکن ہم اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں جب ہمارے "نام" اور ہماری "کتاب" کا پورے ملک میں چرچا ہوگا۔ بک اسٹالوں سے آرڈر کا تانتا لگ جائے گا اور اکادمی، انجمن اور دوسرے علمی اور ادبی اداروں کی رکنیت اور دعوت ناموں پر ہمارا بھی حق ہو جائے گا ــــ اور اس دن کا انتظار ہم سے زیادہ ہماری بیگم کو ہے کیوں کہ ہم نے کتاب کے منافع سے انھیں دوہرے زیور بنانے کا وعدہ جو کیا ہے

مہیلؔ لکھنوی

دلدل میں خر

جو آگے جائیں
تو
لوہے کے بنے جاتے ہیں
جو مُڑ کے دیکھیں
تو
پتھر کے ہوئے جاتے ہیں
کہیں جو ٹھہریں
تو
دلدل میں روندے جاتے ہیں
نہ زندگی کو ہتھیلی لینے ہی کا یارا ہے
نہ زندگی ہمیں کھا جائے یہ گوارا ہے
عجیب مخمصے میں حال اب ہمارا ہے
کسی جہت نہ کسی سمت کچھ اشارا ہے
قطب نما نے کہاں لا کے ہم کو مارا ہے

روٹیاں

کیا کیا نہ اپنا جال بچھاتی ہیں روٹیاں
مفلس کا ناچ روز نچاتی ہیں روٹیاں

آدم اسی کی چاہ میں نکلے بہشت سے
ماضی کی داستان کو سناتی ہیں روٹیاں

چاہیں تو یہ سکون کی دولت کو چھین لیں
ہر ایک گھر میں آگ لگاتی ہیں روٹیاں

بیٹے کو اپنے باپ سے کردیں یہ منحرف
بیٹی کو پیاری ماں سے چھڑاتی ہیں روٹیاں

ساری ہما ہمی اسی روٹی کے دم سے ہے
ہر انجمن میں رنگ جماتی ہیں روٹیاں

روکھی ہوں یا کہ سوکھی ہوں اس سے غرض نہیں
ہر حال میں غریب کو بھاتی ہیں روٹیاں

فکرِ معاش ہی کی ضرورت نہیں کلیم
ہر روز گھر میں غیب سے آتی ہیں روٹیاں

غزل

ہوئی ہے [illegible] ندامت ہی ساتھ کر کے مجھے
ملے ہیں دوست کئی گھاٹ کے نہ گھر کے مجھے

اُدھار بنئے کا گھر کردی چکے عدو پتے
یہ تحفے دے گئے ابا حضور مر کے مجھے

ابھی انڈیل دو تھالی میں سارے گوشت پلا[illegible]
یہ علم ہے کہ کھلاؤ شہر شہر کے مجھے

میں خود نہ آیا جوا کھیلنے سپاہی ج[illegible]
مرے رقیبوں کی سازش تھی لائے مر کے [illegible]

ضرور ہے میری تنخواہ کی خبر ان [illegible]
دکھانے پیار چلی ہیں وہ بن سنور کے [illegible]

ہے کھونج دوست کا [illegible]
سلام کرنے چلے کا [illegible] آ کے [illegible]

*

انتظار حسین

واہ حیدرآباد، واہ حیدرآباد — ہنستے لوگ مسکراتا شہر

آہ حیدرآباد۔ واہ حیدرآباد۔ آہ پرانے حساب سے واہ نئے حساب سے یہ شہر خاک و خون میں لوٹ کر پھر بھی اٹھا ہے۔ نقشہ اس قدر آباد ہو جس قدر پہلے تھا۔ مگر محفلوں مجلسوں میں اب بھی بہت رونق نظر آتی ہے۔ ہم شہر میں داخل ہوئے تو یوں لگا کہ شہر قہقہہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایک محفل آراستہ دیکھی۔ ہزاروں کا مجمع۔ اندر آدمی باہر آدمی۔ اور سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں ہم نے پوچھا کہ بھائی یہ کیسی محفل ہے۔ جواب ملا کہ یہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا جلسہ ہے۔ لطیفہ گوئی کی محفل ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد ہم چونکے ہم تو بس زندہ دلانِ پنجاب سے متعارف چلے آتے تھے۔ یہاں آ کر کھلا کہ حیدرآباد والے بھی زندہ دلی کے مدعی ہیں ——— خیر یہ تو لطیفہ گوئی کی محفل تھی۔ مگر جب اگلے دن زندہ دلانِ حیدرآباد کی طنز و مزاح کانفرنس شروع ہوئی تو وہاں بھی مجمع کم تو نہیں تھا۔ یہ عجب شہر ہے جہاں نثر سننے کے لئے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں ؛ پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

یہ اب سے زمانہ پہلے ملا وجہی نے کہا تھا۔ مگر بات آج بھی اچھی خاصی صحیح نظر آتی ہے۔ کیا کیا فاضل گزر گیا کیسا کیسا فاضل آج بھی موجود ہے۔ سالار جنگ میوزیم میں قدم رکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ ایک شخص کے جمع کئے ہوئے نوادرات ہیں جنھیں سجا کر رکھا گیا تو ہندوستان کے بڑے سے بڑے میوزیم کے مقابلہ کا میوزیم آراستہ ہو گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں امراء و رؤسا آگے بھی اسی تماش کے ہوا کرتے تھے۔ جیسے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ علم و فضل کی اپنی روایت سے بے خبر فنونِ لطیفہ سے دور ——— اسی شہر میں ادارۂ ادبیات اردو بھی ہے جس کی داغ بیل ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ڈالی تھی مخطوطات و نوادرات کی ایک دولت اس نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہے علی یاور جنگ کی بھانجی طیبہ بیگم نے یہاں اپنے شہر کے ایک غریب مہمان کی خاطر ایک محفلِ موسیقی آراستہ کی تھی جس میں قلی قطب شاہ سے لے کر میر و سودا تک کا کلام سنایا گیا ——— اسی محفل میں ہم نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ سر سفید ڈاڑھی سفید تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ یہ اکبر علی خاں ہیں یو پی اور اڑیسہ کے سابق گورنر کیا ٹھسا پایا ہے کہ جے پرکاش نرائن سے ایک نجی ملاقات پر کسی نے انگشت نمائی کی۔ انھوں نے اپنا استعفا داغ دیا اور گورنری سے دامن جھاڑ کر حیدرآباد آن بیٹھے۔ اب یہاں مختلف علمی ادبی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں اور مطمئن ہیں۔

اور اسی شہر میں ایک بزرگ مولوی حبیب الرحمٰن ہیں۔ بزرگ صورت سر پہ ترکی ٹوپی۔ حیدرآباد کی ریاست پر جب زوال آیا تو انجمن ترقی اردو پر بھی زوال آیا۔ انھوں نے اپنی بہت سی جائیداد انجمن کے لیے وقف کر دی۔ اب انجمن پھر زندہ ہے۔ اس کے انتظام میں دو کالج چل رہے ہیں۔ سراج بہادر گوڑ اس کے سکریٹری ہیں ——— افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو، عوض سعید، نقادوں میں ڈاکٹر مغنی تبسم، مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین۔ مگر یہاں مزاح نگار کون نہیں ہے۔ جس بندے کو ٹھونکو بجاؤ وہی سے مزاح نگار نکلتا ہے۔ مگر اس روایت کا اس وقت نقطۂ عروج مجتبیٰ حسین ہیں۔ یہ ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پھر طنز و مزاح تو ان کے گھر کی لونڈیاں ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہاشم علی کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ کم از کم یہاں ہم طنز و مزاح سے بچے رہیں گے۔ مگر وہ بھی اندر سے مزاح نگار نکلے۔ اردو صحافت یہاں خوب پروان چڑھ رہی ہے اخباروں میں سیاست اپنی جگہ "رہنمائے دکن" اپنی جگہ سیاست کے ایڈیٹر عابد علی خاں صاحب ہیں۔ جو فالی ایڈیٹر نہیں۔ شہر کی ادبی اور تہذیبی زندگی کے بھی روحِ رواں ہیں انھی کی مہم کے نتیجے میں یہاں بلدیہ ہال تعمیر ہوا ہے جہاں بھری پری ادبی محفلیں ہوتی ہیں۔ باہر سے کوئی مہمان آجائے تو یہاں اس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں۔

باقی گولکنڈہ کی اپنی کشش ہے قطب شاہیوں کے محلات اور مقبرے مل کر جنگل میں کیا یادہ جگاتا ہے حیدرآباد والے سب سے زیادہ قطب شاہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہی بھاگ متی کو یاد کرتے ہیں اور اس کے مزار پر میلہ لگاتے ہیں۔

شاعرِ پیشہ

[illegible] (ایم اے)

آئی ازل میں خلقتِ شاعر کی جب گھڑی　　عجلت میں لبی بن گئی کچھ اُس کی کھوپڑی
حور و ملک کی جیسے ہی اُس پر نظر پڑی　　کہنے لگے کہ تیز یہ مخلوق ہے بڑی

پر بدحواس سارے فسانہ نگار تھے
اپنا حریف جان کر سب سوگوار تھے

جب اُس میں جان آگئی تو اُٹھ کھڑا ہوا　　مفعول فاعلات کی دینے لگا صدا
آغاز شاعری کا کچھ اس طرح سے کیا　　نیچی نظر سے دیکھ کے بس مُسکرا دیا

ہر لمحہ واہ واہ کا وہ خواستگار تھا
اردو زباں میں شعر کا پروردگار تھا

پہلو میں رکھتا تھا وہ دھڑکتا ہوا بھی دل　　پارے کی طرح رہتا تھا بے چین مستقل
شل دیا سلائی وہ ہو ہو کے مشتعل　　گرمئ فکر شعر میں کرتا تھا منتقل

تاڑی شراب بھنگ کا بھی شوق تھا اُسے
دل پھینک تھا تو عشق کا بھی ذوق تھا اُسے

حوروں پہ جب نظر پڑی وہ تلملا گیا　　دو گھونٹ پی کے کہنے لگا بے مزہ ہوا
پارٹنر جو ساتھ ہوتی تو آجاتا پھر مزا　　تخلیق کر کے میری اکیلا ہی کیوں رکھا؟

پھر سوچنے لگا کہ یہاں اور بھی ضرور
تاروں سے آگے ہوگا جہاں اور بھی ضرور

دوزخ کی آگ اُس کو نہ مطلق ڈرا سکی　　جنّت کی بھی ہوا نہ اُسے راس آسکی
ناصح کی بات اُس کو نہ اپنا بنا سکی　　عقل اُس کے سامنے نہ کبھی راہ پا سکی

بستی پہ جب نگاہ پڑی وہ اُچھل پڑا
سَو نعمتوں سے کم نہ تھا تاڑی کا اک گھڑا

ملتا گیا جو آب تخیل کی فصل کو　　بالیدگی نصیب ہوئی نقل و اصل کو
درد و الم کو، عشق و ہوس ہجر و وصل کو　　ہوتا رہا فروغ سخن ور کی نسل کو

دنیا ہے دنگ سارے فرشتوں کو رشک ہے
مایوسی کا رقیبوں کی آنکھوں میں اشک ہے

زندہ ہے آج بھی وہ اسی آن و بان سے　　فکرِ سخن میں غرق ہے وہ جی سے جان سے
جاتا مشاعروں میں ہے کچھ ایسی شان سے　　جیسے کہ تیر چھوٹ رہا ہو کمان سے

حسن و ادا کی چاہ میں وہ تشنہ کام ہے

(پانچویں قسط)

یداللہ مہدی

...آباد

...ال

...درآباد

..کم۔ ریلیف تاثر)

بھوپال شہر میں برقی "بریک ڈاؤن" روز مرہ کے معمولات میں شامل ہے۔ ہر علاقے کے "اوقات بند" الگ الگ مقرر ہیں۔ ہمارا ہوٹل جس علاقے میں پڑتا تھا وہاں بریک ڈاؤن کے اوقات دو حصوں میں تقسیم تھے۔ پہلا دور ساڑھے صبح تا نصف النہار اور دوسرا دور رات میں دو بجے سے صبح کا جھٹپٹا پھیلنے تک۔ شب غزل کا دور سے نظارہ کر کے ہوٹل لوٹنے تک خاصی رات ہو چکی تھی لہٰذا بستر پر دراز ہوتے ہی آنکھ لگ گئی لیکن زیادہ دیر تک لگی رہ نہ سکی کیونکہ معمول کے مطابق برقی رانی' اس علاقے سے روٹھ گئیں اور ان کے روٹھتے ہی نیند بھی روٹھ گئی۔ ساری رات روٹھی ہوئی نیند کو مناتے' مسکہ لگاتے' منتیں سماجتیں کرتے اور مسیح صاحب کے خراٹے سنتے بیت گئی۔ برقی بریک ڈاؤن کی اس "کل ہند دوڑ" میں چونکہ حیدرآباد بھی بھوپال سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے اس لئے مسیح صاحب برقی کی اس آنکھ مچولی کے عادی ہیں لہٰذا چین کی نیند سوتے رہے۔ البتہ میری آنکھ دوبارہ اس وقت لگی جب چھت میں لگے پنکھے پر مسلسل چار گھنٹے سے طاری جمود خدا خدا کر کے ٹوٹا۔

اگر مسیح صاحب مجھے نہ جگاتے تو شاید میں سوتا ہی رہ جاتا اور محفل طنز و مزاح میرے بغیر ہی کامیابی سے ٹھکانے لگ جاتی۔ میں نے جواباً موصوف کا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر' ان کے ہمراہ ایک بار پھر کام و دہن کی آزمائش کی غرض سے ڈائننگ ہال میں پہنچ گیا۔

ہم لوگ ناشتے کا انتظار کر رہے تھے کہ نفیس تابش صاحب فکر تونسوی صاحب کو اس طرح سنبھالے ہوئے ہال میں داخل ہوئے جیسے کچھ دیر کیلئے قسمت نے انہیں اپنی "امانت" عاریتاً سونپ دی ہو۔ ویسے بھی فکر تونسوی اردو کے اس مجاہد کا نام ہے جس نے اردو کے

طنزیہ ومزاحیہ ادب کو جو سرمایہ دیا ہے وہ یقیناً قوم کی امانت کے طور پر وراثتاً نسل در نسل منتقل ہوتا رہے گا — میں اور مسیح صاحب ایک ساتھ فکر جی کی پیشوائی کو آگے بڑھے، فکر جی نے مسیح صاحب کو اپنے گلے سے لگایا اور خود میرے گلے سے لگ گئے۔ پھر تابش صاحب سے انتہائی بے فکری کے ساتھ بولے۔ "آج کی محفل طنز ومزاح کی کامیابی کی ضمانت میں تمہیں ابھی سے دیئے دیتا ہوں — !" — تھوڑی ہی دیر میں ڈائننگ ہال قہقہوں کی آماجگاہ بن گیا۔ مسلسل قہقہوں کی یہ بازگشت، یوسف ناظم صاحب کو بھی اپنے کمرے سے ڈائننگ ہال میں کھینچ لائی۔ میں نے فکر جی کے لئے ناشتے کا آرڈر دیا تو بولے — "تم لوگ ناشتہ کرو، میرا پیٹ، کچھ تو پلین میں کئے گئے ناشتے سے اور کچھ "ایر ہوسٹس" کی مسکراہٹ سے بھرا ہوا ہے، یار یہ ایر ہوسٹس بھی کمال کی مخلوق ہوتی ہے، جب دیکھو مسکراتی رہتی ہے۔ پلین ہوائی اڈے پر کھڑا ہو تب مسکراتی ہے، زمین اور آسمان کے بیچ معلق ہو تب بھی مسکراتی ہے، کوئی پریشانی، کوئی دکھ اسکی مسکراہٹ کی 'والیوم' (Volume) کم نہیں کرتا، اپنا ہر درد، ہر تکلیف دل میں چھپائے بس مسکرائے جاتی ہے — کاش ایر ہوسٹس کی یہ خالص مسکراہٹ، اس قدر طویل ہو جائے، اس قدر پھیل جائے کہ ہمارے دکھی سماج کو اپنی وسعتوں میں سمیٹ لے۔ پھر تو یہ خانہ خراب دنیا جو روز بہ روز تباہی و بربادی کے دہانے کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بھرے رہتے ہیں، پیار کرنے کے قابل ہو جائے گی — !!"

فکر تونسوی صاحب کے اندر چھپا ادیب، طنز نگار کالم نویس بولتا رہا، وقت پنکھ لگا کر اڑتا رہا۔ فکر جی کے ایک ایک لفظ میں وہ کاٹ تھی، وہ چبھن تھی، ایسے ایسے زوردار برقی جھٹکے تھے کہ اس روز روٹھی ہوئی برقی رانی بھی تڑپ کر، مچل کر، وقت سے پہلے ہی واپس آگئی۔ ناظم صاحب دوپہر کے کھانے پر کہیں مدعو تھے اس لئے روانہ ہو گئے۔ فکر جی بھی سفر سے تازہ تازہ آئے تھے، اسی لئے کافی تھکے ہوئے تھے چنانچہ انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ کر ہم دونوں ایک بار پھر دورے پر نکل پڑے — !

ارادہ تو تھا کہ ٹہلتے ٹہلاتے، بھٹکتے بھٹکاتے ممکن ہو سکا تو شفیقہ فرحت صاحبہ یا فضل جاوید کے دولت خانے پر پہنچ کر انہیں 'مشرف بہ ملاقات' کریں۔ شفیقہ صاحبہ کا مکمل پتہ ہمارے ساتھ نہیں تھا بس اتنا ہی علم تھا کہ وہ "پروفیسرز" کالونی میں رہتی ہیں۔ البتہ فضل جاوید کا پتہ ہمارے پاس تھا چنانچہ دو ایک مقامی حضرات سے اس سلسلے میں رجوع کیا لیکن جس طرح ہماری زبانی رہنمائی فرمائی گئی اس سے یہی اندازہ ہوا کہ یاروں نے کافی دور بسائی ہیں بستیاں۔ لہٰذا اپنے موجودہ دورے کو ایک بار پھر آس پاس کی گلیوں تک محدود رکھنا پڑا۔ البتہ اس راؤنڈ میں بھوپال کی جامع مسجد دیکھنے کا شرف ضرور حاصل ہوا۔

جامع مسجد دیکھتے ہوئے مجھے والد صاحب کی بات یاد آگئی — میں جب بھی کسی نئے شہر کا

پہلی بار قصد کرتا ہوں والد صاحب مجھے وہاں کے آثار قدیمہ اور تاریخی مقامات دیکھنے کی تاکید اتنی سختی سے نہیں کرتے جتنی کہ وہاں کی مسجدوں کو دیکھنے کی۔ اس تاکید میں دراصل یہ تنبیہ پوشیدہ ہوتی ہے کہ برخوردار! چاہے کہیں بھی جاؤ نماز کی طرف سے کبھی غافل مت ہونا۔ تاکید کا یہ جدید انداز میری جدت پسند طبیعت کو ہمیشہ اچھا لگا۔ چنانچہ جب انہیں میری بھوپال روانگی کا علم ہوا تو اپنی تاکید دہراتے ہوئے بھوپال کی "تاج المساجد" کی تاریخی حیثیت و اہمیت پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی کہ مجھے یوں لگا، تاج المساجد دیکھے بغیر بھوپال سے لوٹنا اپنے ایمان کو ادھورا لے کر لوٹنے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ جامع مسجد، دیکھتے ہوئے میں نے یہ تہیہ کیا کہ اگلے روز کے بھوپال درشن کی بسم اللہ تاج المساجد ہی سے کروں گا۔

بھوپال کی جامع مسجد اگرچہ حیدرآباد کی مکہ مسجد جتنی وسیع و عریض نہیں ہے۔ تاہم خوبصورتی میں مکہ مسجد سے کم نہیں۔ جامع مسجد سے نکل کر ہم دوبارہ ہوٹل پہنچے جو جامع مسجد ہی کے زیر سایہ خرابات کی صورت موجود تھا، کیونکہ ایک عدد "بار" بھی اس کے گلے کا ہار تھا ـــــ !!!

ـــ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے فکر جی کی خیر خبر لینے کی غرض سے ان کے کمرے میں پہنچے۔ موصوف اس وقت اپنے مضمون کی نوک پلک درست کرنے میں منہمک تھے۔ میرے حساب سے یک ادیب پر دو وقت بڑے بھاری ہوتے ہیں ایک وہ وقت جب مضامین غیب سے خیال کی طرف اپنی باگ موڑتے ہیں یعنی ادیب "نزول" کی صبر آزما کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ اور دوسرا بھاری وقت وہ ہوتا ہے جب ایک ادیب خود کو فرشتہ تصور کرتے ہوئے اپنے ہی لکھے پر گرفت کرتا ہے۔ یعنی خود تنقیدی کے سنگین عمل سے خود کو گزارتا ہے ـــ اور اس وقت فکر جی خود کو موخرالذکر مرحلے سے گزار رہے تھے، اس لئے ہم نے مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور لوٹنے کیلئے پر تولے ہی تھے کہ فکر جی کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔ "جب آ ہی گئے ہو تو خالی کیوں لوٹتے ہو، آؤ بیٹھو۔ میں تو ایسے ہی خالی بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگا تو سوچا چلو اپنے ہی مضمون سے جی بہلا کر دیکھیں، مگر یار آج پتہ چلا کہ اپنا ہی لکھا، پڑھنا، دنیا کا سب سے تکلیف دہ عمل ہے۔"

مسیح صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "فکر بھائی یہ صرف آپ کا انفرادی کرب نہیں بلکہ آج اردو کا ہر ادیب و شاعر اس تکلیف دہ عمل سے دوچار ہے۔ دراصل پچھلے چند برسوں میں اردو قارئین کی تعداد اس قدر انحطاط کو پہنچ چکی ہے کہ ہر ادیب خود اپنا لکھا پڑھنے پر مجبور ہو گیا ہے یہاں تک کہ اس کی اپنی اولاد بھی اس کا لکھا اس وقت تک نہیں پڑھ سکتی جب تک کہ اس کی تخلیقات اردو سے کسی اور مقامی زبان میں منتقل نہیں ہو جاتیں۔ زبانوں کے انتقال کی یہ کہانی بڑی

پرانی ہے لیکن "انتقالِ اُردو" کا یہ کرب
سب سے جدا ہے، اُردو کو کندھا دینے والوں میں
بدقسمتی سے خود اُردو والے ہی پیش پیش ہیں۔!"
مسیح صاحب یوں بھی اپنے حلیے بشرے سے کافی
سنجیدہ اور بُردبار نظر آتے ہیں لیکن جب خود پر
"زائد از نصاب" سنجیدگی طاری کر لیتے ہیں تب
معصوم علامہ راشد الخیری کا کوئی روتا بسورتا
کردار نظر آنے لگتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ
موصوف کسی انتہائی اداس اور مایوس کردار کے
روپ میں پوری طرح ڈھل جاتے، ایک اجنبی کردار
اچانک کمرے میں داخل ہوا اور "کوئیک مارچ"
کرتا ہوا سیدھے فکر جی کے روبرو پہنچ کر گویا ہوا
"آج کے اخبار میں جیسے ہی آپ کا نام پڑھا آپ
سے ملنے کی تمنا جو چنگاری کی صورت برسوں سے
دبی ہوئی تھی بھڑک کر شعلہ بن گئی چنانچہ اِدھر
اُدھر، جہاں تہاں، آپ کو ڈھونڈتا ہوا پورے
چھبیس [۲۶] کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے بالآخر
آپ تک پہنچ ہی گیا۔!" اس تمہید کے ساتھ
اجنبی کردار نے بے تکلفی سے کرسی گھسیٹی اور فکر
جی کے دوبدو بیٹھ کر ان کی متحیر آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر پُراسرار انداز میں سوال داغا۔
"پہچانا۔؟" "اس مان نہ مان، میں تیرا
مہمان والے انداز پر فکر جی گمبھیر لہجے میں بولے۔
"پہچنوائیے۔!!" اجنبی کردار نے اپنی آواز کی
گھن گرج کو اور بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ "شاید
آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ خیر، امریکہ اور

کولمبس کا حوالہ تو آپ کو یاد ہوگا۔ کولمبس
کی بناء پر میرے ساتھ نہیں آسکا۔ فی الحا
اکیلا ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔" ا
علامتوں کے گورکھ دھندے سے لبالب
حوالے پر فکر جی نے بڑی بے بسی سے اس
کردار کی طرف دیکھا پھر باری باری ہمار
دیکھا۔ اتنے بے بس تو مسیح صاحب
گفتگو سے بھی نہیں ہوئے تھے جس
نے اُردو قارئین کے صفحۂ ہستی سے غائب
والے اندوہناک مسئلے کو چھیڑا تھا۔
دوران میں اجنبی کردار عرف امریکہ نے
فائیل میں سے ایک عدد خط نکال کر
کے طور پر فکر جی کے حوالے کیا جس کا
آخر مطالعہ کرنے کے بعد فکر جی اس طر
بیٹھ گئے جیسے کہ وہ خط نہیں بلکہ وارن
ہو۔ میں چونکہ فکر جی کے قریب ہی بیٹھا
لئے ذرا سا جھک کر اس خط کی تحریر
تو حیرت زدہ رہ گیا، کیونکہ وہ خط خو
لکھا ہوا تھا، گویا یہ وارنٹ گرفتار
موصوف نے اپنے نام جاری کیا تھا
ہی خط کا مضمون بھانپتے ہی فکر جی
اور مکتوب الیہ کے احوال پوری طرح
چنانچہ اجنبی کردار عرف امریکہ المتخلص
الیہ کے بارے میں فرمایا۔ "یہ بڑے
ہیں بلکہ اپنی واحد ذات میں رستم ہ
سہراب بھی کیونکہ استاد شاعروں

شاعروں تک سبھی کے اردو اشعار کو ردیف قافیے بحر، وزن تمام جزئیات کے ساتھ انگریزی زبان میں منتقل کر دیتے ہیں، اس پر کمال یہ کہ شعر چاہے کتنا ہی سنجیدہ ہو یا رنجیدہ، اسے ہیومر (Humour) کا ایسا ٹچ (Touch) عطا کرتے ہیں کہ روتے بسورتے شعر بھی قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" ان تعارفی کلمات کے ساتھ ککر جی نے شاعر موصوف کو گویا لائٹ کلیر کا اشارہ دے دیا کہ چل جمورے شروع ہو جا۔ چنانچہ حضرت اریکہ جن کا نام میں بغیر کسی مصلحت کے صیغۂ راز میں رکھ رہا ہوں، یہ شروع ہو گئے۔ میرؔ غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، غرض تمام کے تمام چوٹی کے شاعروں کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر "مشرف بہ عیسائیت" کر کے رکھ دیا۔ نمونے کے لئے یہاں صرف دو شعر مع موصوف کے ترجمے کے پیش ہیں۔ پہلا شعر ملاحظہ فرمائیے جو سننے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ بقول مترجم، اس میں ایکشن پچھتر فیصدی اور پچیس فیصدی، ری ایکشن (Reaction) ہے۔

پہلے اُردو لباس میں شعر دیکھئے ؎

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے
اور کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

اب ترجمہ ملاحظہ فرمائیے ؎

HOW HOW, WHO, WHO
WHO WHO, HOW. HOW

اب دوسرا شعر دیکھئے۔ پہلے اُردو میں ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

اب اس کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے اور دُھنیے ؎

'ou ZAHID, Let me Drink wine in-
-the Mosque
Or show me that place which is
-minus god

گرمی چاہے بھوپال کی ہو، حیدرآباد کی یا بمبئی کی، انسانی ذہنوں پر اپنے مضر اثرات یکساں مرتب کرتی ہے، چنانچہ چلچلاتی دھوپ میں چیل انڈا چھوڑ رہی تھی اور اندر مترجم شاعر صاحب، اردو اشعار کے انڈے توڑ کر انہیں پھینٹ کر انگریزی میں ان کے آملیٹ بنائے چلے جا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی شاعر موصوف نے پورے چھبیس کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے یہاں تک پہنچنے کی جو بات کہی تھی اس کی سچائی کا اس وقت تو یقین نہیں آیا تھا لیکن اب آ گیا بلکہ گمان یہ ہونے لگا کہ فاصلے کے تعلق سے موصوف نے بڑی کسر نفسی سے کام لیا تھا، جب کہ ان کے شاعرانہ ترجموں کی رفتار اور معیار کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا، موصوف اس چلچلاتی دھوپ میں چھبیس کلومیٹر سے کہیں زیادہ فاصلہ طے کر کے آئے ہیں ـــ !!!

مئے گشتیوں، خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں بالآخر دن تمام ہوا۔ شام نے اپنے پنکھ پھیلائے

اور دیکھتے ہی دیکھتے آزمائش کی وہ گھڑی آگئی جو ہمیں ایک ہزار کلومیٹر دور سے یہاں کھینچ لائی تھی ــ جس وقت ہم لوگ بھوپال کے ثقافتی مرکز "ٹیگور بھون" پہنچے، اگلی صفیں بھر چکی تھیں، یعنی ہال کا اگلا حصہ "ہاوز فل" ہوچکا تھا البتہ پچھلی نشستوں پر "ہاوز گل" کا بورڈ لگا تھا۔ "اردو میڈیم" کی ادبی نشستوں میں اگلی صفوں کا بھر جانا ہی دم غنیمت سمجھا جاتا ہے پچھلی نشستوں کا اہتمام تو محض اس خیال سے کیا جاتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بے گھر، بے در اردو کے حال پر ترس آجائے اور اردو سامعین و قارئین کی بے حسی اور بے رخی کو دیکھتے ہوئے اس زبان کی لاج رکھنے کے لئے فرشتوں کی جماعت کو بھیج دے۔ اردو والے یوں بھی اپنے ہر مسئلے کے حل کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنے کے عادی ہیں۔ کسی غیبی "امداد" کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھنا "غیروں" کی طرف دیکھنے سے بہرحال بہتر ہے ـــ!

فضل جاوید سے ہال میں ہی ملاقات ہوئی وہ بھی اس حال میں کہ موصوف ہم سے زیادہ "مہمان" دکھائی دے رہے تھے۔ جب اس سلسلے میں ان سے استفسار کیا گیا کہ پچھلے بیس سال سے آپ جس شہر میں مستقل مقیم ہیں وہاں اچانک ایسا کون سا "سانحہ" پیش آیا جو آپ خود کو "مہمان" پوز کرنے پر مجبور ہوگئے۔ تو جواب میں جاوید نے فرمایا۔ "کیا بتاؤں یارو، جب سے مجھے یہ خبر ملی ہے کہ میرا تبادلہ حیدرآباد ہوگیا ہے تب سے اپنے آپ کو بھوپال میں مہمان سمجھنے لگا ہوں۔ اب یہی دیکھو، اتنے دنوں سے اس پروگرام کی تیاریاں ہورہی ہیں لیکن مجھے اس کی خبر آج ہی ہوئی۔ اتفاق سے اگر آج کا اخبار میری نظر سے نہیں گزرتا تو میں شاید ہی یہاں پہنچ پاتا۔" موصوف کے اس انکشاف پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا ہم نے ان کے دولت خانے کا رخ نہیں کیا ورنہ یہ تو خود کو مسلمہ طور پر مہمان تصور کر ہی چکے ہیں، ایسی صورت میں ظاہر ہے "میزبانی" کے فرائض ہمیں ہی انجام دینے پڑتے۔

دعوت ناموں پر، پروگرام کا جو وقت دیا گیا تھا اس میں ابھی کچھ دیر تھی لیکن پروگرام کے کنوینر جناب اجلال مجید نے اس ڈر سے پروگرام کے آغاز کا اعلان کر دیا کہ وہ سامعین جو غلطی سے وقت سے ذرا پہلے تشریف لے آئے تھے کہیں بے چین ہوکر واپس نہ لوٹ جائیں۔ دعوت ناموں کے مطابق محفل کی صدارت عالی جناب علی سردار جعفری صاحب فرمانے والے تھے لیکن عالی جناب چونکہ خرابیٔ صحت کے باعث بمبئی سے تشریف نہیں لا سکے تھے، اس لئے آخری وقت میں نہ صرف یہ کہ صدارت میں تبدیلی کرنی پڑی بلکہ اگلے روز منعقد ہونے والی انعامی تقریب التوا کا بھی فیصلہ کرنا پڑا کہ اس تقریب کے مہمان خصوصی بھی موصوف ہی تھے۔ جب آ

نامور شاعر یا ادیب ہوجاتا ہے تو اس کی "خرابی صحت" صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ دور دراز کے علاقوں کی ادبی فضاء کو بھی خاصا متاثر کرتی ہے۔ اگر بمبئی میں اسے چھینک آتی ہے تو اسکی چھینک اور دھمک دوسرے شہروں میں سنائی دیتی ہے بلکہ ان علاقوں میں رہنے بسنے والے اس کے مداحوں کی "ناک" بہنے لگتی ہے
آخری وقت میں محفل کی صدارت کا قرعہ فال کشمیری شاعر جناب غلام نبی خیال کے نام نکلا جو کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ان دنوں بھوپال تشریف لائے ہوئے تھے۔ صدر صاحب کے بعد تمام مہمان ومیزبان مزاح نگاروں کے ناموں کا یکے بعد دیگرے اعلان کیا گیا۔ ہم سبھی دھڑکتے دل اور سہمے تلے قدموں کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھے جہاں خالص ہندوستانی اسٹائیل کی "فرشی نشست" کا اہتمام کیا گیا تھا۔ فرشی نشستوں میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں علاحدہ سے کوئی مسند صدارت نہیں ہوتی بلکہ ساری کی ساری نشست پر "مسند صدارت" کا گمان ہوتا ہے اور ٹیگور بھون کی مسند صدارت تو اس قدر وسیع و عریض تھی کہ اکیلا صدر بے چارا لیٹ کر بھی اسے پُر نہیں کرسکتا تھا لہٰذا ہم سب نے مل کر اس کام میں صدر کا ہاتھ بٹایا۔ بالفاظ دیگر "مسند صدارت" بٹائی ـــــ ۔

پروگرام کا آغاز مقامی مزاح نگار جناب مصطفیٰ تاج کے مضمون سے ہوا جس کا عنوان تھا "پوسٹر"۔ مضمون نہایت ہی رواں اور شگفتہ تھا، جس میں جابجا مقامی زبان کی چاشنی بھی بکھری ہوئی تھی جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے اور مضمون نگار اپنا "پوسٹر" سامعین کے ذہنوں پر چسپاں کرکے کامیاب وکامران اپنی نشست پر واپس لوٹے۔ اب مائیک پر پہنچے فضل جاوید صاحب جن کا تعارف "میزبان" مزاح نگار کی حیثیت سے کروایا گیا لیکن موصوف چونکہ بھوپال سے حیدرآباد تبادلے کے پیش نظر خود کو مہمان تصور کرچکے تھے اس لئے جو مضمون پیش کیا اتفاق سے مہمانوں سے متعلق تھا۔ عنوان تھا "ہمارے بس کی بات نہیں مہمان نوازی" مضمون کو کافی سراہا گیا۔
ان کے بعد بھوپال کے کہنہ مشق اور بزرگ مزاح نویس جناب جہاں قدر چغتائی مائیک پر تشریف لائے اور اپنا پُرمزاح مضمون شروع کیا جس کا عنوان تھا "العذاب الیبھل"۔ اس "عربی النسل" عنوان پر مجھے گلابی اُردو کے خالق ملا رموزی کے ایک مضمون کا عنوان یاد آگیا جس میں مرحوم نے بڑی ہی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ ایک عربی آیت پر اُردو "مصرع" پہنچایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوگیا زندگی سے جی بیزار
وقنا ربنا عذاب النار

چغتائی صاحب میزبان مزاح نگاروں کی "کیمپ" کے آخری مضمون نگار تھے۔ ان کے بعد مہمان مزاح نگاروں کا دور شروع ہوا ۔ ــ ــ

(باقی آئندہ)

غزلیں

ڈاکٹر عزیز الرحمٰن

"رازِ نہاں ہمارا"

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"
پر کون جانتا ہے "رازِ نہاں" ہمارا

رہبر کے بھیس میں ہے رہزن یہاں ہر اک شخص
لیڈر بنا ہوا ہے خورد و کلاں ہمارا

ہوتا ہے جب الکشن لٹتی ہے خوب دولت
نوٹوں پہ چل رہا ہے یہ کارواں ہمارا

کوٹھی میں پل رہے ہیں جن کی ہزاروں غنڈے
"وہ منتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا"

فلمیں جو سب سے ردی آتی ہیں ہر کہیں
گاتا ہے ان کا گانا ہر نوجواں ہمارا

ڈمپل کپاڈیا کی تصویر جب سے آئی
کرتا ہے جان قرباں پیرِ مغاں ہمارا

عالم پہ چھا رہا ہے سحرِ عزیز ہر سو
مشتاق ہو رہا ہے سارا جہاں ہمارا

محبوب مانجھومی

وہ ہیں کتنے پانی میں ہم جانتے ہیں
اُنھیں پھر بھی ہم محترم جانتے ہیں

ہمیں اُن کے نادر کی پروا نہیں ہے
وہ ڈھائیں گے کیا کیا ستم جانتے ہیں

تمہیں خاک معلوم ہے ان کی فطرت
یہ بیگم ہماری ہیں، ہم جانتے ہیں

خبر سارے لوگوں کی رکھتی ہے مجھ کو
یہاں لوگ مجھ کو ہی کم جانتے ہیں

وہ TOPIC ہی کیوں چھیڑتے ہو کہ جس کو
نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں

ہتھیلی میں جنت دکھا دیں گے تم کو
یہ فن قبلۂ محترم جانتے ہیں

تعجب ہے محبوب گھر کے یہ لڑکے
مدرسنگ ہی اپنی کم جانتے ہیں

کرکٹ بتیادی

سمجھتے ہیں منتر رنگ میں بس جنگ ہے
"فرکشن" نام ہے اپنا فساد و جنگ

سو ہم جب سے آئے ہیں سیاست کے
رقیبانِ سیاست کی لنگوٹی تنگ ہے

ہمیں ہیں جو عبث دُکھتی رگوں پر ہاتھ
رقیبِ روسیہ تم سے نہیں ہے تنگ

نئی بیگم قیامت بن کے جب سے گھر
خدا شاہد پرانی اہلیہ کو جنگ ہے

بجائے لاکھ طبلہ اور ڈھولک خواہ
دیارِ یار میں تو شہرتِ مردنگ

جو ابجد سے نہیں واقف وہی کہتے
نوب کے دائروں میں وسعتِ

رئیسِ شہر کے دربار میں آئے
ذرا دیکھو نظر آتے سراپا دنگ

ذرا سوچو کرکٹ ہوتے تو بتیا نہیں
کہ بزمِ شاعری میں رنگ اور آہنگ

گونگا بہرا ٹیلی فون

مانا کہ ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ غیر ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور ہمیں اپنی دال بھاجی پر قناعت کرنی چاہیئے کیوں کہ یہی حب الوطنی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر سچویشن ایسی ہو کہ کوئی غیر ملکی دوست آپ کی انگلیوں کو حیرت سے تک رہا ہو جن میں سے ٹیلی فون کا ڈائیل گھماتے گھماتے خون ٹپکنے لگا ہو۔ تو پھر کہاں تک یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے غیر ملکی دوست کے سامنے کھسیانے پن میں ملک کی عزت رکھنے کی خاطر کہیں کہ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ ورنہ عام طور پر تو دس پندرہ منٹ میں ڈائل کرنے کے بعد لوکل نمبر مل جایا کرتے ہیں۔ اور وہ کم بخت طنزیہ انداز میں مسکراتا رہے جیسے کہہ رہا ہو۔ کئے جاؤ کوشش میرے دوستو۔!!

میرے غیر ملکی دوست نے جو کسی قدر ہندوستان دشمن رویہ کا مظاہرہ جا و بے جا کرتا ہی رہتا تھا۔ کہا کہ اگر میرا کتا بیمار ہو۔ اور میں ڈاکٹر کو فون کرتا رہوں اور ایسا واقعہ ہو جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور میرا کتا مر جائے۔ تو میں ٹیلی فون والوں سے ہزاروں ڈالر ہرجانہ وصول کر لوں؟

اب میں اس مسخرے کو کیسے سمجھاتا کہ ہرجانے جیسی لعنتوں کا سہارا ہمارے پیارے ملک میں کوئی وجود نہیں ہے۔ ہم اسکوٹر چلاتے چلاتے۔ اندھیری سڑک پہ سپیڈ بریکرز کے عنوان سے جگہ جگہ بنائے ہوئے پہاڑی سلسلوں پر اچھل کے گرتے ہیں۔ یا کھلے مین ہول میں گر جاتے ہیں اور گردن تڑوا کے، دم توڑ دیتے ہیں اور ہمارے متعلقین تجہیز و تکفین، فاتحہ سوم اور چہلم وغیرہ وغیرہ جیسی دلچسپ مصروفیتوں میں بلا چون و چرا لگ جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار یہ ہوتا ہے کہ کلیم الدین کلیم یا ایسے ہی کوئی صاحب جو مُراسلوں کے کالم میں اپنا نام دیکھنے کو اپنی ادبی اور صحافتی مصروفیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ کھلے مین ہول، غیر متوقع سپیڈ بریکرز۔ یا بغیر لائٹ کے کھمبوں کے خلاف ایک مراسلہ جناب ایڈیٹر صاحب کے نام لکھ کے چھپوا لیتے ہیں۔ ہرجانے ورجانے کے چکر میں جانے کی ہم کو فرصت نہیں ہے۔ بہرحال۔ بات ٹیلی فون سے شروع ہوئی تھی اور بات جیسے

مجھے نہایت مشتعل کیا ہے وہ دراصل فلمز ڈویژن کی وہ چھوٹی سی غیر ضروری فلم ہے جس میں ہم عوام پر ٹیلی کمیونی کیشنز کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں دوست دوست کو۔ دشمن، دشمن کو، ڈاکٹر، کیمسٹ کو۔ آپ مجھ کو۔ میں آپ کو۔ جب چاہیں جس وقت چاہیں مسلسل ٹیلی فون کرتے دکھائے گئے ہیں۔ عام ہندوستانی فلموں میں ہیرو کے تاڑی کا پیڑ سے کودنے۔ دس دس آدمیوں کو پیٹ ڈالنے اور ٹرین کی چھت پر ناچنے گانے کو تو کسی حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے کہ یہ سچویشن "اَن نیچرل" ہونے کے باوجود تفریح کا سامان فراہم کردیتی ہے۔ لیکن ٹیلی فون کے کنکشن کا ڈائیل کرتے ہی مل جانا ایسا خطرناک قسم کا غیر فطری اسٹنٹ ہے کہ اسے برداشت کرنا مشکل ہے۔

یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ آپ ڈائیل کریں "ٹوٹوٹو ٹوٹوٹو" جواب ملے گا "ٹوں ٹوں ٹوں ٹوں ٹوں ٹوں" پھر جب گھنٹوں یہی مذاق سنتے سنتے زندگی گزر جائے تو دہائی دینے کے لئے ڈائیل کیجئے۔ "دن نائن نائن" گھنٹی کبھی کبھی بجے گی۔ اور بجتی رہے گی اور پھر کبھی کبھار اگر قسمت مہربان ہوئی تو وہ خاتون محترم توجہ دیں گی جنھیں آپ جیسے بھٹکتے ہوؤں کو منزل تک پہنچانے کی تنخواہ ملتی ہے۔ اپنا نمبر دیجئے۔ تو وہ کچھ کھٹ پٹ کرکے بولیں گی! "THE LINE IS FAULTY – I AM REPORTNG!"

کلک — ان بیچاری کے قبضہ میں اس سے زیادہ کچھ ہے بھی نہیں کہ آپ کے کشکول میں ڈالیں۔ وہ تو ظاہر ہے کہ اپنی ٹیلیفون آپریٹر سے پھر اپنے بچہ کی عادتوں کے متعلق تبادلۂ خیال میں لگ گئی ہوں گی۔ لیکن اب آپ اپنے دوست کو وہ خبر کیسے سنائیں گے جو "فوری" نوعیت کی ہے؟ صبر کیجئے۔ کہ صبر ہم ہندوستانیوں کا بنیادی وصف ہے۔ لیکن اسے فلمز ڈویژن والو۔ کیوں ہم سے جھوٹی باتیں کرکے ہمارا منہ کھلواتے ہو!!

OO

سیکولرزم کے تصوّر اور مفہوم کی وسعتوں کا احاطہ کرنے والی

جناب چندر سری واستو کی دوسری تصنیف

مُسلمان اور سیکولر دھارا شائع ہوچکی ہے

قیمت: ۳۵ روپئے

ملنے کا پتہ: ● حسامی بکڈپو مچھلی کمان

● یوسف بک اسٹال چادرگھاٹ۔

غزلیں

وقتِ پیری ہے پارسا کہیئے

اسعد احمد مُجددی

بیکار نوجواں کو گھر، مال و زر ملے
اُدُہ دُعا کریں اُسے تگڑا سسر ملے

چھوں میں اُن سے آپکے وعدہ کیا ہوئے
بس نے لیا تھا دوٹ منسٹر اگر ملے

شوخ پہلوان ہے اور میں بہت نحیف
زش کا اب خیال ہے مگدر اگر ملے

نو لکھا ہے پوسٹ کے پیسے نہیں ہیں پاس
اہیر بھیجدوں گا کبوتر اگر ملے

دوستوں کو اسعدِ گم گشتہ کی تلاش!
پتہ ہے کیسے وہ شوریدہ سر ملے

محمد رحیم الدین نیاز (کریمنگری)

چاہیئے دام کام کچھ بھی ہو
بن گیا ہوں غلام کچھ بھی ہو

مفت میں مل گئی سو کیا کم ہے
چیز "جائز" حرام کچھ بھی ہو

اپنے مطلب کی بات سُن لیجئے
باقی قصہ تمام کچھ بھی ہو

ہم بُلانے کو چھوٹا کرلیں گے
آپ کا اصلی نام کچھ بھی ہو

چار پیسے ہیں اُس کے پاس نیازؔ
ذات کچھ بھی ہو نام کچھ بھی ہو

ظفر کمالی

آپ غالبؔ کو گر چچا کہیئے
کیوں نہ اقبالؔ کو پتا کہیئے

آٹھ بچے ہیں آپ کو، آخر
کب رکے گا یہ سلسلہ کہیئے

لوگ فاقوں سے جب لگیں مرنے
اس کو مرنے کی اک وبا کہیئے

چور کہیئے شریف لوگوں کو
اور چوروں کو دیوتا کہیئے

اب گنہ کی نہیں رہی طاقت
وقتِ پیری ہے پارسا کہیئے

کیا بتاؤں کہ اس زمانے میں
زندگی کیا ہے اک سزا کہیئے

دورِ نو کے بشر کا ہے یہ خیال
مال و دولت کو ہی خدا کہیئے

تندرستی انسان کی اوّلین ضرورت ہے۔ اس کو دھیان میں رکھتے ہوئے منصوبہ کاری کرتے وقت صحت کی خدمات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ سن 2000ء تک سبھی کے لیے صحت کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔

ملک میں تقریباً ایک لاکھ 50 ہزار "صحت کارکن" پہلے ہی مقرر کیے جا چکے ہیں اور 55,000 سے بھی زائد ذیلی مراکز اور ابتدائی صحت مرکز کھول دیے گئے ہیں۔

بچے اور حاملہ عورتیں جلد امراض کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تندرستی کی مربوط نشوونما کی خدمات "شروع کی گئی ہیں جن کے اچھے نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

تنگ اور گندی بستیوں کے گھٹن اور سیلن آلود ماحول میں متعدد بیماریاں پنپنے لگتی ہیں۔ 1990ء تک ایسی بستیوں میں بسنے والے تین کروڑ لوگوں کو 20 نکاتی پروگرام کے تحت صاف ستھرا ماحول فراہم کرایا جائے گا۔

صحت مند شہریوں سے ہی صحت مند سماج تعمیر ہوتی ہے۔

تفصیلات کے لیے ذیل کا کوپن استعمال کیجیے۔

ڈپٹی ڈائریکٹر ماس میلنگ یونٹ،
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی،
"بی" بلاک، کستوربا گاندھی مارگ،
نئی دہلی۔ 110001

نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق مجھے تفصیلی معلومات اردو / انگریزی میں بھیجنے کی نوازش کریں۔

نام ______________

پتہ ______________

______________ پن کوڈ نمبر

نیا 20 نکاتی پروگرام

davp 83/107

خرافات

مراسلے

آپ نے جس محنت اور لگن سے "شگوفہ" کو جان عطا کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اردو میں مزاحیہ ادب کے فروغ میں یہ آپ کا زبردست کارنامہ ہے "شگوفہ" اپنے معیار اور مزاج کے لحاظ سے اردو کا واحد رسالہ ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد (مونگیر)

"شگوفہ" کا ہندوستانی طنز و مزاح نمبر کا اعلان باعث مسرت ہے۔ اس کے لئے میں آپکو پیشگی مبارکباد دیتا ہوں۔

اسمٰعیل آذر (کٹک)

محترم ایڈیٹر صاحب! تسلیم! جب کچھ کتابیں خریدنے کے لئے لائبریری گیا اور اچانک ماہ جولائی کے شگوفہ پر نظر پڑی۔ شعیب نگار کا کارٹون دیکھ کر خود بخود بے ساختہ مسکرا اٹھا پھر جب شگوفہ ہاتھ میں لیکر ورق گردانی کرتا رہا۔ بس اُسی وقت اُسے خرید کر گھر لے آیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے بس ایک ایسے ہی میگزین کی تلاش تھی جو طنز و مزاح سے بھرپور ہو۔ ورنہ ہر ماہ "بیسویں صدی" میں فکر صاحب کے ایک مضمون پر قناعت کرتا تھا۔ شگوفہ میرا ایک آئیڈیل میگزین ہے۔ ہر ماہ فکر صاحب یا مجتبیٰ حسین کا کسی ایک کا خاکہ ضرور شائع ہو تو بہت ہی اچھا رہے گا۔ **اقبال احمد خان (گلبرگہ)**

جون کا شمارہ زیر نظر ہے اس دفعہ کسی شکایت کی گنجائش نہیں ہے۔ اگلے ماہ سے زیادہ سنورا سجا رسالہ اپنے دامن میں مزاح کا خزانہ لئے ہوئے ہے۔ کتابت و طباعت بھی کافی شستہ نظر آرہی ہے۔ غزلوں کی تعداد قدرے کم ہے مگر دلچسپ اصطلاحات کے نام دینا کو جھنجوڑنے والا ہے۔ [illegible] عالم تاجپوری اور انور محمد یاس زیادہ پسند آئے۔ انشائیے بھی تعریف کے قابل ہیں۔ خوشی ہے کہ رسالہ دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہے ہمارے شہر میں رسالہ کی مانگ بڑھتی جارہی ہے۔

کریک بیتیاوی

محترمی و مکرمی! سلام خلوص! اس وقت طنز و مزاح کے میدان میں شگوفہ کے مقابل اور دوسرا پرچہ نہیں۔ شروع سے آخر تک پرچہ پڑھا۔ میمونہ وحید صاحبہ کا "مزاح کی تعریف"، شہناز کنول "آدمی دو کان" بانو سرتاج صاحبہ (کرائے کا مکان) پسند آئے انھیں مبارکباد پیش کر دیجئے اسی طرح حصہ نظم بھی کافی معیاری ہے۔ **مصطفیٰ اجمل (بالاپور)**

ماہ جولائی کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ خوب بہت خوب۔ پرویز ید اللہ مہدی کا سفرنامہ ایک تاریخی داستان سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد بھی بہت خوب ہیں۔ آپ کے میت یعنی سید مصطفیٰ تاج صاحب بھی آپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ شاعری کی دنیا میں بے کے معطر اسرار جامعی اور سراج نزلی کو پسند کیا گیا۔ قتیل شفائی کی معروف غزل کافی پسند آئی۔ **مرزا کھونچ (بیتیا)**

ماہ رواں (جون) کا شگوفہ ملا۔ بہت خوب ہے۔

پروفیسر ایس اے یم ہاشمی (بمبئی)

ممتاز مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے
مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

سمن زار

قیمت: [illegible] روپے * بتوسط "شگوفہ"

ہمیں اپنی
کامیابیوں پر
ناز کرنا چاہیے

ہم اپنی ضروریات کے لیے کافی اناج پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ بھارت آبادی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرا سب سے بڑا ملک ہے جسے اناج کی درآمد پر بھاری خرچ کرنا پڑتا تھا یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں۔

ہمارا شمار دُنیا کے صفِ اوّل کے صنعتی ممالک میں ہوتا ہے۔ ہم ہیئر پن سے لے کر کمپیوٹر تک اور سوئی سے لے کر انتہائی پیچیدہ مشینری اور آلات تک تیار کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں دُنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں (رُوس اور امریکہ کو چھوڑ کر) زیادہ تربیت یافتہ سائنسداں اور ٹیکنیشین موجود ہیں۔ بہت سے ملکوں میں ہماری امداد سے مشترکہ صنعتیں قائم کیے جا رہے ہیں۔

ان کامیابیوں سے ہمیں منجملہ انسیٹ اور بین الاقوامی پروگرام میں خلائی کاموں کو سرانجام دینے کی صلاحیت اور مہارت حاصل ہوئی ہے۔

ہم پُر اُمید مستقبل کی طرف
رواں ہیں
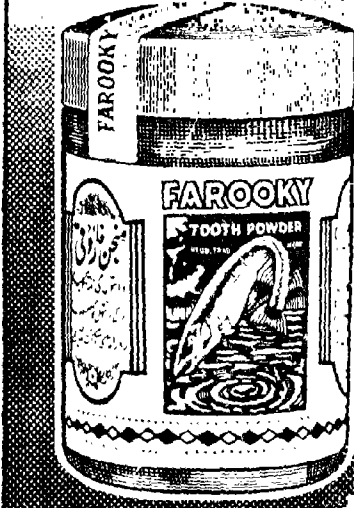
davp 83/150

FTP U2 77

دن بھر کی خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے

مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دھن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

ساختہ:
کارخانہ زندہ طلسمات ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۱۳

Courtesy - Deccan Chro

SEPTEMBER **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۶ ـــــ ستمبر ۱۹۸۳ء ـــــ شمارہ ۹

ایڈیٹر:

سیّد مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل:
شعیب

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

منیجر: سحیم جلیل

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۳۰ روپے، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

کتابت: محمود سلیم، عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان، حیدرآباد

خط وکتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۔ 1

ڈسٹری بیوٹرس، برائے :

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری، آگرہ
۳۔ پارکو، سری نگر
۴۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئیٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چیمپئن وہائٹ روٹس
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام
خریدنے کے لیے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان :

پُورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس
گلزار حوض
حیدرآباد ۔ ۲

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے فہرست

"سائیڈ سے چلئے"
اور
"در پردہ"
کے بعد
مزاح نگار
مسیح انجم
کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ

زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام
شائع ہو چکا ہے

خوبصورت سہ رنگی سرورق
پاکستان کے نامور کارٹونسٹ :
عزیز حیدرآبادی

قیمت :
(مجلد) بارہ روپیے

"شگوفہ" کا

"ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب

(حصۂ نثر)

• جنوری ۱۹۸۴ء

میں شایع ہوگا

اردو
ڈاکٹر محمد حسن - ڈاکٹر ظ - انصاری

ہندی
ڈاکٹر سریدھر مشرا
رتی لال شاہین

بنگالی
شانتی رنجن بھٹا چاریہ

مراٹھی
ڈاکٹر عبدالستار دلوی

گجراتی
ڈاکٹر سکینا جوہری

کشمیری
ڈاکٹر محمد زماں آزردہ

پنجابی
پروفیسر گرنام سنگھ تیر
پروفیسر راز سنتوک سری

انگریزی
ڈاکٹر ملک راج آنند
ڈاکٹر سید حامد حسین

تلگو
ڈاکٹر راما راؤ

کنڑی
حمید الماس

میتھلی
ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

سندھی
ڈاکٹر ارجن داس

اُڑیا
اسمٰعیل آذر

تامل
ایس - ایم - حیات

مہمان مدیر: یوسف ناظم

ساتھ میں بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے اور "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

رشید احمد صدیقی پطرس فرحت اللہ بیگ عظیم بیگ چغتائی شوکت تھانوی فرقت کاکوروی کنہیا لال کپور
کرشن چندر بھارت چند کھنہ فکر تونسوی احمد جمال پاشا یوسف ناظم مجتبیٰ حسین وجاہت علی سندیلوی
شفیقہ فرحت ۔ خواجہ عبدالغفور نریندر لوتھر رشید قریشی برق آشیانوی مسیح انجم پرویز یداللہ مہدی

★ حصۂ معلومات اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی

مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

قیمت: بیس روپے

شگوفہ: ۳۱ - مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ ۵۰۰۰۱

وجاہت علی سندیلوی

پک نِک

" تو آپ اگلے اتوار کو پک نک پر چل رہے ہیں؟"
"پک نک پر جانے سے ماحول تبدیل اور آب و ہوا تازہ ہو جاتی ہے۔"
" آنکھوں میں نور اور دل میں سرور آجاتا ہے۔"
" مہذب ممالک کے لوگ بلا ناغہ پکنک پر جاتے ہیں اور اس وجہ سے مہذب کہلاتے ہیں۔"
"پکنک پر جانے سے انسان قدرت سے بالفاظ دیگر خدا سے قریب ہوجاتا ہے۔"
"معدے میں کشادگی اور دماغ میں بالیدگی پیدا ہوجاتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ

ہر سوموار کو میرے دفتر پہونچتے ہی مرزا صاحب گراموفون کے کسی گھسے پٹے ریکارڈ کی طرح اپنے اس پک نک مینی فسٹو سے میرے کان پکانا شروع کر دیتے اور یہ سلسلہ سنیچر کی شام تک جاری رہتا البتہ کان پکانے کے لیے جو لہجہ وہ استعمال کرتے اس کی آنچ کبھی صرف گرم ہوتی اور کبھی بہت گرم۔ پکنک کے نئے نئے فضائل اور فوائد وہ آئے دن تصنیف کرکے ہمیشہ کسی نئے مورچے سے ایسا حملہ کرتے کہ مخاطب کی قوت مدافعت مفلوج ہوکر رہ جاتی اور اُس میں یہ جراءت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ اُن سے دریافت کرسکے کہ معدے کی کشادگی اور خدا کی قربت سے کیا تعلق اور آنکھوں میں نور اور دل میں سرور کے بعد کون سرپھرا مہذب بننے کی خواہش کرے گا۔ بہرکیف اس خاص موضوع کے متعلق ان کی زبان کے آگے نہ کوئی کھائی تھی اور نہ خندق۔ ان کی رائے میں کسی انسان کے لیے پیدا ہونے سے بھی اہم کام پک نک پر جانا تھا اور چونکہ عدم سے وجود میں آنا ایک طرح کی پک نک ہی ہوتی ہے لہٰذا ہر پیدا ہونے والے کی زندگی کا پہلا اور غالباً آخری مقصد پک نک پر جانا ہی ہونا چاہیئے۔ ع ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

پکنک کے متعلق مرزا صاحب جب اپنی داستان چھیڑتے ——— اور چھیڑتے وہ بلاناغہ ہر روز اور خود میری میز پر آکر ——— تو پہلے پہل میں اس کو ان کی کسی وقتی بدحواسی پر محمول کرکے ہمدردی سے ان کا مُنہ تکا کرتا۔ لیکن پھر جب یہ سلسلہ دنوں، ہفتوں، مہینوں، ختم ہی ہونے کو نہیں

آیا اور ان کی پک نک کی دعوت میں عداوت کے آثار نمایاں ہونے لگے تو پاس مروّت سے میری ہمت نہ پڑتی کہ میں اُن سے آنکھیں چار کر سکوں لہٰذا میں کبھی اپنے ہاتھ کے ناخونوں کو دیکھتا، کبھی نظریں جھکا کر اپنے پالش سے بے نیاز جوتوں کا جائزہ لیتا اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو چھت کے روشن دان کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا اور دبی زبان سے عرض کرتا :

"اب کی اتوار کو راشن لینے جانا ہے۔"

"اب کی اتوار کو ننھے کے بال کٹوانا ہیں۔"

"اب کی اتوار کو میری سالی کے لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔"

"اب کی اتوار کو ایک جوتشی نے گھر سے باہر قدم نکالنا منع کیا ہے۔" وغیرہ وغیرہ

مرزا صاحب کسی بہت بھوکے اسٹیشن کی طرح میری بہانہ سازی کی نرم و نازک ہڈیوں پر جھپٹ کر اُن کو چُرمُرا کر بلکہ اُن کا سُرما کیا حریرا بنا کر پی جاتے۔ میں بہت دنوں مرغے کی ایک ہی ٹانگ بناتا رہا لیکن آخر کب تک ؟

ایک روز جب مرزا صاحب کی سمع خراشی زیادہ بڑھی اور میرے کان پک، کیا گل گئے تو میں نے دائرۂ ادب سے کچھ آگے بڑھ کر وہی بات کہہ دی جو اس سے قبل اپنے محلے کے ایک بزرگ سے کہہ چکا تھا جو آئے دن مجھے اپنے ساتھ جنّت لے جانے کی تلقین فرما بلکہ دھمکی دے کر مجھے اس جیتی جاگتی دُنیا سے بیزار کرنے پر تُلے ہوئے تھے " قصور معاف، اگر آپ مجھ جیسے بدذوق کو اپنے ساتھ لیے بغیر وہاں چلے جائیں تو آپ پر کون سی آفت آ جائے گی ۔"

اثر اُلٹا ہوا۔ اپنی کُرسی کو میری کرسی کے اور قریب گھسیٹ کر اس لہجے میں کہ میں جیسے اُن کے ٹاپ کے نیچے آ گیا ہوں، بولے " اجی میں تو یہی چاہتا کہ صرف میں ہوں اور مس ڈرروتھی۔ آدرش پکنک کے لیے صرف اچھے موسم اور خراب لڑکی کی ضرورت ہوا کرتی ہے لیکن اب اس کو کیا کروں کہ وہ ڈرروتھی کی بچّی کہتی ہے کہ وہ میرے ساتھ تنہا نہیں جا سکتی ۔ اس کو ممّی ایک دفعہ اکیلے لیکن ـــ خیر ہٹاؤ اس قصّے کو بلکہ قصّہ مختصر پکنک ـــ تو اس کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہے لیکن وہ اپنی ممی والی غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی ۔"

" تو پھر مسٹر شرما کو ساتھ لے لیجئے ۔"

" شرما، کملا کے بغیر نہیں جا سکتے ۔ وہ دونوں ہی جانے پر تیار ہیں لیکن ڈرروتھی کہتی ہے کہ وہ دونوں جائیں گے تو کہیں روپوش ہو جائیں گے اور وہ پھر میرے ساتھ اکیلی رہ جائے گی ۔ وہی بات ہوئی کہ کبوتر کو کھڑے میں بند کر دو گے اور مجھے چھیڑو گے ۔"

" تو آپ مجھے کباب کی ہڈی بنانا چاہتے ہیں ؟"

ہم لوگ چوروں کی طرح بہت دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے اور مس ڈرروتھی کی میز ہم سے کافی

فاصلے پر تھی۔ لیکن شاید اس کے خیال میں جب بھی کوئی دو آدمی راز داری سے گفتگو کرتے ہیں تو اس کا موضوع وہ اور صرف وہ ہوتی ہے، اپنی جگہ سے چیخی "تم بابو لوگ ہماری بات کرنا مانگتا ؟ شیم لس !" مس ڈوروتھی نہیں معلوم کس قسم کے حادثۂ پیدائش کی بنا پر اپنے آپ کو اینگلو انڈین کہتی اور اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لیے زبردستی اوٹ پٹانگ ہندوستانی، انگریزی الفاظ کے ساتھ ہانکتی لیکن چونکہ وہ تھی مسخری اور دل چسپ لہٰذا اسے کئی خون معاف تھے۔

"یہ تمہارے آنر کو بچانے کے لئے تیار ہو گئے ہیں" مرزا صاحب بولے۔

دو من وزن اور چار فٹ قد کی گول مٹول لڑکی بے ساختہ قہقہہ لگاتی ہوئی بولی "ہم اس پر بھی ٹرسٹ کرنا نہیں سکتا۔ سائیلنٹ آدمی بہوت ڈین جرس ہوتا ہے۔ لیکن ٹرائل کے لیے یہ چل جائے گا"

میں اپنی اس اہانت پر تلملا اٹھا لیکن مرزا یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے "تو بس پکّی رہی اب کی اتوار کو ؟"

ڈوروتھی نے مجھے مخاطب کر کے مرزا صاحب پر پھبتی کسی "مرزا ہم کو بے ڈھنگ سوٹ میں گبارا (غبارہ) موافک (موافق) دیکھ کر ایک دم فینٹ ہونا مانگتا" اور پھر مارے خوشی کے اپنی ہی بات پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

بڑی جھک جھک کے بعد طے کئے ہوئے پروگرام کے ماتحت اتوار کو میں کچی نیند جاگ کر تاروں کی چھاؤں میں مرزا صاحب کے گھر پہونچا۔ وہ خوابِ خرگوش میں پڑے عجب والہانہ انداز میں خرّاٹے لے رہے تھے۔ خرّاٹوں کے تال و سر کچھ اس قسم کے تھے کہ شبہ ہوتا کہ کسی بگڑے ہوئے ٹرانسسٹر پر دھیمی آواز میں قوالی ہو رہی ہو۔ پتا چلا کہ رات بھر پکنک کا انتظام کرنے کے بعد "ٹک" سو گئے ہیں۔ انتظام کے ثبوت میں ایک ٹرنک، دو چھابے، کئی ٹوکریاں۔ مچھلی پکڑنے کا سامان۔ کیرم بورڈ اور کئی دوسری چیزیں اُن کے پلنگ کے پاس ہی رختِ سفر بنی ہوئی تیار رکھی تھیں۔ گمان گزرا کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے پکنک پر نہیں بلکہ مستقل طور سے ترکِ سکونت کر رہے ہیں اور پکنک ہی پر سے سیاحتِ عالم کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ میں انتظار کرنے لگا لیکن جب صبح کا آخری ستارا بھی ڈوب چکا تو میں نے ان کی توند کو اس انداز سے جیسے ملائی کی قلفی والا اپنا ہنڈا ہلاتا ہے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ خون خراب کرکے بیدار ہوئے تو مجھے فوراً بادشاہی حکم دیا "شرما ابھی اپنے چچا کی موٹر لے کر نہیں آئے ہیں۔ ذرا لمبے قدموں ان کے یہاں چلے جاؤ، میں ابھی تیار ہوتا ہوں"

میں شرما کے یہاں پہونچا تو پتا چلا کہ وہ کملا کے یہاں گئے ہیں۔ میں رکشے پر کملا کے یہاں پہونچا تو دیکھا کہ شرما اور کملا میں کچھ نوک جھونک چل رہی ہے اور ایک میکانک ـــ ایک اس قسم کی سواری کو جسے

دیکھ کر ہی شاید موجد کے ذہن میں موٹر کار ایجاد کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا بڑی بے دردی سے ٹھونک پیٹ رہا تھا
اس سواری کی بوسیدگی دیکھ کر خود اپنے اوپر بوسیدگی چھا گئی اور اس عالمِ فانی سے جلد از جلد کوچ کر جانے کو جی چاہنے
لگا ہے۔ یہ سواری جب بنی تھی تب تک پالش جیسی نمائشی چیزیں غالباً ایجاد ہی نہیں ہوئی تھیں۔ تکلف سے
بڑی ہے حسنِ ذاتی۔ کئی دھاتوں کی آمیزش سے اس سواری کا ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا اور وہ اپنا اپنا رنگ الگ
الگ ظاہر کر رہی تھیں البتہ کہیں کہیں کیچڑ اور تیل کے دھبوں نے غلط بحث پیدا کر دیا تھا۔ اس کی چھت
شاید بنائی ہی نہیں گئی تھی۔ پیچھے کی نشستیں غائب تھیں اور ان کی جگہ پیال بچھا کر دری ڈال دی گئی تاکہ اس پر
بیٹھے ہوئے خوش قسمت مسافر ایک ہی ٹکٹ میں دو تماشے دیکھ سکیں۔ یعنی بیٹھیں موٹر میں اور لطف حاصل
کریں بیل گاڑی کا۔

اس کے دو دروازے غیر ضروری سمجھ کر مستقل طور پر بند کر دیئے گئے تھے کیونکہ شرما جی کے چچا نے اس
ضعیفہ سے اس کی پیرانہ سالی کے باوجود بالکل قطع تعلق نہیں کر لیا تھا بلکہ کبھی کبھی اپنے فارم پہ اس سے بھوسا اور
کنڈے ڈھونے کا کام اب بھی لے لیا کرتے اور اس مقصد کے لیے دروازے کے زنگ آلود ہینڈل کھیا چوں کا نشر
بانڈ حصے کے کام آتے۔

میکانک جب اس کو ٹھونکتے پیٹتے تھک چکا تو اس نے عاجز آکر اعلان کر دیا کہ موٹر ٹھیک ہو گئی ہے
اپنی ریشمی عنابی ساڑی پہن کر کملا اس قسم کی غیر مہذب سواری میں بیٹھنے سے حد درجہ بدک رہی تھیں لیکن
پھر وہ کسی طرح میری مروت اور شرما کی محبت میں خاموش ہو گئیں اور موٹر کے اگلے حصے میں شرما کے پاس
بٹھا دی گئیں۔ میکانک نے ہینڈل گھمایا، پھر دوڑ کر میرے ساتھ دھکا لگایا اور شرما کے ہاتھوں مردہ زندہ ہو گیا
یعنی موٹر چل پڑی اور میں بھی ہائی جمپ کر کے اس پر چڑھ گیا۔

مرزا صاحب کے گھر پہنچے تو وہ شاید اس خیال سے کہ انتظار کی گھڑیاں بیکار کیوں جائیں اپنی پڑوسن سے
چار چوٹ کی لڑائی ایک بلّی اور کچھ دودھ کے متعلق لڑ رہے تھے لیکن موٹر کی کھڑکھڑاہٹ اور بھربھراہٹ سے وہ
کیا سارا محلہ گھروں سے باہر نکل آیا اور یہ تو تو میں میں خود بخود بند ہو گئی۔ جلدی جلدی سامان اور مرزا صاحب لاد
گئے۔ محلے کے لڑکوں نے بڑے جوش اور زور سے دھکا اور نعرہ لگایا "بم پرخ کی پوں، پوں کی ہائے ہائے"
یہ شاید اس محلے کے ہونہار سپوتوں کا مخصوص مقامی نعرہ تھا اور موٹر چل پڑی۔

مس ڈرورتھی کے یہاں پہونچے تو پتا چلا کہ وہ ابھی تیار ہو رہی ہے۔ آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد مرزا صاحب
نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا "تو" کی میں" قسم کا ایک ساز بجا۔ مرزا صاحب اسے "کم اِن" سمجھ اور فوراً ہینڈل گھما
دروازے کے اندر ہو گئے لیکن پھر ایک نسوانی چیخ اور چند امپورٹڈ قسم کی گالیوں کے ساتھ فوراً ہی باہر آ گئے اور
اپنے اس طرح غروب اور طلوع ہونے کی یہ تاویل پیش کی "اس نے کنگ کہا تھا یعنی آ رہی ہے اور میں سمجھا کم اِن
یعنی اندر چلے آؤ۔"

شرما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا " اجی جان بوجھ کر اس نے آپ کو اندر بلایا تھا گھر میں آنے کو کہا اور کچھ کے کیسی پھر گئی ۔

چند ہی لمحوں میں مس ڈررتھی منی اسکرٹ اور اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے جن میں وہ صرف ٹانگ ہی ٹانگ دکھائی پڑتی ۔ اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ نمودار ہوئی اور مرزا صاحب سے مصنوعی غصّے سے کہا "شیم لیس پی پنگ ٹام ۔ لیڈیز کے کمرے میں ایک دم گھسنا مانگتا تم ؟"

مرزا صاحب بولے " اجی نہ وہاں لیڈی تھی نہ یہاں ، جو ٹانگیں وہاں تھیں وہی یہاں ہیں "

مس ڈررتھی نے ہم لوگوں کا رسمی خیر مقدم کرتے ہوئے کہا " اب نو بجا چاہتا اور مرزا بولا تھا کہ رات بجے ہم جمیت نگر کے ٹینک میں ڈبکی لگانا سکتا "

"نو بجے تک تو آپ خود ہی تیار نہیں تھیں" کملا بولی

"ہم جانتا کہ مرزا انڈین ٹائم بولتا ہے ورنہ ہم پچھے بجے تیار ہونا سکتا "

اس گفتگو کے وقت مرزا صاحب مس ڈررتھی کے سامنے آڑ بنے ایسے کھڑے تھے تاکہ اس کی نظر لکر گڑھا قسم کی موٹر پر نہ پڑے ورنہ کہیں وہ ہنسے پہ سے ہی نہ اکھڑ جائے ۔ اتنے میں ڈررتھی کا فاکس ٹیریر جمی آگیا ۔ اسے مرزا صاحب سے پرانی رقابت یا مخاصمت تھی ۔ اس نے ہم لوگوں کو تو قابلِ اعتنا سمجھا نہیں البتہ مرزا صاحب کی طرف منہ کر کے "چخ پخ" کی ۔ "دیوانہ را ہوئے بس است" کے مصداق مرزا بھاگے کتے نے تعاقب کیا اور جس طرح بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ، اسی طرح مرزا صاحب ایک ہی بائی جمپ میں موٹر کے پچھلے حصے میں غرق ہو گئے ۔ اب مس ڈررتھی نے ہمارا موٹر نما عجوبہ دیکھا ۔ وہ مارے خوشی کے اچھلتی کودتی اس کی طرف بڑھی " ونڈرفل " بالکل انٹیک ، ایک دم ونٹیج کار ! مرزا ڈارلنگ تم پرفکٹ لوَر ہے ۔ نوز آرک NOAH'S ARC کی چھوٹی سسٹر کو پکڑ لیا ۔ اس کو ہم ڈرائیو کرنا مانگتا اور یہ کہتے ہوئے وہ اچک کر ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔

کملا موٹر کے پیچھے حصے میں بٹھائی گئی جہاں سامان کے درمیان مرزا دبکے بیٹھے تھے ۔ ہینڈل گھمانے اور دھکا دینے کے بعد میں اور شرما آگے بیٹھ گئے اور ایک دفعہ پھر موٹر چل پڑی ۔ اس کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں تھی البتہ اس کھڑکھڑاہٹ اور بھربھراہٹ سن کر چونکہ سڑک کی سواریاں اور راہ گیر دور ہی سے بھاگ نکلتے لہذا اس کو صاف اور کھلا ہوا راستہ مل رہا تھا اور اس پھوسے میں کسی خرگوش کے کان کاٹنے کے دم خم ظاہر ہوتے ۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مرزا صاحب مجھے مس ڈررتھی کے پاس بیٹھنے کے جرم میں قہر آلود نگاہوں سے دیکھ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مرزا غالب کا یہ مصرع دہرا رہے تھے

ؔ بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

میں نے فوراً اپنا منہ پھیر لیا اور اسی وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے اور مس ڈررتھی کے درمیان اس کا

فاکس ٹیریر بیٹا ہوا ہے۔ مس ڈروتھی شاید اس بوسیدہ موٹر کے زنگ آلود پُرزوں سے واقف نہیں تھی اور میں موت کو برحق سمجھتے ہوئے انتہائی تشویش اور خوف سے دیکھ رہا تھا کہ موٹر کبھی دائیں جاتی اور کبھی بائیں اور جہاں کوئی گڑھا نظر آجاتا تو اس میں یہ دھچکا ضرور کھاتی جس سے اس کا سارا وجود بُری طرح جھنجھنا اُٹھتا۔ میں ایسے ہی ایک دھچکے کا منتظر رہا۔ اور جیسے ہی وہ درپیش آیا میں نے بڑی سرعت سے ڈروتھی کے فاکس ٹیریر کو موٹر کے پیچھے والے حصّے میں منتقل کر دیا۔

اور پھر ایک بھونچال سا آگیا۔ مرزا صاحب موٹر میں کھڑے ہونے یا موٹر سے باہر پھاند جانے کی کوشش میں پھڑپھڑانے لگے لیکن موٹر کے اطوار اور رفتار ان کو اس کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی اور وہ گر گر کر موٹر کے چرکھٹے اور اسباب سے ٹکرا رہے تھے اور جمی ان کے اوپر بیٹھا تھا۔ کملا ٹرنک کو ڈھال بنائے مارے ہنسی کے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ مرزا صاحب اس رقص بسمل کے دوران اپنے سینے اور حلق کی پوری قوت سے چیخ رہے تھے "روکو! روکو! فار گاڈس سیک موٹر روکو!"

اور ساتھ ہی ساتھ کملا کی خوشامد بھی کر رہے تھے "اس کُتّے کے بچّے کو موٹر سے باہر پھینک دو! کملا میری کملا!"

موٹر خود اس قدر کھڑکھڑ بھڑبھڑ کر رہی تھی کہ بیچارے مرزا صاحب کی کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں بھی ہم سُنی ان سُنی کر رہے تھے لیکن جب مرزا صاحب کی دھرپٹخ زیادہ بڑھی تو ڈروتھی چیخی۔ "یُو فلرٹ کملا کو پریشان کرنا مانگتا۔ جمی کی بات مت کرو۔ تم اُسے ٹچ کرے گا تو ہم تم کو ایک دم شوٹ کرنا مانگتا مرزا!"

موٹر کی کھڑکھڑاہٹ اور بھڑبھڑاہٹ میں اب کچھ پھٹ پھٹا پھٹ بھی شامل ہوگئی تھی۔ ہم لوگ اس وقت شہر کی سڑک چھوڑ کر ایک تالاب کے کنارے بالکل سپاٹ چڑھائی پر جا رہے تھے دفعتاً موٹر کے انجن کے اندر ایک نو، کا بم جیسا پٹاخہ دغا اور وہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ جس سے اگر مس ڈروتھی مجھ پر گر کر پیپر ویٹ کا کام نہ دیتی تو یقیناً میں اچھل کر اس کے باہر ہوتا، وہ ایسی رُکی بلکہ بیٹھ گئی جیسے کسی عاشق نامراد کا دل۔ ہم میں سے کسی کے بھی ہوش حواس ٹھیک نہیں تھے اور کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔ پھر اس قبرستان جیسی فضا میں زندگی کا پہلا آثار یہ نمودار ہوا کہ موٹر کے اندر سے مرزا صاحب پھاندے اور ان کے پیچھے جمی۔ لیکن اب شاید دونوں میں دوستی ہوگئی تھی کیونکہ وہ مرزا صاحب کو دوڑا ضرور لیکن بھونک نہیں رہا تھا

ہم لوگ اس حادثے سے ششدر ہو کر کچھ دیر یہ کبڈی تُم سم دیکھتے رہے۔ پھر مس ڈروتھی کی تحکمانہ آواز گونج "مرزا تم ایک دم ڈنکی ہے۔ ایسی کنڈم موٹر لایا اور پھر اس میں ہم رکھ کر ہم کو مرڈر کرنے کی اٹمپٹ کی۔ ہم تمہارا اگینسٹ رپورٹ لاج کر کے تم کو جیل بھیجنا مانگتا۔"

مرزا صاحب جو دوڑ دوڑ کر بُری طرح ہانپ رہے تھے، بولے "اور یہ جمی اُلّو کے پٹھے کو ہمارے پیچھے چھوڑ کر تم ہمارا ایک دم مرڈر کر رہا ہے۔"

"جمی ڈارلنگ کم ہیر۔ ڈونٹ ویسٹ یور ٹائم وِتھ دِس ویگا باونڈ۔" مس ڈروتھی بولی اور جمی بھاگتا ہوا آیا اور کود کر اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

مرزا صاحب بھی جامۂ انسانیت میں آگئے۔ سب لوگ موٹر سے اُتر آئے اور اس کو اس طرح ٹٹولنے لگے جیسے،

اُندھوں نے ہاتھی کو ٹٹولا تھا لیکن مرحومہ قیدِ حیات و بندِ غم سے پوری طرح نجات پا چکی تھیں اور اُن سے کسی جنبش کی توقع کسی مُردے پر اتہام لگانے کے مترادف تھی۔

اتفاق سے بدلی تھی ورنہ دھوپ کی شدّت سے ہم لوگوں کا اور بھی بُرا حال ہوجاتا۔ کافی رد و قدح کے بعد طے پایا کہ کملا اور مس ڈرورتھی اور شرما کو موٹر کے پاس چھوڑ دیا جائے اور مرزا صاحب اور میں چڑھائی کے اوپر جو گاؤں ہے اور جس کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں دُور کھڑے ہمارا تماشا بھی دیکھ رہے ہیں، جاکر چند ایسے آدمیوں کو بلا لائیں جو موٹر کو ڈھکیل کر گاؤں تک پہونچا دیں اور وہیں گاؤں کے قریب کہیں پکنک کی حسرت نکال لی جائے یعنی کھانا کھایا جائے اور پھر کرائے کی بیل گاڑی پر شہر کے لیے روانہ ہو جایا جائے۔

مرزا صاحب اور میں چلا تو مرزا صاحب کے تعاقب میں جی بھی چل پڑا اور اس کو واپس لانے کے لیے ڈرورتھی بھی وہ تہقہہ لگاتے ہوئے بولی "ڈارلنگ مرزا! میں کملا اور شرما کے رومانس میں کِل جوائے (Kill Joy) نہیں بننا مانگتا" اور ڈرورتھی ہنسنے لگی۔

ہم لوگ افتاں و خیزاں مرزا صاحب اور مس ڈرورتھی کی نوک جھونک کے درمیان اوپر پہنچے تو گاؤں تک پہنچنے میں ایک کافی چوڑی نالی پڑتی، جس سے ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں پانی جارہا تھا۔ مس ڈرورتھی نے کچھ فاصلے سے دوڑ کر اُسے پھاندنا چاہا تو غالباً اس کے اونچی ایڑی کے جوتے نے ساتھ نہیں دیا اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بیچ نالی میں گری۔ پاس کھڑے دیہاتیوں کو غالباً منی اسکرٹ کی زیارت اور مصرف کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ انھوں نے پُرزور اور پُرجوش قہقہوں سے اظہارِ تحسین کیا۔ میں نے اور مرزا صاحب نے ڈرورتھی کو اتنی مشکل سے نکالا کر خود بھی کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ مس ڈرورتھی کے پَیر میں موچ آگئی تھی اور یہ مرزا صاحب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ اب وہ مرزا صاحب پر اپنا پورا بوجھ ڈھکیلے ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی۔ وہ اس نئے سانحے سے مبہوت ہوکر بولی "مرزا ڈارلنگ تمہارا پکنک ہمارا فیونرل ہوگیا۔ ہم جلدی ایک دم ہاسپٹل میں بھرتی ہونا مانگتا"

لیکن ابھی وہ پوری بات کہہ بھی نہیں پائی تھی کہ جی پر ایک دیہاتی کُتّا حملہ آور ہوا اور اس کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے موٹے کتوں نے بھی آکر اس پر اور اس کے ساتھ ہم لوگوں پر بے تحاشا بھونکنا شروع کر دیا۔ جی مارے ڈر کے ڈرورتھی کے پیروں سے چپٹا جارہا تھا اور حملہ آور کُتّے ہم لوگوں سے خوفناک حد تک قریب سے قریب تر ہوتے جاتے۔ ڈرورتھی چیخ مار کر مرزا کے بجائے مجھے چمٹ گئی۔ اب کاموں کی یہ تقسیم ہوگئی کہ میں ڈرورتھی کو ایک گرتی ہوئی دیوار کے مانند یکیں سنبھالے کھڑا تھا اور بیچارے مرزا صاحب جی کو گود میں لیے تن تنہا دیہات کے نصف درجن مسٹنڈے کتوں سے جنگِ مغلوبہ لڑ رہے تھے اور وہ بھی محض زبانی "دہت! دہت!" "لے پہت تیری کی" "ایں چھوڑ بھی جا نا!"

کچھ بھلے دیہاتیوں کو رحم آگیا اور وہ لاٹھیاں لے کر آگئے اور انھوں نے ان بے ہودہ کتّوں کو دور بھگا دیا اور ایک پیڑ کے نیچے ہم لوگوں کے لیے چار پائی ڈال دی۔ ہم لوگوں کو دیکھنے کے لیے گاؤں کے آدھے مرد اور قریب

ریب سب عورتیں اور بچے جمع ہو چکے تھے۔

مرزا صاحب نے گاؤں کے پردھان کو طلب کیا اور وہ بیچارا بہت شریف ثابت ہوا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم لوگ ایک بیل گاڑی پر لدے شہر واپس جا رہے تھے۔ گاؤں کے نیچے چڑھائی پر تالاب کے کنارے شرما اور کملا ہنستے ہوئے ملے البتہ موٹر غائب تھی۔ انھوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ چند گاؤں والوں نے موٹر کو چڑھائی کے اوپر ڈھکیلنے کی کوشش کی تو اس نے تھوڑی دور آگے بڑھ کر پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ گاؤں والے اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے اور وہ غالباً مرنے کے بعد کی رسوائی سے بچنے کی غرض سے اُلٹی دوڑتی ہوئی سیدھی تالاب میں جا ڈوبی۔ اب وہ بالکل محفوظ تھی اور حسبِ ضرورت مناسب طریقے سے باہر نکالی جا سکتی۔

"اور سامان اور کھانا ؟" مرزا صاحب نے بوکھلا کر پوچھا

مس ڈوروتھی نے لقمہ دیا "ہم بہوت بھوکا ہے پورا لنچ کھانا مانگتا ؟"

شرما نے ایک جھاڑی کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا جہاں مرزا صاحب کا سارا ساز و سامان کسی بھیگے ہوئے چوہے کی طرح سکڑا پڑا تھا "ایک غوطہ خور لڑکے نے بڑی مشکل سے یہ نکالا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنا لنچ کھا سکتی ہیں مس ڈوروتھی۔ اس کے ساتھ آپ کو پانی بھی نہیں پینا پڑے گا۔ وہ اس میں پہلے ہی سے موجود ہے۔"

بیل گاڑی سے شہر تک کا سفر کچھ زیادہ پھیکا اور بے مزا نہیں رہا۔ راستے میں آندھی اور پانی کے طوفان نے ہماری خود ساختہ پکنک کو بالکل ہی بے ساختہ قدرتی بنا دیا۔ اور یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ ہم قدرت سے بالفاظ دیگر خدا سے قریب ہونے سے بال بال بچ گئے۔ معدے میں کشادگی اور دماغ میں بالیدگی، ہم بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ آنکھوں میں وہ نُور تھا کہ ساری دنیا تاریک نظر آتی اور دل میں ایسا سرور موج زن تھا کہ چلتی بیل گاڑی ہی پر کھڑے ہو کر رقص کرنے کو جی چاہتا۔ پانی میں بھیگے اور کیچڑ سے لت پت ہم ایسے مہذب نظر آتے کہ معلوم ہوتا کہ تہذیب کا جنازہ ہمارے ہی کاندھوں پر رکھا ہوا ہے۔ ہمارا ماحول لاحول پڑھتا ہوا بالکل تبدیل ہو چکا تھا اور آب و ہوا کی تازگی کا ہم ایسا سبق سیکھے ہوئے تھے کہ ہمیں اپنے گرد و پیش کی ہر چیز باسی اور بوسیدہ نظر آتی۔

دفتر میں مرزا صاحب اور مس ڈوروتھی جو اب مسز مرزا ہیں اور شرما اور کملا جو اب مسز شرما ہیں جب مجھے کچھ بے تعلق سے نظر آتے ہیں تو میں حلق صاف اور اپنا منہ چھت کی طرف کر کے بلند آواز سے پوچھتا ہوں ـــ

"تو آپ اگلے اتوار کو پکنک پر چل رہے ہیں ؟"

فضا میں فوراً چار قہقہے بلند ہو جاتے ہیں اور میں شرما کے چچا کی موٹر کا تصور کر کے خاموشی سے اپنے کام میں لگ جاتا ہوں۔

ڈوروتھی چہکتی ہے "ہم ٹھیک بولتا ہے کہ سائیلنٹ آدمی بہوت ڈین جرس ہوتا ہے۔ یہ دوسروں کی وائیوز کو سیڈیوس کرنا مانگتا۔"

حلیمہ زرکس (بنگلور)

بیوی اور ٹی وی

مقفیٰ الفاظ شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں اور بسا اوقات زندگی میں بھی ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ بیوی اور ٹی وی موجودہ زندگی کے دو اہم قافیے ہیں۔ جن کے بغیر زندگی کا مطلع مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور جب یہ مکمل ہو جاتا ہے تو آگے بے سوچے سمجھے دھڑا دھڑ شعر (یعنی دیگر خواہشاتِ زندگی) ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بیوی اور ٹی وی دونوں زندگی کا تکملہ ہیں۔ بنا بیوی کے کوئی کب تک بے چارہ بنا رہے گا۔ بائیں پسلی ہی سے سہی اس کا وجود ہو جاتا ہے۔ بیوی کے بغیر زندگی خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔ شادی سے پہلے کسی کنواری کی ذرا بھی حمایت کریں تو لوگ آنکھیں نکالنے لگتے ہیں۔ ہمدردی برتیں تو ہر طرف چہ مگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ ان سارے دھبوں کو دور کرنے والی لانڈری صرف بیوی ہے۔ آپ اس کی آڑ میں جتنے چاہے گل کھلا سکتے ہیں لیکن کوئی ان کھلے ہوئے گلوں پر توجہ نہیں دے گا۔ بیوی سے زندگی میں برکت ہی برکت ہوتی ہے۔ بیوی کے بہانے آپ کھلے عام اپنی محبوبہ کے لئے تحفہ خرید سکتے ہیں۔ انجانے شہر میں اس نقلی بیوی سے زندگی کے سارے مزے لوٹنے کا حق بھی آپ کو حاصل ہے۔ اور جب دل اوب جائے تو نقلی بیوی سے اصلی بیوی کے پاس آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ یہی نہیں روٹی، کپڑا اور مکان غرض سبھوں کے لئے ایک عدد بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے آپ جھوٹا کھائیے اور موٹا پہنئے کوئی نہیں پوچھے گا لیکن شادی کے بعد بیوی کے ساتھ مٹن فرائی، چکن مسالہ، فش چاپس کھانا ضروری ہے۔ سفاری سوٹ پہننا اور پالیسٹر شیفان ساڑیاں کا پہنانا از حد ضروری ہے۔ ورنہ بیوی منظر عام آپ کے ڈھول کا پول کھول کر رکھ دے گی۔ بیوی آخر بیوی ہی تو ہے گھر کے سارے راز افشا کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے۔ دوزخ اسے یونہی ہاتھ نہیں آتی۔

کبھی تے شہر میں مکان آپ کو اپنا سیاہ نامہ دکھانے کے بعد ہی ملتا ہے۔ کیوں کہ اس میں زندگی کے سب سے بڑے سیاہ کارنامہ کا جو ذکر ہوتا ہے کہ آپ ایک عدد بیوی یعنی سیاہ کار کے مالک ہیں۔ ایک عدد بیوی کے ساتھ دو تین بچے بھی

ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ البتہ ہر سال اللہ کا فضل ہوتا ہے تو مالک مکان آپ پر فضل نہیں کرسکتا۔ ایسے میں آپکو بیوی کے ہوتے ہوئے بھی در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ بیوی اور ٹی وی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ پہلے آفس سے گھر پہنچتے ہی سارے محلے کی خبریں اور دنیا کی کچی پکی خبریں سب بیوی کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتی تھیں۔ پر کمبخت ٹی وی کے نیوز ریڈر نے ہماری بیگم صاحب کی بولتی بند کردی ہے۔ بیوی کی خاموشی ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ سوچتے ہیں کہ کاش ٹی وی کا وجود ہی نہ ہوتا اور تعجب تو یہ ہے کہ گھر میں ٹی وی کی سب سے پہلے فرمائشیں بیوی ہی کرتی ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ مرد کے لئے ایک ساتھ دو بیویوں کو سنبھالنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ بیوی ٹی وی کی گرویدہ ہو جائے تو کوئی بات نہیں لیکن مرد ٹی وی کا دلدادا ہو جائے تو یہ کسی کی بیوی بھی برداشت نہیں کرسکتی۔

آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ گھر گھر ٹی وی آنے سے بیوی بیوی نہیں رہی۔ پڑھی لکھی عورتیں تو پہلے ہی بیوی بننے میں عار محسوس کرتی تھیں لیکن اب ٹی وی دیکھ کر ان پڑھ بیویوں کے دماغ کی چولیں بھی ڈھیلی ہو گئی ہیں۔ پردۂ ٹی وی پر عورتوں کے عظیم کارناموں اور اس کے نت نئے روپ دیکھ کر آج کل کی ہر بیوی ٹی وی کی طرح ہر جواب انگریزی الفابیٹز میں دینا چاہتی ہے۔ میاں کے بلاوے پر وہ بڑے انداز سے کہتی ہیں۔

[آئی۔ جی آئی ٹی جائے پی کے آئی] .I.G.I.T [TEA] P.K.I

بوڑھی سی بوڑھی بیویاں بھی اُس کی شوقین ہیں۔ ٹی وی کے بناء تو انھیں بور ہوتا ہے۔ لفظ "بور" اسی ٹی وی کا کرشمہ ہے۔ لفظ ٹی۔ وی ایسا رواں دواں ہے کہ اُسے توتلی، پوپلی، اَن پڑھ، سُگھڑ، سبھی بیویاں بآسانی استعمال کرتی ہیں۔ بوڑھی بیویاں نے ٹرانسسٹر کو ٹانگ ٹسر بنا ڈالا۔ ٹیپ ریکارڈر تو ان کے پلے ہی نہ پڑسکا لیکن ایک ٹی وی ہے کہ ہر زبان پر آسانی سے چڑھ گیا۔ اور اس کا جادو سب کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ دراصل ٹی وی بھی ٹی۔ بی کے مرض کی طرح ہر ایک کو لاحق ہو گیا ہے۔ جبکہ ٹی بی کا سینی ٹوریم شہر سے دور ہوتا ہے اور ٹی وی کا سینی ٹوریم تو شہر کا ہر گھر ہے۔

گھر تو گھر جھونپڑے پر بھی اینٹنا لگا دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ آج کل پاؤں چادر سے بھی بڑھنے لگے ہیں۔ جھونپڑوں میں رہ کر کوئی محلوں کے خواب دیکھے یا نہ دیکھے لیکن ٹی وی کے خواب ضرور دیکھتا ہے۔ چند ایسی معصوم بیویاں بھی ہوتی ہیں جو تنگدستی کا خیال کرتے ہوئے اپنے شوہروں سے فرمائشیں کرتی ہیں کہ گھر میں ٹی وی نہ سہی چھت پر اینٹنا تو لگائے رکھیں تاکہ محلے والوں کو معلوم رہے کہ ہم بھی اِس دوڑ میں پیچھے نہیں۔

آج کل ہر گھر میں ہر بیوی کا موضوعِ گفتگو ٹی وی ہے۔ آپ اپنے کسی دوست کے ہاں چلے جائیے تو اس کا پتہ خود بخود چل جائے گا۔ ہم اپنے تجربے کے تحت یہ بات کہہ رہے ہیں تاکہ آپ بھی اپنے دوستوں کی بیویوں سے ہوشیار رہیں۔ جب ہم اپنے دوست کے ہاں گئے تو ان کی بیوی ہماری بیوی سے خیر و عافیت پوچھے بناء یوں ہمکلام ہوئیں کہ "ہائے جن آپ ایسے موقع پر آئیں جب کہ ہمارا ٹی وی درستی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی اتوار کو چلے آیئے تو کچھ دیکھنے کا مزا آجائے گا۔ ہماری بیوی اُن مکالموں کو

بڑے غور سے سُن رہی تھیں۔ انھیں ورغلانے کے لئے ہمارے دوست کی بیوی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ دم لے کر کہنے لگیں آپ نہیں جانتیں سُنا ہے کہ اب شہر میں رنگین ٹی وی بھی آگیا ہے اس کی قیمت فلاں ہے۔ فلاں کمپنی کا ٹی وی معیاری ہوتا ہے بھلا ان کالی تصویروں کو دیکھنے میں اب کیا خاک مزا آئے گا۔ میں تو ہمارے شوہر کے سر پہ سوار ہوں کہ جلد سے جلد رنگین ٹی وی خریدیں ویسے میرا زیور بھی تو گھر میں بیکار پڑا ہے۔ انشاءاللہ آٹھ پندرہ روز میں میری یہ خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔" اچھا بتائیے آپ ٹی وی کب خریدنے والی ہیں؟ ان کے اس جملے کو سُننے کے بعد ہمارے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور ہم نے یہاں سے کھسکنے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی۔ دُم دبائے اور انہیں خدا حافظ کہے بغیر اپنی بیوی کو لیئے گھر چلے آئے۔ اس کے بعد ہمیں یہ خدشہ لاحق ہوگیا کہ گھنٹہ بھر ٹی وی پر لکچر سُننے کے بعد ضرور ہماری بیوی بھی ٹی وی کی فرمائش کریں گی۔ کیونکہ وہ بھی تو بیوی ہے۔

ہر ہفتہ پندرہ روز میں بیوی کی زبانی ٹی وی کی فرمائش سن کر ہم اس لمحے کو کوستے ہیں جب کہ دوست کی بیوی نے ہماری بیوی کے کان بھرے تھے۔ آخر کس کس سے دامن بچائیں۔ دوست، احباب عزیز و اقربا سے کنارہ کشی تو ممکن ہے لیکن سسرال سے ناطہ توڑنا تو بہت مشکل بلکہ ناممکن۔ سالے اور سالیوں کے بغیر بھی کوئی جیتا ہے اور یہی سالے اور سالیاں ہیں جنھوں نے ہمارا جینا حرام کردیا ہے ہماری بد دُعا سے اور ان کی رشوت خوری سے سبھوں کے پاس ٹی وی آگیا ہے اور اس کے آنے سے ان کے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ نقشہ ہی نہیں ان کے گھر کا سکون بھی غارت ہوگیا ہے۔ کسی سالے کا ڈرائینگ روم پکچر ہال بن گیا ہے تو کسی سالے کے دیوان خانے پر ریلوے اسٹیشن کے انتظار خانے [WAITING ROOM] کا دھوکہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ساری ضروری اشیاء کا ڈھیر ایک طرف لگا ہوا ہے۔ کونے میں ٹی وی رکھا ہوا ہے اور فرش پان کے دھبوں سے مزین، پیشاب کی بُو میں بسی ہوئی شطرنجی بچھادی گئی ہے۔ یہاں محمود و ایاز کی کوئی تمیز نہیں۔ کیا بوڑھا، کیا بچہ، کیا عورت کیا مرد غرض محلے بھر کے لوگ یہاں موجود ہوتے ہیں ہماری سالی صاحبہ بڑی مہمان نواز ثابت ہوئی ہیں۔ بچاری درجن بھر لوگوں کی تواضع ایک جرعہ بدمزہ کالی چائے سے کرتی ہیں۔ یہاں مچھلی بازار سے زیادہ ہنگامہ مچا رہتا ہے۔ بچے کے رونے پر ایک صاحبہ بھاگی جاتی ہیں تو دوسری صاحبہ گھر کا سارا کام نپٹا کر ہانپتی کانپتی چلی آتی ہیں۔ تیسری کوئی نقرہ کسنے میں مگن ہے۔ گھروں کے سارے جھمیلے، بہو کی زیادتیوں سے لے کر نندوں کے جلاپے کا ذکر بھی یہاں ہوتا ہے۔ آنکھیں جلنے لگیں، سر دھکنے لگے لیکن کوئی وہاں سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ خواہ کوئی بات پلے پڑے یا نہ پڑے لیکن پردے پر یہ سارا تماشہ دیکھنا ان بیویوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ہائے رے ٹی وی کی درگت۔ یہ اس ملک کی حالت ہے جہاں ایک شخص اخبار خریدتا ہے تو دس لوگ اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

خدا خدا کر کے اب ہماری بیوی میں بھی یہ شوق دن چوگنی رات آٹھ گنی ترقی کر رہا ہے۔ پہلے وہ پندرہ دنوں میں ایک وقت ٹی وی کی فرمائش کرتی تھیں اسکے بعد ہفتہ میں ایک بار فرمائش کرنے لگیں اب تو یہ عالم ہے کہ وہ روزانہ اس وظیفہ کو دہراتی رہتی ہیں۔ تبھی تو ہم نے ان دنوں گھر میں مارشل لا نافذ کردیا ہے۔ کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے کیا مانتے۔ بیوی کو سمجھایا ہے کہ ٹی وی اور طلاق انگریزی حرف "T" سے شروع ہوتے ہیں۔ اگر پھر کبھی تم نے ٹی وی کی فرمائش کی تو سمجھنا کہ ہم بھی طلاق کے خواہاں ہیں۔ بچاری ہماری اس عظیم خواہش کو سننے کے بعد دُم دبا کر بیٹھ گئی ہیں۔ لیکن انکی خاموشی دیکھ کر ہمیں انکے بیوی پن پر گمان ہونے لگا ہے۔ وہ بیوی ہی کیا جو ٹی۔ وی بغیر زندگی گزارے۔

○ ○

غزلیں

پاگل عادل آبادی

آپ اُن کے باپ سے کیا کہہ گئے — لے کے جوتا ہاتھ میں وہ رہ گئے
قورمے کی بوٹیاں وہ کھا گیا — ہم فقط چمچہ ہلاتے رہ گئے
ہوگیا رُدمانس سارا کِرکِرا — باندھ کر راکھی وہ بھیّا کہہ گئے
میکدے کی بھیڑ میں یہ کیا ہوا — شیخ صاحب گھس گئے ہم رہ گئے
بس یہی تھا جرم اپنا دوستو — گدھے کو گدھا ہی کہہ گئے
کتنے کوّے چل رہے ہیں ہنس کی چال — ہم گدھے تھے اور گدھے ہی رہ گئے
شاید اب کے آخری ہو یہ نکاح — جب بھی کی شادی یہی وہ کہہ گئے
یہ تو اپنا ہی جگر تھا "مائی سَن" — ہر ستم ممّی کا تیری سہہ گئے
فیوز اچانک اُڑ گیا اُن کا میاں — جو بنائے تھے قلعے وہ ڈھ گئے
"رام" جانے آگے اب کیا حال ہو — ہم تو پچپن سال کا دکھ سہہ گئے

میں تو ہوں پاگل میرا کیا ہے مگر
آپ کیوں مُرغی کو انڈا کہہ گئے

انعام درّانی

بند ہے دِل کا گٹر اس کے سوا سب خیر ہے — ہے اُبل پڑنے کا ڈر اس کے سوا سب خیر ہے
زندہ ہے اُڑ کر چٹانوں پر بسیرے کی اُمنگ — جھڑ گئے ہیں بال و پَر اس کے سوا سب خیر ہے
عزم بھی ہے منزلِ مقصود بھی ہے سامنے — دھنس گئی ہے رہگذر اس کے سوا سب خیر ہے
ہے عدو ناوک فگن اور زرہ بکتر کے بغیر — میرا سینہ ہے سپر اس کے سوا سب خیر ہے
آڑ میں جن کی اماں کی آس تھی وہ کوہسار — ہوگئے زیر و زبر اس کے سوا سب خیر ہے
ان کو حل کرنے کی تدبیریں ہوئی جاتی ہیں فیل — مسئلے سارے امر اس کے سوا سب خیر ہے
کرسیاں میزیں سبھی ہیں گول بھی چوکور بھی — پھوٹتا رہتا ہے سر اس کے سوا سب خیر ہے
دھیرے دھیرے دبتے دبتے ہوگیا ہے پاش پاش — جہل کی تہہ میں ہنر اس کے سوا سب خیر ہے
ہوگئی تعداد مہمانوں کی میرے تیس لاکھ — تنگ صحن و بام و در اس کے سوا سب خیر ہے
خیر کی امید کرکے جس سے وابستہ جیئے — ہے وہی سرگرم شر اس کے سوا سب خیر ہے
یوں تو چاروں سمت سے محفوظ ہیں مامون ہیں — پھنس گیا دلدل میں گھر اس کے سوا سب خیر ہے
قتل کر دیتا ہے تھوڑی سی کرنسی کے لیے — باپ کو اس کا پسر اس کے سوا سب خیر ہے

حضرت انعام کل تک رونقِ ہر بزم تھے
آج کل ہیں شیرِ نر اس کے سوا سب خیر ہے

ڈاکٹر واجد علی مشد
(پٹنہ)

کال بل

(CALLBELL)

کال بل پھر بج رہی ہے۔ دس منٹ کے اندر یہ پانچواں موقع ہے جب مجھے مضمون نامکمل چھوڑ کر دروازے تک جانا پڑا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے مجھے اس گھنٹی سے سخت نفرت تھی لیکن جیسے جیسے مجھے یہ احساس ہوتا گیا کہ گھر کی کال بل کا بار بار بجنا بھی بڑا آدمی ہونے کی ایک نشانی ہے، میں کال بل کی آواز سے محبت کرنے لگا۔ ہاں تو آج پہلی بار کال بل بجانے والے مسٹر ورما تھے۔ یہ ورما جی بھی بڑے بھلے آدمی ہیں۔ اکثر میرے لئے کوئی نہ کوئی کام لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ کسی کی ملازمت، کسی کی سفارش، کسی کا ٹرانسفر، کسی کی پوسٹنگ، غرض ایک دل ہے اور لاکھ تمنائے دوستی۔ میں بھی ان کا ہر کام بڑی محنت سے کردیتا ہوں۔ آخر تو اپنے دوست ہیں اور آج کل زندگی کا کاروبار ان ہی دوستوں کی مدد سے چلتا ہے۔ اپنی مدد آپ کا محاورہ اب غلط ہوچکا ہے۔ ورما جی بڑے ایماندار آدمی ہیں۔ انھوں نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا کام ہوجانے کی صورت میں متعلقہ لوگوں سے ملنے والا معاوضہ پہلے ہی بتا دیتے ہیں اپنے کمیشن کی بات بھی قبل ہی طے کرلیتے ہیں اور کیا مجال جو ایک پیسہ بھی ادھر سے ادھر ہو۔ حالانکہ اپنے ملک میں ہر بے ایمانی کا کام بے حد ایمانداری سے کیا جاتا ہے لیکن انھیں دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ست یگ دوبارہ جلد ہی آنے والا ہے دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔ یوں بھی یہ کوئی غلط کاری نہیں، یہ تو سماجی خدمت ہے جو ہم دونوں مل جل کر انجام دے رہے ہیں شاید اسی لئے ورما جی مجھے اکثر یہ یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ہمیں نوبل پرائز نہ سہی مگر کوئی قومی ایوارڈ تو کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔ ورما جی آج کے مہذب سماج کی سچی نمائندگی کرتے ہیں اکثر صرف ایک دن کے لئے قرض لے کر کئی دن غائب ہوجاتے ہیں اور مجھے ان کے انتظار میں دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے۔ لیکن بے چارے کریں بھی کیا؟ روپئے کو پہلے پیر ہوتے تھے اب پر لگ گئے ہیں۔ جھونکا ہوا کا ہے ادھر آیا ادھر گیا۔ اتنی بڑی فیملی کا خرچ تنخواہ سے پورا ہونا بھی مشکل ہے۔ پھر سوسائٹی میں اپنا بھرم رکھنے کے لئے بھی تو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آج کل تو بڑی بڑی حکومتیں قرض کی بیساکھی کے سہارے چل رہی ہیں۔ اور قرض کا زریں اصول یہی ہے کہ ایک جگہ سے قرض لو اور دوسری جگہ ادا کردو۔

کال بل دوسری بار بجی تو دروازہ کھولتے ہی مرزا صاحب پر نظر پڑی۔ یونیورسٹی سے کاپیوں کا بنڈل کل ہی پہنچا، اور آج یہ پہنچ گئے۔ اپنے ایک داماد کے لئے سفارش کرنے لگے۔ ویسے تو جب سے امتحان کی کاپیاں میرے پاس آنی شروع ہوئی ہیں اکثر لوگ خود کو کسی نہ کسی بڑے آدمی کا داماد بتاکر مجھ سے نمبر بڑھواتے آجاتے ہیں لیکن مرزا صاحب کا حال عجیب ہے۔ کاپی خواہ کسی بھی یونیورسٹی کی ہو، انٹر کی ہو کہ بی۔ اے کی یا ایم۔ اے کی، آرٹس کی یا سائنس کی، ہر جگہ ان کا کوئی نہ کوئی داماد نکل ہی آتا ہے۔ ایک دن میں نے دل کڑا کر کے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"بھئی مرزا صاحب! آپ کے دامادوں کی صحیح تعداد مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکی۔ آپ ہر سال ــــ"

اور وہ میری بات کاٹ کر کہنے لگے ــــ "بات یہ ہے بھائی صاحب کہ میرے تمام لڑکوں کو تو آپ پہچانتے ہی ہیں۔ اس لئے مجبوراً داماد کا رشتہ تلاش کرنا پڑا۔"

ہاں تو دوسری بار گھنٹی بجی تھی تو مرزا صاحب تشریف لائے تھے اور ابھی میں انھیں رخصت کر کے دروازہ پوری طرح بند بھی نہ کرنے پایا تھا کہ کال بل پھر بجنے لگی۔ اس بار بے قرار چڑاہوی کا سامنا ہوا۔ موصوف بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ جوتے کا کاروبار بھی کرتے ہیں اور سائیڈ بزنس کے طور پر شاعری بھی۔ خود کو اردو میں "شاعرِ قوم" اور انگریزی میں "NATIONAL POET" کہتے ہیں۔ انھیں اس بات کا بے حد فخر ہے کہ انھوں نے شاعری کی روایت سے بغاوت کی ہے اور اپنے نام کے آگے دہلوی یا عظیم آبادی وغیرہ نہیں لگایا ہے۔ ان کا مکان ایک چورا ہے پر واقع ہے، اس لئے وہ خود کو چڑاہوی کہتے ہیں۔ بہرحال موصوف نے سلام کرتے ہی تازہ غزلوں کی فرمائش کر دی ہے۔ ایک بار میں نے دس روپے میں ایک غزل کیا لکھ کر دے دی کہ اب ہر دو تین دن پر نازل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بننے سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں مگر وہ اپنا ایک شعری مجموعہ ضرور چھپوانا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ شعری مجموعہ شائع کر کے شاعروں کی صف میں داخل ہو جانے کی خواہش تو ان کے دل میں برسوں سے انگڑائیاں لے رہی تھی مگر پچھلے دنوں وہ کسی نہ کسی طرح اردو اکاڈمی کی اشاعتی کمیٹی کے ممبر ہو گئے۔ اب اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے۔ کہتے ہیں نیک کام جتنا جلد ہو جائے بہتر ہے۔ اور شعری مجموعہ شائع کرنے سے زیادہ نیک کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں انھیں کیسے بتاؤں کہ آخر مجھے بھی تو غزلیں کہنے کے لئے قدیم شاعروں کے کچھ دیوان الٹنے پڑتے ہیں اور جدید رسالوں کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کاموں کے لئے کچھ تو مہلت چاہئے مگر وہ بے قرار صاحب ہیں کہ جلد از جلد اپنا دیوان چھپوا لینا چاہتے ہیں۔ پچھلی بار انھوں نے اور بھی غضب کیا۔ ایک صاحب کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ کہنے لگے ــــ "یہ بھی علم و ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور مجھ سے کچھ زیادہ ہی خدمت کر سکتے ہیں" میں نے خوش ہو کر ایک غزل ان کے بھی حوالے کر دی مگر بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ غزل قوالیوں میں گائی جا رہی ہے بہرحال اس بار تو ان کی فرمائش پوری کرنی ہی پڑی لیکن آئندہ سے ریٹ بڑھانا ہوگا، آخر انہوں نے بھی تو جوتوں کا دام دوگنا کر دیا ہے۔

چوتھی بار کال بل نے دماغ پر دستک دی تو میں نے کچھ جھنجھلاہٹ کے ساتھ دروازہ کھولا۔ فوراً ہی ایک پڑھے لکھے نمبر "EARLY" کی EARLY IN THE MORNING ایبلی پر نظر پڑی جو چار برس تک میرے شاگرد رہنے کے سبب

[illegible]

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ جب اتنے دنوں تک یہ میرے ساتھ رہ کر کچھ نہ سیکھ پائے تو آج کا کوئی طالب علم کیا سیکھے گا۔ اس ٹیوشن سے مالی فائدے کی بھی زیادہ اُمید نہ تھی، اس لئے میں ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن پھر ان کی بات ٹالنا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ جب سے وہ ایم۔ اے ہوئے تھے شاگرد کی جگہ میرے دوست بن گئے تھے۔ ان کے نام آنے والے خطوط کے جواب میں دے دیا کرتا اور بدلے میں وہ میرے چھوٹے موٹے کام کردیا کرتے اس طرح کوآپریشن سے دونوں کا کام چل رہا تھا۔ فی الحال صرف وعدہ ہی تو کرنا تھا اس لئے کوآپریشن کو برقرار رکھنے کے لئے میں نے ٹیوشن پڑھانے کا وعدہ کرلیا۔ بدلے میں انھوں نے بھی ایک وعدہ کیا۔ کہنے لگے ــــ
"میں ڈیولپمنٹ کمیشن کا وائس چیرمین بنائے جانے کے لئے تمہارے نام کی سفارش کردوں گا ــــ"
مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس عہدے کے لئے وہ خود کوشش فرما رہے تھے۔ بہرحال وہ تو وعدے کرکے رخصت ہوئے اور میں نے ان کے جانے کے بعد اطمینان کی سانس لی کیونکہ جس سمت سے کوئی بڑی بلا گزر جائے اُدھر چھوٹی بلائیں رخ نہیں کرتیں۔

مگر اب کال بل پانچویں بار بجنے لگی ہے۔ اس بار یقیناً میرے آفس کا چپراسی ہوگا۔ بے چارہ ٹھیک نو بجے آجاتا ہے اور میرے گھر کے بہت سارے کام بخوبی نپٹا دیتا ہے۔ اس قدر تجربہ کار اور ہوشیار ہے کہ دفتر چاہے دیر سے پہنچے مگر میرے گھر پر پابندیٔ وقت کے ساتھ پہنچ جاتا ہے۔ میری بیگم صاحبہ کا تو کہنا ہے کہ دفتر کا ملازم گویا اپنا ہی ملازم ہوتا ہے لیکن میں ذرا اصول پسند آدمی ہوں۔ مفت میں نہ کوئی کام کرتا ہوں نہ کسی سے مُفت کام چاہتا ہوں اس لئے اسے دفتر سے روزانہ ایک گھنٹہ پہلے چھٹی دے دیتا ہوں۔

ممکن ہے کہ اس بار کال بل بجانے والا چپراسی نہ ہو بلکہ میرے دوست کا وہ سالا ہو جو تھرڈ ڈویژن میں پاس کرنے والے کسی بھتیجے یا بھانجے کے ایڈمیشن کی سفارش لے کر آیا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ کل جس لڑکے کو میں نے تھیسس کا ایک باب لکھا دینے کا وعدہ کیا تھا وہ ایڈوانس لے کر آیا ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی صاحب صبح صبح قرض مانگنے پہنچ گئے ہوں اور یہ بھی بعید نہیں کہ پچھلے ہفتے میں نے جس دوست سے دو دن کے وعدے پر قرض لیا تھا وہ تقاضہ کرنے آگیا ہو۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی ہے کہ کوئی عزیز رشتہ دار اپنے کسی دوست کے چوتھے پانچویں یا چھٹے بیٹے کی شادی کے لئے سہرہ لکھوانے پہنچ گئے ہوں کیوں کہ مہینہ کی ابتداء میں اکثر تقریبات کا موسم رہتا ہے۔ کل جو مولانا مایوس واپس لوٹ گئے تھے وہ آج پھر چندہ مانگنے بھی آسکتے ہیں اور یہ بھی خدشہ ہے کہ میں مسلسل چار دنوں سے بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی جن محترمہ کو گھور رہا ہوں وہ میری بیوی سے ملنے پہنچ گئی ہوں۔ بہرحال کال بل بج رہی ہے۔ اس کی پکار نے مجھے بے قرار کردیا ہے۔ اس لئے میں اپنی بات نامکمل چھوڑ کر اب اس آواز کی طرف چلتا ہوں۔ ◘◘

ممتاز مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے مضامین

سمن زار

قیمت : ۸/ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

تضمینات

جوہر سیوانی

۱

وفا کے اشارے پہ بہتے تھے دونوں
محبت کے دریا کے دھارے تھے ہم تم
تمہیں خوف شوہر، نہ ہم کو غمِ زن
"بڑا لطف تھا جب کنوارے تھے ہم تم"

۲

بلا کرتے ہیں شب میں چھپ چھپ کے اکثر
لگا ہے محبت کا دونوں کو چسکا
جوانی کے دن کا تقاضا یہی ہے
"تو سولہ برس کی، میں سترہ برس کا"

۳

کل رات اُن سے جھگڑ کے تو گھر سے نکل پڑے
بچے بھی پیچھے پیچھے ہمارے نکل پڑے
ماں کے بغیر بچوں کو نیند آتی کس طرح
"چندہ کو ڈھونڈنے سبھی تارے نکل پڑے"

۴

پایل کا بھی آنگن اک دن چھوٹ جاتا ہے
مٹی کا برتن بھی گر کر پھوٹ جاتا ہے
ظاہر ہے ہر نازک شے کا حشر اے جوہر
"شیشہ ہو یا دل ہو آخر ٹوٹ جاتا ہے"

۵

اصطلاحی گالیوں کا گن چلا کے چل دیئے
اپنے غصّے کا خزانہ، وہ لُٹا کے چل دیئے
آرزو کے آئینے کی کرچیاں چُبھنے لگیں
"دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مسکرا کے چل دیئے"

۶

کچھ لوگ کہہ رہے ہیں تمہیں جھیل کا کنول
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں چمن کا گلاب ہو
شاعر سمجھ رہے ہیں تمہیں اک حسیں غزل
"جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو"

۷

بعد شادی کے مرے ہونٹوں پہ آئی نہ ہنسی
جو بھی دن آیا نئے فکر کا انداز آیا
اس جوانی میں کمر جھک گئی بوڑھی کی طرح
"زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا"

۸

اُن کے اَجداد میں ہوگا کوئی نا کوئی جوہر
جنکی مٹھی میں گرفتار ہے قسمت میری
اپنی بیگم ہو کہ دفتر کے بڑے صاحب ہوں
"رات دن اور دن بناتے ہیں حجامت میری"

۹

ہمارا نام سنتے ہی ارے ظالم ترے ابّا
دھڑا دھڑ منہ سے برساتے ہوئے گالی کا بم نکلے
ترے بھائی نے بھی جی کھول کر خاطر تواضع کی
"بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے"

ایم۔ اے۔ وحید
جدہ (سعودی عرب)

بیوی

"بیوی" عالمِ وجود میں اس وقت آئی جب کہ خود اس کائنات کی تخلیق ہوئی۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ روایات کے مطابق
ضرت آدمؑ کو جنّت سے بے دخل کروانے میں بھی "بیوی" کا ہاتھ تھا۔؟ ان حقائق کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ بیوی ہر
سان کی سماجی ضرورت ہی نہیں بلکہ زندگی کا ایک اہم حصّہ ہوتی ہے۔ بیوی کسی بھی انسان کی زندگی بنانے اور بگاڑنے میں نمایاں حصّہ
ادا کرتی ہے۔ وہ لوگ یقیناً خوش نصیب ہیں جن کی بیویاں خوبصورت ہونے کے علاوہ خوب سیرت بھی ہیں۔ وہ اشخاص قابلِ ہمدردی
ہیں جن کی بیویاں قبول صورت لیکن بدمزاج ہیں ۔۔ اور اُن کے دکھ کا اندازہ کرنا مشکل ہے جن کی بیویاں نہ صرف بدصورت بلکہ
بدمزاج (یا بدسیرت) ہوتی ہیں گویا کریلا نیم چڑھا والی بات ہوتی ہے؟ بہرحال یہ اپنے اپنے نصیب اور انتخاب کی بات ہے ۔!

دانشوروں کا کہنا ہے کہ نوجوان شوہر کے لئے بیوی ایک نعمت، ایک حسین ساتھی اور رفیقِ حیات ہوتی ہے۔ درمیانی عمر کے لوگوں
کے لئے "بیوی" بس سماجی ضرورت کی حد تک اہم ہوتی ہے۔ البتہ بوڑھوں کے لئے بیوی پیرانہ سالی میں ہر وقتی "نرس" ہوتی ہے جو ہر
ایک لمحے میں ان کی تیمارداری کرتی ہے۔ یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ بعض شوقین قسم کے بوڑھے اس عمر میں بھی نوجوان "بیوی" کو رفیقِ حیات
بنانے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ ایک بزرگوار نے بسترِ مرگ پر شادی کی۔ اُن کا آخری وقت آپہونچا تو عزیز و اقارب دیدار اور وراثت
میں ملنے والے مال و متاع کے حصول کی غرض سے ان کے اطراف جمع ہونے لگے روایات کے مطابق وصیت اور آخری خواہش کے بارے میں
دریافت کیا گیا۔ بزرگوار نے فوراً اپنی شادی کی خواہش ظاہر کی اور وہ بھی کسی دوشیزہ سے۔ دوسری طرف ایسی کم عمر خواتین کی بھی کمی
نہیں جو شادی کے معاملے میں لڑکھڑاتے بوڑھوں کو ترجیح دیتی ہیں بشرطیکہ وہ مالدار ہوں لیکن کنجوس نہ ہوں ۔؟ ویسے تقریباً تمام
عورتوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو ممکنہ حد تک کمسن ظاہر کریں ۔!

کچھ لوگ جو خود پسماندہ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں احساسِ کمتری کا شکار ہو کر بڑے گھرانوں میں شادی کرتے ہیں تاکہ اس طرح

اُن کا سماجی رُتبہ بلند ہو سکے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہر بازار، ہر محفل میں اپنی بیویوں کے "اونچے گھرانوں" کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں جبکہ یہی لوگ رسماً بھی اپنے اپنے خاندانوں کا ذکر تک کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر خود اپنے خاندان کی تذلیل پر اُتر آتے ہیں؟ ہم نے ایک صاحب سے اس سلسلے میں دبے الفاظ میں احتجاج بھی کیا۔ اُن کا المیہ یہ ہے کہ ہر بڑا عہدہ دار، وزیر سفیر یا کوئی اور اہم شخصیت کسی نہ کسی رشتہ سے اُن کی بیوی کا عزیز ہوتا ہے ہم نے اُن صاحب کو چھیڑنے کی خاطر اُن کے اپنے خاندان کے بارے میں سوالات کئے جس پر وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ اُنھیں کمزور پاکر ہمارا حوصلہ بڑھا اور ہم نے فقرہ چُست کیا "غالباً آپ سرے سے یتیم ہیں"۔۔؟ ہمارے دوست اس ریمارک پر سخت برہم ہوئے اور ہمیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔!

"بیوی" کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا نہ صرف اہم ہے بلکہ ضروری بھی ہے لیکن یہ کیا حماقت ہے کہ "بیوی" کے سامنے بھیگی بلی بن جائیں۔؟ ایک صاحب کی بیوی جب بھی تشدد پر اُتر آتی ہے تو پنجے جھاڑ کر شوہر کے پیچھے پڑ جاتی ہے اور اکثر و بیشتر صاحب موصوف کی دھول جھٹکا کرتی ہے کیا جھاڑو، کیا جوتا جو چیز ہاتھ لگ جائے اُسی سے اُن کی خبر لیتی ہے۔ بے چارے اپنے سسرال سے ذہنی طور پر اتنے مرعوب ہیں کہ چاہے کھال ادھیڑ جائے کیا مجال جو اُف بھی کریں۔ البتہ بُزدلی کے باوجود ضرورتاً احتیاطی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اپنے جوتوں کا تک انتخاب کرتے وقت اتنی احتیاط ضرور برتتے ہیں کہ چمڑے اور کیل کانٹوں والے جوتوں کے بجائے "ربر" کے آرام دہ جوتے خریدیں۔ (جو بے ضرر ہوں)۔ ایک اور صاحب بیوی کی مسلسل گالی گفتار اور ڈانٹ ڈپٹ کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اب سر بازار کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے سے ڈانٹ کھا کر خندہ پیشانی سے مسکراتے ہیں۔

آج کل ایک عام روش چل پڑی ہے کہ شادیاں "پیکیج ڈیل" "PACKAGE DEAL" کی بنیاد پر ہوتی ہیں جن کی رو سے "شوہر" کو نہ صرف قانونی ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں بلکہ ساتھ ساتھ باقاعدہ طور پر کچھ اخلاقی معاہدات کا بھی پابند کر دیا جاتا ہے۔ شادی میں بھلے ہی جہیز دیں یا نہ دیں اکثر صورتوں میں "بیوی" کے ساتھ دو، چار بھائی بیچارے شوہر کے گلے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ہر پھول کے ساتھ کانٹا لازم و ملزوم ہوتا ہے اُسی طرح ہر خوبصورت بیوی کے ساتھ کم از کم ایک، آدھ "سالا" ضروری ہے۔ بعض صورتوں میں پھول جس قدر دلکش ہوگا اُسی تناسب سے کانٹے ایذا رساں ہوں گے۔ اور بعض لوگوں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اُن کی سیج خاردار ہوتی ہے (بیوی کی بدصورتی کی وجہ سے) بلکہ چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے ہوتے ہیں (پھول سرے سے غائب ہوتا ہے)۔۔!

ایک صاحب مشرقِ وسطیٰ میں برسرِ روزگار ہیں انھوں نے روایات کے مطابق شادی کے موقع پر اپنی ملازمت، تنخواہ اور دیگر اُمور کے بارے میں بُلند بانگ دعوے کئے خیر کسی طرح ان کی شادی ہو گئی اس کے ساتھ ہی اُن کی بیوی کی میکے سے دوامی سے قبل ہی اُن کے چار ہٹے کٹے قسم کے "سالے" اُن کے ہاں پہونچ گئے۔ چار کے چار بھائی نبات خود قیامت سے کم نہیں تھے۔ ایک صاحب پہلوان تھے (جنھوں نے پندرہ دن کے اندر اندر اپنے ہی بہنوئی کو پچھاڑنے کی دھمکی دے دی) دوسرے پتنگ بازی اور کبوتر بازی کے شوقین تھے اور کبھی کبھار تفریحاً کوئی نہ کوئی کام کر لیا کرتے تھے۔ تیسرے صاحب گھوڑ دوڑ کے دیوانے اور پیشہ ور جواری تھے اور چوتھے محول نوشت و خواند سے واقف تھے۔ بالاصر بیچارہ بہنوئی کو معاش تھا اور صدقہ کم اور شیطان زیادہ والا معاملہ تھا۔ "سالوں" کی باز آبادکاری تو گئی، خود بہنوئی کو پردیس میں بے وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک صاحب کی بیوی شوہر کے ہاں پہونچی تو ساتھ میں اپنے بھائی کو بھی لائی بھائی کیا تھا فتنہ و فساد کا جیتا جاگتا مجسمہ تھا۔ چوبیس گھنٹے مفت کی روٹیاں توڑتے توڑتے اس "جائز" رشتہ کا "ناجائز" فائدہ اٹھاتا رہا۔ دن بھر بہن کو بہنوئی کے خلاف، اور بہنوئی کو بہن کے خلاف بھڑکا کر ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولتا رہا۔ بیچارے بہنوئی، کچھ دن مروّت میں خاموش رہے پھر دونوں نے مل کر اسے دھکے دے کر گھر سے باہر کیا تب جاکر انھیں سکون ملا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شادیاں آسمانوں میں طے ہوتی ہیں۔ ہم بھی اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر و بیشتر صورتوں میں شوہر بیوی میں طبیعتوں کے لحاظ سے اتنی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جلد یا بدیر ایک دوسرے کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ اگر شوہر ڈینگیں مارتا ہو تو بیوی بھی سیر کو سوا سیر کے تناسب والی ہوگی۔ اگر شوہر جھوٹ کے قلعے فتح کرتا ہو تو بیوی بھی دروغ گوئی کے میدان میں معرکے سر کرنے لگے گی۔ ایک صاحب کو دوسروں کی جاسوسی کا شوق ہے اس سلسلے میں شوہر بیوی بالکل ہم خیال ہیں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں ملاقات کے بہانے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ شوہر تمام خارجی معاملات مثلاً ڈرائینگ روم سے لے کر میزبان کی ملازمت وغیرہ کی تفصیلات جمع کرتے ہیں۔ اس دوران بیوی داخلی اُمور مثلاً بیڈ روم سے لے کر باورچی خانے تک کے ہر پہلو کا جائزہ لینے لگتی ہیں جب دونوں کے پاس معلومات کا ڈھیر لو ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے تو فوراً کسی اور کے ہاں پہنچ کر اپنا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ توڑ جوڑ کے ماہر ہیں۔ دنگا فساد کرنے میں اتنے باکمال ہیں کہ اب تو اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ کس کس کے درمیان کب کب اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اس تعلق سے باقاعدہ پیشن گوئیاں بھی کرتے ہیں۔ شوہر بیوی کے مزاج اور کردار میں اس قدر ہم آہنگی کو دیکھ کر ہم بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

یوروپ و امریکہ میں بیوی کے رشتہ داروں میں "ساس" کا رشتہ شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہاں کے لوگ کسی قیمت پر "ساس" کو برداشت کرنے تیار نہیں ہوتے۔ درحقیقت وہاں خود شوہر بیوی کے تعلقات میں کبھی جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہر بات سماجی مصلحتوں کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ آناً فاناً شادی اور جھٹ پٹ طلاق عام بات ہے۔ ایک امریکی انجنیئر کو مشرقِ وسطیٰ میں معقول تنخواہ پر ملازمت کا پیشکش ملا۔ چنانچہ وہ امریکہ سے روانہ ہونے لگا تو اس نے بیوی سے خواہش کی کہ ہمسفر ہو۔ بیوی کو مشرقِ وسطیٰ آنا منظور نہ تھا چنانچہ اس نے ایک طرف ساتھ چلنے سے انکار کیا اور دوسری طرف فوراً طلاق حاصل کی۔ بیچارہ شوہر تن تنہا ملازمت پر پہنچا۔ لیکن بیوی کی جُدائی میں اس قدر متاثر رہا کہ چند ماہ بعد خود بھی ملازمت سے استعفیٰ دے کر امریکہ واپس چلا گیا۔ بعد کی اطلاع ہے کہ اس نے پھر سے اپنی "مطلقہ" بیوی سے شادی کر لی۔

ایک گرہست "قسم کے شوہر نے چولہے چکی اور تمام اُمورِ خانہ داری کی ذمہ داری خود سنبھال لی ہے۔ دن بھر گھریلو کاموں میں مصروف رہتا ہے مصالحے پیسنے سے لے کر بچوں کو نہلانا، کپڑے دھونا غرض سب کچھ خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔ بیوی ملازم پیشہ ہے۔ چنانچہ روز شام کو تھکی ماندی گھر پہنچتی ہے تو اس وقت تک شوہر گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر خود بناؤ سنگھار کر کے بچوں کے ساتھ تیار بیٹھا رہتا ہے۔ جوں ہی بیوی گھر میں داخل ہوتی سب مل کر کہیں نہ کہیں گھومنے باہر نکل جاتے ہیں۔ کبھی کبھار اگر بیوی دیر سے گھر پہنچتی ہے تو

شوہر گھر میں پڑے پڑے مختلف وسوسوں اور اندیشوں میں پڑ کر عورتوں کی طرح کبھی سسک سسک کر آہیں بھرتا اور کبھی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا ہے۔ دُکھ تو یہ ہے کہ بے چارے کی اپنی کوئی منزل، کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ بیوی کی ملازمت پہ شوہر کی زندگی کا بھی دار ومدار ہوتا ہے چنانچہ اگر بیوی بمبئی میں نوکری کرتی ہو تو خود بھی وہیں رہتا ہے۔ اگر بیوی کا تبادلہ بنگلور ہو جائے تو پھر یہ بھی اپنا بوریا بستر سمیٹے بنگلور پہنچ جاتا ہے۔ خود غم روزگار سے آزاد ہے اس لئے اور کر بھی کیا ـــ؟

جہاں ایک بیوی کا وجود خود ایک گراں بار سے کم نہیں ہوتا۔ ایک دولت مند نے وقت واحد میں کئی بیویاں پال رکھی ہیں۔ ان کا خاندان بذات خود ایک کالونی سے کم نہیں۔ خیر سے چار بیویاں اور چالیس سے زیادہ بچوں کی کفالت کرتے ہیں۔ بیویوں اور بچوں کا باقاعدہ حساب کتاب رکھنے کے لئے ملازم رکھے گئے ہیں رجسٹر میں تمام بیویوں اور بچوں کا اندراج کیا گیا ہے نام کے بجائے "کوڈ نمبر" استعمال کئے جاتے ہیں۔ سواری کے لئے چھوٹی موٹی کار کے بجائے ایک بس خریدی ہے چاروں بیویوں اور بچوں کو علٰحدہ علٰحدہ رنگوں کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں تاکہ شناخت میں سہولت ہو۔ بچوں کے لئے خود ایک اسکول کھول رکھا ہے۔ جس طرح ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں اسی طرح ان صاحب کی بیویاں بھی ہمہ گیر صفات کی حامل ہیں۔ دو بیویاں جو کسی قدر خوبصورت ہیں یکے بعد دیگرے محفلوں میں ان کے ساتھ جاتی ہیں۔ پہلی بیوی جو تاش کے باون پتوں کو صرف سونگھ کر پہچان سکتی ہیں شوہر کے ساتھ کلب جاتی ہیں۔ دوسری جو گھوڑدوڑ کے تاریخ و جغرافیہ سے بخوبی واقف ہیں ریس کورس جاتی ہیں۔ دوسری دو بیویاں زیادہ تر پردہ میں رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک گھر کی چاردیواری میں رہ کر نگران کرتی ہیں چوتھی بیوی جو ذرا پسماندہ ماحول سے تعلق رکھتی ہیں ریزرو RESERVE میں رہ کر ناگہانی حالات میں فرائض انجام دیتی ہیں۔ مزہ تو اس وقت آتا ہے جب اُن کی چاروں بیویاں اور بچے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ اس وقت نہ صرف گھر کا ماحول آلودہ ہوتا ہے بلکہ سارے علاقے کا امن وامان درہم برہم ہو جاتا ہے اکثر حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں تو انھیں مجبور ہو کر پولیس کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں چنانچہ پولیس مقام واردات پر پہنچ کر کبھی صرف لاٹھی چارج اور کبھی اشک آور گیس کا استعمال کرنے پر مجبور ہوتی ہے تب کہیں جا کر صورت حال پُرسکون ہوتی ہے۔ جب کبھی مطالبات منوانے ہوں ان کی بیویاں اور بچے احتجاجی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ باقاعدہ ہڑتال کرنے کے علاوہ صاحب موصوف کا "گھیراؤ" کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ چار و ناچار انھیں مطالبات قبول کرنے پڑتے ہیں ـــ!

ایک اور صاحب کی شادی بھی المیہ ثابت ہوئی۔ انھوں نے سہاگ رات کو دُلھن کا گھونگھٹ اُٹھا کر چہرہ دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی دولھن کیا تھی چکنی مٹّی کی مورت تھی۔ انھیں وحشت میں کچھ اور نہیں سُوجھا جُنون کی حالت میں سہرے کے پھول نوچ پھینکے، دُولھن کو سیج پر چھوڑا اور خود بھاگ کھڑے ہوئے وہ دن اور آج کا دن، ابھی تک بیوی کی صورت نہیں دیکھی اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں!

ایک اور صاحب جو معاشی حیثیت سے زیادہ مستحکم نہیں ہیں تین دفعہ شادی کر کے اپنی زندگی کو "تین تیرہ" نو اٹھارہ" کئے بیٹھے ہیں ان کی تنگدستی کو دیکھ کر اُن سے ان پے در پے حماقتوں کی وضاحت کے لئے کہا گیا تو اُن کا جواب خاصا دلچسپ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کی پہلی شادی محبت کی شادی تھی جو انھوں نے رجسٹرار کے دفتر میں کی تھی۔ اس کے بعد اُن کے ماں باپ نے ضد کر کے انھیں پھر ایکبار قاضی کے روبرو شادی کے لئے مجبور کر دیا۔ پھر ملازمت کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے تو ایک مالدار تاجر نے جس کی بیٹی بدصورتی

کی وجہ طویل عرصے تک غیر شادی شدہ تھی، اصرار کرنے کہا کہ اگر وہ اُس کا بوجھ اپنے سر لیں گے تو ملازمت کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے چنانچہ صاحب موصوف تین تین بیویوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں۔

ع مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

غزل

خواہ مخواہ

نرگسِ بیمار کی باتیں کرو
یا نگاہِ یار کی باتیں کرو

ایک ہی مطلب ہے مضمون الگ
دو اور دو یا چار کی باتیں کرو

جب ملے جھگڑے سے فرصت دگھڑی
ہوسکے تو پیار کی باتیں کرو

دشمنوں کی دشمنی تو ہے اٹل
دوستِ دلآزار کی باتیں کرو

امن جب ہونے لگے ناپائیدار
مستقل پیکار کی باتیں کرو

جب عدو باتیں نہ مانے صلح کی
توپ اور تلوار کی باتیں کرو

ڈوبتوں سے مت کرو ساحل کی بات
ان سے تو منجدھار کی باتیں کرو

آتشِ دوزخ کے چرچے ہو چکے؟
اب گل و گلزار کی باتیں کرو

دیکھنا ہے چاند کو گر ابر میں
زلف اور رخسار کی باتیں کرو

جن پر حسرت کی نظر کی تھی کبھی
اُن درو دیوار کی باتیں کرو

صرف پہلی ہی کے دن اے دوستو!
ساز اور جھنکار کی باتیں کرو

دوسری کو بچ گئے پیسے اگر
کوچہ و بازار کی باتیں کرو

دس تلک چلو اگر باقی بچے
چائے پر اخبار کی باتیں کرو

بیس تک دفتر اور گھر کے درمیاں
تیز تر رفتار کی باتیں کرو

قرض کے پیسوں سے تم انتیس تک
گھر کے کاروبار کی باتیں کرو

آخری دن خوب غصے میں رہو
حجت و تکرار کی باتیں کرو

پھر اسی شب صبح کی اُمید میں
میٹھی میٹھی پیار کی باتیں کرو

خواہ مخواہ کب تک پُرانی شاعری
کچھ نئے اشعار کی باتیں کرو

غزل

ظفر کمالی

حال جس شخص کا اس دور میں ابتر ہوگا　　وہ کوئی اور نہیں کوئی سخنور ہوگا
کج روی چھوڑ دو اے دوستو سُن لو میری　　ورنہ ہاتھوں میں مرے طنز کا پتھر ہوگا
میں نے پوجا ہے نہ پوجوں گا کبھی بت تیرا　　پوجتا ہے جو تجھے وہ کوئی آذر ہوگا
آج سمجھتے ہو جسے چور اُچکا لوگو　　کل کو دیکھوگے وہی قوم کا رہبر ہوگا
یاد آنے لگے نیتاؤں کو جب جنتا کی　　تو بلاشبہ الکشن کا وہ چکر ہوگا
چہرے پہ کرب تفکر کی جھلک آنکھوں میں　　ہے یہ پہچان کہ اس دور کا شوہر ہوگا

○

عالم تاجپوری

حجامت عاشقوں کی پھر سرِ بازار ہو جائے　　کوئی چنچل حسینہ جب بھی پاکٹ مار ہو جائے
کبھی نوبت نہ آئے بینک میں گڑبڑ گھٹالے کی　　جو منیجر کا سالا اُس میں چوکیدار ہو جائے
وزارت کی جہاں کرسی پہ بیٹھے ہوں کروڑی مل　　تعجب کیا جو دو کوڑی کی وہ سرکار ہو جائے
اُڑائیں کیوں نہ ہم بھی گوشت مچھلی اور ملپوئے　　جو بیٹا چار سو بیسی کا ٹھیکیدار ہو جائے
مرا اسٹارٹ کل سے اینول اکزامینیشن ہے　　مسالا نقل بازی کا کوئی تیار ہو جائے
محافظ ہے خدا شعر و ادب کا دورِ حاضر میں　　کوئی بھی خوش گلو شاعر اگر فنکار ہو جائے
بنایا دھرم شالا گھر کو ہم نے اِس لیے ڈیڈی　　کہ اُس میں منتقل ہر ایک رشتہ دار ہو جائے
یقیناً پھاند ہی جائے گا وہ دیوارِ جنت کو　　ہمارا شاعرِ اعظم اگر بیزار ہو جائے
اِدھر بیگم کی دُر دُر اور اُدھر احباب کی بھن بھن　　خدائی قہر ہے جب آدمی بے کار ہو جائے
ترقی کی بلندی پہ وہی تو گامزن ہوگا　　کہ جس کے ذہن و دل کی اہلیہ مختار ہو جائے

میرے ہوش و خرد کا گر یہی عالم رہا کچھ دن
تعجب کیا اِنھیں میں جو تو بیزار ہو جائے

غزل

○

مجیب الرحمٰن بزمی

اُن سے پوچھا کہ عارضہ کیا ہے　　ہنس کے بولے کہ مدعا کیا ہے
کہتے پھرتے ہیں باوفا خود کو　　"جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"
میں بھی پاکٹ میں نوٹ رکھتا ہوں　　"کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"
سب سے گھل مل کے بات کرتے ہیں　　"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"
گندم و باجرا سے واقف ہوں　　کچھ تو بولو یہ "دادرا" کیا ہے

ثنا بابمشہ

آٹو رکشا کرایہ پر

صنفِ نازک کے لئے مَرد کو کئی معرکے انجام دینے پڑتے ہیں جس میں چند معرکے بہت مشہور ہوئے ہیں جیسے لیلا کے لئے مجنوں کا صحرا میں بھٹکنا اور شیریں کے لئے فرہاد کا پہاڑ میں سے نہر نکالنا۔ کوہکن فرہاد کی خدمات کا صلہ دینے کے لئے محاورہ "جوئے شیر لانا" بنایا گیا ہے اور آج کل حیدرآباد میں آٹو رکشا کرایہ پر حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مساوی ہے۔ اکثر و بیشتر صنفِ نازک کے لئے آٹو رکشا درکار ہوتے ہیں۔ ویسے مَرد بھی اس سواری کو استعمال کرتا ہے لیکن حتی الامکان وہ اس مصیبت سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہے اور آٹو رکشا کرایہ پر حاصل کرنے کا معرکہ صنفِ نازک کے لئے انجام دیتا ہے۔

آٹو رکشا عجیب و غریب سواری ہے۔ یہ سواری کسی طرف سے سمجھ میں نہیں آتی۔ سواری تکونہ ہوتی ہے۔ کہیں سے بھی سمجھنے کی کوشش کبھی ایک کونہ میں آکر الجھن بن جاتی ہے۔ علم ہندسہ کے مطابق آٹو رکشا کی جبلت میں ٹکراؤ ہے یہ ٹکراؤ طاق عدد پہیوں اور جفت عدد مسافرین کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باوجود کوشش کے آٹو رکشا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی طرح حیدرآباد کے آٹو رکشا ڈرائیور بھی ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ سواری کی طرح آٹو رکشا ڈرائیور کی بھی اپنی ایک منفرد قسم ہوتی ہے بلکہ ہم تو انھیں ایک مختلف مخلوق کہنا پسند کریں گے ہر آٹو رکشا ڈرائیور ایک ہی طرح کا ہوتا ہے ان میں فرق کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے آٹو رکشا ڈرائیور حکم سنتے ہیں اور نہ ہی التجاء سُنتے ہیں آٹو رکشا ڈرائیور کچھ زیادہ ہی جمہوریت پسند اور شخصی آزادی کے حامل ہوتے ہیں۔ وہی کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔

آٹو رکشا کرایہ پر حاصل کرنا مرحلہ وار معرکہ ہوتا ہے۔ اس معرکہ کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ خالی آٹو رکشا ملنے کا ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں آٹو رکشا ڈرائیور کو مطلوبہ جگہ چلنے کے لئے راضی کرنا ہوتا ہے۔ تیسرا اور آخری مرحلہ کرایہ کا مول تول کرنا ہے۔

چلتے ہوئے یا ٹھہرے ہوئے سواری کے ساتھ یا خالی آٹو رکشے شہر میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ آٹو اسٹانڈ پر بھی کئی آٹو رکشا ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ آٹو اسٹانڈ سے آٹو رکشا کرایہ پر نہیں چلتے، وہ وہاں آرام کرلے، ایک دوسرے سے ملنے یا نوک

ے کاموں کے لئے ٹھہرے رہتے ہیں۔ لہٰذا خالی آٹو رکشا کی تلاش کہیں بھی سڑک کے کنارے ٹھہر کر کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ مرحلہ ہوتا ہے آنکھیں پیلے رنگ کو تلاش کرتی رہتی ہیں، کان مخصوص آواز سُننے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں ناک پٹرول اور مٹی کے تیل کی ملی جلی بو سونگھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اور ہاتھ پیر آٹو رکشا کی طرف لپکنے کے لئے بے چین ہوتے ہیں۔ آٹو رکشا نظر آتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ لگتا ہے دونوں جہاں کی نعمت مل گئی۔ آٹو رکشا گاہک کی طرف بڑھتا ہے اور گاہک آٹو رکشا کی طرف بڑھتے ہوئے "آٹو... آٹو" کی ہانک لگاتے ہیں جواب میں کبھی ڈرائیور کی آواز آتی ہے "بازو ہٹو" تو اکثر ہارن بجتا ہے "ہاٹو.... تو... ہٹو .... ہاٹو..." اور آٹو رکشا گاہک کی نظروں میں دھول جھونکتے ہوئے گاہک سے دور چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات ڈرائیور گاہک سے چوہے بلّی کا کھیل بھی کھیلتے ہیں۔ "آٹو... آٹو..." کی آواز سُن کر آٹو رکشا کچھ دور لے جاکر روکتے یا آہستہ کرتے ہیں۔ گاہک آٹو رکشا کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور جب قریب پہنچتے ہیں تو آٹو رکشا دھواں چھوڑتا ہوا آگے چلا جاتا ہے۔ گاہک کھانستے، کپڑے جھٹکتے اور دل ہی دل میں کوستے ہوئے دوسرے آٹو رکشا کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ بعض وقت خالی آٹو رکشا حاصل کرنے کا دلچسپ مرحلہ خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ آٹو رکشا کے لئے اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ میں کبھی حادثہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو آٹو رکشا کرایہ پہ حاصل کرنے کے پہلے مرحلے ہی میں ناک آؤٹ ہوئے۔ انھیں دواخانہ پہونچا دیا گیا۔ آج کل ہم ان کی عیادت کرتے ہیں۔

خالی آٹو رکشا حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ میں طبیعت نڈھال ہو جاتی ہے "آٹو... آٹو..." چیخنے چلانے اور سڑک کے گرد و غبار سے گلے میں خراش ہونے لگتی ہے آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پیر میں درد ہونے لگتا ہے۔ گاہک تھک کر سڑک کے کنارے دیوار یا کھمبے کا سہارا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب کبھی آٹو رکشا گزرتا ہے تو صرف ہاتھ کے اشارہ سے بُلانے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح سے کچھ دیر سستانے کے بعد پھر سے از سر نو خالی آٹو رکشا کی تلاش شروع کرتے ہیں۔ کوشش اور تھکن، پھر کوشش اور پھر تھکن کے لامتناہی سلسلہ میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ ایک وقت زوجہ محترمہ کو درد زہ شروع ہونے پر ہم نے گلی کے نکڑ پر آٹو رکشا کی تلاش شروع کی۔ لمحوں سے منٹ بنے اور منٹوں سے گھنٹے اور قریب تھا کہ گھنٹوں سے دن بھی ختم ہو جاتا، ہمارے پڑوسی نے آکر ڈھارس دی "آٹو رکشا نہیں ملا۔ کوئی بات نہیں۔ گھر چلئے آپ کو لڑکا ہوا ہے۔ اب اسے ہی آٹو رکشا لانے کے لئے بھیجیں گے۔"

کافی وقت گنوانے اور بہت ساری قوت صرف کرنے کے بعد کوئی ایک خالی آٹو رکشا دستیاب ہوتا ہے۔ ہونا تو یوں چاہئے کہ گاہک آٹو رکشا میں بیٹھ جائیں اور ڈرائیور میٹر چالو کر کے آٹو رکشا اسٹارٹ کردے کچھ دیر بعد گاہک سے پوچھے "صاحب! آپ کو کہاں لے چلوں" اس طرح صرف خیالوں میں ہوتا ہے۔ خالی آٹو رکشا دستیاب ہونے کے بعد اُسے اپنی مطلوبہ جگہ چلنے کے لئے راضی کرنا ہوتا ہے۔ گاہک اور آٹو رکشا ڈرائیور میں بات چیت ہوتی ہے اور ہر مذاکرہ کی طرح بات چیت بیچ ہی میں ٹوٹ جاتی ہے۔ آٹو رکشا واک آؤٹ کرتا ہے۔ اور گاہک پھر سے خالی آٹو رکشا کی تلاش میں لگ جاتا ہے جہاں گاہک جانا چاہتا ہے وہاں آٹو رکشا چلنا نہیں چاہتا۔ ڈرائیور صاف انکار کر دیتا ہے "اُدھر نہیں چلنا ہے" اور اپنا آٹو رکشا بڑھا لے جاتا ہے۔ بعض

ڈرائیور گاہک کی ناراضگی کا خیال کرتے ہوئے بہانے بناتے ہیں "ادھر ٹریفک زیادہ ہوتی ہے"، "واپسی میں سواری نہیں ملتی" "آج ادھر آٹو رکشا اور ڈرائیور کو پکڑ رہے ہیں" "گاڑی بند کرنا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ گاہک کی تھوڑی سی بھی غیر ذمہ دارانہ بات چیت سے ڈرائیور ناراض ہوکر آٹو رکشا میں ہوا ہوجاتے ہیں یا پھر نقص امن کا اندیشہ رہتا ہے۔ اسی لئے ہم اکثر ڈرائیور سے مودبانہ بات چیت کرتے ہیں۔ نظریں نیچی کئے، ہاتھ باندھے عرض گزارش کرتے ہیں۔ "بھائی صاحب! مجھے فلاں جگہ چلنا ہے۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور آپ راضی و خوش ہیں تو کیا میں آٹو رکشا میں بیٹھ جاؤں!!"

آٹو رکشا ڈرائیور گاہک کی بتلائی ہوئی جگہ چلنے کے لئے تیار بھی ہوجائے تو اس کی رضامندی مشروط ہوتی ہے "تین سے زائد سواریاں نہیں بٹھاؤں گا (چاہے چوتھی سواری دودھ پیتا بچہ ہی کیوں نہ ہو) راستے میں آٹو رکشا کہیں نہیں ٹھہراؤں گا" "آٹو رکشا خراب ہونے پر آٹو کو دھکے دینا ہوگا" "راستے میں کہیں بھی سواریوں کو چھوڑ کر جانے کی آزادی حاصل رہے گی" الغرض گاہک آٹو رکشا ڈرائیور کے رحم و کرم کے محتاج بن کر سفر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آٹو رکشا ڈرائیور نے ہماری بتلائی ہوئی جگہ چلنے کے لئے شرط رکھی "صاحب آٹو رکشا میں تھوڑی سی خرابی ہے اسے درست کروائیے گا پھر میں آپ کو لے چلوں گا" ضرورت بڑی بُری چیز ہوتی ہے ہم نے آٹو ڈرائیور کی شرط مان لی۔ ہمیں کرایہ کی رقم اور اس سے کئی گنا زائد رقم درستگی کے لئے ادا کرنی پڑی۔

خالی آٹو رکشا ملنے کے بعد کرایہ کے لئے بھاؤ تاؤ کرنا بہت ہی تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔ ہر آٹو رکشا میں پولس اور روڈ ٹرانسپورٹ محکموں کو بہلانے اور عوام کو دھوکہ دینے کے لئے میٹر نصب ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی آٹو رکشا میٹر پر چلتا ہے۔ ہم نے ایک آٹو رکشا ڈرائیور سے دریافت کیا "کیا آپ کا آٹو میٹر سے چلے گا" جواب دیا گیا "صاحب آٹو رکشا پٹرول سے چلتا ہے اور ڈرائیور اسے پیسے کے لئے چلاتا ہے۔ میٹر کا کوئی کام نہیں ہوتا اسے مجبوراً نصب کرایا جاتا ہے" اور اسی لئے اکثر آٹو رکشا ڈرائیور محکمہ پولس اور محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ کو بہلانے کے لئے میٹر چلاتے ہیں لیکن گاہک سے من چاہا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ چند آٹو رکشا ڈرائیور بامروت ہوتے ہیں۔ وہ میٹر کو عزت دیتے ہوئے آٹو رکشا میٹر سے چلاتے ہیں لیکن آٹو رکشا ڈرائیور کی قوم سے ہونے کے ناطے میٹر سے دو تین روپیہ اضافہ مانگتے ہیں۔ میٹر سے زائد اور من مانی کرایہ وصول کرنے کے لئے آٹو رکشا ڈرائیور کئی طرح کا عذر لنگ پیش کرتے ہیں "رات ہوگئی ہے" "پانی پڑ رہا ہے" "دھوپ تیز ہے" "ایک بچہ زائد ہے" "واپسی میں سواری نہیں ملتی" "سامان ساتھ ہے" "اپنے موڈ کے خلاف آٹو رکشا چلا رہا ہوں"۔

ڈرائیور ہر طرح کی من مانی کرنے اور گاہک ہر قسم کا ظلم سہنے کے بعد آٹو رکشا کرایہ پر حاصل ہوتا ہے۔ آٹو رکشا کرایہ پر ملنے کے بعد بھی گاہک کی مشکلات کم نہیں ہوتیں۔ گاہک آٹو رکشا میں با ادب با ملاحظہ ہوشیار بیٹھے ہیں کچھ تو سواری کا تقاضہ ہوتا ہے اور کچھ ڈرائیور کے روٹھ جانے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ ان تمام مشکلات اور مظالم کا اندازہ ہر کسی کو رہتا ہے اور حکومت نے مظلوم پر ظلم کم کرنے کے لئے گاہک کو شکایت کرنے کی ہدایت دی ہے۔ طریقۂ شکایت بہت آسان ہے۔ پوسٹ کارڈ چھپوا کر جگہ جگہ رکھ دیئے گئے ہیں۔ گاہک کو صرف آٹو رکشا کا نمبر درج کرنا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بھی شاید ہی کوئی گاہک شکایت

کرتا ہے اندیشہ رہتا ہے کہ شکایت پر حکومت کی کارروائی کے خلاف آٹو رکشا ڈرائیور ہڑتال نہ کردیں۔ ویسے اگر کوئی شکایت کرنے کی ٹھان ہی لے تو اسے پتہ چلے گا کہ ایک دانہ ہی نہیں پورا انار کھٹا ہے ایک وقت ہم نے شکایت کرنے کی نیت سے آٹو رکشا ڈرائیور کے نمبر نوٹ کرتے گئے۔ ایک گھنٹہ کی مدت میں کاغذ پر اتنے نمبرات درج ہو چکے تھے کہ اس پر ہمیں میٹرک کے سپلمنٹری نتیجہ کا گمان ہونے لگا۔ ڈھیر سارے نمبرات دیکھ کر شکایت کرنے کے لئے ہمیں خود شرم آنے لگی اور ہم نے اس کاغذ کے ٹکڑے کر دیئے۔

آٹو رکشا کرایہ پر حاصل کرنے کے ارادہ سے جو پریشانی اور مصیبتیں شروع ہوتی ہیں وہ سفر ختم ہونے تک موجود رہتی ہیں۔ کرایہ کی رقم ادا کرکے ان سے چھٹکارا ملتا ہے۔ ڈرائیور کی کوشش رہتی ہے کہ وہ گاہک سے مطلوبہ رقم سے زائد اینٹھ لے۔ اسی لئے اس کے پاس ہمیشہ چلر نہیں رہتا اور ہر سواری اس کی پہلی سواری ہوتی ہے۔ کرایہ کی منجملہ رقم دینے پر ڈرائیور مسکراکر قبول کرتا ہے۔ جو کچھ پیسے ڈرائیور واپس کردے اس کی مہربانی ہوگی۔ اگر گاہک بقیہ رقم کا مطالبہ کرے تو ڈرائیور اسے گھور کر دیکھتا ہے جیسے گاہک نے اسے گالی دی ہو۔ ایک وقت ہم نے تیس پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت ڈرائیور نے ہمیں ڈانٹ پلائی۔ "آپ پیدل کیوں نہیں چلے آئے آٹو رکشا میں بیٹھے ہیں تو "پیدل آدمی" کی حرکتیں مت کیجئے گا۔"

مختصراً ہم حیدرآبادیوں کے لئے آٹو رکشا کرایہ پر حاصل کرنا اور اس میں سفر کرنا دشوار کن اور وبال جان معرکہ بن گیا ہے۔ اس معرکہ کو صنفِ نازک کے لئے انجام دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے اکثر حیدرآبادی بیوی اپنے شوہر کو طعنہ دیتی ہے۔ "جائیے! آپ کیا خاک ہم سے محبت کرتے ہیں۔ سال بھر میں ایک بار بھی آٹو رکشا کرایہ پر حاصل نہیں کرسکے!" ■■

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

اب آپ کی پسندیدہ

لاسا اسپیشل چائے اور

لمسا چاکلیٹ چائے نے اپنے

۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ مکمل کرلئے ہیں

سرسوتی سرن کیف

چنڈی گڑھ

پڑھنا مقالہ

حضرت ادیب کا سیمینار میں

میں دفتر میں اپنی میز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ کچھ کچھ غنودگی آرہی تھی۔ دراصل گزشتہ ہفتے بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ رسالہ نکلنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ کاتب کو ڈانٹ ڈپٹ اور اس کی خوشامد ایک ساتھ کرنی پڑی تھی اور کسی طرح سے تین روز کے اندر اس سے پورے مواد کی کتابت کرائی تھی، روزروز پریس والوں کے سر پہ چڑھ کر چھپائی کرائی تھی، ایک دن ڈائرکٹر صاحب کے آگے پیچھے رہ کر اس شمارے کو منظور کرایا تھا اور آج صبح سے ایک بجے تک ڈاک خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی سخت سست سن کر اور ان کی خوشامد کرکے انھیں اس بات پر راضی کیا تھا کہ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے پر بھی پرچوں کو مقررہ ریٹ پہ بھیجنا منظور کریں۔ ارادہ تھا کہ شام تک اسی طرح میز پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھوں گا۔ چپراسی سے کہہ دیا تھا کہ ٹیلیفون آئے یا کوئی ملنے والا جواب یہی دینا کہ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ کہیں باہر گئے ہیں۔ خصوصاً ادیب صاحب کا خیال رکھنے کے لئے کہا تھا، ہدایت دی تھی کہ انھیں زینے پر بھی نہ چڑھنے دینا۔

لیکن آرام تو تبھی ملتا ہے جب خدا آرام دینا چاہے۔ ہوا یہ کہ چپراسی کے بند ھے ٹکے جواب پر جو منمنی سی آواز آئی اس نے مجھے اپنی جگہ سے اٹھنے کے لئے مجبور کر دیا۔ میں نے کیبن سے باہر نکل کر زور سے آواز دی "السلام علیکم عنبر چچا" تشریف لایئے"۔

"ارے چپراسی تو کہہ رہا تھا کہ تم ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ کہیں گئے ہو" منمنی سی آواز میں اب خوشی جھلک رہی تھی۔

"گیا تو تھا لیکن جلد چھٹی ہوگئی۔ ابھی آیا ہوں۔ چپراسی کو میرے آنے کے بارے میں معلوم نہیں تھا، میں آیا تھا تو یہ کہیں گیا ہوا تھا"۔ جھوٹ بول کر چپراسی کی عزت رکھنا ضروری تھا۔ دفتر میں افسر اور ماتحت جھوٹ کے ذریعہ ایک دوسرے کا بھرم قائم نہ رکھیں تو کام ہی نہ چلے۔

میں نے کہا "آپ اندر تو تشریف لائیں۔ ادھر ہاں رام مگن، فوراً دو پیالے چائے لاؤ، عمدہ سی۔"

عنبر انصاری صاحب کو اندر تو لے آیا لیکن تعجب ہو رہا تھا کہ بزرگ وار نے آج ادھر آنے کی زحمت کیسے گوارا کی۔ یونیورسٹی میں رہتے تو کبھی کبھی ادھر اُدھر چلے بھی جاتے تھے۔ دو سال پہلے ریٹائر ہوئے ہیں اُس وقت سے گھر ہی میں تصنیف و تالیف میں مستغرق رہتے ہیں، کہیں آتے جاتے نہیں۔ والد مرحوم کے دوستوں میں سے تھے اس لئے ویسے بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

"اور فرمائیے" میں نے گفتگو شروع کرنے کے انداز میں کہا۔

"بھئی زمانا کیا ہے۔ عجیب الجھن میں پڑ گیا ہوں.... یہ ادیب جیا نسوی...."

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ پھٹ سا پڑا۔ "چچا جان معاف فرمائیے گا۔ آپ کی بزرگی اور لیاقت مسلم لیکن کبھی کبھی آپ بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اُس نالائق سے آپ بات ہی کیوں کرتے ہیں؟"

"بھائی، اس سے بات کون کرتا ہے۔ لیکن وہ کسی کا پیچھا چھوڑتا ہے؟ آج صبح ہی آ دھمکا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے گیا ہے۔ کھانا تو میرے ساتھ کھایا ہی' یہ بھی چاہتا تھا کہ اسے ہضم کرنے کے لئے میرا دماغ کھائے۔ میں نے یہ کہکر پیچھا چھڑایا کہ مجھے قیلولہ کرنے کی عادت ہے، نہ کروں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ لیکن پانچ بجے شام کو پھر آنے کی دھمکی دے گیا ہے۔"

"آپ ایک کُتا کیوں نہیں پال لیتے؟" میں نے فضا کا بوجھل پن کم کرنے کے لئے کہا۔

"کُتا پالنا ریٹائرڈ پروفیسر کے لئے مہنگا سودا ہے۔" مُنیر صاحب بولے۔ پھر قدرے مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اور بیکار بھی ہے۔ چوری کا مجھے خطرہ نہیں۔ شہر کا ہر چور جانتا ہے کہ پروفیسر صاحب کے پاس پُرانی کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ رہی ادیب صاحب کی بات، تو میرا خیال ہے کہ شاید ہی دنیا کا کوئی کُتا ان سے زیادہ بھونک سکے۔ اب آئے دن کون کُتے سے ان کا مباحثہ سنے۔"

میرا چھوٹا سا کیبن کافی دیر تک قہقہوں سے گونجتا رہا۔ پھر میں نے کہا "خیر آج کیا فرما گئے ہیں؟"

"کہتا ہے میرا مقالہ تیار کرا دو ...."

"مقالہ؟ اُسے مقالے سے کیا لینا دینا؟"

"میاں کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے تو لینا ہی لینا ہوتا ہے۔ دنیا اسے کیا دیگا! محکمہ السنہ نے سماجیت پسند ناول نگاروں کے متعلق ایک سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگلے مہینے یہ سیمینار ہونے والا ہے۔ ان حضرت نے ڈپارٹمنٹ کے ڈپٹی ڈائرکٹر کے پیچھے پڑ کر اپنے لئے جگہ پیدا کر لی ہے۔ اب یہ مولوی نذیر احمد پر مقالہ پیش کریں گے۔"

"لاحول ولاقوۃ، ادیب اور مقالہ! میرا خیال ہے اس نے نذیر احمد کا نام بھی نہیں سُنا ہوگا۔"

"اب سُن لیا ہے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر کھنہ صاحب نے پوچھا کہ آپ کس پر مقالہ پڑھیں گے تو اُس نے کہا جس پر آپ کہیں۔ انہیں نذیر احمد پر مقالہ پڑھنے کے لئے کوئی نہیں مل رہا تھا چنانچہ ان صاحب کے سر پر تھوپ دیا گیا۔ کھنہ صاحب نے مجھ سے مقالہ لکھنے کے لئے کہا تھا لیکن میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں اس لئے میں نے معافی مانگ لی۔" مُنیر صاحب نے حالات پر روشنی ڈالی۔

"اور اب آپ وہی مقالہ اپنے نام کی بجائے ان کے نام سے لکھیں گے۔ یہی نا؟" میں نے قدرے تلخی سے کہا۔

منحنی سی آواز اور رقت آمیز ہو گئی "اسی لئے تو تمہارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ کسی طرح میرا پیچھا چھڑا دو۔"

عجیب حالت ہے۔ میں نے کسی طرح ادیب کی بے ادبی سے پیچھا چھڑایا تو بزرگوار اب پھر اسی دلدل میں مجھے دھکیلنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کروں۔ تیرنے کی مشق کم ہو تو بھی کسی کو ڈوبتے تو نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا "اچھا پہلے مجھے اس سے تو بات کر وا دیں۔"

محکمہ السنہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر پریم کرشن کھنّا میرے کالج کے زمانے کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ میرا ان سے بات چیت کرنے کا طریقہ وہی ستائیس برس پہلے کا کالجیانہ طریقہ ہے۔

ٹیلیفون ملایا تو آواز آئی "کھنّا ہیئر"۔

"یور چچا جان ہیئر۔ سالے بے وقت کی اولاد، یہ کیا جھک ماری ہے؟"

مصنوعی غصّے کے لہجے اور گالیوں کی طوفانی آمد و رفت کے درمیان جو اطلاع ملی وہ یہ تھی کہ چار روز تک حضرت ادیب جالنوی اُن کے پیچھے پڑے رہے اور انھیں دھمکی دیتے رہے کہ مقالہ پڑھنے کا موقع نہ دیا تو منسٹر صاحب سے شکایت کر دوں گا۔ اس دھمکی سے کھنّا صاحب کو دبنا پڑا کیوں کہ منسٹر صاحب کو خُدا کے فضل سے کسی زبان کے ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے اور ایک تقرری کے معاملے میں وہ کھنّا صاحب سے ناخوش بھی ہیں۔ میں نے کھنّا سے کہا "تو دھوکا کھا گیا یار۔ ادیب کو منسٹر کے ہاں کون گھسنے دیتا؟ خیر، جو ہونا تھا ہو گیا۔" میری کھنّا سے کچھ اور بھی گفتگو ہوئی جو نہایت پرائیویٹ قسم کی تھی۔

اب میں نے مُنیر صاحب پر دھیان دیا۔ شرارت آمیز تبسم کے ساتھ کہا "میں آپ کو چھٹکارا دلا دوں گا لیکن ایک شرط ہے۔ آپ اپنی کتاب کو طاق پر رکھیئے اور میرے رسالے کے لئے اگلے مہینے تک حسرت موہانی پر ایک مضمون لکھ دیجیئے۔ ادیب کو میرے حوالے کر دیجئے۔"

منحنی سی آواز کے ساتھ منحنی سی ہنسی بھی شامل ہو گئی "بڑے شریر ہو۔ خیر، سودا مہنگا نہیں۔ مجھے منظور ہے۔"

شام کو چائے پینے کے بعد میں بال بچوں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ ادیب صاحب نازل ہو گئے۔ فرید کی طرف دیکھ کر بولے "کہیئے حضرت، آج کچھ بات کرنے کی اجازت ہے یا آج بھی . . ."

میں نے کہا "فرید، انکل سے معافی مانگ لو۔ اور آپ بھی ادیب صاحب بچوں کی باتوں پہ . . ."

"ارے نہیں صاحب۔ بچے تو آپ کے لاکھوں میں ایک ہیں اور بچوں میں شوخی نہ ہو تو بچے ہی کیا رہے۔"

"فرید، اب تو معافی مانگ لو" میں نے پھر کہا۔ فرید نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں۔

ادیب صاحب نے مشکل حل کر دی "میں نے معافی مانگے بغیر ہی انھیں معاف کر دیا۔" اور پھر ان کا تنہا فلک شگاف قہقہہ۔

سب کچھ پہلے ہی طے تھا۔ نہ ادیب صاحب وقت ضائع کرنا چاہتے تھے نہ میں۔ ڈرائنگ روم کا باہر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں نے مقالہ بولنا شروع کر دیا اور ادیب صاحب نے لکھنا۔ بچے منہ پھاڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس قسم کی ادبی بددیانتی میں میں کیوں کھل کر حصہ لے رہا ہوں۔

اس درمیان بچوں کے ادبی ذوق نے کچھ دقت پیدا کر دی۔ ایک موقعے پر فرید بولا "لیکن ابّو بازارِ حسن تو پریم چند . . ."

"تم اپنے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ فرید خاموش ہو گیا لیکن اسے میرے مجنوں ہونے کا یقین ہونے لگا تھا۔

ڈکٹیشن چلتی رہی۔ کچھ دیر میں بانو نے ٹانگ اڑائی "یہ تو مرزا ہادی رسوا کا . . ."

مجھے پھر بگڑتا پڑا "تم بڑے لوگوں کے بیچ میں بہت بولنے لگی ہو۔ لڑکیوں کو خاموش رہنا چاہئے۔ تم اندر جاکر باورچی خانہ کیوں نہیں دیکھتیں؟ تمہاری امّی کو دیر لگ سکتی ہے۔"

ترکیب کام کرگئی۔ رات کے دس بجے مقالہ ختم ہوا۔ ادیب صاحب باغ باغ۔ انہیں اس بات کا بھی غم نہیں تھا کہ کسی نے انھیں کھانے کے لئے نہیں پوچھا۔ میں نے اندر جاکر بیگم صاحبہ سے بات کرلی تھی، وہ ڈرائنگ روم میں آئیں ہی نہیں۔ میں نے باورچی خانے ہی میں چپکے سے کھانا کھالیا تھا۔ ادیب صاحب نے شاید خوشی کے مارے اس رات کھانا ہی نہ کھایا ہو۔ کھاتا بھی کہاں سے ہوگا، ہوٹل تو بند ہوگئے ہوں گے۔ لیکن نیند مجھے بھی دیر تک نہیں آئی۔

دراصل ادیب صاحب کو مقالہ لکھوانے پہ میرا کام ختم نہیں ہوا تھا بلکہ شروع ہوا تھا۔ اگلے تین چار دن شہر کے ادیب دوستوں سے ملنے میں صرف کئے۔ سب سے دست بستہ عرض کی کہ مقالے کے بارے میں ادیب صاحب سے کچھ نہ کہیں کیوں کہ مقالے کی ایک ایک مطبوعہ کاپی تو ہر ادب نواز کو بہرحال ملتی ہی تھی۔ خوش قسمتی سے میرا کام ادیب صاحب نے آسان کردیا۔ ڈپارٹمنٹ میں جاکر اس بات کا انتظام کروادیا کہ ان کا مقالہ سیمینار کے دو ہی دن پہلے ارسال کیا جائے کیوں کہ تازہ ملی ہوئی چیز کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

خیر صاحب، سیمینار کا دن آیا۔ ڈپارٹمنٹ کے لوگوں سے سانٹھ گانٹھ تھی ہی۔ ادیب صاحب کا مقالہ سب کے آخر میں رکھا گیا تاکہ سیمینار میں کوئی خرابی واقع نہ ہو۔ پانچ سات مقالے سننے کے بعد سامعین بہت تھک گئے تھے لیکن ادیب صاحب کے چہرے کی بشاشت جوں کی توں تھی۔ انھیں خوشی اس بات کی تھی کہ جس طرح استاد شعرا سے آخر میں غزل پڑھوائی جاتی ہے اسی طرح ان کے مقالے کو اعلیٰ ترین سمجھ کر آخر میں رکھا گیا تھا۔

جناب ادیب جھانسوی کے نام کا اعلان ہونا تھا کہ سارے ہال میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک انچی سے لے کر چار انچی قسم کے تبسّموں اور دنداں نمائی سے لے کر فلک شگاف قہقہوں تک سب کچھ ظہور میں آیا۔ حضرت ادیب نے مانگے کی ریشمی شیروانی پہنی ہوئی تھی اور کھدر کی ٹوپی بھی لگائی ہوئی تھی۔ سمجھے کہ لوگ ان کے نئے حلیئے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ مائک پر آکر بولے "حضرات" میں ہمیشہ آپ کو ہنساتا رہا ہوں لیکن آج آپ سے سنجیدہ رہنے کی درخواست کروں گا۔ اگر آپ اس مقالے کو ...."

"لاجواب مقالہ ہے" کرسیوں کی پچھلی قطار سے آواز آئی۔

"بالکل گرم مسالہ ہے" کسی نے ہال کے دوسرے گوشے سے قافیہ آرائی کی۔

ادیب جھانسوی نے پوری توجہ اور پوری سنجیدگی سے مقالہ پڑھنا شروع کیا "ڈپٹی نذیر احمد کے بزرگ افغانستان کے لاچین ترک تھے اور مہاراجہ کنشک کے زمانے میں مازندران سے دہلی آکر منصب ہفت ہزاری پر فائز ہوئے تھے۔"

ہال ہنسی سے گونج رہا تھا۔ کسی صاحب نے زور سے آواز دی "کچھ اپنے بزرگوں کے متعلق بھی فرمائیں جناب۔"

جواب مقالہ نگار کی بجائے کسی اور نے دیا "ان کے بزرگ ڈپٹی صاحب کے بزرگوں کے سائیس تھے۔"

ادیب صاحب کا مقالہ آگے بڑھا "مولوی نذیر احمد بادشاہ دہلی محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں شاہی حکیم کے طور پر ملازم تھے۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت انہیں اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد وہ کلکتے چلے گئے اور ڈاکٹر گلکرائسٹ نے انھیں پچاس روپے ماہوار پر ناول نویسی کی ملازمت دے دی۔"

"آپ بھی ان کے ساتھ کیوں نہ چلے گئے!" ایک آواز آئی۔

"یہ چلے جاتے تو جھانسی میں گھاس کون کھودتا؟" جوابی آواز آئی۔

"کھودتے ہیں یا کھاتے ہیں؟" کسی ادھر سے استفسار ہوا۔

ادیب صاحب کا مقالہ اسی شان سے چلا "مولوی صاحب نے شریف زادہ میں طرابلس کے مجاہدین اسلام کی شاندار تصویر کھینچی ہے۔ "بازار حسن اور پردۂ مجاز" میں مولوی صاحب نے ایران پر سکندر کے حملے کے واقعات اس چابک دستی سے بیان کئے ہیں کہ جنگ کا پورا نقشہ آنکھوں کے آگے آجاتا ہے۔" زہر عشق اور دریائے لطافت میں ان کے قلم میں وہ زور نہ رہا جو جوانی کے عہد کے ناولوں منصور موہنا اور فسانۂ آزاد میں تھا۔ لیکن ارمغانِ حجاز میں انہوں نے ناول نویسی کی تکنیک میں ایک نیا باب جوڑ دیا۔ بھائی لوگوں نے مقالہ تو پہلے ہی دیکھ رکھا تھا۔ سنجیدہ کیسے ہوناتھا؟ میری پوری کوشش رہی تھی کہ مقالے میں مولوی صاحب کے ایک بھی ناول کا ذکر نہ آئے اور تاریخ کی کتاب جاڑ کر اس کے اوراق الٹے سیدھے لگا کر دوبارہ سی دیئے جائیں۔

بدقسمتی سے مقالہ خوانی پوری نہ ہوسکی۔ سامعین ہنستے ہنستے تھک گئے تھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ تک کتے بلی کی آوازیں نکالنے لگے تھے۔ منسٹر صاحب، خوصدارت کر رہے تھے، عجب پریشانی میں تھے۔ خواہ سیاست کی مشغولیت انھیں عالم نہ بنا سکی ہو تاہم لاعلمی کے معاملے میں وہ ادیب صاحب کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ انہیں سازش کا پتہ بھی نہیں تھا۔ کھنّا صاحب کی طرف پُر غیظ نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن کہہ کچھ نہ سکتے تھے، خود انہیں نے ادیب صاحب کی شمولیت پر زور دیا تھا۔ (میرا اندازہ غلط تھا۔ ادیب نے جوڑ توڑ لگا کر منسٹر کے ہاں رسائی حاصل کر لی تھی) آخر ضبط نہ ہوا تو منسٹر صاحب چیخ پڑے "یہ کیا بکواس کر رہے ہیں ادیب صاحب؟ بند کیجئے یہ خرافات!"

اب ادیب صاحب کی سمجھ میں آیا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ منسٹر صاحب نے کھنّا صاحب کو سیمینار ختم کرنے کا اشارہ کیا اور کھنّا صاحب نے دو منٹ میں مقالہ نگاروں اور سامعین کا شکریہ ادا کر کے سیمینار ختم کر دیا۔

ادیب صاحب ایک گوشے میں کھڑے ہو کر یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا بات ہوگئی۔ اسی وقت کھنّا صاحب منسٹر صاحب کو ان کی کار تک پہنچا کر آئے اور ادیب پہ بگڑنے لگے "اسی مقالے کے لئے آپ نے کہا تھا کہ اس موضوع پر اس سے بہتر مقالہ نہیں ہو سکتا؟"

"مقالہ آپ نے بھی تو دیکھا ہوگا" ادیب صاحب معصومیت سے بولے۔

میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے آپ پر بھروسہ کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ منسٹر صاحب سے ڈانٹ کھانی پڑی۔ کہتے تھے کہ اس شخص کو اب پاس نہ پھٹکنے دینا۔" لیکن مقالہ تو نظامی صاحب نے لکھوایا تھا" ادیب صاحب بدحواسی سے بولے — "کیوں بدنام کرتے ہو یار؟ میں کسی کو مقالہ کیوں لکھواؤں گا؟" میں نے معصوم ہونے کے ساتھ کہا اور کھنّا صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر باہر آگیا۔ باہر ہم لوگوں کو کھل کر ہنسنے کا موقع تھا۔ ■ ■ ■

اعلیٰ تعلیم کی نصابی کتابیں

ترقی اردو بیورو نے آندھرا پردیش کے اردو میڈیم کے طالب علموں کے لئے انٹر، اعلیٰ ثانوی اور گریجویٹ سطح کی نصابی کتابیں تیار کروائی ہیں ان میں مندرجہ ذیل کتب شائع ہوچکی ہیں۔ یہ نصابی کتابیں دوسری ریاستوں کے طلباء کے لئے بھی مفید اور کارآمد ثابت ہورہی ہیں۔

انٹرمیڈیٹ۔ اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لئے:۔

۱۔	ابتدائی سماجیات	محمد عبد القادر عمادی	۱۶۴	۶-۲۵
۲۔	احصار (تفرقی اور تکملی)	محمد خواجہ محی الدین	۳۱۲	۱۱-۶۰
۳۔	الجبرا	محمد احسن اور رشید احمد	۴۳۹	۱۵-۶۰
۴۔	اصول معاشیات	رضیہ نظامی	۳۰۰	۱۰-۰۰
۵۔	خالص جیومیٹری و تحلیلی جیومیٹری	محمد خواجہ محی الدین	۳۰۰	۴-۰۰
۶۔	طبیعیات (حصہ اول)	سدرشن راج و محمد منیر الدین	۲۵۴	۶-۶۵
۷۔	طبیعیات (حصہ دوم)	سدرشن راج و محمد منیر الدین	۳۵۱	۸-۵۰
۸۔	علم شہریت	سلطان عمر	۲۴۷	۹-۰۰
۹۔	علم مثلث مستوی (حصہ اول)	اے۔ کے۔ ڈیش مکھ اور مسز نور علیم	۳۳۱	۱۱-۶۰
۱۰۔	عملی جغرافیہ	محمد انعام اللہ	۱۵۲	۴-۵۰
۱۱۔	کاروباری تنظیم	مرزا صغیر احمد	۲۳۹	۸-۲۵
۱۲۔	ہندوستان کے سماجی مسائل	محمد عبد القادر عمادی	۱۴۲	۵-۵۰

۲/.....

بی۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ کام کے لئے:۔

۱۔	تاریخ دستور انگلستان	سید علی محسن	۳۳۲	۶-۰۰
۲۔	سکونیات	محمد خواجہ محی الدین	۲۲۸	۸-۲۵
۳۔	سماجی انسانیات	محمد عبد القادر عمادی	۲۸۸	۹-۲۵
۴۔	سماجیات کے اصول	فاطمہ شجاعت	۲۳۲	۸-۰۰
۵۔	علم مثلث مستوی (حصہ دوم)	ایس۔ ایل۔ لونے۔ ابرار حسین	۴۴۸	۸-۷۵

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ:۔

شعبہ فروخت و نمائش ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک ۸۔ آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

DAVP 511 (40) 84

ضیاء حسنی

آسیبوں کا مسکن

اِنسان کے ذرا سے دل میں کافی گنجائش ہے اور اس میں سبھی کے لئے درد چھپا ہوا ہے۔ ابتدائے آفرینش ہی سے اُس نے آسیبوں سے بھی تعلقات استوار کر لئے۔ ہم آسیبوں کے وجود کو نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ انکار کرتے ہیں۔ تسلیم اس لئے نہیں کرتے کہ ہم نے اُنھیں بچشم خود کبھی نہیں دیکھا لیکن انھیں روبرو دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے اور انکار اس لئے نہیں کرتے کہ کوئی پیکرِ آفت اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے ہمارے روبرو کھڑا ہو جائے تو ہم نہ صرف ہوش وحواس کھو بیٹھیں گے بلکہ ہماری روح کے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے بھی سو فی صد امکانات ہیں اس لئے ہم اپنی دلی کمزوری کے پیشِ نظر اِن فی اطلاعات پر اعتماد رکھتے ہیں کیوں کہ اِنھیں گھنی آبادی میں بھی دس مکانوں کے درمیان ایک آسیب زدہ مکان ضرور دکھائی دیتا ہے لہٰذا ہم ایسی کوشش کرتے ہیں کہ کبھی ایسے مکان میں داخل نہ ہوں جس میں اپنے آپ آوازیں آتی ہوں تو یاں کی خوشبو بھٹکتی پھرتی ہو۔ کافور کی مہک سے کسی تازہ کفنائے ہوئے جنازے کا تصوّر اُبھرتا ہو۔ جب کوئی شخص ایسے مکان کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ہم کترا کر نکل جاتے ہیں اور اس مکان میں داخل ہونے کی بات تو درکنار ہم اُس کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کرتے۔

ایک بار ایسا ضرور ہوا کہ گھنی آبادی میں واقع ایک مکان کی دوسری منزل کو ہم نے کرایہ پہ لے لیا اور اس میں رہنے لگے۔ اس مرحلے سے ہم آسانی سے نہیں گذرے تھے بلکہ اس ٹھکانے کو حاصل کرنے میں ہمیں دن میں تارے دکھائی دے گئے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے جسم ناتواں پر کئی ضربیں لگیں، خوف زدہ اور ہراساں کئے گئے اور نوبت دست درازی تک پہنچی۔ غرض اس مکان میں ہم پُرسکون طور رات بسر کر کے بیدار ہوئے تھے کہ کسی نے دستک دی۔ اس آواز کو سنتے ہی ہم سوچنے لگے "کون صبح سویرے آگیا؟ مالکِ مکان کو ہم ایڈوانس کرایہ دے چکے ہیں اور اس محلہ میں اُن کے علاوہ ہمارا کوئی شناسا نہیں" اب ہم نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو ایک خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں پڑوس میں رہتی ہوں"۔

"تشریف لائیے! ہم جہاں بھی رہے پڑوسیوں سے ہمیشہ خوش گوار تعلقات استوار کرنے ہی میں خوشی محسوس ہوئی"۔

ہم ایسی بات کہتے ہوئے انھیں اپنے کمرے میں لے آئے۔ اُنہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ان جچے تلے ہوئے فقروں سے گفتگو شروع کی۔

"چلئے! یہ مکان آباد تو ہوا۔ جب سے میں یہاں آئی ہوں اس کا دروازہ ہمیشہ بند دیکھتی رہی ہوں"۔

"محترمہ! ایسی کیا بات ہے؟"

"جو بھی کرایہ دار آتا ہے وہ اتنا سامان لاتا ہے کہ جیسے وہ یہیں دمِ واپسیں تک رہے گا لیکن چند دنوں قیام کر کے وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگ"۔

ایسی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں اور ہمارے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کا بغور جائزہ لینے لگیں جس سے اُن کی تجربہ کاری اور معاملہ فہمی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جب ہماری بوکھلاہٹ نقطۂ عروج پر پہنچی تو وہ پھر بولیں۔

"اب تو آپ آ ہی گئے ہیں اور خیر سے کافی سامان بھی لائے ہیں اس لئے جب تک رہ سکیں رہیں۔ خدا کرے آپ نیند بھر کے سو سکیں"۔

ہم نے جلدی سے پوچھا۔

"کیا بدمعاش آتے ہیں یہاں؟"

"ہم جنسوں کا تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں ایک ایسی مخلوق پھیرا لگاتی ہے جو کرایہ دار کو کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور اسے اس طرح اذیت دیتی ہے اور نت نئے ڈھنگ سے ستاتی ہے کہ اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور وہ راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ اس میں تو وہ جری آدمی رہ سکتا ہے جو اس بلا سے نبرد آزما ہونے کی ہمت رکھتا ہو"۔

ہم نے پھر گھبرا کر پوچھا۔

"آخر وہ کیا کرتا ہے؟"

"وہ کیا نہیں کرتا۔ کرایہ دار کی ساری حرکات و سکنات پر نگاہ رکھتا ہے۔ جیسے جیسے رات گذرتی ہے ویسے ویسے اس کے کاموں میں تیزی آتی ہے کسی کے زینے پر چڑھنے کی آواز سنائی دیتی ہے پھر اپنے آپ دروازہ کھل جاتا ہے۔ اندھیرا ہوتا ہے تو یکایک بلب روشن ہو جاتا ہے روشنی ہوتی ہے تو اچانک اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اکثر قہقہے سنائی دیتے ہیں گانے کی آواز ابھرتی ہے کسی مغنیہ کی دل کش آواز"۔

ہم نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں پُرسکون ہو کر اس مکان میں رہنے دیجئے۔ آپ تو واقف ہوں گی کہ کسی بڑے شہر میں مکان کو حاصل کرنے میں

کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"

"پڑوسی کے ناطے میں نے اس مکان کا جغرافیہ ذرا تفصیل سے بتادیا تھا۔ اب آپ کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔" آداب عرض" میں جاتی ہوں۔"

وہ خاتون چلی گئیں لیکن وہ جس کانٹے کو چبھو گئی تھیں وہ رہ رہ کر کھٹکتا ہوا لگ رہا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ اس مکان کو چھوڑنا کوئی مشکل نہیں اسے دن کے دن خیرباد کہہ سکتے ہیں لیکن پھر ایسا آرام دہ مکان کسی طرح نہیں مل سکتا۔ سو چار رات بسر کر کے دیکھیں۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا موسلادھار بارش شروع ہو گئی بارش کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ ہم کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے کبھی انسان تنہائی کو ترستا ہے اور یکسوئی چاہتا ہے اور آج تنہائی کرب انگیز بن گئی تھی ذہن میں عجیب عجیب وسوسے آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ بج گئے اسی وقت چھت پر دھماکہ ہوا۔ دل دھڑکنے لگا اور ہم نے کہا۔ "اللہ خیر کرے"۔

پھر صحن میں کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ ہم نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے بستر پر سمٹ کر اکڑوں بیٹھ گئے اسی دوران میں دروازہ کھلا اور ایک تندرست و توانا بلا اندر آگیا۔ اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ پراسرار لگا اور ہم لرز گئے لیکن وہ بجلی کی طرح آیا اور چلا گیا اس واقعہ کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ہم نے رات کا کافی حصہ بے خوابی میں گزارا شاید رات کے آخری حصے میں تھوڑی دیر کے لئے سو گئے ہوں تو یہ بھی یاد نہیں۔

اس طرح کئی راتیں عالم بے خوابی میں گزر گئیں۔ ہاں! پڑوسن نے جو یہ کہا تھا کہ زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آتی ہے اس کا بھی تجربہ ہوا کبھی گیارہ بجے اور کبھی اس کے بعد زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور اس وقت ہمارے ذہن پر ضربیں پڑنے لگتیں کہ اب کوئی دروازہ کھولے گا اور اندر داخل ہو کر ہمیں انجانی اذیتیں دے گا۔ یہ تو نہیں ہوا البتہ ایک دن صبح کو ہم کمرے سے باہر آئے تو ایک جگہ کٹی ہوئی مرغی اور دوسری جگہ مردہ کبوتر پڑا ہوا تھا دوسرے دن باتھ روم کے قریب تازہ تازہ خون پڑا ہوا دکھائی دیا۔ ایسی باتیں ہوا کرتی ہیں اور کوئی دھیان نہیں دیتا لیکن اس گھر کے بارے میں ذہن میں جو باتیں بیٹھ گئی تھیں اُن سے ہر بات میں کوئی بات چھپی ہوئی نظر آتی اس لئے ہم اُن کرم فرما خاتون سے ملنے کے لئے اُن کے یہاں پھر پہنچے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے استقبال کیا اور ہنستی ہوئی بولیں۔

"کیسی گزر رہی ہے بھائی!"

"یہ صحیح ہے کہ زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن ہمیں بلیوں کے علاوہ کوئی مخلوق نظر نہیں آئی۔"

"آسیبوں کو پہچاننا مشکل ہے۔ یہ کبھی کتے اور بلی کا روپ دھار کر آتے ہیں اور کبھی سانپ بن کر پھنکارنے بھی لگتے ہیں۔ آپ انہیں دھوکے سے بھی کوئی تکلیف نہ دیجئے گا ورنہ آپ کی خیریت نہیں۔"

"باجی! آپ کا یہ مقصد ہے کہ ہم ان بڑھتے ہوئے نرخوں کے زمانے میں ہوٹل سے دودھ اور گوشت لاکر رکھیں جسے یہ کتے اور بلی کھائیں اور اس خاطر و تواضع کے باوجود یہ کوئی توڑ پھوڑ کے کام کریں تو ہم ذرا سی شکن چہرے پر نہ لائیں اور ہاتھ پر ہاتھ

بیٹھے رہیں۔"

"یہ تو کرنا پڑے گا۔"

"ہم یہ نہ کرسکیں گے۔ ہمیں صرف ایسی بات دکھائی دیتی ہے کہ یہ مکان تھوڑے دنوں خالی رہا ہے لہٰذا اس میں بلیاں رہنے لگی ہوں اور وہی شکار کرتی ہیں اور کبھی مرغی اور کبھی کبوتر چھوڑ جاتی ہیں کل سُرخ سُرخ خون بھی پڑا تھا۔"

"جب آپ مطمئن ہیں تو اتنے فکرمند کیوں ہیں؟ آپ دھوکے میں نہ رہیں، یہ آسیبوں کا دیرینہ مسکن ہے۔ خون کہاں پڑا تھا؟"

"باتھ روم کے قریب۔"

"اسی باتھ روم میں ایک کرایہ دار نے ایک انجان سیاہ شخص کو دیکھا تھا پہلے تو اُسے تعجب ہوا کہ دروازے بند ہیں یہ کہاں سے آیا پھر سوچا یہ غُسل سے فارغ ہو جائے تو اس کی خاطر کرے۔ اب جو پانی گرنے کی آواز رُکی تو اُس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا وہ خوف سے لرزنے لگا اور اسی وقت اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر کہیں چلا گیا۔ وہ آپ کی طرح اپنی جان ہتھیلی پر لئے اس مکان میں رہنا گوارا نہیں کرسکا۔"

ایسی بات سُنتے ہی ہم نے نقلِ مکانی کا عزم مصمم کرلیا لیکن ہم نے باجی سے اپنے اس ارادے کو احتیاطاً ظاہر نہیں کیا اور آداب کر کے رخصت ہوگئے۔ ہم وہاں سے چلے آئے لیکن یہ اُلجھا ہوا مسئلہ ہمیں کسی طرح یکسو ہونے نہیں دیتا تھا لہٰذا ہم نے سوچا کہ اِس روئیداد کو ایک مخلص دوست کو سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کریں۔ ہم جیسے ہی گھر سے نکل کر اُن کے یہاں جانے لگے تو سرِ راہ ایک معمر آدمی مل گیا اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں مطلع کیا۔

"دیکھئے! ہم اسی مکان میں رہتے ہیں۔"

"تو ہم کیا کریں؟"

"مطلب یہ ہے کہ اس مکان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتائی جاتی ہیں۔"

"مجھے کوئی خبر نہیں۔ اپنی سوت کے پچیس سال کے بعد وقتی طور پر رہائی ملی ہے اور میں ایک سرسری جائزہ لے کر ہوا کے دوش پر چلا جاؤں گا۔"

ایسی بات سُنتے ہی ہم نے بجلی کی سی تیزی سے جست لگائی اور دور جاکر کھڑے ہوگئے۔ وہ شخص برابر والی گلی میں مڑ گیا اس کے بعد وہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔ ہم اُفتاں وخیزاں اپنے دوست کے یہاں گئے اور اپنی ذہنی اُلجھنوں سے اسے باخبر کیا۔ اس بیچارے نے دوستی ادا کیا اور ہمدردانہ انداز میں کہنے لگا فی الحال تم وہاں نہ جاؤ میرے یہاں بے فکر ہو کے سوؤ۔ وہاں کوئی مخلوق نہیں رہتی ہے تو لگتا ہے کہ تمہاری پڑوسن کی نظر میں یہ مکان چڑھا ہوا ہے اور وہ تمہارے قدم وہاں سے اُکھاڑنے میں لگی ہوئی ہے تم نے بڑی مشکلوں سے یہ مکان حاصل کیا تھا اور لگتا ہے تم اسے یوں ہی گنوا دو گے۔"

"یار! اس خاتون نے اشارے کنارے سے بھی مکان لینے کی بات نہیں کی اور اُن کی چند باتیں ہمارے تجربے میں بھی آئی ہیں۔"

ان کو تم نے اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ اُن کے دل کے کسی کونے میں اس مکان کو حاصل کرنے کی خواہش دبی ہوئی ہے۔ اگر تم اس مکان کو چھوڑنے پر تلے ہو تو چلو! تمہیں ایک سن رسیدہ عامل سے ملوائیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہمیں اُن کی باتوں پر یقین نہیں آتا کیوں کہ وہ اپنی باتوں میں ردوں پر رڈے جماتے ہیں لیکن تمہیں بے چین دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اُن کے پاس لے چلیں۔ جب انسان مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پھنس جاتا ہے تو اسے جس طرف راستہ ملتا ہے اس طرف چل پڑتا ہے۔ شاید اُن کے ڈھارس بندھانے سے تمہارے دل کو قرار آجائے۔ چنانچہ وہ ہمیں بشیر بابا کے یہاں لے گئے۔ اب ہم نے جو اُن کو اپنی روئیداد سنائی تو بابا فکر کی گہرائی میں ڈوبنے لگے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر بولے۔

" اس مکان میں تم بے خوف ہو کر رہو وہاں کوئی مخلوق نہیں رہتی۔ تمہاری جوان پڑوسن اور اس کا سن رسیدہ شوہر دونوں آسیب بن کر تمہیں خوف زدہ کر رہے ہیں اور تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی پرسکون ہونے نہیں دیتے اور تمہیں مکان سے نکال دینے کے در پے ہیں۔ ذرا تم اس سے یہ کہو کہ میں اس مکان کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں تو اس کے دل کی بات زبان پر آجائے گی۔ بات سے بات نکلتی ہے ابھی ترائی کے گھنے جنگل میں جنوں کا ایک عالمی اجتماع ہوا تھا۔ اس میلے میں دُنیا کے ہر ملک سے جنوں کے نمائندے جوق در جوق آئے تھے ان میں یورپی گورے تھے اور افریقی کالے بھی۔ زاہد شب بیدار آئے تھے اور رند بادہ پرست بھی۔ مفکر، مُدبر، دانش ور، ادباء اور شعراء نے بھی شرکت کی تھی۔ غرض مختلف رنگ و نسل اور مختلف مذاق کے لوگ ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع پر انسانوں اور آسیبوں کے متعلق کھل کر باتیں ہوئیں۔ اس مختصر وقفے میں پوری روئیداد تو بتانا ممکن نہیں لیکن چند لوگوں کے خیالات تمہاری دلچسپی کے لئے بتائے دیتا ہوں اور اس سے تمہاری ذہنی اُلجھنوں کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ اُن کے نیتا نے کیا کہا اُسے سُنو!

" آپ ہمیں کافی سوچ وچار کر کے منتخب کرتے ہیں ہمارے پچھلے کاموں کو اس طرح احتیاط کی چھلنی میں چھانا پھٹکا جاتا ہے کہ پسینہ آجاتا ہے۔ منتخب ہو کر زمانہ اقتدار میں بھی اُسی طرح اپنے ووٹروں سے رابطہ رکھتے ہیں اور اُن کے وفادار بنے رہتے ہیں ہم خوب سمجھتے ہیں کہ اُنھیں نے ہمیں منتخب کیا ہے اور یہی ہمیں کان پکڑ کر نکال بھی سکتے ہیں ہم اپنے اس انجام کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کرتے۔ ہم میں ذرا سی خود غرضی نہیں آتی۔ ذات پات کا خیال مذہبی جذبہ اور لڑکوں بھائیوں اور بھتیجوں کی محبت کو دل میں لاکر کوئی غلط قدم نہیں اُٹھاتے۔ ہمیں انسانوں میں بھی چند ایک پر خلوص لیڈر دکھائی دیئے لیکن ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔

ایک عالم باعمل نے بھی مختصر وقفے میں کافی اچھی باتیں کہیں انھیں بھی سُنتے چلو! ہم فلاح و بہبود کے سبھی کاموں میں انسانوں کو بھرپور تعاون دیتے ہیں، درس گاہوں، عبادت گاہوں، پارکوں، کتب خانوں، نہروں، نلکوں اور ہوٹلوں کی تعمیر میں اس کی مدد کرتے ہیں کیوں کہ ہم بھی اُن سے استفادہ کرتے ہیں اور جب کوئی پاک طینت، عالم، فاضل اور دانش ور داعی اجل کو لبیک کہتا ہے تو ہم اس کے جنازے میں شریک ہو کر کاندھا دینے والوں کی تعداد بڑھا دیتے ہیں ان کے تعزیتی جلسوں میں ہم جوق در جوق پہنچتے ہیں اور ایسے موقعوں پر ہمارے مقررین کافی خلوص سے دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ رئیس التجار نے بھی اچھی باتیں کہی تھیں اس نے کہا، ہم صارفین سے خلوص رکھتے ہیں انھیں اچھی مصنوعات اور خالص چیزیں دیتے ہیں۔ اگر ہم انسانوں کی طرح

مکر و فریب کرنے لگیں اور کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنے لگیں تو آپ ہمیں عبرت ناک سزائیں دیں گے۔ صدیوں سے انسانوں سے ہمارے تجارتی تعلقات تھے لیکن اب اُن کی بدعیانتی کے سبب یہ تعلق ٹوٹتا جارہا ہے۔ انسان یہ نہیں سوچتے کہ ملاوٹ سے اُن کے ہم جنسوں کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اسی اجتماع میں ایک شاعر نے اپنی تقریر کے دوران اپنے استاد کا تذکرہ کافی عقیدت سے کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے اندر چھپی ہوئی شاعرانہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کر کے انھیں پوری طرح نمایاں کرنے میں اُن کا کافی ہاتھ ہے۔ وہ معمولی سی تبدیلی کر کے اُن کے اشعار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے لیکن ان کے خیال کو کبھی مجروح ہونے نہیں دیا۔ یہ انھیں کی دین ہے کہ میری شاعری کا مخصوص لب و لہجہ بن گیا۔ اُنہوں نے اپنی تقریر کے دوران اپنے انھیں اُستاد کا ایک واقعہ سُنایا۔ استاد کو ان کا کوئی شعر کافی پسند آیا انہوں نے اسے دوبار پڑھوایا اور کافی سراہا اب جو تیسری بار پڑھا تو استاد نے جوش میں آکر پیٹھ ٹھوکنا چاہی تو شاگرد غائب ہو گئے۔ اس واقعہ سے استاد کی حالت ایسی بگڑی کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اب شاگرد رس گلے لے کر حاضر ہوئے تو استاد کو سر بسجدہ پایا۔ اُنہوں نے اُستاد کے پیر پکڑ لئے اور دھیرے دھیرے پیر دابنے لگے اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولے۔

"آپ بالکل خوف زدہ نہ ہوں۔ میں آپ کا شاگرد ہوں اور آپ کی خدمت کو موجبِ سعادت سمجھتا ہوں۔ آپ نے جس لفظ کی طرف اشارہ کیا تھا اسی کو دیکھنے کے لئے گیا تھا اس سلسلہ میں لغت دیکھی تو آپ کی اِصلاح سے کافی خوشی ہوئی بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو رس گلے کھلاؤں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں بغیر اجازت لئے اچانک چلا گیا تھا۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے میں آپ کے ہم جنسوں سے زیادہ ادب و احترام ملحوظ رکھتا ہوں اور مجھ سے بالکل نہ ڈریئے۔ میں مرشدِ شیراز کا پیرو ہوں کسی کے درپے آزار نہیں ہوتا اور آپ تو میرے مخدوم اور استاد ہیں۔"

آخر میں اس فیصلہ کو بھی سُن لو جو اس اجتماع میں بہ اتفاق رائے سنایا گیا۔

"انسانوں کی آپسی تفریق اور خون خرابے کو دیکھ کر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انسانی آبادیوں سے دور بہت دور ریگستانوں اور گھنے جنگلوں میں جا کر بس جائیں جہاں گورے کالے کی تفریق، ذات پات کے جھگڑے، مذہبی مناقشے، چوروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں کے جبر و ستم کی داستانیں ہماری سماعت سے ٹکرا نہ سکیں۔ یہ فیصلہ کرب انگیز ضرور ہے اس لئے کہ ہمیں بعض انسانوں سے دلی محبت ہے لیکن کیا کریں کہ ان کی اجتماعی زبوں حالی اب ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ یہ اپنے ہم جنسوں کو ستاتے ہیں حیران کرتے ہیں یہاں تک کہ مار ڈالتے ہیں۔ ہم نے کبھی انسانی خون کو اس روانی سے بہتے نہیں دیکھا۔ ستم یہ ہے کہ یہ سب ہتھکنڈے انسان خود کرتا ہے اور ہمارے سر بصفائی سے الزام رکھ دیتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمارے بعض ہم جنس بدمعاش، خبیث اور بدکردار ہیں لیکن وہ بھی انسانوں کو دیکھ کر شرما جاتے ہیں۔"

ہم نے بابا کی سبھی باتوں کو بغور سُنا دلچسپی لی اور متاثر بھی ہوئے۔ لیکن ہماری بڑھتی کے بارے میں جو اُنہوں نے اظہار خیال کیا اسے ہم نے ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیا کیوں کہ ان کی کسی بات سے مکان کو حاصل کرنے کا اشارہ نہیں ملا تھا۔

اگلے دن ہم بغیر ارادہ اُن خاتون کے یہاں چلے گئے اور اچھا بھی ہوا پھر اس طرح بات شروع کی۔

"آپ ہم اس مکان کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جی چاہا کہ چلتے وقت آپ سے مل لیں۔"

"دیر آید درست آید۔ چلئے! آپ نے میری بات مان تو لی اور اسی میں مجھے آپ کی بھلائی دکھائی دیتی ہے۔"

ہم نے اُٹھنے کے لئے پہلو بدلا ہی تھا کہ اُنہوں نے کافی رازداری سے کہا۔

"چائے پی کر جائیے گا ہاں! آپ جا رہے ہیں تو اس مکان کو ہمارے حوالے کئے جائیے۔"

کیا اس مخلوق کو راہِ راست پر لانے کا کوئی حربہ ہاتھ لگ گیا ہے آپ کے، اگر ایسی بات ہے تو ہم کیوں اس مکان کو چھوڑیں اور دَر دَر بھٹکیں۔ یہ کیا معاملہ ہے کہ ابھی تک آپ اس مکان کو آسیبوں کا مسکن بتاتی تھیں اور اب اسی میں رہنا بھی چاہتی ہیں۔"

"میرے دشمن اس میں رہیں میں کیوں رہوں گی؟ میرے شوہر کا کارخانہ ذرا فاصلے پر ہے وہاں گودام کی جگہ نہیں ہے وہ اس مکان کو گودام بنائیں گے۔"

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے یقین جانئیے! اس مکان میں جو مخلوق رہتی ہے وہ آپ کے سامان کو تہس نہس کر دے گی کسی طرح آپ کے تجارتی منصوبے کو کامیاب ہونے نہ دے گی اور آپ کو تجارت میں خسارہ ہوگا اور آپ پھر پنپ نہ سکیں گی۔ یہ ایسی بدروح ہے کہ جسے حیران کرنے اور ستانے ہی میں مزہ آتا ہے۔"

پڑوسن سناٹے میں آگئیں اور اُن کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ ہم آداب کر کے چلے آئے اور سوچتے رہے کہ آسیب کتنے دنوں ہمارے ذہن پر مسلط رہے اور کتنی راتیں بے خواب گزر گئیں۔ اب ہم اپنے مکان میں دروازہ کھول کر بے خبر سوتے ہیں۔ کوئی زینہ پر چڑھے بلیاں اور کتے آئیں ہم آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن ہم وضع دار بھی ہیں لہٰذا پڑوسن سے بدستور ملا کرتے ہیں۔

شگوفہ کے دو یادگار خصوصی نمبر

کنھیا لال کپور نمبر

قیمت دس روپے [مجلد]

ڈرامہ نمبر

قیمت ۲۵ روپے [مجلد]

ہم صاحبِ کتاب ہوئے ہائے کیا ہوئے
رسوا ہوئے، خراب ہوئے ہائے کیا ہوئے
ہوتی نہ دل کی بات بزرگوں پہ آشکار
شعروں سے بے نقاب ہوئے ہائے کیا ہوئے
لاکھوں سہے عذاب تو جاکر چھپی کتاب
سکھ چین سارے خواب ہوئے ہائے کیا ہوئے
اب راہ تک رہے ہیں خریدار کی مگر
عنقا دہی جناب ہوئے ہائے کیا ہوئے
بچے پڑھیں گے اور بگڑ جائیں گے ضرور
ہم شاملِ نصاب ہوئے ہائے کیا ہوئے

یدِ بیابانی

جب کبھی بیگم کی فرمائش ذرا ٹالی گئی
ماہ میں چوبیس دن میکے کو گھروالی گئی
اونچی سینڈل پہن کر وہ جب دھڑم سے گرگئی
فیس سے پاؤڈر گیا اور ہونٹوں سے لالی گئی
ساس کے گھر سے جُدا ہسبنڈ کو لے کر ہو گئی
باپ کے گھر میں جو بیٹی لاڈ سے پالی گئی
پہلے قُل تھا دیش میرا کل غلامی میں مگر
مل گئی آزادی پھر بھی آج خوشحالی گئی
چار پیسے پاس ہیں تو منت کھوٹے آدمی
اچھے اچھوں کے گھمنڈ کی سوکھ ہریالی گئی

ساغر شولاپوری

یہ کیسا بازار ہے پیارے یہ کیسی مہنگائی رے
کپڑے کی قیمت سے بڑھ کر کپڑے کی سلوائی رے
انگریزی میڈیم کی آن میں اُردو کا شیدائی رے
میٹھے ٹامٹام بول رہے مجھ کو جوڑو بائی بائی رے
خاموشی سونا ہے بول کے میرے کو قلفیاں دے رئیں
لیکن سب اُس کی سنتے ہیں جس نے کی کمائی رے
گھر میں بُڈھی کے پھر بج رہا سلمیٰ آغا کا کیسٹ
اُس کا بیٹا جاکو آیا ہوں گا پھر دُوبائی رے
بچے دو ہی اچھے بول کے کون کی اُس کو لولا تھا
دو دو بچوں کی اُس نے اب گھر میں لائن لگائی رے
گھر داماد کی کا آفر ہی بیلن اچھا آفر تھا
بیک آپ ہی میں خرچ ہوتی ہے گھر کی پائی پائی رے

بیلن نظام آبادی

صرف جوڑو ہی نہیں کپڑوں کی ماری آج کل
ساس کو بھی چاہیئے اب زر کی ساری آج کل
نازنینوں کو بھی کچھ پولس میں بھرتی کیجئے
دل کی بستی میں بھی ہے چوری چکاری آج کل
تھا زمانہ وہ بھی جب زاہد بنے پھرتے تھے ہم
کرکے توبہ چھوڑ دی پرہیزگاری آج کل
واسطہ ہے سیدھا سادا دیگچوں سے ان دنوں
چھوڑدی لوگوں نے بھی چمچوں سے یاری آج کل
ایک ہی بھاری ہوا تو درجنوں پیدا ہوئے
پاؤں دو توں ہیں گئے اب اُن کے بھاری آج کل
بارہا ثابت ہوا جانی میاں اس دور میں
بے وقوفی کی علامت ہوشیاری آج کل

یوسف جانی میدکی

پرویز یداللہ مہدی

حیدرآباد، بھوپال، حیدرآباد

[چھٹی قسط]

[سفرنامہ کم رپورتاژ]

کنوینرِ محفل جس مائیک کے ذریعہ سامعین کو مخاطب فرما رہے تھے اسے غالباً یہ سبق پڑھایا گیا تھا کہ امانت میں خیانت کرنا بُری بات ہے لہٰذا وہ کسی دیانت دار امین کی طرح کنوینر کا ایک ایک لفظ سامعین تک بخوبی پہنچا رہا تھا لیکن اسٹیج پر بیٹھے مزاح نگار کنوینر کی دلنشین آواز سے زیادہ تر محروم ہی رہے۔ میزبان مزاح نگار حضرات محفل کو خاصا جما چکے تھے، اور اس دوران میں سامعین کی آبادی میں بھی توقع سے زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ یعنی ابتداء میں ہال کا جو حصّہ ہاؤز گل کی عکاسی کر رہا تھا، وہ بھی اب ہاؤز فل ہو چکا تھا بلکہ بالکنی کی بھی زیادہ تر نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔

کنوینرِ محفل نے مہمان مزاح نگاروں کے ادبی پتنگ بلے باز کی حیثیت سے راقم الحروف کے نام کا اعلان کرتے ہوئے مزاحیہ ادب میں ناچیز کے مرتبے و مقام کے تعلق سے ایسے ایسے انکشافات کئے جو کم از کم اُردو دنیا میں اس وقت تک صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں جب تک کہ بے چارا شاعر یا ادیب خود، بہ نفسِ نفیس صیغۂ راز میں نہیں پہنچ جاتا۔ اپنی شان میں تعمیر کئے گئے تعریفوں کے پُل پر چل کر سامعین کے روبرو پہنچنا ایک مزاح نگار کے لئے خودکشی کے مترادف ہوتا ہے لہٰذا میں نے عقلمندی دکھائی اور ان پُلوں کو نظر انداز کر کے "شارٹ کٹ" کے ذریعہ مائیک پر پہنچا، اور جملہ حاضرین کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے ان کی خدمت میں "پارٹی پیش" کی جو اتفاق سے خوب جمی بھی اور چلا بھی۔ میرے بعد مسیح صاحب کو "زحمتِ مضمون" دی گئی۔ کنوینر نے انھیں سامعین کے حضور میں پیش کرتے ہوئے جتنی تعریفیں کیں ان پر نہ صرف وہ پورے اترے بلکہ یہ چیلنج کرتے نظر آئے۔ ہے کوئی اور تعریف کرنے والا، ایک ایک کر کے سامنے آئے۔! موصوف نے اہلیان بھوپال کی خدمت میں اہلِ دکن کی طرف سے پونتہ پیش کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ دکن کا پونتہ ہو شمال کی رضائی ہو یا کشمیر کی دُلائی۔ درد کی ٹیس، کرب کی چبھن سبھی کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ طنز کی سوئی اور مزاح کے دھاگے سے سیئے گئے اس پونتہ کو سامعین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مسیح صاحب دونوں ہاتھوں سے داد کی سوغات سمیٹ کر واپس اپنی جگہ پہنچے۔

مسیح صاحب کے بعد یوسف ناظم صاحب نے مائیک سنبھالا۔ ناظم صاحب برسوں سے اس قاتل صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں اور ہنوز تازہ دم ہیں، چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جانا ان کی تحریر کا خاص وصف ہے اور اہلیان بھوپال کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ناظم صاحب ان کے لئے اجنبی نہیں پہلے بھی کئی بار وہ اپنے مضامین کے ذریعہ اہلیان بھوپال کو محظوظ کر چکے ہیں"۔ ان تعارفی کلمات کے ساتھ کنوینر محفل، حاضرین محفل اور ناظم صاحب کے درمیان سے ہٹے۔ ان کے ہٹتے ہی ناظم صاحب نے سامعین سے قی البدیہہ فرمائش کی "ذرا مسکرائیے" جسے نہ صرف شرفِ قبولیت عطا کی گئی بلکہ موصوف کی تحریر میں چھپی طنز کی چٹکیوں اور مزاح کی گدگدیوں پر شرکائے محفل کی مسکراہٹ کئی بار قہقہوں کی سرحدیں بھی پار کر گئی ــــ

دیکھتے ہی دیکھتے محفل طنز و مزاح بلندی کے آخری زینے پر پہنچ گئی جہاں فکر جی اپنی مطالعہ گاہ کو بڑے ہی قرینے اور سلیقے سے سجائے، تعریف و توصیف سے بے نیاز بیٹھے تھے، تاہم کنوینر صاحب نے اپنا فریضہ ادا کیا فکر جی کی شان میں ان تمام قصیدوں کا آموختہ کیا جو ایسی ہر محفل میں ہر کنوینر کی شان میں پڑھتا ہے، جس پر ہو سکتا ہے فکر جی کوئی دھیان نہ دیتے ہوں لیکن شرکائے محفل، یار بارسنی گئی ان تعریفوں کو ہر بار بڑے دھیان سے سنتے ہیں۔ البتہ فکر جی کنوینر کی تعریفوں کو تو نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن سامعین کے دھیان کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اپنے گیان سے سامعین کے دھیان کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ اس اجلاس میں بھی موصوف نے یہی چال بڑی کامیابی سے چلی اور محفل کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں سے اس کے مزید آگے بڑھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا کنوینر محفل نے عقلمندی کا ثبوت دیا اور صدر صاحب کو معہ صدارتی خطبے کے حاضرین کے روبرو پیش کر دیا۔ مختصر سی صدارتی تقریر کے بعد سکریٹری اردو اکیڈمی کے شکریئے پر پورے دو گھنٹوں تک سامعین میں قہقہوں کی سوغات بانٹنے والی یہ یادگار محفل طنز و مزاح اختتام کو پہنچی۔!!!

محفل کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہوا وہ سلسلہ جو عموماً ایسی محفلوں کے بخیر و خوبی انجام کو پہنچنے کے بعد دیکھنے کو ملتا ہے یعنی گروپ تصویروں گروپ ملاقاتوں اور گروپ مبارکبادیوں کا ملا جلا سلسلہ۔ ملنے والوں کی بھیڑ میں ادب نوازوں اور ادب شناسوں کے علاوہ ادیبوں شاعروں اور مزاح نگاروں کی بھی خاصی تعداد تھی، ان میں جدید یئے بھی تھے اور قدیمئے بھی۔ شاعروں کی نمائندگی، محترم اختر سعید خاں، ظفر صہبائی، عبدالمتین نیاز، عشرت قادری اور ڈاکٹر اختر نظمی نے فرمائی۔ او بمزاح نگار ادیبوں کی طرف سے دوستی کا پرچم لہرایا، ڈاکٹر حامد حسین اور پروفیسر آفاق احمد نے ـــ قصہ مختصر یہ کہ اہلیان بھوپال کی پُر خلوص بدھائیوں کی سوغات سمیٹتے سمیٹتے ہمارا وہ حال ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ مبارکبادیوں کے یہ تابڑ توڑ حملے ہمارے ہاضمے پر مضر اثرات مرتب کرتے، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے کچھ اربابِ مجاز کمک لے کر پہنچ گئے اور ہمیں سوغات کے اس پُر خلوص محاذ سے ٹیگور بھون کے پچھواڑے والے وسیع و عریض سبزہ زار کی جانب ہنکالے گئے جہاں ایک وسیع و عریض ڈنر ٹیبل بندرگاہ پر لنگر انداز کسی باربردار جہاز کی طرح مختلف قسم کے کھانوں سے سجا سجایا کھڑا تھا۔ غالباً ارباب اکیڈمی کو ہمارے معدے سے زیادہ اپنے "ڈنر" کی فکر لاحق تھی،

ظاہر ہے جس ڈنر پر کثیر رقم صرف ہوئی ہو اسے اگر مہمانوں نے پوری طرح ٹھکانے نہیں لگایا تو کھانے کی بربادی کیساتھ اکیڈیمی کا مالی نقصان بھی یقینی تھا، لہٰذا فضل تابش صاحب اکیڈیمی کے مفاد کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے اپنی "سکریٹری شپ" کو بالائے طاق رکھ کر کنوینر ڈنر کے فرائض انجام دینے لگے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے ایک ہوشیار میزبان پر یہی دھن سوار رہتی ہے کہ اس کی میزبانی کا سکہ کسی طرح چل جائے، چاہے اس کوشش میں مہمانوں کے ٹکسال، عرف معدے کا دیوالہ ہی کیوں نہ پٹ جائے۔ چنانچہ ہم لوگ اپنے معدے کا دیوالہ خوشی خوشی پٹا کر کافی رات گئے اپنے ہوٹل پہنچے جہاں ہمیں صبح تک کے لئے الوداع کہنے سے پہلے اکیڈیمی کے اکاؤنٹنٹ، جناب انصاری ایم اے نے انتہائی صیغۂ رازمیں فرداً فرداً ہماری خدمت میں معاوضہ کی رقم معہ خرچۂ آمدورفت پیش کی اور اس طرح اپنے اکاؤنٹنٹ ہونے کی جو بات موصوف نے پہلی ملاقات میں بر سبیل تذکرہ بیان فرمائی تھی اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے خوشی خوشی رخصت ہوئے !!

اگلی صبح نکرجی کی روانگی عمل میں آنے والی تھی اس لئے رات میں یہ ارادہ باندھ کر سوئے تھے کہ صبح جلدی اٹھ جائیں گے اور اپنی دانست میں صبح معمول سے کچھ قبل بیدار بھی ہو گئے لیکن جب باہر نکل کر دیکھا تو نکرجی اپنا مختصر سا رختِ سفر باندھے چلنے کو تیار بیٹھے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ تابش صاحب بھی آگئے نکرجی کو ایرپورٹ پہنچانے کے لئے چنانچہ ہم بھی اسی قافلے کے ساتھ ہولئے اور راستے میں حسبِ پروگرام میں اور مسیح صاحب تاج المساجد کے قریب اُتر گئے نکرجی سے الوداعی مصافحہ کیا۔ اور پھر کار کے نظروں سے اوجھل ہوجانے کے بعد تاج المساجد کی طرف متوجہ ہوئے۔ بھوپال کی حدود میں داخل ہوتے ہی جن بلند و بالا مناروں کو دور سے دیکھ کر ہمیں تاج محل کا گمان ہوا تھا وہ دراصل تاج المساجد کے نورانی مینار تھے جو اب اس قدر نزدیک تھے کہ نظر ان کے بوسے لے رہی تھی۔ سورج کی کرنیں بھی ان سر بہ فلک میناروں کے سنہری کلس سے کسبِ نور کر کے چاروں طرف ایمان کا اجالا بکھیر رہی تھیں جس سے ہر ذی روح اپنے کعبۂ دل کو منور کر سکتا ہے بشرطیکہ رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو میں عقیدت کی سُرخی بھی شامل ہو۔ وسعت اور رقبے کے اعتبار سے ایک اندازے کے مطابق تاج المساجد کو ایشیا کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ویسے مسجد چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، سنگ مرمر کی ہو یا اینٹ چونے گارے سے تعمیر کی گئی ہو، خُدا کے گھر سے ایمان کی روشنی ایقان کی پختگی اور عقیدے کی مضبوطی یکساں تقسیم ہوتی ہے۔ وسیع و کشادہ مسجدوں کی تعمیر کے پیچھے یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ ان کے رعب و جلال کے ذریعہ آئندہ نسلوں کو مرعوب کیا جائے بلکہ ایسی ہر تعمیر میں خلوص کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، وقتی اور عصری تقاضوں کے ساتھ مستقبل کی ضرورتیں پیش نظر ہوتی ہیں وقت کی رفتار کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے بڑھتے ہوئے مسائل کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ایسے پر خلوص تعمیری نذرانوں کے ساتھ آئندہ نسلوں کا جوابی سلوک اکثر حوصلہ شکن رہا ہے دو نسلوں کی اسی بے حسی کو دیکھ کر علامہ اقبال کو شکوہ جواب شکوہ میں یوں شکوہ بہ لب ہونا پڑا ؎

مسجدیں نوحہ کناں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔

البتہ تاج المساجد نے اِس قسم کی نوحہ گری سے کسی حد تک خود کو بچا لیا تھا کیوں کہ اس نے مستقل نمازیوں کا نعم البدل مختلف عمر کے ان معصوم بچوں میں پا لیا تھا جو طلبِ علم کی جستجو میں دور دور سے آکر اس سے وابستہ دینی درسگاہ میں قیام پذیر تھے۔

اس دینی درسگاہ کی فعالی اور کارکردگی دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی بلکہ یہ خوشی اس وقت دو چند ہوگئی جب یہ معلوم ہوا کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں عصری تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے اور سارے ہی مضامین یہاں تک کہ عربی بھی اُردو میڈیم کے ذریعہ پڑھائی جاتی ہے گویا جو زبان سرکار، دربار، بازار یہاں تک کہ گھر بار سے بھی محروم کردی گئی ہے اسے اس کا جائز مقام ملا بھی اللہ کے گھر میں سچ ہے جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

تاج المساجد کے بارے میں ایک اور حیرت انگیز انکشاف یہ ہوا کہ اس کی بُنیاد تقریباً نصف صدی قبل رکھی گئی تھی جب بھوپال ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہوا کرتی تھی لیکن اس کی تعمیر کی تکمیل کا سہرا کسی نواب یا رئیس اعظم کے سر نہیں بندھا تھا بلکہ اس کی موجودہ صورت گری ایک اکیلی شخصیت کی کوششوں اور محنتوں کا ثمرہ ہے اور اس قابلِ فخر شخصیت کا نام ہے مولانا عمران خان صاحب ـــ موصوف بفضلِ تعالیٰ حیات ہیں اور سارے بھوپال میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ قابلِ فخر کارنامے انجام دینے والی شخصیتوں کے بارے میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں جبکہ مولانا عمران خان صاحب نے تن تنہا تاج المساجد کے تعمیری کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچا کر یہ ثابت کر دیا کہ بعض خوش نصیب شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی ذات میں انجمن ہی نہیں مسجد بھی ہوتی ہیں۔

حسب پروگرام تابش صاحب نے ایرپورٹ سے لوٹتے ہوئے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور اردو اکیڈیمی کے دفتر لے گئے جو پروفیسرز کالونی کے ایک دو منزلہ رہائشی بنگلے میں واقع ہے۔ تقریبات کے سلسلے میں اکیڈیمی کا عملہ چونکہ پچھلے کئی روز سے "اوور ٹائم" مصروفیات میں مُبتلا تھا اس لئے آج غالباً چھٹی پر تھا چنانچہ اکیڈیمی کے دفتر میں خالی میز کرسیوں کا غذات مطبوعات ٹیلی فون اور جاں نثار اختر مرحوم کی "آئیل پینٹ" سے بنی دیوارگیر تصویر نے ہمارا استقبال کیا مرحوم کی تصویر دیکھ کر ان تمام چھوٹی بڑی محفلوں اور نشستوں کی یاد آگئی جن میں جاں نثار اختر کو دیکھنے کا سُننے کا ان سے بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور یادوں کی اس اچانک یلغار کا اثر یہ ہوا کہ دل بوجھل سا ہوگیا اور جاں نثار اختر ہی کا یہ شعر حافظے کے دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دینے لگا۔

ے چھلکتے جام میں بھیگی ہوئی آنکھیں اتر آئیں
ستائے گی کسی دن یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

اکیڈیمی کے سرسری معائنے کے بعد محسوس ہوا کہ بھارت کی مختلف اردو اکیڈیمیوں کے قیام کے پیچھے چونکہ ایک ہی مقصد کارفرما ہے اس لئے ان کے لائحۂ عمل بھی قریب قریب مشترک ہیں، جن خطوط پر یہ اکیڈیمیاں کام کرتی ہیں وہ بھی بڑی حد تک پٹے چلتے ہیں

قصہ مختصر یہ کہ اردو اکیڈیمی مدھیہ پردیش کی ہو، مہاراشٹرا کی یا آندھرا پردیش کی، ساری اردو اکیڈیمیاں ایک دوسرے کی "ٹرو کاپی" ہوتی ہیں۔!

اردو اکیڈیمی سے نکل کر، ہم اور مسیح صاحب، یوسف ناظم صاحب کے ہمراہ سیفیہ کالج گئے۔ جہاں بھوپال کے کہنہ مشق مزاح نگار جناب جہاں قدر چغتائی استاد کے منصب پر فائز ہیں۔ ناظم صاحب نے راستے میں یہ بات بھی ہمارے گوش گذار کردی تھی کہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب بھی اسی کالج کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔۔ قوی صاحب کے وقیع مضامین او تحقیقی مقالے آئے دن اُردو کے مستند رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اس لئے موصوف کا نام نامی علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ بھوپال آکر پروفیسر صاحب سے نہ ملنا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی بمبئی آئے اور گیٹ وے آف انڈیا، یا جوہو کا نظارہ نہ کرے۔ کالج پہنچنے پر چغتائی صاحب تو آسانی سے دستیاب ہوگئے البتہ پروفیسر صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی گھر تشریف لے گئے ہیں چغتائی صاحب نے موصوف کے گھر تک ہماری رہنمائی فرمائی جو کالج کے پچھواڑے ہی واقع ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنی مخصوص "عالمانہ" مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ اور پھر اپنی بیٹھک میں لے گئے جو ان کی مسکراہٹ ہی کی طرح عالمانہ تھی یعنی بیٹھک کم اور مطالعہ گاہ زیادہ تھی، پروفیسر صاحب اپنی بیٹھک کم مطالعہ گاہ کے احترام میں زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے تھے لہٰذا ہمیں بھی تکلفاً زانوئے ادب تہہ کرکے بیٹھنا پڑا۔ ہمارے اس جذبے کے پیچھے دراصل یہ احساس کارفرما تھا کہ جب پروفیسر صاحب روزانہ اس طرح اپنی مطالعہ گاہ میں زانوئے ادب تہہ کرکے گھنٹوں بیٹھ سکتے ہیں تو کیا ہم تھوڑی دیر کے لئے زانوئے ادب تہہ نہیں کرسکتے۔۔ قوی صاحب قویٰ کے اعتبار سے اس قدر قوی نہیں ہیں لیکن ذہنی طور پر بے حد قوی ہیں؟ اس کا اندازہ ان کی نپی تلی ٹھوس علمی گفتگو سے ہوا۔ اگرچہ کہ اس مختصر سی ملاقات کے دوران موصوف کی ادبی شخصیت نقوش اور فن اور شخصیت کے تازہ ترین شخصیات نمبروں میں گھری ہوئی تھی تاہم انھوں نے ہمیں اس بات کا مطلق احساس نہیں ہونے دیا۔ دو روز پیشتر چغتائی صاحب جاں نثار اختر مرحوم کے ہم زلف عرف ساڑو کی حیثیت سے ہم سے متعارف ہوئے تھے اور ہم نے بھی انھیں اتنی ہی اہمیت دی تھی جتنی کہ ایک مشہور شاعر کے ہم زُلف کو دینی چاہیئے۔ لیکن جب محفل طنز و مزاح میں موصوف ایک پختہ کار مزاح نگار کی حیثیت سے خود اپنی شناخت کا پرچم لہراتے آئے تو ان کا مرتبہ ہماری نظر میں کچھ اور اُونچا ہوگیا۔ موصوف نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ بھوپال کے چپے چپے میں اپنے مقام مرتبے اور مقبولیت کے بے شمار لہراتے ہوئے جھنڈوں کی جھلک دکھلانے کی غرض سے ہمیں مختلف گلیوں کوچوں اور بازاروں کا طواف کروانے لگے۔۔۔ چغتائی صاحب اس وقت عمر کے جس پیٹے میں ہیں، اس میں آدمی عام طور سے بڑا نعدد نج ہوجاتا ہے لیکن مزاح نگاری کی برکت نے زود رنجی کی اس منزل میں بھی چغتائی صاحب کو خاصا مرنجانِ مرنج بنا رکھا ہے، اور غالباً اسی وجہ سے سارا بھوپال ان کا مداح ہے۔ چنانچہ جس راستے، جس گلی، جس بازار سے وہ ہمیں اپنے ساتھ لئے گزرتے رہے ان پر سلاموں کی بوچھار ہوتی رہی، اور ان کی یہ قدر افزائی دیکھ کر میرا یقین اور بھی پختہ ہوگیا کہ آدمی کو جہاں قدر چغتائی صاحب کی طرح جہاں قدر ہو دہیں بود و باش اختیار کرنی چاہیئے۔

دپال کے مارکیٹ میں، چغتائی صاحب کی قدر و منزلت کو رائج الوقت سکے کی طرح چلتا دیکھ کر ناظم صاحب نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا
ر امورِ خانہ داری سے متعلق اشیاء کی خریداری میں مصروف ہو گئے۔ ایک مشہور ادبی شخصیت کو اس قدر غیر ادبی مصروفیت میں
بتلا دیکھ کر مسیح صاحب خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے ان کی اس سنجیدگی پر ناظم صاحب کو غالباً دل لگی سوجھی چنانچہ جس دکان پر خریداری
ی نیت سے رکتے مسیح صاحب سے بھی کچھ نہ کچھ خریدنے کا اصرار کرتے اور مسیح صاحب جواباً ان کے ہر اصرار کو اپنے انکار سے بے کار
دیتے۔ غالباً مسیح صاحب کو یہ خدشہ تھا کہ امور خانہ داری سے متعلق جو اشیاء ناظم صاحب خرید کر اپنے گھر کا سکون قائم و دائم رکھنا
یاہتے ہیں وہی اشیاء ہو سکتا ہے ان کے حق میں خانہ جنگی کا باعث بن جائیں اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناظم صاحب جس قدر جوش و
زکش سے اپنی قوتِ خرید کا مظاہرہ کرتے رہے مسیح صاحب اتنی ہی شدت سے خود کو خریداری کی تہمت سے بچائے رکھنے کی
وشش کرتے رہے۔ کافی دیر تک یہ مقابلہ آرائی جاری رہی بالآخر ناظم صاحب بیزار ہو کر بولے "ٹھیک ہے آپ کچھ مت خریدیئے لیکن
یہاں کا بٹوہ ضرور لے جائیے، پاندان کا یہ پاکٹ ایڈیشن بھوپال کی گھریلو صنعت کا شاہکار مانا جاتا ہے آپ کے مکان میں خوش ہو جائیگی
مسیح صاحب نے فوراً جواز پیش کیا۔ میری گھر والی پان نہیں کھاتی ۔!
ناظم صاحب نے پینترا بدل کر وار کیا۔ کوئی بات نہیں یہاں کے بٹوے بوقتِ ضرورت سیف ڈپازٹ لوکر کا بھی کام دیتے ہیں۔ جواب
میں مسیح صاحب نے اپنے ہونٹوں کا بٹوہ کھولا، اور بظاہر مسکرا کر رہ گئے، لیکن میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کربناک مسکراہٹ
کے پردے میں اُنہوں نے بڑی ہی تلخ حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا تھا ناظم صاحب میں محکمہ تعلیمات کا ایک معمولی ٹیچر ہوں اور ٹیچر کے
بجٹ میں بچت تو دور، محض خانہ پوری کی خاطر بھی بچت کا خانہ نہیں ہوتا پھر میں بٹوہ لے کر کیا کروں گا۔ ناظم صاحب بولے اگر آپ فی الحال بٹوہ خریدنا
نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ ویسے آپ کل تک تو یہاں ہیں میرے مشورے پر ضرور غور فرمائیے گا۔!!"
بھوپال کے بازاروں کی رونق دیکھتے ہوئے ہم لوگ اپنے ہوٹل کے قریب پہنچ چکے تھے، دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہو چکا
تھا بھوک بھی لگنے لگی تھی اور ناظم صاحب بھی خریداری کے بوجھ سے خاصے دوہرے ہو چکے تھے اس لئے سیدھے ہوٹل کا رخ کیا۔!!

پاگل عادل آبادی کا مجموعہ کلام

گڑبڑ گھٹالہ

قیمت ۱۵ روپے
بتوسط شگوفہ حاصل کی جا سکتی ہے

ڈاکٹر سید حامد حسین
(بھوپال)

تبصرہ

"غبارِ حاضر" از رؤف خوشتر

باسی ڈبل روٹی اور باسی مزاح دونوں حلق میں پھنسنے لگتے ہیں۔ اور با خبر لوگوں کا کہنا ہے کہ رؤف خوشتر کو دونوں سے پرہیز ہے۔ روٹی کی دوڑ دھوپ سے جب انھیں سانس لینے کی مُہلت ملتی ہے تو وہ مزاح لکھتے ہیں لیکن چھاؤں میں بھی وہ دھوپ کی چٹک اور تمازت بھُلا نہیں پاتے اور اِسی لئے اُن کے مزاح کی گدگدی پرت پر ذرا سا سنجیدگی کا دباؤ پڑجائے تو تہ میں بیٹھے کھُردرے پن کا احساس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اُن کے یہاں شخص، سماج اور شورش کے تلوّن سے جھلاّہٹ نہیں بلکہ مسکراہٹ جنم لیتی ہے، ایک ایسی مسکراہٹ جس کے جلو میں جوہری شکست سے پیدا ہونے والی توانائی اور تباہ کاری کے جلوے نظر آتے ہیں۔

"غبارِ حاضر" مزاح کی نیام میں رکھے ہوئے اُن ۱۸ آبدار مضامین کا مجموعہ ہے جس کی ابتداء "پان" کی سُرخی سے ہوتی ہے اور انتہا "یرقان" کی زردی پر اور ان کے درمیان کہیں تلاشِ داماد اور گنجے سر کی روداد ہے تو کہیں موپیڈ کی سواری اور ناقابلِ گزر گلیوں کا احوال۔ کہیں اسکول کھول کر معاشی خستہ حالی کے علاج کا ذکر ہے تو کہیں وزارت سے گزر کر حجامت تک پہنچنے کی داستان۔ کہیں کُل ہند مچھر کانفرنس بپا ہے تو کہیں پانی کی قلت کی بپتا ہے۔ الغرض اپنی ایک ٹانگ پر اُچھلتے، کودتے ناک سکوڑتے، ہمارے جانے پہچانے، کُڑھے، دریدہ لباس سماج کا یہ ایسا عجیب دلچسپ نگار خانہ ہے جس کی طرف کبھی طبیعت از خود کھِنچتی ہے اور کبھی ہم ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

لگتا ہے کہ رؤف خوشتر افسانہ نگاری کی منزل سے ایک پڑاؤ پیچھے ہی داہنے موڑ پر مُڑ گئے ہیں اور رقّت اور خطابت کے درمیان پڑنے والی پتلی پگڈنڈی پر چل نکلے ہیں۔ اُنھوں نے زبان و بیان کی برسوں مہما نداری کی ہے اور وہ اُن کے مزاج اور ناز و انداز کو پہچاننے لگے ہیں۔ اسی مزاج دانی نے اُنھیں مزاح نگار بنا دیا ہے۔ چنانچہ اُنھیں الفاظ سے کھیلنے، محاوروں کے ساتھ آنکھ مچولی کرنے اور اشعار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں لطف آتا ہے۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ کبھی مضمون نگار ایسا بھی

کرے گا کہ وہ اپنے موضوع کو کھلا چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ بھٹک کر دور نکل جائے اور پھر پیچھے سے آکر اچانک اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کی آنکھیں چھپالے۔ رؤف خوشتر کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔ پھر کبھی اُنھوں نے ایسا بھی کیا ہے کہ چلتے ہیں ایسے کہ چین پہنچیں گے اور نکلتے ہیں پڑوس کی گلی میں۔ مزاح کے ساتھ یہی بے تکلفانہ برتاؤ اُن کے انداز کو ایک انوکھی تازگی اور کشش بخشتا ہے۔

وہ جانتے ہیں کہ مزاح کا دروازہ کونسے سم سم سے کھلتا ہے۔ وہ تفصیلات کے تصادم و تقابل سے ایسی بے ہنگم صورت بنانا چاہتے ہیں جس سے مزاح کی فضا بنتی ہے۔ اُنھیں وہ گر بھی معلوم ہے جس سے مزاحیہ بیان کو سان پر چڑھا کر اُس میں ضرب المثل جیسی حکمت افروز گرفت پیدا کی جاتی ہے۔ وہ مزاح میں بوالعجبی اور اچانک پن کی اہمیت سے بھی واقف ہیں۔ لیکن مزاح کا طلسمی دروازہ بغیر گڑگڑاہٹ کے، پٹ سے کھل جائے اُس کے لئے جو قلمی ریاض چاہئے وہ اُمید ہے کہ رؤف خوشتر اپنا اگلا مجموعہ شائع کرنے سے پہلے یقیناً حاصل کرلیں گے۔

جو بات اس یقین کو پختہ کرتی ہے وہ خوشتر کا خلوصِ نیت، جوشِ طبیعت اور دردمندانہ فطرت ہے۔ اُن میں سماج کی ناہموار وادیوں میں، گھٹنوں کی خراشوں اور تلوؤں کے زخموں سے بے پروا ہوکر دوڑنے کا دم خم ہے اور وہ تارتار گریبان میں منہ ڈال کر ہنس لینے کی بھی ہمت رکھتے ہیں۔ اگر نالہ کو سینے میں تھوڑا اور تھام لینے کی اُنھوں نے مشق کرلی تو پھر تو وہ سادھو بن سکتے ہیں یا ایک اعلیٰ طنز نگار اور ہماری دُعا بلاشبہ آخرالذکر کے حق میں ہے ●●

پہلے "چھیڑ چھاڑ" پھر "چوڑی کے غلام" اس کے بعد "توتو، میں میں"

اور اب پرویز یداللہ مہدی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ

ٹائیں ٹائیں فش

۱۲۸ صفحات ——— قیمت ۱۵ روپئے

محبوب تا مجھومی (نماسیلہ)

اک ہاتھ میں ساغر ہے، اک ہاتھ میں خنجر ہے
کس بات پہ ساقی کا بگڑا ہوا تیور ہے
ٹکتا ہی نہیں اک جا، پاؤں میں سنیچر ہے
کل جیل کے باہر تھا، اب جیل کے اندر ہے
جب جیب میں پیسہ تھا، وہ شوخ بھی کہتا تھا
تو ہی مرا سب کچھ ہے، تو ہی مرا دلبر ہے
آواز لگاکر وہ اب بیچتے ہیں سبزی
آلو ہے، ٹماٹر ہے، بیگن ہے، چقندر ہے
اِس اُلٹے زمانے کی ہر بات ہی ہے اُلٹی
شوہر جو ہے بیوی ہے، بیوی جو ہے شوہر ہے
اس رسم تعارف کی محبوب ضرورت کیا؟
صورت ہی سے لگتا ہے، مظلوم ہے شوہر ہے!

یوں تو صورت سے ہو متین میاں
پھر بھی باتوں کا کیا یقین میاں
سن لو گانے تمام فلموں کے
میرا بچہ ہے کیا ذہین میاں
مانگنے سے کسی کو کچھ نہ ملا
چھین کو جو چاہیئے وہ چھین میاں
رنگ دنیا کا چڑھ گیا اُن پر
بے ایمان ہو گئے "امین میاں"
جن کو کلمہ بھی سیدھا یاد نہیں
وہ ہیں اب پاسبانِ دین میاں
تیرے ہر کام ہی میں جلدی ہے
آدمی ہے کہ تو مشین میاں
میں سناؤں نیاز کس کو غزل
کِس کے آگے بجاؤں بین میاں

○

دل میرا پنجے میں اُنکے پھنس گیا ہے دوستو — ہاتھ میں بچے کے جیسے جھنجھنا ہے دوستو
چین کا دارالخلافہ اصل میں نانديڑ ہے — اک پروفیسر نے ثابت کر دیا ہے دوستو
پہلے میرا شہر تو دانشوروں کا شہر تھا — اب یہ ہوٹلوں کا جزیرہ بن گیا ہے دوستو
رفتہ رفتہ اُس کا جب ذہنی توازن کھو گیا — وہ میری بستی کا لیڈر بن گیا ہے دوستو
دل کے سو ٹکڑے کرو اور پھینک دو چاروں طرف — آنے جانے کا یہ اُنکے راستہ ہے دوستو
شاعری شانہ کی ہے بس خاندانی شاعری
حضرتِ غالب سے اُس کا سلسلہ ہے دوستو

غزلیں

اقبال شانہ

محمد رحیم الدین نیاز (کریم نگری)

خرافات (مراسلے)

مکرمی سید صاحب۔ تسلیمات!

ماہ اگست کا شگوفہ اپنی تمام شگفتگیوں اور ساگر سرحدی کے "پھر کون آیا؟" کے ساتھ موصول ہوا۔ اتنے اچھے پرچے نکالنے پر آپ کو بار بار مبارکباد دینے کو دل کرتا ہے۔

انیس احمد خان۔ نئی دہلی

جولائی و اگست کے شمارے نظر نواز ہوئے۔ ماہ رفتہ میں ہند کے مختلف حصوں سے مزاح نگاروں کی یلغار اور خرافات میں ملک کے طول و عرض سے طنز و مزاح کے واحد ترجمان شگوفہ کی پذیرائی سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ

ع سلطانیٔ مزاح کا آتا ہے زمانہ

عصر حاضر کے کرب کو صبر سے صرف طنز و مزاح کے سہارے ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور یوں بھی اس پیچیدہ ہنگامی اور مسائل زدہ دور کا مداوا اگر نثر میں پیش کیا جائے تو وہ طنز و مزاح کی شکل میں ہوگا۔ افسانہ اور دوسرے اصناف نثر اتنا بار نہیں اٹھا سکیں گے۔ یہ لکھ لیجئے کہ اس کا سہرا شگوفہ کے سر جاتا ہے۔ مزاح کا پودا اب گلشن اردو میں اتنا تن آور درخت بن گیا ہے کہ اس کے سائے میں سستانے کے لئے ہر کوئی اب کشاں کشاں آ رہا ہے۔ ہر ماہ کے خطوط اس بات کے مظہر ہیں کہ اب زیادہ سے زیادہ قارئین کو مزاح کی لت لگ ہوتی ہے پھر کیوں نہ آپ کو سالار مزاح کہا جائے۔ محققین و ناقدین مزاح کے لئے شگوفہ کا تذکرہ اب ناگزیر ہو گیا ہے۔

خاص نمبر میں اردو کے لئے زیادہ صفحات مختص کریں تاکہ ہر معروف مزاح نگار کا مختصر سوانحی خاکہ تصنیف اور فوٹو آ جائے۔ رؤف خوشتر۔ لیکچرر

گورنمنٹ کالج پوسٹ بکس ۹ بیدر ۵۸۵۴۰۱

اگست کا شمارہ ملا۔ اچھا رہا۔ پرویز ید اللہ مہدی کا سفرنامہ کافی شاندار ہے ساتھ ساتھ ساگر سرحدی کا ڈرامہ یہ کون آیا۔ اور انتظار حسین کا "واہ حیدرآباد" بہت پسند آئے۔

میں مارچ اپریل اور مئی میں حیدرآباد میں ہی تھا اور آپ کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔ بڑے شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا تھا آپ نے دیر سے ہی سہی میری طرف سے اس شاندار مشاعرے کے انعقاد پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ مشاعرے کو ریکارڈ کر کے یہاں لایا ہوں اور یہاں پر تمام دوست احباب سُن کر محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔

مسرت ہوئی کہ آپ نومبر میں "ہندوستانی مزاح نمبر" شائع کر رہے ہیں۔

انیس احمد۔ دوحہ قطر۔

مکرمی! ایلے

اگست کا شمارہ کئی آنکھوں کو جگا گیا۔ کاہلی کو بھگا گیا اور دل میں آگ لگا گیا۔ عابد معز، فیاض احمد فیضی انیس احمد خاں اُمید سے زیادہ پسند کئے گئے۔

یہ ساگر سرحدی کون ہیں وہی فلم والے تو نہیں۔ بھئی کمال ہے آپ کا بھی کہاں کہاں سے لوگوں کو بلا کر اکھٹا کر لیا ہے۔ آپ آدمی ہیں یا طلسمی چھڑی۔ جس سے آنکھ لڑائی بس اُس کی ہو گئی کھٹیا کھڑی۔

اگست کا شمارہ ہر نکتہ نظر سے کامیاب ہے۔

مرزا الکوبخ۔ بھینسا

شری این۔ٹی۔ راما راؤ کی حرکیاتی قیادت میں

آندھرا پردیش میں معاشی ترقی اور سماجی انصاف کا ایک نیا باب تحریر کیا جارہا ہے

انتظامیہ کا جائزہ حاصل کرنے کے بعد شری این۔ٹی۔ راما راؤ کی زیرِ قیادت حکومت آندھرا پردیش منصوبے کے تحت آنے والے اہمیت کے حامل کاموں کا از سرِ نو جائزہ لینے میں مصروف ہوگئی۔ کمزور طبقات کے فلاحی پروگراموں کو اب اہمیت دی جاتے لگی ہے۔ خوشحالی کے لئے نئے دور کی ابتداء کرنے کے لئے باہمت اور بلند تخیل کے حامل اقدامات کئے جارہے ہیں۔ نئی حکومت کے چند کارہائے نمایاں حسبِ ذیل ہیں۔

چاول دو روپے کلو: چاول جو یہاں کے عوام کی اہم غذا ہے دو روپے فی کلو اُن تمام لوگوں کو سربراہ کئے جارہے ہیں جن کی سالانہ آمدنی ۶ ہزار روپے سے کم ہے۔

دیہات کے لئے پینے کا پانی: پینے کے پانی کے لئے دور دور کی مسافت کرنے کی مشقت بہت جلد ختم ہوجائے گی۔ ۱۰۰ افراد کی آبادی پر مشتمل مقامات کے لئے پانی کی سربراہی کا کم سے کم ایک ذریعہ فراہم کرنے کے اقدامات کئے گئے ہیں اور اب ۲۰۸۶ مواضعات کو پینے کے پانی کی سربراہی کا انتظام کیا گیا ہے۔

کمزور طبقات کے لئے مکانات: مکانات کی تعمیر کا ایک وسیع پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ سالِ رواں کے دوران ہر ضلع میں دس ہزار مستقل نوعیت کے مکانات تعمیر کرنے اور ۲ لاکھ خاندانوں میں مکانات کی آراضی تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے ۲۶۱۹۲ خاندانوں کو تعمیر مکان کے لئے امداد اور ۱ر۳۹ لاکھ خاندانوں کو مکانات کی آراضی فراہم کردی گئی ہے۔

معاشی امدادی پروگرام: معاشی امدادی پروگرام برائے کمزور طبقات کے تحت ۱ر۷۰ لاکھ درج فہرست خاندانوں اور ۰ر۱۹ لاکھ درج فہرست قبائل خاندانوں میں حاشیائی رقم تقسیم کی گئی ہے۔

بہبودیٔ خواتین واطفال: بچوں کی پرورش کرنے والی اور حاملہ خواتین کے لئے تغذیہ کا پروگرام۔ ہر ضلع کے مستقر پر کام کرنے والی خواتین کے لئے ایک ورکنگ ویمنس ہاسٹل کا قیام۔ ترپتی میں عورتوں کی یونیورسٹی کا قیام، آبائی جائیداد میں خواتین کو مساوی حق دینے کے لئے ہندو قانونِ وراثت میں ترمیم جیسے چند ترقی پسند اقدامات ہیں جو معاشی امدادی اسکیمات کے تحت خواتین کو سماج میں اُن کا جائز حق دلانے کے لئے کئے جارہے ہیں۔

(سلسلہ صفحہ ۵۸ پر)

تعلیمی محاذ پر کئے گئے اقدامات: ۵ کروڑ روپے کے خرچ سے ۶ سال تا ۱۱ سال کی عمر والے بچوں کی متوازن جسمانی او
نشو ونما کے لئے دوپہر کے کھانے کی اسکیم پر عمل آوری کی جا رہی ہے تعلیمی معیا
کرنے کے لئے کئے گئے اقدامات میں ۴۰ اقامتی مدارس کا قیام شامل ہے این آر ای پی پروگرام کے تحت اسکول کی عمارتوں کی تم
دی گئی ہے۔ عطیات کی وصولی پر پابندی عائد کی گئی ہے اوپن یونیورسٹی اور تلگو یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

دیہات میں تبدیلی لے آنا: دیہات کو خوشحالی سے روشناس کروانے کے لئے کئے گئے اقدامات میں دودھ دیا مویشی، بھا
بھیڑیں اور پمپ سٹس وغیرہ کی فراہمی شامل ہے۔ ان سے ۳۲ء ۱۰ لاکھ خاندان مستفیض ہوئے۔
۲۴ء ۱ لاکھ خاندانوں کا تعلق درج فہرست اقوام اور ۴۱ء۔ لاکھ خاندانوں کا تعلق درج فہرست قبائل سے ہے۔ دیہات میں
کی کھدائی تالابوں اور سڑکوں کی تعمیر کے ذریعہ ۱۷ء ۱۹ لاکھ کام کے ایام کے برابر روزگار فراہم کیا گیا ہے ایک ہی ذریعہ سے کاشت
کو قرض کی فراہمی کے لئے امداد باہمی تحریک کو تقویت دی جا رہی ہے۔

بڑے آبپاشی پراجیکٹ: ہمارے عظیم دریاؤں کے روح پرور پانی کو پراجیکٹوں کی تعمیر کے ذریعہ روک کر خشک اور بنجر زمی
کاشت کرنے کے لئے استعمال کیا جائے گا دریائے کرشنا کا پانی ہیچ در ہیچ مسافت طے کر
شہر مدراس کے رہنے والوں کی پیاس بجھانے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اس پانی سے راَئل سیما کے کسانوں کو نئی زندگی ملے
گنگا پراجیکٹ ہے۔ سری رام پراجیکٹ کے دوسرے مرحلے کی تکمیل سے تلنگانہ علاقہ میں کاکتیہ دور کی خوشحالی واپس آئے گی۔
یا مُن کنال رائل سیما اور تلنگانہ کے کسانوں کے لئے نئی امیدیں لے کر آئے گی۔

جاری کردہ: **ناظم اطلاعات وتعلقات عامہ حکومت اے پی**

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کے مجموعے

البتہ — قیمت: ۱۰ روپے

بتوسط
شگوفہ
حاصل
کی جا سکتی ہے

فقط — قیمت: ۸ روپے
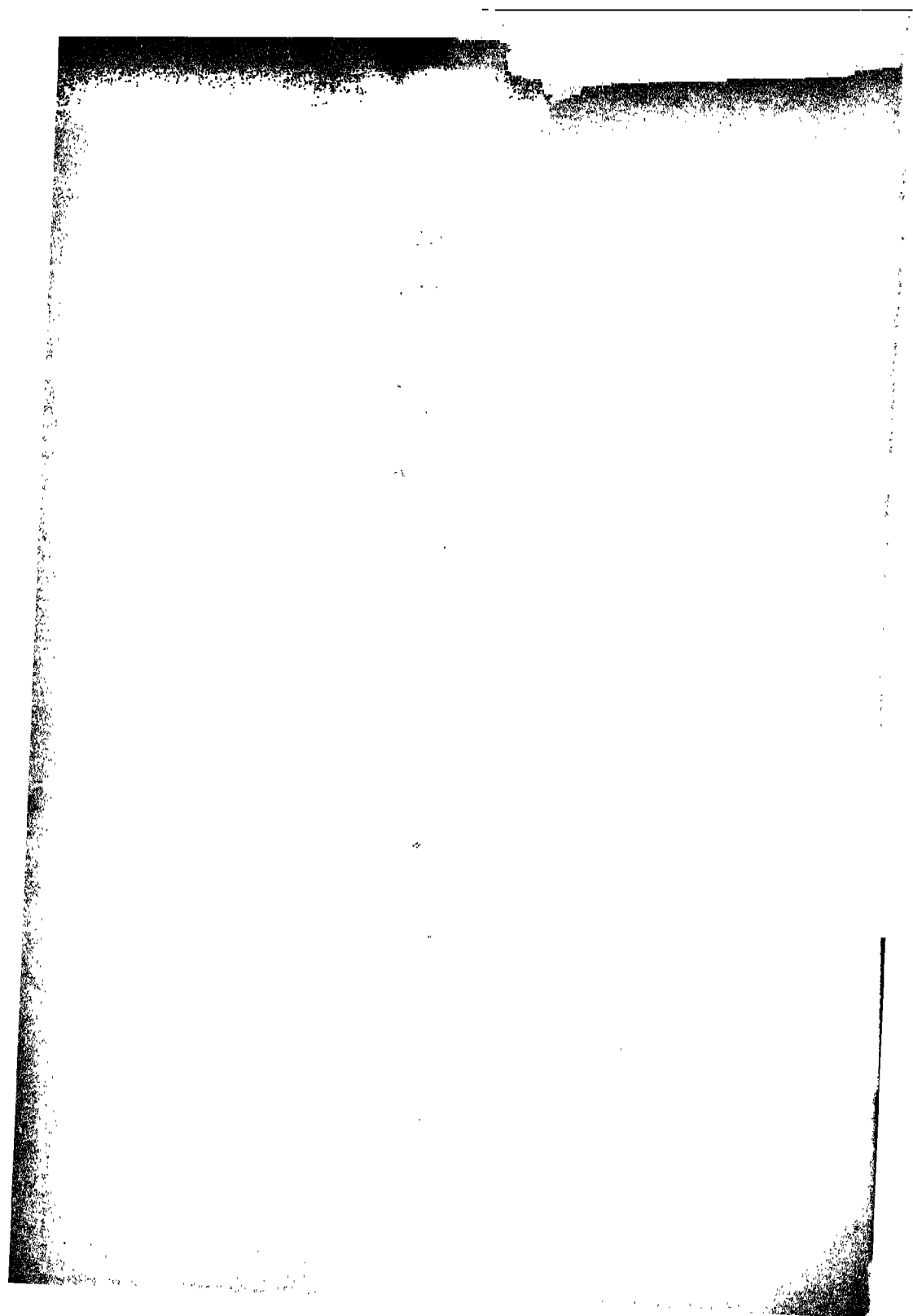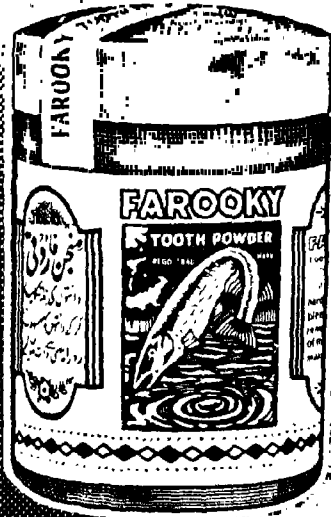
Courtesy - Deccan Chronicle

OCTOBER **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۱۶ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر :
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت :
راجندر سنگھ بیدی
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل :
شعیب

منیجر : سمیع جلیل

قیمت : فی پرچہ : ۳ روپے
زرِ سالانہ : ۳۰ روپے ، انفرادی ۲۵ روپے
بیرونِ ہند سے : ۹۰ روپے

کتابت : محمود سلیم ۔ عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲۔

خط و کتابت کا پتہ :
شگوفہ ۳۱ ۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون : 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ــ ۱

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری آگرہ
۳۔ پارکو، سری نگر
۴۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز تریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چمپئن وہائٹ روئس
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اُس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے ــــ

تیار کنندگان:

پھولت داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۲

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

"سائیڈ سے چلئے"
اور
"در پردہ"
کے بعد
مزاح نگار
مسیح انجم
کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ
چنانچہ
زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام
شائع ہو چکا ہے
خوبصورت سہ رنگی سرورق
پاکستان کے نامور کارٹونسٹ:
عزیز حیدرآبادی
قیمت:
(مجلد) بارہ روپے

"شگوفہ" کا "ہندوستانی مزاح نمبر"

ہندوستان کی ساری زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا

جائزہ اور انتخاب

(حصۂ نثر)

● جنوری ۱۹۸۴ء میں شایع ہوگا

مہمان مدیر: یوسف ناظم

زبان	نام
اردو	ڈاکٹر محمد حسن - ڈاکٹر ظ۔ انصاری
ہندی	ڈاکٹر سریندر مشرا - متی لال شاہین
مراٹھی	ڈاکٹر عبدالستار دلوی
گجراتی	ڈاکٹر سکینا جوہری
کشمیری	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ
پنجابی	پروفیسر گرنام سنگھ تیر، پروفیسر راز سنتوک سری
بنگالی	شانتی رنجن بھٹاچاریہ
انگریزی	ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر سید حامد حسین
تلگو	ڈاکٹر راما راؤ
کنڑی	حمید الماس
میتھلی	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
سندھی	ڈاکٹر ارجن داس
اڑیا	اسمٰعیل آذر
تامل	ایس ایم - حیات

ساتھ میں بیسویں صدی کے مزاح نگاروں کے قلمی خاکے اور "بقلم خود" تحریریں اور تصویریں

رشید احمد صدیقی پطرس فرحت اللہ بیگ عظیم بیگ چغتائی شوکت تھانوی فرقت کاکوروی کنہیا لال کپور

کرشن چندر بھارت چند کھنہ فکر تونسوی احمد جمال پاشا یوسف ناظم مجتبیٰ حسین وجاہت علی سندیلوی

شفیقہ فرحت خواجہ عبدالغفور زیندر لوتھر رشید قریشی برق آشیانوی مسیح انجم پرویز یداللہ مہدی

★ حصہ معلومات اردو کی مزاحیہ کتابوں کی ببلوگرافی

مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

قیمت: بیس روپے ۲۰

شگوفہ: ۳۱ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ ۵۰۰۰۰۱

سرسوتی سرن کیفؔ
(چنڈی گڑھ)

منتخب گمنا ادیبؔ کا

ایک عدد نشست شعری

آج کا دن بہت خراب ثابت ہوا۔ کل رات مچھروں کا بہت زور تھا، نیند بہت کم آئی تھی۔ بیگم صاحبہ کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ ایسے میں اگر صبح صبح صاحب زادے تیسرے پہر سینما دیکھنے کی اجازت طلب کریں اور یہ اس مہینے میں اُن کی پانچویں پکچر ہو تو کس کم بخت باپ کو غصہ نہ آئے گا اور جب صاحب زادے غصّہ میں آگ لگا کر کھسک جائیں تو باپ کے غصّے کو اُترنا بھی ماں ہی پر ہوگا اور ماں اگر اپنے خون سے رات بھر مچھروں کی تواضع کرتی رہی ہو تو اس کی قوت برداشت ختم ہو جانا بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ناشتے کے وقت ہم دونوں کے منہ کھانے کے لئے کم چلے، ایک دوسرے پر آگ اُگلنے میں زیادہ مصروف رہے کیونکہ زید کو "بگاڑنے" کی ذمہ داری والی بال کی گیند کی طرح ادھر سے اُدھر پھینکی جاتی رہی۔ اس مباحثے کا نتیجہ میرے اور فرید دونوں کے حق میں خراب ہوا کیونکہ بیگم صاحبہ نے آج کی شام اور رات مع اپنی دختر نیک اختر کے اپنی بہن کے ہاں گزارنے کا اعلان کر دیا اور ہم باپ بیٹے کے سامنے شام کو رمضان ہوٹل کے بدبودار کھانے اور اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کچی پکی کھچڑی کے درمیان انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوگیا۔

دفتر میں کوفت کم ہونے کی بجائے بڑھی۔ شروع شروع ہی میں ٹیلیفون پر وزیر صحت کی ڈانٹ سننے کو ملی کہ گزشتہ شمارے میں یوم جمہوریت کے سلسلے میں اِن کا پیغام وزیر مالیات کے پیغام کے بعد کیوں رکھا گیا، پہلے کیوں نہیں۔ ایک ایم ایل اے میرے کیبن میں خود قدم رنجہ فرما گئے اور دھمکی دے گئے کہ اگر آئندہ ہنر کی کوئی غزل چھپی تو اس کا نتیجہ میرے لئے اچھا نہ ہوگا (میں انھیں کیوں کر بتاتا کہ ہنر سے آپ کی ناخوشی کا کوئی مطلب نہیں ہے کیونکہ ہنر ڈائرکٹر صاحب کے لڑکوں کا اتالیق ہے اور صرف پچاس روپے مہینے لے کر چار لڑکوں کو پڑھاتا ہے اور اسے رسالے کے ذریعے اپنی آمدنی بڑھانے سے خود چیف منسٹر روک سکیں تو روک سکیں دوسرا کوئی نہیں روک سکتا)۔ ایم ایل اے گئے تو کاتب صاحب آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں پندرہ روز کی رخصت کی درخواست لے کر آ گئے کیوں کہ اُن کے داماد کی نانی کی بڑی بہن اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ ادھر ایک

نوجوان سب ایڈیٹر نے جناب نہال چند کا مضمون اپنی ذمہ داری پہ واپس کر دیا تھا۔ کم بخت نے مجھ سے پوچھا ہوتا تو جان گیا ہوتا کہ نہال چند صاحب کا مضمون کتنا ہی بے کار اور چوری کا مال کیوں نہ ہو اُسے واپس نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ نہال چند کے زور ہی پر تو پلیس منسٹر صاحب انتخابات میں کامیاب ہوئے ہیں۔

لیکن یہ سب باتیں مسئلہ ان کی سوسے زیادہ ثابت نہیں ہوئیں۔ نہاں کا ایک اس وقت پڑا جب حضرت ادیب جہانسوی طوفان کی تیزی سے کیبن میں داخل ہوئے اور کرسی میں دھنس کر بولے "نظامی صاحب! میں آپ کا صرف ایک منٹ لوں گا۔"

ہندو پُرانوں کے مطابق دیوتاؤں کا ایک دن انسانوں کے ایک برس کے برابر ہوتا ہے۔ ادیب جہانسوی کا منٹ بھی دیوتاؤں کے دن سے افضل ہی ہوگا۔ زیادہ تر تو وہ ایک منٹ کی گفتگو کا اعلان کرتے ہوئے آتے تھے لیکن شاید ہی کبھی تین گھنٹے سے پیشتر اُٹھے ہوں۔ میرا دماغ صبح سے آتی بار جوش کھا چکا تھا کہ اس وقت میں کسی قسم کا احتجاجی برتاؤ نہ کر سکا۔ نہایت مُردہ دلی سے صرف یہ کہہ سکا "تشریف رکھیے۔ کیسے تکلیف کی؟"

"بھئی نظامی صاحب! اصلیت یہ ہے کہ دو چار روز بھی آپ سے نیاز حاصل نہ ہو تو زندگی میں خالی پن محسوس ہونے لگتا ہے لیکن اس وقت ایک خاص تکلیف دینے آیا ہوں" ادیب صاحب نے کتاب کا دیباچہ شروع کیا۔

مجھے کچھ تعجب ہوا۔ ادیب صاحب کے ہاتھ میں کوئی مسودہ وغیرہ بھی نہ تھا۔ پچھلے دو تین ہفتوں میں کئی دوستوں نے بتایا تھا کہ ادیب صاحب مجھ سے سخت ناخوش ہیں اور ہر جگہ میری برائیوں کا دفتر کھولنے کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ چاہے مر جاؤں اب نظامی کا منہ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ چونکہ اِدھر ان کی کئی تخلیقات واپس بھجوا چکا تھا للہٰذا میرے محکمے کے ڈائرکٹر صاحب کے دفتر میں حاضر ہو کر مجھ پہ تبرا کر آئے تھے۔ میں خاموشی سے ان کی بے تکی خوشامدانہ تقریر سُننے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔

خوش قسمتی سے اس بار دیباچہ کچھ لمبا نہ نکلا۔ شاید اس لئے بھی کہ میں بالکل خاموش تھا اور مزاجیہ طور پر انکسار بھی ظاہر نہ کر رہا تھا۔ دو چار منٹ تک ان کی یک طرفہ گفتگو سن کر بولا "آپ کیا خدمت لینا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

ادیب صاحب کچھ چکرا گئے۔ سیدھے ڈھنگ سے بات کرنے کی انھیں عادت ہی نہ تھی چنانچہ بوکھلا کر بول پڑے "میں درخواست کرنے آیا ہوں کہ آپ شعری نشست کی صدارت منظور کرلیں۔"

"جی؟" میں نے چونک کر کہا "کیا کرنا منظور کرلوں؟"

"شعری نشست کی صدارت۔"

"کون سی شعری نشست؟"

"جو اگلے ہفتے غریب خانے پر منعقد ہو رہی ہے۔"

اب چونکنا کافی نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں مل کر اطمینان کرلیا کہ خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ تاہم جو کچھ سُن رہا تھا اُس کی

اصلیت منظور کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حالانکہ ادیب صاحب سے تقریباً تین برس سے ملاقات تھی تاہم ان کے "غریب خانے" کا پتہ مجھے نہیں تھا۔ مجھے ہی کیا، کسی کو بھی نہیں تھا۔ جس ادب نواز دوست سے بات ہوتی وہ یہی بتاتا کہ ادیب جھانسوی ہر شخص سے یا تو اس کے دفتر میں ملتے ہیں یا اس کے گھر پر یا پھر بازار میں۔ ایک آدھ دوست نے ان سے ان کے گھر کا پتہ پوچھا تو انھوں نے جواب دیا "میں آپ کو کیا پتہ بتاؤں؟ مکان بدلنے والا ہوں۔ دو تین مکان دیکھے ہیں۔ نئے مکان میں پہنچوں گا تو انشاء اللہ ضرور اطلاع دوں گا۔" وہ اطلاع آج تک کسی کو نہ ملی۔ ویسے بھی کون کم بخت ان کے دولت خانے کی زیارت کرنے کا خواہش مند ہو سکتا تھا؟ ہر شخص کی کوشش ہوتی تھی کہ ادیب صاحب سے جلد از جلد چھٹکارا ملے۔ چنانچہ کسی نے اس تحقیقات کو آگے نہ بڑھایا۔

اور آج یہ حال ہے کہ جناب اپنے دولت خانے پر تمام شعرا اور ادب نواز حضرات کو لا گھسیٹنے پر آمادہ ہیں۔ یہی نہیں ہمیشہ دوستوں کی جیبوں سے اپنے ناشتے اور کھانے کا خرچ نکلوانے کے عادی ادیب جھانسوی صاحب آج حاتم کی قبر پر لات مارنے کے لئے تیار ہیں۔ پچیس تیس آدمیوں کو چائے تو پلانی ہی پڑے گی۔ خیر، مجھے تو اس وقت اپنی فکر پڑ گئی تھی۔

میں نے گھبرا کر کہا "بھئی مجھے شعر و شاعری سے کیا واسطہ؟ آپ جانتے ہیں رسالے کا حصۂ نظم بھی میں نے آفاق احمد کے سپرد کر رکھا ہے۔ مجھے فن شعر سے کوئی طبعی مناسبت نہیں ہے۔ سبھی لوگ اس بات کو جانتے ہیں۔ آپ کسی شاعر سے صدارت کیوں نہیں کرواتے؟"

"نہیں صاحب، شعرا صاحبان تو گٹ بندی کئے بیٹھے ہیں۔ جس گٹ کے آدمی سے صدارت کرواؤں گا اس کے مخالفین نشست کا بائیکاٹ کر دیں گے یا پھر آکر نشست کو خراب کر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ شعرا کی ذہنیت کتوں کی طرح ہوتی ہے۔"

"تو آپ کتوں میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا

پورا مکالمہ دینے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ گھنٹے بھر جھک مارنے کے بعد مجھے ادیب کی تجویز منظور کرنی ہی پڑی۔ کم از کم اس وقت ان سے خلاصی پانے کی یہی صورت تھی۔ نشست تو بہر حال اگلے ہفتے تھی۔ ادیب صاحب نے مجھ سے وعدہ تو لے لیا لیکن تاریخ کے علاوہ اور ہر بات سے مجھے ناواقف رکھا۔ نہ یہ بتایا کہ کون کون شعرا یا شعر نواز شرکت کر رہے ہیں نہ اپنے مکان کا پتہ بتایا۔ کہنے لگے "اجی صاحب! میں خود آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو کر رکشے پر آپ کو لے جاؤں گا؟"

گھر والوں کو بتایا تو انہوں نے متفقہ طور پر رائے ظاہر کی کہ مجھ پر بڑھاپے کا اثر ہونے لگا ہے کیوں کہ ادیب جھانسوی کے ساتھ کسی بات میں تعاون کرنا ذہنی تعطل کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے خود محسوس ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی بات میں وزن ہے۔ ادیب کے ساتھ تعاون کرنے کو صحت و دماغ سے کیا علاقہ ہو سکتا تھا؟ لیکن خود کردہ را چہ علاج۔ ایک بار وعدہ کر کے اس سے منحرف ہونا بھی تو میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ روز مقررہ پہ دفتر کی طرف سے باہر جانے کا کوئی پروگرام بنا لوں لیکن پھر یہ خیال، فضول معلوم ہوا۔ اس کے بعد ادیب صاحب جس طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑتے وہ ناقابل برداشت ہوتا۔ پھر کچھ اشتیاق بھی

تھا یہ دیکھنے کا کہ حضرت ادیب کا مکان اور اس میں ہونے والی نشست کس طرح کی ثابت ہوتی ہے۔

روز مقررہ پر ادیب صاحب واقعی پانچ بجے شام کو رکشا لے کر حاضر ہو گئے۔ لیکن رکشے پر صرف آدھا سفر کٹا سڑک پر رکشا چھوڑ کر ہم لوگوں نے جو گلیوں میں چلنا شروع کیا تو معلوم ہوا ابھی بھول بھلیاں میں آ گئے ہیں۔ اگر ادیب صاحب مجھے چھوڑ کر چلے جاتے تو لوگوں سے سڑک کا پتہ پوچھتے پوچھتے آدھی رات ہو جاتی لیکن ادیب صاحب مجھے چھوڑنے کے لئے نہیں پکڑ کر رکھنے کے لئے لائے تھے۔ نشست ایک کھپریل والی دالان میں منعقد کی گئی تھی۔ فرش پر ایک معمر جاذم عشاق کے جا کھائے گریباں کا نقشہ پیش کر رہی تھی اور ایک طرف ایک گاؤ تکیہ تھا جو غالباً واجد علی شاہ کے کسی مصاحب نے بنوایا تھا اور پشت بہ پشت اپنی زندگی کی گھڑیاں گنتا چلا آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ شعرا میں دونوں سوتیلی انجمنوں جدال ادب اور قتال ادب کے اراکین شامل تھے اور ایک دوسرے کو خشم آلودہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر دونوں محاذوں کے بہادروں کا جوش کچھ کم ہوا۔ سیدھی سی بات تھی۔ شعرا آپس میں چاہے جتنا لڑیں جھگڑیں پیسہ دینے والے ادبی جرائد کے ایڈیٹروں کے سامنے مکمل ادب کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب ادیب نے قتال ادب کے جوائنٹ سکریٹری سے شمع روشن کرنے کی استدعا کی تو جدال ادب کی صفوں سے آواز آئی " ادیب صاحب! اس توہین کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔" میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہا "بھئی! یہ بے تکلف نشست ہے۔ اس میں شمع وغیرہ جلانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ویسے بھی یہاں دھوپ آ رہی ہے۔" چنانچہ گالی گلوج کا پہلا دور ملتوی ہو گیا۔ پھر ادیب صاحب نے جدال ادب کے ایک رکن سے نشست کی نظامت کی درخواست کی تو قتال ادب کے اراکین واک آؤٹ پر تیار ہو گئے۔ میں نے پھر دخل در نامعقولات کیا اور ادیب صاحب ہی سے نظامت کرنے کے لئے کہا چنانچہ اس بار بھی

ع　رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

شعراء کی فہرست ادیب نے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی جس کے مطابق دونوں انجمنوں کا ایک ایک شاعر بلایا جاتا۔ ادیب صاحب کی نظامت کی شان ہی نرالی تھی ہر شاعر کے تعارف پر کوئی شعر پڑھتے تھے لیکن اس طرح کہ غالب کے شعر کو لنگڑا بنا کر میر کے سر تھوپ دیا جاتا تھا اور جگر کا شعر توڑ مروڑ کر اقبال کے گلے منڈھ دیا جاتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ادھر شاعر نے غزل پڑھنی شروع کی اور ادھر ادیب صاحب گھر کے اندر۔ وجہ یہ تھی کہ چائے وغیرہ کا انتظام غریب کو خود کرنا تھا۔ ایک بار تو شاعر غزل پڑھ چکا اور ادیب صاحب غائب کے غائب رہے تو تفتیش شروع ہوئی اور معلوم ہوا کہ دودھ پھٹ گیا تھا اور ادیب صاحب دودھ لینے بازار گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بازار گلیوں کی بھول بھلیاں کے باہر ہی واقع تھا۔

ادیب مع دودھ کے واپس ہوئے تو جدال ادب کے لوگوں نے بگڑنا شروع کیا "اس کا کیا مطلب ہے کہ ہماری انجمن کا شاعر غزل پڑھتا ہے تو ناظم صاحب غائب ہو جاتے ہیں؟"

ادیب صاحب جواب دیں اس کے پہلے ہی قتال ادب کی طرف سے کہا گیا "یہی غنیمت ہے کہ آپ لوگوں کو جھیلا جا رہا ہے۔

ادیب نے آپ لوگوں کو دعوت ہی کب دی تھی ؟ آپ لوگ تو زبردستی آئے ہیں۔ اب خاموش بیٹھے رہیئے۔"

ادیب صاحب نے گھبرا کر کہا "نہیں نہیں .... سُنیئے تو ...."

لیکن سُننے والا کون تھا۔ جدال ادب کے سورماؤں نے اُن کا گلا دبایا۔ بولے صاف صاف، یہ کیا تماشہ ہے ؟ آپ نے تو ہم سے کہا تھا کہ نشست میں قتال ادب کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیا جائے گا۔"

ادیب صاحب "سنئے حضرات .. سنئے تو" کہتے ہی رہے اور نشست میں جدال و قتال شروع ہوگیا۔ بدقسمتی سے اسی وقت اندر سے گندی پیالیوں میں چائے آگئی اور جنگ میں گرمی آئی تو بات لاتی جمع خرچ تک محدود نہ رہی۔ پیالے اور طشتریاں مع مشروب و ماکول تیر و تفنگ کی طرح استعمال کی جانے لگیں۔ ادیب صاحب چیخنے لگے "حضرات اب غریب کے مال کو تو برباد نہ کیجئے"۔ نتیجے کے طور پر ان کے منہ پر گرما گرم چائے گری اور اس کے پیچھے اس کا ظرف بھی۔

مجھے ادیب صاحب کی کیا فکر ہوتی تھی، خود اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ خوش قسمتی سے میرے قریب پروفیسر فکر بنارسی بیٹھے تھے انہوں نے مجھے بانہہ پکڑ کر اٹھایا اور باہر گلی میں لا کھڑا کیا۔ اندر سے اب بھی چیخ پکار اور چینی کے ظروف ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے کہا "یہ ہوا کیا ؟"

فکر صاحب بولے "یہاں سے چلئے تو بتاؤں گا۔" خوش بختی سے فکر صاحب گلیوں کی بھول بھلیاں سے اچھی طرح واقف تھے۔ دس منٹ میں ہم لوگ سڑک پر آ گئے اور ایک معقول ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

فکر صاحب نے بتایا کہ دراصل کچھ حد تک وہ خود اس نامعقولیت کے لئے ذمہ دار ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ مہینوں سے ادیب ان کے پیچھے پڑے تھے کہ اس شہر میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کھولی جائے اور انھیں اس کا سکریٹری بنایا جائے۔ فکر صاحب کی کچھ جان پہچان انجمن کے صدر مقام میں ہے۔ اسی لئے ادیب ان کے پیچھے پڑے تھے۔ فکر نے ان سے کہا "بھئی پہلے یہ ثابت تو کرو کہ تم اچھے منتظم ہو۔ دو چار نشستیں کراؤ، مخالف انجمنوں کے اختلافات ختم کرو، کچھ اخباروں میں بہ حیثیت منتظم تمہارا نام چھپے۔ تب تو میں تمہارے لئے بات کروں"۔ اسی روز سے ادیب مع اپنی عقل خداداد کے اس کارِ خیر میں جٹ گئے۔ اخبار کے نام پر مجھے بلایا گیا، اختلافات دور کرنے کی یہ ترکیب سوچی گئی کہ دونوں انجمنوں کو دھوکے میں رکھا جائے، شعری نشست میں لوگ آئیں گے تو خواہ مخواہ ملیں گے ہی اور پھر ادیب کا نام ہو جائے گا کہ اس نے ادبی دنیا میں اتحاد پیدا کر دیا۔

"افسوس ہے ادیب کی سکریٹری شپ بھی گئی اور پیالے طشتریوں کا خسارہ بھی ہوا" میں نے کہا۔

"اس کے لئے ہمدردی کا مستحق ادیب نہیں غریب صاحب خانہ ہے۔ بیچارہ ایک ہوٹل سے کرائے پر برتن لایا تھا۔ اب مہینوں میں ان کی قیمت بھرے گا" فکر صاحب نے بے فکری سے کہا۔ میرے مزید استفسار پر انہوں نے بتایا "صاحب خانہ ان کی جان پہچان کا ایک ناخواندہ درزی ہے جس کی کھپریل میں ادیب صاحب گرمی سردی برسات سارے موسموں میں پڑے رہتے ہیں۔ ویسے تو وہ ان کی بات نہیں پوچھتا لیکن اس وقت ان کے بھرے میں آگیا۔ انھوں نے اُسے لالچ دیا تھا کہ بڑے لوگوں سے ملاقات کروا دوں گا تو تیری دُکان چمک اُٹھے گی"۔

"لاحول ولا قوۃ" میں نے کہا ــــ فکر صاحب ہنس کر بولے "اِس وقت لاحول کیوں پڑھ رہے ہیں ؟ ادیب کے آنے پر پڑھا کیجئے"۔ ■■

گوپی ناتھ امن

حضرت آتش کی روح سے معذرت کیساتھ

حیا و شرم کیسی ڈر نہیں ہے جگ ہنسائی کا
نہ بیٹا باپ کا اپنے نہ بھائی اپنے بھائی کا

کہیں سائنس نے ذاتِ خدا کا ذکر گر چھیڑا
خدا کے منکروں کو ہو گیا دعویٰ خدائی کا

اکیلے ہیں نہ آگے ہے نہ پیچھے ہے کوئی اُن کے
خدا کی شان ان کو بھی ہے دعویٰ رہنمائی کا

گلا بندھ جائے تو اچھا گلا چکنا نہ ہو جائے
مہینے بھر کے گھی کا خرچ ہے خرچہ ایک ٹائی کا

سوالِ وصل بھی قانون کے ڈر سے نہیں کرتے
کیا سرکار نے ممنوع اب پیشہ گدائی کا

اگر چینی نہیں ملتی تو ہم کو غم نہیں اس کا
مگر یارانہ ہے ہم سے تو مصری اور ملائی کا

نئی تہذیب کے صدقے یہ عریاں ہی بنا دیگی
کہ کپڑے سے زیادہ بڑھ گیا خرچہ سلائی کا

جوش ملسیانی سے معذرت کیساتھ

گر کہا آپ نے تو ہے یہ اگر دہ بٹا تین
جو خبر آپ کی ہے اسمیں ہے خبر دہ بٹا تین

اُن کے حُقّے کی چلم نے مری چادر پھونکی
جسکو کہتے ہیں شرر اس میں ہے شر دہ بٹا تین

دیکھ کر آنکھ مری ڈاکٹروں نے یہ کہا
چشمہ لیں آپ کہ باقی ہے نظر دہ بٹا تین

زندگانی میں نمایاں ہے معاشی پہلو
جسکو کہتے ہیں گن اسمیں ہے زر دہ بٹا تین

ہم ہوئے شہر بدر اس کا نہیں غم کچھ بھی
پھر در آئیں گے بدر میں بھی ہے در دہ بٹا تین

حضرت ناسخ کی روح سے معذرت کیساتھ

دھرم اب کچھ اور ہے اب شرحِ ایماں اور ہے
اور ہے کچھ آج کا ہندو مسلماں اور ہے

قیس کا دورِ جہالت تھا یہ ہے فیشن کا دور
وہ گریباں اور تھا اپنا گریباں اور ہے

وہ پلنگ اور تخت وہ مونڈھے تعجب رخصت ہوئے
اپنے ڈرائنگ روم میں اب ساز و ساماں اور ہے

کہیے حیواں کو اگر انساں تو ہے اس کی ہتک
نامِ انساں اور کچھ ہے کارِ انساں اور ہے

انفرادی اجتماعی زندگی میں کشمکش
دل کا فرماں اور ہے سرکاری فرماں اور ہے

ہے مجازی و حقیقی عشق میں فرقِ عظیم
تارِ داماں اور ہے تارِ گریباں اور ہے

صاحبِ تخت اُڑتے ہیں اور تخت اُڑتے ہیں کبھی
تختِ شاہی اور ہے تختِ سلیماں اور ہے

(گوپی ناتھ امن کی یاد میں)

بانو سرتاج
چندراپور (مہاراشٹرا)

آؤ پڑوسن جھگڑا کریں

اکثر کوئی بات جب بحث کا موضوع بنتی ہے اور کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچتی تب کوئی کہتا ہے فلاں شخص سے رجوع کرو، وہ اس موضوع پر اتھارٹی ہے۔ کوئی نفسیات پر اتھارٹی ہوتا ہے کوئی ادب پر۔ کوئی میڈیکل سائنس میں تو کوئی ایگریکلچرل سائنس میں ماہر مانا جاتا ہے۔ خواتین خانہ بھی چند موضوعات پر اتھارٹی ہوتی ہیں (چونکئے مت) ہاں اُن کے موضوعات نرالے ضرور ہوسکتے ہیں۔ جیسے پکوان ایکسپرٹ، لگائی بجھائی ایکسپرٹ، بناؤ سنگار ایکسپرٹ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ یہ خواتین اپنے اپنے موضوع پر اتھارٹی مانی جاتی ہیں اور وقتاً فوقتاً خواتین (محلے کی) اُن سے مشورہ کے لئے جاتی رہتی ہیں۔

ہم پڑوسیوں کی نبض شناسی کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ پڑوسیوں کو (خواہ کیسی کے ہوں) ایک نظر دیکھ کر، چند منٹ اُن سے گفتگو کر کے ہم انھیں مختلف خانوں میں رکھ دیتے ہیں۔۔۔ ہماری جان پہچان والے جب کسی مکان میں شفٹ ہوتے ہیں تو ایک روز ہمیں بلا کر اپنے سب پڑوسیوں سے ہمارا تعارف کرا دیتے ہیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ اُن سے بات چیت کرنے کے بعد ہم اپنی رپورٹ پیش کر دیتے ہیں کہ فلاں پڑوسن کان کی کچّی ہے اُس سے اپنی بالائی آمدنی کی بات نہ کہنا۔ فلاں عورت مانگ کر واپس دینے والوں میں سے نہیں، لین دین محدود رکھنا۔ فلاں عورت نمبر ایک شکّی مزاج ہے اُس کے شوہر سے بھول کر بھی بات نہ کرنا۔

اور جناب ہم جو کہ پڑوسیوں کی نبض شناسی کے ماہر تھے۔ چار محلّوں اور دس گلیوں میں ہمارا شہرہ تھا ایک مرتبہ ایک ایسی پڑوسن سے ٹکرائے کہ اپنی قابلیت بڑھانے کے لئے ریسرچ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُس کی کوئی کل ہی ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی تو قربان ہونے کی حد تک لگاوٹ کا اظہار کرتی اور کبھی خواہ مخواہ پکوڑا سی ناک پھُلائے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی۔

ہمارے پڑوس کا مکان کئی دنوں سے خالی پڑا تھا۔ ایک دن آٹھ بجے کچھ عجیب و غریب آوازیں اُس مکان سے آنے لگیں جیسے کتّے اور گیدڑ باہم غصیلے لہجے میں مصروفِ گفتگو ہوں۔ رات کا وقت ہوتا تو ہم چڑیل بھوتوں کی کارستانی سمجھ لاحول پڑھتے ہوئے بستر میں گھس جاتے مگر یہاں تو روز روشن تھا۔۔۔ آفتاب اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔۔۔

باہری دروازے پر جاکر ہم نے پتہ لگایا تو خالی مکان میں مکینوں کی آمد کی اطلاع ملی۔ جن آوازوں کو ہم غلط سمجھے تھے وہ میاں بیوی کی صحیح آوازیں تھیں... چار بچّے تھے اُن کے خاندان میں... پہلے دن کی مختصر سی ملاقات کا تاثر ہم ان الفاظ میں بیان کرنا چاہیں گے کہ تھانے دار (صاحب خانہ) صاحب اگر لوکی کدّو تھے تو تھانیدارنی ڈھیمسہ دونوں لڑکے پیٹھا کدّو سے مشابہت رکھتے تھے تو دونوں لڑکیوں کے لئے بربٹی کی پھلیوں سے عمدہ تشبیہ کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

اس مختصر جائزے کی تفصیل کچھ اس طرح تھی.... تھانے دار لمبے اونچے چوڑے شخص تھے۔ توند نکلی ہوئی گردن اکڑی ہوئی۔ داروغائی پوشاک پہننے کے بعد گردن کچھ اور اکڑ جاتی تھی۔ مونچھیں تھانیدارانہ اور رعب سپاہیانہ۔ ہم نے فوراً انھیں نام دیا اکڑو جی'... ہم نے شاید آپ کو بتایا نہیں کہ ہم نام رکھنے میں بہت پکّے ہیں... مثال کے طور پر ہماری ایک سہیلی کے شوہر کا ٹرانسفر ہوا۔ جاتے وقت وہ ہمیں ایک مرغی اور تین چوزے دے گئی.... یہ مرغی ہمارے گھر آتے ہی ہمارے شاندار مرغے جنرل پر عاشق ہوگئی اور اپنے تینوں چوزوں کو چھوڑ کر چل پڑی جنرل کے پیچھے۔ ہمیں بہت طیش آیا۔ اُن بچّوں (چوزوں) پر رحم آیا اور چڑھ کر ہم نے اُس مرغی کا وہی نام رکھ دیا جو ایک مشہور فلم اسٹار کی دوسری بیوی کا ہے (تھا) اور جو انہی حالات سے گزر کر اس مقام تک پہنچی تھی۔

اکڑو جی جتنے تھانے دار تھانے میں ہوتے اُس سے کہیں زیادہ تھانے دارپن گھر میں دکھاتے۔ رات دن اُن کی دہاڑوں سے نہ صرف اُن کا بلکہ ہمارا گھر بھی گونجا کرتا۔ تھانے دارنی کا نام ہم نے 'کُڑک مرغی' رکھا۔ جیسے کُڑک مرغی ہمہ وقت پر پھیلائے ہوا سے لڑنے کو تیار رہتی ہے تھانے دارنی بھی (تھانے دار کے تھانے جانے کے بعد) ہوا، پیڑ پھول پودوں اور مرغی کوؤں سے لڑتی رہتی.....

تھانیدارنی کا قد ہوگا کوئی چار فٹ، چوٹی چار انچ، آواز چار فرلانگ تک جانے والی۔ آنکھیں چار۔ دو وہاں جہاں سب کی ہوتی ہیں دو وہاں جہاں کسی کی نہیں ہوتیں یعنی سر کے پچھلے حصّے میں۔ ایک بار وہ ہماری طرف پُشت کر کے کھڑی تھیں پھر بھی انہوں نے دیکھ لیا کہ ہم اُن کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہے ہیں۔ (حالانکہ ہم نے قطعیً کوئی اشارہ نہیں کیا تھا) بس تیار ہوگئیں ہمارے جھونٹے پکڑنے کو۔ ہاتھ بھی اُن کے چار تھے۔ دو ہاتھوں سے گھر کا کام کرتیں اور دو ہاتھوں سے سب کے بخئیے اُدھیڑتیں۔ کان تو یقیناً اُن کے چار تھے۔ کیوں کہ کبھی غلطی سے اُن کے بارے میں ایک بات کہہ دو تو ایک کی چار بنالیتی تھیں اُسے۔ چار پایہ بھی تھیں۔ دو پاؤں سے گھر میں مصروفِ کار ہوتیں اور دو ٹانگیں ہر کسی کے (ماسوا تھانیدار) معاملے میں اڑایا کرتیں... البتہ زبان کو کئی بار چار سے ضرب دینے کے باوجود ہم اُس کی لمبائی کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ آواز میں سُر بھی مناسبت سے تھے۔ ہر وقت پنچم سُروں میں بجتی رہتیں۔ آپ سوچیں گے کہ ہم نے یہ چار کی گردان کیوں لگا رکھی ہے تو سُنئیے کہ کُڑک مرغی نے چار مرتبہ ہمیں چھیڑ چھیڑ کر جھگڑا کرنے کی کوشش کی تھی اور ہم نے تبھی طے کر لیا تھا کہ اس چار کے عدد سے کو کُڑک مرغی پر مسلط نہ کیا تو ہمارا نام بھی.... نہیں۔

جھگڑا کرنا تھانیدارنی کی ہابی تھی۔ ایک مرتبہ اپنے مکان کی سیڑھیوں پر کھڑی ہو کر ہم سے کہنے لگیں" آپ کی مرغیاں روز ہمارا آنگن خراب کر جاتی ہیں"۔

اُنہوں نے سوچا ہوگا ہم جواب دیں گے۔ وہ کچھ کہیں گی۔ ہم کچھ کہیں گے اور ہو جائے گا جھگڑا شروع۔ مگر ہم نے پُکار کر کہا" مائی ڈیر مرغیو! دیکھو تمہاری شکایت ہو رہی ہے۔ یہ اچھی بات نہیں۔ خبردار! آئندہ جو آنٹی کا گھر گندہ کیا"

ویسے تو ہمارے گھر کی مرغیاں بھی (چوہوں کے علاوا) کافی سمجھدار ہیں ہماری بات سمجھ لیتی ہیں مگر شاید تھانیدارنی کے کیریکٹر سے وہ بھی مطمئن نہیں تھیں اس لئے صاف حکم عدولی کر گئیں ہماری۔ تیسرے روز ہمیں آنگن میں کھڑا دیکھ تھانیدارنی نے کیرتن شروع کر دیا.... ہم ہیں کہ دن رات آنگن کی صفائی کئے جاتے ہیں اور لوگوں کی مرغیاں یہاں آکر آرام فرماتی ہیں۔ انڈے خود کھاتے ہیں۔ آنگن ہمارا خراب کرواتے ہیں... اچانک چیخ کر بولیں" آپ بتاتی کیوں نہیں کہ میں کیا کروں؟

"پکڑ کر مار ڈالئے انھیں" ہم نے سنجیدگی سے رائے دی۔

پودوں کے نام سے واقف نہیں تھیں۔ پھول پتی کے نام پر تُلسی کا ایک پودا لگا رکھا تھا۔ ہمارے باغ کے خوبصورت پھولوں کو دیکھ دیکھ کر کُڑھا کرتیں ایک روز خوب زوردار ہوا چلی۔ بوگن ویلیا کے ڈھیر وں پھول اڑ کر اُن کے آنگن میں جا گرے۔ اب گِلہ تو ہمیں ہونا چاہیئے تھا کہ ہماری پھولوں کی دولت اُن کی ہو گئی مگر وہ اُلٹا ہمیں کو الزام دینے لگیں۔ ہم نے خلوصِ دل سے مشورہ دیا" یہ ہوا بہت سر چڑھ گئی ہے۔ پکڑوا کر پانچ دن حوالات میں رکھئے۔ سب شیخی بھول جائے گی۔

کل کی بات ہے۔ شوہرِ نامدار سے ہماری شرط لگ گئی۔ تھانیدارنی کو جھگڑا کرنے کے لئے کسی موضوع کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اس بات کو مان نہیں رہے تھے۔ ہم نے کہا شرط رہی... آپ خاموشی سے بیٹھ کر سُنیں۔

باہر آکر انھیں پکارا آئیں اور پوچھا۔ کیا ہے؟"

ہم نے کہا" دِل نہیں لگ رہا ہے۔ آیئے جھگڑا کریں"

وہ بولیں" کیا آپ کو پاگل کُتّے نے کاٹا ہے؟"

" ہمیں تو نہیں کاٹا.... مگر...." ہم نے جان بوجھ کر فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

وہ تڑخ کر بولیں" تو کیا مجھے پاگل کُتّے نے کاٹا ہے"

"دراصل بہت دیر سے آپ کی آواز سُنائی نہیں دی"

" میں کیا پاگل ہوں جو ہر وقت چیختی چِلّاتی رہوں" وہ نتھنے پھلا کر بولیں۔

" نہیں۔ مگر بہت دِنوں سے آپ نے مرغیوں کی شکایت نہیں کی۔ ہم اپنی مرغیوں کے کردار کی طرف سے مطمئن ہونا چاہتے ہیں"

" کیا آپ میرا مذاق اُڑا رہی ہیں؟"

" ہم بھلا ایسا کیوں کرنے لگے؟"

"آخر آپ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں؟ ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔"
"ہم نے کیا کہا؟" ہم نے معصومیت سے پوچھا۔
"آخر آپ نے جھگڑا کرنے کے لئے مجھے کیوں چنا؟"
"پھر کس سے جھگڑا کرتے؟"
"اور لوگ نہیں ہیں کیا؟"
"انھیں جھگڑنا تھوڑی آتا ہے۔"
"آپ کا مطلب ہے مجھے جھگڑا کرنا آتا ہے۔"
"ہم نے یہ کب کہا؟"
"پھر آپ نے مجھ سے جھگڑا کرنے کی بات کیوں کی؟"
"کیا آپ ہماری پڑوسن نہیں ہیں؟"
"پڑوسی تو وہ دائیں ہاتھ والے بھی ہیں۔"
"وہ سیدھی سادی ہیں بے چاری۔"
"میں کمینی ہوں؟"
"توبہ! توبہ! ہم اپنے منہ سے کیوں کہیں؟"
"آخر آپ نے جھگڑے والی بات نکالی کیوں؟"
"ہم نے نکالی تھی تو آپ کہہ دیتیں مجھے نہیں کرنا جھگڑا۔"
"میں کیوں کہوں؟ کیا میں آپ سے دبتی ہوں؟"
"بس یہی بات تو ہم کہنا چاہ رہے ہیں۔ ہمیشہ جھگڑا آپ شروع کرتی ہیں۔ کیا ایک بار یہ حق ہمیں نہیں مل سکتا؟"
"میں جھگڑا شروع کرتی ہوں۔ میں کمینی ہوں۔ یہ دودھ کی دھلی ہیں بے چاری۔۔۔۔"
ہم خاموشی سے اندر سرک آئے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک ہمیں نوازتی رہیں۔ اُن کے میٹھا کدو اور بربٹی کی پھلیاں بھی اُن کا ساتھ دے رہے تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ شرط میں جیتی ہوئی رقم سے کون سی مٹھائی منگائی جائے۔

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ اپنی تخلیقات پر پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں
(ادارہ)

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

[شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ]

حیدرآبادی نل

انسانی زندگی کا دارومدار ہوا، پانی اور غذا پر ہوتا ہے۔ ہوا پہلے مفت ملا کرتی تھی سو آج بھی مفت ملتی ہے لیکن آج کی ہوا پچھلے زمانہ کی ہوا جیسی پاک وصاف اور تروتازہ نہیں ہوتی۔ آج کل ہوا ہر طرح سے آلودہ ہوتی ہے۔ کارخانوں اور موٹروں سے خارج شدہ دھویں سے لے کر ذرّتہ داریت کا زہر تک اس میں ملا ہوا ہوتا ہے۔ غذا پہلے مفت ملتی تھی اور نہ آج کل ملتی ہے۔ غذا حاصل کرنے کے لئے خود یا خود کے لئے کسی دوسرے کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ پانی کا مسئلہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ پہلے زمانے میں پانی مُفت ملا کرتا تھا۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا پانی بکنے لگا۔ آج بھی انسانی تہذیب جہاں ترقی یافتہ نہیں ہے وہاں پانی مُفت ملتا ہے۔ دیہاتوں میں ندی، نالوں اور کنوؤں کا پانی مفت ملتا ہے۔ لیکن یہی پانی جب شہر کے تہذیب یافتہ ماحول میں پہنچتا ہے تو بکنے لگتا ہے۔ شہروں میں بہ اہتمام نل کے ذریعہ پانی پہنچا کر اور پانی کے خرچ کو میٹر سے ناپ تول کر پانی کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔

دوسرے شہریوں کی طرح ہم حیدرآبادیوں کو بھی نل کے ذریعہ پانی سربراہ کیا جاتا ہے۔ جب بھی ہم حیدرآبادی نل کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ناک میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ بے ساختہ ناک کی طرف چلا جاتا ہے۔ انسانی ناک اور حیدرآبادی نل میں بہت زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ انسانی ناک اور حیدرآبادی نل سال کے ایک طویل عرصہ تک خشک رہتے ہیں۔ گرما کے موسم کے چھ ماہ میں نہیں سردی زکام ہوتا ہے اور نہ ہی ہمارے نل سے پانی آتا ہے۔ بارش کے موسم میں سردی زکام سے ناک بہنے لگتی ہے۔ تب نل میں بھی پانی آتا ہے۔ اکثر اوقات انسانی ناک حیدرآبادی نل کو مات دیتی ہے۔ ناک سردی زکام کی شدت سے ندی کی طرح بہہ نکلتی ہے۔ نل سے کبھی بھی پانی بہتا نہیں بلکہ ٹپکتا اور برستا رہتا ہے۔ سال بھر میں بارش کے یہی تین ماہ نل سے پانی آتا ہے۔ بارش کے بعد سرما کے تین ماہ ہر دو کے لئے بھاری ہوتے ہیں۔ سردی زکام کی شدت سے ناک، بند رہتی ہے ایسے ہی ہمارے نل بھی ہم سے روٹھ جاتے ہیں۔ انسانی ناک اور حیدرآبادی نل میں موجود مماثلت سے

ہمیں ایک طرح سے سہولت حاصل ہے۔ جب کبھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم اپنی ناک کی کیفیت سے نل کی حالت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ناک اور نل کی رلی ملی حالت سے ہم موسم کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے ہماری کی ہوئی موسمی پیش قیاسی اکثر صحیح ثابت ہوئی ہے۔

ہر نل کے ساتھ ایک میٹر لگا ہوا ہوتا ہے۔ پانی پہلے میٹر سے گزرتا ہے پھر نل سے ٹپکتا ہے۔ میٹر پانی کا غلط حساب کتاب کرتا ہے۔ پانی آئے نہ آئے میٹر بہرحال پانی کا خرچہ بتلاتا ہے۔ نل والوں کو پانی کی قیمت ٹیکس کے نام سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ پانی کی قیمت کے بجائے پانی کا ٹیکس وصول کرنے میں بھی باریکی ہے ٹیکس وصول کرنے والوں کا استدلال ہوتا ہے کہ وہ پانی کی قیمت وصول نہیں کر رہے ہیں بلکہ پاک و صاف پانی کو سلیقہ سے سربراہ کرنے کا ٹیکس لیتے ہیں۔ پاک و صاف پانی کسے کہتے ہیں اس کا اندازہ شاید ٹیکس وصول کرنے والوں کو نہیں ہے۔ حیدرآبادی نل سے آنے والا پانی، پانی نہیں ہوتا بلکہ مختلف رنگوں کا سیال ہوتا ہے جسے مجبوراً پانی کہنا پڑتا ہے۔ بارش کے موسم میں چاکلیٹی، لال اور پیلے رنگ کا پانی آتا ہے تو بعض وقت کائی ملے ہرے اور نیلے رنگ کا پانی سربراہ کیا جاتا ہے۔ اسی رنگین پانی میں خوردبینی مخلوق سے لیکر بحری مخلوق تک موجود رہتی ہے۔ ایک وقت رات کے کھانے پر ہمیں زوجہ محترمہ نے تازے جھینگوں کے سالن کا سرپرائز دیا۔ اصرار کے بعد راز کھلا کہ اس دن دوپہر نل کی راہ چند جھینگے ٹپک پڑے تھے۔

نل کے پائپ کئی دشوار کن مرحلوں سے گزر کر صارفین تک پہنچتے ہیں۔ ڈرینج اور موریوں سے گزرتے ہیں۔ کرنٹ کے تاروں سے دشمنی مول لیتے ہیں تو ٹیلیفون کے تاروں سے دوستی کرتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر مختلف قسم کی مٹی اور پتھروں کا بوجھ اٹھائے ٹوٹتے پھوٹتے اور زنگ کھاتے ہوئے ہم کو پانی کے ساتھ چند خطرناک اور دلچسپ چیزیں پہنچاتے ہیں۔ موریوں اور ڈرینج میں سے گندگی، غلاظت اور بیماریاں صارفین تک پہنچاتے ہیں۔ بعض وقت نل کے پائپ میں پانی کے ساتھ کرنٹ بھی بہنے لگتا ہے۔ ان دو صورتوں میں نل بہت خطرناک اور جان لیوا بن جاتا ہے۔ نل کو دیکھتے ہی کپکپی طاری ہونے لگتی ہے۔ نل کے پائپ ٹیلیفون کے تاروں سے ان کی گفتگو چرا کر صارفین کا دل بہلاتے ہیں۔ ہمارے گھر کے نل سے بعض وقت ریڈیو سیلون اور دوردرشن بھارتی کے پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ مضمون لکھتے وقت . . .

پانی رے پانی تیرا رنگ کیسا ۔ جس میں ملا دو لگے اس جیسا . . . . . گانا نل پر نشر ہو رہا تھا۔

جب نل کے پائپ پر ظلم بہت زیادہ ہوتا ہے تو وہ تمام بندشیں توڑ کر زمین کی سطح پر پانی انڈیلنے لگتا ہے۔ پائپ کے راستے پر سیلاب آ جاتا ہے۔ گھروں میں پانی کا کال پڑ جاتا ہے اور اس وقت نل سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی ہیں۔

گاؤں میں جیسے زراعت کا انحصار مانسون پر ہوتا ہے ایسے ہی ہمارے شہر میں پانی کی فراہمی مانسون پر منحصر ہوتی ہے طاقتور مانسون نل میں پانی بہا لاتے ہیں۔ ہر سال ہم طاقتور مانسون کے لئے دعا کرتے ہیں لیکن مانسون تو مانسون ہوتے ہیں جو کسی کو مانتے ہیں اور نہ ہی کسی کی سنتے ہیں اپنی مرضی میں جو آئے وہی کرتے ہیں۔ چند سال میں ایک مرتبہ طاقت کا مظاہرہ

کرتے ہیں بقیہ وقت رسماً چلے آتے ہیں۔ حیدرآبادی شہریوں کو پانی فراہم کرنے کی ذمہ داری محکمہ آبرسانی کے سپرد کی گئی ہے۔ یہ محکمہ، مانسونی بارش کو تالابوں میں جمع کر کے شہریوں تک پانی پہنچاتا ہے۔ اسی لئے ابر، برسات اور پانی کو ملاکر اس محکمہ کا نام "محکمہ آبرسانی" رکھا گیا ہے۔ ویسے یہ محکمہ زمینی ذرائع سے پانی حاصل کرنے کے لیے بور ویلس کھدواتا ہے۔ اکثر بور ویلس صرف "بور" (BORE بمعنی سوراخ) رہ جاتے ہیں ویلس ہوا ہو جاتی ہیں اور لوگ بور ہونے لگتے ہیں۔

نل سے پانی ہر وقت نہیں آتا۔ روزآنہ ایک وقت چند منٹوں کے لئے نل سے پانی آتا ہے۔ کہنے کو نل کھلنے اور بند ہونے وقت مقرر ہوتا ہے لیکن کبھی بھی ان اوقات کی پابندی نہیں کی جاتی۔ کبھی صبح کبھی شام اور کبھی رات کو نل سے پانی ٹپکنے لگتا ہے۔ اسی لئے ہم چوبیس گھنٹے نل کھولے، نل کے نیچے برتن رکھے مصلّے بچھائے پانی کی رحمت کے لئے دُعا کرتے رہتے ہیں۔ نل ایک شانِ بے نیازی سے کھلتا ہے۔ چند قطرے پانی ٹپکاتا اور سیٹی بجاتے ہوئے بند ہو جاتا ہے۔ اکثر اوقات نل، دادا جان کے حُقّہ کی طرح گُڑ گُڑا کر ہوا اور کبھی دھواں بھی خارج کرتا ہے۔

نل سے پانی حاصل کرنے کے لئے ہم بہت کوشش کرتے ہیں۔ نل کو زمین سے فٹ، دو فٹ اُونچا رکھنے کے بجائے زمین میں گڑھا بناکر رکھتے ہیں۔ بعض گھروں میں نل کے لئے تہہ خانے بنے ہوئے ہیں اکثر لوگ نل کو پمپ لگاکر پانی کھینچتے ہیں۔ ان تمام کوششوں کے باوجود روزانہ صرف اتنا پانی حاصل کیا جاتا ہے جس سے ایک ہی کام انجام دیا جا سکتا ہے! اس سلسلے میں ہمارے گھر کی مثال پیش کرتے ہیں۔ پانی کے ہر کام کے لئے ایک دن مقرر ہے بچوں کے نہانے کا دن، بڑوں کے نہانے کا دن، برتن دھونے کا دن، بچوں کے کپڑے دھونے کا دن، بڑوں کے نہانے کا دن، برتن دھونے کا دن، بچوں کے کپڑے دھونے کا دن، بڑوں کے کپڑے دھونے کا دن اور نل بند رہنے کے دو دن!

حیدرآبادی نل کی ایک دلچسپ اور خطرناک صورت پبلک نل ہوتی ہے۔ پبلک نل پر آس پاس کے گھروں کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے بجائے گھڑوں اور دوسرے برتنوں کی لائین لگتی ہے۔ پانی کے انتظار میں ملک سے لے کر محلہ کی سیاست تک بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ گروہ اور فرقہ وارانہ جھگڑے بھی ہوتے ہیں جس سے شہر کا امن تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر حیدرآبادیوں کے لئے نل کی اہمیت پانی تک ہی محدود نہیں ہے۔ پانی کے علاوہ نل سے چند دوسری باتیں بھی وابستہ ہوتی ہیں! اس صورتِ حال کی ترجمانی شاید اس شعر سے ہوتی ہو جسے ہم نے ایک حیدرآبادی رکشہ سے لوٹ کیا تھا۔

اللہ رے کیا ہے گرانی
سستا خون تو مہنگا ہے پانی

OO

عبدالحفیظ لقب عمران (امراوتی مہاراشٹرا)

ہزل

اگر دوبارہ تو پوچھے گا مجھ سے "تو کیا ہے"
تو میں بتادوں گا تجھ کو کہ "پاٹا شو کیا" ہے

حقیقتاً وہ زروسیم کی ہے لوبھی بہت
نظر میں اس کی محبت کی آبرو کیا ہے

علاج کر دے گا اس میں نہیں کلام مگر
بتا سکے گا نہیں وید یہ فلو کیا ہے

سمندروں میں سدا میں نے کی ہے غوطہ زنی
مری نظر میں یہ چھوٹی سی آبِ جو کیا ہے

پڑی ہوئی ہے جنھیں پیچھے دیکھنے کی خو
کبھی وہ دیکھ نہیں سکتے روبرو کیا ہے

گریباں پھاڑا ہے جب خود ہی تم نے اُلفت میں
تو پھر بتاؤ کہ یہ کوششِ رفو کیا ہے

تری زباں پہ نہیں ہے جو دل میں ہے تیرے
بتا کہ اس میں تری چال اے گرو کیا ہے

ہمیشہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا کر ظالم
اسی پہ غور کیا کر کہ روبرو کیا ہے

تو میرے ساتھ اگر بھاگنے کا وعدہ کرے
تو تیرے باپ سے میں پوچھ لوں کہ تو کیا ہے

کمائی کرنے لگے جو، بھلا وہ کیا شاعر
جو مال وزر میں نہ کھیلے وہ خوش گلو کیا ہے

لقبؔ فریب دیا کرتا ہے حسینوں کو
تمہارے شہر میں چرچا یہ چارسو کیا ہے

سراج نزبلی

غزل

نہ ہونا ہی تھا اچھا، تو مری سنتان ہونیسے
کہ شیطان تجھ سے بہتر ہے فقط شیطان ہونیسے

دُعا یہ ہے کہ بچ جائے فنا، لبنان ہونے سے
بچا میرے خُدا اِسکو، تو گورستان ہونے سے

بلا کرتی ہے یہ تو آجکل دھنوان ہونیسے
کہ اب عزت نہیں اِنسان کی انسان ہونیسے

کبھی میں نے، گزند کوئی کسی کو بھی نہ پہنچائی
ڈرا کرتی ہے پبلک نام امجد خان ہونے سے

جو بیتے گی سو بیتے گی تمہارے میزباں پہ ہی
بھلا تکلیف کیا ہوگی؟ تمہیں مہمان ہونیسے

صدارت کا یہ عہدہ تو فقط ہے نار ہی بھائی
کہ ہوگا فائدہ تم کو تو بس پردھان ہونے سے

ڈیئر اس بات میں بھی ایک پہلو دیکھ ابڈکشن ہے
کہ سب کھاتے ہیں بس کم کم ترا پکوان ہونیسے

نہ سمجھیں آپ مطلق آپ سے ناراض وہ ہوگا
سراج اللہ ہے خاموش منہ میں پان ہونیسے

مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

"ایسا بھی ہوتا ہے"

گاڑی چھوٹنے کا وقت دن کے گیارہ بجے تھا.

ریلوے ٹائم ٹیبل میں یہی وقت درج تھا. ٹائم ٹیبل بھی وہ جسے میں نے خود خریدا تھا، مانگ کر نہیں لایا تھا۔

گیارہ کچھ جلدی تو نہیں بجتے. سویرے بستر چھوڑنے، ناشتہ کرنے اور تھوڑا سا کام کر لینے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے. ان سب کے بعد یقینی طور پر ایک گھنٹہ بچے گا.

گھر سے اسٹیشن دو میل ہے. زیادہ دوری نہیں ہے. جلدی پہنچ جائیں گے۔!

صبح سو کر دیر سے اٹھا. قریب سات بجے. چار گھنٹے تھے گیارہ بجنے میں. چائے پی اور پھر سب کچھ کر لیا. پھر بھی دو گھنٹے اور تھے. ایک پڑوسی دوست کے یہاں گپ شپ کے لئے چل دیا. دراصل کچھ کرنے کو تھا ہی نہیں۔

پڑوسی دوست ایک دفتر میں کلرک ہیں. کچھ پرانے ہیں. یعنی دس بارہ سال نوکری کرتے ہو گئے ہیں انھیں. کبھی کبھی دفتر ٹھیک وقت پر پہنچ جایا کرتے ہیں. ویسے ان کا اصول ہے کہ گیارہ اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان دفتر کے لئے گھر سے نکلتے ہیں. کہا کرتے ہیں کہ جلدی پہنچ جاؤ تو وہی بات اور دیر سے پہنچو تب بھی وہی بات! صرف تنخواہ کے دن وہ دس بجے گھر سے نکلتے ہیں.!

اُس دن تنخواہ والی تاریخ نہیں تھی جب میں ان کے پاس جا بیٹھا.

انھیں شاید کسی سے شکایت ہو گئی تھی اسی لئے کہنے لگے "سائیکلیں کتنی تیز چلاتے ہیں لوگ! بھڑ جاتے ہیں. ٹکرا کر بھی پڑتے ہیں. لیکن مانتے ہی نہیں؟

مجھے بھی بولنا تھا اس لئے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا "موٹر اور ٹرک والے تو اور بھی زیادتی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جلد بازی کی وجہ سے حادثے بڑھ گئے ہیں"۔

"شراب پی کر چلاتے ہیں"۔ وہ بولے ۔

" ہاں جی، شاید اسی لئے شراب حرام ہے۔ لیکن سائیکل والوں کو کونسا نشہ چڑھ جاتا ہے کہ دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اکڑ کے ساتھ پیر پھینکتے ہیں۔ ان کے گرنے پر دیکھئے، کیا تصویر بنتی ہے "

" اور فلموں کے گیت گاتے ہوئے بھی چلتے ہیں "

ہم دونوں اپنی گفتگو سے خوش نظر آ رہے تھے۔ آخر ساڑھے دس بج گئے۔ میں اُٹھ کر اپنے گھر چلا آیا۔ بریف کیس ٹھیک کیا۔ بیڈنگ باندھا اور نوکر سے رکشہ منگوایا۔ سوار ہونے سے پہلے خیال آیا کہ سفر میں ساتھ دینے والی صرف کتاب ہوتی ہے۔ کونسی کتاب ساتھ لے جاؤں۔ انتخاب میں پانچ منٹ لگ گئے۔ گھڑی دیکھی تو گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے اور دو میل دور اسٹیشن جانا تھا۔ سوچا گاڑی وقت پر کب آتی ہے، پھر بھی رکشا والے کو تاکید کی کہ جلد چلے۔ لیکن راستے کا خدا بھلا کرے۔ اسکول، کالج، کچہری اور آفس کا وقت یہی ہوتا ہے۔ کہیں سائیکلوں کی بھیڑ، کہیں موٹریں رکی ہوئیں۔ کہیں تانگے والے نے راستہ روک رکھا ہے اور کہیں ٹریفک کی لال بتی۔ ایسے میں میری چیخ پکار کون سنتا۔ دو جگہ جب راستہ صاف ملا تو رکشے کا چین گر پڑا۔ آخر کار اسٹیشن پہنچا۔ مگر لال وردی میں قلی نے ٹھینگے کی گھنٹی بجا دی کہ گاڑی آدھا گھنٹہ لیٹ آئی اور چلی گئی۔

مجھے لوٹ آنا پڑا۔ طے کیا کہ دوسری گاڑی سے چلا جاؤں گا جو تین بجے چھوٹتی ہے۔ ایک گھنٹہ، نہیں سوا گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔ اس بار گاڑی نہیں چھوٹے گی۔

لیکن دوسری بار اسٹیشن پہنچا تو پتہ چلا کہ گاڑی ایک سو پچاس منٹ لیٹ ہے۔ اسٹیشن پر پڑا پڑا کیا کرتا۔ ٹکٹ خرید کر گھر لوٹ آیا۔ کچھ کام ہی کر لوں گا یہی سوچتا ہوا لوٹا۔

آخر کام کرتے کرتے کافی وقت نکل گیا۔ پھر بھی اس لیٹ گاڑی کے اسٹیشن پر بتلائے گئے وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ گاڑی آئی بھی اور چلی بھی گئی۔

میں غصے میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گھس گیا "آخر گاڑی وقت سے پہلے کیوں گئی؟"

"وقت سے پہلے؟ اجی جناب، ساری گاڑیاں لیٹ چل رہی ہیں۔ آپ کس گاڑی کی بات کر رہے ہیں؟"

میں نے تفصیل بتائی تو جواب ملا "چونکہ گاڑی کا انجن اچھا تھا۔ اور فلاں اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں جگہ جگہ زنجیر نہیں کھینچی گئی، اس لئے ڈرائیور نے رفتار بڑھا کر وقت کی کمی کو کچھ پورا کر لیا تھا"

" کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟"

" اکثر ایسا ہوتا ہے، اس میں حیرت کی بات نہیں ہے "

میں ایک بار پھر لوٹ آیا۔ جھنجھلایا ہوا۔ تھکان سے چور۔ پسینے میں شرابور۔

تیسری گاڑی رات کے دس بجے جاتی ہے۔ رات بھر کا سفر طے کرنا ہے۔ میں نے کچھ دیر سو رہنے کا پروگرام بنایا۔ کپڑے اتار کر نوکر کے حوالے کیا کہ دوبارہ اسٹیشن جانے آنے میں اس کا کچومر نکل گیا ہے، دوسرے کپڑے نکال دو تاکہ وہی پہن کر جاؤں۔

ایک گھنٹہ سوتا رہا۔ اطمینان سے کھانا کھایا۔ وقت گزارنے کے لئے قریب رکھے رسالے سے دو ایک افسانے پڑھے، نظمیں غزلیں بھی پڑھیں، اور ایک بار پھر اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ راستے میں خیال آیا کہ کتاب رکھنا بھول گیا ہوں۔ رات بھر کا سفر ہے، آخر وقت کیسے کٹے گا۔ یہی سب سوچ کر رکشا لوٹایا اور کتاب لے کر چل پڑا۔ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی آنے میں آدھا گھنٹہ کی دیر تھی۔ ٹکٹ کا خیال آیا تو جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ غالباً نوکر بے وقوف ٹکٹ رکھنا بھول گیا۔ کپڑا چینج کرتے وقت اس نے شاید جیبوں پر دھیان نہیں دیا۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی کہ آتے وقت چیک نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے کو مدِ نظر رکھ کر میں پھر ایک بار گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی نوکر پر برس پڑا۔ لیکن اس نے بڑی معصومیت سے بتایا کہ ٹکٹ بریف کیس میں رکھ دیا ہے۔

اور اِس بار بھی جب میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی جا چکی تھی —!

گولڈن جوبلی سال ۱۹۳۳ء سے ۱۹۸۳ء

اب آپ کی پسندیدہ

• لاسا اسپیشل چائے اور
• لمسا چاکلیٹ چائے نے
• اپنے ۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ
مکمل کر لئے ہیں

مجنوںؔ حیدرآبادی

اشتہاری بیوی

○

عاشقی سے تنگ آکر شادی جب کرنے چلا کیسی ہو بیوی مری کیسے ہو اس کا فیصلہ
بات یہ آکر پڑی تھی کام یہ مشکل بھی تھا چونکہ سارے شہر میں مجنوںؔ اکیلا میں ہی تھا
دوستوں نے دی صلاح اخبار میں دو اشتہار چاہیئے شادی کی خاطر ایک لڑکی ملنسار
درمیانہ قد ہو اُس کا لانبے کالے بال ہوں آنکھیں ہوں راکھی سی اُسکی ہیماؔ جیسے گال ہوں
ہو صراحی دار گردن موتی جیسے دانت ہوں گندمی ہو رنگ اُس کا ہونٹ اُسکے لال ہوں
کون سی بھی بولی بولے بولے وہ اُردو ضرور شاعری کرتا ہوں میں وہ شاعری سمجھے ضرور
جو شرائط پوری کرتے ہوں وہ بس اتنا کریں باکس نمبر دس پر اپنا ایک فوٹو بھیجدیں
دوستوں کی بات پر جب دیدیا یہ اشتہار دوسرے ہی دن ہمارے گھر خط آئے بیشمار
کھول کر دیکھا تو اُن میں کوئی بھی جچتی نہ تھی ہیما جیسے گال جس کے آنکھوں میں مستی نہ تھی
آنکھیں تھیں راکھی سی جسکی نادرہ سے گال تھے تھی صراحی دار گردن گھنگریالے بال تھے
ایک لڑکی ایسی تھی جو تھی میرے معیار کی نام تھا اُسکا غزل وہ لڑکی تھی سردار کی
آنکھیں تھیں راکھی سی اُسکی ہیما جیسے گال تھے تھی صراحی دار گردن لانبے کالے بال تھے
درمیانہ قد بھی تھا اور جانتی اُردو بھی تھی شاعری کیسے نہ سمجھے شاعرہ وہ خود بھی تھی
شادی ہوگی تو اسی سے آگئی دل میں یہ بات ہفتہ بھر ہی میں گئے ہم لے کے اُسکے گھر برات
شادی جس دن سے ہوئی ہے چل رہی ہے کر کری میں غزل ریڈیو پہ سُننا چاہوں وہ کا ملنڑی
مرثیہ اپنا تو پہلے ہی سنا دیتی ہے وہ میں غزل اپنی سنانا چاہوں تو روتی ہے وہ
خوش دلی سے کام اپنے گھر کا کچھ کرتی نہیں ساس اور نندوں سے بھی اُسکی کبھی بنتی نہیں
اشتہاری بیوی میں چاہا تھا میری تھی خطا آج میں اپنے کئے کی پا رہا ہوں یہ سزا

اب اُٹھا کر ہاتھ روز و شب یہ کرتا ہوں دُعا
عقل دے اُسکو یا مجھکو صبر دے تو اے خدا

له، گه، که فلمی اداکارائیں۔

عطاالرحمٰن طارقؔ

غزل

مان لیا اوتار ہے یار
تُو تو اپنا یار ہے یار

ہم کو کب انکار ہے یار
بے شک تجھ سے پیار ہے یار

بنگلہ، ٹی وی، موٹر کار
دولہا بھی تیار ہے یار

کام دلا دو گیرج میں
بے چارہ، بے کار ہے یار

سرکاری آفیسر ہے
تب تو بیڑہ پار ہے یار!

بلیک میں ہر شئے بکتی ہے
یہ کالا بازار ہے یار

وہ بھی تیرا ہم پلّہ
تو بھی اک عیار ہے یار

طارقؔ اُس سے دُور رہو
دو دھاری تلوار ہے یار

ڈاکٹر محمد عزیز الرحمٰن
٭
بھاگلپور (بہار)

حجامت

بزمِ دنیا کی آرائش و زیبائش کے لئے مبداءِ فطرت نے جتنی نعمتیں ودیعت کی ہیں ان میں حجامت ہی مصور فطرت کا سب سے بہترین عطیہ ہے۔ اس متاعِ گراں بہا سے حسنِ انسانی میں دل ربائی و دل فریبی آتی ہے اور بنک بیلنس میں اضافے ہوتے ہیں، عمارتوں کی منزلیں دو بالا ہوتی ہیں اور ریاستوں کی حدیں وسیع ہوتی ہیں، وزارتوں کی کرسیاں ملتی ہیں اور لیاقتوں کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اگر قدرت کی تمام نعمتیں میسر ہوتیں اور ایک حجامت نہ ہوتی تو انسان بربریت اور وحشت کی تاریکیوں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا اور ڈارون کے "نظریہ ارتقاء" کی پہلی ہی منزل میں اٹکھیلیاں کر رہا ہوتا۔ جیسا کہ آج بھی ڈارون کے مورثِ اعلیٰ "تاریک براعظم" میں صحرانوردی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بالاستثنائے جنس زحمتِ حجامت سے سراپا مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی تیوری پر بل نہیں آتا اور نہ انھیں اس کا غم ہے۔ بلکہ وہ تو دوسروں کی حجامت میں بڑی فیاضی دکھاتے ہیں۔ لیکن اپنی حجامت کے نام پر مرنے اور مارنے پر اتر آتے ہیں۔

دنیا کے تاریخ دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ فنِ حجامت دنیا کی قدیم ترین ایجاد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ انسان نے جیسے ہی صحرانوردی کو خیرباد کہہ کر ایوانِ تمدن میں قدم رکھا انھیں "تمغۂ حجامت" سے سرفراز کرکے مشرف بہ تہذیب کیا گیا۔ بعض مورخین کی رائے ہے کہ فنونِ لطیفہ کی دیگر شاخوں کی طرح حجامت کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی حضرتِ انسان کی اور اس مقدس فریضہ کا آغاز بھی اپنے ہی بھائیوں کی حجامت سے ہوا۔ دنیا میں پہلی حجامت مسٹر قابیل نے ہابیل کی بنائی۔ اسی دن سے دنیا قابیل کی قابلیت اور حجامت کی قائل ہوگئی اور حجامت و قابلیت دونوں لازم و ملزوم شئے قرار دی گئیں۔

جس طرح میدانِ سیاست میں اعلیٰ فنکاری اور اداکاری لازمی ہے اسی طرح کاروبارِ حجامت میں چابک دستی، مہارت اور فنکاری درکار ہے۔ اس لئے کہ "نتیا" اور "اچھینیا" میں "اکھی" اور "کبھی" کا فرق ہے ورنہ ذرا سی غفلت میں اپنی ہی حجامت

بن جاتی ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک "اجینیا" نے نیتا کی حجامت اس طرح بنانا چاہی کہ بادشاہ کے آباء و اجداد اجنبی جنت مکانی کی خبرگیری کے لئے انھیں جنت الفردوس کے سفر پر روانہ کردیا۔ تمدن اور مہذب سوسائٹی میں حجامت سے محروم رہ جانا بڑی بدنصیبی ہے۔ اسی بدنما داغ کو چھپانے کے لئے شائستہ دنیا کا ہر انسان اپنے بالوں کو سونٹنے اور زلفوں کو بل دینے میں شب و روز مصروف ہے پھر بھی تقاضہ ہنوز جاری ہے کہ "گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر" اور یہ کہ گیسوئے انسان ابھی منت پذیر شانہ ہے۔" شعرائے اردو کی شانہ پذیری اور زلف اسیری نے انھیں دو گروہوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ایک نے تو قیس و فرہاد کی تقلید میں مجنوں کی راہ اختیار کی اور گورکھ دھندے کی نذر ہوگئے اور دوسرے نے پیروی اپاز میں عظیم آباد کی گلیوں میں پناہ لی۔ ان شعرائے "بادہ خوار" اور اسیر زلفِ یار" نے گیسو درازی" اور پریشانی زلف" کی ایسی مدح خوانی کی کہ ان کے محبوب کا دماغ چوتھے آسمان پر پہنچ گیا ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

اور بعض شاعر تو ایسے ہوئے کہ خوشبوئے زلفِ یار کی آرزو میں زندگی تباہ کرلی کہ دھر کھوئے گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے"۔ درازی زلف کی اس حوصلہ افزائی کا اثر یہ ہوا کہ معشوقانِ مہوش اور دلربایانِ عصر کے دلوں میں بھی خودنمائی کی خواہشوں نے چٹکی لی اور پری چہرہ زہرہ جبینوں کی ہمرکابی شروع ہوگئی۔ اس چھیڑ چال کا نتیجہ اتنا شرمناک ہوا کہ ہوس پرستانِ عشق اور اسیرانِ زلفِ یار کو یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ کل شام بس اڈہ پر اُنھوں نے جس ماہ پارہ کو آنکھ ماری تھی وہ لڑکا تھا یا لڑکی" جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے"۔

قدرت کی ستم ظریفی بھی یہ کیا کم ہے کہ دنیا کی نصف آبادی نعمتِ حجامت، سے محروم قرار دی گئی۔ بھلا ہو لدادگانِ مغرب اور فدایانِ حجامت کا جنھوں نے "نصف بہتر" کو بھی ذوقِ حجامت پر آمادہ کردیا۔ اور اب تو شہر کے سیلونوں اور فیشن گھروں میں "مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے"۔ اور بلاتفریق عمر بے بی بوبی اور بیوی ہر ایک میں حجامت کی پذیرائی ہو رہی ہے خود مسٹر نقلی کو بھی شکایت ہے کہ "پیری میں بھی بیگم کی یہ عادت نہیں جاتی۔"

نوبت باایں جا رسید کہ ؎

ہمہ آہوانِ شہراں سرِ خود نہادہ برکف
بامید آنکہ شاید کہ حجام خواہی آمد

اور ان کی ان خواہشوں کا احترام اس طرح کیا جارہا ہے کہ ہر گلی کوچہ میں صبح شام ان کی ایسی حجامت بنائی جارہی ہے کہ "روتی ہیں زار زار کوئی پوچھتا نہیں"۔

جنسِ گراں مایہ کا جذبۂ انتقام جب انگڑائیاں لیتا ہے تو یہ جہانگیر جیسے جابر شہنشاہ کی بھی حجامت بنا ڈالتی ہے

دنیا کے بیشتر معرکے ان کی حجامت کے طفیل میں وجود میں آئے۔ صنفِ لطیف کی نظرِ عنایت کے لئے عامی یا خاصی کی کوئی قید نہیں۔ راجہ بھوج ہو کہ گنگو اتیلی صنفِ نازک کی حجامت سے کسی کو مفر نہیں ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

"نصف بہتر" کے حجامتی حملوں کا "حصہ بقدر جثہ" ہوتا ہے۔ موٹی مرغیوں کے ساتھ نہایت ہی فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے تخلیقی عمل تیز کر دیا جاتا ہے اور کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے "ناتوانوں کے گھروں میں تو شدید روز میں کتنی ہی دفعہ ازدواجی تعلقات کے نزع کا عالم ہوتا ہے اور ایسے عالم میں محلے والوں کا خوش اخلاق اگر جوش میں آجاتی ہے تو اوروں کو بھی فیضیاب ہونا نصیب ہو جاتا ہے۔

"نزلہ ریزد بر عضوِ ضعیف" کے اصول کے تحت صنفِ لطیف کی حجامت کا پہلا حملہ اولادِ آدم کی جیب پر ہوتا ہے اور مہینے کی پہلی تاریخ ہی سے "جیب کی صفائی" کی مشق شروع ہو جاتی ہے۔ اب اگر یہ غریب بنتِ حوا کے تابڑ توڑ حجامتی حملوں کی تاب نہ لاکر دم توڑ دیتی ہے تو "یہ سے بہتر" کی راہ اختیار کی جاتی ہے اور "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کی گردان دہرائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں عاشقِ زار کی قوتِ تحمل ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور وہ غلامی کا جوا اتارتے ہوئے پکار اٹھتا ہے ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ریاست، سیاست، وزارت، حجامت اور حماقت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان سب کا یکجا ہونا تقدیر کے ستاروں کا ایک برج میں اکٹھے ہونے کے مترادف ہے۔ اس لئے ان سبھوں میں تال میل بنائے رکھنا سیاستِ حاضرہ کا پہلا اصول ہے۔ ریاست کے لئے قطعہ اراضی، آبادی، سرکار اور خود مختاری، سیاست کے لئے ہوا کا رُخ، موقع شناسی پینترے اور اداکاری، وزارت کے لئے فراستِ ذہنی اور دیانتِ بدنی کی ضرورت ہے حجامت اور حماقت کے لئے بھی یہی لیاقتیں درکار ہیں۔ خاص کر وزارت اور حجامت کا یکجا ہونا تو نہایت ہی فالِ نیک سمجھا جاتا ہے۔ "خوب چھنتی ہے جو مل جاتے ہیں دیوانے دو"۔ راوی لکھتا ہے کہ کسی ملک میں کرسئی وزارت کے ایک مقابلے میں بڑے بڑے رستمِ زماں چاروں شانے چت ہو کر ایک ایک کر کے کام آگئے اور میدان ایک ماہرِ حجامت کے ہاتھ آگیا۔ اس وزیرِ دلپذیر نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ حکمائے وقت کی عقل بھی حیران رہ گئی "سب جام بکف بیٹھے ہی رہے وہ پی بھی گئے چھلکا بھی گئے"۔ نہ معلوم اس نے کتنے کی حجامت بنائی اور کتنے کا جھٹکا کرایا۔ آج بھی ایک ہمالیائی خاتون ان کے نام کی دہائی دیتی ہیں۔ دروغ برگردنِ راوی، کرشنا ، مایتی یا گنگا (نوٹ: یہ ان خواتین کے نام ہیں جنھوں نے ان ناموں سے ایف۔ آئی۔ آر۔ رپورٹ درج

کرائی ہے)

کارزار حجامت میں ہندوستان میں مستعمل آلاتِ حرب نہایت ہی کند و قدیم قرار دیئے جا چکے ہیں لیکن بعض حربے اتنے سخت جان واقع ہوئے کہ ان کی افادیت اور کارگری کا مغرب زدہ حجام آج بھی معترف ہے۔ قینچی فنِ حجامت کا ایک بہترین حربہ ہے۔ یہ عورتوں کی زبان کی طرح ہی بہت تیز چلتی ہے اور حریف کے کمزور پہلو کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ اصلاح خانوں میں حجاموں کی قینچیاں کم اور زبان زیادہ کام کرتی ہیں۔ اس لئے کہ قینچیاں تو کھوپڑی کے بالائی حصّے پر اپنے فن کا مظاہرہ کر کے تھک جاتی ہیں اور زبان دل کی گہرائیوں تک زخم کاری لگاتی ہے۔ ؎

جسے عشق کا تیر کاری لگے ؎ اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے۔

اُسترا فنِ حجامت کا نہایت ہی کارآمد آلۂ حجامت ہے جس کی بدولت حجام کو اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ ہاتھ آتا ہے دوسری طرف گاہک کی اچھی خاصی حجامت ہوجاتی ہے۔ عرفِ عام میں اسے اُلٹے اُسترے سے مونڈنا بھی کہا جاتا ہے۔

آئینہ نگارخانۂ حجامت کی تزئین و تجمیل میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ لوگ اس کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے اور اسے دیکھتے ہی برخود غلط ہو کر "نرگس" کی وادئ رنگیں کی سیر پر روانہ ہو جاتے ہیں اس لئے ازروئے قانونِ تجارت اور کاروبارِ حجامت آئینہ کا سیلون اور پان کی دوکانوں پر نصب کیا جانا لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ معمول جب تک عشقِ خودی میں مُبتلا ہو کر نکٹائی کی نوک پلک درست کریں عامل اپنے فرائض منصبی سے بہ آسانی سبک دوش ہو لے اور صاحب بہادر کی جب چوتھے فلک سے واپسی ہو تو معلوم یہ ہو اکہ سر اور جیب دونوں کی حجامت بن چکی ہے: "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت"۔

ہماری زندگی کے تمام شعبے محتاجِ حجامت ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو اس کی زد سے بچ نہیں سکتا اس کی حدیں اتنی ہی وسیع ہیں جتنی کائنات کی۔ غرض کہ جہاں تک سینگ سمائے حجامت نے اپنے قدم جمائے۔ جو ملک اور قوم جتنی شائستہ اور مہذب ہوتی ہے اتنا ہی اسی قدر حجامت کا رواج ہوتا ہے۔ کلچرڈ اور الٹرا موڈرن سوسائٹی میں تو دن میں کئی بار حجامتیں بنتی ہیں اُ کے یہاں ایک دوسرے کی حجامت بنانا کوئی معیوب نہیں سمجھا جاتا بعض اوقات اپنی ہی حجامتیں خود بنائی جاتی ہیں۔ ہر بڑا اپنے چھوٹوں کی حجامت بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے اور سینہ پھُلا کر اپنے دوستوں کی محفل میں ان حجامتوں کا تذکرہ کرتا ہے جس غریب کی حجامت بنائی جاتی ہے اس کی وفاداری بشرط استواری قائم رہتی ہے وہ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ چکانے کی تاک میں لگا رہتا ہے اور ایک وفادار دوست کی طرح موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جیسے ہی مواقع ہاتھ آتے ہیں اپنے محسن کی بھرپور حجامت بنا ڈالتے ہیں تاکہ دُنیا انھیں احسان فراموش اور نمک حرام نہ کہے۔ اس لئے کہ احسان فراموشوں اور نمک حراموں کو ہماری سوسائٹی اور سماج میں بڑا ہی ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ بھارتی سنسکرتی میں سماج کا بھی ہم پر حق ہے خاص کر سماج کے ٹھیکیدار پنڈت اور مُلّا کے حقوق سے تو ہم کبھی عہدبراء ہو ہی نہیں سکتے۔ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ؎ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ انسانیت کے یہ دونوں محسن بحسب توفیق انسان کی حجامت سے آج بھی غافل نہیں ہیں ؎

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے ان سے ؛ اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے ان سے

جس طرح اشیائے تجارت پر بعض طبقہ خاص کی منوپالی (MONOPOLY) ہوتی ہے اسی طرح معاشی حجامت کا جملہ حقوق سیٹھ ساہوکار اور مل مالکوں کو حاصل ہیں۔ معاشی میدانِ حجامت میں یہ کسی حال میں بھی شرکتِ غیرے اور مداخلت بے جا کے روادار نہیں اور کسی نے جرأتِ حماقت کی تو اس کی سات پشت کی حجامت بنادی جاتی تاکہ رہے بانس نہ باجے بانسری۔

لیاقت اور حجامت بھی ایک دوسرے پہ سبقت و برتری کے لئے برسرِ پیکار ہیں۔ اساتذہ طلبہ کی حجامت اگر درجے کے اندر بنانے کے درپے ہیں تو شاگرد بھی برسرِ بازار حقِ شاگردی ادا کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ ناقدینِ ادب اگر شعراء کی حجامت کے لئے ادھار کھائے ہوئے ہیں تو محققین کی قوم بھی گڑے مُردوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے۔ نئی اور بے لگام نسل کے یہاں تو حفظِ مراتب کا نام و نشان نہیں۔ یہ بزرگ و برتر اور عزیز و کہتر سب ایک ہی اُسترے سے مونڈ دیتی ہے ایک حکیم وقت نے حکومت سے درخواست کی تھی ؎

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اور اب تو حکومتِ وقت بھی ان کی حجامت باکرامت سے لرزہ بر اندام ہے ؎

حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پہ گالی ہے
کالج نے یہ کیسے سانچے میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

حکمائے وقت کی رائے ہے کہ نئی نسل اربابِ سیاست اور آسمانِ فلم کے ستاروں کی امامت پر ایمان لا چکی ہے۔

ایک عالمی سروے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عالمِ موجودات میں بلا امتیاز ملک و ملت، رنگ و نسل اور زمان و مکان صرف دو طرح کی مخلوق کا وجود ہے۔ فاتح و مفتوح، غالب و مغلوب، قاتل و مقتول، ظالم و مظلوم، حاسد و محسود، قاسم و مقسوم، عالم و مجہول، عامل و معمول اور حاجم و محجوم۔ حاجم وہی ہے جو محجوم کی حجامت کے فرائض انجام دیتا ہے ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا انھیں تو بس اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ اس جگہ ایک نکتہ ذہن نشین رہے کہ کہیں کہیں "حاجم" کی بجائے "ہاضم" بھی دیکھی گئی ہے جس کے معنی ہضم کر جانے کے ہوتے ہیں جیسا کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو اور بڑے ممالک چھوٹے ممالک کو ہضم کر جاتے ہیں "تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"۔

حجامت کے لئے یہی فخر کیا کم ہے کہ اس کے سامنے راجہ اندر رنگ اور ہر کس و ناکس سرنگوں ہوکر کہتے ہیں "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"۔ ■■

"خوابِ غفلت"

مرزا کھونچ (بیتیا)

کل جمعہ کے روز دیکھی بھیڑ اِک مسجد کے پاس
نوجواں کچھ جوش میں تھے اور بوڑھے تھے اُداس

مشتعل اِک نوجواں تقریر کرتا تھا وہاں
اُس کے ہر جملے کو راوی نقل کرتا ہے یہاں

"مہربانو! قدر دانو! نوجوانو! دوستو"!
اِک ذرا خاموش ہوکر کام کی باتیں سنو"

"کس لئے ہے بھیڑ اکٹھی اس جگہ پہچان لو"
"اپنے حق اپنے مطالب کی صدا پہچان لو"

"احتجاج اپنا ہے لوگو! روبروئے ذوالجلال"
"تم بھی سُن لو جو خُدا کے سامنے ہے عرضِ حال"

"ہے ہماری مانگ یارب ہو وضو جاڑے میں کم"
"دل کو دیں تسکیں نمازِ صبح کی مہلت سے ہم"

"موسم گرما میں ہم کو لو سے مرنے کا یقین"
"ظہر پڑھنے کیسے جائیں پاس میں چھاتا نہیں"

"موسم برسات میں کپڑے پہ چھینٹے جا بجا"
"اپنا حال غم خدا تجھ سے بھلا ہے کیا چھپا"

"ایسی رُت میں گیلے کپڑے خشک ہو پاتے نہیں"
"اس لئے مسجد میں یارب ہم کبھی جاتے نہیں"

"ڈالڈا ای دور کی ہر چیز کھانے کے سبب"
"جب رکھیں روزہ تو ہوتی ہے نقاہت سی عجب"

"اور نمازیں پڑھنے میں چکر یہ چکر آتا ہے"
"بخش دے ہمکو خدا اس میں تیرا کیا جاتا ہے"

"پوری کردے ساری مانگیں پوری کردے اے کریم!
"ہوگا یہ انسانیت پہ تیرا احسانِ عظیم"

"رائیگاں اب بھی اگر ہر عرضی و فریاد ہے"
"پھر لے ربِ دو جہاں ہڑتال زندہ باد ہے"

"ہم تو مسجد میں نہ جائینگے خُدائے بے نیاز
"راستہ روکیں گے اُن کا جو ہیں پابندِ نماز

اور اس پہ بھی خُدایا کچھ نہ گر نوٹس لیا"
"تیری دوزخ ہوگی پُر ہم جیسے بندوں سے خُدا"

ذکر دوزخ پر ہوا لوگوں میں اِک ہنگامہ گر
شور اُٹھا اُتر دو ڈائس سے اگر کچھ بھی ہے شر

اینٹ پتھر جو تھے سڑکوں پر وہ چلنے بھی لگے
الٹیمیٹم کے بنا جوتے اُچھلنے بھی لگے

ایک جوتا جانبِ راوی بھی آیا زور سے
جو کہ پہلے ہی تھا گھبرایا ہوا اُس شور سے

نیند ٹوٹی بستر سے راوی نیچے آ گرا
خود ہی پائے چارپائی اپنی جانب کھینچتا

جاڑے کے موسم میں تھا بالکل پسینے میں
جسطرح گرمی کی تپتی دھوپ میں آیا ہو گھ

خوابِ غفلت پر وہ اپنے اِس قدر رنجور تھا
کہ سراپا خوفِ روزِ آخرت سے چور تھا

ہو کے فوراً با وضو وہ جانبِ مسجد
گڑگڑا کر خالقِ کونین سے مانگی دُ

آج کل ہڑتال و دھرنا ایک رسمِ عام ہے
پھر بھی تجھ سے احتجاج اپنا خیالِ خام ہے

تیرے سب احکام ہیں محبوب تجھکو جا
بخش دے مجھکو خدایا رحمتوں کی شان

انیس احمد خان (نئی دہلی)

"بیان ایک نیتا کا"

اس رات ایک عظیم الشان فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے ہوئے بھکاری کو اخلاقیات کا درس
یتے ہوئے اور اس کے بھوکے بچے کو جوان کے ذریعے جھنجھوڑی گئی، مرغ مسلّم کی ایک ہڈی کو ترستی ہوئی آنکھوں سے تک رہا
تھا، بھارت کے بہادر سپوتوں کے بارے میں زبانی بتاتے ہوئے نیتا جی مل گئے۔ وہ اس وقت پورے موڈ میں تھے کیوں کہ
فائیو اسٹار ہوٹل اس بات کی ضمانت تھا کہ انھوں نے بدہضمی کی حد تک اچھا کھانا ٹھونسا ہے۔ پھر کھلی ہوئی بات ہے کہ نیتا
پیٹ جب زیادہ ہی بھر جاتا ہے تو اسے دیش کی غریبی اور عوام کا بھوکا ننگا پن ستانے لگتا ہے جس کے لئے فوراً ہی یا تو
ئی پریس کانفرنس بلائی جاتی ہے یا جلسہ عام منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں تشریف لاکر وہ اپنی بدہضمی دور کرتے ہیں۔ لہٰذا
ب میں نے یہ دیکھا کہ اعلیٰ حضرت کا پیٹ بھی بھرا ہے اور جلسۂ عام کی شکل میں اکٹھے ہوئے ایک عدد بھوکے ننگے بھکاری
ر اس کے بھوکے ننگے بچے کو تقریر بھی پلا رہے ہیں تو میں نے فوراً ہی اچھا شگون سمجھ کر ان سے اپنے اخبار کے لئے ایک عدد
نٹرویو کی درخواست کر ڈالی۔ میری درخواست سنتے ہی ان کی باچھیں جو کہ ان کے موٹے پھولے پھل پھل کرتے گلوں کے بیچ
ائب تھیں، کھل اٹھیں۔ انھوں نے فوراً ہی جلسۂ عام ختم کیا، بھیڑ کی شکل میں اکٹھے بھکاری پر حقارت کی ایک نظر ڈالی اور مجھے
ے کر اسی عالیشان فائیو اسٹار ہوٹل کے ایک کونے میں گھس گئے جسے کانفرنس روم کہتے ہیں۔ جہاں بیٹھ کر ہمارے دیش کے
سیاں دیش کی معاشی، سیاسی، اقتصادی اور جنگی، کئی ضروری اور غیر ضروری مسئلوں پر بیان فرماتے ہیں۔ مجھے سامنے ایک
رسی پر بٹھا کر جھٹ سے ایک بنچ پر چڑھ گئے جہاں ایک سنگھاسن نما کرسی میں دھنس گئے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی کھادی
ٹوپی سے سجے سجائے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے مجھ سے اپنا انٹرویو شروع کرنے کا اشارہ کیا۔

اس وقت میرا دل اور دماغ دیش بھر میں ہوتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادوں میں بہتے ہوئے معصوموں کے خون سے
ہو رہا تھا۔ میں ہر جگہ اپنے تن بدن، چہرے اور کپڑوں پر خون کے تازہ چھینٹے ہی دیکھتا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں

صرف فرقہ وارانہ فساد ہی گھوم رہے تھے اور کچھ نہیں۔ لہٰذا میں نے نیتا جی سے اپنا پہلا اور آخری سوال کیا کہ ہمیں آزادی ملے پورے ۳۳ سال ہو گئے ہیں۔ ہم وہ ہیں جنھوں نے اپنی مادرِ وطن کو، اس سرزمین کو تاج محل کی سی خوب صورتی، لال قلعے کی جیسی پختگی جامع مسجد جیسی پاکیزگی اور قطب مینار جیسی بلندی دی۔ آخر کب تک اس طرح کاٹے جاتے رہیں گے؟

میرا یہ سوال سنتے ہی وہ کچھ بے چین سے ہوئے پر جلدی ہی خود پر قابو پاکر اور چہرے پر تمام سیاسی سنجیدگی اکٹھی کر کے کہا:

"نوجوان تیرا من بڑا چنچل ہے۔ اپنے چنچل من کو قابو میں کر اور میرا یہ بیان سن جو کہ بالکل تازہ ہے۔ اسے فوراً سے پیشتر لکھ اور کل سے پہلے شائع کر۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے ہوا میں ہٹلر اسٹائل ہاتھ اٹھا کر اپنا بیان شروع کیا:

"اے مراد آباد سے لے کر ہندوستان میں کبھی جگہ ہو رہے فرقہ وارانہ فساد میں مرنے والے مظلومو! تمہارا یہ پیارا راج دلارا نیتا تمہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ میرے دیش واسیو! یہ جو دنگے ہوتے ہیں یہ ہماری سرکار نہیں کراتی بلکہ غیر ملکی طاقتیں جو برسوں سے ہمارے دیش میں جڑ پکڑ کر برگد ہو گئی ہیں، کراتی ہیں۔ یہ غیر ملکی طاقتیں کون ہیں۔؟ اس کا پتہ لگانے کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جلد ہی ہم اپنے پورے منتری منڈل کے ساتھ غیر ملکوں کا دورہ کریں گے اور اس کے لئے چاہے ہمیں اپنی پوری زندگی غیر ملکوں میں غیر ملکی طاقتوں کا پتہ لگانے میں کیوں نہ گزارنا پڑے .... گزار دیں گے آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم لوگ ان تمام فرقہ وارانہ فساد کی طرف سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔ ایسا نہیں ہے آپ خود ہی دیکھئے ہم نے ان دنگوں کو روکنے کے لئے کتنے سارے کمیشن بٹھا رکھے ہیں۔ جو کہ جلدی ہی اگلے پانچسالہ پروگرام کے لاگو ہونے تک فسادات کی صحیح وجوہات کا پتہ لگا کر ہمیں بھیج دیں گے اور اس دوران جو بھی فرقہ وارانہ فساد ہوگا ان تمام فسادات کے لئے ہم نے جگہ جگہ "مستقل چندہ اگاؤ کمیٹیاں" قائم کر دی ہیں جو کہ فساد زدہ علاقوں میں دنگا ہونے کے بعد مدد پہنچائیں گی۔ اس کے علاوہ ہم نے کئی کروڑ فسادات کے خلاف پوسٹر چھپوائے ہیں جو فساد زدہ اور پُرامن علاقوں میں چل رہے ہنگاموں سے روشناس کرائیں گے اور جوں ہی فساد زدہ علاقے پُرامن ہو جائیں گے، وہاں پہنچ کر ایک عظیم الشان عام سبھا منعقد کر کے یک جہتی اور محبت کے گیت گائیں گے .... یہی نہیں، اپنے ہم وطنوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہمارا اور ہماری سرکار کا فرض اول ہے جس کیلئے ہم نے اپنی تمام پولیس ٹکڑیوں کو کچھ ضروری ہدایتیں دے رکھی ہیں، لہٰذا ان ہدایتوں کے تحت فساد زدہ علاقوں اور پُرامن علاقوں، دونوں علاقوں سے وہ بے قصور لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ ہم کیا کریں، مخالف پارٹیاں سمجھتی ہیں کہ ہم نے انھیں جیل میں ڈال دیا حالانکہ وہ جیل نہیں بلکہ محفوظ مقام ہے۔

ہم اپنے ہم وطنوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جب تک پورے ملک سے فرقہ واریت کا یہ زہر ختم نہیں ہوگا تب تک ہماری سرکار قانون پر قانون بدلتی جائے گی چاہے اس کو پورا کونسٹی ٹیوشن ہی کیوں نہ بدلنا پڑے اس کے ساتھ ہی میں ان تمام مرنے والوں مظلوموں کو اپنے جیب خرچ سے بچا کر دس دس روپے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے کر کے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو تصوّف کی دُنیا میں غرق کر دیا۔

میں اپنا پین بند کر کے اس عالیشان ہوٹل کے باہر آگیا جس کے سامنے وہ بھکاری اپنے بچے کے ساتھ کپڑے بنانے کی ایک بہت بڑی کمپنی کے اپنے نئے تیار کردہ گرم کپڑے کی تعریف میں نکالے گئے ایک بہت بڑے اشتہار کے نیچے ٹھٹھرا ہوا پڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے ۲۶ر جنوری کے پروگرام کی عالیشان تیاریاں چل رہی تھیں، کچھ جھنڈے گاڑے جا رہے تھے کہیں کہیں بڑے بڑے لکڑی کے خالی فریم لگائے جا رہے تھے۔ جن میں نیتاؤں کی بڑی بڑی تصویریں لگائی جانے والی تھیں اور دور کہیں ٹرانسسٹر پہ گانا آرہا تھا۔

"تیری دنیا میں دل لگتا نہیں واپس بلالے"

▲▼

قافیہ کی تلاش

فرحت زیدی

(ایک محترم بزرگ شاعر سے معذرت کے ساتھ)

کہتے ہیں ہو گئے اک بار جو اکبر بیمار ۔۔۔ روز ہی آنے لگے بہر عیادت دو چار
دوست، احباب، اقارب و اعزہ آئے ۔۔۔ عالم دین بھی تھے ان میں تو کچھ دنیا دار
شیخ نتھو بھی، بقاتی بھی تھے، خیراتی بھی ۔۔۔ کچھ زمیں دار بھی، حکام بھی اور کچھ تجار
اک طوائف بھی وہاں آئیں عیادت کیلئے ۔۔۔ جن کے آنے سے بنا خانہ اکبر گلزار
تھیں سخن سنج بھی اور اہل سخن کی مداح ۔۔۔ نام گوہر تھا طوائف تھیں وہ اک ڈیرے دار
کامل فن تھیں کہ گاتی تھیں ہر راگ میں وہ ۔۔۔ دادرا، ٹھمری، غزل ہو کہ کھماچ، ملہار
ان کی آواز کا تھا شہر میں چرچا ہر سو ۔۔۔ اہل عزت میں ہوا کرتا تھا ان کا بھی شمار
بعد احوال کی پرسش کے وہ خاموش ہوئیں ۔۔۔ گفتگو کے نئے موضوع تھا ان کو درکار
بہر اخلاق وہ یوں کہنے لگیں اکبر سے ۔۔۔ آپ کہہ دیجئے "میرے لئے" بھی کچھ اشعار
مسکرانے لگے اکبر جو سنی فرمائش ۔۔۔ بولے سنجیدہ غزل میں نہیں کہتا زنہار
آپ کے واسطے ہے پیش فقط ایک ہی شعر ۔۔۔ اور اکبر نے یہ دو مصرعے کئے گوش گزار

"کون خوش بخت زمانے میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا"

میں نے یہ شعر سنا جب تو یہ سوچا پیہم ۔۔۔ قافیہ اور ہے کیا گوہر و شوہر کے سوا
غور کرنے پہ بہت بھید کھلا یہ مجھ پہ ۔۔۔ کوئی ہم قافیہ ہے ہی نہیں جوہر کے سوا

پیروڈی ۔ از شیخ جانسی

۱

نہ جانے کون سی خوبی ہے فلمی گیت میں شیخو
نہ جانے اِن پہ کیوں ہر عمر کا انسان مرتا ہے
ابھی شوہر تو کیا اُس کا منگیتر بھی نہیں لیکن
"بیدردی بالما تجھ کو مرا من یاد کرتا ہے"

۲

کیا کہا! عشق کا بس ڈھونگ رچا رکھا ہے
سچ کہا میں نے تجھے سر جو چڑھا رکھا ہے
پاؤڈر پونچھ کے آئینہ کبھی دیکھا ذرا
"مجھ سے مت پوچھ مرے عشق میں کیا رکھا ہے"

۳

وہ بات جو عوام میں مشہور ہو چکی
کمزور کا گلہ تو نہیں ہے کہ داب دیں
اچھا تمہیں سے پوچھ رہے ہیں تمہیں بتاؤ
"دنیا کرے سوال تو ہم کیا جواب دیں"

۴

دیکھی ہیں بہت ہم نے حسیناؤں کی آنکھیں
آنسو ہی ملے اُن میں نہ صہبا تھی نہ بادہ
پاگل ہی وہ شاعر تھا کوئی ورنہ یہ کہتا
"چھلکے تیری آنکھوں سے شراب ۔ اور زیادہ"

۵

ہم تجھ کو بہر حال بھلا کر ہی رہیں گے
اُترے گی تو پی لیں گے شراب اور زیادہ
اب آنکھ اُٹھا کر تجھے دیکھیں تو گنہ گار
"کھلتے رہیں ہونٹوں کے گلاب اور زیادہ"

۶

بولیں بیگم کہ میں یہ ٹھان چکی ہوں دل میں
اُسترے سے کسی سیلون میں سر منڈا والوں
آپ ہی جب نہیں کرتے ہیں کوئی قدر ان کی
"اپنی زلفوں کی سیہ رات کسے پیش کروں"

۷

ہم بھی ضدّی ہیں اگر آ گئے اپنی ضد پہ
پھر نہ حیلہ کوئی ہوگا نہ بہانہ ہوگا
یوں نہ آؤ گی تو ہم بیاہ کے لے آئیں گے
"آج پردہ ہے تو کل سامنے آنا ہوگا"

۸

وہ یہ کہتی تھیں ارادے کو بدلنا ہوگا
اب دوبارہ جو کہا ہم سے تو جھگڑا ہوگا
اور بیگم سے یہ کہتے تھے جناب بیتاب
"دلِ بیتاب کو سینے سے لگانا ہوگا"

○

ابراہیم یوسف

کارکردگی

[پولیس آفیسر اپنے آفس میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا ہے کہ فون کی گھنٹی بجتی ہے ۔ ریسیور اٹھا کر]

پولیس آفیسر :۔ ایکس اسپیکنگ ۔ یس سر ۔ جی ہاں کیا کسی سرخ داڑھی والے نے پولیس کے سپاہی کو نفرت سے دیکھا ۔ یس سر ۔ یس سر ۔ میں فوراً کارروائی کر کے سرخ داڑھی والے کو گرفتار کرتا ہوں ۔ بس سر ۔ یس سر ۔ جی ہاں ابھی ابھی ۔ [ریسیور رکھ کر سوچنے لگتا ہے] سرخ داڑھی والا ۔ [گھنٹی بجاتا ہے ۔ ایک سپاہی داخل ہو کر سلوٹ کرتا ہے] ریکارڈ کیپر کو بلاؤ ۔ [سپاہی سلوٹ کر کے چلا جاتا ہے ۔ پولیس آفیسر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے کہ ریکارڈ کیپر داخل ہوتا ہے] ریکارڈ میں ایسے مجرم کی تلاش کرو جس کی داڑھی سرخ ہو ۔

ریکارڈ کیپر :۔ سرخ داڑھی والا ۔

پولیس آفیسر :۔ ہاں سرخ داڑھی والا ۔ آج تک بری داڑھی کسی کی نہیں نکلی ۔ افسر اعلیٰ سے ایک سپاہی نے شکایت کی ہے کہ ایک سرخ داڑھی والے نے اسے نفرت اور غصہ سے دیکھا ۔ اس کا گرفتار کیا جانا ضروری ہے ۔

ریکارڈ کیپر :۔ مگر سر ۔

پولیس آفیسر :۔ مگر وگر کچھ نہیں ۔ نئے افسر اعلیٰ نے کل ہی چارج لیا ہے ۔ میں نے تو ابھی تک ان کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے ۔ ہمیں انھیں اپنی کارکردگی دکھلانا ۔ [فون کی گھنٹی بجتی ہے ۔ ریسیور اٹھا کر] یس ۔ یس سر ۔ انتظامات کیے جا رہے ہیں ۔ جی ہاں ۔ جی ہاں ۔ یہ پورے محکمہ کی توہین ہے کہ کوئی پولیس کے سپاہی کو غصہ اور نفرت سے دیکھے یس سر ۔ یہ پولیس کی پرسٹیج کا سوال ہے ۔ یس سر ۔ اگر وہ قبر میں بھی چلا گیا ہوگا تو اسے کھود کر نکال لیا جائے گا جس نے ایک پولیس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا ہے ۔ [ریسیور رکھ کر] اس کا گرفتار ہونا بہت ضروری ہے ۔ آج اس نے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا ہے کل مجھے دیکھے گا پرسوں افسر اعلیٰ کو ۔ [ریکارڈ کیپر سے] جائیے اور ریکارڈ میں ایسے مجرم کو تلاش کیجئے جس کی داڑھی سرخ ہے [ریکارڈ کیپر چلا جاتا ہے ۔ پھر گھنٹی بجاتا ہے ۔ سپاہی اندر آ کر سلوٹ کرتا ہے] وائرلیس آپریٹر کو بلاؤ ۔ [سپاہی سلوٹ کر کے چلا جاتا ہے کہ ایک سب انسپکٹر داخل ہوتا ہے وہ گھبرایا

ہوا ہے ۔ پولس آفیسر اسے دیکھ کر] کیا سرخ داڑھی والا پکڑا گیا ۔
سب انسپکٹر :۔ سرخ داڑھی والا !
پولس آفیسر :۔ ہاں سرخ داڑھی والا جس نے ایک سپاہی کو غصہ اور نفرت سے دیکھا تھا ۔
سب انسپکٹر :۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس سرخ داڑھی والے نے پولس کے سپاہی کو غصہ اور نفرت سے دیکھا تھا ۔
پولس آفیسر :۔ کس گدھے نے تمہیں سب انسپکٹر بنا دیا ہے کہ تمہیں شہر کی اتنی اہم خبر کا علم نہیں ۔
سب انسپکٹر :۔ لیکن سر
پولس آفیسر :۔ کیا سر سر لگا رکھا ہے جاؤ اور سرخ داڑھی والے کو تلاش کرو ۔
سب انسپکٹر :۔ مگر سر ۔
پولس آفیسر :۔ بکو جلدی بکو کیا بکتا ہے ۔ میرا خون کھول رہا ہے ۔
سب انسپکٹر :۔ رام پورہ میں ڈاکہ پڑ گیا ہے سر ۔ تین قتل ہوئے ہیں اور کئی مکانوں کو آگ لگا دی گئی ہے ۔
پولس آفیسر :۔ اور تمہارے نزدیک یہ بہت اہم خبر ہے جب کہ ایسا ہر روز ہوتا ہے ۔ ہر روز ڈاکے پڑتے ہیں، ہر روز قتل ہوتے ہیں ۔ ہر روز مکانوں کو آگ لگائی جاتی ہے لیکن کیا کبھی کسی سرخ داڑھی والے نے کسی پولس کے سپاہی کو غصہ اور نفرت سے دیکھا ہے ۔
سب انسپکٹر :۔ جی نہیں کبھی نہیں ۔
پولس آفیسر :۔ تو جاؤ اور پہلے سرخ داڑھی والے کو تلاش کرو ۔
سب انسپکٹر :۔ یس سر ۔
[سب انسپکٹر چلا جاتا ہے وائرلیس آپریٹر داخل ہوتا ہے ۔]

پولس آفیسر :۔ تمام پیٹرول کاروں کو میسیج بھیجو کہ اس سرخ داڑھی والے کو فوراً گرفتار کیا جائے جس نے ایک پولس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا ہے ۔
آپریٹر :۔ یس سر ۔
[آپریٹر واپس جاتا ہے کہ فون کی گھنٹی پھر بجتی ہے ۔ ریسیور اٹھا کر]
پولس آفیسر :۔ ایکس اسپیکنگ ۔ یس سر ۔ پوری فورس حرکت میں آگئی ہے ۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر سرخ داڑھی والا گرفتار کر لیا جائے گا جس نے پولس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا تھا ۔ [ایک سپاہی آکر سلوٹ کرتا ہے ۔ پولس آفیسر نظر اٹھا کر دیکھتا ہے]
سپاہی :۔ ایک سرخ داڑھی والا ۔
پولس آفیسر :۔ گرفتار کر لیا گیا ۔ گڈ ۔ [ریسیور کان سے لگا کر] سرخ داڑھی والا گرفتار ہو گیا ۔ ابھی رپورٹ پیش کرتا ہوں ۔
[ریسیور رکھ کر سپاہی سے] اس سرخ داڑھی والے کو اندر لاؤ ۔
[سپاہی باہر جاتا ہے اور ایک شخص کو اندر لاتا ہے جس کی داڑھی منڈھی ہوئی ہے پولس آفیسر اسے غور سے دیکھتا ہے]
سپاہی :۔ حضور یہ حجام کی دکان سے نکلا تو مجھے مسکرا کر دیکھا مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنی سرخ داڑھی منڈھوائی ہے ۔
پولس آفیسر :۔ [اس شخص سے] تم نے اپنی داڑھی کیوں منڈھوائی ۔
شخص :۔ حضور میں ہر روز داڑھی منڈھواتا ہوں ۔
پولس آفیسر :۔ اور تم ہر روز مسکراتے ہو ۔
شخص :۔ جی ہاں میں اکثر مسکراتا ہوں ۔
پولس آفیسر :۔ کیوں مسکراتے ہو اور اگر مسکراتے ہی ہو تو پولس کے سپاہی کو دیکھ کر کیوں مسکرائے ۔

شخص :۔ حضور میں نے پولس کے سپاہی کو دیکھا نہیں.
پولس آفیسر :۔ اور اگر دیکھتے تو نفرت اور غصہ سے دیکھتے.
شخص :۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں کیا کرتا.
پولس آفیسر :۔ بہت چالاک معلوم ہوتے ہو. تمہاری داڑھی کا رنگ کیسا ہے۔
شخص :۔ کالا ہے حضور.
پولس آفیسر :۔ تو کالی داڑھی کیوں منڈھائی. تم جھوٹ بول رہے ہو تمہاری داڑھی کا رنگ سرخ ہے۔
شخص :۔ حضور میری تو سات پشتوں میں کسی کی داڑھی سرخ نہیں تھی۔
پولس آفیسر :۔ میں سات پشتوں کی نہیں تمہاری داڑھی کا رنگ پوچھ رہا ہوں۔
شخص :۔ مگر حضور۔
پولس آفیسر :۔ (ڈانٹ کر) دیکھو سیدھے سیدھے قبول کرلو کہ تمہاری داڑھی سرخ ہے. ورنہ پولس کو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کرنا آتا ہے. مجھے پولس کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر مجبور نہ کرو (فون کی گھنٹی بجتی ہے. ریسور اٹھا کر) ایکس اسپیکنگ. یس سر. اس نے داڑھی منڈھوائی ہے. پوچھ تاچھ جاری ہے. جی ہاں پٹائی بھی کی جائے گی. جی ہاں. جی ہاں خوب پٹائی کی جائے گی. یس سر. (ریسیور رکھ کر) اسے اس وقت تک لاک اپ میں رکھو جب تک اس کی داڑھی نہ نکل آئے۔
شخص :۔ لیکن حضور.
پولس آفیسر :۔ لے جاؤ. بدمعاش ہے پولس کے سپاہی کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔
شخص :۔ مگر حضور۔

پولس آفیسر :۔ لے جاؤ اور وائرلیس آپریٹر کو بھیجو.
سپاہی :۔ یس سر.
(سپاہی اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے جاتا ہے کچھ دیر بعد آپریٹر آتا ہے).
پولس آفیسر :۔ تمام پولس فورس کو مطلع کرو کہ وہ تمام حجاموں کو سختی سے منع کر دیں کہ وہ آج کسی کی داڑھی نہ مونڈھیں.
آپریٹر :۔ یس سر.
(آپریٹر چلا جاتا ہے کہ پولس آفیسر کرسی پر بیٹھ کر ایک فائل کھولتا ہے کہ ایک دوسرا شخص کمرے میں داخل ہو کر)
دوسرا شخص :۔ حضور میں لٹ گیا.
پولس آفیسر :۔ (اسے دیکھ کر) تو پھر میں کیا کروں. تم کیوں لٹ گئے۔
دوسرا شخص :۔ حضور گولڈن میری لڑکی کو اٹھا کر لے گیا۔
پولس آفیسر :۔ گولڈن!
دوسرا شخص :۔ وہ نامی غنڈا ہے سرکار.
پولس آفیسر :۔ تم چاہتے تھے کہ کوئی شریف آدمی اٹھا کر لے جاتا. غنڈے ہی لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں. پھر تمہیں کیوں شکایت ہے۔
دوسرا شخص :۔ مگر میری لڑکی بہت بھولی بھالی ہے سرکار. وہ اسے تباہ کر دے گا۔
پولس آفیسر :۔ سراسر تمہاری غلطی ہے. اپنی لڑکی کو بھولی بھالی کیوں رکھا تھا.
دوسرا شخص :۔ مگر سرکار.
پولس آفیسر :۔ خاموش رہو. ہمیں آج سرخ داڑھی والے کی تلاش ہے. ہم آج کسی غنڈے وُنڈے کے چکر میں پڑنا

نہیں چاہتے۔ کیا نام بتلایا تھا اس غنڈے کا۔

دوسرا شخص :۔ گولڈن۔

پولیس آفیسر :۔ ہاں گولڈن۔ کیا اس کی داڑھی سُرخ ہے۔

دوسرا شخص :۔ سرکار وہ داڑھی نہیں رکھتا۔

دوسرا شخص :۔ تب تک سرکار وہ میری لڑکی کی عزت لوٹ لے گا۔

پولیس آفیسر :۔ غنڈوں نے ہزاروں عورتوں کی عزت لوٹی ہے اگر ایک تمہاری لڑکی کی عزت لُٹ جائے گی تو سورج نکلا نہیں چھوڑ دے گا۔

دوسرا شخص :۔ (ہاتھ جوڑ کر) مجھ پر رحم کیجئے سرکار۔ میری لڑکی کی عزت بچا لیجئے۔

پولیس آفیسر :۔ تمہیں اپنی لڑکی کی عزت کی فکر پڑی ہے اور ہمیں اپنی عزت کی۔ اگر سُرخ داڑھی والا نہ پکڑا گیا جس نے پولیس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا تھا تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔

دوسرا شخص :۔ (رو کر) مگر سرکار۔

پولیس آفیسر :۔ (غصہ سے چیخ کر) خاموش رہو۔

دوسرا شخص :۔ سرکار۔

پولیس آفیسر :۔ باہر نکلو۔ بلا وجہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ (گھنٹی بجاتا ہے سپاہی اندر آتا ہے) اسے باہر نکالو۔ (سپاہی اسے گھسیٹ کر باہر لے جاتا ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے رسیور اٹھا کر) ایکس اسپیکنگ۔ اچھا۔ پکڑ لیا گیا۔ گڈ۔ کیا۔ خود کو یونیورسٹی کا پروفیسر بتلا رہا ہے۔ اگر سُرخ داڑھی ہے تو اسے یہاں لے آؤ۔

(رسیور رکھ کر فائل اُلٹنے پلٹنے لگتا ہے کہ سپاہی اندر آکر)

سپاہی :۔ سر! نیتا جی آئے ہیں۔

پولیس آفیسر :۔ کیوں آئے ہیں۔

سپاہی :۔ وہ بہت غصہ میں ہیں۔

پولیس آفیسر :۔ تو کیا مجھے گولی مار دیں گے۔ جاؤ انھیں اندر بھیجو۔

(سپاہی چلا جاتا ہے کچھ دیر بعد نیتا جی اندر آکر)

نیتا جی :۔ یہ آپ نے کیا اودھم مچا رکھی ہے۔ آپ کے سپاہی ہر گھر میں اس طرح گھس رہے ہیں جیسے انھوں نے یہ شہر فتح کر لیا ہو۔

پولیس آفیسر :۔ وہ ٹھیک کر رہے ہیں ہمیں اس سرخ داڑھی والے کی تلاش ہے جس نے ایک پولیس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا ہے۔

نیتا جی :۔ (کرسی پر بیٹھ کر) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ سُرخ داڑھی والے کی تلاش میں شریفوں کے گھروں میں گھس گھس کر انھیں بے عزت کریں۔

پولیس آفیسر :۔ اور سرخ داڑھی والے کو یہ حق ہے کہ وہ پولیس کے سپاہی کو غصہ اور نفرت سے دیکھے۔ اور اسے عزت کرے۔ (فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ رسیور اٹھا کر) ایکس اسپیکنگ کیا۔ ایک اور سُرخ داڑھی والا پکڑا گیا۔ کیا۔ کہہ رہا ہے کہ پولیس والوں کی طرف دیکھنا تک نہیں۔ بہت مغرور معلوم ہوتا ہے۔ کیا۔ سات ڈکیتیوں اور گیارہ قتل کرنے کا اقرار کر رہا ہے۔ کیا۔ کتنے ریپ کئے۔ ہیں ان کی تعداد بھول گیا ہے۔ گدھے تمہیں اس سُرخ داڑھی والے کو پکڑنے کا حکم دیا گیا ہے جس نے پولیس کے سپاہی کو غصہ اور نفرت سے دیکھا تھا اور تم ہو کہ ڈکیتیوں، قاتلوں اور زانیوں کی تلاش میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ اصل مجرم کو تلاش کرو۔ (رسیور رکھ کر)

کیسے کیسے گدھوں کو پولس فورس میں رکھ چھوڑا ہے (نیتا جی کی طرف دیکھ کر) معاف کیجئے گا نیتا جی! اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔

نیتا جی:۔ آپ ہی نہیں آپ کی پوری فورس مصروف ہے۔ جنتا کے ساتھ اینائے ہو رہا ہے۔

پولس آفیسر:۔ ہونے دیجئے۔ آپ کی داڑھی تو سُرخ نہیں ہے۔

نیتا جی:۔ مگر میرے تین دوٹروں کی داڑھیاں سُرخ ہیں، انہوں نے میرے گھر میں پناہ لے رکھی ہے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں۔

پولس آفیسر:۔ مُجرموں کو پناہ دینا سُرخ داڑھی رکھنے سے بڑا جُرم ہے۔

نیتا جی:۔ میں ابھی ہوم منسٹر سے اس اینائے کی شکایت کروں گا۔

پولس آفیسر:۔ تو کیا وہ میرے توپ لگا دیں گے۔ (فون اس کی طرف بڑھا کر) لیجئے یہیں سے انھیں فون کر دیجئے۔

نیتا جی:۔ جناب میرا یہ مطلب نہیں تھا۔

پولس آفیسر:۔ اور کیا مطلب تھا۔

نیتا جی:۔ میرا مطلب تھا کہ ان تینوں کو نہ چھیڑا جائے۔

پولس آفیسر:۔ نہیں چھیڑا جائے گا۔ مگر آپ کو ہماری مدد کرنا ہوگی۔

نیتا جی:۔ میں نے کب انکار کیا ہے۔ نیتا اور پولس کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔

پولس آفیسر:۔ تو پھر اس سُرخ داڑھی والے کو پکڑوانے میں ہماری مدد کیجئے جس نے ایک پولس کے سپاہی کو نفرت اور غصّہ سے دیکھا تھا۔

نیتا جی:۔ ضرور۔ ضرور۔ (کھڑے ہو کر) اب میں چلتا ہوں۔

(دروازے کی طرف جاتا ہے کہ ایک سپاہی اندر آ کر)

سپاہی:۔ سر! وہ سُرخ داڑھی والا آ گیا ہے جو اپنے آپ کو یونیورسٹی کا کہہ رہا ہے۔

پولس آفیسر:۔ اسے اندر لاؤ۔

(سپاہی اور نیتا جی کمرے سے نکل جاتے ہیں کچھ دیر بعد پروفیسر اور سپاہی آتے ہیں۔ پولس آفیسر پروفیسر کو سر سے پیر تک دیکھ کر)

پولس آفیسر:۔ تو تم یونیورسٹی کے پروفیسر ہو۔

پروفیسر:۔ کیا آپ کو شک کیوں ہے۔

پولس آفیسر:۔ اس لئے کہ تمہاری داڑھی سُرخ ہے۔

پروفیسر:۔ یہ کس قانون میں لکھا ہے کہ پروفیسر کی داڑھی سُرخ نہیں ہونا چاہیئے۔

پولس آفیسر:۔ (میز پر سے رول اُٹھا کر دکھلاتے ہوئے) ہمارے ڈنڈے کے قانون میں (غصّہ سے) بتلاؤ تم نے پولس کے سپاہی کو غصّہ اور نفرت سے کیوں دیکھا تھا۔

پروفیسر:۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں کسی پولس والے کو دیکھتا پھروں۔

پولس آفیسر:۔ گویا تم پولس والوں سے نفرت کرتے ہو۔ تم نے ضرور پولس کے سپاہی کو نفرت اور غصّہ سے دیکھا ہوگا۔

پروفیسر:۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں کسی پولس والے کو دیکھنا پسند نہیں کرتا نہ نفرت سے نہ غصّہ سے نہ محبت سے۔

پولس آفیسر:۔ تو تم ان کا صرف ڈھنڈورا دیکھنا پسند کرتے ہو۔ سیدھے سیدھے اقرار کر لو کہ تم نے پولس کے سپاہی کو نفرت اور غصّہ سے دیکھا تھا۔

پروفیسر:۔ بلا وجہ اقرار کر لوں؟ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس بدتمیزی کی وجہ کیا ہے۔

پولس آفیسر:۔ اچھا۔ تو اب تم پولس کے سپاہی کو نفرت اور غصّہ سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں بدتمیز بھی کہہ رہے ہو (گھنٹی بجا

ہے۔ سپاہی آتا ہے] ذرا ان مہاشے پروفیسر کو تمیز سکھاؤ۔
[سپاہی پروفیسر کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہے۔ پروفیسر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے]
پروفیسر:۔ کیا بے ہودگی ہے۔
[جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیتا ہے]
پولیس آفیسر:۔ سراسر بے ہودگی ہے کہ سرخ داڑھی رکھ کر پولیس کے سپاہی کو نفرت اور غصّہ سے دیکھتے ہو۔
پروفیسر:۔ لیکن میں امن پسند شہری اور شریف انسان ہوں۔
پولیس آفیسر:۔ تمہاری امن پسندی اور شرافت تمہاری سُرخ داڑھی سے ظاہر ہے [سپاہی سے] لے جاؤ اور اس وقت اس کی پوجا کرو جب تک یہ اقرار نہ کرے کہ اس نے پولیس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھا تھا [سپاہی پروفیسر کو گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے]
پولیس آفیسر:۔ [غصّہ سے ٹہلتے ہوئے] سرخ داڑھی۔ اور پروفیسر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے شہر نے سُرخ داڑھیاں رکھ کر پولیس کو چڑانے کی کوشش شروع کردی ہے۔ میں ہر سُرخ داڑھی والے کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا۔ پولیس کے سپاہی کو نفرت اور غصہ سے دیکھنا معاف نہیں کیا جا سکتا۔ [باہر شور وغُل اور چیخ پکار کی آوازیں۔ گھنٹی بجاتا ہے۔ سپاہی آکر سلوٹ کرتا ہے] یہ کیا شور وغُل ہے۔ یہ پولیس آفس ہے یا مچھلی بازار۔
سپاہی:۔ ایک سُرخ داڑھی والا ہے سر۔ وہ خود کو پولیس کا افسر اعلیٰ بتلا رہا ہے اور اسٹاف سے ہاتھا پائی کر رہا ہے۔
پولیس آفیسر:۔ کہاں پکڑا گیا۔
سپاہی:۔ مین مارکیٹ میں۔ فٹ پاتھ پر کھڑا اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے اسے پولیس کا خوف ہی نہ ہو۔

پولیس آفیسر:۔ اسے فوراً اندر لاؤ۔
[سپاہی جانے کے لئے مڑتا ہے کہ تین چار سپاہی ایک شخص کو گھسیٹتے ہوئے لاتے ہیں اور اس زور سے دھکا دیتے ہیں کہ وہ پولیس آفیسر کی میز سے جا کر ٹکراتا ہے اس کے بال بکھرے ہوئے اور لباس بے ترتیب ہے]
پہلا سپاہی:۔ یہ خود کو ہمارا افسر اعلیٰ کہہ رہا ہے۔
پولیس آفیسر:۔ ابھی تھوڑی دیر میں خود کو گورنر کہے گا۔
شخص:۔ میں تم سب کو سسپینڈ کر دوں گا۔
پولیس آفیسر:۔ بلکہ تم ہم سب کو پھانسی پر چڑھا دوگے اور وہ بھی سُرخ داڑھی لگا کر۔ [غصّہ سے] تم نے پولیس کے سپاہی کو غصّہ اور نفرت سے کیوں دیکھا تھا۔
شخص:۔ میں تم کو تباہ کر دوں گا ڈسمس کر دوں گا میں تمہارا افسر اعلیٰ ہوں۔
پولیس آفیسر:۔ کیوں بک بک کر رہا ہے۔
دوسرا سپاہی:۔ یہ شاید پاگل ہونے کی ایکٹنگ کر رہا ہے۔
پولیس آفیسر:۔ ہم باہوش لوگوں کو پوجا کر کے پاگل بنا دیتے ہیں ایک پاگل کی ایکٹنگ کرنے والے کو منٹوں میں باہوش بنا دیں گے۔
شخص:۔ تمیز سے بات کرو۔ مجھے سلوٹ کرو۔ میں تمہارا افسر اعلیٰ ہوں۔ [پولیس آفیسر مارنے کے لئے رول اُٹھاتا ہے کہ وہ شخص پولیس آفیسر سے لپٹ جاتا ہے۔ دونوں میں جدوجہد ہوتی ہے۔ سپاہی اس شخص کو دو چار تھپڑ مار کر اسے الگ کرتے ہیں]
پولیس آفیسر:۔ ہتھکڑیاں لگا دو۔ [تھوڑی جدوجہد کے بعد ہتھکڑیاں لگا دی جاتی ہیں۔ [پولیس آفیسر ایک دو طمانچے مارکر] اب بھی تم پولیس کے افسر اعلیٰ ہو۔

شخص :- کیا تم سب پاگل ہو گئے ہو۔ ہیڈ آفس سے معلوم کرو کہ نئے افسرِ اعلیٰ کی داڑھی کیسی ہے۔

پولس آفیسر :- تمہاری طرح چھگی اور سُرخ۔ کیا افسرِ اعلیٰ پاگل ہو گیا ہے کہ سُرخ اور چھگی داڑھی رکھے گا۔

شخص :- ہاں رکھتا ہے کیا تم اس سے مل چکے ہو۔

پولس آفیسر :- اور نہ ایسے بے ہودہ افسرِ اعلیٰ سے ملنا چاہتا ہوں جو سُرخ اور چھگی داڑھی رکھتا ہو [سپاہیوں سے] لے جاؤ اور اس وقت تک لے جا کر تے رہو جب تک یہ افسرِ اعلیٰ بنا رہے

[سپاہی گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ شخص جد و جہد کرتا ہے اور چیخ چیخ کر ماں بہن کی گالیاں دیتا ہے۔ پولس آفیسر غصہ سے ایک دو ٹکے اس کے منہ پر مار کر] لے جاؤ۔

[سپاہی گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ پولس آفیسر اطمینان کا سانس لے کر اپنی کُرسی کی طرف جاتا ہے کہ ایک سب انسپکٹر گھبرایا ہوا داخل ہو کر]

سب انسپکٹر :- سر۔ سر۔ غضب ہو گیا۔

پولس آفیسر :- اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ پہاڑ ٹوٹ گیا یا آسمان گر پڑا۔

سب انسپکٹر :- اس سے بھی بڑا غضب سر اس سے بھی بڑا۔ وہ جس کو آپ نے ہتھکڑیاں لگوائی ہیں پولس کا افسرِ اعلیٰ ہے۔ میں اسے پہچانتا ہوں۔

پولس آفیسر :- افسرِ اعلیٰ۔

[چکرا کر کُرسی پر گر پڑتا ہے]

[ایک جرمن کہانی سے ماخوذ۔]

نامور مزاح نگار

خواجہ عبدالغفور

کے مضامین

سمن زار

قیمت ۸/- روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

مریخ

ماہنامہ پٹنہ

نئی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء کو منظرِ عام پر آرہا ہے

افسانے، وامق اور سلیس تنقیدی مضامین ان کے علاوہ اردو زبان کے مسائل وانھا

قیمت فی پرچہ دو روپے، سالانہ بیس روپے، بیرونِ شہر ایجنٹ وی پی طلب کریں

زرِ ضمانت جمع کریں۔ معقول کمیشن دیا جائے گا۔ مشتہرین کے لئے مناسب نرخ

ایڈیٹر عبدالمغنی، پتہ دفتر انجمن ترقی اردو بہار

لیڈی امام ہاؤس، پتھر کی مسجد، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

محمد تقی (ایم اے، بی ایڈ)
(رتناگیری)

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

دوائیوں کو ہاتھ میں تھماتے ہوئے ڈاکٹر نے ہمیں تاکید کی "مرض کے دفع ہونے تک چائے سے پرہیز بے حد ضروری ہے۔"

ہم دوائیوں کو لئے چائے سے پرہیز کے متعلق غور و خوض میں ڈوبے چلے آ رہے تھے کہ کسی نے ہمیں آواز دی "ارے آفتاب صاحب!" پلٹ کر جو دیکھا تو ہمارے ایک ساتھی اپنے مکان کے سامنے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بلا رہے تھے۔ جوں ہی ہم اُن کے قریب پہنچے وہ ہمیں اپنے ساتھ دیوان خانے میں لے گئے اور کرسی پر بٹھاتے ہی آواز دی:
"بیگم! دو پیالی کڑک چائے تیار کرو۔" چائے کا لفظ سُنتے ہی ہمارا ماتھا ٹھنکا۔

"بھائی چائے وائے رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"ڈاکٹر نے چائے پینے سے منع کیا ہے۔" ہم نے دوائیاں دکھاتے ہوئے بڑی بے چارگی کے ساتھ کہا۔

"کونسا مرض ہے؟"

"ایسی ڈیٹی (Acidity)"

ارے یہ بھی کوئی مرض ہے! ایک آدھ کپ چائے پینے سے کیا بگڑتا ہے۔ بیگم جلدی تیار کرنا۔"
تھوڑی دیر بعد بچہ چائے لے آیا۔ ہم نے تیزاب کی پیالی لبوں سے لگائی اور آنکھیں موند کر چائے حلق میں اُنڈیل لی۔
ہمیشہ کی طرح آج بھی کھانے کے فوراً بعد ہمارے میزبان نے (جن کے ہم (PAYING GUEST) تھے چائے کی پیالی لا کر سامنے رکھ دی۔ پیالی پر نظر پڑتے ہی ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ ہم چائے پینے سے مسلسل انکار کرتے

رہے لیکن مہربان میزبان نے ہر بار یہی کہا کہ دن میں ایک آدھ پیالی چائے پینے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا؟ ہم نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ پیالی اٹھالی۔

اسکول جانے سے قبل ہم نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اسکول میں چائے قطعی نوش نہیں فرمائیں گے۔ SHORT RECESS کے دوران ہم اسٹاف ممبران سے اس لئے کترانے لگے کہ کہیں کوئی ساتھی ہمیں چائے کے لئے کینٹین کی طرف گھسیٹ نہ لے جائے۔ چنانچہ ہم نے لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے اسکول کے چمن کے پُرسکون ماحول میں قدم رکھا۔ اتنے میں کہیں سے ہمارے ایک بے تکلف دوست نمودار ہوئے۔ اور آتے ہی ہمارے شرٹ کے کالر کو پکڑ کر کھینچا:

"ابے کدھر جاتا ہے؟ چل تجھ سے آج ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنی ہے۔"

وہ اہم معاملات اکثر کینٹین میں بیٹھ کر ہی طے کیا کرتا تھا۔ ہماری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ کینٹین میں داخل ہوتے ہی اس نے بیرے کو اشارے سے بلوایا "دو کپ گولڈن چائے لاؤ۔"

"ارے بھائی ڈاکٹر نے ہمیں چائے پینے سے منع کیا ہے۔ ایسی ڈیٹی ہے۔" ہم ایک ہی سانس میں فرفر بول گئے۔

دھت تیری کی۔ دن میں ایک آدھ کپ چائے کیا تیری آنتوں کو پگھلا دے گی! دھت تیری کی۔ ویسے ہمارے ہاں کے ڈاکٹر بھی کوئی ڈاکٹر ہیں۔ مرض کو حکمت کی چھڑی کی بجائے پرہیز کے سونٹے سے بھگانے کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔

دھت تیری کی بیرا کدھر ہے۔ جلدی لاؤ۔"

جی چاہا کہ بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن اخلاقی تقاضے کے تحت ہم بے بسی کی حالت میں خاموش بیٹھے رہے۔ اور بالآخر ہم نے اسپیڈ کی تیسری پیالی بھی اپنے پیٹ میں انڈیل لی۔

اسکول سے لوٹنے کے بعد چائے سے پرہیز کے معاملے پر ہم نے کافی غور و خوض کیا۔ اب چائے کا مسئلہ ہمارے لئے مسئلہ فلسطین بن گیا۔ لیکن چائے سے پیچھا چھڑانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دوست و احباب کو ناراض کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ بہرکیف ہم نے تہیہ کرلیا کہ چند دنوں کی رخصت لے کر وطن چلے جائیں گے اور صحت یاب ہونے تک چائے کو چھوئیں گے بھی نہیں۔ اسی دن ہم نے دس یوم کی رخصت کی درخواست بھی پیش کردی ــــــ خدا کا کرنا کہ درخواست اسی دن منظور ہوگئی۔ گھر پہنچ کر ہم نے سفر کی تیاری مکمل کرلی۔ شام کے کوئی ۸ بجے ہوں گے کہ ہم صدر مدرس صاحب سے ملاقات کے لئے اُن کے مکان پہنچے۔ اتفاق سے صدر مدرس صاحب مکان ہی میں تشریف رکھتے تھے اُنھوں نے ہمیں دیوان خانہ میں بٹھایا۔ ابھی دو چار باتیں بھی نہ ہو پائی تھیں کہ موصوف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم فوری تاڑ گئے کہ موصوف چائے کا آرڈر بک کروانے کے لئے اندر جانا چاہتے ہیں۔ ہمارا اندازہ صحیح نکلا۔ موصوف نے کہا بیگم سے چائے بنانے کے لئے کہہ کر ابھی آتا ہوں۔ آپ تشریف رکھیئے گا۔"

"جناب چائے وائے کے چکر میں مت پڑیئے گا۔ میں شام میں چائے نہیں پیتا" لیکن اُنھوں نے ہماری درخواست

سپرد کردی۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئے ہم پھرتی سے مکان سے باہر نکل آئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کھِسک گئے۔

دوسرے دن علی الصبح بس میں سوار ہوگئے۔ اور بس منزلِ مقصود کی سمت روانہ ہوئی۔ جب بس آدھا فاصلہ طے کر چکی تو ایک بس اسٹینڈ پر ٹھہرتے ہی کنڈیکٹر مسافروں سے مخاطب ہوا۔

بھائی صاحب یہاں گاڑی آدھا گھنٹہ رُکے گی۔ جس کو چائے پانی پینا ہو پی لے۔" چائے کی بھنک کانوں میں پڑتے ہی ہم نے لاحول بھیجی۔ باوجود یہ کہ ہمیں رفعِ حاجت کے لئے نیچے اُترنا تھا ہم اس خوف سے نہیں اُترے کہ کہیں کوئی ہمسفر ہمیں چائے کی پیشکش نہ کر بیٹھے۔ ہم اپنے آپ پر جبر کر کے بس میں بُت بنے بیٹھے رہے۔ بس کے تھانہ پہنچنے تک ہم نے راستہ بھر کسی بھی مقام پر نیچے اُترنے کی جرأت نہیں کی۔

تھانہ پہنچنے کے بعد ہم ٹرین میں سوار ہوگئے۔ ہماری سامنے والی نشست پر ایک لحیم شحیم سردارجی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے حیدرآبادی انداز میں انھیں آداب عرض کیا۔ وہ ہماری اس ادا سے بے حد متاثر ہوئے اور بہت جلد ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی مانوس ہوگئے۔

ٹرین کے ناسک اسٹیشن پر رُکتے ہی خوانچے والوں کی آوازیں فضاء میں اچھلنے لگیں۔

"اے چائے والا۔ گرما گرم چائے والا۔"

ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی ہمارے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیل رہا ہے۔

"اے او چائے والا" سردارجی نے کھڑکی سے باہر اپنا پگڑی والا سر نکال کر پکارا۔

"کتنا پیالی صاحب؟"

"دو پیالیاں بھرنا۔" ہمیں وحشت سی ہونے لگی۔

جس وقت سردارجی چائے کی پیالیاں ہاتھوں میں لے رہے تھے اُسی پل ہم بیت الخلاء کی طرف تیزی سے لپکے۔ بیت الخلا کے اندر داخل ہوتے ہی ہم نے دروازہ کو اچھی طرح بند کرلیا۔ جب ٹرین اسٹیشن سے کافی آگے نکل گئی تو ہم بیت الخلا سے برآمد ہوئے اور اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔

سردارجی بول اُٹھے" ارے بھائی! کدھر تھا تم؟ ہم نے تمہارے لئے چائے منگوائی تھی۔ ہمارا LOSS کردیا۔"

ہم من ہی من میں بڑبڑا کر رہ گئے۔

ذہن کو چائے کے مرکز سے ہٹانے اور دل کو بہلانے کے لئے ہم نے ٹرانسسٹر کا سوئچ آن کیا۔

"لپٹن چائے۔ مزیدار چائے۔ آپ بھی استعمال کیجئے۔"

ہم نے جھنجھلا کر دوسرے ہی لمحے ٹرانسسٹر کا گلا گھونٹ دیا۔ منماڈ پہنچنے تک ہم آنکھیں بند کئے بُت کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ اسٹیشن پر اُترنے کے بعد سردارجی کو گڈ بائی کہا۔ دوسری ٹرین پر سوار ہوکر شام کے تقریباً ۸ بجے اپنے وطن

پہنچ گئے ـــــ گھر پہنچ کر ابھی ہم اپنے کپڑے بھی تبدیل نہ کر پائے تھے کہ باورچی خانے سے آواز گونجی "منّے پپّا کے لئے چائے تیار کرنا ہے دودھ لاؤ" ہمارا سر بھنّایا "ہمیں چائے نہیں آرام چاہیئے" اتنا کہہ کر ہم نے بیگم کو بستر لگانے کا حکم دیا۔

دوسرے دن صبح بازار پہنچے تو راستے میں ایک لنگوٹیا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ہم دونوں بےساختہ ایک دوسرے سے لپٹ پڑے۔ باتوں ہی باتوں میں وہ ہمیں ایک ہوٹل کے اندر لے آیا۔

"بیرا ادھر آؤ"

ہمارے کان خرگوش کی طرح کھڑے ہوگئے۔

"کھانے کی کون کونسی اشیاء تیار ہیں؟" ہماری جان میں جان اس لئے آئی کہ لنگوٹیے نے کسی پینے کی چیز سے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ "صاحب! آلو وڑا، دوسہ، اڈلی سانبھر، اُپیا، کاجو برفی، سادہ برفی، گلاب جامن، چوڑوا، سب ختم ہوگیا ہے"

"تو پھر کیا ہے؟"

"صرف چائے"

ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمارے تازہ زخموں پر پسا ہوا نمک چھڑک دیا ہو۔ ہم نے یار کو چھوٹی انگلی دکھائی اور سُرعت سے باہر نکل آئے۔

اس واقعہ کے بعد ہم نے اپنی رخصت کے بقیہ ایّام گھر کی چار دیواری میں ایک بے قصور قیدی کی طرح مقید ہو کر گذارے۔

دس یوم بعد جب ہم اپنے اسکول کے اسٹاف روم میں داخل ہوئے تو ہمارے ایک اسٹاف ممبر نے ہم سے کہا۔ "تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے" ہماری باچھیں کھل گئیں۔

"فوری بتائیے بھائی" ـــ "ہم نے ٹی کلب قائم کیا ہے"

"ٹی کلب!" ہمارا سر چکرایا۔ ہم ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کرسی میں دھنس گئے۔

"ہم اس کلب کے ممبر نہیں بنیں گے" ـــ روم میں بیٹھے ہمارے تمام ساتھیوں نے کورس میں کہا "اسٹاف ممبران کا فیصلہ ہے کہ اسٹاف کے ہر ممبر کو ٹی کلب کا ممبر بننا پڑے گا" آخر کار ہم ایک ہارے ہوئے فوجی کی مانند ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔

اب روزانہ LONG RECESS کے دوران ہمارے تمام ساتھی بڑے مزے سے چائے کی پیالیاں اڑاتے ہیں اور ہم اُنکی صورتیں تکتے رہتے ہیں۔ ہمیں خواہ مخواہ ہر ماہ دس روپئے چائے کے بل کے طور پر ادا کرنا پڑتے ہیں۔ جس وقت ہم دس کی نوٹ کلب انچارج کے ہاتھ میں تھماتے ہیں تو ہمارا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہماری قوم پر بے حد افسوس بھی ہوتا ہے کہ وہ انگریز کی مکارانہ چال میں پھنس گئی۔ جس کے نتیجہ میں چائے کی عادی بن چکی ہے۔

اب تو چائے ہماری تہذیب کا ایک لازمی جزو بن کر ہمارے جسموں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے! □□

احمد حسین حیات
(بہلگنڈہ)

اخبار کے ایڈیٹر کی ڈاک

جناب ایڈیٹر صاحب، تسلیم!

اس سال ایس ایس سی (SSC) کے امتحانات جن حالات میں منعقد ہوئے ہیں یہ سب پر عیاں ہیں۔ سال تمام نہ تو ہماری نصابی کتابیں دقت پر دستیاب ہوئیں اور نہ کئی اسکولوں میں خاص مضامین کے ٹیچروں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ لہٰذا وزیر تعلیمات سے پُرزور گذارش ہے کہ اب کی بار رعایتی پانچ یا دس نمبرات دینے سے احتراز کرتے ہوئے طلبہ و طالبات کو پاس کلاس سرٹیفکٹ عنایت فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

چند ذہین طلبہ و طالبات ۔ موضع جاہل نگر، آندھرا آباد۔

مکرمی!

محکمہ دفتر فراہمی روزگار سے سخت ترین شکایت ہے کہ ہم نوکری کے کال (CALL) کے انتظار میں شادی شدہ ہو چکے ہیں اور اللہ کی دین سے تین بچوں کے شفیق والد محترم بھی ہو گئے ہیں لیکن ہماری نوکری کا بلاوا آج تک نہیں آیا۔ ہم آج سسرال والوں کی روٹیاں توڑتے توڑتے اس حال کو پہنچ گئے ہیں کہ اب ہم نوکری کرنے کے لائق نہیں رہے۔ بس ارباب ذمہ داران سے اتنی "گزارش ہے کہ ہماری سینیارٹی ہمارے بیٹے کی سینیارٹی میں جوڑلیں!

ایک گھر داماد ۔۔۔ لکھنؤ لیپہ۔

محترم ایڈیٹر صاحب تسلیم!

ہم تو چوپٹ راجاؤں کو برداشت کرتے چلے آرہے ہیں (خدا نے توفیق دی تو انشاءاللہ آگے بھی برداشت کریں گے) لیکن "اندھیر نگری" ہم کو برداشت کا دامن چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہمارے محلّے کے اکلوتے برقی کھمبے کی لائیٹ ہمیشہ دھڑکتی رہتی ہے کئی دفعہ "ہارٹ فیل" بھی ہو چکا ہے جس کی وجہ سے چوروں کو اپنا "فن" دکھانے میں کافی

سہولت مل رہی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ارباب مجاز اب کے ہماری اپیل کو سنتے ہوئے ہماری اکلوتی لائٹ کو زندگی عطا فرمائیں گے۔

سعید شاہ میاں ۔ قمر آباد۔

ایڈیٹر صاحب تسلیم!

آج کل آر ٹی سی بسوں کی رفتار سے زائد لوکل بس کے کرائے بڑھا دیئے گئے ہیں پھر بھی ہم کنڈکٹروں سے "سمجھوتہ" لیتے ہوئے کرایوں کو برداشت کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود لوکل بسوں کے وقت پر نہ آنے کی وجہ سے ہمیں اسٹیج پر طرح انتظار کرنا پڑتا ہے جیسے کوئی "لیڈر" صاحب آنے والے ہوں۔ مشکلوں کی حد یہ ہے کہ ہم کو بس آنے پر اس طرح گھسنا تا ہے جیسے بعض یار لوگ دعوتوں میں گھسے چلے آتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ذمہ دارانِ آر ٹی سی ہمارے دفاتر کے اوقات کو ہماری کلوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مزید بسوں کا انتظام فرمائیں گے۔ اُمید کہ ہم وقت کے پابندوں کی اپیل پر غور فرمائیں گے۔

لیث لطیف ۔ سنت نگر۔

مکرمی تسلیم!

ہم برسوں سے گدلا اور "ننھے منے" کیڑوں والا پانی نلوں سے بھرتے چلے آرہے تھے لیکن یہ کیا غضب ہے کہ دنوں سے سالم مچھلیاں چلی آرہی ہیں جس کی وجہ سے "آبِ حیات" جیسے پانی سے محروم ہیں۔ ہم اربابِ متعلقہ کو شدت سے اس طرف توجہ دلاتے ہیں۔

چند پریشان حال پیاسے ۔ کربلا آباد۔

ایڈیٹر صاحب آداب عرض!

محلہ خوشبو نگر میں بلدیہ والوں کی کاہلی سے ہمارے گھروں کے اطراف کی موریاں وقتاً فوقتاً سیٹھوں کی تجوریوں طرح بھری پڑی ہیں ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ غفلت شعاری سے بدبو پھوٹ کر ساری ہوا کو معطر کرنے لگی ہے۔ یہ بدبو کیسے برداشت کر سکتے ہیں جب کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا نسب تانا شاہ سے کتنا قریب سے ہو کر جاتا ہے۔ ضمن میں بلدیہ والوں سے بارہا شکایت کی گئی لیکن ہماری شکایت میں اتنا دم نہیں کہ ان کے کانوں پر جمع کچرے کو پار کر ان کے دماغ میں گھس سکے۔ کیا ہم خوشبو نگر والے موریوں میں عطر اور گلاب کی پتیاں بہائیں؟

اہلیان محلہ ــــ خوشبو نگر

ماہنامہ شگوفہ
چارکمان حیدرآباد پر ممتاز تاجرِ کتب
حسامی بکڈپو سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پرویز یداللہ مہدی

(آخری قسط)

دوپہر کے کھانے سے لقمہ لقمہ زور آزمائی میں مصروف تھے کہ فصل جاودیکی صورت نظر آئی۔ اور یہ صورت بھی یوں پیدا ہوئی کہ تابش صاحب نے انھیں ہماری واپسی کے ٹکٹوں کی ذمہ داری سونپی تھی۔ چنانچہ موصوف اس وقت ٹکٹ ہمارے حوالے کرنے تشریف لائے تھے اور بدستور مہمان دکھائی دے رہے تھے لہٰذا ہم نے چائے سے ان کی تواضع کی، جتنی دیر ساتھ رہے، اُسی مصرعِ طرح پر مزید تازہ اشعار سُناتے رہے جو تیاد لے کی صورت میں بھوپال سے بچھڑنے اور حیدرآباد سے جڑنے کے نتیجے میں ان کے ہاتھ لگا تھا۔ ان کے روانہ ہوتے ہی ناظم صاحب نے شفیقہ فرحت صاحبہ کو فون کیا۔ بھوپال میں تقریباً سبھی جانے انجانے ادیبوں شاعروں اور ادب نوازوں سے ملاقاتیں ہو چکی تھیں سوائے ایک محترمہ کے۔ خدا خدا کر کے فون پر موصوفہ سے ربط قائم ہوا۔ ناظم صاحب نے بذریعہ فون ہی ان کی مزاج پُرسی شروع کر دی۔ بھوپال میں موجود ہوتے ہوئے بھی مطلع سے اِس طرح غائب رہنے پر یوں ڈانٹ پلا رہے تھے جیسے ایک بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی سرزنش کرتا ہے۔ حالانکہ اصولاً اس طرح ڈانٹنا چاہیے تھا جیسے ایک بڑا بھائی چھوٹی بہن کو ڈانٹتا ہے لیکن ناظم صاحب چونکہ ابھی حال میں شفیقہ صاحبہ کو اپنا بھائی تسلیم کر چکے ہیں اس لئے فون پر بھی اسی "برادرانہ" رشتے کو نباہتے رہے۔ جب جی بھر کر ڈانٹ پلا چکے تو محترمہ کو اس بات کا پابند کیا کہ شام میں چار بجے چغتائی صاحب کے گھر پہنچ جائیں جہاں ہم سب چائے پر مدعو تھے۔

یہ بات پتہ نہیں کس کی اُڑائی ہوئی ہے کہ وعدہ نباہنے میں خواتین مردوں سے اکثر بازی لے جاتی ہیں لیکن شفیقہ صاحبہ پانچ بجے تک بھی چغتائی صاحب کے گھر نہیں پہنچیں اور اس طرح ثابت کر دیا کہ ناظم صاحب نے انھیں اپنا بھائی تسلیم کر کے کوئی غلطی

نہیں کی ہے بلکہ بہت سوچ سمجھ کر انھیں اپنی برادری میں شامل کیا ہے۔

چغتائی صاحب نے اپنے گھر پر چائے کے بہانے بڑی ہی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ بلکہ ان کا عصرانہ تو "بوفے ڈنر" کا ہم زلف معلوم ہوتا تھا گویا اس طرح موصوف نے پھر ایک بار ثابت کر دیا کہ وہ واقعی جان نثار اختر مرحوم کے ہم زلف ہیں۔ ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ ٹیبل پر چنی گئی قسم قسم کی مٹھائیوں میں مٹھاس زیادہ ہے یا چغتائی صاحب اور ان کے اہل و عیال کے خلوص میں۔ خلوص کی اس میٹھی میٹھی اور گھنی چھاؤں سے اُٹھنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن ناظم صاحب کو اپنے واپسی کے ٹکٹ کی فکر لاحق تھی اس لئے ایک بار پھر مجبوراً ہوٹل واپس لوٹنا پڑا۔ یوں تو ناظم صاحب کو صبح ہی سے ٹکٹ کی فکر لگی ہوئی تھی، لیکن اب اضطراب ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

ناظم صاحب اپنے مضامین میں جس طرح دو چار سطروں میں ایک آدھ چبھتا ہوا فقرہ قوسین میں فٹ کر دیتے ہیں بالکل اسی طرح ان کا اضطراب بھی صبح سے ضبط و برداشت کی قوسین میں قید تھا مگر اب یہ بریکٹ کی دیواروں کو پھاند کر باہر نکل آیا تھا۔ چنانچہ ہم اس آس میں ہوٹل پہنچے کہ شاید ٹکٹ کے بارے میں اس دوران میں کوئی اطلاع وصول ہوئی ہو۔ لیکن وہاں ٹکٹ کے بجائے شفیقہ فرحت صاحبہ معذرت خواہیوں اور مجبوریوں کے بے شمار دفتر لئے بیٹھی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی ناظم صاحب اپنا اضطراب بھول کر واپس اپنے مخصوص موڈ میں آگئے، پہلے خیر خیریت دریافت کی پھر محترمہ ــــــــ کی طرف اشارہ کر کے بولے "میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کے مزید دُبلے ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ آپ کو مزید دُبلے ہونے کا اتنا شوق کیوں ہے۔؟" شفیقہ صاحبہ نے جواب میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جب ایسے لحیم شحیم لوگ سامنے ہوں تو بھلا کوئی اور صحت مند نظر آسکتا ہے"۔ اس برجستہ بات پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ میرا قہقہہ ظاہر ہے سب سے لحیم شحیم تھا۔ شفیقہ صاحبہ اس وقت جرمانے کے طور پر ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کرنے تشریف لائی تھیں۔ اس سے پہلے کہ موصوفہ ہمیں ہوٹل سے نکالے جانے میں کامیاب ہوتیں، بھوپال کے نامور ایڈوکیٹ جناب اختر سعید خان صاحب کا نمائندہ اس پیغام کے ساتھ نازل ہوا کہ ایڈوکیٹ صاحب مع کشمیری مہمانوں کے اپنے دولت خانے پر پچھلے دو گھنٹوں سے ہمارا انتظار فرما رہے ہیں۔ اس اطلاع پر ہمیں یاد آیا کہ پچھلی رات محفل کے اختتام پر ایڈوکیٹ صاحب نے بنفس نفیس ہم سب کو آج شام کی چائے پر اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ اختر سعید خاں صاحب بھوپال کے نہ صرف صفِ اول کے ایڈوکیٹ ہیں بلکہ صفِ اول کے شہری بھی ہیں شاعری بھی کرتے ہیں اور بھوپال کے صفِ اول کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پچھلی رات محفل طنز و مزاح میں بھی موصوف صفِ اول میں نظر آئے تھے بلکہ پروگرام کے اختتام پر مبارکباد دینے والوں میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں بھی موصوف نے اپنی صفِ اول والی خصوصیت کو برقرار رکھا تھا۔ اور اس وقت بھی اپنے صفِ اول کے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے نمائندے کے ہمراہ اپنے فرزند کو بھی بھیجا تھا اور کار بھی بھجوائی تھی۔ صفِ اول کے اس بلاوے پر ہم بھی تذبذب میں مبتلا ہو گئے کہ آخر جائیں تو کدھر جائیں۔ ایسے نازک موقعوں پر صنفِ نازک ہی کام آتی ہے۔ ایڈوکیٹ صاحب کی ہم وطن ہونے کے ناطے محترمہ چونکہ ان کی صفِ اول والی حیثیت سے بخوبی واقف تھیں اس لئے تجویز رکھی کہ ہم لوگ پہلے خاں صاحب کے ہاں

چلتے ہیں پھر وہاں سے موصوف کے گھر چلیں گے۔ شفیقہ فرحت صاحبہ کی طرح ان کی تجویز بھی معقول تھی لہٰذا ہمارا کارواں ایڈوکیٹ صاحب کے دولت خانے کی طرف روانہ ہوا۔

اختر سعید خاں صاحب مع احباب کے دروازے ہی پر ہمارے منتظر تھے۔ اور ظاہر ہے اپنی سابقہ روایات کے مطابق بدستور صف اول میں تھے۔ موصوف کا دولت خانہ اگرچہ قدیم طرز کا تھا لیکن تھا صف اول کا۔ جب مکاں سے لے کر مکین تک سبھی صفِ اول کے ہوں تو پھر دعوت، درجے میں بھلا کس طرح پیچھے رہتی۔ چنانچہ اس دعوت کا اثر یہ ہوا کہ جب تک ہم خاں صاحب کی معیت میں رہے خود کو بھی صف اول کی مخلوق سمجھتے رہے۔

اس دوران میں ناظم صاحب میں دوبارہ اضطرابی آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے یعنی ان کے اعصاب پر ایک بار پھر واپسی کا ٹکٹ سوار ہو گیا تھا لہٰذا شفیقہ فرحت صاحبہ کی دعوت کو "بہ یک جنبش اضطراب" منسوخ کر کے ہمارے بوجھل معدوں پر بھی احسان فرمایا جو پچھلے دو گھنٹوں کے قلیل وقفے میں، دو عدد پُرتکلف عصرانوں کی کڑی آزمائش سے گزرنے کے نتیجے میں جواب دے چکے تھے چنانچہ ہمارے تھکے ہوئے معدوں سے موصوف کے اضطراب کے حق میں یہی دُعا نکلی ؎

اللہ کرے زورِ اضطراب اور زیادہ

چغتائی صاحب نے ناظم صاحب کو مع ان کے اضطراب کے فوراً ان کے اسکوٹر پر بٹھایا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور ہم دونوں نے ایک بار پھر خود کو بھوپال کی گلیوں اور سڑکوں کے حوالے کر دیا، جن کے نہ تو نام معلوم تھے نہ تخلص، پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے یہ اپنی ہی گلیاں ہوں اپنی ہی سڑکیں ویسے بھی مخصوص تہذیب کے "علم بردار" قدیم شہروں کی گلیاں کوچے اور سڑکیں ایک جیسی ہوتی ہیں، اور ان کی یہ آپسی مماثلت اور ہم آہنگی کہیں بھی اجنبیت اور بیگانگی کا احساس ہونے نہیں دیتی۔ ہمیں بھوپال کی سرزمین پر قدم رکھے آج تیسرا دن تھا لیکن پُرانے شہر کی چھوٹی بڑی گلیوں اور سڑکوں نے ہمارے قدموں میں اپنائیت اور یگانگت کی ایسی پُرخلوص زنجیر پہنائی کہ بھوپال میں جنم لینے والے نئے شہر کا رُخ ہی نہیں کرنے دیا۔ ویسے نئے شہر کی ایک سرسری جھلک بھوپال کے حدود میں داخل ہوتے وقت ٹرین میں سے دیکھ چکے تھے۔ حدِ نظر تک اُونچی عمارتوں کے جنگل کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا۔ جسے دیکھ کر سینے میں گھٹن سی محسوس ہوئی تھی۔ کیوں کہ جہانگیری بمبئی میں رہنے کی پاداش میں یوں بھی یہ اُونچی اُونچی دیوہیکل عمارتیں جو بیسوں گھنٹے چھاتی پر سوار رہتی ہیں، بڑی مشکل سے تو سینے پر دھرا یہ بوجھ ہٹتا ہے، تازہ اور خالص ہوا میسر آتی ہے۔ ایسے میں نئے شہروں کے نام پر آبادیوں میں جگہ گھیرتے ان عمارتوں کے جنگل کا رُخ کر کے سینے کا بوجھ سانسوں کی گھٹن اور آنکھوں میں دھواں بڑھانے کی حماقت، عقلمندی کے عین منافی ہوتی، اس لیے ہم نے خود کو قصداً پُرانے شہر تک محدود رکھا۔

کسی بھی شہر کی سیر کا صحیح لُطف راتوں ہی میں آتا ہے۔ دن کے اوقات میں سیر کو نکلیے تو بجائے اس کے کہ آپ شہر کو دیکھیں، شہر آپ کو دیکھنے لگتا ہے۔ راتوں میں البتہ سارے ماحول پر غنودگی چھائی رہتی ہے اس لئے آپ اپنی جاگتی آنکھوں سے شہر کے کوائف کا بغور مطالعہ کر سکتے ہیں۔ شہر بھوپال کی راتیں اگرچہ "پیرس بائی نائیٹ" "ٹوکیو بائی نائیٹ" اور "بمبئی بائی نائیٹ"

کی طرح نہ تو رنگین ہیں نہ ہی سنگین، یعنی یہاں حسن والے، راتوں میں راؤنڈ پر نکل کر سڑکوں کے کنارے سے دعوت نظارہ دیتے نظر نہیں آتے۔ ہم نے کم ازکم پندرہ بیس گلیوں اور آٹھ دس سڑکوں کی خاک چھانی مگر کہیں بھی مطلع "حسن آلود" نظر نہیں آیا بلکہ جہاں جہاں بھی نظر گئی مطلع "مرد آلود" ہی نظر آیا۔ پچھلے تین دنوں میں یہاں پٹھانوں کی بہتات کو دیکھ کر جو اندازہ ہم نے قائم کیا تھا اُس کی توثیق اس مردانہ مطلع نے کردی کہ بھوپال پٹھانوں کا شہر ہے۔

اس گشت کے دوران بھوپال کے کثیر الاشاعت اردو روزنامے "آفتابِ جدید" کے دفتر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا جہاں بھوپال کے مشہور ڈرامہ نویس قمر جمالی صاحب اور مرحوم مُلا رموزی کے صاحبزادے شوکت رموزی سے ملاقات ہوئی یہ دو حضرات اسی اخبار سے وابستہ ہیں۔ آفتابِ جدید کا دفتر بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک اردو روزنامے کے دفتر کو ہونا چاہیئے اور، اردو روزنامے کا دفتر کیسا ہوتا ہے یہ بیان کرنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اخبار ہذا کے ایڈیٹر صاحب سے مدھیہ پردیش خصوصاً بھوپال میں اردو کے موقف اور اُردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کے تعلق سے بڑی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اور اسی گفتگو نے اس بات کی توثیق کردی کہ کسی زمانے میں جس اردو زبان کا طوطی سارے بھوپال میں بولتا تھا اب وہی زبان مسجدوں اور خانقاہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے اس مایوس کُن گفتگو کے باوجود جس وقت ہم دفتر سے واپس لوٹے قطعاً مایوس نہیں تھے کیوں کہ اللہ جس زبان کا والی ہو اُسے کوئی نہیں مٹا سکتا، ایسی زبان "طاقِ نسیاں" ہو کر بھی مقدس زبان کی حیثیت سے زندہ رہتی ہے —!

اگلی صبح حسب پروگرام بھوپال سے روانگی عمل میں آنے والی تھی' لہٰذا صبح اول وقت بیدار ہو گئے اور پھر جھٹ پٹ تیار ہو کر ناشتہ کیا، اتنے میں انصاری صاحب بھی کار لے کر پہنچ گئے۔ ہم بھوپال کی سڑکوں گلیوں کوچوں در و دیوار پر حسرت کی نظر کرتے ہوئے بالآخر اسٹیشن پہنچے مصافحہ و معانقہ کے بعد انصاری صاحب کو رخصت کیا اور پھر ہم ریلوے پلیٹ فارم کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ ٹرین ہندوستانی روایت کے مطابق حسبِ معمول لیٹ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور حسبِ معمول لیٹ ہی روانہ ہوئی۔ ہم دونوں اس وقت تک دروازے میں ٹنگے رہے جب تک کہ تاج المساجد کے بلند و بالا مینار نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ ٹرین کی بتدریج بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ بالآخر بھوپال شہر بہت پیچھے رہ گیا۔ تاہم دل کے ہندوستان میں جو شہر بھوپال تازہ تازہ آباد ہوا تھا، وہ بدستور ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ لیکن یہ وہ بھوپال نہیں تھا جسے ہم سُنی سُنائی بنیادوں پر صرف قوالوں اور قوالیوں کا شہر سمجھتے تھے بلکہ یہ بھوپال، مسجدوں ——— ، کالجوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا شہر تھا۔ چار روز قبل جس بھوپال کو دیکھنے کی تمنا لے کر آتے ہوئے ذہن میں اُس کا ایک [illegible] تصور تھا وہ حافظے کے جزیرے میں ایک [illegible] سا تھا اب اس کی جگہ اپنا ہو بھوپال کے پیار خلوص اور اپنائیت کے بے شمار قمقمے روشن تھے جن سے یادوں کا گزر گاہ ہی دور دور تک سنہرا سنہرا اُجالا اُجالا ہوا تھا —!!

●●

برق آشیانوی

برق و شرر
[مستقل کالم]

آوارہ گدھے

گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے لیکن ہر وہ جاندار جس کے سر پہ سینگ نہیں ہوتے گدھا نہیں ہوتا ویسے معنوی اعتبار سے اِن دونوں میں بعض وقت کوئی فرق نہیں ہوتا گدھے ہندوستان میں بھی ہوتے ہیں اور پاکستان میں بھی۔ لیکن ہمیں یہ روح فرسا خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا کہ پاکستان میں ایک سو آوارہ گدھوں کو گرفتار کرلیا گیا اس خبر کا وہ حصّہ تو انتہائی المناک ہے کہ ایک "کلرک" نے اِن سو آوارہ گرفتار شدہ گدھوں کو اپنی شخصی ضمانت دے کر رہا کروایا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن سو آوارہ گدھوں کو رہا کر کے آیا کلرک کو ضمانت کے طور پر اپنی تحویل میں رکھ لیا گیا یا پھر اُسے بھی آوارہ پھرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ آوارہ گدھے تو ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں جو خدمت تو دھوبی یا کمہار کی کرتے ہیں لیکن چرتے پھرتے ہیں گھوڑوں پر یا اگر موقع مل گیا تو کسی کے باغ میں یا زراعتی زرخیز زمین میں۔ اِن آوارہ گدھوں پر حکومتِ ہند کو اب تک تو کوئی اعتراض نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی گدھا آوارگی کے الزام میں گرفتار ہوا جس سے ثابت ہوا کہ ہماری حکومت گدھوں کے تعلق سے بہت فراخ دل واقع ہوئی ہے یہ سُن کر ملا جی البیرودی نے اپنی عالمانہ شان کے ساتھ فرمایا۔ "میاں بات کچھ اور ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دیس میں گدھوں کی کئی قسمیں ہیں بلکہ ہزار ہا قسمیں ہیں اگر ان تمام قسم کے گدھوں کو گرفتار کر کے کسی غیر آباد مقام پر چھوڑ دیا جائے تو ایک دن یہ تمام گدھے اپنی ایک علٰحدہ ریاست کا مطالبہ کریں گے۔ پھر جب اُن کو حکومت اپنی عملداری میں رکھنا چاہے گی تو وہ گوریلا وار (GORILLA WAR) شروع کردیں گے۔ اس صورتِ حال کا جائزہ لے کر ترقی یافتہ ممالک اُن ترقی پذیر ممالک کو خفیہ طور پر اسلحہ اور اشیائے خوردنی کے ذخائر بھیجا کر ترقی پذیر ممالک کا تماشہ دیکھیں گے۔ اِن تمام خدشوں کے تحت ملک کے ہر قسم کے گدھوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے اور اُن کی آوارگی پر کوئی (STEP) نہیں لیا جاتا۔ البتہ اُن گدھوں کو نہیں معاف کیا جاتا جو سڑکوں پر... [illegible] کہ گدھوں کی نسل سے ہوں اور صنفِ نازک سے چھیڑ چھاڑ کے...

میں خاطر تواضع کے ساتھ رکھنے کے بعد پھر آوارگی کے لئے رہا کر دیا جاتا ہے اور تاکید کر دی جاتی ہے کہ آئندہ چھیڑ چھاڑ سے توبہ کرلیں۔ اس خاص قسم کے آوارہ گدھوں کے علاوہ کئی اور قسم کے گدھے موجود ہیں جو آوارہ اور بے لگام پھرتے ہیں لیکن انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ ہم نے ایک پاکستانی رشتہ دار سے سُنا کہ پاکستان کے گدھے بڑی بڑی خدمات انجام دیتے ہیں اور ایک ایک گدھا پانچ یا دس ہزار روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں گدھے دھوبی یا کمہار کی وفادارانہ خدمات انجام دیتے ہیں لیکن اتنی بھاری قیمت پر نہیں فروخت ہوتے۔ جب سے لاریوں نے لادنے کی خدمات اپنے ذمّہ لے لی ہیں مثلاً مٹی اور کھاد کو بھی لاری پر لاد کر لیجایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اب گدھوں کو کون پوچھے گا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لادے جانے والے گدھوں کی نسل میں کمی واقع ہوگئی ہے بالکل اسی طرح جیسے جنگلی جانوروں کی جنگلوں میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ اور محکمہ جنگلات بے حد پریشان ہے کہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب کہ جنگلی جانوروں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہمارے خیال میں اس خصوص میں پریشانی کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جنگلی جانوروں میں جتنی "خوبیاں" تھیں وہ اب انسانوں میں آگئی ہیں اور آج کا انسان جنگلی جانوروں کی صفات سے اس حد تک متصف ہوگیا ہے کہ جنگلی جانوروں کے ناپید ہو جانے کا غم نہیں کرنا چاہیئے رہا یہ سوال کہ زو (zoo) میں رکھنے کے لئے جنگلی جانوروں کی ضرورت ہے تو عرض ہے کہ زو (zoo) میں رکھنے کے لئے بھی ایسے ایسے انسان اب موجود ہیں جو جنگلی جانوروں سے زیادہ عجیب و غریب ہیں۔

بات گدھوں کی ہو رہی تھی اور ہم جنگلی جانوروں تک پہنچ گئے اس لئے پھر لوٹ کر گدھوں کی محفل میں آتے ہیں اس بات پر قاری کو ہماری شخصیت پر کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرنا چاہیئے۔ ویسے بہ قول ملا حجر الیھود ادیب اور شاعر بن کر ہم نے گدھا پن" نہیں تو اور کیا، کیا ہے۔ مفت کی محنت کر کے گھر کا کھا کر اُن دھوبیوں کی خدمت کرنا جو ایڈیٹروں کے نام سے مشہور ہیں گدھا پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اس خصوص میں دھوبی کے گدھے اور ادیب یا شاعر میں کونسا نمایاں فرق ہے۔ ملا حجر الیھود بعض وقت ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ہماری زبان بند ہو جاتی ہے۔

بہر حال پاکستان کے آوارہ گدھوں کو گرفتار کرنے کے بعد ایک "کلرک" کو اُن گدھوں کی ضمانت دے کر رہا کروانا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ کسی شاعر یا ادیب کو یہ فریضہ انجام دینا چاہیئے تھا۔ اس پر بھی ملا حجر الیھود نے اپنی عالمانہ رائے دی کہ میاں شاعر اور ادیب خود بے چارے مفلس ہوتے ہیں وہ گدھوں کی ضمانت کیا دے سکیں گے جب کہ خود اُن کو اپنا پیٹ پالنے کی فکر میں آوارہ پھرنا پڑتا ہے۔ اور جب "روٹی" کے عنوان پر کوئی دردناک نظم لکھتے ہیں تو خود اُن کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور کسی گدھے کو اُن کی ضمانت دے کر رہا کروانا پڑتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے آوارہ گدھوں نے کس قسم کی آوارگی کی تھی۔ کیوں کہ آوارگی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ قسم ہے جو آوارگی کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں تو انھیں بہ قول پاگل عادل آبادی ؏۔

بل دیتے۔

آوارگی کی ایک قسم وہ ہے کہ بچپن ہی سے گھر سے کتابیں لے کر نکلتے ہیں اور اُن کو بیچ کر مارننگ شو دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ مارننگ شو صرف ان ہی کے لئے مخصوص ہے۔ ورنہ تاجر پیشہ ملازم پیشہ زراعت پیشہ یا دیگر روز گار میں مصروف بالغ آدمی تو مارننگ شو دیکھ نہیں سکتے کیوں کہ یہ اُن کے روز گار کا وقت ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ قسم کی آوارگی جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ہڑتالوں اور ایجی ٹیشنوں کی صورت اختیار کرلیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بالآخر لیڈری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں نہ کوئی تعلیمی سند کی ضرورت ہوتی ہے نہ قابلیت کی۔

آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کے آوارہ گدھوں نے غالباً فوجی حکومت کے خلاف کوئی ایسی حرکت کی ہوگی جس پر آوارگی کا الزام عاید ہوتا ہو۔ چنانچہ انھیں گرفتار کرلیا گیا اور ایک کلرک چونکہ حکومت کا وفادار ہوتا ہے اس نے ان سو آوارہ گدھوں کو سیدھا راستہ بتا کر انھیں رہا کروا لیا ہوگا۔ □□

نامور مزاح نگار
یوسف ناظمؔ
کے مضامین کے مجموعے
البتہ
قیمت: دس روپے
فقط
قیمت: آٹھ روپے
بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہیں

نامور مزاح نگار
مجتبیٰ حسینؔ
کے مضامین کے مجموعے
تکلف برطرف
قیمت: ۱۲ روپے
بہرحال
دس روپے
بالآخر
۱۲ روپے
آدمی نامہ (خاکے)
قیمت: ۹ روپے
بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

نعیم زبیری

توند کی بھی کوئی حد ہوتی ہے

ایک زمانہ تھا کہ گنجا سر اور توند، دبدبہ اور وقار کی قدرتی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ آج کی طرح توند کی یہ گت نہیں بنی تھی کہ جسے دیکھو ایک توند لگائے پھر رہا ہے۔ غربا د مساکین اپنی حد میں رہتے تھے اور پیٹ پر حسب استطاعت چھوٹے بڑے پتھر باندھنے کی گنجائش رکھتے تھے۔ اب تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بھلے ہی آپ کا سارا جسم نگوڑ نڈی ہو۔ لیکن بالکل درمیان میں ایک چھوٹی سی توند اسپیڈ بریکر کی طرح اُگی ہوئی ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک اینٹی توند جہاد چل پڑا ہے۔ لوگ مختلف ورزشوں اور ڈائٹنگ کے پروگراموں میں مبتلا ہیں۔ لیکن توند پھر بھی ہار مانتی نظر نہیں آتی۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ غالباً یہ بھی انہی تجربات کا ایک نتیجہ ہے۔ ورنہ بیٹے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ باپ کے جیتے جی توند اُگالے۔ لیکن اب تو نو دس برس کے بچے بھی دن دھاڑے توندیں لئے گھوم پھر رہے ہیں۔ گزرے ہوئے دنوں میں توند کے ساتھ گنجے سر کی زبردست مانگ تھی۔ اس COMBINATION کو نہایت شاذ اور قابل عزت سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں چیزوں کے لئے آمدنی کی ایک حد مقرر تھی مثلاً مڈل انکم گروپ کے لوگوں کو گنجا سر مخصوص حالات میں کبھی کبھار مل بھی جاتا تھا لیکن گنجے سر کے ساتھ توند تو صرف ہائر انکم گروپ ہی کو نصیب ہوتی تھی۔ لیکن آج جہاں ساری قدیم روایات اور قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ اس زرین قدرتی اصول کو بھی فراموش کر دیا گیا ہے۔

پولیس والوں اور فوجیوں کے لئے تو توند کے استعمال کی قطعی ممانعت تھی لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ جگہ جگہ توندیل پولیس والے اور فوجی تک نظر آنے لگے ہیں۔ ابھی کل ہی میں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ ایک نہایت وسیع و عریض کانسٹبل صاحب جن کا بیلٹ ان کی گول توند کے قطب جنوبی تک پہنچا ہوا تھا۔ بجھی ہوئی ٹریفک لائٹس سے ٹیکے ہوئے مونگ پھلی کی ایک کثیر مقدار اپنے پیٹ کی گہرائیوں میں دبے ہوئے عظیم معدے میں بھیجنے میں مصروف تھے۔ اور ان کا نہایت لمبا اور چکنا گنجا سر کچھ ایسا چمکا ہوا تھا کہ سورج کی شعاعیں منعکس ہو کے "ٹریفک" کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا انھیں مشورہ دیا جائے کہ وہ آدھے

سر پر کالا رنگ کروالیں تاکہ ٹریفک میں خلل نہ پڑے۔ لیکن پھر اس لئے ہمت نہ ہوئی کہ کہیں سرکاری فرائض انجام دہی میں خلل کے سلسلے میں گرفتار نہ کر لیا جاؤں ہو سکتا ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ یہ اچانک مخالف توند دورہ مجھ اس شدت سے کیوں پڑ گیا ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ آپ ہی کی طرح میں بھی توند کو جو ایک قطعی شخصی معاملہ سمجھتا کیوں کہ ایک حد تک خود بھی توند سے عاری نہیں ہوں اور اس میں دخل اندازی کو مناسب نہیں گردانتا لیکن توند کی بھی ایک حد ہوتی ہے کبھی کبھی جب توند اتنی کثیر ہو کہ دوسروں کی شہری آزادیوں میں خلل ہونے تو پھر ظاہر ہے کہ احتجاج کرنا ہی پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں یہ حادثہ ہوا کہ مجھے ایک اسٹیشن پر اترنا تھا جہاں ٹرین صرف دو منٹ کے لئے ٹھہرتی ہے۔ میں سوٹ کیس اُٹھائے تڑپتا رہا۔ اور ایک نہایت ہی وحشتناک توند باتھ روم میں سے نکلتے ہوئے دروازہ میں کچھ یوں اٹکی کہ اسٹیشن گزر گیا۔ □

شگوفہ کے دو یادگار خصوصی نمبر

ڈرامہ نمبر

قیمت: ۲۵ روپے (مجلد)

کنھیا لال کپور نمبر

قیمت: ۱۰ روپے (مجلد)

خرافات

(مراسلے)

برادرم سلام مسنون :

ستمبر کا ستم ڈھاتا ہوا شگوفہ ملا۔ ہندوستانی مزاح نمبر کی اشاعت میں تاخیر سے اس کی وسعت گیرائی اور گہرائی مظہر ہے۔ یقیناً یہ نمبر طالبِ مزاح، تنقیدِ مزاح اور تحقیقِ مزاح کے لیے انسائیکلوپیڈیا کا کام دے گا۔ اور یہ نہ صرف تاریخ ساز بلکہ طنز ساز بھی ہوگا۔

رؤف خوشتر
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج
پوسٹ بکس ۹۔ بیدر ۵۸۵۴۰۱

● ستمبر کے شمارے میں بیلن نظام آبادی کی مزاحیہ غزل نظروں سے گزری۔ یوں تو بیلن نظام آبادی کی کئی غزلوں کو میں نے پڑھا ہے اور بے حد محظوظ بھی ہوا۔ اس بار بیلن کے کلام کا رنگ کچھ اور ہے۔ میرے خیال میں بیلن کو ہندوستان بھر میں پہلی مرتبہ "شگوفہ" کے ذریعہ آپ ہی نے روشناس کرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیلن کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور یہ سب آپ کی بدولت ہے۔ ہر چہار طرف ان دنوں بیلن کے کیسٹ شوق سے سنے جا رہے ہیں۔ ستمبر کے تازہ شمارے کو کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور آپ کو پہلی مرتبہ دلی مبارکباد دے رہا ہوں

گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ **احمد عبدالقادر**
سکریٹری اردو سوسائٹی نظام آباد

● اخبارات میں حیدرآباد کے بارے میں پڑھ پڑھ کر سخت الجھن ہو رہی ہے خدا کرے آپ سب تمام احباب بالکل خیریت سے ہوں۔ حیدرآباد کا بچا اب کچھ ہے۔ بڑی تاریخ تہذیب، ثقافت، ادب سب سے بڑا ستم ہے۔ خدا اسے آباد رکھے ــــ میں بیمار ہوں۔ بلڈ پریشر میں مبتلا ہوں۔ نہ کہیں آنا ہے نہ جانا ہے۔ جب کچھ افاقہ ہوتا ہے تو کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ آپ کا اپنا

احمد جمال پاشا

● آداب: ماہنامہ "شگوفہ" وصول ہوا۔ تمام پرچہ ایک ہی وقت میں پڑھ ڈالا۔ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ تمام مزاحیہ مضامین، غزلیں اور نظمیں سبھی اپنی اپنی جگہ بہترین ہیں۔

اسعد احمد مجددی لکچرار، یادگیر

● مکرمی! تسلیمات

ہندوستان میں "شگوفہ" ہی نہایت قہقہہ انگیز واحد رسالہ ہے۔ کچھ مہینوں سے پرویز یداللہ مہدی کے سفر نامے "حیدرآباد۔ بھوپال۔ حیدرآباد" نے شگوفہ میں چار چاند لگا دیئے ہیں اس کے لیے آپ میری اور اہلیانِ آکولہ کی جانب سے مبارکباد قبول کیجئے۔

نعیم احمد، آکولہ

قطعے

صابر بہاری
رانچی

کیا عرض کروں دوستو، کیا حال بتاؤں
سوچا نہ تھا جس کو تھا وہ نقشہ مرے آگے
پکچر کے لیے جب میں ٹکٹ لینے بڑھا تو
لائن میں کھڑے تھے وہاں ابا مرے آگے

لیپی بدلنے والوں کی تحریک جب چلی
ہندی کی آشتی کی نکالی گئی سبیل
اک ہندی دوست اردو نوازی میں بڑھ گئے
میرے جلیل بھائی کو کہنے لگے ذلیل

پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔۔۔ (اداریہ)

زندہ دلان حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈمی کے نامور فن کار و شاعر حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ اِن دنوں لندن اور امریکہ میں مزاح کا جادو جگا رہے ہیں۔ اور اپنے منفرد فن کے ذریعہ کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے پروگرام لندن کے علاوہ امریکہ کے مختلف شہروں میں کامیابی کے ساتھ منعقد ہو رہے ہیں۔

حمایت اور مصطفیٰ کو اگست کے آخری ہفتہ میں لندن بُلایا گیا تھا جہاں "شام ڈھلے سویرا" ڈرامے میں دونوں نے حصّہ لیا۔ لندن میں ان دونوں نے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ لندن کے اردو داں طبقوں میں انھیں بے حد سراہا گیا۔ زندہ دلان کے ان سفیروں نے برصغیر کے نامور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کو زندہ دلانِ حیدرآباد کی تقاریب میں شرکت کی بھی دعوت دی۔ جسے موصوف نے قبول کر لیا ہے۔ امید ہے کہ مارچ / اپریل ۸۴ء میں منعقد ہونے والی تقریبات میں شرکت کے لیے مشتاق احمد یوسفی حیدرآباد آسکیں گے۔

حمایت و مصطفیٰ، شکاگو، سینٹ لوئی، نیوجرسی اور دوسرے شہروں کے کلچرل پروگراموں اور مشاعروں میں حصّہ لینے کے بعد دوبارہ لندن جائیں گے جہاں ان کے پروگرام دوبارہ پیش ہونے والے ہیں۔

● زندہ دلان حیدرآباد کے صدر جناب نریندر لوتھر کو ان کی ادبی خدمات کے عوض بہار اردو اکیڈمی نے تین ہزار روپے کے نقد انعام کا اعلان کیا ہے ــــ بہار اردو اکیڈمی کے اس فیصلہ کا ہم پُرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ جناب نریندر لوتھر کو دیا گیا یہ انعام انفرادی اعزاز بھی ہے اور صنفِ طنز و مزاح کے لیے باعثِ افتخار بھی ــــ ہم جناب نریندر لوتھر کی خدمت میں دِلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

● حیدرآباد میں پھر فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فسادات کی روک تھام میں پولیس ناکام ہو چکی ہے۔ ہم دُنیا بھر کے ممالک میں رونما ہونے والے واقعات پر فوری ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ ساری دنیا کی لیڈری کا ہمیں شوق ہے ہم نے اتنی ترقی کر لی کہ ہر قسم کے زہر کا اثر زائل کرنے کی دوا بنالی ہے لیکن ہمارے جسموں میں سرایت کئے ہوئے فرقہ پرستی کے زہر کو ہم نہیں مار سکتے ــــ ؟ شہر میں عید و تہوار آتے ہیں تو خوشیوں کی بجائے خوف طاری ہو جاتا ہے کہ یہ دن سکون سے گزر جائیں۔ کیا ہمیں اپنی خوشیاں بھی عزیز نہیں رہیں ؟

No. 15822/68
Vol 16 Copy 10
SHUGOOFA Hyderabad-1
Postal Regd. No. H. HD 6
October 1983 Phone : 57716

دن بھر کی
خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دہن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ:

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۱۶ ، شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر :
سیّد مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت :
راجندر سنگھ بیدی
خواجہ عبد الغفور
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

منیجر : سمیع جلیل

ٹائٹل :
شعیب

قیمت فی پرچہ : ۳ روپے
زرِ سالانہ : ۳۰ روپے -
بیرونِ ہند سے : ۹۰ روپے

کتابت : محمود سلیم - عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، چارکمان حیدرآباد ۲۔

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون : 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۔ ۱

ڈسٹری بیوٹرس برائے :

۱۔ موہن میکن بریوریز
۲۔ اجنتہ ڈیری آگرہ
۳۔ ہارکو، سری نگر
۴۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز تریچور
۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی
۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۹۔ چمپئین وہائٹ روش
۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اُس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے ـــــ

تیار کنندگان :

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۲

اِس تھیلی کے چٹے بٹّے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (افسانہ و ڈرامہ)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (حیدرآباد)

* * *

چوُرن (نظمیں)

مسیح انجم کے

مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ

چنانچہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے

تیرہ باغ و بہار و شگفتہ مضامین، خوبصورت سہ رنگی سرورق، مجلد:

قیمت -/12 بارہ روپے

بتوسط "شگوفہ"

شگوفہ

ہندوستانی مزاح نمبر

جنوری ۱۹۸۴ء

مہمان مدیر : ———————— یوسف ناظم

اُردو ۔ انگریزی ۔ ہندی ۔ بنگالی ۔ تمل ۔ تلگو ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ مراٹھی ۔ اُڑیا ۔
ملیالم ۔ سندھی ۔ کنڑی ۔ میتھلی اور راجستھانی زبانوں کے مزاحیہ نثری ادب
کا **جائزہ** اور منتخب مضامین کے تراجم ۔ اُردو کے مصنفین کے خود نوشت
خاکے اور مضامین ۔ ملک کے تنقید نگاروں کی آرا اور **انٹرویو**
اُردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل **بلوگرافی** اور مقالہ نگاروں کی **تصاویر** کے ساتھ

جنوری ۱۹۸۴ء

میں شایع ہوگا

شرکاء :

پروفیسر کلیم الدین احمد، ملک راج آنند ـــــ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وحید اختر، ظ۔ انصاری، باقر مہدی ـــــ ڈاکٹر ایتا پانیکر ـــــ نثار احمد فاروقی رشید حسن خاں۔ پروفیسر رام پنجوانی۔ شمیم حنفی۔ عبد الستار دلوی۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کرامت علی کرامت۔ عمیق حنفی۔ مظفر حنفی۔ ابن فرید۔ حامد حسن۔ سکینا چودھری۔ پروفیسر سنتوک راز۔ پروفیسر شیام سندر مشرا۔ محمد زماں آزردہ۔ رتی لال شاہین۔ پروفیسر عبد المغنی حمید الماس۔ عزیز تمنائی۔ اسمٰعیل آذر۔ سلیمان اطہر جاوید۔ بھارت چند کھنہ۔ خواجہ عبد الغفور دریندر لوتھر۔ مناظر عاشق ہرگانوی۔ فکر تونسوی۔ مجتبیٰ حسین۔ احمد جلال پاشا۔ شفیقہ فرحت ـــ رشید قریشی۔ وجاہت علی سندیلوی۔ مسیح انجم۔ پروفیسر راما راؤ۔ اعجاز علی ارشد۔ پرویز ید اللہ مہدی

ضخامت : تقریباً ۲۵۰ صفحات	قیمت : ۲۰ روپے، مجلد ۲۵ روپے

اپنی کاپی آج ہی محفوظ فرمایئے

سالانہ خریداروں کے لیے دس روپے۔ پانچ روپے زائد بھجوانے کی صورت میں یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (پٹنہ)

آتی ہے اُردو زباں...

میری تقدیر تو مجھ سے بہت پہلے ہی روٹھ چکی تھی مگر اس کا احساس مجھے اسی دن ہوا جب میری بار بار کی درخواست کے باوجود امتحانات کے کنٹرولر نے مجھے انٹرمیڈیٹ کا اکزامینر بنانے سے صاف انکار کر دیا۔ ٹیچروں کی مالی حالت ویسے تو سال بھر خراب رہتی ہے لیکن میں ان دنوں کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ شادی کے بعد ایک تو لڑکیوں کے ٹیوشن ملنے ہی بند ہو گئے تھے۔ دوسرے جو بچے کچھے تھے وہ بیوی نے زبردستی چھڑوا دیئے تھے۔ رہے لڑکے تو انھیں پڑھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی ٹیوشن پڑھنے کی فرصت کہاں سے ملے۔ بہرحال مجھے اس وقت آمدنی کے کسی نہ کسی ذریعہ کی تلاش تھی اور مختلف دروازوں پر قسمت آزمائی کے بعد میں نے اس دروازے پر صدا لگائی لیکن منت سماجت کے باوجود میں کنٹرولر کے انکار کو اقرار میں نہ تبدیل کرا سکا۔ آخر نا اُمیدی کے سمندر میں ڈوبنے سے قبل میں نے اُمید کے ایک تنکے یعنی متعلقہ کلرک کا سہارا لیا۔ اس نے میری بات سنتے ہی کہا۔

" کنٹرولر کے ناراض ہونے کی وجہ تو میں بتا سکتا ہوں لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے اور ہر چیز کا ریٹ دوگنا ہو گیا ہے۔ اس لئے میں بھی "..... میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس کا مدعا نہ صرف سمجھ لیا بلکہ پورا بھی کر دیا۔ اور اس نے انتہائی رازداری کے ساتھ مجھے بتایا۔

" پچھلی بار آپ نے کنٹرولر صاحب کے لڑکے کو صرف ۴۰ نمبر دیئے تھے جس کے سبب اس کا سکنڈ کلاس آ گیا اور اس کو ملنے والے جہیز کی رقم میں بھاری کمی ہو گئی۔ اس لئے " لیکن اس نے صرف پچاس نمبر کے تو سوالات ہی حل کئے تھے "

میں نے کلرک کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

کلرک کچھ جھنجھلا سا گیا کہنے لگا

" آپ پڑھے لکھے ہو کر بھی ایسی بات کرتے ہیں۔ ارے نمبر آدمی دیکھ کر دیا جاتا ہے کہ کاپی دیکھ کر!

وقت پڑنے پر تو نہ جانے کس کو کیا کیا کہنا پڑتا ہے وہ تو پھر بھی کلرک تھا۔ اس لئے میں نے اس کی ڈانٹ سنتے ہی سراپا نیازمندی

کے ساتھ پوچھا" لیکن اب کرنا کیا ہوگا۔ آپ ہی کوئی صورت نکالئے"

کلرک نے پہلے تو اپنے دانت نکالے پھر کہنے لگا۔

"لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ صورت تو میں نکال سکتا ہوں لیکن . . . میں نے اسے آگے بولنے کا موقع دیئے بغیر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ دل ہی دل میں میری معاملہ شناسی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"بات ایسی ہے کہ اس بار کنٹرولر صاحب کی بیٹی امتحان دے رہی ہے اگر آپ اسے فرسٹ ڈیویژن میں پاس کرانے کا ذمہ لیں تو آپ کا کام آسانی سے ہوسکتا ہے"۔ میں کلرک کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ ویسے قائل ہونے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا کیوں کہ آخر مجھے اپائنٹمنٹ لیٹر بھی تو اسی سے لینا تھا۔ بہرحال میں نے کلرک کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے دوسرے ہی دن کنٹرولر سے گھر پر ملاقات کی اور اپنے بال بچوں کی قسمیں دے کر انھیں یہ یقین دلایا کہ اس بار میرے کوپیاں دیکھنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ میں اپنی پچھلی غلطیوں کا کفارہ ادا کرسکوں۔ باتیں تو بہت ساری ہوئیں مگر قصہ مختصر یہ ہے کہ اگلے ہی دن مجھے تقرری کا پروانہ مل گیا۔ متعلقہ کلرک نے اہم رول نمبروں کی ایک فہرست بھی میرے حوالے کی اور پھر مسکراتے ہوئے مجھے "گڈ بائی" کہا۔ ریزلٹ جلد شائع کرنے کے خیال سے اس بار اجتماعی طور پر کوپیاں دیکھی جارہی تھیں۔ ایک بڑے سے ہال میں مختلف سائز کی میزیں لگی ہوئی تھیں اور ہر مضمون کے لئے ایک ٹیبل مخصوص تھا۔ مگر اکثر ایسے حضرات اپنی کوپیاں دیکھنے میں کم اور دوسروں کے ٹیبل پر جانے میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ خیر یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر سامنے آگئی۔ میں نے اپنے ٹیبل پر پہنچتے ہی سب سے پہلے تو ڈائری میں سے وہ سفارشی خطوط نکالے جو مختلف دوستوں نے مجھے لکھے تھے۔ اس سے یہ نہ سمجھئے کہ صرف میرے دوست ہی سفارشی خطوط لکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم بھی ہوں پانچویں سواروں میں اور یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے۔ ہاں تو ان خطوط میں لکھے ہوئے رول نمبروں کی ایک فہرست تیار کرنے کے بعد (واضح ہو کہ یہ فہرست فل اسکیپ سائز کے تقریباً دو صفحات پر مشتمل تھی) میں نے ایک کوپی کے اوراق الٹے۔ سوال تھا، میر انیس کی نظم "اولاد" کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھئے۔ جواب سنئے۔

"اولاد ہی انسان کے آنکھ کا روشنی ہے ضعیفی کے روز ماں کو اپنے جوان فرزند پر قوت ملتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا اولاد بڑا سے بڑا بنے گا اور میرا نام روشن کرے گا۔ اولاد دنیا اور آخرت دونوں میں کام آنے والا چیز ہے۔ تب ہی ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

تجھے سورج کہوں کہ چندا یا دیپ کہوں یا تارا
میرا نام کرے گا روشن جگ میں میرا راج دلارا

میں نے جلدی سے ورق پلٹا۔ سوال تھا، خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیئے۔ جواب کچھ اس طرح تھا۔ "حضرت خواجہ کا دربار بہت بڑا ہے۔ یہاں ہر ضرورت کے لئے ضرورت مندوں کو جانا پڑتا ہے، اور اپنی اپنی ضرورت کے لئے بہت ضروری ہے کہ ضرورت کے وقت بھی ضرورت کے لئے خواجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اپنے لئے بھی ضرورت ہے اور دوسروں کی بھی ضرورت ہے اور خواجہ

کی بھی ضرورت اور ہر ضرورت کے وقت میں ضرورت پڑتی ہے اور ضرورت ایسی چیز ہے کہ ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت ۔" میری طبیعت جھنجھلا گئی۔ جی میں تو آیا کہ کوپی پر لکھ دوں آخر آپ کو اردو پڑھنے ہی کی کیا ضرورت ہے ؟ لیکن پھر سوچا کہ اردو ایسٹری زبان ہے اور سرکاری زبان گویا سرکار کی زبان ہوتی ہے اس لئے دل کڑا کر کے پچاس فیصد نمبر دے دیئے اور دوسری کوپی اُٹھائی پہلے ہی صفحے پر درج تھا۔

"جناب اکزامینر صاحب اگر آپ نے اس بار بھی مجھے فیل کردیا تو میری شادی نہ ہوسکے گی اور میں جان دے دوں گا اور ..."

میں نے گھبرا کر دوسرا صفحہ پلٹا۔ میر انیس کی نظم 'اولاد' کا خلاصہ اس طرح شروع ہوا تھا۔

" اولاد کی بڑی اہمیت ہے۔ شادی انسان اس لئے کرتا ہے کہ وہ اولاد کو پاسکے مگر جب وہ نہیں پا سکتے تو ان کی زندگی میں ایک طرح کا دراڑ سا پڑ جاتا ہے۔ حالاں کہ لوگ بیوی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان سے یہ کام نہیں ہوتا ہے اور آخر میں طلاق تک کا معاملہ آجاتا ہے" آگے پڑھنا بے کار تھا۔ میں نے اس کاپی میں بھی پچاس فیصد نمبر دے دیئے اور تیسری کاپی اٹھائی۔ "میرا پسندیدہ شاعر" کے تحت غالب کی شاعری پر مضمون لکھا گیا تھا۔ شروعات اس طرح ہوئی تھی۔

"میرے پسندیدہ شاعر غالب ہیں جو اس وقت دُنیا میں نہیں ہیں۔ غالب کی شاعری مجھے اس لئے پسند ہے کہ غالب آم بہت کھاتے تھے اور مجھے بھی آم بہت پسند ہے۔ غالب کی شادی صرف سترہ سال میں ہوگئی تھی مگر انھیں بچپن سے ہی کپڑے چبانے کی عادت تھی۔ لوگ جب روٹیاں کھایا کرتے تھے تو غالب کپڑے چبایا کرتے تھے۔ میرے پروفیسر صاحب نے بتایا ہے کہ اسی لئے غالب کا گریبان ہمیشہ تار تار رہتا تھا۔"

میں نے کچھ آگے نظر دوڑائی۔ لکھا تھا" غالب کے ہر شعر میں دو معنی نکلتے ہیں اس لئے اس کے پڑھنے سے ہماری اردو بہت اچھی ہوگئی ہے۔ غالب کے شعر کی نقل ساری دنیا میں لوگ کرتے ہیں۔" میں نے جلدی جلدی کئی صفحات الٹ دیئے۔ ایک صفحے پر کچھ اشعار کی تشریح کی گئی تھی۔ پہلا شعر تھا ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ؎ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

صاحبزادے نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا :-

یہ نظم علامہ اقبال کی ہے۔ وہ وکالت کر کے خوب روپیہ کماتے تھے اور سائیڈ میں شعر و شاعری بھی کرتے تھے کہتے ہیں کہ اے دل تجھے کیا ہوگیا ہے جو تو بے کار نظر آرہا ہے۔ آخر تیری دوا کیا ہے۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب اقبال کو اُن کی زندگی میں نہیں ملا ورنہ وہ ہارٹ اٹیک سے نہ مرتے۔ اگر دل میں درد ہو تو ڈاکٹر رحمان کو دکھانا چاہئے جو ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں"

میں نے نیچے نظر دوڑائی، انیس کا ایک شعر درج تھا

گھر کا ہر ایک چراغ بجھا کر امام دین ؎ اسلام کی نمود سحر دیکھتے رہے

اس شعر کی تشریح اس طرح کی گئی تھی " یہ نظم امام دین کی ہے۔ شاعر نے گھر کے چراغ کو بجھانے کے لئے اپنے آپ کو چراغ بنایا ہے

انھوں نے اسلام کی بربادی پر لکھا ہے کہ مسلمان اپنے فعل ہی سے برباد ہوتا رہا ہے نہیں تو اسلام کا یہ بربادی نہیں ہوتا۔"
اب میری ہمت جواب دینے لگی تھی مگر ابھی ویلنس کالج کا پورا بنڈل باقی تھا۔ میں نے اسی طرف توجہ کی اور ایک کاپی اٹھائی۔ محترمہ نے "ہمارے دو قومی تہوار" پر مضمون لکھا تھا۔ ابتداء کچھ اس طرح تھی۔

"ہمارے دو قومی تہوار ہیں۔ یہ تہوار عید اور رمضان ہیں۔ یہ تہوار بہت ہی پاک اور صاف ہیں۔ دل تو بہت چاہتا ہے لیکن روزہ رکھنے کے بعد ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ عید میں سینما دیکھنے کو ملتا ہے۔ عید کے چاند کے انتظار میں لوگ کوٹھے پر کھڑے رہتے ہیں۔ ایک دن میں بھی کوٹھے پر کھڑی تھی کہ نیچے سے کسی نے کہا۔ لو چاند دکھائی دے گیا، وہ کوٹے پر موجود ہے ۔ میں نے ممی کی نظر بچا کر اس لفنگے کو دیکھنا چاہا مگر وہ نظر نہ آیا۔"

آگے چل کر ذہنی ترنگوں نے اس مضمون میں انشائیہ کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ لکھا تھا۔

" عید میں لوگ ایک دوسرے کے بچوں کو پیروی یعنی روپئے دیتے ہیں۔ روپئے کا خرچ تو ہر تہوار میں ہے۔ جیسے کہ ہمارا ایک تہوار بقر عید بھی ہے جس میں قربانی ہوتا ہے۔ قربانی نام کی ایک فلم بھی آئی تھی۔ اس میں امجد خاں نے کام کیا تھا۔ امجد خان ویسے تو کام اچھا کرتا ہے مگر اس کی مونچھیں مجھے زہر لگتی ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنی کبھی ہوئی مونچھیں کٹوا دینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر دوسرا صفحہ پڑھنے لگا غالب کے شعر کی تشریح کچھ اس طرح تھی۔" اس شعر میں شاعر نے دل اور نادان سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ آخر ان لوگوں کو ہوا کیا ہے جو اب تک مرض کو نہیں سمجھ سکے ہیں "۔ میں نے اگلے صفحے پر نظر دوڑائی۔ خواجہ حسن نظامی سے اپنی واقفیت کا اظہار صرف تین سطروں میں اس طرح کیا گیا تھا۔" خواجہ صاحب دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن سے شاعرانہ مجانلے کر آئے تھے۔ انداز بیان میں بہت نرمیات اور شوخیانہ انداز تھا۔ ان کی شاعری بہت بڑی تھی" میں نے دوسری کاپی اٹھائی۔" میرے پسندیدہ شاعر" پر مضمون لکھتے ہوئے محترمہ نے لکھا تھا۔

" پہلے زمانے کے لوگ خط بہت لکھا کرتے تھے۔ اس لئے لکھتے تھے کہ ان کی قابلیتیں معلوم ہو سکے۔ مگر غالب زیادہ سے زیادہ بات کم لفظوں میں لکھا کرتے تھے مجھے بھی ایسا ہی خط پسند ہے۔ مگر غالب شراب بہت پیتے تھے اور ہر وقت عشق میں مبتلا رہتے تھے۔" میری طبیعت الجھنے لگی اور میں نے پھر لڑکوں کی کاپیاں دیکھنی شروع کر دیں۔ ایک صاحب نے مختلف الفاظ کی جنس بتاتے ہوئے [illegible] مذکر اور مونث کے بدلے " اسٹرلنگ" اور" پولنگ" لکھا تھا۔ دوسرے نے عمرا ؤ ان برائے امیر ون [illegible] پامال برائے اسپتال لکھا تھا تیسرے نے سرسید احمد خاں کو اپنا پسندیدہ شاعر قرار دیتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت کو غالب اور اقبال سے زیادہ بلند تسلیم کیا تھا چوتھے نے یہ انکشاف کیا تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ ٹیپو سلطان کے سپہ سالار تھے اور انھوں نے انگریزوں سے لڑنے کے لئے آزاد ہند فوج بنائی تھی۔ وہ کھیلوں کے بھی بڑے شوقین تھے اور ان ہی کے نام پر ہر سال رانجی ٹرافی کا کرکٹ میچ ہوا کرتا ہے۔ ایک اور صاحب نے کالج کے آخری

لکھا تھا کہ "مسلمانا صحبت میں نہ رہنے کی وجہ سے ہم اُردو سے محروم رہے اور اردو ہمیں آتی بھی نہیں ہے۔ اس لئے گزارش ہے کہ آپ اس پہ غور کریں گے۔"

اور بھی بہت ساری باتیں تھیں جن میں اکثر مجھے یاد بھی ہیں۔ مگر ممکن ہے ان کاپیوں کے لکھنے والوں میں سے بعض مستقبل کے حکمراں ہوں یا انقلاب بپا کردیں۔ آپ جانیئے میں ہوشیار آدمی ہوں اور ہوشیار آدمی مستقبل سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس لئے میں بہت سے اصحاب کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہاں ایک بات اور ـــــ "یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اُردو ٹیچروں اور طالب علموں کی حالت زار پہ ماتم کرنے کے لئے ہاتھ اٹھا رہے ہوں۔ لیکن ذرا ٹھیریئے! آخر یہ اُردو زبان ہے کوئی گلی ڈنڈا تھوڑے ہی ہے جسے بچے بھی کھیل لیتے ہیں۔ ابھی تو ان بے چاروں نے انٹر کالج میں قدم ہی رکھا ہے۔ ابھی تو انھیں لیڈی سیکھنی ہے، پھر چمچہ گیری سیکھنی ہے، آخر میں نقل نویسی اور پیشہ ورکاری سیکھنی ہے۔ اس کے بعد موقع ملا تو اُردو زبان بھی سیکھ لیں گے۔ آخر داغ نے یوں ہی تھوڑے ہی کہا تھا ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے۔

■■

صغیر احمد سحر سندیلوی٭

قصۂ چہار بیویاں

"ارے تم سب کی سب کہاں چلیں"؟ میں نے گھر میں داخل ہوکر انھیں برقعہ پہنتے دیکھ کر کہا۔
"ہم لوگ چیف کورٹ جا رہے ہیں"۔ تینوں بیگموں نے یک زبان ہوکر کہا۔
"چیف کورٹ"؟ میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"جی ہاں چیف کورٹ" انھوں نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں کہا۔
"ارے بھئی میری بھی تو سنو! آخر معاملہ کیا ہے" میں نے لپک کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔
"معاملہ جو کچھ بھی ہے اخبار میں دیکھ لیجئے"۔ بڑی بیگم پیچھا چھڑاتے ہوئے بولیں۔
"ارے منجھلی بیگم تم ہی کچھ بتاؤ۔ یہ کیا تماشا ہے" میں نے ان کا دامن تھام کر پوچھا۔
"اے ہے یہ تماشا ہے اتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے اسے آپ تماشہ کہہ رہے ہیں۔" وہ تنک کر بولیں۔"
"اب تم ہی بتاؤ منجھلی بیگم! جب مجھے خود کوئی بات نہیں معلوم تو میں کیا کہوں تماشے کا لفظ تو یوں ہی زبان سے پھسل گیا۔
میں نے ایک شکست خوردہ سپاہی کے لہجے میں کہا۔
"بات یہ ہے کہ چیف کورٹ نے سرکاری ملازمتوں میں ہم عورتوں کو صرف ۲۵ فیصدی کی نمائندگی دی ہے جبکہ آبادی کے لحاظ سے عورتیں مردوں سے چوگنی ہیں"۔ انھوں نے مدلل طور پر مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"تم نے یہ اعداد و شمار کہاں سے حاصل کئے"؟ میں نے تعجب سے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔
"میں کوئی مردم شماری کرنے گئی تھی"؟ وہ تڑاخ سے بولیں۔
"مردم شماری نہ سہی زن شماری تو کی ہوگی"؟ میں نے اسی لہجہ میں پوچھا۔
"تو اے ستم ظریف زن شماری کیوں کرنے لگی"۔ نہ میں نے مردم شماری کی نہ زن شماری میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر عورتوں

کی آبادی مردوں سے چوگنی نہ ہوتی تو ہم چار عورتوں کو ایک مرد کیوں ملا ہوتا" انھوں نے ایک منفی دلیل پیش کی۔

" تو اس کا مطلب ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں ۸۰ فی صدی عورتوں کو ہونا چاہیئے؟" میں نے جرح کی۔

" اب یہ تو میں نہیں جانتی کیوں کہ حساب و کتاب کے معاملے میں ہمیشہ سے کچی رہی ہوں لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ چیف کورٹ کا فیصلہ قطعی منصفانہ نہیں ہے" انھوں نے جواب دیا۔

" اچھا خیر اس بکھیڑے کو چھوڑو یہ بتاؤ چھوٹی بیگم کہاں ہیں؟" میں نے موضوع بحث کو بدلنے کے لئے کہا۔

" آپ کو ہمیشہ چھوٹی بیگم ہی کی فکر رہتی ہے کبھی ہمارے مسائل سے آپ نے دلچسپی لی" وہ چیف کورٹ کو چھوڑ کر میری سرزنش پر اتر آئیں۔

" میں نے کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کی مجھے تو تم سب کے مسائل سے پوری ذمہ داری کے ساتھ دلچسپی ہے کوئی مسئلہ بھی تو معلوم ہو تم لوگوں کا تو موڈ ٹھیک نہیں! پوچھتا ایران کی ہوں جواب توران کا ملتا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا چھوٹی بیگم سے اس معاملہ پر کوئی سنجیدگی سے بات کروں" میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ جی ہاں آپ کو تو ہمیشہ چھوٹی بیگم سے ہی بات کرنا آتی ہے جیسے ہم لوگ کی زبانوں میں کانٹے ہیں، ہر وقت چھوٹی بیگم! چھوٹی بیگم! کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں آپ، جیسے چھوٹی بیگم نہ ہو گئیں . . . .

اتنے میں باہر سے جیپ کے رکنے کے ساتھ ہی ہارن کی آواز آئی۔

میں نے سمجھا شاید حکومت کی حساس اور فرض شناس سی۔ آئی۔ ڈی کے ذریعہ اس کو اس بات کی خبر ہو گئی کہ میرے گھر کی عورتیں چیف کورٹ کے فیصلہ کے خلاف احتجاج کرنے والی ہیں۔ اس لئے ان کی گرفتاری کے وارنٹ کے ساتھ پولس آگئی ہے۔ میں نے دروازے کی دراز سے جھانک کر دیکھا۔ واقعی پولس والوں کی جیپ کھڑی تھی جن کے ساتھ کم از کم ایک درجن سپاہی ضرور ہوں گے گاڑی کا ڈرائیور ہارن پہ ہارن بجا رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا جلد سے جلد دروازہ کھولو۔

" لو اور کرلو چیف کورٹ کے غیر منصفانہ فیصلہ کے خلاف احتجاج۔ اب بتاؤ بچ کر کہاں جاؤ گی پولس آگئی ہے"۔ میں نے رازدارانہ سرگوشیوں میں کہا۔

تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ وہ تو آپ کی چھوٹی بیگم ہوں گی۔

"میری چھوٹی بیگم"؟ میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں ہاں جنھیں آپ ابھی ابھی یاد فرما رہے تھے" منجھلی نے شوخی سے کہا۔

"میری چھوٹی بیگم کو کیا ہوا ان کا اور پولس کا کیا تعلق؟ خدارا جلدی سے بتاؤ میری تو جان نکلی جا رہی ہے"۔ میں نے بے تابی سے کہا۔

" وہ اب سب انسپکٹر پولس ہو گئی ہیں کیا آپ کو ابھی تک نہیں معلوم" بڑی بیگم نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

میرے [illegible] کے نیچے سے زمین نکل گئی [illegible] پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بڑی بیگم نے دروازے کھول دئے۔

" میرے پاس وقت کم ہے میں دوڈش پر جارہی ہوں چند نامور ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے ۔ میں نے سوچا آپ کو اس کی اطلاع دے دوں۔" وہ مکان میں داخل ہوتے ہوئے خالص پولیس والے لہجے میں بولیں۔"

ان کے سُرخ و سفید نسوانی جسم پر سب انسپکٹر پولیس کی خاکی وردی بہت ہی جچ رہی تھی۔ اور ان کے دونوں شانوں پر تین تین سنہرے چمکتے ہوئے ستارے اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے جڑاؤ ٹپس اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ میرے دل میں آیا میں انھیں گود میں لے کر کہیں دور بھاگ جاؤں لیکن خوف یہ پیدا ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے پہلے دارو غہ جی کے اغوا کرنے کے جرم میں اچانک دھر نہ لیا جاؤں میں ابھی انھیں تصورات میں گم تھا کہ میری تینوں بیویاں میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور کبھی ان کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ کہ دار و غہ جی کی نقرئی آواز نے میرے اس حسین طلسم کو توڑ دیا

" دیکھئے میں شاید رات کو واپس نہ آسکوں میرا انتظار نہ کرنا اچھا خدا حافظ!" وہ اُلٹے پاؤں مکان سے باہر نکل گئیں، اور میں عالم بے خودی میں یہ سوچتا رہ گیا کہ آخر یہ جادو کس نے کردیا۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ اور خُدا جانے وہ کون سی طاقت ہے جس نے اس عورت کو جو کل تک چوہے اور بلّی سے خوف کھاتی تھی پٹاخوں کی آواز سن کر کانوں میں اُنگلیاں دے لیتی تھی، بادل کی گھڑ گھڑاہٹ اور بجلی کی چمک سے ڈر کر سات کوٹھریوں کے اندر گھُس جاتی تھی اس قدر نڈر بے باک اور بہادر بنا دیا کہ وہ آج خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کی مہم پر روانہ ہونے سے بھی نہیں جھجکتی میں انہی مسائل پر غور کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز آئی۔

میری پیاری بہنو! اکھل بھارتی "مہیلا سنگھٹن" کی اور سے ایک عام سبھا "مہیلا جگت منڈل" کے وسیع ہال میں آج شام ۸ بجے ہونے جارہی ہے جس میں پردھان منتری ہماری پریشانیوں، مشکلوں اور مانگوں پر ہمدردی سے غور کرنے کے لئے تشریف لا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ آل انڈیا "ناری پولیٹیکل سوسائٹی"، "ناری فلاح و بہبود کمیٹی" اور مہیلا سدھار پر بندھک سنگھ کی بڑی بڑی لیڈروں کی بھی تقاریر ہوں گی۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اپنی ساری گھریلو ذمہ داریوں کو اپنے غیر ذمہ دار شوہروں پر چھوڑ کر بڑی سے بڑی تعداد میں اس سبھا میں شامل ہو کر اپنی احساس ذمہ داری کا یقین دلائیں۔"

"دیکھئے مجھے اس میٹنگ میں شرکت کرنا ہے اس لئے میں ذرا غسل کرنے جارہی ہوں آپ چائے کا پانی رکھ دیجئے۔" بڑی بیگم یہ حکم دے کر غسل خانہ کی طرف بھاگیں۔

آپ کی بات کا بھی کوئی قیام نہیں! آپ تو احتجاج کرنے جارہی تھیں؟" میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی کہا۔

" جلسہ میں شرکت اس سے زیادہ ضروری ہے۔ زیادہ بحث و مباحثہ کا وقت نہیں آپ ذرا جلدی سے چائے بنا دیں۔" وہ غسل خانے میں سے بولیں۔

" مجھے چائے وائے بنانا نہیں آتی۔ خُدا جانے شکر کہاں ہے چائے کا ڈبہ کون سا ہے اور دودھ کس جگہ رکھا ہے۔" میں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

" دیکھا! باورچی خانہ میں دیکھ لیجئے سب مل جائے گا۔"

" آپ بھی کمال کرتی ہیں جس نے اپنی ساری زندگی میں باورچی خانہ کا منہ نہ دیکھا ہو اسے آپ چائے بنانے کا حکم دے رہی ہیں"۔

" چائے بنانے میں کون سی مہارت کی ضرورت ہے؟"

" مجھ سے یہ کام نہ ہوگا" میں نے صاف انکار کردیا۔

اُوہو! میں کہتی ہوں وقت کم ہے خدا جانے وہاں سے دیر سویر کب آنا ہو اس لئے کم از کم دو بسکٹ اور ایک کپ چائے ہی پیٹ میں ڈال لوں اس لئے آپ سے خوش آمد کر رہی ہوں"۔

" ارے خوشامد نہیں آپ حکم دے سکتی ہیں لیکن میں چائے بنانے کی ترکیب نہیں جانتا!"

" تین کپ پانی، ایک کپ دودھ، اور چھ چمچے شکر، اور مناسب چائے کی پتی"۔

انھوں نے مختصراً چائے بنانے کی ترکیب بتادی۔

" ارے سُنئے میں ذرا کپڑے تبدیل کرلوں آخر اتنی بڑی محفل میں جا رہی ہوں آپ ذرا میری جوتیوں پر پالش کر دیجئے" منجھلی بیگم تولیے سے بال صاف کرتے ہوئے چمک کر بولیں۔

" اب کیا یہ کام بھی مجھے کرنا پڑے گا" میں نے بگڑ کر تیکھے لہجہ میں کہا۔

" آج کم بخت وہ نوکرانی ڈیم فول نہیں آئی ہے اسے بھی آج ہی مرنا تھا" اس لئے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے جیسے آپ اپنے جوتوں پر پالش کرتے ہیں ویسے ہی میرے سینڈل پر پالش کر دیجئے کیا میں آپ کی نہیں ہوں"۔ انھوں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

توبہ ہے یہاں تو وقت پر کوئی سامان ہی نہیں رہتا آپ ذرا جلدی سے بازار چلے جائیے اور ایک کرنیل پالش لپ اسٹک اور پاؤڈر لا دیجئے" منجھلی بیگم نے ڈریسنگ روم سے نکلتے ہوئے آواز لگائی۔

اچھا میں بازار جا رہا ہوں آپ بڑی بیگم کے لئے چائے تیار کر دیں"۔ میں نے باورچی خانے کے جنجال سے جان چھڑانے کے لئے جوتے پہنے اور بازار کی طرف بھاگا۔

جب میں مہیلا جگت منڈل کی شاندار عمارت کی طرف سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ میری چھوٹی بیگم نہایت دلچسپ لچھے دار تقریر فرما رہی ہیں۔ انھوں نے شاید جلسے میں شرکت کی غرض سے ڈاکوؤں کے پکڑنے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ میں وہیں رُک کر ان کی تقریر سُننے لگا۔

" ہمیں سب سے بڑی شکایت پردھان منتری سے یہ ہے کہ آج ہندوستان کو آزاد ہوئے ۳۶،۳۵ سال ہو رہے ہیں کوئی مہیلا راشٹر پتی نہ بن سکی آخر اس کی کیا وجہ ہے جب میں عالمی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالتی ہوں تو سوائے چند مہیلاؤں کے کسی عورت کا نام نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے مردوں کو ہم عورتوں پر سیاسی برتری حاصل رہی ہے اور انھوں نے ہمیں کبھی اُبھرنے نہیں دیا کیوں کہ ہم لوگوں میں اتفاق نہ تھا ہم لوگوں کی آپسی رشک و رقابت ہی ہماری سیاسی پستی کا

اعث بنا ہے۔ آج مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہم سب ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہیں اور اب ہم کو جس فرقہ پرست مرد عورت کا ڈٹ کر مقابلہ
رنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اب وہ ہم پر اپنی سیاسی بالادستی کیوں کر قائم رکھتے ہیں۔"

.... "غضب خدا کا آج جب مہیلا پولیس اسٹیشن قائم ہوتا ہے تو اس کا افتتاح بھی مرد انسپکٹر جنرل پولیس کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کیا ہم عورتیں اس قدر نااہل ہیں کہ سارے ہندوستان میں ایک بھی مہیلا انسپکٹر جنرل پولیس نہیں۔"

... حکومت ہمیں اس بات کا بھی جواب دے کہ جب پنجاب رجمنٹ، سکھ رجمنٹ، گورکھا رجمنٹ بن سکتی ہے تو آج تک مہیلا جمنٹ کیوں نہیں بنائی گئی آخر کس دلیل کی بنا پر مہیلا ایر فورس، مہیلا نیوی فورس کی داغ بیل نہیں ڈالی گئی جب ایک مہیلا سب انسپکٹر بن ہوسکتی ہے تو کمانڈر انچیف، بریگیڈیر، فوجی جنرل اور فیلڈ مارشل کیوں نہیں ہوسکتی؟"

چاروں طرف سے تالیوں کا شور ہونے لگا۔ مہیلا سنگٹھن زندہ آباد کے نعرے لگائے جانے لگے میں اپنی چھوٹی بیگم کی تقریر ڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ اس شور و غل نے مجھے خواب غفلت سے جگا دیا تو مجھے بیگم کی فرمائش سرخی اور پاؤڈر کی یاد آئی میں ہاں سے بڑی تیزی سے بازار کی طرف روانہ ہوا۔ جلدی جلدی سامان خرید کر رکشہ سے مکان آیا تو معلوم ہوا دروازے پر لا پڑا ہوا ہے شاید میری بیویاں میرا انتظار دیکھ کر جلسہ میں شرکت کرنے چلی گئی تھیں جب مجھے دروازے پر کھڑے کھڑے یڑھ گھنٹہ ہو گیا تو ہمارے پڑوسی خان صاحب نے کھڑکی سے جھانک کر مجھے دیکھا۔

" ارے بھائی صاحب بھابی صاحبہ تو جلسہ میں شرکت کرنے چلی گئیں آپ خدا جانے کہاں چلے گئے تھے انھیں دیر ہو رہی تی وہ مکان کی کنجی مجھے دے گئی ہیں اُنھوں نے کنجیوں کا گچھا اوپر سے پھینکتے ہوئے کہا کیوں کہ ان کی بیوی بھی انھیں مکان میں ند کر کے جلسہ میں چلی گئی تھیں۔

میں نے دروازہ کھولا تھکا تو تھا ہی کھڑے کھڑے ٹانگوں میں درد بھی ہونے لگا تھا۔ چاروں بیویوں کا بستر جیسے تیسے لگایا اکہ ڈلیسی میں وہ ناراض نہ ہوں آخر میں چار بیویوں کا واحد شوہر ہوں ہم مردوں کی ایسی ہی درگت ہونا چاہیئے کیوں کہ بقول بیگم مرد آج کل اقلیت میں ہیں اور اقلیتوں کا اس جمہوری دور میں جیسا کچھ حال ہے سبھی جانتے ہیں ان کے جائز حقوق کی پامالی ظہر من الشمس ہے انھیں مسائل پر غور کرتے کرتے نہ جانے مجھے کس وقت نیند آگئی۔

وہ سب کس وقت آئیں مجھے نہیں معلوم شاید میں دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا چار بیویوں کی بے شمار فرمائشوں میں پڑ کر مرد کا حافظہ ویسے بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

صبح ناشتہ کی میز پر چاروں بیویاں بہت خوش نظر آرہی تھیں بڑی بیگم کے ہاتھ میں ایک کاغذ دیکھ کر میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟"

یہ درخواست ہے میں مہیلا نیوی فورس میں ملازمت کرنے جا رہی ہوں" پردھان منتری نے ہمارے مطالبات تسلیم کر لئے ہیں۔"

اُنھوں نے بڑی شوخی سے کہا۔

"اور میں مہیلا ایرفورس میں جارہی ہوں" منجھلی بیگم نے دوپٹے کا پلو اس طرح درست کرتے ہوئے کہا۔ جیسے وہ ہوا میں پرواز کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"اور آپ؟" میں نے سنجھلی بیگم سے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔

میرے لئے مہیلا رجمنٹ ہی ٹھیک رہے گی آپ کا کیا خیال ہے؟" اُنھوں نے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال کیا اور میں کیا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں ایسی حالت میں مجھے ملازمت سے استعفیٰ دے دینا چاہیئے"، میں نے آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے کہا

"وہ کیوں؟ وہ سب جیسے سوالیہ نشان بن گئیں۔

"اس لئے کہ آخر کچھ گھریلو ذمہ داریاں بھی تو ہیں بچوں کی دیکھ بھال مکان کی زینت وزیبائش باورچی خانے کے امور وغیرہ وغیرہ یہ سب کون انجام دے گا؟" میں نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"دو چار ملازم رکھ لیں گے" انھوں نے ایک راستہ نکالا۔

"ملازم بھی تو کم بخت میرے جیسے مرد ہی ملیں گے جو امور خانہ داری سے بالکل ناواقف ہوں گے ملازمائیں تو سب کی سب سرکاری ملازمتوں میں مختلف محکموں میں بھرتی ہو جائیں گی"۔

میں نے انھیں یاد دلایا۔

"وہاں یہ بات تو صحیح ہے" وہ سب میرا منہ تکنے لگیں۔

میں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے فی الحال دفتر سے غیر معین مدت تک کے لئے چھٹی لے لی ہے اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے میں نے عجلت میں ملازمت سے استعفیٰ نہیں دیا ہے پھر بھی مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں میری جگہ پر کسی عورت کا تقرر نہ ہو جائے اور خدانخواستہ اگر ایسا ہو بھی گیا تو مجھے اس کی اتنی پرواہ بھی نہیں کیونکہ جس کی چار بیویاں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوں تو اسے ملازمت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ■■

ماہنامہ شگوفہ

چارکمان حیدرآباد پر ممتاز تاجر کتب

حسامی بک ڈپو سے حاصل کیا جاسکتا ہے!

ڈاکٹر کے۔ بھکتہ وتسل راؤ
حیدرآباد

مجسمہ دیکھتا رہا

دُنیا میں کئی ممالک میں مختلف مقامات پر کئی مجسّمے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ روس میں مارکس اینجلس لینن کے مجسّمے ہیں تو جزائر برطانیہ میں ایڈورڈ، جارج، ایلزبتھ، شیکسپیئر کارن وال ہار دے کے ہیں۔ فرانس میں خوبصورتی کو مات دینے والی چیزیں کئی ہیں۔ امریکہ میں لبرٹی کا سٹاچو ہے۔ واشنگٹن کا روز کا ہے، لنکن کا ہے، چند بڑے مجسّمے صدور امریکہ کے میلوں دور تک نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں تو گاندھی، نہرو، بوس کے مجسّمے قدم قدم پر ہیں۔

جہاں کہیں بھی مجسّمے کھڑے کر دیئے گئے ہیں اُن کی تاریخ پُرانی ہے۔ کہانی لانبی ہے۔ گہرائی بھی ہے۔ دلچسپ جغرافیہ بھی ہے مجسّمہ نصب کرنے سے پہلے کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے۔ جلسہ عام یا خاص میں روئیداد لکھی جاتی ہے۔ اتفاق رائے ہو ہی جاتا ہے۔ چندہ کی فہرست لکھی جاتی ہے۔ نام کے لئے چند لوگ پس و پیش کرتے ہیں۔ چند دلیر خیر خواہ نام لکھنے کے لئے حجّت بھی کرتے ہیں۔ عطیوں کی فہرست الگ، مرکزی کمیٹی، ذیلی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ ٹکٹ بھی چھپائے جاتے ہیں بکری کے لئے کسی طریقوں سے رقم اکٹھا کی جاتی ہے۔ بنک میں حساب کتاب بعض اوقات دکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد فن کار، سنگ تراش، مجسّمہ ساز کی تلاش ہوتی ہے۔ ہزاروں روپیہ بہا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ رُوپ ریکھا عمدہ رہے، نفیس رہے۔ لُٹ بیٹھے بھی تنگ جائیں تو خاموشی کے سوا چارہ نہیں۔ جلدی کرنے سے اُس کی ناک، آنکھ، کان میں فرق آجائے گا اور جعلی ہونے کا اندیشہ ہو جائے گا۔ پتھر کالا یا سفید، فرنگی پدم کا یا مرکانہ کا، کانسہ یا لوہے کا، چونے کا یا سیمنٹ کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے حُلیہ کا، صورت کا، رُوپ کا، احساسات کا، جذبات کا، ارمانوں کا، ریاست کا، قوم کا، مجسّمہ ایسا بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ جی للچائے اور کرشمہ ہو جائے حیات کا۔ چند فن کار اُٹھے ایسا بنائے ہیں کہ اُن کی تمنا پوری ہوئی۔ قدر ہوئی۔ مانگ ہوئی سالوں تک۔ سالار جنگ میوزیم میں ایسے نمونے ہیں۔ دعوت ہوتی ہے آنکھوں کو، جنبش ہوتی ہے قدموں میں، اُپج ہوتی ہے تخیل میں ٹکٹ دو روپیہ کا لیکن پچیس تیس مجسّمے دیکھ لیتے ہیں جو

خوش خوش گھر واپس لوٹتے ہیں۔

مجسّمہ بن جانے کے بعد کھڑا کرنے کی جگہ کا بھی تعین ہوتا ہے کمیٹی کے توسط سے بعض اوقات گرانٹ بھی ہو جاتی ہے۔ چند تو شاہراؤں پر بٹھائے جاتے ہیں مثلاً کالیشور راؤ کا مارکٹ یا پُل کے قریب، گوردھا باڈا مارکٹ، یونیورسٹی یا لائبریری کے وسط میں۔ چند تو چوراستوں پر کھڑا کر دینا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ہر ایک راہ رو یاد کرے مثلاً نہرو، آزاد، تلک، گاندھی چند تو سواریوں کے ساتھ بٹھائے جاتے ہیں مثلاً جھانسی لکشمی گھوڑے پر، چھترپتی شیواجی گھوڑے پر۔ بارش آجائے تو مجسّمے خود بخود صاف ہو جاتے ہیں۔ دھول اُڑ جائے۔ طوفان آجائے تو گرد جم جاتی ہے۔ اُن پر حاشیے نمودار ہوتے ہیں۔ بجلی گرنے پر تڑخ جاتے ہیں۔ ہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ دیکھ لیں تو حفاظت ہو جاتی ہے ورنہ دھات بِک جاتی ہے چور بازار میں۔ نہ رپورٹ درج کرانے کی ضرورت ہوتی ہے نہ شکایت کا موقع گرما کے موسم میں لُو سے بھی محفوظ بس سہہ لیتے ہیں صبر و تحمل کے ساتھ۔

تعلیمی اداروں کے احاطوں میں کئی طرح کے مجسّمے نصب ہوتے ہیں۔ اُن اداروں کے بانی، معین امیر جامعہ، نامور اُستاد معطی، نائب معین امیر جامعہ، سیاسی مُدبر سیاسی ٹھیکہ دار وغیرہ۔ ان کی ڈگریاں بھی تراشی جاتی ہیں۔ مثلاً نام کے ساتھ ایل۔ ایل بی، ایل۔ ایل۔ ایم، ایل۔ ایل۔ ڈی، جی۔ سی۔ آئی۔ ای، او۔ بی۔ ای وغیرہ۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد تو نام کے پہلے پدم شری، پدم وبھوشن، لگا دیتے ہیں۔ شاید وہ لوگ جب زندہ تھے تو صرف نام لکھا جاتا تھا۔ راجہ، مہاراجاؤں، جاگیرداروں بادشاہوں کے مجسّمے قلعوں میں، محلات میں، دیوڑھیوں میں، فصیلوں کے اندر رہیں تو دھول بھی جھٹکنے کی ضرورت نہیں لاپرواہی اگر زیادہ ہو جائے تو رات میں بھوت کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھنے والے کو بخار آجاتا ہے۔ منتر پھونکنا پڑتا ہے۔ عامل کا آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فاتحہ بھی دلانا پڑتا ہے۔ گنڈا مالا، تعویذ گندھے یا ہاتھ پر باندھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ زیادہ ڈر جانے پر دل کا دورہ بھی پڑھ سکتا ہے۔

یہ شاہراؤں پر، گلیوں میں ٹرافک کنٹرول کا کام بھی کرتے ہیں۔ لاری والے، بنڈی والے ٹکر دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ کمیٹی والے ماتم کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ پولس میں رپورٹ کر دیں تو کہانی لانبی ہو جاتی ہے سنا چوکا حُلیہ کیا تھا؟ کب نصب کیا گیا تھا؟ کیا لاگت ہوئی؟ کمیٹی کب بٹھائی گئی؟ حساب کتاب ہے کیا جمع کردہ رقم کا؟ گواہ تو کوئی رہ نہیں پاتا۔ چُپ چاپ ہو جائیں تو معاملہ ختم ورنہ اعلیٰ سطح پر کمیٹی ایک آدھ سال کے اندر رپورٹ بھی پیش کر دیتی ہے۔ ایسے میں شیبہ گھڑی کو دیکھ کر ایک اور کھڑا کر دینا مفید سمجھا جاتا ہے۔

مجسّموں کے بھی خوشی کے دن ہوتے ہیں جیسے گلپوشی، جنم دن، برسی کے دن، سمرن کے دن چوراہوں پر ٹرافک بھی رُک جاتی ہے۔ اعلیٰ عہدہ دار یا سرگرم کارکن یا میر محلہ پھول مالا ڈال دیتا ہے۔ تقریر کی بھرمار ہوتی ہے۔ باقی دنوں میں ان کے پاس کوئی نہیں آتا۔ چیل، باغ میں بھی ان کی مانگ ہوتی ہے۔ لوگ بیماریوں کو دور بھگانے کے لئے علی الصبح چہل قدمی کرتے ہیں ان

کے اطراف۔ ریڈیو کی خبریں بھی چپ چاپ سنتے رہتے ہیں بھکاری، جذامی، اپاہج برابر حاضری دیتے ہیں ان کے پاس۔ شرابی، پاکٹ مار میں بھی فرق کر نہیں پاتا مجسمہ زندگی میں برتتے یا نہ برتتے مرنے کے بعد مساوات برت پاتا ہے! انھیں کے قدموں میں چور اُچکے ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں سو جاتے ہیں۔ سپاہی، حوالدار، پہرہ دار کی پکار سے اُٹھ جاتے ہیں۔ بھاگ نکلتے ہیں۔ عاشقوں کے لئے مجسمے بہت ہی مہربان دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سایہ میں وعدہ کرتے ہیں شادی رچانے کا۔ پھل والے، پھول والے ان لوگوں کو چھوڑتے نہیں۔ مجسمہ ہی گواہ ہے ان کرتوتوں کا۔ انصاف کے ساتھ ناانصافی کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

شہر میں کوئی جلوس نکالنے سے پہلے لوگ ایک مجسمہ کے قریب جمع ہوتے ہیں۔ راستہ طئے کر کے دوسرے مجسمہ کے پاس جلسہ عام میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پُرامن ماحول رہا تو ٹھیک ہے ورنہ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو جاتا ہے۔ چند مجسمے تو ہمیشہ طلبا یہ گری کے شکار ہوتے ہیں۔

گھر میں جگہ نہ رہے، اتوار آ جائے یا کوئی تعطیل، عید ہو یا تہوار، کئی خاندان کے افراد، گھنٹوں بیٹھ جاتے ہیں مجسموں کے احاطہ میں گرم مصالحہ، چنے، مونگ پھلی، چُڑوا، مرچیاں، پاپڑ، گپ چپ، رگڑا، گول گپے، کباب، سموسے کھا لیتے ہیں۔ "چنا جور گرم بابو" کی آوازیں سُن کر تھک جاتا ہے مجسمہ آئسکریم بھی خوب فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں تنگ کمروں میں تنے جوڑوں کو سکون کہاں۔ نکل پڑتے ہیں چمن، باغ کی طرف۔ مجسمے ہمدرد ہیں ان کے لئے۔ خوشیوں کی پرورش کرتے ہیں۔ سنوارتے ہیں۔ مایوسی کو دور بھگاتے ہیں۔ امن کا حامی ہے مجسمہ۔ رہبر ہے تو رہنما بھی۔

کسی الکشن میں کوئی جیت جائے تو جشن مجسمہ کے پاس جم جاتا ہے۔ مشاعرہ، قوالی، ناچ گانے کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ بے چارہ مجسمہ چپ چاپ سہہ لیتا ہے۔ سردی گرمی سے درکنار، رنج و خوشی سے پرے، تپش سے دور، سالوں بلکہ نسل در نسل سکوت کے ساتھ خدمت میں لگ جاتا ہے مجسمہ۔ کوئی حال ہو، کوئی بات ہو ہم محسوس کر سکتے ہیں مجسمہ دیکھتا رہتا ہے۔

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے مضامین

سمن زار

قیمت: ۸/- روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جا سکتی ہے!

رشید عبدالسمیع جلیل

ہم اہلکار ہیں

سُستی بدن میں سر پہ نحوست ہو جب سوار
دفتر کی اصطلاح میں کہتے ہیں اہلکار

بیوی ہماری کہتی ہے مشتِ غبار ہیں
شوہر نہیں ہیں بلکہ فقط اہل کار ہیں

جاتے ہیں اپنے وقت پہ دفتر کو روز ہم
رب کا ہے شکر لنچ میں کھاتے ہیں موز ہم

پابند ہیں اصول کے عادت کے ہیں غلام
کرتے ہیں ایرے غیرے کو جھک جھک کے ہم سلام

کہنے کو ماتحت ہیں چلاتے ہیں اپنا حکم
سکشن ہمارا کھیت ہے بوتے ہیں اپنا تخم

دفتر میں اپنی ذات میں گرچہ ہیں اہلکار
بنگلہ ہمارے پاس نہ موٹر نہ جیپ کار

پیتے ہیں صبح و شام کئی بار چائے ہم
قرضوں کی مملکت کے ہیں اک وائسرائے ہم

ہر پل دھواں دھواں ہے ہمارے لئے حیات
سگریٹ کے بغیر ادھوری ہے کائنات

اوقاتِ کار کیا ہیں ہمارے نہ پوچھئے
گردش میں کس قدر ہیں ستارے نہ پوچھئے

پنڈنگ ہے کتنا کام کوئی جانتا نہیں
جھک مارے دن تمام کوئی جانتا نہیں

دفتر میں کام کیا ہے فقط چند فائیلیں
کچھ آئیں بائیں شائیں کسی وقت بھی لکھیں

احکام، قاعدے و قوانین بے حساب
نوٹنگ ڈرافٹنگ بھی ہماری ہے لاجواب

کہتے نہیں زباں سے کوئی بات اہل کار
لکھ کر اُتارتے ہیں مگر دل کا سب غُبار

گالی گلوج اور تشدّد کے ہم خلاف
خاموش احتجاج سے بلڈنگ میں ہو شگاف

سنجیدگی کے ساتھ شرافت ہمیں سے ہے
مجموعی حیثیت سے حماقت ہمیں سے ہے

دانہ بچھائیے تو کبوتر دکھائی دے
اندر کا جو مواد ہے باہر دکھائی دے

لوزنگ و ٹیکلنگ جو کرے اس کی قدر ہے
تاخیر بھی روا ہے ڈسپلن بھی منذر ہے

پُرزے ہیں بس مشین کے فٹ ہو گئے تو خیر
ڈوبیں گے سب کو لیکے نہ اپنا نہ کوئی غیر

"پلے ڈے" ہمارے واسطے آفت کی ہے گھڑی
ہر ماہ ایک روز قیامت کی ہے گھڑی

موسم کے ساتھ ساتھ بدل جائے گی ہوا
جس دن وظیفہ لیں گے نکل جائے گی ہوا

نور پرکاش [بمبئی]

اِس سچائی کے باوجود کہ چھینک کبھی حالت میں بھی روکی نہیں جا سکتی، آپ سب اِس بات سے بھی بخوبی واقف ہوں گے کہ اس چھینک کی دم میں ایک چھلّہ یہ بھی ہے کہ بڑے بوڑھوں کی زبانی سُنتے آئے ہیں کہ کسی بھی کام کے شروع کرتے ہی اگر کسی کو چھینک آجائے تو بدشگونی ہوتی ہے، اور وہ کام کچھ دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا نہ کرے تو کہتے ہیں کہ وہ کام بگڑ جاتا ہے!

میرے خیال سے جنتا پارٹی کو ووٹ دیتے وقت ہر ووٹر کو چھینک ضرور آتی ہوگی!

کسی اور کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک اِس چھینک کے منحوس ہونے کا میری ذات سے تعلق ہے یہ میرے لئے تو واقعی منحوس ثابت ہوئی ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن مجھے آفس کے لئے گھر سے نکلنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ اور اسی نئے میں بجائے گرم کے ٹھنڈے پانی سے نہا لیا۔ پھر جیسے تیسے تیار ہو کر جھپٹ کر بریف کیس اٹھایا اور ناشتہ کئے بغیر دروازے کی طرف لپکا تھا، کہ اچانک ناک میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی .... اور لاکھ روکنے کی کوشش کے باوجود ایک زوردار چھینک آ ہی گئی!! بس پھر کیا تھا! ماں نے لپک کر راستہ روک لیا، اور بولیں "بیٹا، چھینک ہوئی ہے۔ ابھی مت جاؤ۔ کچھ دیر ٹھہر کر جانا!"

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اُدھر سے بیگم نے آکر بریف کیس ہاتھ سے جھپٹ لیا اور بولیں۔

" اور نہیں تو کیا! ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ میں پڑوس میں شرما جی کے یہاں بیٹھی تھی، ان کا لڑکا کہیں جا رہا تھا گھر سے نکلنے سے پہلے چھینک دیا، اور منع کرنے کے باوجود نہیں رُکا۔" میں نے پھر کچھ کہنا چاہا کہ ہاتھ کے اشارے سے گویا "چپ رہو جی" کہہ کر بولیں .... بس تھوڑی ہی دیر بعد گھنٹہ، اور سائیکل سوار ٹکرا کر آ گیا .... اور اب ہلدی چونا لگائے گھر میں پڑا ہے" جس پر ماں نے لقمہ دیا "اب رک ہی گیا ہے تو دو لقمے ناشتہ ہی کر لے۔ دوپہر تک بھوکے پیٹ کام کرنا پڑے گا۔" میں نے چڑ کر

کہا "چھینک آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آج میں تیسری بار بھی لیٹ آفس پہنچا تو نوکری سے ہاتھ دھوکر گھر میں لیٹنا پڑیگا"۔
مگر صاحب کون سُنتا ہے ؟! بیگم نے جھٹ ناشتہ لاکر سامنے رکھ دیا۔ میں نے ہتھیار ہی نہیں بیگم کے ہاتھ سے دوبارہ چھینا ہوا بریف کیس بھی زمین پہ ڈالدیا۔

جیسے تیسے ناشتہ کرکے بریف کیس لے کر دوڑتا ہوا گھر سے نکلا ! . . . . ! اور کمپاؤنڈ سے باہر نکل کر جبو جٹ کی رفتار سے بس اسٹاپ کی طرف دوڑا۔ ابھی گلی سے نکل کر سڑک کے موڑ پہ مڑا ہی تھا کہ . . . . . سامنے سے تازہ تازہ ٹماٹروں سے بھری ایک ہنگی کاندھے پہ لٹکائے ایک سبزی والا شاید (چھینک آنے کی وجہ سے) بازار کے لئے لیٹ ہونے پر ہوا کے گھوڑے پہ سوار چلا آرہا تھا . . . ! میں نے لاکھ چاہا کہ ایسا نہ ہو . . . . پر صاحب ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ؟ ٹکر ہونی تھی سو ہوئی اور ایسی زوردار ہوئی کہ ہم دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہنڈولے میں سواری کا مزہ آگیا۔ ہوا یوں کہ ٹماٹر والا ٹکر ہوتے ہی اپنے پورے زور میں (مجھے تریب تریب لپٹائے ہوئے) کئی چکر گھوم گیا ! اور جب راہو اور کیتو کے ٹکراؤ کا یہ چکر تھا . . . تو معلوم ہوا کہ ٹماٹروں سے بھرے ایک ٹوکرے میں وہ ٹماٹر والا فرو کش ہے تو دوسرے میں یہ ناچیز ! اور ٹماٹر والا میرا بریف کیس اپنی گود میں رکھے مجھے ٹماٹر کی طرح لال لال آنکھوں سے ایسے گھور رہا ہے جیسے ٹماٹر سمجھ کر کھا ہی تو جائے گا !

کچھ نہ پوچھئے۔ بڑی مشکل سے تیس کیلو ٹماٹروں کے دام چکا کر سر سے پیر تک "ٹماٹر زار" بنا گھر پہنچا ! ہاں باتھ روم میں تھیں۔ بیگم ہمیں اس حالت میں دیکھتے ہی غصّہ کے مارے ٹماٹر کی طرح سُرخ ہوگئیں اور بولیں "میں نے کہا نہیں تھا کہ چھینک آتی ہے۔ ذرا دیر اور رُک جائیے پر اس گھر میں میری سُنتا ہی کون ہے"۔ میں نے کہا۔
"بھلی مانس وہ تو شکر کرو کہ ٹکر ٹماٹر والے سے ہوئی ! . . . . ورنہ اگر کچھ دیر اور رُک جاتا اور کسی قصائی سے ٹکر ہوجاتی تو اپنا تو قیمہ ہی بن گیا تھا آج"۔

مجھے یقین ہے کہ یو۔ این۔ او کے پاس عرب۔ اسرائیل کے تنازعہ کا کوئی نہ کوئی حل ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک نہ ایک دن کشمیر کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ لیکن یو۔ این۔ او تو ایک طرف۔ چھینک روکنے کا نسخہ تو ودیاتا وٗں کے پاس بھی نہ ہوگا !

پہلے "چیر پھاڑ" پھر "چوٹی کے غلام"، اس کے بعد "تو تو میں میں" اور اب پرویز یداللہ مہدی کے
طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ
ٹائیں ٹائیں فش
قیمت : ۱۵ روپے
ناشر زندہ دلان حیدرآباد

سرسوتی سرن کیف
چنڈی گڑھ

کرنا تبصرہ جناب ادیب کا بزبانِ ہندی

اگر آپ کو اردو ادب سے دلچسپی ہے اور آپ کبھی ہمارے شہر تشریف لائیں تو دو باتوں کا خیال رکھیں۔ پہلی بات یہ کہ حضرت ادیب جھانسوی سے ملاقات ہو جائے تو انھیں ہرگز پتہ نہ چلنے دیں کہ آپ شاعر یا افسانہ نگار یا نقاد یا صحافی ہیں ورنہ وہ آسیب کی طرح آپ کے سر آ جائیں گے اور ایک بار آ گئے تو انھیں اُتارنا بڑے بڑے عاملوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ کبھی نہ کبھی طرح موقع نکال کر آپ سردار شیر سنگھ کے شیرِ پنجاب ہوٹل میں ضرور تشریف لائیں۔ سردار صاحب نے فوجی ملازمت سے ریٹائر ہونے پر یہ ہوٹل کھولا ہے اور فوجی سختی کے ساتھ اس کا انتظام کرتے ہیں نتیجتہً آپ کو یہاں کی ہر چیز لذیذ اور خالص ملیگی اور کہیں کسی قسم کی گندگی نہیں دکھائی دے گی اور چیزوں کی قیمت بھی دوسرے ہوٹلوں سے کم ہوگی۔ یہاں کے گاہکوں میں آپ کو صاف ستھرے اور شریف لوگ ہی ملیں گے کیوں کہ سردار صاحب ادب نواز ہی نہیں خود اچھے شاعر ہیں اور اپنے ہاں غیر معقول لوگوں کا آنا پسند نہیں کرتے۔ شام کو ان کے ہوٹل میں اچھا خاصہ ادبی اجتماع ہو جاتا ہے اور ہر روز تقریباً ہر ادیب ان کے ہاں آتا ہے خواہ پانچ منٹ ہی کے لئے سہی۔ ہاں کچھ واقعات ایسے ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے سردار صاحب نے اپنے ہاں ادیب جھانسوی کا آنا بند کر دیا ہے۔ سردار صاحب کے ہر پروفیسر، ہر شاعر اور ہر ادیب اور ہر صحافی سے ذاتی تعلقات ہیں۔ اگر کسی ادیب یا صحافی کو ان کے ہاں بیٹھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ ہوٹل کے سامنے والی سڑک سے بھی نہیں گزرتا کیوں کہ نظر پڑتے ہی سردار صاحب اسے پکڑ بلاتے ہیں۔

چنانچہ آج مجھے بھی پکڑ بلایا گیا۔ میں عموماً گھر اور دفتر کے علاوہ کہیں نہیں جاتا۔ چنانچہ جب مجھے ایک ضروری کام سے ادھر آنا پڑا تو سردار صاحب کیوں موقع چھوڑتے۔ اتفاق سے آج فکر صاحب اور منظر صاحب کے علاوہ اور کوئی ادیب نہ تھا۔ ابھی ہوٹل میں گاہکوں کی بھیڑ بھی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ سردار صاحب خود ہماری میز پر ڈٹ گئے، یعنی آج وہ ہم لوگوں کو کچھ خرچ نہ کرنے دینا چاہتے تھے۔

ہم میں سے ہر شخص کوشش کرتا تھا کہ ادیب جالنسوی کا ذکر نہ چھڑے کیوں کہ اس موضوع پہ ہر ایک شخص کو اتنا کچھ کہنا ہوتا تھا کہ پھر اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہو سکتی تھی حالانکہ یہ بھی ظاہر تھا کہ ادیب جالنسوی کی شخصیت سے زیادہ لاحاصل موضوع ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن نہ معلوم کیسے بھوت پریتوں کی کہانیوں کی طرح یہ موضوع ضرور سر پر سوار ہو جاتا تھا۔ معلوم نہیں کس نے ادیب کی بات شروع کی لیکن پھر ہر ایک نے ان کے متعلق اپنا کوئی تازہ یا باسی تجربہ سُنایا۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی خاص بات اس وقت ہوتی جب جناب گوپی ناتھ نظیر نے سب کو یہ کہہ کر چونکا دیا "آج صبح حضرت غریب خانہ پر تشریف لائے تھے

میں نے کہا کل ہی تو وہ میرے دفتر میں آکر ڈھائی گھنٹے تک میرا دماغ چاٹتا رہا اور اس سارے عرصے میں اس نے آپ [illegible] کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔ [illegible] نظیر صاحب سے بات نہیں کروں گا۔"

"تو اس کے معنی کل رات قیامت آگئی ہوگی" سردار صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔ "یہ بتایئے اس نے کس کے لئے نہیں کہا کہ کبھی اس سے تعلق نہیں رکھوں گا اور کس کے ہاں دوبارہ نہیں جاؤں گا۔ صرف میرے ہاں نہیں آتا کیوں کہ جانتا ہے کہ یہاں ادیبوں کا زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ سر پر ڈنڈا پڑے گا۔ ہاں تو کیوں آیا تھا آپ کے ہاں نظر صاحب؟"

"کہتا تھا کہ میرے لئے دو تین کتابوں کا ریویو لکھ دو" نظر صاحب بولے۔

"تعجب کی بات ہے...."

میری بات سردار صاحب نے کاٹی "اس میں تعجب کی کیا بات ہے نظامی صاحب؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس نے جو مزاحیہ خاکے اپنے نام سے چھپوائے ہیں وہ بھی اس کے اپنے نہیں۔ . ."

جواباً میں نے سردار صاحب کی بات کاٹی "مجھے معلوم ہے کہ یہ اس کے نہیں ہیں۔ بلکہ بھری بزم میں راز کی بات یہ بھی کہہ دوں کہ [illegible] شروع آپ بھی اس کے چکر میں آگئے تھے اور ان خاکوں میں کم از کم آدھے آپ کے لکھے ہوئے ہیں ورنہ یہاں اس قسم فوجی مذاق کرنے والا اور کون ہے؟ آپ کو اس بات سے انکار ہے؟"

کھچڑی داڑھی کے مالک سردار صاحب نئی نویلیوں کی طرح شرمائے اور بولے "میں بھی انسان ہوں ایک بار دھوکے میں آگیا لیکن آپ لوگوں کی طرح بار بار اس سے زیر بار تو نہیں ہوا۔ خیر میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ کو اس کی حرکت پر تعجب کیوں ہے۔"

"تعجب اس لئے ہے" میں نے وضاحت کی "کہ اردو رسائل تو تبصرے کے نام پر کتابوں کے علاوہ کچھ دیتے نہیں۔ اس شہر سے اُسے تبصرے کے لئے کتابیں مل نہیں ہوں گی کیوں کہ میں نے اُسے کچھ نہیں دیا اور دوسرا کوئی رسالہ یہاں سے نکلتا نہیں صرف کتابوں کے لالچ میں وہ کسی دوسرے شہر کا، جہاں سے اسے تبصرے کے لئے کتابیں مل سکتی ہوں، سفر کیوں کرے گا؟"

نظر صاحب نے وضاحت کی "اسے واقعی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دو تین کتابوں کی بات کی اور سات کتابیں میرے سر منڈھ گیا۔ ان میں اردو کی صرف ایک کتاب ہے باقی ہندی کی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں ہندی ادب میں خاص دلچسپی رکھتا ہوں۔"

"یہی کمال ہے۔ یہ ہندی کے ایڈیٹر بھی عجیب چیز ہیں تبصرے کے لئے کتابیں دینے کے پہلے دیکھ تو لیں کہ آدمی ہندی جانتا بھی۔۔" میری بات اس مرتبہ فکر صاحب نے کاٹی "گستاخی معاف ہو نظامی صاحب۔ اردو کے ایڈیٹر صاحبان کیوں اسے اردو دان سمجھتے ہیں؟۔ میں نے کہا آپ کا اعتراض درست ہے لیکن اردو میں وہ اپنا نام تو لکھ سکتا ہے۔ خط تو بھیج سکتا ہے۔۔۔"

نظر صاحب نے کہا "یہ بیکار کی بحث ہے۔ اس کے دھوکے میں کون نہیں آیا؟ بعد میں ہندی کے ایڈیٹر صاحبان بھی سمجھ لینگے کہ حضرت کیا چیز ہیں۔ اردو والے سمجھیں یا نہ سمجھیں مصیبت تو میرے سامنے ہے۔ لکھوں یا نہ لکھوں؟ آپ کی کیا رائے ہے نظامی صاحب؟"

"میری رائے ہے کہ آپ انکار کر دیجئے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا پھرے گا اور یہ اب بھی کر رہا ہے" میں نے اپنی رائے دی۔ "آپ کی رائے بہت معقول اور سنجیدہ ہے" فکر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ میں نے ان کا شرارتی اور طنزیہ لہجہ نوٹ کیا اور خاموشی اختیار کی۔ میں چونکہ ادیب جاسوسی کے معاملے میں شرارت کرتے کرتے ادب گیا تھا اسی لئے میں نے سنجیدہ رائے دی تھی۔ فکر صاحب نے بات جاری رکھی "لیکن انکار کرنا ممکن کس کے لئے ہے؟ کم از کم گوپی ناتھ جیسے گاودی آدمی کے لئے تو ناممکن ہے۔ ان کے دروازے پر اس نے بھوک ہڑتال کر دی تو وہ تو چوری چھپے کھائے گا ہی، یہ ضرور بھوک کے مر جائیںگے"

قہقہوں کا دور ختم ہوا تو گوپی ناتھ نظر بولے "مذاق تو اچھا ہوا لیکن مسئلہ جوں کا توں رہا"

میں نے نظروں ہی نظروں میں فکر کو تنبیہہ کی لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے بولے "مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ مرض سے افاقہ ہونے پر آپ جشن صحت کریں گے اور ہم لوگوں کو دعوت دیں گے"

نظر نے بخوشی یہ منظور کر لیا۔ ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔ خود یونیورسٹی کے ریٹائرڈ رجسٹرار ہیں اور ان کا اکلوتا بیٹا ایک چھوٹی فیکٹری کا مالک ہے۔ سردار صاحب نے بہت اصرار کیا کہ فکر بتا دیں کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فکر نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے "پردہ اٹھنے کے پہلے ہی آپ ڈرامے کا پلاٹ پوچھ رہے ہیں"

سردار صاحب بولے "ہم بھی اسٹیج پر آ جائیں تو کیا حرج ہے؟"

"جی نہیں" فکر صاحب نے قطعی فیصلہ کیا۔ "یہ مونو ایکٹنگ کا معاملہ ہے"

میں اٹھ کر چلا آیا۔ اس بار مجھے نہ مونو ایکٹنگ میں دلچسپی تھی نہ کٹھ پتلیوں کے تماشے میں۔ میں اس معاملے کو بالکل بھولنا چاہتا تھا لیکن ادیب صاحب اپنے متعلق کسی بات کو بھولنے دیں تب نا۔

ایک ہفتے کے بعد دھڑ دھڑاتے ہوئے میرے کیبن میں داخل ہوئے اور نعرہ لگایا "نظامی صاحب مبارک ہو"

میں نے تعجب سے انھیں دیکھا۔ نہ میری ترقی ہوئی تھی نہ کسی بچے کے امتحان کا نتیجہ نکلا تھا۔ نہ بیٹی کی شادی طے ہوئی تھی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا "کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں؟"

"آپ کے اس غلام کی ہر طرف شہرت ہو رہی ہے۔ اردو ادب میں تو میرے نام کا ڈنکا بج ہی رہا تھا، ہندی ادیبوں کے سر فہرست بھی میرا نام آنے والا ہے" ادیب صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "اب تو چائے پلا دیجئے حضور"

یہ ادیب جاسوسی کی خاص ادا ہے۔ اپنی کامیابی کو مخاطب کے لئے موجبِ خوشی بتانا، اس پر اُسے مبارک باد دینا اس مبارکباد کے عوض چائے چلایا موقع ہو تو کھانا کھانا۔ دوسروں کے بارے میں، اُن کے مرنے جینے میں ادیب صاحب کو کوئی نہیں تھی۔ مجھے جس بات کا اندازہ ہو رہا تھا اسے میں بالکل پسند نہ کرتا تھا۔ ادبی کتابوں اور تبصروں کو تو کم از کم ادیب صاحب کی دَ سے محفوظ رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن کیا کیا جائے، فکر کے منہ خون لگ چکا تھا۔

میں نے بے دلی سے کہا "مبارک ہو" اور چپراسی سے چائے کے لئے کہہ کر ایک مضمون کا مسودہ دیکھنے لگا۔

یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ادیب صاحب بولے "آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ کیا ہوا"۔

میں نے تقریباً غراتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے آپ اگنی کے لئے ہندی کی چھ کتابوں کا ریویو کر رہے ہیں اور اس اخبار کے تبصرے منظور کر لیئے ہیں۔۔۔۔ لیکن آپ نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ آپ کو ہندی آتی ہی نہیں ہے تو۔۔۔؟"

ادیب صاحب پھر طیش میں آ گئے "کیا ثبوت ہے آپ کے پاس اس بات کا کہ مجھے ہندی نہیں آتی! میں نے تو سوچا تھا اپنے دوست کی کامیابی سے خوش ہوں گے لیکن آپ بھی ان لوگوں میں سے ہو گئے جو مجھ سے جلتے ہیں"۔

مجھے غصہ آ گیا۔ پاس میں پڑا ہوا ایک ہندی رسالہ ان کے منہ پر مارا اور کہا "آتی ہے تو کچھ پڑھ کر سناؤ اس میں سے"

ادیب صاحب کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ اُٹھتے ہوئے بولے "میں آپ کے پاس ہندی کا امتحان دینے نہیں آیا"۔

ادیب صاحب تو ناخوش ہو کر چلے گئے لیکن مجھے معاملے سے کلیتہً مخلصی نہیں ملی۔ تقریباً پندرہ روز بعد ایک روز میں د تو ایک پریشان حال نوجوان کیبن میں میرا انتظار کرتا ملا۔

پوچھنے پر اس نے انتہائی لجاجت سے کہا "جناب اس وقت میرے اور میری بیوی بچے کے پیٹ کی روٹی آپ کے ہاتھ میں میں اگنی میں سب ایڈیٹر ہوں۔ ایڈیٹر صاحب نے مجھے سسپنڈ کر دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹالتے۔ آپ جا اُدیب جاسوسی نے جو تبصرے کئے ہیں انھیں کا معاملہ ہے نا؟

نوجوان نے ہاں کہا تو میں بولا "تمہاری غلطی تو ہو گی ہی لیکن اصل غلطی کرکرے صاحب کی ہے۔ انھیں پہلے دیکھنا تو چا کہ وہ جسے کتابیں دے رہے ہیں وہ ہندی جانتا بھی ہے یا نہیں۔ خیر، مفصل بتاؤ، ہوا کیا ہے"؟ کرکرے اگنی کے ایڈیٹر کا نام۔ اس نے بتایا "ادیب صاحب نے آپ ہی کا نام کرکرے صاحب کے سامنے لیا تھا اور کہا تھا کہ نظامی صاحب اچھی طرح جا کہ میں ہندی میں دو ناول لکھ چکا ہوں۔ اسی بناء پر کرکرے صاحب نے، جو آپ کے پرانے اور گہرے دوست ہیں، اُن پر اعتماد کر ہندی ادیبوں کے ناول انھیں دے دیئے۔ دس روز پہلے وہ سارے تبصرے لے کر ہمارے دفتر میں آئے اور کہا کہ نظامی صاحب تبصرے دیکھے ہیں اور انھیں پسند کیا ہے۔ اس روز کرکرے صاحب بہت مشغول تھے۔ مجھ سے بولے نظامی نے دیکھے ہیں تو پریشانی بات نہیں ہے، تم انھیں پریس میں بھجوا دو۔ میں نے بھی غلطی کی کہ بغیر دیکھے انھیں پریس میں بھجوا دیا اور وہ چھپ گئے۔ دوسرے د نے مجھے سسپنڈ کر دیا کہ میں نے خود تبصروں کو کیوں نہیں دیکھا۔ تبصرے عجیب طرح کے تھے۔ کتابوں کے نام، مصنفوں کے نام،

کے نام سب اصلی تھے لیکن کسی میں کوک شاستر کے متعلق رائے زنی کی گئی تھی کسی میں ماہی گیری کے متعلق۔ کرکرے صاحب بھی مصیبت میں ہیں۔ ان چھ مصنفین میں سے چار مصنف کل ہند شہرت کے حامل ہیں اور مقدمہ چلانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اخبار کے قارئین کے جو غصّے اور طنز سے بھرے خطوط آ رہے ہیں وہ علیٰحدہ ..... لیکن مجھے تو اپنی پڑی ہے۔ اگر آپ ..."

میں نے اس عرصہ میں طے کرلیا کہ کیا کرنا ہے۔ کرکرے صاحب سے ٹرنک ٹیلیفون پر بات کی اور انھیں ڈانٹا کہ ہر بے ہودہ آدمی میرا نام لے کر آئے تو کیا آپ میرے نام پر غلط سلط کام کریں گے؟ اس کے بعد ہم دونوں نے فون ہی پر طے کیا کہ کیا کرنا ہے کیوں کہ وہ بھی مصیبت کے مارے تھے، سب ایڈیٹر کی قربانی سے ان کی بات تو نہیں بنتی تھی۔ انھوں نے میری یہ تجویز منظور کرلی کہ دو مرتبہ اخبار کے پہلے صفحے پر یہ پورا قصہ چھاپا جائے کہ ایک ناخواندہ اور جھوٹے آدمی نے ایڈیٹروں سے پوچھے بغیر اور پریس سپروائزر کو دھوکہ دے کر مصنفین کو بدنام کرنے کے لئے اُلٹے سیدھے تبصرے چھپوا لئے۔ اس سلسلے میں اخبار اُن سے معافی مانگے۔ تبصرے میں نے خود کرنے منظور کر لئے لیکن اس کے عوض کرکرے سے وعدہ لے لیا کہ معطل سب ایڈیٹر کو واپس ملازمت میں لے لیں چاہے اسے ادبی شعبے کے علاوہ کوئی دوسرا کام دے دیں۔

چار چھ روز بعد فکر صاحب نے بتایا کہ ادیب صاحب پھر اگنی کے دفتر میں مزید کتابیں برائے تبصرہ لینے گئے تھے۔ مختصراً یہ ہوا کہ کرکرے نے انھیں بہت گالیاں دیں اور جب یہ از خود دفتر سے نہیں نکلے تو چپراسی سے دھکے دلوا کر انھیں باہر کردیا۔ بد قسمتی سے کرکرے کے کمرے کے باہر ان کا سامنا متعلقہ سب ایڈیٹر سے ہوگیا اور اس نے سب کے سامنے انھیں چار چھ جھاپڑ رسید کئے۔

میں نہ ہنسا۔ میں نے کہا "فکر صاحب! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ آخر کرکرے صاحب کا تو خیال کیا ہوتا۔"

"آپ کے دوست ہیں نا، اسی سے آپ کو ان کا درد ہے۔ لیکن میرے خیال میں ایسے ایڈیٹر کو ضرور سزا ملنی چاہیئے جو بے ہودہ آدمیوں کے کہنے میں آجائے۔"

میں لاجواب ہوگیا۔ □□

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین کے مجموعے

البتہ
قیمت ، دس روپئے

فقط
قیمت ۸/ روپئے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہیں

بے دھڑک مدراسی

شاعر کے گھر چور

جا جا کو تو میرے گھر میں چوری کرنے آیا نا رے آیانا
آیانا رے آیانا تو میرے چ گھر کو آیا نا رے

نہ میں کوئی نوڈ منسٹر گورنر ہوں نہ لیڈر رے
رشوت کھا کو جینے والا افسر ہوں نہ لائر رے
صورت دیکھ کو جان لے منجے میں ایک مفلس شاعر رے
کھایانا رے کھایانا تو اوندھی ٹھوکر کھایا نا رے

میری گھر ڑسی میں ہے منشی کچھ غزلیں کچھ افسانے
کھٹی امباڑے کی چٹنی موٹے چاول کے دانے
ٹوٹا صندوق پھٹے کپڑے جیب میں چلّر چار آنے
چکن املیٹ چھوڑ کو باڈ ابھکے بونڈے کھایا نا رے
آیانا رے آیانا تو میرے چ گھر کو آیا نا رے

ڈاکہ ڈال رے بنگلوں وہاں لوٹ کی کالی دولت ہے
اِک اِک رات میں بننے والی شدادوں کی جنّت ہے
اُجلے اُجلے تن کے اندر کالی کالی نیّت ہے
ایسے ایسوں کو چھوڑ کو تڑ نمے کو تڑ غا یا نا رے
آیانا رے آیانا تو میرے چ گھر کو آیا نا رے

رحمت بن کو آیا ہے تو میرا رستہ کر کو جا
دھندا تیرا [illegible] کچھ تو بھی دیکو جا
چندے سے بھی معذور ہے تو بیڑی ایک پلا کو جا
اچھے موقعے پو تو بادا شعراں سُننے آیا نا رے
آیانا رے آیانا تو میرے چ گھر کو آیا نا رے

محنت کی یاں بیک پڑی ہے رشوت کا نئیں غلہ رے
کام ملا تو شکھی ردی نئیں تو اللہ اللہ در رے
رہے تو ہنڈی بھر کو کھچڑی نئیں تو ٹھنڈا اُپلا رے
گرتی سو دیوار گراتے سبل پھاوڑا لایا نا رے
آیانا رے آیانا تو میرے چ گھر کو آیا نا رے

معاف کرو بھئی چور میاں کچھ نئیں ہے میرے کو پے میں
سوتی سو جھگڑا لو جورو وہ بھی پھیٹے بونتے میں
درجن بھر میں کابل پوتے میری بجٹ کے کھاتے میں
ہونا کتو بیدھڑک تو لیجا یہ چ میرا سرمایا نا رے
آیانا رے آیانا تو میرے چ گھر کو آیا نا رے

یہ جوتے ۔ گلیم بیدگی

یہ تھا عزم دل میں جو فولاد بن کر
نہ جاؤں گا سسرال داماد بن کر
(۱) مگر میری قسمت کی گردش تو دیکھو
پڑا اُن کے در پہ ہوں اولاد بن کر

شیروانی جو یہ پرانی ہے
پہلی شادی کی ایک نشانی ہے
(۲) جب پہنتا ہوں لوگ کہتے ہیں
کس محلے میں عقد خوانی ہے

عشق کی میزان میں مجنوں کو تولا جائیگا
کیا وزن ہے اس کا وہ لیلیٰ سے بولا جائیگا
(۳) جسکو دیکھو مبتلائے عشق جاناں ہے یہاں
عاشقوں کے شہر میں شوردم کھولا جائیگا

جہانگیر انس، سیوان (بہار)

ایک مفکر کا قول ہے "انسان ہنستا ہے لیکن فرشتے نہیں ہنستے اور ہنسیں بھی کیوں؟ ان کی زندگی تو مکمل ہے اور ہنسی نتیجہ ہے عدم تکمیل کا"۔ ایک جہاندیدہ شخص سے جب ہم نے یہ سوال کیا کہ "انسان کیوں ہنستا ہے"؟ تو انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا "انسان ہنستا اس لئے ہے کہ وہ ہنسنا چاہتا ہے"۔ اور یہ لاجواب کر دینے والا جواب سن کر ہم بھی ہنس پڑے۔

بقول شخصے ہنسنے سے انسان کا غم غلط ہو جاتا ہے"۔ اور آج کے دور میں کون ایسا ہے جسے کوئی غم نہیں۔ کوئی ڈگری نہ ملنے کے سبب غمگین ہے تو کوئی نوکری مل جانے کے سبب غمگین ہے، کسی کو لاولد ہونے کا غم ہے تو کسی کو کثرت اولاد کا غم ہے، کسی کو منسٹر نہ بننے کا غم ہے تو کسی کو منسٹر بن جانے کا غم ہے، کسی کو پیٹ بھر کھانا نہ ملنے کا غم ہے تو کوئی پیٹ سے زیادہ کھانے کے سبب غمگین ہے، کسی کو اپنی غربت کا غم ہے تو کوئی اپنی امیری کے سبب غمگین ہے، کسی کو اپنے جاہل ہونے کا غم ہے تو کوئی تعلیم یافتہ ہونے کے سبب غمگین ہے، کسی کو والدین کے مرجانے کا غم ہے تو کوئی والدین کے زندہ ہونے کے سبب غمگین ہے، کوئی اس لئے غمگین ہے کہ اس کی شادی نہیں ہوتی اور کوئی شادی ہو جانے کے سبب غمگین ہے اور کوئی اس لئے غمگین ہے کہ اسے کوئی غم کیوں نہیں ہے۔ غرض کہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی آج ایک ایسا شخص نہیں ملے گا جسے کسی کسی بات کا غم نہ ہو۔ اس لئے آج ہر شخص ہنسنے کی کوشش کرتا ہے بہ الفاظ دیگر ہنسنے کا سوانگ بھرتا ہے کہ اس طرح اس کا غم غلط ہو جاتا ہے اور وہ خود کو نائیٹروجن گیس بھرے ہوئے غبارے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ ہم نے غمگین لوگوں کو روتے دیکھا ہے ہنستے نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سماج کے ڈر سے یا خود کو انٹلیکچول ثابت کرنے کے لئے بعض لوگ غم کے موقع پر ہنسنے کا سوانگ بھرتے ہیں لیکن اس وقت ان کا چہرہ قابل دید ہوتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہنسنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہنسی اگر انسان کی فطرت میں شامل ہوتی تو ہر شخص ہر جگہ اور ہر وقت ہنستا دکھائی دیتا اور یہ دنیا، دنیا نہ ہو کر "ہنسی خانہ" ہوتی لیکن یہ دنیا ہنسی خانہ نہیں یہاں اگر ہنستے

ہوئے چہرے ملتے ہیں تو ایسے بھی چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں جن کے لئے ہنسی شجر ممنوعہ ہے۔ بعض لوگوں کے چہروں پر تو سال بھر ماتم برستا رہتا ہے۔ ہم تجربہ کی روشنی میں یہ کہنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ ہنسی کے مختلف وجوہ اور مختلف مواقع ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک آدمی جس بات پر ہنستا ہے دوسرے لوگ بھی اس بات پر ہنسیں۔ بعض مواقع تو ایسے ہوتے ہیں کہ جس بات پر ایک آدمی ہنستا ہے اُسی بات پر دوسرا آدمی روتا ہے۔ اب شادی کو ہی لے لیجئے۔ دُلہا ہنستا ہے اور دُلہن روتی ہے دُلہن کے عزیز و اقارب روتے ہیں حالانکہ انھیں ہنسنا چاہیئے کہ اس گرانی کے دور میں ایک آدمی کا خرچ کم ہو رہا ہے۔ دُلہا کے عزیز و اقارب ہنستے ہیں حالانکہ انھیں رونا چاہیئے کہ ایک آدمی کا خرچ بڑھ رہا ہے۔

آپ صبح صبح کسی بات پر بیوی سے لڑ کر منہ پھلائے بیٹھے ہیں اور اپنی حالت زار پر رونا چاہتے ہیں اتنے میں آپ کا ایک ملاقاتی آتا ہے اور آپ کو اس کے استقبال کے لئے ہنسنا پڑتا ہے آفس لیٹ پہنچنے کے سبب صاحب اپنی صاحبی دکھا رہے ہیں اور آپ ہنس کر اپنی خفت مٹا رہے ہیں۔ کبھی آپ خواہ مخواہ اس لئے ہنسنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اگر آپ نہیں ہنسیں تو لوگ آپ کو غیر مہذب سمجھیں گے۔

جس طرح ہنسی کے مختلف وجوہ اور مختلف مواقع ہوتے ہیں اسی طرح مختلف قسمیں بھی ہوتی ہیں:

مہذب ہنسی:۔ اس ہنسی کے جملہ حقوق مہذب حضرات کے نام محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ ایسے حضرات ہوتے ہیں جو ہمیشہ خود کو لیئے دیئے رہتے ہیں۔ محفلوں میں اگلی صف میں ان کی جگہ موجود ہوتی ہے۔ یہ کم بولتے ہیں۔ کسی بھی مسئلہ پر اپنی رائے سب سے آخر میں ظاہر کرتے ہیں۔ دعوتوں میں ان کے لئے اسپیشل انتظام ہوتا ہے۔ ان کی ہر خواہش حکم کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی بجا آوری سبھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایسے حضرات نہایت ہی نفاست کے ساتھ ہونٹوں کو ذرا سا وا کر دیتے ہیں۔ یہی ان کی ہنسی ہوتی ہے۔ یہ جس بات پر اپنے ہونٹوں کو وا کر دیتے ہیں وہ بات سند بن جاتی ہے اور بطور مثال استعمال ہوتی ہے۔

غیر مہذب ہنسی:۔ اس ہنسی کے جملہ حقوق غیر مہذب حضرات کے نام محفوظ ہوتے ہیں یعنی جنھیں تہذیب جدید کی ہوا ابھی نہیں لگی ہے غیر مہذب حضرات ہمیشہ کھل کر ہنستے ہیں جس سے ان کے پھیپھڑے کی گردش ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب حضرات کی بہ نسبت غیر مہذب حضرات کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ انھیں محفلوں میں کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ یہ بات بات پر ہنس دیتے ہیں ان کی ہنسی پر دس ہارس پاور کے ڈیزل انجن کے چلنے کا گمان ہوتا ہے۔

مسکین ہنسی:۔ جس طرح جانوروں میں ایک مخصوص جانور گدھا کہلاتا ہے اسی طرح انسانوں میں بھی ایک مخصوص طبقہ مسکین کہلاتا ہے۔ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے گدھا کی طرح ہی سیدھے سادے اور بے ضرر ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ دوسروں کے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ محفلوں میں پیچھے بیٹھتے ہیں۔ اکثر انھیں بیٹھنے کے لئے جگہ بھی نہیں ملتی۔ خود کو دوسروں سے کمتر سمجھتے ہیں ان کی ہنسی بھی ان کے حسب حال ہوتی ہے یعنی یہ جب ہنستے ہیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہنس رہے ہیں کہ رو رہے ہیں۔

غمگین ہنسی:۔ ایسی ہنسی جس میں آنسوؤں کی آمیزش ہو، غمگین ہنسی کہلاتی ہے۔ غم کے موقع پر ہنسنا معمولی بات نہیں یہ ہنسی انھیں لوگوں کے ہونٹوں پر آتی ہے جو بقول شاعر ؎

ہر فکر کو دھوئیں میں اُڑاتے چلے گئے
بربادیوں کا جشن مناتے چلے گئے

ہنسی:۔ اس ہنسی کا جملہ حقوق قاتلوں' مجرموں اور سخت دل انسانوں کے نام محفوظ ہوتا ہے۔ یہ ہنسی کسی سے بدلہ لینے یا
ب دینے کا عہد کرنے کے موقع پر ہنسی جاتی ہے یہ طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے ایک ایسے طوفان کا جو کسی کی زندگی کا چراغ
ا ہے یا کسی کو مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔

ان کے علاوہ "مصلحتی ہنسی" "معصوم ہنسی" وغیرہ ہوتی ہیں۔ ہنسی کا ایک منی اڈیشن بھی ہوتا ہے جسے مسکراہٹ یا تبسم کہتے ہیں۔
بڑی کشش ہوتی ہے۔ اس میں دنیا کو زیر و زبر کر دینے کی قوت ہوتی ہے۔ اس کی اسی کشش اور قوت سے متاثر ہو کر شعرأ نے
لیف میں وہ وہ موشگافیاں کی ہیں کہ فرشتوں کو بھی ہنسی آجاتی ہے (واضح رہے کہ فرشتوں کے لئے ہنسی شجر ممنوعہ ہے)
ہنسی کی ابتداء کب ہوئی اور کیوں ہوئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا صحیح جواب ملنا مشکل ہے۔ ویسے بعض حضرات کا کہنا ہے
یطان کی ایجاد ہے۔ حضرت آدم کو شجر ممنوعہ کھانے کے جرم میں جب جنت سے نکالا گیا تو شیطان اپنی اس کامیابی پر ہنس پڑا تھا۔
ہنسی کے بہت سے فوائد ہیں امریکی ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق ہنسنے سے عمر بڑھتی ہے اور صحت اچھی رہتی ہے اور بہت
ن دور ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جہاں غربت ہوتی ہے وہاں طرح طرح
ں پیدا ہوتے ہیں۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ ہسپتال کے بدلے "ہنسی خانہ" قائم کرے اور اس
ے متعین کئے جائیں جو لوگوں کو ہنسانے کے فرائض انجام دیں اس طرح دوا کا جو پیسہ بچے گا وہ منسٹروں کے الاؤنس میں
سبب بن سکتا ہے۔ ہنسی کے ذریعہ اپنی خفت مٹائی جاسکتی ہے۔ دوسروں کو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے افسر کی خوشنودی حاصل
تی ہے' ناراض بیوی کو منایا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ!

●●

شگوفہ کے دو یادگار خصوصی نمبر

ڈرامہ نمبر ★ کنھیالال کپور نمبر

قیمت: ۲۵ روپے قیمت: ۱۰/ روپے

کریک بتیادی

ایک شاعر اور ڈاکو

ایک شاعر مست و بےخود گنگناتا جھومتا
جا رہا تھا اپنی دھن میں جانے کیا کیا سوچتا

در حقیقت اس نے کہہ ڈالی تھی اک تازہ غزل
اب یہ وحشت تھی سنا دے وہ کسی کو برمحل

ہائے لیکن کوئی بھی باذوق ملتا ہی نہ تھا
اس لئے بےچارہ شاعر آگے بڑھتا ہی رہا

الغرض شہری علاقہ کو وہ پیچھے چھوڑ کر
گامزن تھا ناشناسا رہ گزر پہ بےخطر

رات کی تاریکیاں پھیلی تھیں ہر سو بےگماں
راستے پر پیچ دیکھا مثل گیسو الاماں

فکر لاحق ہوگئی شاعر کو میں آیا کہاں
مجھ کو میرا ذوقِ شعری کھینچ کر لایا کہاں

دیکھ کر خاموشیوں کا حال تا حدِ نظر
حالتِ شاعر ادھر ہونے لگی زیر و زبر

بس وہیں سے خود کو موڑا گھر کی جانب چل پڑا
اس کے معیارِ سخن پر جب نہ اک انسان ملا

سوچا اس نے اہلیہ کو ہی سنائے گا غزل
ذہن میں اس کے یہی اک فیصلہ تھا اب اٹل

دو قدم جیسے بڑھا آئی ڈپٹنے کی صدا
کون ہے تو کس لئے آیا ادھر فوراً بتا!

سن کے شاعر یہ صدائے ناگہانی خوش ہوا
جیسے اس کا گوہرِ مقصود اس کو مل گیا

ڈٹ کے بولا کون ہو تم سامنے آؤ ذرا
پھر سناؤں گا میں تم کو اپنے دل کا مدعا

اس کو کیا معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کا قافلہ
لے چکا ہے اپنے نرغے میں اسے مثل قضا

ڈاکوؤں نے روشنی میں ٹارچ کی دیکھا اسے
مل گیا موٹا آسامی سوچ کر سب خوش ہوئے

دیکھ کر پیراہنِ شاعر انھیں ایسا لگا
جیسے ہو نواب کوئی راستہ بھولا ہوا

قد موافق۔ شکل و صورت سے ٹپکتا تھا جلال
اور اس پر اس کی بےباکی تعجب کی مثال

ڈاکوؤں نے سوچا کچھ۔ اور پھر ہوئے یوں ہمکلام
آیئے نواب صاحب آپ کے ہیں ہم غلام

اس شبِ تاریک میں کیونکر بھٹکتے ہیں جناب
کیا ہمارے گھر ٹھہرنے سے کریں گے اجتناب

سن کے باتیں ڈاکوؤں کی سوچا شاعر ہو نہ ہو
کوئی میری شکل کا نواب اس بستی میں ہو

ساتھ ان کے شعر گوئی کا مزہ آئے گا خوب
رات بھر ان کو بیاض اپنی پلائے گا خوب

پھر تو شاعر ہوگیا تیار چلنے کے لئے
ڈاکوؤں نے بھی غنیمت مال سمجھا چل پڑے

لا کے عزت سے بٹھایا اُسکو اپنی غار میں
کی بہت خاطر مدارات اجنبی سرکار میں

رات کافی ڈھل چکی تھی درمیانِ خورد و نوش
شاعرِ مدمت کو کچھ بھی نہیں تھا اس کا ہوش

تھا بڑا مسرور اپنے دل ہی دل میں اس قدر
جیسے اک بھٹکے مسافر کو ملی ہو رہ گزر

بعد کھانے کے غزل پڑھنے کی تھی اسکو خوشی
اس خوشی سے اس کے دل میں چھوٹتی تھی پھلجھڑی

جیوں ہی کھا کر حضرتِ شاعر نے لی لمبی ڈکار
آئی اس پر ڈاکوؤں کی آفتِ نا اختیار

ہاں تو حضرت سب سے پہلے آپکا ہے نام کیا؟
کس جگہ رہتے ہیں صاحب اور کرتے کام کیا؟

اِتنا سُننا تھا کہ شاعر کو پسینہ آ گیا
منجمد خوں ہو گیا آنکھوں پہ نزلہ چھا گیا

ڈر کے بولا وہ۔ کہ میرے کام سے کیا واسطہ
میں ہوں اک بیکار، گھر بھی ہے نہیں کوئی مرا

یوں سمجھئے اک کرائے کے مکاں میں ہوں مقیم
اور بد قسمت بھی کیونکہ ہوں میں بچپن سے یتیم

اس پہ اللہ کے کرم سے سات بچے ہیں مرے
ٹیچری کرتا ہوں ان کی پرورش کے واسطے

اہلیہ بھی ہے مریضِ دائمی اللہ قسم
آپ ہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اب میرا بھرم

حضرتِ شاعر کی ساری حق بیانی رَد ہوئی
ڈاکوؤں نے اس کی باتوں پر یقیں ہرگز نہ کی

ڈانٹ کر بولے کہ تم احمق بناتے ہو ہمیں
سچ بتاؤ! ورنہ گولی مار دیں گے ہم تمہیں

لاؤ! تیرے پاس ہے جو کچھ رقم رکھدو یہاں
بے سبب یوں موت اپنی مت بلا اے ناتواں

کانپتے ہاتھوں سے شاعر نے ٹٹولی اپنی جیب
جس میں بچوں کے لئے بسکٹ تھے کچھ مرجھائے سیب

دوسرے پاکٹ میں تھا کاغذ کا اک ٹکڑا پڑا
جس پہ کچھ ٹیڑھی لکیروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

ڈاکوؤں کے سامنے جو کچھ تھا لا کے رکھدیا
تھرتھراتے لَب سے پھر کچھ اسطرح گویا ہوا

بس کہ میرے پاس اب اسکے سوا کچھ بھی نہیں
آپ کی مرضی کریں یا نا کریں میرا یقیں

دیکھ کر شاعر کی خالی جیب ڈاکو کہہ اُٹھے
ہم تو تجھ سا آجتک پھکڑ کوئی دیکھے نہ تھے

ہاں تو اب تیار ہو جا یار مرنے کے لئے
کہدے تیری آخری خواہش ہے کیا اے دل جلے

اتنا سُنتے ہی دلِ شاعر ہوا پھر باغ باغ
جیسے اسکے سامنے روشن ہوا بجھتا چراغ

ڈوبتی آنکھوں میں پھر اک بار کوندی روشنی
ٹوٹتی سانسوں میں پیدا ہو گئی پھر زندگی

بے دھڑک اس نے اٹھائی سامنے کاغذ جو تھا
اور تن کر ڈاکوؤں سے یوں مخاطب ہو گیا

آخری خواہش ہے میری بس یہی اے محترم
اک غزل سن لو کیا ہے آج ہی جسکو رقم

بالیقیں جو قافیہ بحر و وزن سے دور ہے
ہاں مگر اس میں لغذ شاعری بھرپور ہے

اور دعویٰ ہے مرا ہر شعر پہ یوں گا میں داد — آپ بھی بے ساختہ کہہ دینگے "شاعر زندہ باد"
اتنا کہہ کر جیوں ہی شاعر مصرعۂ اولیٰ پڑھا — بس کہ فوراً ڈاکوؤں کو دردِ سر پیدا ہوا
بھاگو بھاگو چھوڑ دو دیوانہ ہے یہ ناتواں — اس کے چکر میں کریں کیوں رات اپنی رائیگاں
چل کے ڈھونڈیں دوسرا سر غاکہ بیڑا پار ہو — جس کا پاکٹ گرم ہو جو واقعی زردار ہو
اتنا کہہ کر ڈاکوؤں نے رُخ کیا گاؤں کی اور — اب تو شاعر نے کیا ہنگامہ ہائے زور و شور
پھاڑتا تھا وہ حلق کہتا تھا جاتے ہو کہاں — اب تو سُننا ہی پڑیگا یہ غزل تم کو یہاں
آگے آگے ڈاکوؤں کا قافلہ تھا گامزن — اور پیچھے پیچھے شاعر دوڑتا تھا من و عن
اور پڑھے جاتا تھا مصرعہ الٹا سیدھا بار بار — دوڑنے کی دھن تھی اسکو دوڑتا تھا دھن میں یار
اتنے میں ٹکرا گیا بے چارہ اک چٹان سے — اور غش کھا کر وہیں یہ گر گیا ایمان سے

"ہائے شاعر یہ ترا مرضِ سخن بھی خوب ہے
واقعی ساری حماقت تجھ سے ہی منسوب ہے"

O

غزل

یوسف یکتا

کیا کماتا ہے بھیجتا کیا ہے
ابے لونڈے تجھے ہوا کیا ہے

دیکھ اچھی طرح اُجالے میں
گُھپ اندھیرے میں دیکھتا کیا ہے

دل دیا ہے تو جان بھی دے دے
ارے نادان سوچتا کیا ہے

بھیڑ کیسی ہے کوچۂ جاناں میں
"کچھ نہیں ہے تو پھر ہوا کیا ہے"

گا رہے ہیں مگر نہیں معلوم
"ٹھمری کیا اور دادرا" کیا ہے

آہ! پنشن بھی بک گئی یارو
پاس یکتا کے اب رہا کیا ہے

نظر برنی
(نئی دہلی)

ماڈرن غالب

[پہلا ایکٹ، پہلا سین]

[ایک آراستہ و پیراستہ وسیع کمرہ۔ دیوار پر تازہ سفیدی پتی ہوئی، بوسیدہ ایرانی قالین جس پر چیتے کی کھال کا ایک ٹکڑا اپڑا ہوا ہے تین تکیئے ادھر اُدھر پڑے ہوئے جن پر نہایت خوبصورت ریشمی غلاف چڑھا ہوا۔ درمیان میں ایک اُونچا سا خاصدان نظر آرہا ہے جس میں چاندی کے ورق سجے ہوئے ہیں۔ دروازوں پر جالی کے پردے۔ غالب کی بغل میں ان کے ایک قریبی دوست بنسی دھر بیٹھے ہوئے ہیں محفل میں ان دونوں کے علاوہ غالب کے عزیز ترین شاگرد نواب مصطفےٰ احسان شیفتہ اور الطاف حسین حالی بھی سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ غالب کے پاس حقّہ رکھا ہے جسکی نَے ان کے ہاتھ میں ہے]

کلیان داخل ہوتا ہے۔

کلیان: "حضور!"

غالب: (سر اُٹھاکر) "کہو، کلیان کیا بات ہے؟"

کلیان: "حضور! مفتی صاحب، تشریف لائے ہیں۔"

غالب: "اچھا، اندر بھیج دو، مگر دیکھو، وہ سامنے والی بوتل تو کہیں چھپا دو، ورنہ مفتی صاحب مقدمہ قائم کردیں گے۔"

کلیان: "بہتر ہے۔"

[کلیان جھٹ سے شراب کی بوتل کو ہاتھ میں اُٹھا لیتا ہے اور اسے زنان خانے پہنچا دیتا ہے۔ تھوڑی دیر میں مفتی صدر الدین آزردہ کلیان کے ہمراہ غالب کی نشست گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ غالب اور دوسرے حاضرین بغرض احترام و تکریم کھڑے ہوجاتے ہیں اور کورنش بجالاتے ہیں]

غالب: "سلام عرض کرتا ہوں۔"

مفتی: "وعلیکم السلام۔ کہئے مرزا صاحب، مزاج تو اچھے ہیں؟ کیا آجکل بیگم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں؟"

غالب: "جی ہاں آج کل وہ اپنے میکے تشریف لے گئی ہیں، اس لئے اطمینان کا سانس لے رہا ہوں اور چین کی بنسی بجا رہا ہوں۔ میں نے تو آج ہی بیگم کو ایک مراسلہ روانہ کیا ہے اور شکایت کی ہے۔

تجھ کو میکے کا مزہ مجھ کو نقطہ ہجر ملا
اب نہ اس میکہ نوازی سے مجھے طیش دلا
کیا یہی ہے مری دیرینہ محبت کا صلا
تجھ سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا"

[تمام حاضرین اس مراسلہ پر داد دیتے ہیں]

غالب: "میں اپنی بیگم سے جتنا خائف رہتا ہوں، شاید چوہا بھی بلی سے اتنا نہ خوفزدہ ہوگا؟"

مفتی: "کیا آپ زن مرید ہوگئے ہیں؟"

غالب: (کچھ جھینپتے ہوئے) "جی ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لیجئے، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ آخری وقت میں صرف نیک اعمال اور شریک حیات کی رفاقت ہی کام آتی ہے۔ یوں بھی یہ میرا دوسرا جنم ہے اور نئے زمانے کا سلوگن بھی یہی ہے کہ لیڈیز فرسٹ۔ میرا خیال یہ ہے کہ لیڈیز فرسٹ اینڈ لاسٹ دونوں ہوتی ہیں۔ میں نے بیگم کے نام دوسرے مراسلہ میں یہ عرض کیا ہے۔

پتلی پتلی مری حالت ہی سہی
پھوٹی کوڑی میری قسمت ہی سہی
"زن مریدی" مری قسمت ہی سہی
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

ربط ہے خاص ہمیں بیگم سے
یہ بہاریں ہیں ترے ہی دم سے
لطف پاتے ہیں ڈبل ہم غم سے
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

تیرے میکے سے گلا کرتے ہیں
اپنے موقف کو لکھا کرتے ہیں
ہاں ہاں اتنی سی خطا کرتے ہیں
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں

سانس گھٹتی ہے نہ گھبرائیے اسد
دل کھلونوں ہی سے بہلائیے اسد
مار کھاتے ہیں نہ شرمائیے اسد
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

[تمام حاضرین داد و تحسین کا اظہار کرتے ہیں]

مفتی: "اچھا مرزا صاحب، اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!"

غالب: "خدا حافظ!"

[غالب مہمان کو رخصت کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے فرش کے کونے تک آتے ہیں تاکہ مفتی صاحب روشنی میں اپنا جوتا دیکھ کر پہن لیں]

مفتی: "مرزا صاحب" آپ تشریف رکھیں" اتنی زحمت کیوں فرماتے ہیں؟"

غالب: "قبلہ میں آپ کا جوتا دکھانے کے لئے شمعدان نہیں لایا ہوں بلکہ اس لئے آیا ہوں تاکہ آپ کہیں میرا جوتا نہ پہن لیں"

[سب لوگ قہقہہ بلند کرتے ہیں]

[پہلا ایکٹ، دوسرا سین]

[مرزا غالب کی نشست گاہ۔ شام کا وقت۔ قریب ہی شراب کی بوتل اور کئی گلاس رکھے ہوئے۔ مرزا عالم نشہ میں ہیں اور بڑی پُرلطف باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے کئی شاگرد بھی بیٹھے ہوئے ہیں]۔

[مرزا غالب پلنگ پر بیٹھے ہوئے کراہتے ہیں۔ مرزا ...

نامور مزاح نگار

مجتبیٰ حسین کے مضامین کے مجموعے

تکلف برطرف

قیمت : ۱۴/ روپے

بہرحال قیمت ۱۰/ روپے

آدمی نامہ (خاکے)

قیمت : ۹/ روپے

بالآخر

قیمت : ۱۴/ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

...ہیں)

... "استاد! آپ کی طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ... آپ اجازت دیں تو میں آپ کا جسم داب دوں؟"

...بھئی تو سید زادہ ہے۔ مجھے کیوں گنہ گار کرتا ہے"

...عذر کو خاطر میں نہیں لاتے اور جھٹ فرش سے اُٹھ ... بیٹھتے ہیں اور اجازت کے بغیر غالب کے پاؤں ...ہیں۔

...اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت ...ے گا؟"

...ں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

...دیر تک مجروح اپنے استاد کے ہاتھ پاؤں دابتے ہیں

...اچھا، ہماری اُجرت ادا کر دیجئے۔"

...کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے ...پیسے دابے۔ حساب برابر ہوگیا۔ اب کیسی اُجرت؟"

...رد: "محترم استاد! یہ شراب خوری، بہت بڑی سماجی ...۔ اس سے فائدہ تو کوئی ہوتا نہیں، البتہ نقصان ...ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شراب خور کی دُعا بھی قبول ..."

...: بھائی جس کو شراب میسر ہے اُس کو اور کیا ...ں کے لئے وہ دُعا مانگے؟"

...رد: مرزا صاحب، رتھ مذکر ہے یا مونث؟

... دیکھو جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو کہو ...، اور جب مرد بیٹھے ہوئے ہوں تو کہو رتھ ...

قصہ تمام ہوا۔

(سب ہنستے ہیں)

■■

ھزل

مہمل لکھنوی

زندگی تھی کہ پیاز کی گٹھی — عمر چھلکے اتارتے گزری
بھلا دُنیا کو کیا سنوارتے ہم — زُلف اُن کی سنوارتے گزری
ہر مہینے منڈلایا سر ہم تے — اُن پہ تنخواہ وارتے گزری
غیر مطلب نکال چلتے بنے — میری عرضی گزارتے گزری
عشق کی گیس پیٹ میں جو بھری — لمحہ لمحہ ڈکارتے گزری
بڑھ کے دو لفظ کہنا مشکل تھا — دور سے ہی کھنکارتے گزری
"اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے" — نظر ان کی اُتارتے گزری
وہی کہتا ہے مجھ کو آج بلیک — رنگ جس کا نکھارتے گزری

کیسے بادام پستے اے مہمل
مونگ پھلیاں ٹھنگارتے گزری

مٹکا

اسعد احمد مجیدی

غُربت نے پہلے ہی کیا درگور ملک کو
باقی جو تھی سو جان کو مٹکا نگل گیا

محنت کی تھی کمائی گئی جو حرام میں
مزدور اور کسان کو مٹکا نگل گیا

نمبر کی ہے لگن جو سحر سے تو شام تک
انسانیت کی شان کو مٹکا نگل گیا

اسعد کی بات مان کے باز آ جائیو
ورنہ سمجھ لو آن کو مٹکا نگل گیا

غزل

سراج نرملی

تنگ آ چکے بھتیجے! تمہاری چچی سے ہم
کب تک کریں نباہ بھلا چڑچڑی سے ہم

ملتے نہیں خیال نئے، قافئے ہیں تنگ
لکھوائیں گے غزل کسی اُستاد ہی سے ہم

دو بیویوں کے بیچ ہیں، نٹ یال کی طرح
"تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم"

اپنی بساط کیا؟ بہ طفیلِ سمیع سراج
"زندہ دِلوں" میں آ گئے زندہ دلی سے ہم

عابد معز

جانوروں کی کانفرنس

فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بجھانے کے لئے انسانوں نے اپنی تمام توجہ اور قابلیت کو جھونک دیا۔ حکومت کے ذمّہ داروں نے لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس کے شل برسائے، فائرنگ کی، مختلف اشخاص کو مختلف الزامات کے تحت گرفتار کیا اور چند قائدین کو قیامِ امن کے لئے نظربند بھی کیا گیا۔ امن پسند شہریوں نے امن کمیٹیاں بنائیں۔ نوجوانوں نے شانتی سینا تشکیل دی۔ دانشوروں اور قائدین نے اخبار اور رسائل کے لئے بیانات دیئے اور ریڈیو اور ٹی وی پر اپیلیں نشر کیں۔ فسادات کی وجوہات اور انسدادی تدابیر کے سلسلے میں گھروں پر بحث و مباحثہ سے لے کر کانفرنس اور سمینار منعقد کئے گئے۔ عوامی اور عدالتی تحقیقات بھی ہوئیں۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ صفر ہی رہا۔ امن پھر بھی بحال نہ ہوسکا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار نہ رہ سکی۔ ایسے نازک موقع پر جانور بھی اپنا حقِ "انسانیت" ادا کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ گھوڑے کی تحریک پر چند دانشور جانوروں نے جس میں خرگوش، لومڑی، گائے اور کبوتر شامل تھے فرقہ وارانہ فسادات پر ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ گھوڑا عقل مند ہے۔ تدبّر اور فراست میں یکتا ہونے کے ساتھ انسانوں کا دیرینہ رفیق بھی ہے۔ ان خوبیوں کے پیشِ نظر جناب گھوڑا کو بہ اتفاق آراء کانفرنس کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ انتظامات کو قطعیت دینے کے بعد کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا نے اپنا ایک صحیفائی نوٹ بعنوان "فرقہ وارانہ فسادات پر جانوروں کی کانفرنس" صحافت کے حوالے کیا "حیدرآباد کے طویل اور بدترین فرقہ وارانہ فسادات پر تمام پرند، چرند اور درند گہری تشویش اور دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ تشدّد چاہے جس نام پر کیا جائے قابلِ مذمت ہے۔ ہم جانوروں کو خود سے زیادہ انسانوں سے تعلق خاطر رہا ہے۔ ہم انسانوں کی بربریت پر خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا تمام جانوروں نے فیصلہ کیا ہے کہ ورلڈ لائف ہال میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس کی صدارت صدرِ جنگل شیر کریں گے۔ حضرت انسان کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے۔ حضرت انسان کے علاوہ ہم کسی اور جانور کو دعوت نہیں دیں گے۔ ہر جانور کا انسانی فرض ہوگا کہ وہ کانفرنس میں شریک رہے۔ کانفرنس کے فوری بعد صدرِ جنگل جناب شیر کی قیادت میں شہر کے متاثرہ محلّوں میں جانوروں کا امن جلوس نکالا جائے گا۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس کانفرنس اور

امن جلوس کے پیچھے کسی بڑی علاقائی یا فرقہ وارانہ جماعت کار فرما نہیں ہے اور نہ ہی کسی باہر کے ہاتھ کی کارستانی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ کانفرنس اور جلوس کا محرک انسانوں کے داخلی امور میں مداخلت کا جذبہ بھی نہیں ہے۔ یہ بات انسانوں پر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جانور تہذیب، مذہب اور علاقہ واریت کی سطح سے بہت نیچے ہیں اور ہمارا مقصدِ حیات انسان کی خدمت ہے۔"

حکومت کے ذمہ داروں کی جانب سے جانوروں کو شہر میں کانفرنس کے انعقاد اور وہیں امن جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کنوینر کانفرنس کے بیان کے بعد شہر میں آوارہ مویشیوں کو گرفتار کر کے بنجر دوڑی میں قید کیا جانے لگا۔ ان اقدامات کے ساتھ ہی پریس نے کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔

س: جانوروں کی کانفرنس کے خلاف حکومت کے اقدامات پر آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: اقدامات حکومت کر رہی ہے اور آپ خیال ہمارا جاننا چاہتے ہیں۔ جہاں تک کانفرنس کا سوال ہے وہ شہر میں نہ سہی جنگل میں مقررہ دن ضرور ہوگی۔

س: کیا آپ لوگ اسے وقار کا مسئلہ بنا رہے ہیں؟ ج: جناب والا عزت، شرافت، وقار، نیکی، بدی جیسے الفاظ ہم جانوروں میں رائج نہیں ہیں۔

س: کیا آپ حکومت سے احتجاج کریں گے؟ ج: احتجاج کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا اسی لئے ہم خاموش رہیں گے۔

س: چند جانوروں کی گرفتاری کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: انھیں گرفتار کیا گیا۔ وہ گرفتار ہوئے۔ اس میں کونسی نئی بات ہے جس پر ہم رائے زنی کریں۔

اسی طرح اور چند غیر ضروری سوالات کئے گئے جن کے جوابات جناب گھوڑا گول کر گئے۔ دوسری صبح اخباروں نے مختلف سرخیاں لگا کر کنوینر کانفرنس کے ظاہر کردہ خیالات کو بدل دیا۔ کسی نے لکھا گول مول جوابات دینا جانوروں کا شیوہ ہے کسی اخبار نے جانوروں پر ظلم کی سرخی لگائی۔ پریس کی کارستانی دیکھ کر جناب گھوڑا زیرِ لب مسکرا کر رہ گئے۔

مقررہ دن کانفرنس شہر سے دور ایک وسیع میدان میں مقرر کی گئی وقت سے پہلے ہی جوق در جوق جانور جمع ہونے لگے۔ ہاتھی اور کتا ایک ساتھ تبادلہ خیال کرتے ہوئے میدان میں آئے۔ گائے کی پیٹھ پر کوا اور بھینس پر بگلا بیٹھ کر آئے۔ صدرِ کانفرنس جناب شیر کو جلوس کی شکل میں لایا گیا۔ کئی پرندے اڑتے ہوئے آئے اور پاس کے درختوں پر بیٹھ گئے۔ مگرمچھ اور مچھلیاں میدان کے قریب موجود تالاب میں بیٹھ گئیں۔ چند نوجوان جانور اپنے ہاتھوں میں تختیاں تھامے ہوئے تھے جن پر مختلف نعرے درج تھے۔ "تمام انسان بھائی بھائی ہیں" "انسانو! اپنا مقام پہچانو" مقررہ وقت پر کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا چٹان کے بنے شہ نشین پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنا گلا صاف کر کے کہا "میں تمام شرکائے کانفرنس کا استقبال کرتا ہوں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم آج انسانوں کی درندگی اور بربریت پر غور کرنے کے لئے اس میدان میں جمع ہوئے ہیں۔ میں صدرِ کانفرنس جناب شیر سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ صدارت کے لئے شہ نشین پر تشریف لائیں۔ جناب صدر کی رہبری محترمہ بکری کریں گی۔" بکری صاحبہ صدر کے لئے راستہ بناتے ہوئے انھیں شہ نشین پر لے آئیں۔ سامنے بکری اور پیچھے شیر ایک منفرد اور قابلِ دید منظر تھا۔ جناب صدر اپنی نشست سنبھالنے کے بعد

ضرین سے مخاطب ہوئے" ہم نے حضرت انسان کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا تھا۔ انھوں نے شرکت سے معذوری ظاہر
ہے۔ اپنے پیغام میں لکھا ہے کہ شرمندگی اور احساسِ ندامت کے باعث وہ کانفرنس میں شرکت سے معذور ہیں۔ فسادات
ان کے ماتھے پر کلنک ہیں اور حضرت انسان میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ بدنامی کا بوجھ اُٹھائے کانفرنس میں مہمانِ خصوصی
حیثیت سے شریک ہوسکیں۔ وہ کانفرنس کی کامیابی سے زیادہ امن اور سکون کی بحالی کے لئے دُعا گو ہیں۔ اب میں جمیع حاضرین
ے گزارش کرتا ہوں کہ وہ مہلوکین کے سوگ میں دو منٹ کی خاموشی منائیں"۔ ساری محفل میں سناٹا چھا گیا۔ کبھی کبھار اُبھرنے
ا کھانسی اور کھنکھارنے کی آوازیں بھی سُنائی نہیں دیں۔ دو منٹ ختم ہونے کے بعد جناب گھوڑا نے خاموشی کو توڑا" اب میں
ب صدر سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تقریر سے کانفرنس کا آغاز کریں۔

زبردست تالیوں کے شور میں جناب شیر نے اپنی تقریر شروع کی۔ میں آپ تمام صاحبین کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس
دس کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے۔ انسانوں کے فرقہ وارانہ فسادات پر ہر جانور دل برداشتہ ہے۔ ایسی درندگی ہم
ندوں نے بھی نہیں دیکھی۔ درندگی کے لئے میں اور میرے بھائی جناب چیتا، بور بچہ، ببر ساری دنیا میں بدنام ہیں لیکن ہماری درندگی
یک مقصد ہے۔ ہم اپنی غذا کے لئے چرندوں کا شکار کرتے ہیں چرند جانوروں کا یہ مقسوم ہے۔ درندے اپنی ہم جنس کا شکار
ں کرتے لیکن انسان بلا کسی مقصد اور وجہ اپنے بھائیوں کا قتل و خون کرتا ہے۔ ایسی درندگی کی مثال ہم درندوں میں بھی
ں پائی جاتی۔ انسان کی اس درندگی کی وجہ کیا ہے؟ فسادات کیوں پھوٹ پڑتے ہیں؟ ان پر کیسے قابو پایا جائے؟ ان سوالات پر
رنے کے لئے یہ کانفرنس منعقد کی گئی ہے اب میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ باری باری اپنے زریں خیالات کا اظہار کریں"۔

جناب شیر کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ جھومتے ہوئے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ محترمہ ہرن اپنی جگہ سے اٹھیں اور نشین پر پہنچ کر اپنے
لات کا اظہار کرنے لگیں۔" عوام کی اکثریت امن پسند ہوتی ہے۔ ہر فرقہ اور نسل میں مٹھی بھر شر پسند عناصر ہوتے ہیں جو اپنے مفاد
خاطر عوام کے جذبات کا استحصال کرتے ہیں۔ مذہب، علاقائیت، زبان اور نسل کے نام پر فساد برپا کرتے ہیں۔ ایسے افراد
ان نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کے بھیس میں بھیڑیئے اور درندے ہوتے ہیں۔ میں تمام جانوروں کی جانب سے شر پسند عناصر پر
ت بھیجتی ہوں" اتنا کہہ کر ہرن صاحبہ اپنی جگہ جا بیٹھیں بھیڑیئے صاحب نے پھرتی دکھلائی، چھلانگ لگا کر نشین پر پہنچے" ابھی
ا صاحبہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں ان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ عوام کی اکثریت امن پسند ہوتی ہے ساتھ
میں ان کے اس جملے پر کہ شر پسند عناصر انسانوں کے بھیس میں بھیڑیئے اور درندے ہوتے ہیں، سخت احتجاج کرتا ہوں۔ ہم
ذر، انسانوں کی درندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی انسانوں کی درندگی کے لئے بطور استعارہ ہمیں استعمال کیا جا سکتا ہے
سوم بے گناہ انسانوں کا بلا کسی مقصد قتل کیا جاتا ہے۔ نام پوچھ کر زندگی ختم کی جاتی ہے۔ بھوکوں کے لئے چاول، بچوں کے لئے
دھ، اور بیماروں کے لئے دوائی لانے کے لئے گھر سے باہر نکلنا موت کا بہانہ بنتا ہے۔ پچھلے فسادات میں ایک تلگو شاعر کے گھر پہنچ کر
ا کے خاندان کو ختم کیا گیا۔ ایک عبادت گاہ میں مصروف عبادت بچوں اور بوڑھوں کا قتل کیا گیا۔ کمزور صنف عورت پر جو ان

کی ماں بھی ہے قاتلانہ حملے کئے گئے۔ کیا ایسی درندگی کی مثال ہم جانوروں میں ملتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ بہتان کیسا؟" اس سوال کے بعد جناب بھیڑیئے جذبات کی شدت سے کانپتے ہوئے اپنی جگہ جا بیٹھے۔

محفل میں کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سبھی سوچ رہے تھے کہ ہرن صاحبہ کو اپنے الفاظ واپس لینے کے لئے کہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا جانور اس تحریک کو لئے اُٹھتا، خود ہرن اپنی جگہ کھڑے ہوکر گویا ہوئیں "میں اپنے کہے ہوئے الفاظ پر نادم ہوں۔ جناب بھیڑیئے کے خیالات میں سچائی ہے" اتنا کہہ کر ہرن صاحبہ بیٹھ گیئں۔ تقریر کے لئے محترمہ گائے اور جناب گدھا ایک ساتھ اُٹھے۔ جناب گدھا اپنا جسم جھٹکتے رہ گئے جب کہ محترمہ گائے نے سٹیج نشین پر پہنچ کر اپنی تقریر شروع کی "واقعی انسانی درندگی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مذہب کے نام پر انسانوں نے درندگی کی ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ آج کل طاقت اور تشدد کے مظاہرے کے لئے نئے نئے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلوس کے ساتھ ہر قسم کا ہتھیار ہوتا ہے۔ جلوس میں شامل انسان مختلف دل آزار نعرے لگاتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور موقع ملتے ہی فساد برپا کرتے ہیں۔ شادی کے جلوس بھی فسادات کا موجب بنتے ہیں۔ اشتعال انگیز تقاریر سے بھولے بھالے اور معصوم انسانوں کے دلوں میں تعصب اور نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ اس درندگی کا تاریک پہلو یہ ہے کہ میرے نام پر بھی اکثر فسادات ہوئے ہیں۔ میں اور میری بہن بھینس صاحبہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے جگر کے ٹکڑوں کا حق تلف کرتے ہوئے انسانوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ ہم کبھی یہ سوچتے بھی نہیں کہ ہمارا دودھ پینے والے کا مذہب کیا ہے۔ وہ کس علاقہ کا رہنے والا ہے۔ اس کی زبان کونسی ہے۔ اس کا رنگ کیا ہے۔ ہم جانور مذہب، علاقہ، رنگ، نسل اور ذات پات سے بے نیاز ہو کر بنی نوع کی خدمت کرتے ہیں اور خود انسان، انسانیت کا دشمن بن کر اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ جانے کب انسان کو عقل آئے گی!!" محترمہ گائے اپنی تقریر ختم کر کے سٹیج نشین سے اتریں کہ جناب گدھا سٹیج نشین پر پہنچتے ہوئے کہنا شروع کیا "حضرت انسان بے وقوفیوں کی ذمہ داری میرے سر باندھتا ہے۔ ہمیشہ مجھے بے وقوف، احمق اور ناسمجھ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت انسان کیا بتلائیں گے کہ معصوم اور بے گناہ انسانوں کو قتل کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ کہتے ہیں فسادات میں اِس فرقہ کے چار لوگ اور اُس فرقہ کے چھ لوگ قتل ہوئے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ دس انسان اپنی جان گنوا بیٹھے۔ انسان کے پاگل پن اور جنون کا اندازہ لگایئے کہ وہ غلط شناخت کی بنا پر اپنے ہی فرقہ کا خون بہاتا ہے۔ مزید برآں اخبار میں سرخی بھی لگتی ہے "غلط فہمی کی وجہ ہلاک" کوئی بتلائے دوسرے فرقہ کے انسان کو قتل کرنا کونسی خوش فہمی ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ حضرت انسان مذہب کے نام پر خون بہاتا ہے کوئی انسان بتلائے کونسا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے؟" جناب گدھا کی تقریر ختم ہوئی۔ چہار طرف سے "شیم شیم شیم" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ صدر کانفرنس جناب شیر کو چنگھاڑ کر حاضرین کو خاموش کرنا پڑا۔

پاس کے درخت پر سے جناب اُلّو اُڑتے ہوئے آئے اور صدر کی اجازت سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ "بھائی گدھے کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ میں بے وقوفیوں اور حماقتوں کی وجہ سے مشہور کیا گیا ہوں۔ چند محاوروں کے ذریعہ میرا رشتہ بے وقوفیوں سے اور بھی مضبوط کیا گیا ہے جیسے اُلّو کا پٹھا، اُلّو کی دُم فاختہ۔ لیکن انسان کی اِس حماقت کو کیا نام دیا جائے

جو فسادات کے دوران اپنے اوپر لادلیتا ہے۔ خوف اور دہشت کی فضاء میں سانس لیتا ہے گھر سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتا ہے سرِ شام شہر ویران ہوجاتا ہے سڑکوں پر جسے دیکھئے دل میں موت کا خوف لئے سہما ہوا حیران و پریشاں ہر دوسرے شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا منزل مقصود کی جانب دوڑا چلا جارہا ہے۔ عید و تہوار وبال جان ہوتے ہیں۔ روایتی خوشی ہوا ہوچکی ہے۔ عبادت گاہوں پر پولیس کا پہرہ لگا رہتا ہے۔ ڈرے اور سہمے ہوئے پر ملال چہرے عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ شادی بیاہ کی خوشیاں ختم ہوچکی ہیں۔ تین چار دن کی تقاریب گھٹ کر چند گھنٹوں کی خوشیاں بن چکی ہیں۔ شادی کی برات نکالنے کی اجازت نہیں ملتی اور جب ملتی ہے تو پولیس ساتھ ہوجاتی ہے۔ دولھے کو کوئی حسرت سے دیکھنے نہیں ٹھہرتا۔ لوگ برات سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ تو پولیس براتیوں کو تیزی سے آگے بڑھا لے جاتی ہے۔" اتنا کہہ کر جناب اُلّو آب دیدہ ہوگئے اور اُڑ کر درخت پر جا بیٹھے۔

دوسرے درخت سے کبوتر بیگم اُڑ کر آئیں اور کہنے لگیں "جناب اُلّو نے جو حالات بیان کئے ہیں ان کو میری گنہگار آنکھوں نے بھی دیکھا ہے۔ پرشکوہ بلند و بالا تاریخی عمارتوں سے میں نے بھی بے گناہ انسانوں کا خون ہوتے دیکھا ہے۔ مرنے والا تو خیر مرجاتا ہے لیکن اس کے بعد کتنی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ بچے یتیم اور ان کی مائیں بیوہ ہوجاتی ہیں۔ گھروں میں ماتم ہوتا ہے۔ ایسے مناظر ہم سے دیکھے نہیں جاتے اور ہم شرم سے اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبک جاتے ہیں۔" بی کبوتر کی آنکھیں بھر آئیں وہ اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ تمام جانور بھی رنجیدہ ہوگئے۔ جناب گھوڑا نے دُم کے اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ بی کبوتر پھر سے کہنے لگیں "میرے آباء و اجداد نے اسی شہر میں گنگا جمنی تہذیب کا نظارہ کیا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ بادشاہ وقت کی ایک آنکھ ہندو تھی تو دوسری مسلمان۔ لوگ شیر و شکر کی طرح رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو عید و تہوار کی مبارکباد دیتے تھے ہائے وہ بھی کیا زمانہ تھا۔" بی کبوتر اپنی تقریر ختم کرکے درخت پر جا بیٹھیں۔

جناب مگرمچھ بڑی مشکل سے پانی سے نکل کر نشست پر آئے اور مختصر تقریر کی "زمانہ وہی رہتا ہے۔ انسان بدل جاتے ہیں۔ اس وقت کا انسان اپنی قدر اور اپنا مقام جانتا تھا۔ لیکن آج انسان اپنی راہ سے بھٹک چکا ہے۔ مفاد پرست اور ابن الوقت سیاسی قائدین کے ہتھکنڈوں کا شکار ہے جو فسادات کرواکر اُن پر دکھاوے کے آنسو بہاتے ہیں جسے انسانی الفاظ میں مگرمچھ کے آنسو کہا جاتا ہے۔" تیز قدموں سے جناب مگرمچھ پھر سے پانی میں جا بیٹھے۔

جناب کتّا نشست پر تشریف لائے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ "فساد پھوٹ پڑنے کے بعد اس پر قابو پانا پولیس کا کام ہوتا ہے۔ اس میں پولیس کہاں تک کامیاب ہے اخباروں میں شائع ہونے والے بیانات سے ظاہر ہے۔ ہمیشہ چند بند ھے ٹکے بیانات جاری ہوتے رہتے ہیں۔ "ہر وقت حالات قابو میں رہتے ہیں" ایک ہی دن میں آٹھ دس افراد ہلاک اور کئی زخمی ہونے کے باوجود بھی حالات قابو میں رہتے ہیں۔ شرپسند عناصر کی نشاندھی ہوچکی ہے پولیس جلد ہی انھیں ڈھونڈ نکالے گی۔" حالانکہ شرپسند عناصر اپنے بچاؤ کی تدبیر پہلے ہی اختیار کرچکے ہوتے ہیں۔" جناب کتّا کے ان خیالات کو سن کر محفل میں قہقہے بلند ہونے لگے کسی گوشے سے سیٹیوں کی آواز بھی آئی کنوینر جناب گھوڑا نے مداخلت کی "امید ہے کہ حاضرین تہذیب کا دامن نہ چھوڑیں گے اور کانفرنس کا

اختتام سنجیدگی سے ہوگا۔" ایک منچلے نوجوان جالور نے جواب دیا "یقیناً! ایسا ہی ہوگا! ہم انسان نہیں ہیں!" اس برجستہ
پھر قہقہے بلند ہوئے۔ چند منٹ کے بعد محفل میں خاموشی ہوئی تو جناب کتّا نے اپنی تقریر جاری رکھی "بے گناہ افراد کی گر
اوران پر پولیس مظالم کی شکایتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ شرپسند عناصر پولیس کے ہاتھ شاید ہی لگیں۔ ہو
پولیس اپنی کارکردگی دکھلانے کے لئے گرفتاریوں اور سزا کا کوٹہ پورا کرتی ہوگی۔ چند گوشوں سے پولیس پر جانبداری کا الزام
جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس الزام میں کچھ سچائی ہو۔ اس لئے کہ پولیس بھی اس سماج کا ایک حصّہ ہے جس میں فرقہ واریت
سرایت کرچکا ہے۔ پولیس کسی دوسرے سیارہ کی مخلوق ہے اور نہ ہی ہم جانوروں کا دستہ ہے۔ ویسے کئی مرتبہ میں پولیس
کرچکا ہوں ہمیشہ ہی میں نے اپنے فرائض نبھانے میں تندہی، چالاکی اور غیرجانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ کاش پولیس یہ
تمام خوبیاں بہ درجہ اتم موجود رہتیں!!" جناب کتّا افسوس کا اظہار کرتے ہوئے واپس اپنی جگہ پہنچ گئے۔ جناب بندر دو چھلا
میں شہ نشین پہنچے جناب صدر سے علیک سلیک کی اور مصافحہ کرنے کے بعد اپنی تقریر شروع کی "معاشی پسماندگی کو بھی
فسادات کی ایک وجہ بتلایا گیا ہے۔ کیا فسادات سے پسماندگی دور ہوتی ہے حالانکہ فسادات معاشی بحران کا باعث بنتے ہم
نزدیک فسادات کے انسداد کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے انسانوں کے ذہن سے فرقہ وارانہ زہر کو نکال باہر کرنا۔ ا
کو سوچنا اور سمجھنا چاہیئے کہ تمام انسان ایک جیسے اور بھائی بھائی ہیں۔ کوئی بھی مذہب تشدّد کی تعلیم نہیں دیتا ہر مذہب
بھلائی چاہتا ہے۔" محفل میں زبردست تالیاں بجیں جناب شیر نے جناب بندر کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ایک شانِ بے نیازی سے
کودتے نیچے اترے۔

کنوینر کانفرنس جناب گھوڑا شہ نشین پر تشریف لائے اور فرمایا "اب میں جناب ہاتھی سے گزارش کروں گا کہ وہ
قرارداد کانفرنس میں پیش کریں۔ جناب ہاتھی متانت کے ساتھ شہ نشین پر آئے اور قرارداد پیش کی "ہم تمام جانور دقتاً فوقتاً
ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے سخت نالاں ہیں۔ اور ہم خالق کائنات سے دعاگو ہیں کہ جس کے نام پر فساد کیا ج
وہی انسان کو نیک ہدایت دے" اس قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا۔ صدر اور کنوینر کانفرنس کے دستخط ہونے
قرارداد کو پریس کے حوالے کیا گیا۔ جناب خرگوش نے شکریہ ادا کیا "میں، بشمولِ صدر تمام شرکائے کانفرنس کا شکریہ
ہوں کہ آپ تمام نے اپنی دیگر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اس کانفرنس کو کامیاب بنایا۔" آخر میں جناب بلبل او
کے ساتھیوں کی جانب سے پیش کردہ اس نظم پر کانفرنس تمام ہوئی ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مرزا کھونچ، بیتیا

دَامَادْ

داماد' ایک ایسا لفظ ہے جس کا سفر 'د' سے شروع ہو کر 'د' پر ہی ختم ہوتا ہے۔ یعنی داماد کے سلسلے میں سفر کرنے والے انسان کا 'د' قدم قدم پر پیچھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دورہ اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ دل کا دورہ تک پڑنے لگتا ہے۔ راوی نے اس دورے کا تعلق دلدل سے جوڑا ہے۔ کیوں کہ کیچڑ میں کنول کھلتا ہے اور دلدل میں داماد۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کنول کی جسامت، ضخامت اور نزاکت داماد سے کم ہوتی ہے۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ داماد کا سفر 'د' سے شروع ہو کر 'د' پر ہی ختم ہوتا ہے۔ اگر آپ ایک سند یافتہ باورچی ہیں تو کیا ہوا آپ داماد کی دال کو نہیں گلا سکے۔ گلے گی تو بس اُسی کی دال۔ اگر آپ اُس کی دال کو نہیں گلنے دیں گے تو داماد کو دفع ہی سمجھئے۔ اس 'د' کا دعوت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ دامادی سفر میں آپ کے گھر سے ہر دوسرے یا تیسرے روز بریانی اور مرغ مسلّم کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ آپ کے دسترخوان کو جسے ایسی خوشبو کبھی نصیب نہیں ہوئی ہے' سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ ہی نوابی دَور تو نہیں ہے جس کے متعلق اس کے جدامجد چٹخارے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا دروازہ آپ کی شادی کے بعد مہمانوں کے جلوؤں کو ترس گیا تھا۔ اب اُسے ہر دوسرے یا تیسرے روز مستقبل قریب داماد کے بھائی، بھابی، بہن اور پھر بہن کی سہیلیوں کے درشن ہونے لگتے ہیں۔

داماد کے ساتھ ساتھ ایک لفظ اور دیکھنے میں آتا ہے جسے جہیز کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ لفظ "جہیز" جہاز سے بنا ہو۔ اور ایک داماد کے لئے ایک جہاز کی لاگت تو لگ ہی جاتی ہے۔ داماد مل گیا جہیز کی بات پکّی ہو گئی۔

داماد پانچ حروف سے بنا ایک لفظ ہے۔ یعنی 'د' 'ا' 'م' 'ا' 'د' اگر آپ نے اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے تو آپ کو حسابکے اُستاد نے L.C.M (ذو اضعاف اقل) بتاتے وقت ضرور کان پکڑا ہوگا۔ اُن پرانی یادوں کے سہارے آیئے اِن پانچ حروف

کا L.C.M نکالئے۔ داماد کا L.C.M ہوا 'دام'۔ اب داماد میں دام سے تقسیم کیجئے۔ پورا پورا بٹ جائے گا۔ مطلب ظاہر ہے دام ہے تو داماد ہے۔ جیسا دام ویسا داماد۔ رنگ پرکھ کر لیجئے۔ ٹھونک بجا کر لیجئے اور دکاندار سے ٹکا ڈمال بھی۔ ویسے تو داماد کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ مگر زیادہ تر دو ہی قسمیں نظر آتی ہیں۔ ایک خالص داماد اور دوسرا گھر داماد۔ داماد کی نسل بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی ہے۔ گھر داماد بنتے ہی آپ کو ڈیوٹی لگ جائے گی۔ آفس میں ٹفن پہنچانے کی سالیوں کو پڑھانے کی، صبح بازار سے سودا لانے کی، شام کو اخبار لانے کی اور ہر دوسرے یا تیسرے روز خوش دامن کے میکے خبر گیری کرنے کی۔ آپ کو سانس لینے کی فرصت نہیں ملے گی۔ آپ دنیا کے مصروف ترین آدمی ہوں گے۔ بیکاری دور کرنے کا سب آسان طریقہ ہے گھر داماد بن جائیے۔

ادھر آپ داماد بنے اُدھر آپ پر شادی شدہ ہونے کا مہر ثبت ہوجاتا ہے۔ کسی نے سوال کیا کہ جب شادی شدہ عورت پہچان مانگ میں سیندور، ہاتھ میں مہندی، پاؤں میں چھاگل اور بدن پر خوش نما لال رنگ کی بنارسی ساڑی ہے تو مرد کی پہچان؟ جواب ملا ۔ دماغ ماؤف، ہاتھ میں جھولا، پاؤں سوئے بازار اور لباس پر آثار قدیمہ کے آثار۔ تب سوال ہوتا ہے ایسا کیوں؟ ایسا اس لئے کہ آپ دُلہا بنے اور داماد بھی یعنی تین 'د' ایک ساتھ۔

داماد کو آپ سیدھا پڑھئے یا اُلٹا۔ دونوں طرف سے داماد ہی ہوگا۔ اس سے مطلب یہی نکلتا ہے کہ داماد سیدھا بھی مل سکتا ہے اور اُلٹا بھی۔ جس دن داماد ملنا بند ہوجائے گا گردش ایام ٹھہر جائے گی۔

اگر آپ کو اپنے بدترین دشمن سے بدلہ لینا ہو تو جھٹ اُسے کسی کا داماد بنا ڈالئے۔ "بکو" کو چھٹی کا دودھ یا آپ کو ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ماہنامہ سہیل گیا کا ایک ضخیم شمارہ مشہور نقاد ڈاکٹر کلیم الدین احمد

حقیقت کے آئینے میں

قیمت ۵ روپے یا مبلغ ۱۸ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر سہیل کے خریدار بنئے اور یہ نمبر مفت حاصل کیجئے

پتہ: ماہنامہ سہیل ۔ ریلوے سائڈ روڈ گیا

ک۔ اکے۔ شمیم عابدی (جالگیوں)

کہانی کی کہانی

ہر کہانی لکھنے والے کی بھی ایک کہانی ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے زندگی سب سے بڑی کہانی ہے۔ اس کہانی سے جس نے کہانی نکالی وہی سچا کہانی کار کہلایا۔ کہانی کا پلاٹ سوچنے کے بعد کہانی کا روپ دینے تک کی کہانی بھی عمدہ کہانی ہے اگر اُسے الفاظ کے زیور سے آراستہ کر دیا جائے تو بے شک اعلیٰ درجہ کی کہانی بن جائے گی۔

کہانی لکھنے کے بعد لوگوں کو پکڑ پکڑ کر چائے پلا پلا کر کہانی سناتے کہانی نگاروں کو دیکھا ہے۔ کہانی سنانے کی بھی کہانی ہوتی ہے۔ لوگ بور ہو ہو کر جمائیاں لے رہے ہیں لیکن کہانی نگار آنکھ کان بند کئے کہانی سنائے جا رہا ہے کبھی کبھی کہانی سننے والے کہانی کے ہیرو بن کر دو چار ہاتھ بھی کہانی کار کو جڑ دیتے ہیں اِسکے بعد کی کہانی بھی دلچسپ ہوتی ہے خدانخواستہ اگر کسی کہانی لکھنے والے کی کہانی چھپ جائے تو اسکی بھی لمبی کہانی ہوتی ہے۔ جس پرچے میں کہانی چھپی اس پرچے سے روشنائی کاغذ ڈاک ٹکٹ وغیرہ کے پیسے وصول کرنے کی بھی الگ کہانی ہے۔ جسے آج تک کسی نے لکھی نہیں اگر لکھی جاتی تو چھپتی نہیں۔ اگر چھپ جاتی تو کئی کہانیوں کو ضرور جنم دے دیتی۔ آخر میں کہانی کار کی بھی کہانی بن جاتی۔

کہانی پڑھ کر پسندیدگی کا خط لکھنے والوں کی بھی ایک کہانی ہوتی ہے۔ پہلے پہل لکھیں گے "کہانی پسند آئی" دوسری بار خط آئے گا "اس دور کے آپ عظیم کہانی کار ہیں" تیسرا خط آئے گا "میری محبوبہ کے نام دو چار خط لکھ دیں تاکہ کتابت کرا کے روٹھی ہوئی محبوبہ کو بھیج کر منا سکوں" ہوئی نا نئی کہانی۔ اس کے بعد کی کہانی ہے جسے کسی دوسری کہانی میں پیش کیا جائے گا۔ فی الحال کہانی کی کہانی سُنئے۔ میرے ایک شناسا نے ایک کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ کہانی میں الفاظ کا جڑنا بھی نگینوں سے کم نہیں۔ جب تک چمکتے دمکتے جھلملاتے جگمگاتے الفاظ کہانی میں جڑے نہ جائیں خوبصورتی آتی ہی نہیں لیکن افسوس کریم اللغات سے فیروز اللغات تک چاٹ ڈالا لیکن مجھے نگینہ سا چمکتا لفظ ملا ہی نہیں۔ جس لفظ میں خوبصورتی نظر آئی وہ اتنا دقیق نظر آیا کہ حلق سے اترتا ہی نہیں مثلاً گنجلک پیچیدہ، مخنی۔ ایسا لفظ جب مرے حلق سے نہیں اترا تو کہانی کے حلق سے کس طرح اترتا

اِس لئے میری لکھی کہانی منحنی کے دائرے سے نکل کر گنجلک یعنی تحریری انداز کے زمرے میں نہ آسکی۔ شائد کہانی کا کلائمکس اسے ہی کہتے ہیں۔ ویسے ہندوستانی کہانی کاروں کے نظریہ کے مطابق کہانی کے کلائمکس کا PATHOS ہونا ضروری ہے یعنی ہیرو نے ہیروئن کو دھوکا دیا یا دھوکا کھایا۔ لیکن میری کہانی PATHOS اور PERODY کے بیچ میں اُلٹی لٹکی رہتی ہے۔ لٹکنے پر یاد آیا۔ اگر آپ کہانی لکھتے ہیں یا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کو کبھی نہ کبھی کہانی کے انتظار کے ہینگر پہ لٹکنا پڑا ہوگا۔ کیوں کہ کچھ پرچوں کا خاص شوق ہے کہانی ملنے کے بعد کہانی کو انتظار کے ہینگر پر لٹکا دینا۔ نہ اِطلاع ملے گی اِشاعت کی نہ ردی کے ٹوکری کی جانب اشارہ ہوگا۔ مجبوراً کہانی نویس اسی کہانی کو دوسرے پرچے میں بھیج دیتا ہے یک بارگی نئی کہانی جنم لے لیتی ہے جس کا عنوان "سرقہ" ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی کہانی در کہانی شروع ہوتی رہتی ہے کیوں کہ کہانی کبھی ختم ہی نہیں ہوتی، ہمیشہ جنم لیتی رہتی ہے!

∞

رضوان احمد

کے آتشیں قلم سے نکلے ہوئے شعلہ بار اداریوں کا مجموعہ

مجھے بولنے دو

جس میں سسکیاں بھی ہیں اور آہیں بھی، چیخیں بھی ہیں اور کراہیں بھی

قیمت ۲۵ روپئے (علاوہ محصول ڈاک)

آج ہی طلب کریں

زیور پبلی کیشنز۔ پوسٹ باکس نمبر ۱۲، بانکی پور، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

(۱)

نسیم انہولوی، ابو محمد شبلی، رضوان احمد، مناظر عاشق ہرگانوی اور دو ایک حضرات نسیم بکڈپو لکھنؤ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اردو کی ابتدائی تعلیم پر باتیں ہونے لگیں تو نسیم انہولوی نے فرمایا "میرے گھر میں ایک لطیفہ ہوا۔ نعیم انہولوی بچپن سے انگلش اسکول میں تعلیم پاتے رہے، جب ذرا سیانے ہوئے تو اردو تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔ ان کے اردو سیکھنے کے دوران ایک بار گھر پر ان کے کچھ دوست ملنے آگئے۔ اتفاق سے گھر میں ناشتے کا سامان نہیں تھا۔ ان کے دوست ٹی وی دیکھنے لگے اور نعیم میاں نے نوکر کو میرے پاس دوڑایا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"میرے چند دوست ٹیلی ویژن کی بینائی کرنے آئے ہیں۔ گھر میں رزق نہیں ہے۔ برما بسکٹ فیکٹری سے کچھ بسکٹ خرید کر بھیج دیں۔"

(۲)

اسی محفل میں نسیم انہولوی نے فرمایا "نعیم میاں کو مقفیٰ اردو بولنے کی عادت ابتداء سے رہی ہے۔ اردو سیکھنے کے ابتدائی دور میں ایک بار وہ گھر سے گھبرائے ہوئے دفتر آئے اور مجھ سے کہنے لگے "امی جان کی طبیعت ماشاء اللہ بہت خراب ہے۔"

ایک بار ایک لالہ جی ملنے آئے تو نعیم انہولوی کہنے لگے "قبل سے تم منحنی تھے، بیماری میں اور منحنی ہو گئے ہو۔" منحنی کو وہ مقفیٰ کہہ رہے تھے۔

(۳)

نسیم اعظمی (مالک و مدیر "نکھار" مئوناتھ بھنجن) اور مناظر عاشق ہرگانوی ملنے کی غرض سے ڈاکٹر شمیم افزا قمر کے یہاں گئے۔ سب سے پہلے ان کے دس سالہ صاحبزادے شہاب سے سامنا ہوا۔ ہرگانوی نے کہا "اپنی ممی سے میرے بارے میں کہئے کہ ملنے آئے ہیں، ساتھ میں مئوناتھ بھنجن کے ایک صاحب بھی ہیں۔"

شمیم افزا قمر جب ڈرائنگ روم میں آئیں تو ہنستی ہوئی بولیں "اچھا، آپ لوگ ہیں۔ شہاب نے بتایا کہ آئے

سالانہ کوئی مولانا اسپیشلسٹ ہیں"

(۴)

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر لطیف الرحمٰن، ڈاکٹر رئیس الرحمٰن اور مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لطف الرحمٰن نے سنایا کسی رسالہ میں ابھی یہ شعر پڑھا ہے ؎

گھبراتے ہیں کتراتے ہیں لہراتے ہیں کیوں لوگ
سردی ہے تو پانی میں اتر کیوں نہیں جاتے

شمیم احمد برجستہ بولے" اگلے شمارہ میں یہ خط چھپنا چاہیئے کہ شاعر ضرور ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہے"۔

(۵)

اسی محفل میں ڈاکٹر شمیم احمد نے سنایا" پروفیسر شمس منیری پٹنہ کالج کے مشاعرہ میں ایک مثنوی پڑھ رہے تھے۔ سامعین بُری طرح بور ہونے لگے آخر ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر آواز لگائی "سر" گھنٹی بج چکی ہے"۔

(۶)

ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر مظفر اقبال، پروفیسر جمشید حسن جامی، عقیل احمد عقیل، عزیز احمد عزیز، فرحت حسین خوشدل اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کسی نے بتایا کہ فرحت حسین خوشدل بھی شاعری کرتے ہیں۔ اس پر وہ بولے "جی ہاں جب مصرع طرح ملتا ہے تب ہی غزل کہتا ہوں اور جب تک جسم پر چوٹ نہیں لگتی، ان سے غزل نہیں ہوتی"۔ جمشید حسن جامی نے وضاحت کی۔

" تب تو آنسو آمیز غزل کہتے ہوں گے؟"۔ شمیم احمد نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

▭▭

سلمیٰ جاوید کی نظم اور گیتوں کا دلکش مجموعہ

دستِ زُلیخا

قیمت ۱۲ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ: زیبون پبلی کیشنز، پوسٹ باکس نمبر ۱۲ بانکی پور پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۴

سید حسن عباس
(گوپال پور)

ہمارے "ہیڈ"

آئیے! ہم آپ کو اپنے "ہیڈ" سے ملائیں! یہ "ہیڈ" ہمارے سروں پر مسلط کئے گئے ہیں ہمارے "ہیڈ" ۵ فٹ اور تقریباً ۵ انچ کا قد رکھتے ہیں۔ گول مٹول چہرہ، ستوان ناک، تانبے کی طرح چمکتی صاف وشفاف پیشانی۔ اس پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جیسے ہاتھی کے من ابھرا ہوا۔ جن پر دو سیاہ گہرے اور روشن سوراخ۔ پتلے پتلے ہونٹ، جن پر کچھ سیاہ اور کچھ سفید گولائی۔ زراف کا سا چمکدار جسم۔ کتنا دلکش نظر آتا ان کا سراپا دور سے دیکھنے پر ع

"دُور سے کتنا حسین مجھ کو نظر آتا ہے تو"

مسکراتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ٹوتھ پیسٹ کمپنی کا اشتہار۔ دانت ایسے جیسے لکھنوی کرتے میں سیپ کے بٹن، جو دھوبی کی بھٹی پر چڑھ کر چھوٹے، موٹے اور لمبے ہو گئے ہوں۔ گردن کچھ فربہ اور کچھ کچھ پتلی بھی اور کچھ لمبی بھی ۔۔ اب ایسی بھی نہیں جیسے ہاتھی کی گردن یا اونٹ کی گردن، بلکہ میانہ یا "میانی"۔ لمبے لمبے ہاتھ ۔ کافی لمبے ہاتھ ۔ یعنی اپنی جگہ سے کسی کی جیب یا گردن تک بآسانی پہونچ سکتے ہیں ۔ ویسے ماتحتوں کی گردن اور جیب دونوں ہی جناب کی مٹھی میں ہوتی ہیں۔ چوڑی چکلی چھاتی اور اس کے اندر دل کے بجائے پتھر کی سل ۔ باتیں خوب چبا چبا کر کرتے ہیں ایسے لگتا ہے جیسے حلق میں کچھ پھنس پھنس جا رہا ہو۔ جیسے کبھی نگلنے کی کوشش میں اُگل دیتے ہیں اور اُگلنے کی کوشش میں نگل جاتے ہیں ۔۔۔ مگر باتیں بڑی جاندار اور مزیدار ہوتی ہیں ۔۔ آپ بھی کبھی بات کر کے دیکھئے لُطف آ جائے گا ۔۔! جناب کم سخن بھی واقع ہوئے ہیں، اس کا مطلب یہ نہ نکالئے گا کہ جناب خدانخواستہ قوت گویائی سے محروم ہیں۔ ایسی بات نہیں۔ عموماً زیادہ پڑھے لکھے حضرات کم سخن ہی ہوا کرتے ہیں۔ خاص کر کسی علمی ادبی جلسے میں تو جناب کچھ بولتے ہی نہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ جو بول رہے ہیں وہ اس قدر گاڑھی اردو ہوتی ہے کہ سمجھ سے بالاتر۔ لہٰذا خاموشی ہی بہترین نسخہ ہے۔

شعبہ کو ان کی قابلیت پر ناز ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ ان گنت ڈگریاں اور لاتعداد اسنادات رکھتے ہیں بلکہ

میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ جناب ڈگری بردار ہیں خُدا جانے اس میں سچ کہاں تک ہے؟ ویسے آپ انھیں مال بردار مت سمجھ لیجئے گا۔

جناب کو کوئی شوق نہیں، کوئی عادت نہیں، سوائے سگریٹ پینے اور اُس کے مرغولے بنانے کے ۔۔ ویسے کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ جناب اکثر و بیشتر "تصورِ جاناں" میں غلط جگہ پہنچ جاتے ہیں واللہ اعلم ۔۔۔۔۔ دوسری ایک خاص بات جسے میں نے نوٹ کیا وہ یہ ہے کہ جناب گاہ بہ گاہ کسی تعلیم یافتہ یا ڈگری بردار حضرت کی دی ہوئی ٹی پارٹی میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ان کا یہ اہتمام ان کی خاکساری، انکساری بلکہ ڈگری برداری پر بھی بھاری پڑ جاتا ہے اس سے آپ یہ مطلب نہ نکالیں کہ جناب بالکل مجہول قسم کے واقع ہوئے ہیں میری نظر میں تو جناب بے حد نامعقول ہیں ۔ جذبہ اور کام کی لگن میں اکثر و بیشتر غلط کام کر ڈالتے ہیں ۔ کام، اف خدا کی پناہ! بے انتہا! اپنی سبھی کو سناتے ہیں لیکن کسی اور کی کم ہی سُنتے ہیں اور ماتحتوں کی تو سُنتے ہی نہیں ۔ آنکھیں اس طرح بند کر لیتے ہیں جیسے سرے سے کچھ خبر ہی نہیں ۔ اس سے یہ مُراد نہیں کہ خدانخواستہ جناب قوتِ بینائی سے ہی محروم ہیں، ویسے وہ بینا بھی ہیں ۔ کیوں کہ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک ہر وقت چڑھی رہتی ہے۔

چشم پہ چشمہ لگایا تاکہ سوجھے دور کی
مفت میں اندھے بنے صورت بنی لنگور کی

وہ کس مزاج، کس طبیعت اور کس خیال کے ہیں آج تک کوئی بھی نہ جان سکا۔ جس کا قلق مجھے بھی ہے۔ کیوں کہ میری فطرت میں خاص آدمیوں کی خاکہ نگاری کی خصلت ودیعت کی گئی ہے۔ اور میں یہاں آ کر سخت تشویش میں مُبتلا ہو جاتا ہوں کہ "اپنے جناب" کا ڈھانچہ کس طرح لکھا جائے؟ جس طرح ہمارے جناب بے سر پیر کی باتیں کرتے ہیں یہ سراپا بھی بالکل اسی طرح بے سر پیر کا لکھا جا رہا ہے ۔ ہاں تو جناب! ہمارے "ہیڈ" کی بڑی بڑی کتابیں دو کالونوں کے خوبصورت شلف میں قرینے سے سجی نظر آتی ہیں جو انہوں نے اپنی ذاتی رقم سے شائع کروائی تھیں ۔ موصوف کو شکایت ہے کہ آج تک کسی نے کتاب کو چھوا تک نہیں ۔ جناب کے وہ لکچر جو انہوں نے تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں کالج کی لڑکیوں کے ایک جلسے میں دیئے تھے ایک خبر کے مطابق، جلد ہی شائع ہو کر منظرِ عام پر آنے والے ہیں خُدا خیر کرے!

انھیں اس بات کا ہر لمحہ دھیان رہا کرتا ہے کہ آخر اصول بھی تو کوئی چیز ہے! ایک بار جو ٹھان لیا تو زندگی بھر اس پہ عمل پیرا رہنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انھیں کورٹ، کچہری، حوالات کسی کا ڈر نہیں ۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے جناب کو اُوپر سے آرڈر آیا کہ آپ کو صدرِ شعبہ منتخب کر لیا گیا ہے مگر حضور کی بدقسمتی کہ حال مقیم صدرِ شعبہ جو اتفاق سے اردو فارسی اور عربی، تینوں زبانوں کی تکمیل تھامے ہوئے تھے کسی طرح کھسکنے کا نام نہیں لے رہے تھے ۔ جناب بھی پیچھے کیوں ہٹتے؟ (اُوپر سے آرڈر جو آ چکا تھا) اُنھوں نے بھی دوستی کے رومال کو تہہ کیا اور اس کا "لنگوٹہ" بنوایا اور میدان میں آ کر تال ٹھونکی ۔۔ پھر کیا تھا ایک ہنگامہ، ایک طوفان بدتمیزی یا پھر

نتوں کی جنگ ۔ طبل بج ہی چکا تھا صرف ریفری کی ضرورت تھی مگر یہ کشتی بغیر ریفری کے ہی انجام کو پہنچ گئی۔ جناب نے
ت کی کرسی ہتھیالی۔ یہ غیر یقینی بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی گھر کی بات عدالت میں جا پہونچی اور سابق صدر نے جوڑ
یں کرکے اپنی بحالی دوبارہ کرالی جناب پھر کھسکا دیئے گئے! سُنا ہے کہ موصوف آج کل ہائی کورٹ میں مرافعہ کی تیاریوں میں
ں ہیں۔

اِدارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں!

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/-	روپے
نقط	یوسف ناظم	مضامین	۶/-	"
البتہ	"	"	۱۰/-	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-	"
دھرگھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-	"
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	"
بالآخر	"	مضامین	۱۴/-	"
سُنی سُنائی	لئیق صلاح	"	۱۵/-	"
رقصِ تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	"	۱۵/-	"
خواہ مخواہ	رشید الدین	"	۱۰/-	"
چند کلیاں نشاط کی	بُرہان حسین	"	۱۰/-	"
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲/-	"
غبارِ حاضر	روف خوشتر	"	۱۲/-	"
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲/-	"
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵/-	"

آندھرا پردیش مسلسل طاقتور اور مستحکم ہوتا جارہا ہے

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو آندھرا پردیش کے قیام کے ساتھ ہی تلگو عوام جو مختلف ریاستوں میں بکھرے ہوئے تھے دوبارہ متحد ہوگئے اس وقت سے اب تک یہ ریاست بتدریج کامیابی کے ساتھ اپنی پچھلی عظمت کی تجدید کرتے ہوئے بہتر مستقبل کی جانب گامزن ہیں۔

● ریاستی حکومت نے شری این ٹی راما راؤ کی قیادت میں ان کے وعدوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے متعدد اسکیمات شروع کی ہیں، یہ وہ اسکیمات ہیں جن کا مقصد ممکنہ قلیل ترین عرصہ میں عوام کے لیے ترقی اور خوش حالی فراہم کرنا ہے۔

★ ۱۵۔نکاتی پرگتی پدھم کی تکمیل کمزور طبقات میں نیا جذبہ، نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

★ ریاستی موازنہ میں فلاح و بہبود اور خدمات کی سرگرمیوں کے لیے مختص رقم کو دوچند کر دیا گیا ہے۔

★ کمزور طبقات کے لیے ۲۰ء۲ لاکھ مکانات کی مرحلہ وار تعلیم شروع کی جارہی ہے

★ دو روپے فی کیلو کی شرح سے چاول کی فراہمی کی اسکیم سے ریاست کے ۲۲ء۹۴ لاکھ عوام کو فائدہ پہنچ رہا ہے

★ ابتدائی تعلیم کی ترویج کے لیے ۱۶ ہزار اساتذہ کا خصوصی تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔

★ لوک ایوکتا کو جس کا مقصد ایک صاف اور معیاری نظم و نسق فراہم کرنا ہے اس کا آج یکم نومبر ۱۹۸۳ء سے نفاذ عمل میں آرہا ہے۔

★ پروفیشنل کالجوں میں کیپٹیشن فیس کی وصولی پر امتناع عائد کیا گیا ہے تاکہ صرف میرٹ (قابلیت) کی اساس پر طلبار کے داخلوں کی طمانیت حاصل ہوسکے۔

★ "مڈ ڈے میل اسکیم" جو ابتدائی تعلیم کی ترویج کے لیے ہے۔ اس سے کمزور طبقات کے چالیس لاکھ بچوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

★ خواتین کے لیے ایک علحدہ یونیورسٹی ترویج میں شروع کی گئی ہے۔

★ دیہات میں پانی کی قلت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ۱۰۰ افراد کے لیے پینے کے پانی کا ایک ذریعہ فراہم کیا جارہا ہے۔

★ تلگو گنگا پراجکٹ شدید خشک سالی سے متاثرہ رائل سیما کو آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی اور انسانی ہمدردی کے تحت ہمارے پڑوسی ٹامل بھائیوں کی پیاس بجھانے کے لیے شروع کیا گیا ہے

مریخ
ماہنامہ پٹنہ

نئی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ
اکتوبر ۱۹۸۳ء سے منظر عام پر آچکا ہے

ایڈیٹر : عبد المغنی
پتہ : دفتر انجمن ترقی اردو بہار
لیڈی امام ہاؤس، پتھر کی مسجد پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

ٹائیں ٹائیں فش

نامور مزاح نگار
پرویز ید اللہ مہدی
کے
مضامین کا مجموعہ

قیمت ۱۵ روپے
بتوسط "شگوفہ"

یکم نومبر ۱۹۸۳ء سے عوام کی بھلائی کے لیے تین نئے پروگرام "گرامودیا" "دیپا" اور "دیمکتی" شروع کئے جارہے ہیں۔

گرامودیا — اس اسکیم کا اصل منشا دیہی ترقی کے لیے خوش حالی، انسدادِ بے روزگاری اور خود روزگاری کے سہ رخی مقصد کے تحت نوجوانوں کی خدمات سے استفادہ کرنا ہے۔

دیپا — اس اسکیم کا مقصد روزگار اور صنعتی ترقی کے لیے ہر ضلع میں ایک ایجنسی کا قیام ہے تاکہ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کے لیے روزگار فراہم ہوسکے

دیمکتی — اس پروگرام کے تحت سیڈک ٹابلٹس مرحلہ وار تمام بلدی قصبوں اور بڑی پنچایتوں میں محفوظ پانی کی سربراہی کے ساتھ تعمیر کئے جائیں گے۔

حکومت کمیونٹی لیٹرین (بیت الخلاء) کی تعمیر کے ذریعہ بائیو گیس یونٹس" کو ترویج دے گی۔ خاکروبوں کی بازآباد کاری کی جائے گی تاکہ ان کا روزگار اور مالی موقف متاثر نہ ہو۔

"ریاستی حکومت نے آسمانی تباہی پر قابو پانے کے لیے جنگی خطوط پر مکانات کی دوبارہ تعمیر، بازآباد کاری اور امدادی اقدامات کا آغاز کیا ہے۔"

اس خصوص میں ریاست ہر شہری کی مدد اور تعاونِ عمل کی طلب گار ہے

جاری کردہ :
محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ
حیدرآباد

Lr No. 24556/ADVT/C4/83 Dt: 29.10.8

غزل

شاہد عدیلی

ہر الکشن میں ملک چوپٹ ہے
گھر نیا ہے پُرانی چوکھٹ ہے

ہوگئی قوم اس قدر تنہا
جس قدر لیڈروں کا جمگھٹ ہے

میں تو بہکا کے شیخ کو لایا
اور ساغر میں صرف تلچھٹ ہے

سارے بال اُن کے سر میں نقلی ہیں
پھر بھی عارض پہ زُلف کی لٹ ہے

اک مُصیبت ہے دوسری بیوی
صبح کھٹ کھٹ ہے شام کھٹ کھٹ ہے

لاڑ بازار لے چلو مجھ کو
میری بیوی کو ایک ہی رٹ ہے

کل جو تیلی تھے مِل کے مالک ہیں
ہائے کیا چیز یہ بِسلاوٹ ہے

لڑکھڑایا تھا بھوک سے شاہد
لوگ سمجھے کہ نشے میں غٹ ہے

○

باپ رے باپ

حسن رضا

فکرِ فردا ہے تو امروز کا غم
زندگی تجھ سے ہے اب ناک میں دم
باپ رے باپ

مثل گنبد کے نظر آتا ہے
آج ہر افسرِ اعلیٰ کا شکم
باپ رے باپ

ایک دو بچے ہیں جن کے گھر میں
ضبط تولید کا ہے اُن پہ کرم
باپ رے باپ

ڈگریاں لے کے پھرا کرتے ہیں
نوجوانوں کو ہے بے کاری کا غم
باپ رے باپ

بھوک بچوں کو پریشاں مائیں
کیا قیامت ہے گرانی کا یہ بم
باپ رے باپ

چوری ہے قتل ہے اغوا بھی ہے
ہر غلط راہ ہے اب زیرِ قدم
باپ رے باپ

لب پہ ہے نام خدا بھی لیکن
دل کو تڑپاتی ہے امیدِ صنم
باپ رے باپ

غلّہ گوداموں میں آتے ہی رضا
سازشیں ہوتی ہیں جو ہوں بیٹھ ہم
باپ رے باپ

○

غزل

صوفی دھولیوی

گھرانہ اس کا پہلوان ہے دیکھئے کیا ہو؟
ہماری موت کا ساماں ہے دیکھئے کیا ہو؟

چلی ہے بات ہماری جہاں پہ شادی کی
وہ چار بچوں کی اَمّاں ہے دیکھئے کیا ہو؟

ہے اُن کے ہاتھ میں بیلن ہمارے ہاتھ میں لٹھ
گھر اپنا جنگ کا میداں ہے دیکھئے کیا ہو؟

بھنور میں دورہ پڑا نا خدا کو مرگی کا
خدا ہی اپنا نگہباں ہے دیکھئے کیا ہو؟

تمہاری شوخ نگاہی سے بے حیائی سے
تمام شہر پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو؟

جو دیکھنے میں لگے ہے چڑیل کی خالہ
وہ اپنے حسن پہ نازاں ہے دیکھئے کیا ہو؟

گزشتہ سال کے سب روزے کھا گئے صوفی
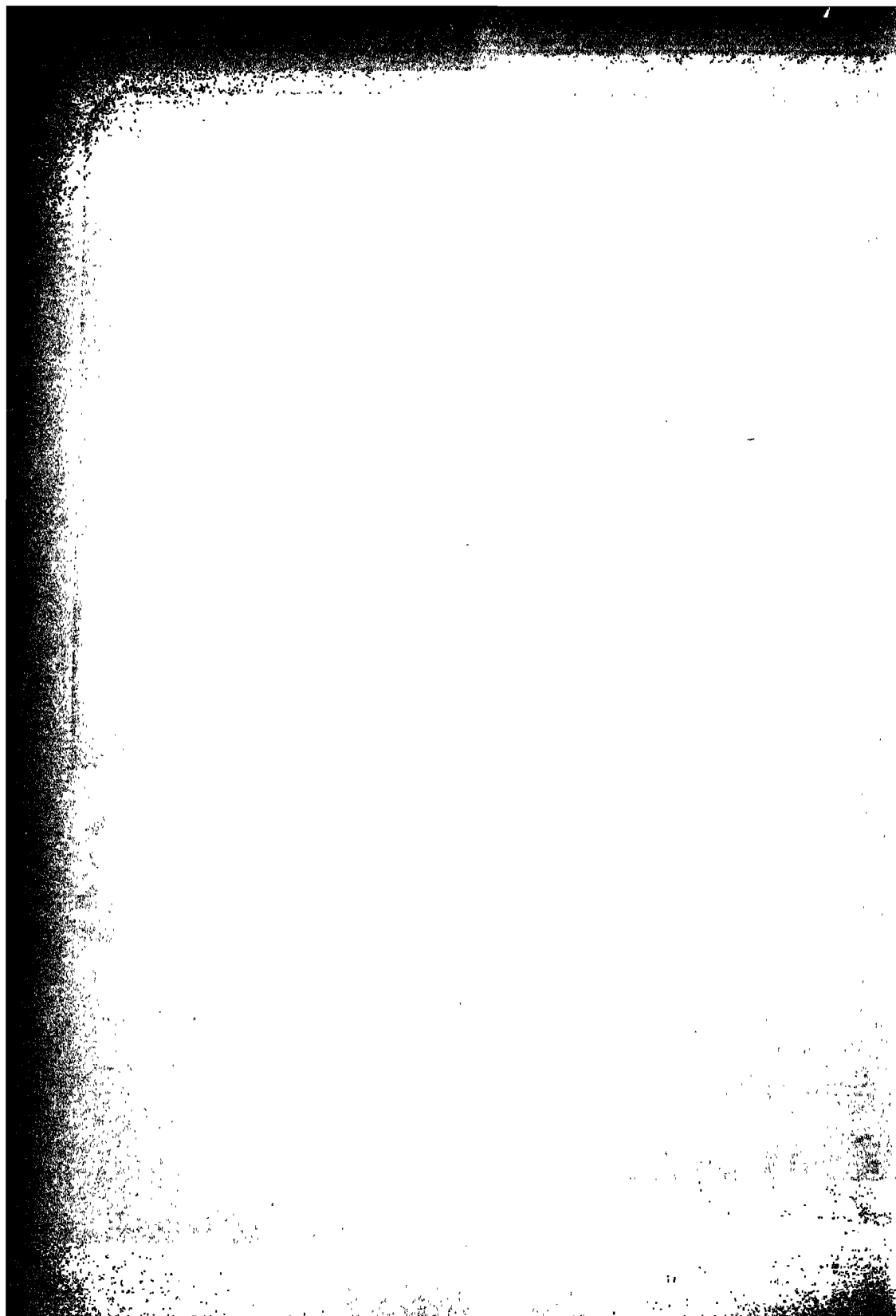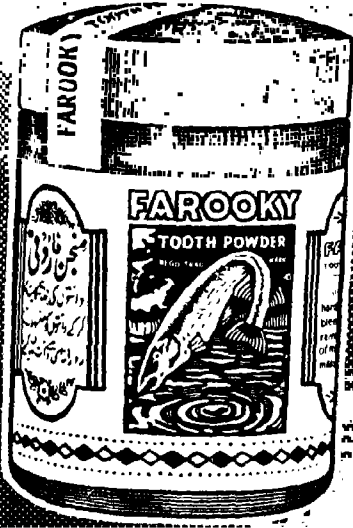
★

No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H. HD 6
. 16 Copy 11
November 1983 Phone : 57716

FTP U2 77

دن بھر کی
خوشگوار تازگی!

جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے لئے ایک بہترین بدل ہے۔

دندان و دہن یعنی
منہ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

تیار کردہ:
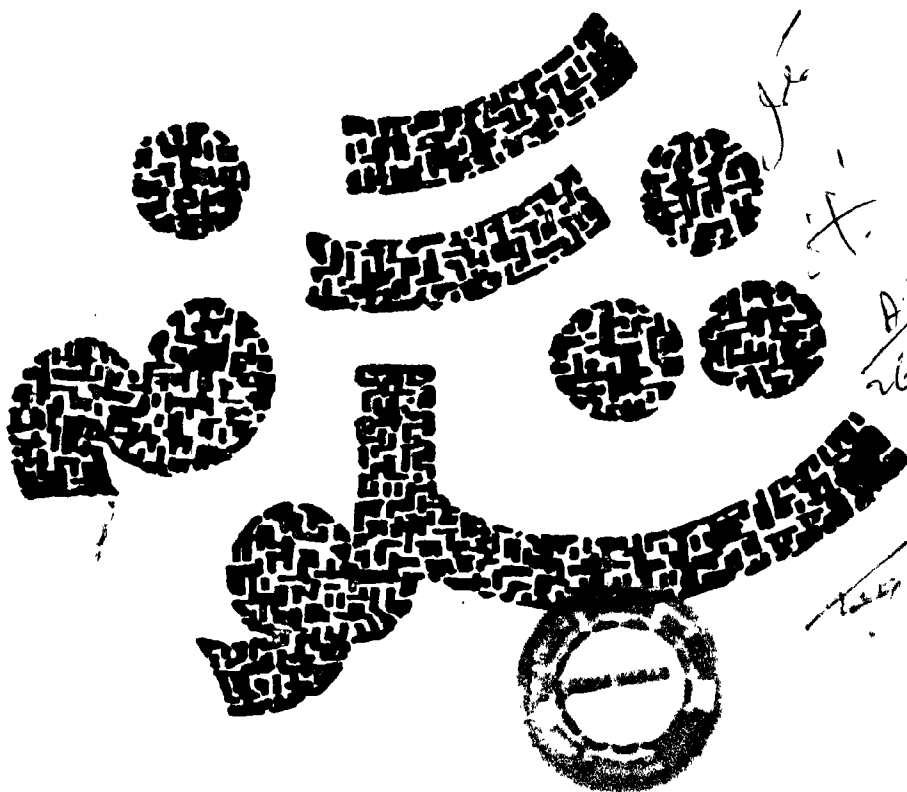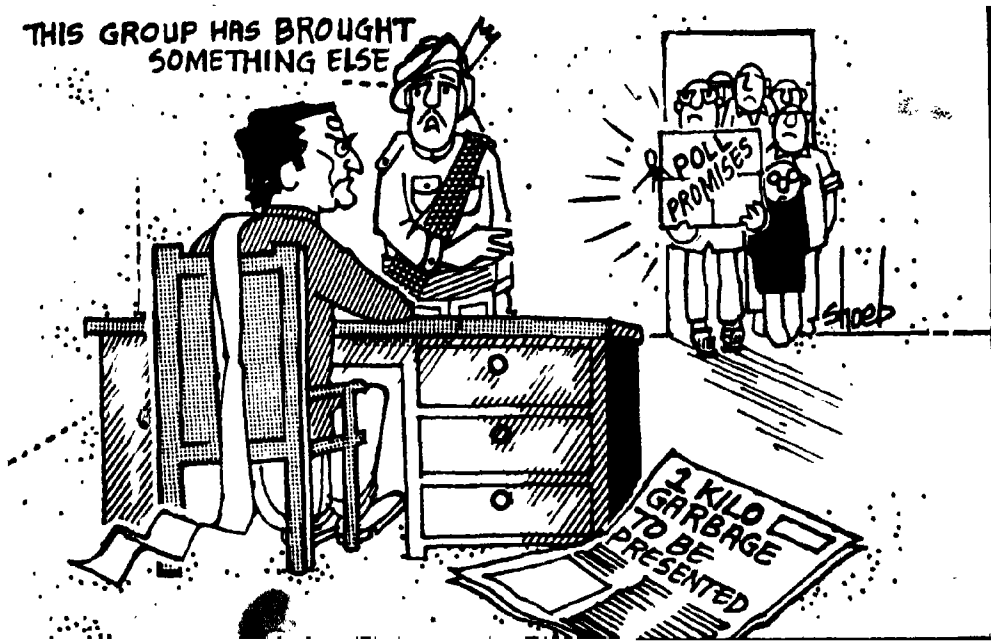
Courtesy : Deccan Chronicle

DECEMBER 1983 **Rs. 3-00**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ حیدرآباد

جلد ۱۶ شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
مینجر: سمیع جلیل

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل
شعیب

کتابت: محمود سلیم۔ عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد ۔۲

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِسالانہ: ۳۰ روپے،
بیرونِ ہند سے: ۹۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد ۔ 1

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱۔ موہن میکن بریوریز ۲۔ اجنتہ ڈیری آگرہ ۳۔ ہارکو، سری نگر ۴۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ڈیچور ۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی ۷۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۸۔ ڈرک بھوٹان فوڈ پراڈکٹس ۹۔ چیمپئن وہائٹ رولس ۱۰۔ سِل SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے اُس کے ڈبّے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے

تیار کنندگان:
پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض حیدرآباد ۔ ۲

اِس شمارہ کے چٹکلے بٹکلے (فہرست)

۱۹۸۴ء

کے لئے

"شگوفہ"

کی

سالانہ خریداری

(بشمول ہندوستانی مزاح نمبر)

۴۵ روپے

ہوگی

★

خصوصی نمبر

سالانہ خریداروں کو

بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ

ارسال ہوگا

(ادارہ)

مہمان مدیر : ـــــــــ یوسف ناظمؒ

اُردو ۔ انگریزی ۔ ہندی ۔ بنگالی ۔ تمل ۔ تلگو ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ مراٹھی ۔ اُڑیا
ملیالم ۔ سندھی ۔ کنڑی ۔ میتھلی اور راجستھانی زبانوں کے مزاحیہ نثری ادب
کا **جائزہ** اور منتخب مضامین کے تراجم ۔ اردو کے دس مصنفین کے خود نوشت
خاکے اور مضامین ۔ ملک کے تنقید نگاروں کی آرا اور اِنٹرویو ،
اُردو کی مزاحیہ تصانیف کی مکمل **ببلوگرافی** اور مقالہ نگاروں کی **تصاویر** کے ساتھ

۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء
کو شایع ہوگا

شرکاء:

پروفیسر کلیم الدین احمد۔ ملک راج آنند۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر وحید اختر
ظ۔ انصاری۔ باقر مہدی۔ ڈاکٹر اپنا پانیکر۔ نثار احمد فاروقی۔ رشید حسن خاں۔ پروفیسر رام پنجوانی
شمیم حنفی۔ عبدالستار دلوی۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ کرامت علی کرامت۔ عمیق حنفی۔ مظفر حنفی
ابنِ فرید۔ حامد حسن۔ سکینا چودھری۔ پروفیسر سنتوک راز۔ پروفیسر شیام سندر مشرا۔
محمد زمان آزردہ۔ رتی لال شاہین۔ پروفیسر عبدالمغنی۔ حمید الماس۔ عزیز تمنائی۔ اسمٰعیل آذر۔
سلیمان اطہر جاوید۔ بھارت چند کھنہ۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور۔ نریندر لوتھر۔ مناظر عاشق ہرگانوی
فکر تونسوی۔ مجتبیٰ حسین۔ احمد جمال پاشا۔ شفیقہ فرحت۔ رشید قریشی۔ وجاہت علی سندیلوی۔
مسیح انجم۔ پروفیسر راما راؤ۔ اعجاز علی ارشد۔ پرویز ید اللہ مہدی۔

ضخامت: تقریباً ۲۵۰ صفحات	قیمت: ۲۰ روپے مجلد ۲۵ روپے

اپنی کاپی آج ہی محفوظ فرمایئے

سالانہ خریداروں کے لیے دس روپے۔ پانچ روپے زائد بھیجنے کی صورت میں یہ خصوصی نمبر بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا۔

باقر نقوی (لندن)

مشتاق یوسفی

جن کی باتوں میں ہے گلوں کی خوشبو

اردو مرکز لندن نے ایک بار پھر شائقین ادب کے لئے ایک شام کا اہتمام کیا جو اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس میں اردو کے کم لکھنے والے مگر نامور طنز نگار مشتاق احمد یوسفی اپنی نئی تصنیف کے ایک خاکے سے سامعین کو محظوظ کرنے والے تھے۔ لندن کے سامعین کے لئے یہ امر باعثِ افتخار ہے کہ انہوں نے پہلی بار یوسفی صاحب کی زبان سے ان کی تحریر سنی۔

اگرچہ موسم بہت زیادہ خراب تھا مگر دور دور سے شائقین ادب تشریف لائے تھے۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حالانکہ اردو مرکز نے اس بار کافی بڑی جگہ کا اہتمام کیا تھا۔ ہم ہمیشہ کی طرح دیر سے پہنچے۔ دیر سے پہنچنے میں خدا نخواستہ وہ امر پوشیدہ نہیں جو عموماً خواص کے پیش نظر ہوتا ہے یعنی اپنی اہمیت کا اظہار۔ شاہی خاندان کے افراد کا تو یہ طرۂ امتیاز ہی ہوتا ہے۔ ہم کم مایۂ انسان ٹھہرے تاخیر کی وجوہات اور کچھ تھیں جن کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

مقررین میں ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور رضا علی عابدی صاحب (بی بی سی والے) تھے جنھوں نے یوسفی صاحب کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا رضا علی عابدی صاحب کا مضمون تحریر شدہ تھا، نپا تلا تھا اور خوب تھا۔ انھوں نے مزاح اور یوسفی صاحب کے فن کا چھوٹے سے مضمون میں بہت خوب احاطہ کیا تھا۔

مشہور محقق اور استاد ڈاکٹر شکیب صاحب نے یوسفی صاحب کے فن پر جو گفتگو کی اس سے اندازہ ہوا کہ مزاح نگار پر تنقید کرنا یا گفتگو کرنا آسان نہیں۔ ان کے خیال میں یوسفی صاحب کا فن ترقی پذیر ہے اور ان کے پسندیدہ مسائل صرف ہنسانے کے لئے نہیں بلکہ جاندار بھی ہیں۔ ان کی تحریر میں تاریخ کا بہتا ہوا دریا دکھائی دیتا ہے۔ یوسفی صاحب سے صرف شکایت یہ ہے کہ وہ بہت کم لکھتے ہیں۔

یوسفی صاحب نے اس شام سامعین کو بہت ہنسایا۔ حالانکہ اگر آپ یوسفی صاحب کو دیکھیں تو آپ کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ ایسا سنجیدہ صورت انسان مزاح نگار بھی ہو سکتا ہے۔ یوسفی صاحب پیشہ کے اعتبار سے بینکر ہیں اور ساری عمر

گزار دی۔ پاکستان میں کئی بنکوں کے سربراہ رہے ہیں اور اب BCCI کے اعلیٰ افسران میں سے ایک ہیں میری کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بہت متین اور مدبر شخصیت کے حامل ہیں۔ کسی سے واقفیت اس سے ملنا کوئی ضروری تو نہیں۔

یوسفی صاحب نے ابتدائیہ کلمات میں ایسی ایسی لطیف باتیں کیں جن سے ہم سب بہت محفوظ ہوئے مثلاً بارش (جو رکنے کا نام نہ لیتی تھی) کا ذکر یوں کیا۔ "یہ شام آپ ایک بزرگ یاراں دیدہ کے ساتھ منا رہے ہیں" ہندوستان یا پاکستان سے کوئی شاعر یا ادیب لندن آتا ہے تو افتخار عارف سے پہلے ملنے آتا ہے اور بادام تسا دیکھنے بعد میں جاتا ہے۔"

یوسفی صاحب کی تحریر میں ہم نے وہ وہ الفاظ سُنے جو ہم نے بچپن میں (ہندوستان) بڑھی بوڑھیوں یا دیہاتیوں کی سے سُنے تھے اور ہمارے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔ انہوں نے لفظ "کھونی" استعمال کیا۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کے لئے واقعی عام تو نہیں ہے۔ اپنے کئی دوستوں سے استفسار کیا۔ میرا خیال صحیح نکلا یعنی اس لفظ کو یوسفی صاحب نے استعمال اردو بولنے والی نئی پود سے روشناس کرا دیا۔ کھونی اس کٹی ہوئی سوکھی شاخ کو کہتے ہیں جو کسی درخت کے تنے کا حصہ سے کاٹ کر کسی اور جگہ نصب کر دیا گیا ہو۔ کھونی عموماً کھونٹی کا کام دیتی ہے۔

یوسفی صاحب نے ایک خاکے 'حویلی' سے اقتباسات سنائے جو ان کے دوست کے خسر کے بارے میں تھا۔ مرزا صاحب در میں لکڑی کی دکان تھی۔ ان کی شخصیت کا نقشہ کس تفصیل سے کھینچا ہے۔

" وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے جس زمانے میں میرے خسر نہیں بنے تھے تو پھوپھا ہوا کرتے تھے۔ پھوپھا بننے سے ان کو جی حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ یقیناً کچھ اور لگتے ہوں گے مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا ہاں مراد آباد میں رشتے ناتے سوتوں کی طرح گتھے رہتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب انسان زندگی میں نہیں تھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا ۔ ۔ ۔ جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپن میں ہوتی تھی ویسی ہی نہ صرف ان کے دم تک رہی بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں ، لال سرخ ایسی جیسی! ون کبوتر، لگتا بڑی بڑی پتلیوں کے لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ ظاہر ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنھیں بوجوہ ناقابلِ اشاعت گالی نہیں دے سکتے تھے ایسے موقعوں پر منہ سے تو کچھ سرتاپا مجسم گالی بن کر کھڑے ہو جاتے بات تو بعد کی بات ہے بعض اوقات تو سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے۔ آپ کچھ بھی کہیں ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں وہ اس کی تردید ضرور کریں گے کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی ہیکی سمجھتے تھے۔ ان نہیں" سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پڑی میرے منہ سے نکل گیا کہ آج بہت سردی پڑ رہی دے کہ نہیں کل اس سے زیادہ پڑے گی ۔ ۔ ۔ حالانکہ بیٹی ان کی اکلوتی اولاد تھی اور بیوی کو شادی کے قبل ۔۔۔ نہلاتے مایوں کے دن بھی اس وقت جب میرے ابٹن ملا جا رہا تھا کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں سہرے سے

منہ باہر نہیں نکالے گا۔ ہنو گز پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا۔ عقد گاہ انھوں نے اِس طرح کہا جیسے ہمارے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ میرے مکان کے آگے باجا ہرگز نہیں بجے گا اور رنڈی نچوانی ہے تو اپنے کوٹھے پر نچواؤ ... چہرے اور چال ڈھال سے شہر کوتوال لگتے، چلتے تو قد، سینہ اور آنکھیں تینوں باہر نکال کر چلتے ... چوڑی دار پاجامہ، چوڑیوں کی وہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی اپنی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا، علیحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوتے تھے میں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دائی نے انھیں بغیر چوڑی دار کے دیکھا ہوگا ... گرمیوں میں ٹمپریچر ۱۱۲ ڈگری ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپڑ سے پڑنے لگتے تو پاجامے کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر، سر پر گیلا انگوچھا ڈال کر تربوز کھاتے تھے، کتنی ہی گرمی پڑے دوکان بند نہیں کرتے تھے، کہتے تھے میاں بزنس میں کیا گرمی کیا سردی لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آنکلے تو بُرا بھلا کہہ کر بھگا دیتے تھے ... تمباکو، قوام، خربوزے اور کڑھی ہوئی ٹوپی لکھنؤ سے اور تالے علی گڑھ سے منگواتے حلوہ سوہن اور محاورے دلّی سے۔ دانت ٹوٹنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ گالیاں البتہ خانہ ساز دیتے تھے۔ بالکل جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔

کراچی شہر سے مرزا صاحب کی خفگی پر ان کا ردِّ عمل سُنئے "یہاں تو بڑھئی آری کا کام زبان سے لیتا ہے، ... مچھر ہیں یا مگرمچھ، کراچی کا مچھر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا صرف قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو پاگل ہو کر بے اولاد مرتا ہے ... امرود کو جام کہتے ہیں اس پر اگر نمک مرچ کے بجائے صاحب لگا دیں تو نواب صاحب لسبیلہ ہو جاتے ہیں ... رنڈی کو پرمٹ راشن کارڈ پر ملتے ہم نے نہیں دیکھا ہے ... کچھ دن ہوئے ایک طوائف سے گانا سُننے کا اتفاق ہوا، اماں اُس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا"۔

حالانکہ پورا کا پورا خاکہ اس قابل تھا کہ نقل کیا جائے مگر طوالت کے خوف سے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں یوسفی صاحب کے اندازِ تحریر اور اس پر مستزاد ان کے لب و لہجہ نے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ سامعین ہنستے ہنستے یوں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے جیسے دھان کے ہرے کھیت سے پے بہ پے ہوا کے جھونکے گزر رہے ہوں۔ میں نے تو ایک دو سالہ بچے کو بھی قہقہہ مار کر ہنستے سنا شاید وہ ان لوگوں کی سنت پر عمل کر رہا تھا جو انگریزی کی کہاوت DO AS ROMANS DO پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی مجمع میں ایک حیرت ناک منظر یہ بھی دیکھا کہ ایک بزرگ جو شباہت میں ایسے لگتے تھے جیسے جوش صاحب ۷۰ سال کے سن میں لگتے ہوں گے، منہ بھی اسی طرح چلا رہے تھے جیسے جوش صاحب پان گھلانے میں چلاتے تھے۔ کمال سنجیدگی سے سُن رہے تھے۔ ایسی محفل میں جہاں سب پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے ہوں مجھے ایسا لگا گویا یہ بزرگ صحیح الدماغ نہیں یا پھر سارا مجمع پاگل ہو گیا ہے۔

یوسفی صاحب کے بعد الطاف گوہر صاحب جو نہ صرف اردو مرکز کے نگرانِ اعلیٰ ہیں بلکہ اس محفل کے بھی

صدر نے یوسفی صاحب کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ یوسفی صاحب جو باتیں مزاح میں کہہ جاتے ہیں اگر سادہ الفاظ میں کہہ دیں تو پکڑ کر جیل میں ڈال دیئے جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں رسم چلی ہے کہ مزاح نگار ہونے کی شرط یہ ہے کہ مصنف فوج میں ملازم ہو۔ مثلاً ضمیر جعفری ڈاکٹر شفیق الرحمٰن وغیرہ اور جتنا ہی فوج میں رتبہ بڑا ہو آدمی اتنا ہی بڑا مزاح نگار اور مزاح گفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ یوسفی صاحب فوجی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک بڑے مزاح نگار ہیں۔

●●

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجا سکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/..	روپے
فقط	یوسف ناظم	مضامین	۸/..	〃
البتہ	〃 〃	〃	۱۰/..	〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸/..	〃
دھرگھسیٹ	سرتیج حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/..	〃
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹/-	〃
بالآخر	〃 〃	مضامین	۱۴/..	〃
سنی سنائی	لئیق صلاح	〃	۱۵/-	〃
رقص تماشائی	وجاہت علی سندیلوی	〃	۱۵/..	〃
خواہ مخواہ	رشید الدین	〃	۱۰/..	〃
چند کلیاں نشاط کی	برہان حسین	〃	۱۰/..	〃
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	〃	۱۲/-	〃
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	〃	۱۲/-	〃
نمائش نمائش	پرویز یداللہ مہدی	〃	۱۵/-	〃

عقدِ ثانی

اعجاز وارثی (سنبھلی)

بہت دن بعد جب بیٹے کا خط رستم کے نام آیا
تو رستم نے جواباً رقعہ اس مضمون کا لکھوایا

مرے بیٹے، ضعیفی کے سہارے باخطِ طا تیرا
رہے منزل کے سائے میں ہمیشہ قافلہ تیرا

ملے عمرِ خضر تجھ کو، سکونِ زیست حاصل ہو
کبھی راہوں میں تیری گردشِ دوراں نہ حائل ہو

ہمیں احساس ہے، ہم کو تو ہر اک شے مہیا ہے
دیارِ غیر میں لیکن تو اے فرزند! تنہا ہے

ملازم تو ہے اور منہ میں ہمارے تر نوالا ہے
تری محنت مشقت ہی نے اِس گھر کو سنبھالا ہے

مگر تیرے لئے یہ فخر بھی کیا کم ہے، لختِ دل
کہ تیرے دم سے تیرا خانداں ہے رشک کے قابل

ہمیں اہلِ محلہ اب سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں
وہ قُل ہو یا نیاز و نذر، چندہ لینے آتے ہیں

ترا ذکر آتا ہے تو سب میاں سہراب کہتے ہیں
جو خاں صاحب ہیں وہ بھی اب ہمیں خانصاحب کہتے ہیں

خلاصہ یہ، بنا ڈالا ہے پربت تو نے رائی سے
ہمیں حاصل ہیں ساری نعمتیں تیری کمائی سے

کہاں وہ کچی دیواریں، شکستہ سائباں اپنا
کہاں اُس خطۂ ناقص پہ اب پختہ مکاں اپنا

جہاں اب "ماربل" کے فرش پر پاؤں پھسلتے ہیں
غسل خانے میں گرم و سرد فوارے مچلتے ہیں

"فریج" بھی ہے مرے کمرے میں کولر بھی ہے ٹی وی بھی
تری مرحومہ ماں کے بدلے ایک باشرع بیوی بھی

نئی ماں کی خبر میرے لئے بیشک نئی ہوگی
تجھے اس سلسلے میں کب کوئی سُن گُن ملی ہوگی

برس چھ کا تھا تو جب ماں سے تیرا ناتہ ٹوٹا تھا
بالفاظِ دگر دستِ اجل نے ہم کو لوٹا تھا

نہ آئی آرزو اُس وقت دل میں عقدِ ثانی کی
لُٹا دیں تیرے اُوپر راحتیں میں نے جوانی کی

یہ چوتھائی صدی گویا غمِ دوراں کا قصہ ہے
تری پرداخت میں ظاہر ہے جو کچھ میرا حصہ ہے

خدا کا شکر ہے تو اب جواں ہے نیک سیرت ہے
تری نظروں میں فرضِ اولین میری اطاعت ہے

کیا ہے خط میں ظاہر کچھ ارادہ تو نے شادی کا
لکھا ہے نام بھی رمضو کی بیٹی شاہزادی کا

مگر آگاہ اب کیونکر کروں تجھ کو حقیقت سے
کسی نے سچ کہا ہے "کون لڑ سکتا ہے قسمت سے"

یہ اُلٹا پانسہ ہی دو قسمتوں کا کیوں پڑا ہوتا
کبھی اس بارے میں تو نے اشارہ ہی کیا ہوتا

تجھے اب کیسے سمجھاؤں کہ دل بے حد پریشاں ہے
ارے وہ شاہزادی ہی تو تیری دوسری ماں ہے

بانو سرتاج
چندراپور (مہاراشٹرا)

ستم ظریفیہ کافی

تصور کیجئے آپ کسی محفل میں شریک ہیں۔ چائے کے پیالے پیش کئے جارہے ہیں۔ اچانک ایک صاحبہ بڑی نخوت سے کہتی ہیں "میں چائے نہیں پیتی۔ میں کافی پیتی ہوں" تمام نظریں اُن کی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں۔ وہ اسے محسوس کرلیتی ہیں۔ ذرا اور اِترا کر کہتی ہیں — میں نے چائے کبھی پی ہی نہیں۔ میرے بچے بھی کافی پیتے ہیں"۔

ہم نے تو صاحب پارٹیوں میں ایسی ایسی خواتین اور صاحبان کو کافی کی فرمائش کرتے دیکھا ہے جنھیں گھر پر کافی نصیب ہوتی ہوگی اس میں شک کی کافی گنجائش ہے کتنوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں کافی اور چائے کے پیالے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں وہ یہ کہہ کر کافی کا پیالہ اُٹھا لیتے ہیں کہ 'چائے تو روز پیتے ہیں آج کافی ہی سہی'۔

کافی پینا آج کل فیشن بن گیا ہے۔ ہر وہ خاندان جو فیشن پرست اور آزاد خیال ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے چائے کا نام بھولے سے بھی نہیں لیتا۔ چائے پُرانے زمانے کی چیز ہوگئی ہے۔ انگریز چلے گئے مگر صاحبی کے لئے اب بھی اُن کی تقلید ہوتی ہے۔ بلیک کافی، کولڈ کافی، کریم کافی وغیرہ نہ جانے کتنی طرح کی کافی پی جاتی ہے۔

کافی بڑے لوگوں کا مشروب ہے اور بڑے لوگوں کی باتیں نرالی ہوتی ہیں۔ اور لوگ ڈھنگ سے بیٹھ کر کھانا نہ کھائیں تو تنقید ہوتی ہے۔ بدتمیزی پر محمول کیا جاتا ہے۔ انگریز کھڑے کھڑے کھانا کھاتے ہیں تو انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا اُلٹے فیشن کہہ کر تقلید کی جاتی ہے۔ عام لوگوں کے گھر چائے میں مٹھاس کم ہو تو طعنہ مارا جاتا ہے کہ کنٹرول کا زمانہ ہے۔ امیروں کے یہاں پھیکی کافی کو بھی مزے لے لے کر حلق سے اتارا جاتا ہے۔

چلے دل کے پھپھولے پھوڑنا کہئیے یا کچھ اور۔ دراصل اس کافی کے معاملے میں ایسے ایسے زخم کھائے بیٹھے ہیں کہ ٹیس برداشت کے باہر ہے۔ کافی کا نام نکلتا ہے اور ہمارے لب پر آجاتا ہے ۔ ۔ ۔

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

ہمارا شمار ہوتا تو عام لوگوں میں ہے مگر اکثر و بیشتر ہمارا سابقہ خواص سے پڑتا رہتا ہے۔ قسمت کا لکھا کہئے یا اعمال کی سزا، اُن کے کافی پینے کا شرف بھی گاہے بگاہے حاصل ہوتا رہتا ہے۔

ضلع کے ایک بڑے افسر کی بیوی ہیں۔ خواہ مخواہ ہم پر شفقت کی بارش کرتی جاتی ہیں۔ روز ہمیں یاد فرماتی ہیں۔ طرّہ یہ کہ روز کافی پینے پر بھی مجبور کرتی ہیں۔ جبراً اس لئے .... کہ ہم لاکھ انکار کریں ... وہ انکار کو ہمارے انکسار پر محمول کر کے قطعی دھیان نہیں دیتیں اور کافی پلا کر ہی دم لیتی ہیں۔ ایک روز ہماری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ حد سے زیادہ خراب کافی تھی۔ ہم نے جلے بھنے لہجے میں اُن سے پوچھا۔

"آپ کافی کس طرح بناتی ہیں؟"

وہ سمجھیں ہم اُن کی کافی پر عاشق ہو گئے۔ خاکسارانہ انداز سے بولیں ...."ویسے ہی جیسے عام طور پر بنائی جاتی ہے۔"

ہم نے ایک طویل اونہہ کی اور خاموشی سادھ لی۔

"آپ کیسے بناتی ہیں؟" اُنہوں نے نہایت اشتیاق سے دریافت کیا۔

"ہم بھی ویسے ہی بناتے ہیں۔" ہم نے تنک سے کہا۔ "مگر ہم کافی میں شکر ڈالتے ہیں۔" اُن کا چہرہ بس ویسا ہی ہو گیا جیسا اُن کی کافی پیتے وقت روز ہمارا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ ہم اپنی سہیلی کے گھر گئے۔ ہائی سوسائٹی کی ماری، فیشن کی دلدادہ تھی۔ کالج سے سیدھے وہاں پہنچے تھے۔ ایک کپ اچھی چائے کی شدت سے ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ چائے تو خیر وہاں کیا ملتی، کافی کی فرمائش کی ہم نے۔ اُس نے ملازم کو پکار کر کافی لانے کے لئے کہا۔ ساتھ ہی ہم سے پوچھا۔ "کچھ کھاؤ گی؟"

"ہاں، شکر کھائیں گے۔"

وہ حیرت سے ہمیں تکنے لگی۔ ہم نے ڈھٹائی سے کہا "کھلانا نہیں ہے تو پوچھا کیوں؟"

اُس نے ملازم کو شکر ساتھ لانے کے لئے کہہ دیا۔ ملازم کافی لایا تو ہم نے اطمینان سے اپنا کپ اُٹھا کر اُس میں ڈیڑھ چمچہ شکر ملائی عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے آئندہ جب بھی اُس سہیلی کے گھر ہمیں کافی پیش کی گئی ٹرے میں شکر پاٹ ضرور موجود رہا۔ ایک اور واقعہ سنئے :- یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کے انچارج تھے۔ ایک تقریب کے لئے ضلع کے کلکٹر کو مدعو کرنے یونین کے پریسیڈنٹ کے ہمراہ اُن کے بنگلے پر پہنچے۔ صاحب لنچ لے رہے تھے۔ ڈرائینگ روم میں انتظار کے دوران جہازی سائز کی کپوں میں ہمیں کافی پیش کی گئی جو کافی کم برتنوں کا دھووَن زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ دراصل وہ کافی کی نقل تھی مگر اصل سے کوسوں دور تھی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی ہم دونوں نے سٹپٹا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں جھکالیں۔ جب پون کافی پی چکے تو کلکٹرنی صاحبہ نادم سی آکر بولیں۔ "رک جائیے۔ دوسری کافی منگوا رہی ہوں۔ ملازم اس کافی میں شکر ڈالنا بھول گیا تھا۔" آپ ہی بتائیے کافی سے چڑھنے میں ہم حق بجانب ہیں یا نہیں؟

انیس احمد خان (نئی دہلی)

راشن کارڈ

راشن کارڈ راشن حاصل کرنے کے کام میں آتا ہے جوکہ راشن کے دفتر سے راشن کارڈ کی فیس کچھ رشوت دے کر بآسانی بن جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ آپ اپنے مرحوم رشتے داروں کو جب تک چاہیں زندہ رکھ سکتے ہیں۔ ان کے نام الاٹ کیا گیا گیہوں اور چینی کھا سکتے ہیں اور اُن کی روح کو جہاں کہیں بھی وہ ہو ثواب پہنچا سکتے ہیں۔

راشن کارڈ روزمرّہ کما کر کھانے والوں کا نہیں بنا کرتا۔ راشن کارڈ ان کا بنتا ہے جن کا کوئی پکا ٹھکانہ ہوتا ہے۔

پکّے ٹھکانے پر ایک بات یاد آئی۔ ہمارے ایک دوست تھے۔ جن کا پتہ تھا مسٹر گھورے لال معرفت لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ایسٹ ویسٹ پارک۔ نئی دہلی۔ کافی دنوں میں جاکر یہ راز کھُلا کہ موصوف ایسٹ ویسٹ پارک میں متعین آنجہانی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مجسمے کے سائے میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔

اجی چھوڑیئے صاحب! بات چل رہی تھی راشن کارڈ کی۔ اور ہم لے بیٹھے پکّے ٹھکانے کو۔ تو صاحب! راشن کارڈ اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعہ آپ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ آپ زندہ ہیں۔

ویسے بھی ہمارے ملک میں مرنے کا حق سبھی کو پہنچتا ہے۔ لیکن راشن کھا کر مرنے کا حق صرف انہی کو ہے جن کے پاس راشن کارڈ ہے۔

ایک زمانہ تھا، میرے پاس سب کچھ تھا۔ نوکری تھی، سکون تھا، شانتی تھی، (یہ کسی لڑکی کا نام نہیں ہے) اس نے جب اس دن مجھے یہ احساس ہوا کہ میری نوجوانی عروج پر پہنچ گئی ہے اور کسی بھی دن ادھیڑ عمر سے ہم آہنگ ہوسکتی ہے تو میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

شادی کرنے سے دو فائدے ہیں۔ ایک تو بیوی ملتی ہے جو آپ کو مجازی خدا کا درجہ عطا کرتی ہے۔ ساتھ ہی چولہا چوکا برتن سے لیکر آپ کی ساری الجھنوں بھال دیتی ہے۔ دوسرے سسرال کی وہ تمام خواتین جن کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا

تمنا آپ کے دل میں ایک زمانے سے مچلتی رہی ہے وہ آپ کے گھر آنا جانا شروع کردیتی ہیں۔ اس لئے میں نے اپنے ایک بزرگ دوست سے اپنے ہونے والے سسر کو اپروچ پہنچادی۔ دوست نے انھیں جاکر بتایا کہ ایک ہونہار نوجوان جو ہر قسم کے خطرات سے کھیلنے کا عادی ہے آپکی دختر نیک اختر کا بوجھ اٹھانا چاہتا ہے۔ لڑکا بہت سیدھا ہے۔ ایک دفتر میں نوکری کرتا ہے۔ گھر سے سیدھا دفتر جاتا ہے صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سنتا ہے اور واپس گھر آجاتا ہے۔ اس کے دوران میں جو وقت ملتا ہے وہ آپ کی صاحبزادی کی گلی اور گرد چکر لگانے میں گزار دیتا ہے۔ جس کے لئے وہ اکثر لنچ کے بعد دفتر سے لاپتہ ہوجاتا ہے۔ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ بڑے صاحب نے اسے نوکری سے نکالنے کی دھمکی دے دی ہے۔ اگر آپ ملک کے ایک نوجوان کی روزی روٹی سلامت رکھنا چاہتے ہیں تو اپنی بیٹی سے اس کا عقد کردیں۔

میرے موجودہ سسر نے اپنی بیٹی کا بوجھ خوشی خوشی میرے اوپر ڈالدیا۔ ابھی میرے سہرے کی لڑیاں سوکھی بھی نہیں تھیں کہ میری نئی نویلی بیوی نے کہا ـــ "یہ گھر ہے یا سرائے"۔

"ابھی کچھ دن پہلے تک تو گھر تھا ـــ میں نے کہا"۔

"خاک گھر تھا ـــ یہاں تو راشن کارڈ بھی نہیں ہے"۔

"راشن کارڈ ـــ ؟ اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم لوگ تو ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں اور آئندہ بھی کھاتے رہیں گے"۔

فنِ خانہ داری میں ان کی پکڑ نہ ہونے کے مدِ نظر میں نے کہا۔

اجی راشن کارڈ صرف راشن لانے کے لئے نہیں ہوتا۔ محلے والوں سے رسم و راہ بڑھانے کے کام بھی آتا ہے"۔

میں نے بیوی کی یہ پہلی فرمائش جان کر فوراً راشن کارڈ بنوایا۔ بس مجھے اپنے دو جوڑی چپل ایک جوتا، قمیض کے کچھ حصے اور سر کے کچھ بال ضائع کرتے پڑے۔ کافی دنوں بعد یہ راز کھلا کہ لوگ چائے کی پتی چینی اور آٹے کی طرح راشن کارڈ بھی گھر گھر جاکر مانگتے ہیں۔ اور آپ کے حصے کا مٹی کا تیل ضرورت پڑنے پر آپ کو ہی اونے پونے داموں میں بیچ دیتے ہیں۔

اب گھر میں راشن کارڈ آگیا تھا۔ لوگوں کا آنا جانا بھی شروع ہوگیا تھا۔ جن میں زیادہ تعداد خواتین کی ہی ہوتی تھی۔ جو آتی تو راشن کارڈ کے چکر میں تھیں لیکن جاتے جاتے گھر سے ایک آدھ رسالہ یا ایک آدھ جوڑی چپل اپنے ساتھ لے جاتیں۔ اِدھر راشن کارڈ کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی بھی وہ محلے پڑوس سے فرصت پاتا تو گیس والے، اسکوٹر والے اور ڈی ڈی اے والوں کے پاس جمع کردیا جاتا۔ کیونکہ یہ لوگ بھی بغیر راشن کارڈ کے رجسٹریشن نہیں کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ میں راشن کارڈ سے راشن لینے کے علاوہ ہر کام لے رہا تھا۔

دن، مہینے، سال گزرتے گئے۔ ہوتے ہوتے ایک دن چناؤ آگئے۔ اخباروں میں یہ اعلان چھپا کہ جن کے نام ووٹر لسٹ میں نہیں ہیں وہ اپنے نام اس میں لکھوالیں۔ اور اپنی آئینی حیثیت قائم کرتے ہوئے اپنے بنیادی حقوق کا استعمال کریں۔ اور ووٹ دیں۔ نام لکھوانے کے لئے راشن کارڈ لانا پہلی شرط تھی۔

میں نے بھی ایک اچھے شہری کی طرح ووٹر لسٹ میں اپنا نام لکھوانا چاہا۔ اور راشن کارڈ لے کر دفتر پہنچ گیا۔ نام لکھنے والے حضرت نے میرا راشن کارڈ بغور دیکھ کر بغیر میری جانب دیکھے کہا۔ "آپ کا نام ووٹر لسٹ میں نہیں لکھا جاسکتا۔ کیوں کہ آپ مرچکے ہیں"۔

"میں مرچکا ہوں۔ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ چھ مہینے پہلے آپ مرچکے ہیں۔ آپ کا نام راشن کارڈ سے کاٹا جاچکا ہے"۔

"لیکن میں تو صحیح سالم آپ کے سامنے کھڑا ہوں"۔ میں یہ سوچکر کہ شاید بابوجی مذاق کر رہے ہیں مسکرا کر کہا۔

"آپ سرکاری کارروائی کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں"۔ انہوں نے مجھے غصّہ سے گھورتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو اس کے لئے آپ کو کڑی سزا ہوسکتی ہے"۔

"لیکن میں تو زندہ ہوں"۔

"اگر آپ زندہ ہیں تو اس کا ثبوت لائیے"۔ یہ کہکر راشن کارڈ مجھے واپس تھما دیا۔

میں حیرت زدہ سا جیسے ہی راشن کارڈ لے کر چلنے لگا تبھی ان حضرت کو میرے اُوپر رحم آگیا۔ اُنہوں نے مجھے بلایا اور سمجھایا۔ "دیکھو بھائی اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں اگر آپ واقعی زندہ ہیں تو راشن کارڈ انسپکٹر کے پاس جاکر اپنا نام اس میں دوبارہ چڑھوالائیے۔

میں اس دن کے بعد سے دفتر، دفتر۔ انسپکٹر، انسپکٹر چکر کاٹنے میں مصروف ہوگیا۔ ہر جگہ سے مجھے یہی جواب ملتا۔ ناممکن! ہم مجبور ہیں! یہ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ایک مرے آدمی کو زندہ کردیں۔ میں لاکھ لاکھ منتیں کرتا گڑگڑاتا اپنے بدن میں سوئیاں چبھا کر اور خون نکال کر انھیں یقین دلانے کی کوشش کرتا لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔

آخر کار ایک دن میں تھکا ہارا اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد گھر لوٹا۔ دل میں یہ ارمان تھا کہ آج پھانسی لگاکر مرجاؤں گا۔ کیونکہ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اتنے ڈھیر سارے آدمیوں کو جھوٹا ثابت کروں۔

میں نے ہاتھ میں پکڑا بیگ ایک جانب پھینکا اور مرنے سے پہلے کچھ غور وفکر کی خاطر دھم سے پلنگ پر گرگیا۔ اس قدر دھڑام دھڑام کی آواز سُن کر بیگم بوکھلا کر باہر آئیں۔ مجھے اس قدر بے سُدھ پڑا دیکھ کر گھبرا کر بولیں۔ "خُدا خیر کرے۔ کیا آپ کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے"۔

"وہ سالے تو سب بھلے چنگے ہیں۔ میں ہی مرگیا ہوں"۔

"مریں تمہارے دشمن۔ آخر بات کیا ہے؟"

"میں نے انھیں تمام داستان سُنادی۔ انہوں نے پریشان ہوکر بیگ سے راشن کارڈ نکالا اور اس پر نظر

پڑھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں " ارے یہ کارڈ تو اپنا نہیں ہے۔ پڑوس والی کملا کا ہے۔ جس کے شوہر کا ابھی پچھلے دنوں انتقال ہوا تھا۔ یہ میرے کارڈ کے دھوکے میں اپنا دے گئی "

اور وہ کملا کا کارڈ اسے واپس کرنے چل دی۔ میں اب پلنگ پر پڑے پڑے اگلی مصیبت کا انتظار کر رہا تھا۔ کیوں کہ میں آج ہی کورٹ میں یہ بیان دے کر آیا تھا کہ میں یعنی کے یس ولد فلاں۔ فلاں جب سے پیدا ہوا ہوں تبھی سے زندہ ہوں۔ بیچ میں ایک بار بھی نہیں مرا۔ اور اس کارڈ میں درج نام والی عورت کا قانونی شوہر ہوں۔ اور ان تمام بچوں کا باپ ہوں جن کا نام اس راشن کارڈ میں درج ہے ساتھ ہی اس راشن کارڈ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی فوری کارروائی کے لئے کورٹ میں جمع کرا آیا تھا۔

گولڈن جوبلی سال ۳۳ء سے ۸۳ء

اب آپ کی پسندیدہ

لاسا اسپیشل چائے اور

لمسا چاکلیٹ چائے

نے اپنے ۵۰ سال بفضلہ تعالیٰ

مکمل کر لئے ہیں

Nilgiri's
FINEST Quality LASA
LASA
SUPER BLEND
TEA

سید ضمیر جعفری

مشاعرہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مرغ بازی بیٹر بازی وغیرہ کی طرح مشاعرہ کرانا یعنی مشاعرہ بازی بھی ایک لت ہے میں خود گزشتہ پندرہ سولہ برس سے اس مرض میں مُبتلا ہوں۔ ابتداء میں محض خدمتِ ادب کے خیال سے ایک مشاعرے کی نیو رکھی تھی۔ بعد میں مشاعرے نے گویا اپنی نیو مجھ پر رکھ دی چنانچہ اس مدت میں درجنوں دبلے پتلے، موٹے تازے مشاعرے کرا چکا ہوں۔ لیکن آج بھی مشاعرہ سے توبہ کا اعلان کرتا ہوں اور اپنی اس تحریر کو گواہ بناتا ہوں تاکہ آئندہ اس مشاعرہ کو منہ دکھاؤں تو دُنیا کو مُنہ نہ دکھا سکوں۔

لوگ عام طور پر مشاعرے کو بڑی آسان چیز سمجھتے ہیں حالانکہ آج کل مشاعرے اور الیکشن میں تھوڑا ہی فرق رہ گیا ہے۔ مشاعرہ اِن دنوں کیسیا۔ نہیں جاتا لڑا جاتا ہے میں نے تو اپنے انتظام کے ہر مشاعرے کے بعد کچھ اس طرح محسوس کیا ہے گویا مشاعرہ نہیں گولکنڈہ کا قلعہ سر ہوا ہے مشاعرے کی مشکل ہی یہ ہے کہ وہ آسان معلوم ہوتا ہے۔

بعض ممالک کی طرح مشاعرہ بھی ہر وقت خارجی اور داخلی خطروں کی زد پہ رہتا ہے اس طرح موت عموماً "داخلی خطروں" یعنی خود شعراء کرام کے ہاتھوں واقع ہوتی ہے کسی انڈو پاک سطح کے مشاعرے میں ظاہر ہے کہ آپ گنتی ہی کے مقامی شعراء کو مدعو کرسکتے ہیں مگر وہاں شہر کا شہر شاعر ہوتا ہے اور شعراء کے بارے میں یہ تو خیر طے شُدہ بات ہے کہ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ بلکہ لہو خورشید کا نکلے اگر ذرّے کا دل چیریں۔

آپ نے دیکھا ہوگا بعض مشاعروں میں شعراء و سامعین کی تعداد قریب قریب برابر ہوتی ہے۔ یہ مشاعرہ تو نہ ہوا ایک قسم کی جمہوریت ہوئی ایسے موقعوں پر مشاعرہ کرنے کے بجائے یہ کہیں بہتر ہو کہ ایک ایک شاعر کو دو دو سامعین کے سپرد کر دیا جائے کہ لیجئے صاحب انھیں اپنے گھر لے جایئے یا پھر مشاعرے کا ایک پورا ہفتہ منعقد کیجئے جس میں شعراء و سامعین زندگی کے تمام کاروبار بند کر کے قومی پیمانے پر مشاعرہ پڑھیں اور سنیں۔

منتخب مقامی شعراء کو آپ یقیناً مدعو کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ان کی سواری کا انتظام کرتے ہیں مگر

ان میں اکثر کا رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ گویا مدعو کئے جانے پر خفا ہو گئے ہیں۔ پہلے میٹھے میٹھے گلے۔ پھر دھیمی دھیمی خفگی کی باتیں اور آخر کار تند و تیز اختلافات حتیٰ کہ مشاعرے کے قریب قریب صرف چند جاں نثار شعراء ہی میدان میں رہ جاتے ہیں صورت حال کچھ مغلوں کے عہد زوال کے ہندوستان کی سی ہوتی ہے کبھی دکن میں شورش کبھی مالوہ میں بغاوت کبھی ملتان میں فساد۔ اختلافات کچھ اس نوع کے ہوتے ہیں۔

۱۔ پوسٹر میں میرا نام باریک قلم سے لکھا گیا ہے۔
۲۔ میرا نام فلاں صاحب کے بعد لکھا گیا ہے۔
۳۔ فلاں صاحب مدعو کئے گئے ہیں
۴۔ فلاں صاحب مدعو نہیں کئے گئے۔
۵۔ میں موٹر میں کسی دوسرے کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔
۶۔ اچھا آپ نے مجھے مقامی شاعر سمجھ لیا؟
۷۔ انجمن ضیأ الادب کے سب شعراء کی شرکت ضروری ہے (اور ان کی گنتی ڈیڑھ سو سے اُوپر ہے)
۸۔ میں نے ۲۵ اعزازی کارڈ طلب کئے تھے۔
۹۔ میں طرحی مشاعرہ کا قائل نہیں۔
۱۰۔ میں غیر طرحی مشاعرہ کا قائل نہیں۔
۱۱۔ میں مشاعرہ ہی کا قائل نہیں۔

الغرض آخر دم تک کچھ پتا نہیں چلتا کہ کون صاحب آ رہے ہیں، کون نہیں لیکن جب پتا چلتا ہے تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جو اصحاب دو ٹوک معذرت کر چکے تھے ان میں سے بیشتر تشریف لے آئے ہیں اور جن کی شرکت یقینی تھی ان میں سے اکثر کا کوئی سراغ نہیں۔

اس آنے کو کیا کہئیے اس جانے کو کیا کہئیے

بیرونی استاد شعراء کے اپنے پرابلم ہیں پہلے تو ان کے انتخاب پر خود انتظامیہ کمیٹی کے اندر وہ ہنگامہ بپا ہوتا ہے کہ عموماً انتظامیہ کمیٹی ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ جو مشاعرہ اس مرحلہ سے بچ نکلا وہ مشاعرے سے زیادہ ترنم اور تحت اللفظ سامعین اور مائیکروفون کارکنوں اور سرپرستوں اور نہ جانے کن کن مجبوریوں اور مصلحتوں کے درمیان ایک عجیب و غریب سمجھوتہ ہوتا ہے۔

شعراء سے خط و کتابت بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ ان خطوط سے اپنے دور کی ایک نہایت قیمتی سوانحی دستاویز مرتب کی جا سکتی ہے۔ مثلاً:۔

۱۔ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔

۲۔ میں غروب آفتاب کے وقت "کافی" پیتا ہوں۔

۳۔ میں سالن میں مرچیں تیز کھاتا ہوں۔

۴۔ میں "کریون اے" کے سگریٹ پیتا ہوں۔

۵۔ کیا بستر ساتھ لانا ہوگا؟

۶۔ مجھے چھٹی دلانے کے لئے پنڈت نہرو کو فون کیجئے۔

میں سمجھتا ہوں مشاہیر کے بارے میں اس قسم کی باتیں ضبطِ تحریر میں آجانی چاہئیں کیونکہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بعد میں تاریخی باتیں بن جاتی ہیں۔ مگر افسوس ان باتوں کو داستان لکھنے کی ہمیں جرأت نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ خط و کتابت سے آپ بیرونی شعرا کے تمام پرابلم طے کرسکتے ہیں تو میں سمجھ جاؤں گا کہ آپ کو مشاعرہ کرانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شعراء نہ خود تفصیل سے لکھتے ہیں نہ دوسروں کی تفصیل پر توجہ دیتے ہیں۔ لہذا آپ خواہ کچھ کریں بعض پرابلم بہ نفسِ نفیس شاعر کے ساتھ ہی وارد ہوں گے۔

آپ جناب سینائی اور جناب تمنائی کو بہ صراحت لکھ چکے تھے کہ پروگرام میں گڑبڑ ہو تو آپ سیدھے میٹروپول ہوٹل میں تشریف لے آئیں جو ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ہے وہاں آپ کے لئے کمرہ مخصوص ہے۔ مشاعرہ شروع ہوچکا مگر سینائی و تمنائی کا کوئی پتا نہیں آپ سمجھتے ہیں کہ وہ تشریف نہیں لائے۔ اتنے میں خبر ملتی ہے کہ سینائی صاحب باہر گیٹ پر کھڑے ہیں اور دو تانگوں میں سامان لدا ہے۔ شہر سے کوئی صاحب فون کرتے ہیں کہ تمنائی صاحب گلی مائی تابو میں ذکی الدین صاحب کے ہاں فروکش ہیں۔ اُدھر آپ کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ گلی مائی تابو کہاں ہے اور ذکی الدین صاحب کون بزرگوار ہیں۔

شباب صاحب مشاعرے سے کوئی دس پندرہ منٹ پہلے پہنچ تو گئے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ابھی حجامت بنوانی ہے۔ شیروانی پر استری کروانی ہے قمیص سرے سے سامان میں کوئی لائے ہی نہیں اور وہاں طرحی غزل میں مصرعِ طرح کے سوا انہیں کچھ کہہ بھی سکتے۔

بعض لوگ (اگرچہ بہت شاذ) تعجیل کے پرابلم پیدا کرتے ہیں۔

مشاعرے میں چھ سات روز باقی ہیں۔ آپ رات کے دس بجے باہر سے گھر لوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ برآمدے میں بکسوں، گٹھڑیوں اور بوریوں کا انبار لگا ہے اور ڈرائینگ روم میں تین چار اجنبی آدمی بیٹھے چلغوزے کھا رہے ہیں۔

"خاکسار کو نغمہ قرطاس پوری کہتے ہیں"

"آ ہا ہا! ــــ نغمہ صاحب" اور آپ ان سے لپٹ جاتے ہیں کیونکہ اگر آپ ان سے نہیں لپٹیں گے تو وہ آپ سے لپٹ جائیں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ نغمہ صاحب سے کبھی نہیں ملے۔ نہ ان کا فوٹو کبھی دیکھا تھا۔ کیوں کہ نغمہ صاحب مشاعرے کے ان استادوں میں سے ہیں جن کو ادبی رسائل کے ایڈیٹر چھاپنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ بہرکیف نغمہ صاحب تشریف لے آئے تھے معلوم ہوا، پچھلے اتوار ادکاڑہ میں مشاعرہ تھا۔ انہوں نے سوچا لاؤ پا بہ رکاب دوسرا مشاعرہ بھی بھگتا لو۔ احباب (۹)

سے ذرا الگ ہی رہے گی اور یہ تین صاحبان، نغمہ صاحب کے سخن فہم دوست ہیں. جن کو آپ زبردستی گھسیٹ لائے ہیں ویسے وہ بنولوں کی آڑھت کرتے ہیں. چنانچہ "نمونے" کی بوریاں باہر برآمدے میں پڑی ہیں.

جو شعراء پروگرام کے مطابق پہنچ چکے ہیں اور آپ کو اطمینان ہے کہ وہ آپ کے قابو میں ہیں. ان میں سے اکثر ٹھیک مشاعرے کی شام کو بے قابو ہو کر گھومنے نکل جائیں گے، کہاں گئے، کب واپس آئیں گے کچھ معلوم نہیں. واپس آئے تو بعض اس حالت میں ہیں کہ اب آپ مشاعرے ہی کو ان تک لے آئیں. ورنہ وہ تو سود و زیاں، ہوش و خرد بلکہ زمان و مکان اور ہستی و نیستی وغیرہ کی منزلوں سے بھی گویا بہت آگے نکل چکے ہیں. نتیجہ یہ کہ سیکریٹری بچارے نے زیادہ تر چوراچار اسمیٹ کر پھر ان چند شعراء کے آسرے پر مشاعرہ شروع کردیا جن سے ابھی تک مشاعروں کی کچھ ساکھ باقی ہے دوسرے شعراء رفتہ رفتہ جیسے جیسے کوئی ملتا گیا شروع سے آخر تک ایک ایک کر کے قطرہ، بہ قطرہ، مشاعرے میں پہنچتے رہے.

بعض شعراء وقت کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں. خوب بجا ہوا مشاعرہ جب تک اُن کی آمد کے غلغلے میں درہم برہم نہ ہو تو وہ اپنی آمد ہی کو بے معنی سمجھتے ہیں یہ اصول گویا عروض کے مسلمات میں سے ہے جتنا بڑا کوئی شاعر ہے اتنی ہی دیر سے وہ مشاعرے میں پہنچے.

یہاں مجھے بے اختیار علامہ ہیبت یاد آجاتے ہیں. ان کو بھول ہی نہیں سکتا کیونکہ وہی تو دراصل "مشاعرہ بازی" سے میری توبہ کا باعث ہوئے. میں تو ایک طرح سے ان کا احسان مند ہوں. بلکہ ایک میں کیا جملہ سامعین کو بھی ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے کیوں کہ میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کم از کم اس شہر میں کوئی مشاعرہ بھی ہو سکے گا یہ نکتہ قدرے تفصیل چاہتا ہے. مشاعرے میں اجمال کا کیا کام؟

علامہ ہیبت ہمارے مشاعرے کے سب سے بڑے شاعر تھے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارے شہر میں آرہے تھے. ہم میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر ان سے واقف نہ تھا. البتہ ان کی نازک مزاجی، غصہ وری اور بددماغی سے متعلق طرح طرح کی ہولناک روایات ضرور مشہور تھیں لوگ کہتے تھے ان کا مدعو کرلینا کوئی کمال نہیں ہاں ان کو سنبھال کے رکھنا واقعی ایک کارنامہ ہے ـــــ بعض لوگ اعداد و شمار سے ثابت کرتے کہ ان کی شرکت کی بدولت جتنے مشاعرے برباد ہوئے ہیں اتنے کامیاب ہرگز نہیں ہوئے ہمیں ان باتوں کا یقین نہ آتا. جیسی جیسی نازک مزاجیاں ان سے منسوب کی جارہی تھیں اس زمانے میں ایسے شخص کا ساٹھ برس تک زندہ رہنا ہی محال تھا مگر لوگ بھی سچ ہی کہتے تھے.

پوری مجلس انتظامیہ علامہ کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی. علامہ تشریف لائے تو ایک ملازم کے علاوہ دو مصاحب بھی ان کے ہم رکاب تھے جن کی ہمیں کوئی اطلاع نہ تھی. ویسے صورت و حیثیت میں یہ دونوں مصاحب کلن نواب اور نبھو مرزا ان کے ملازم سے کچھ بہتر نہ تھے. بہرحال پہلے بڑھ کر میں نے اپنا تعارف کرایا پھر کمیٹی کے دوسرے ارکان کو علامہ کی خدمت میں پیش کیا.

" مسٹر اعجاز علی ٹرانسپورٹ افسر"

" خوب "

" مسٹر علی حیدر فارسٹ"

" خوب"

" خواجہ مصباح الدین میونسپل کمشنر"

" خوب "

" میجر ڈبلیو، زیڈ خاں نائب صدر"

" خوب، اور آپ کے صدر کون ہیں" ؟ علامہ نے دریافت فرمایا۔

" کمشنر صاحب" ہم نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

" کمشنر صاحب کہاں ہیں" ؟

وہ دورے پر ہیں یا "دورے پر" ! علامہ چونک کر بولے "کیا وہ مشاعرے کی صدارت نہیں کر رہے" ؟

" صدارت تو کر رہے ہیں، مگر وہ کمشنر بھی ہیں میجر خان نے جن کو اس سے پہلے کبھی کسی مشاعرے سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا دو ٹوک لہجے میں کہا۔

" مگر میں اس توہین کا عادی نہیں ہوں" علامہ بھڑک اٹھے۔

" قبلہ مجبوری تھی اچانک ایک اہم سرکاری کام نکل آیا" میں نے خیر سگالی کے مشن پر ایک جملہ بھیجا۔ "ویسے شام کو وہ یہیں ہوں گے۔"

" کچھ بھی ہو۔ ہماری طبیعت مکدر ہو چکی ہے۔ منجو مرزا سامان اسی گاڑی میں رکھ دو ہم یہاں نہیں اتریں گے"

یہ سن کر ہمارے قدموں تلے سے گویا پلیٹ فارم ہی نکل گیا وہ تو یہ کہیئے کہ اس موقع پر میونسپل کمشنر صاحب جو سیکڑوں انتخابی معرکوں میں سے نکلے ہوئے تھے کام آگئے اور انہوں نے منت سماجت کر کے علامہ کو راضی کر لیا ورنہ علامہ ہاتھ سے نکل ہی گئے تھے۔

ہوٹل میں پوری مجلس انتظامیہ اُن کی خدمت میں حاضر رہی۔ شام کو ہم لوگ جوائنٹ سیکریٹری عابد کو اِن کی خدمت میں چھوڑ کر پنڈال میں آگئے ہیں۔ میں علامہ کو خطوط میں لکھ چکا اور اب بھی عرض کر آیا تھا کہ آپ نو بجے تشریف لائیں گے میں جانتا تھا کہ میں نو کہوں گا تو وہ کہیں دس بجے آئیں گے خود ہمارا ارادہ بھی مشاعرے کو نو بجے ہی شروع کرنے کا تھا مگر کمشنر صاحب نے وقت کی پابندی ضروری سمجھی اور اعلان کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے مشاعرے کی کارروائی شروع کردی۔ نو بج گئے دس بج گئے مگر علامہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اتنے میں ہوٹل سے ایک آدمی میرے نام یہ پیغام لایا کہ تم فوراً پہنچو علامہ خفا ہو گئے ہیں۔ میں پہنچا تو

عابد پورچ میں کھڑا تھا۔ اُس نے بتلایا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک تو علامہ اور مصاحبین خوب دھواں دھار کافی پیتے رہے اور نہایت اچھے موڈ میں تھے۔ پھر میں ان کا ڈنر لگواتے گیا۔ واپس آیا تو انہوں نے کہا کہ سرکار نے ہدایت کی ہے کہ بارہ بجے سے پہلے ان کو ہرگز نہ جگایا جائے میں نے سوچا بارہ بجے تو ادھر کمشنر صاحب مشاعرہ ہی برخاست کر دیں گے۔ لہٰذا پونے دس بجے میں نے خود ہمت کر کے ان کو جگا دیا کہ حضرت ڈنر تیار ہے مگر اس پر وہ سخت برہم ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں میں مشاعرے میں جاتا ہی نہیں۔

"قطعی انکار؟" میں نے پوچھا۔

"ان کی طرف سے تو یہی معلوم ہوتا ہے"۔ عابد بولا: البتہ کلّن نواب کہہ رہے تھے کہ اگر سیکریٹری صاحب خود آ جائیں تو شاید بات بن جائے"۔

"اچھا اب میں کوشش کر دیکھتا ہوں۔ تم یوں کرو کہ تھوڑی سی اور کافی بھجوا دو"۔

"اور کافی!" عابد حیران ہو کر بولا: "کافی ہی نے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم نہیں سمجھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درد کا حد سے گزرنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں کمرے میں پہنچا تو علامہ تکیے کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹے ہوئے پلنگ پر دراز تھے۔ میں نے پوچھا

"خیریت تو ہے قبلہ؟"

قبلہ نے یہ سُن کر کروٹ لی اور منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔

"سیکریٹری صاحب تشریف لائے ہیں سرکار" نجو مرزا نے سفارش کی۔

"ہوں" سرکار دیوار ہی کی طرف سے بولے "معاف فرمائیے سیکریٹری صاحب"۔ جو چیرا تو اِک قطرۂ خون نکلا۔"

"جی ہاں معاف فرمائیے" کلّن نواب بولے "اب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

"مگر کچھ معلوم تو ہو قبلہ؟"

"کیا ابھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟" قبلہ منہ پھیرتے ہوئے بولے "سیکریٹری صاحب آپ کے جوائنٹ سیکریٹری صاحب نے سرِ شام ہی مجھے بیدار کر دیا۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے"

"ایسا تکدّر تو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ طبیعت میں" نجو مرزا بولے۔

"میں بہت شرمسار ہوں آپ سے"

"ہم ان سے کہتے بھی رہے کہ سرکار بارہ بجے تک آرام فرمائیں گے۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔"

"مجھے بے حد افسوس ہے مگر قبلہ دراصل اس بے چارے کا بھی گناہ نہیں ہم لوگ مشاعرہ آٹھ بجے شروع کر کے بارہ بجے ختم کرنے کا اعلان کر چکے ہیں"

" سبحان اللہ! یہ عجیب مشاعرہ ہے جو بارہ بجے ختم بھی ہوجائے گا لو اور سنو نجو مرزا!"

" مشاعرہ تو بارہ بجے جاکر کہیں شروع ہوتا ہے" مرزا نے گرہ لگائی۔

" بجا فرمایا، مشاعرہ تو واقعی بارہ بجے شروع ہوتا ہے لیکن . . . ."

اتنے میں بیگم کافی لے کر آگیا اور میں نے ایک پیالہ بنا کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

" قبلہ آپ تھوڑی سی کافی نوش فرمائیں۔ میں آپ کے چہرے پر ابھی تکان کے آثار دیکھ رہا ہوں"

اس پر علامہ سنبھل کر بیٹھ گئے دو گھونٹ لینے کے بعد انہوں نے پاؤں فرش پر رکھ دیئے اور تیمرے پر بولے۔

" مجھے تو دس بجے بھی چلنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن بعض مقبولیتوں کو میں برداشت نہیں کرسکتا۔"

" جی"

" اور حضرت کیا وہ آپ کے کمشنر صاحب بھی تشریف لاتے ہیں یا دور سے ہی پرے ہیں؟"

" جب میں آیا ہوں اُس وقت مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس وقت کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

" کیوں؟" قبلہ نے دریافت فرمایا۔

" قبلہ وہ تو صرف آپ ہی کو سننے کے مشتاق تھے"

" تو گویا سخن دوست انسان ہیں"

" آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ کل دوپہر کو آپ کے لنچ کے لئے بھی کہہ رہے تھے۔"

" تو کیا کہہ سکتے ہو برخوردار؟"

" میں کیا عرض کرسکتا ہوں قبلہ ویسے لوگوں کو سخت مایوسی ہوگی۔"

" اچھا تو میں چلتا ہوں" علامہ یکبارگی اچھل پڑے " بھئی مجھ سے لوگوں کی مایوسی نہیں دیکھی جاتی۔"

نجو مرزا میری شیروانی۔ ٹوپی، جوتا . . ."

میں سمجھا اب میدان مار لیا۔ لیکن تیار ہونے کے بعد علامہ نے ایک خاص اداء بے نیازی کے ساتھ تین چار بیاضیں نجو مرزا اور کلن نواب کے سامنے پھینک دیں کہ لو بتاؤ کون کون سی غزل رہے اور اب غزلوں کے انتخاب پر جو بحث چلی ہے تو قصہ کوتاہ جب میں علامہ کو لے کر پنڈال میں پہنچا ہوں تو ایک بج گیا تھا کمشنر صاحب مشاعرے کو ایک پرنسپل صاحب کے سپرد کر کے تشریف لے جاچکے تھے اور پرنسپل صاحب بپھرے ہوئے سامعین کے نام بار بار ان کی اپیلیں جاری کر رہے تھے۔ اور سامعین چلا رہے تھے۔

" ہمارے پیسے واپس کرو"

" ہمارے پیسے واپس کرو"

بد قسمتی کی انتہا یہ ہوئی کہ علامہ کو دیکھنے کے بعد بھی سامعین بدستور بپھرے رہے۔ کیفیت یہ تھی کہ علامہ مطلع پڑھ رہے

ہیں — یاروں کے لئے گردشِ ایام بہت ہے — اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں کہ :۔

"ہمارے پیسے واپس کرو !"

"ہمارے پیسے واپس کرو !"

دراصل ریلوے اسٹیشن پر علامہ کے روٹھنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم نے داڑھی مونچھ پر رام پوری ٹوپی رکھ کر کوئی نقلی آدمی کھڑا کر دیا ہے۔ سب سے مزے دار لطیفہ مشاعرے کے بعد اس وقت ہوا جب مجو مرزا نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب مبارک ہو۔ خدا کی قسم یہ تو معجزہ ہوا ہے جو سرکار مشاعرے میں تشریف لے آئے۔"

اور میجر ڈبلیو، زیڈ خان نے جو پاس پائپ روشن کر رہے تھے زور کا ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"مائی گاڈ — دات اے فنی لاٹ ہول آن دیم۔"

□□

سائیڈ سے چلئے اور در پردہ کے بعد

مزاح نگار

مسیح انجم کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ

چنانچہ

زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے، خوبصورت سہ رنگی سرورق

پاکستان کے نامور کارٹونسٹ عزیز حیدرآبادی

قیمت مجلد (۱۲) روپے

پروفیسر ایم۔ اے۔ شاد
(بھوپال)

تب مجھے یہ شعر یاد آیا

غالب نے کہا تھا ؎

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

جی ہاں! ایسا اکثر ہوتا ہے اور شاید کبھی آپ کے ساتھ بھی ہوا ہو۔ ! کوئی بدگمان ہے اور اس
مانی کی ؟ / بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن آپ کا یہ حال ہے کہ منہ میں زبان رکھتے ہوئے
بے زبانی کی کیفیت طاری ہے۔ تمام تر توانائی کے بعد بھی ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ یارائے جنبش لب
نہیں۔ کوشش کے بعد بھی زبان گُنگ ہے۔ لبوں پر حرف و صوت و معنی کے دفتر خاموشی کی
سینہ چادر میں لپٹے پڑے ہوئے ہیں۔ دل میں جذبات کا طوفان ہے۔ خیالات اظہار کے راستے
ن کر رہے ہیں، عقل دلائل کے سمندر بہانے کے لئے بے چین ہے۔ روح مضطرب ہے اور ذہن
ں فشاں بنا ہوا ہے۔ لیکن صاحب یہاں وہی شکوۂ ناتوانی کہ نہ وہ آپ سے اپنی بدگمانی کے ازالہ
بلئے کچھ پوچھتا ہے اور نہ ہی آپ میں اتنی ہمت ہے کہ خود پہل کریں اور اس طرح بدگمانی کی خلیج
سیع ہوتی چلی جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بدگمانی کے کیا اسباب ہوتے ہیں اور ناتوانی کتنے قسم کی ہوتی
ہے۔ ؟؟ جہاں تک بدگمانی کا تعلق ہے تو بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کی کوئی وجہ
ں ہوتی۔ صرف ایک واہمہ، ایک خیال، ایک شک کبھی کبھی بدگمانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر
سا بھی ہوتا ہے کہ آپ اپنے کسی دوست سے محوِ گفتگو ہیں۔ بات خاصی اہم ہے اور آپ چاہتے ہیں
آپ کے یہ دوست اس بات کو کسی پر ظاہر بھی نہ کریں۔ یہ صاحب آپ کو مکمل رازداری کا یقین بھی

دلاتے ہیں۔ اتفاق سے یہ بات آپ کے ایک دوسرے رفیق سے متعلق ہے جن کی طبع نازک کسی جملۂ معترضہ کی متحمل نہیں ہوسکتی اور آپ بھی چاہتے ہیں کہ کہیں خاطرِ احباب کے نازک آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ چنانچہ بات ختم ہوجاتی ہے لیکن چند روز بعد آپ کی ملاقات ان صاحب سے اس حالت میں ہوتی ہے کہ ان کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ نہ وہ پہلی سی گرم جوشی اور نہ وہ تپاک ـــ!! معاً آپ کو یہ خیال گزرتا ہے کہ آپ کے ہمراز نے بدعہدی کی اور انھیں ساری باتیں بتادیں۔ جب کہ ایسا ہوا ہی نہیں۔ بلکہ آج یہ صاحب اپنی بیگم سے لڑکر آرہے ہیں اور اس قدر برگشتہ خاطر ہیں کہ اپنے پرائے میں امتیاز نہیں کرپارہے۔ لیکن آپ کچھ اس قدر حواس باختہ اور بوکھلائے ہوئے ہیں کہ یہ بھی نہیں پوچھ پارہے کہ بھئی آخر کیا بات ہے۔ یہ خفگی کیسی۔ یہ کھنچاؤ کیسا؟ یہ بدگمانی کیوں؟ ایسے عالم میں غالبؔ کا یہ شعر یاد نہ آئے تو پھر یاد کرے ـــ

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

خیر صاحب یہ معاملہ تو ایک ہم جنس یارِ بدگمان کا تھا۔ لیکن اگر بدگمانی کے بادل آپ کے محبوب کے دل و دماغ پر چھا جائیں اور آپ عشقِ جاں گسل کے ہاتھوں مجبور ہوکر دشت و صحرا کی راہ لیں یا ملازمت سے مستعفی ہوکر کوچۂ محبوب کی خاک اُڑانے لگیں تو معاملہ بہت سنگین ہوسکتا ہے۔ طفلانِ شہر کے دستِ شوخ سے آپ کے سرِ شوریدہ کے پرزے اُڑ سکتے ہیں۔ جیب و گریباں کا امتیاز ختم ہوسکتا ہے یا خردمندانِ جہاں کی صحبت ناخواستہ سے بہرہ ور ہونے کی سعادت نصیب ہوسکتی ہے یعنی آپ کسی پاگل خانہ میں بھرتی کردیئے جائیں یا پھر سرکاری مہمان خانہ کی مدارات سے آپ کی پذیرائی کی جاسکتی ہے۔

اب رہی بات ناتوانی کی، تو صاحب اس کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جب آدمی جسمانی طور پر تو خاصا ناتواں ہوتا ہے لیکن زبان خاصی توانا ہوتی ہے اور الفاظ کے بے تکان پر کترتی ہے۔ دوسری قسم وہ جب آدمی جسمانی طور پر تو خاصا توانا ہوتا ہے لیکن اس کی قوت گویائی ناتوانی کا شکار ہوتی ہے۔ زبان ہر حرف پر گرہ کھاتی ہے۔ ایک ایک لفظ کو ادا کرنے کے لیے جسم کو کئی کئی بار جھٹکے کھانے پڑتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بولنے والا لفظوں سے کشتی لڑ رہا ہے تیسری قسم وہ جب آدمی جسم اور زبان دونوں اعتبار سے خاصا صحت مند ہوتا ہے لیکن موقع کی نزاکت اور Situation اس کی قوتِ گویائی سلب کرلیتی ہے۔ وہ بول سکتا ہے لیکن نہیں

بول سکتا۔ وہ نطقِ گُہر بار کا جلوۂ صد رنگ دکھا سکتا ہے لیکن نہیں دکھا سکتا۔ جی ہاں غالب کی
ناتوانی تیسری قسم کی تھی جن کو خود بقول اُن کے یہ شکوہ رہا کہ ؎

ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

یا جن کو اپنے عالم تقریر پر اتنا ناز تھا کہ بقول اُن کے ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

لیکن صاحب وہ غالب جس کی لذت تقریر کا یہ عالم تھا کہ جو سنتا تھا سمجھتا تھا کہ گویا یہ بھی
اُس کے دل میں تھا کبھی کبھی اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کی بدگمانی دور کرنے کے لیے خود
میں قوتِ گویائی نہیں پاتا۔ جی ہاں۔ ایسا ہی ایک بار میرے ساتھ ہوا اور تب مجھے یہ شعر یاد آیا۔
بہت برسوں کی بات ہے شاید ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا۔ اُس وقت میں ایک ادارہ میں بحیثیت
ECONOMIC ANALYST کام کرتا تھا۔ کالج سے نیا نیا آیا تھا۔ چڑھتی عمر، دل میں
ولولے جوش اور اُمنگیں۔ کام کرنے اور خوب سے خوب تر کرنے کا حوصلہ تھا۔ چنانچہ چند دنوں
میں ہی دفتر کا پینڈنگ ورک (Pending Work) برق رفتاری سے پورا کیا اور اس
کے بعد اپنے روز کے کام میں مشغول ہوگیا۔ میرے سکشن انچارج ایک عمر رسیدہ انسان تھے۔ زندگی
کا بڑا حصہ دفتر کی نذر کر چکے تھے اور اب آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف رواں دواں تھے
جہاں وقت زیادہ اور کام کم ہو جاتا ہے اور جب ہاتھ پیر کم اور زبان زیادہ چلنے لگتی ہے۔ دُبلا پتلا
جسم جس پر بغیر پریس کی بشرٹ اور پتلون چڑھے رہتے۔ آنکھوں پر دبیز شیشوں کا چشمہ
جن میں سے ایک طویل عمر کا تجربہ جھانکتا دکھائی دیتا۔ سر کے بال داغِ مفارقت دے چکے
تھے اور جو تھوڑے بہت باقی تھے وہ اپنی باری کے منتظر تھے۔ جس دن شیو نہیں ہوتا تو
ایسا لگتا جیسے بقول غالب چہرہ پر چیونٹیوں نے انڈے دے دیئے ہوں۔ موصوف ایک طویل
عرصہ تک بمبئی میں رہ چکے تھے اس لیے اُن کا لب و لہجہ بھی ویسا ہی ہو گیا تھا جیسا کہ عام طور پر
بمبئی والوں کا ہوتا ہے۔

ایک دن کہنے لگے۔ "ارے بابو! میرے کو دیکھتا ہے۔ اپُن جب اس آپھس میں آئیلا تو
تیرا مایھک ہوئیلا۔ پن اب تیرے باپ کا مایھک ہوگیلا کیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ...."

"لیکن کیا ــ؟" بڑے بابو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اپُن اس دپھتر میں کھلاس ہوگیا۔ اور ایک دو سال میں رِٹائر ہو جائیگا۔ پن اب ایسا لگتا

رے تو اپُن کو لائف سے بھی رٹائر کر دینگا۔ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"لیکن بڑے بابو ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آپ میرے سینئر Senior ہیں۔ تجربہ کار ہیں۔ میں تو ابھی کچھ بھی نہیں جانتا۔ ابھی تو مجھے آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔" میں نے خفیف ہوتے ہوئے کہا۔
"کیا سیکھا رے؟ بڑے بابو ذرا نرم ہو کر بولے۔
"اپُن کو دیکھو رے۔ سارا لائف ان پھائلوں میں کھتم کر دیا۔ پن ۔ ملا کیا ۔ ؟ دیکھو رے۔ اگر ایسی تیجی کرینگا تو ایک مہینہ کا کام ایک دن میں کھتم ہو جائینگا اور پھر 29 دن کیا مکھی مارینگا۔ اپن تیرے کو Advice دیتا کہ Go Slow ۔ دھیرے چلو۔ نہیں تو تھک جائینگا۔ گر پڑینگا۔ اور پھر سارا لائف رُو۔ رُو کر گجاریگا۔"
"لیکن بڑے بابو۔ ہمیں کام تو کرنا ہی ہے اور پھر اس آفس میں کام بھی تو کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر آج کا کام آج ہی کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔"
"تیری سمجھ میں ابھی نہیں آئینگا۔" بڑے بابو فارغ البال کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولے۔
"دیکھو رے۔ اپُن کو مالوم۔ تو اُڑتی چڑیا ہوئیلا۔ کل کو دوسرا جاب Job ملا تو چلا جائینگا۔ پن اپُن کدھر جائینگا۔ اس آپھس سے سیدھا شمسان۔ سمجھا۔ تو اپُن کے واسطے کاہے کو مصیبت کھڑی کرتا رے۔ میرے کو لگتا تو ایک دن جرور اپنا پائیہ گول کر دینگا۔"
دن گزرتے رہے۔ بڑے بابو کی میز پر فائلوں کے ڈھیر بڑھتے رہے۔ ان کی عینک کے شیشے کچھ اور دبیز ہو گئے اور وقت اپنے محور پر ناچتا رہا۔
ایک دن یکایک ڈائرکٹر صاحب ہمارے سیکشن میں وارد ہوئے اور وہ بھی اُس وقت جب بڑے بابو اپنی کرسی کے تکیے پر سر لگائے، آنکھیں بند کئے ماضی کے کھنڈروں میں اپنی عمرِ رفتہ کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ میں تھامس ہارڈی کے مشہور ناول Jude the obscure میں ڈوبا ہوا تھا۔ دوسرے لوگ چائے اور سگریٹ سے دل بہلا رہے تھے۔ کبھی کبھی ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ فضا کے سکوت کو توڑ دیتی۔ یکایک میری نظر اوپر اُٹھی تو دیکھا کہ سارے لوگ دم بخود کھڑے ہوئے ہیں۔ سوائے بڑے بابو کے جو ہنوز خوابِ خرگوش میں مبتلا تھے۔ میں پہلے تو کچھ نہ سمجھ سکا لیکن جانے کیوں بے سوچے سمجھے خود بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن جوں ہی میں نے اپنی بائیں سمت دیکھا تو بس۔ سمجھو جان ہی نکل گئی۔ ڈائریکٹر صاحب کھڑے ہوئے خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ گویا ہوئے۔

"کیوں کیا کر رہے تھے ؟"
"سر۔ وہ ۔ میں . . . . یہ ۔ یہ ناول پڑھ رہا تھا۔"
"ہوں۔ تو یہ دفتر نہ ہوا، ریڈنگ روم ہوگیا۔"
"جی . . . . وہ . . . ."
"کیا جی جی کرتے ہو۔ کیا آفس میں کچھ کام نہیں ہے؟"
"جی . . . . وہ ؛"
"کیا مطلب ۔" ڈائریکٹر صاحب کا لہجہ اور سخت ہوگیا۔
"بات یہ ہے سر کہ۔ واقعی اس آفس میں بہت کم کام ہے اور جو کچھ تھا وہ میں ختم کر چکا ہوں اور پھر . . . سر . . . ٹائم پاس کرنے کیلئے کچھ تو ۔"
"خوب ۔ تو آپ آفس میں ٹائم پاس کرنے کے لیے آتے ہیں ؟ صاحب کی آواز بجلی بن کر گری اور بڑے بابو ہڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔ اور اس طرح کہ آنکھوں سے چشمہ گرا جا رہا ہے زبان گنگ ہے۔ خود کو سنبھالتے ہیں تو چشمہ ٹوٹتا ہے اور چشمہ سنبھالتے ہیں تو خود کی خیر نہیں۔
بہ ہزار دقت کھڑے ہوئے اور بولے۔
" Good morning Sir " (گڈ مارننگ سر)
"ہوں۔ تو آپ یہاں سونے آتے ہیں" صاحب نے چیخ کر کہا۔
" No - No - Sir وہ . سر. جرا آنکھ لگ گیا۔"
"کوئی کام نہیں ہے آپ کے پاس؟"
"کام ۔ ؟ سر بہت کام ہے۔ بہت کام ہے سر۔ ایک آدمی کا بہت جرورت ہے ۔"
"ہوں۔ ٹھیک ہے ۔ مجھے معلوم ہے اس آفس میں کتنا کام ہے۔"
اس کے بعد صاحب چلے گئے۔ لیکن بڑے بابو کی حالت زار بس دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ایک ایک پر برس رہے ہیں۔ "تم لوگ اپن کو مار ڈالینگا۔ جرور مار ڈالینگا۔ تم میرے کو اٹھایا کیوں نہیں۔ تم اکھا لوگ دشمن ہے دشمن ۔ اور یہ لڑکا کدھر سے ادھر کو آن مرا۔ یہ اپنا پائیہ گول کر دینگا۔"
وقت گزر گیا۔ کچھ دن دفتر میں خاموشی رہی۔ کام حسب معمول ہوتا رہا۔ دفتر کے دیگر لوگ اب مجھ سے کسی حد تک کشیدہ سے رہنے لگے تھے۔ بڑے بابو کو تو بس جیسے صرف ایک

بیماری لگ گئی تھی۔ اور۔ وہ میں تھا۔ اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے بس ایک ہی ٹر۔ " یہ لڑکا اپنا پائیہ گول کر دیگا "۔ اور پھر ایک دن صاحب نے مجھے اپنے چیمبر میں بلایا اور بولے "کیا تمہارے سکشن میں واقعی کام کم ہے؟"

میں نے کہا۔ " جی ہاں سر۔ بہت کم کام ہے۔"

"اور تم سوائے ناول پڑھنے کے اور کچھ نہیں کرتے۔"

"سر۔ وہ۔ ناول تو میں اس وقت پڑھتا ہوں جب کام نہیں ہوتا۔"

"اور کام ہوتا ہی نہیں"۔ صاحب نے فقرہ پورا کر دیا۔

"اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ اس آفس میں سرپلس Surplus ہیں"

میری آواز رندھ گئی۔ گلا خشک ہوگیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان گنگ ہوگئی تھی۔

"ہمیں اب آپ کی ضرورت نہیں۔ اکاؤنٹس آفس سے اپنی تنخواہ لے لیجئے۔ اب آپ جاسکتے ہیں"

میرا سر چکرانے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آہستہ آہستہ میں نے حواس کو مجتمع کیا اور بوجھل قدموں سے اپنے سیکشن کی طرف چل دیا۔ جیسے ہی میں اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ بڑے بابو کے چہرہ کا رنگ فق ہے۔ بدن پسینہ سے شرابور ہے۔ میں نے اشارہ سے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ بولا۔ " بڑے بابو کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ ابھی۔ ابھی سمئے۔ بیچارے کو بڑی دور پھینکا ہے۔ چارج دے رہے ہیں۔"

اتنے میں بڑے بابو نے میری طرف دیکھا اور لگا ہیں فائلوں میں گاڑ دیں اور اِدھر اپنا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

بڑے بابو کے سینہ میں تیر لگا ہوا تھا لیکن وہ خاموش تھے۔ اور ادھر اپنا بھی پائیہ گول ہوگیا تھا اور بڑے بابو کو خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت غالب کا یہ شعر میرے ذہن کی سطح پر رینگ رہا تھا ؎

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

⁂ ⁂ ⁂

پاگل عادل آبادی

ہندو مسلم لڑکو مریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں
اوندھے سیدھے کاماں کریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں

اک دوجے کے خون سے اپنی پیاس بجھاکو اترا رئیں
کھیت میں بے سبب نفرت کے چریئں نئیں بولے توسنتے نئیں

ہیں یہ درندے یا انسان یہ جنگل ہے یا آبادی
اپنا سایہ دیکھ کو ڈریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں

باہر سے جب خطرہ ہوتو کونے کو تے بھاگیں گے
آپس میں اب لڑ کو مریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں

اوپر والا ہاتھ دکھا تو دن میں تارے دکھتے نئیں
سیلاباں میں ڈوب کو مریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں

کٹھ پتلی کا ناٹک ہے سب پیچھے اس کے جو بھی ہیں
اپنا الّو سیدھا کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

مندر ڈھارئیں مسجد ڈھارئیں عقل کے دشمن کیا بولو
تو ”سے لو“تے کھیلاں کریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں

بھاگ متی کا شہر ہے یہ بھولاں کا بن ”کتا بولا
چاقو لیکو ٹھٹھے کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

”ایرہ گڈہ“ سے باہر رہ کر بھی پاگل کچھ لوگاں
پاگل پن کے چالاں کریئں نئیں بولے تو سنتے نئیں

○

دل کے ہاؤس میں کیوں اندھیرا ہے
کیا کہیں اور اُس کا ڈیرا ہے

مجھ کو اس سے نہیں کوئی مطلب
پھر یہ دن رات کیا پھیرا ہے

مون لائٹ کی کوئی ہوپ نہیں
چاند کو بادلوں نے گھیرا ہے

ووٹ لے کر وہ بن گیا ہے وزیر
اب نہ تیرا ہے اور نہ میرا ہے

امن قائم ہو پھر بھلا کیوں کر
مخبروں نے پولس کو گھیرا ہے

چاند بھی چھپ گیا اماوس میں
اُس نے زلفوں کو جب بکھیرا ہے

کل جو رہتے تھے جھونپڑیوں میں رفیع
اُن کا محلوں میں اب بسیرا ہے

نسیم احمد (بانیاں)

خنداں (علیگ)

مکتوبِ غالب

میں شاداں ہوں آج خوشی کا وفور ہے
ہے نشۂ نشاط، خمار و سرور ہے

شاید کوئی فرشتۂ فردوس دے گیا
غالب کا ایک نامہ جو میرے حضور ہے

لکھا ہے میرزا نے یہ مہدی[1] کے نام خط
مجھ کو ملا ہے، نامہ بری کا قصور ہے

قرطاسِ زر پہ لولو و مرجاں کے ہیں حروف
یا مطلعِ سحر میں ستاروں کا نور ہے

اک شہرِ خلد ہے جہاں نوشہ مقیم ہیں
دلّی ہے، لکھنؤ ہے نہ وہ رامپور ہے

مکتوب میں ہیں غالبِ خستہ رقم طراز
دل کو سکوں، قرارِ جگر کو ضرور ہے

خدمت میں دست بستہ ہے غلماں کی ایک فوج
ہر ہر قدم پہ منتظر اردوئے حور ہے

دل بستگی کے ہر طرف اسباب ہیں بہم
چوسر ہے، گنجفہ ہے، شرابِ طہور ہے

پنشن کی فکر ہے نہ تو مطلوب خلعتیں
لفٹنٹ گورنر سے نہ وہ جی حضور ہے

گوروں کی فوج ہے نہ تباہی ہے غدر کی
فتح و شکست کا نہ وہ شورِ کشور ہے

ملّا نے جس کے واسطے کی زندگی خراب
بیشک وہی یہ خلد ہے دار السرور ہے

لگتا نہیں ہے دل مگر اک خیال شہر میں
شاید یہ میری عقل و خرد کا فتور ہے

دلّی میں جو سے بہر تھا جنت میں بھی وہی
ناخواستہ حیات، دلِ ناصبور ہے

دلّی کی صحبتیں ہیں نہ میرن[2] سے چھیڑ چھاڑ
تم ہو، نہ مرزا تفتہ[3]، نہ صدر الصدور[4] ہے

میں کیا کروں نگاہ کو دلّی کی ہے تلاش
کیا جانے باغِ خلد سے وہ کتنی دور ہے

فاقے تھے، مفلسی تھی، وہاں غم تھا، رنج تھا
ہیں جوئے شہد و شیر یہاں حسنِ حور ہے

---

[1] میر مہدی مجروح [2] میر میرن صاحب [3] ہرگوپال تفتہ [4] مفتی صدر الدین۔

مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

"اُس کا آنا"

ڈھلتی عمر میں آدمی بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ 'بجو' بھی ہوجاتا ہے (خفا ہونے کی بات نہیں کیوں کہ یہ لفظ ہمارے محلے میں دھڑلے سے استعمال ہوتا ہے) لیکن میں اپنا یا اپنے محلے کا پوسٹ مارٹم کرانا نہیں چاہتا۔

بات یہ ہے کہ کوارٹر کی صفائی کا خیال یکایک آیا تھا۔ چھٹی تھی، سوچا یہ صحت مند کام کر ڈالوں۔ اور سچ پوچھئے تو تین دن کی محنت کے بعد اپنے دو کمروں والے دیا سلائی نما کوارٹر کی صفائی سے یہ فرق آیا کہ ریٹائرڈ جوتوں (جن میں بغل کی مسجد سے پار کیئے ہوئے جوتوں کا شمار نہیں ہے) کا بکس جو دروازے کے بائیں طرف رکھا رہتا تھا، اب دائیں طرف رکھ دیا گیا۔ کھڑکی پر لگا اپنی قمیص کا پردہ اتار کر پائجامے کا پردہ بدستور لگا دیا۔ تین سال پرانے ہمالنی والے کیلنڈر کی جگہ ابھی کی پدمنی کولہاپوری کا کیلنڈر دیوار پر نظر آنے لگا: جسے لگاتے وقت بیگم کی بڑی تیکھی پھٹکار سننی پڑی تھی (چونکہ یہ ہمارا اسپیشل اینڈ پرائیویٹ، معاملہ ہے اس لئے عام لوگوں کو اس میں دخل اندازی کی قطعی ضرورت نہیں ہے)

لیکن۔۔ تیسرے دن جب میں صحت مند کام سے فراغت پانے ہی والا تھا کہ پڑوس کی دیوار کے اُس پار سے آواز آئی "آج رات وہ آئے گی۔ اس کا استقبال اچھے ڈھنگ سے کرنا ہے۔ وارے نیارے ہو جائیں گے"

میرے دونوں کان کھڑے ہو گئے۔ جمنا پرساد اپنے اُوپر کے پورشن والے مدن کمار سے کہہ رہا تھا "دروازے کھلے رکھنا ہوگا"

میں نے اپنے تن بدن میں آگ سی محسوس کی۔ ہمارے آس پاس ایسی عیاشی اور غنڈہ گردی! ہم سب ایک ہی فیکٹری میں کام کرتے ہیں اور سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ دونوں پڑوسی یوں کھلے عام کسی کا انتظار کریں۔ کیا وہ رات میں آنے والی، کسی اسمگلر گروپ کی ہیڈ ہے؟ آخر ان دونوں کے وارے نیارے

کیسے ہو جائیں گے؟ ضرور کچھ بات ہے ورنہ ان دونوں کی گھروالیاں (کوارٹر والیاں زیادہ صحیح ہے) کسی آنے والی کو کیسے برداشت کرلیں گی؟

دبے پاؤں چلتا ہوا میں کھڑکی کے پاس آگیا اور جھرّی سے جھانکتے ہوئے ان کی بات چیت سننے لگا۔ بالکل جاسوسوں کی طرح جاسوسی ناول میں نے بہت پڑھے ہیں اور لڑکپن سے ہی خواہش رہی ہے کہ جاسوس بنوں۔ آج جیسے موقع خود بخود آگیا تھا۔ جمنا پرشاد دانت لکو سے مدن کمار سے باتیں کئے جارہا تھا۔ اس کے دانت نٹ پا کھی دنت منجن کے اشتہ نظر آرہے تھے۔ مگر باتوں میں صفائی کہاں تھی۔ دونوں بولے جارہے تھے:

"اس سے پہلے تو وہ کبھی نہیں آئی۔ ہم ہمیشہ انتظار میں ہی رہے۔ بڑا تڑپایا ہے اُس نے مگر اس بار اسے آہی جانا چاہیئے"

ان کی یہ مجال! معشوق کہیں کے! میرے ہوتے ہوئے یہ سیاہ کاری!

"نہیں ہونے دوں گا" میرے منہ سے غصہ بھری آواز نکلی۔ گھر کا خیال ذہن سے اُتر گیا تھا۔ یکایک بیگم کی آواز کھڑے کان سے ٹکرائی" کیا نہیں ہونے دیں گے؟ لیکن پہلے یہ تو بتائیے، کھڑکی کے پاس سے چھُپ چھُپ کر اُدھر کیا دیکھ رہے ہیں؟"

اُس نیک بخت نے آگے بڑھ کر مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے تڑاق سے کھڑکی کھول دی۔ اُدھر نظر پڑی تو بالقول کے طوطے اُڑ گئے (سچ مچ کا طوطا ہاتھ میں نہیں تھا۔ یہ محاورہ ہے) جہاں پہلے جمنا پرشاد کھڑا تھا، وہاں اب اس کی جوان بیوی کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔

بیگم اسی تیزی سے دروازہ بند کرکے پلٹیں اور "نیوز ریل" کی طرح چالو ہو گئیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بھی لگی ہوئی تھی "میں اچھی نہیں لگتی تو لگا کیوں نہیں دیا دیتے۔ ایک طرف ہیروئنوں کی تصویریں، دوسری طرف کھڑکیوں سے پرائی عورتوں کے ساتھ تاک جھانک۔ میرے ہوتے ہوئے یہ بے شرمی... اوں... اوں... اوں..." وغیرہ وغیرہ

میں نے گھبراہٹ میں ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے "تم جیسا سمجھ رہی ہو، ویسا بالکل نہیں ہے۔ میرے اس سوا چونتیس انچ کے سینے میں تمہارے لئے ابھی اتنی ہی جگہ ہے جتنی شادی سے قبل چھُپ چھُپ کر ملتے وقت تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب روکو اور مجھ پر بھروسہ رکھو"

شمشیر زنی یا تیراندازی کا کام تو میرے آباد اجداد نے بھی کبھی نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت کی تیراندازی کام آئی۔ تیر ایسے نشانے پر بیٹھا کہ بیگم تیسوں دانت نکال کر ہنس پڑیں (تیس میں ابھی دو کم ہیں)

بیگم کے "گو دِنٹ گون" ہوتے ہی ذہن میں گونج سی پیدا ہوئی "وہ آئے گی رات میں..."

لیکن پھر وہی خیال بغیر پاسپورٹ کے چکر لگانے لگا کہ ہو نہ ہو ان کا تعلق کسی بڑے گروہ سے ہے۔ اگر

ہے تو یہ لوگ ہتھیاروں سے لیس ہوں گے اور اپنی جان بچانے کے لئے کسی کی جان لینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائیں گے۔
بر جھری سی آگئی۔ اس جھرجھری پر حادثے کی صبح یاد آئی جب اکثر سویرے سویرے بیگم رضائی کھینچ لیتی ہیں۔ پھر
جاسوسی ناولوں کے سارے سچویشن یاد آنے لگے۔ "دن دن زیر و دن" کی کار ـــ دھماکہ ـــ دھواں ـــ اندھیرے
میں سرخ بلب ـ کسی کی شیطانی آنکھیں ـ مضبوط ہاتھ ـ کالی پرچھائیاں ـــ ساتھ ہی ساتھ بیگم کی جھڑکیاں
اسوسی ناول پڑھ پڑھ کر ذہن میں زنگ لگائیے ـ آنکھیں پھوڑیئے اور وقت کا "مرڈر" کیجئے۔
لیکن میں نے سوچا کہ جاسوس بننے کا صحیح وقت آپہنچا ہے۔ جب میں اس گروہ کا خاتمہ کردوں گا تو محلے کے
ہر میں چرچا ہوگا۔ اخبار میں تصویر شائع ہوگی اور انعام و اکرام سے بھی نوازا جاؤں گا۔ بیگم کی جھڑکیاں یاد
میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اور رات کی تیاری میں لگ گیا کہ کس طرح اس گروہ کا قلع قمع کروں گا۔
بیگم کے برقع (بطور نقاب) اور ترکاری کاٹنے کی چھری (بطور ہتھیار) کو میں نے خصوصی اہمیت دی اور رات
دس بجتے بجتے گھر سے نکل کر اُس درخت پر چڑھ گیا جہاں سے کوارٹر کا آگا پیچھا دیکھ سکتا تھا۔
وقت سرکتا گیا ـــ میری نگاہیں جمی رہیں۔
جمنا پرشاد اور مدن کمار بھی دروازے کھلے رکھ کر انتظار کرتے رہے۔
آخر صبح کے ساڑھے تین بج گئے۔ غصّے سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ درخت کی شاخ پر بیٹھے بیٹھے کمر بیٹھ
مانگ ایک ہوگئی تھی۔
تبھی جمنا پرشاد نے پکار کر مدن کمار سے کہا "اب نہیں آئے گی؟"
"ہاں اب نہیں آئے گی۔"
دونوں دروازے پر آکھڑے ہوئے۔
میں پیڑ سے نیچے اُتر آیا اور چیختی آواز میں پوچھنے لگا "آخر کون آنے والی تھی؟"
"آج دیوالی ہے نا، اس لئے۔۔۔"

نامور مزاح نگار یوسف ناظم کے مضامین
کے مجموعے
فقط ۸/ روپے البتہ ۱۰ روپے
بتوسط شگوفہ حاصل کیے جاسکتے ہیں

عالم تاجپوری

قربانی کا ہر انساں بکرا نظر آوے ہے

اِس دورِ سیاست میں کھٹکا نظر آوے ہے
کُرسیٔ وزارت پہ گدھا نظر آوے ہے

فیشن میں ہر اک نر اب مادا نظر آوے ہے
لڑکی کی طرح بالکل لڑکا نظر آوے ہے

مسجد ہو کہ مندر ہو گرجا ہو کہ بُت خانہ
ہم کو تو سیاست کا اڈّا نظر آوے ہے

بیگم سے نمایاں ہے مُرغی کا ہر اک نیچر
بچوں سے بھرا گھر کا ڈربا نظر آوے ہے

یہ خوبیٔ قسمت ہے کہ آج کا ہر شاعر
دیکھو تو گوئیوں کا چمچہ نظر آوے ہے

ماں باپ بہن بھائی دادی بھی ہیں دادا بھی
اب گھر مرا بیگم کا میکا نظر آوے ہے

اسٹیج پہ تو دیکھو اس شعبدہ ساماں کو
وہ حسن کی نخوت سے اینٹھا نظر آوے ہے

ہم ایسی ترقی کو بیکار سمجھتے ہیں
قربانی کا ہر انساں بکرا نظر آوے ہے

چوپایہ بھی کرتا ہے پیشاب کھڑا ہو
انسان کی صورت میں کُتا نظر آوے ۔

اعجاز اسے کہیئے یا پیار ہے لیلےٰ کا
چندیا پہ جو مجنوں کے جوتا نظر آوے ہے

اندازِ تکلّم ہے کیا حضرتِ واعظ
ہر وعظ میں چھوکٹ کا مُرغا نظر آوے

یہ شیخ و برہمن کیوں اوپر سے نہاتے ہیں
جب دل ہی تعصب میں کالا نظر آوے ہے

اس حال میں چھوڑا ہے تہذیب نے لوگو
ہر جیب میں اب بسٹل کتّا نظر آوے

ہیں ساس و بہو دونوں کیوں گیم کے چکّر میں
کیوں یہ بھی سیاست کا چکّا نظر آوے ہے

داڑھی کا کرشمہ یا تکمیل سیاست ہے
اس دور کا ہر نیتا مُلّا نظر آوے ہے

○

عبدالرزاق سند (شولاپوری)

کیسے چکّر میں پھنس گیا سالا
اب مرے دل میں بس گیا سالا

تھا بھروسہ رہے گا وہ مشکور
دودھ پی کر بھی ڈس گیا سالا

مجھ کو اکثر بڑا جلاتا تھا
آج خود ہی جُھلس گیا سالا

رؤف رحیم (ایم اے)

"آنا ہمارا ٹی وی پر"

ٹیلی ویژن ذرائع ابلاغ کا بہترین آلہ ہے۔ آج سے چند برس پہلے جب ہم نمائش جاتے تھے تو ہمیں ٹیلی ویژن دیکھنا
ہم اپنے آپ کو خوش نصیب تصوّر کرتے اور "شہری" کا لقب اپنے اُوپر فِٹ کر لیتے لیکن جب معلوم ہوا کہ دیہی
م سے پہلے ٹی وی آچکا ہے اور دیہاتی لوگوں کی تربیت کے لئے حکومت نے ہر موضع میں ٹیلی ویژن رکھا ہے تو ہم
رمندہ محسوس کرنے لگے۔ جب شہر میں اس کی آمد شروع ہوئی تو ہم میں کچھ اعتماد آیا کہ حکومت صرف دیہاتیوں ہی کی
ہر شہری کو ترقی کے مواقع فراہم کر رہی ہے۔ ہماری مسرت کی انتہا نہ رہی ہم گھر بیٹھے دنیا میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی
لیتے۔ لیکن وہی لسانی مسئلہ درپیش آیا۔ نیشنل پروگراموں میں انگریزی اور دوسری زبانیں اور سیاستی پروگراموں
بھرمار۔ ہم ٹھہرے اُردو کے شاعر۔ . . . .

وی سے ہماری معاشی خوشحالی کا اظہار ضرور ہوتا لیکن معاشرتی بدحالی بھی ساتھ ساتھ رہتی۔ آج ہمارے گھر
وی لگتا ہے تو کم سن اور بوڑھے اتنے ہی اہتمام اور بے چینی سے دیکھتے ہیں جتنا کہ ہم۔ چاہے فلم کسی خاص عمر
فلم کے ایک عریاں منظر پر ہمارے معصوم بھتیجے نے سوال کیا کہ چاچا یہ کیا ہو رہا ہے ہم نے اُسے ٹالتے ہوئے
کھیل ہے ، تو اُس نے پھر ایک سوال داغ دیا آپ یہ کھیل کیوں نہیں کھیلتے۔ ہم لاجواب ہو کر رہ گئے خیر ابھی
ترقی کے اس دَور میں بہت جلد معصوم بچے اپنے بڑوں سے بازی لے جائیں گے۔

ہمیں معلوم ہوا کہ ٹی وی حیدرآباد میں بڑے زور و شور سے آرہا ہے جس طرح امیتابھ بچن کی فلم ہماری خواہش ہوئی
چہرہ مبارک کو ٹی وی کے اسکرین کی زینت بنائیں۔ ہم نے جھٹ سے ایک خط ڈائرکٹر دور درشن کے نام لکھا چونکہ
ہم نے انگریزی میں لکھنے میں مصلحت جانی۔ ہماری تحریر سے زیادہ ہمارے لیٹر ہیڈ سے متاثر ہو کر ڈائرکٹر صاحب
سے سرفراز کہ ابھی اردو پروگرام کی شروعات نہیں ہوئی ہے ہم آپ کا نام فہرست میں شامل کرلیں گے اور ترجیح

میں مطلع کریں گے۔ ہمارے لئے پروگرام سے زیادہ جواب فرحت بخش رہا کیوں کہ آج کے دور میں کسی محکمہ سے جواب آنا، محکمہ کے ساتھ ساتھ پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف محکمہ کی مہربانی تصور کی جاسکتی ہے۔ ہم منتظر ہے کہ اردو پروگرام کی شروعات ہو لیکن کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی کیوں کہ اردو کا مستقبل پرامید ہو یہ ممکن نہیں۔ ہم دعا کرتے رہے کہ اگر پروگرام شروع ہو اور ہمارے نام کی فائل دفتر میں اتفاقاً موجود ہو تو ہمیں کم از کم اسٹوڈیوز دیکھنے کا موقع ملے گا۔ یوں تو ہم گزشتہ ۱۵ سال سے ریڈیو پر اپنا کلام سُنانے اور عوام کو بور کرتے رہے ہیں لیکن وقت کے ساتھ بدلنا چونکہ ہمارے لیڈروں کی روایت ہے ہم نے بھی ٹھان لی کہ ریڈیو سے ٹی وی کی دُنیا میں ضرور جائیں گے کئی حربے آزمانا ہم نے ان ہی معزز لیڈروں سے سیکھا ہے ویسے ہماری صورت (ہماری نظر میں) اتنی بری نہیں کہ لوگ آنکھیں موندلیں اور آواز اتنی بھونڈی نہیں کہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرلیں ان دونوں خوبیوں کا ہونا ٹی وی آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے۔ قسمت نے پلٹا کھایا۔ آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے رونیدرا بھارتی میں نوجوان شعراء کا مشاعرہ ہوا لیکن اُس میں شعراء کم اور شاعرات زیادہ تھیں جس طرح "فلمی دنیا" میں نامور اداکاروں کے لڑکوں کی مانگ ہے اُسی طرح "فلمی دنیا" میں بھی شعراء کے لڑکے اور لڑکیوں نے جگہ بنالی ہے خیر! اُس مشاعرہ میں ٹی وی کے کیمرہ کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا پہلے ہم تو یہ سمجھے کہ صرف ہمیں خوش کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے کیوں کہ ـــــ ایک شادی میں ہمیں دولہا کے ساتھ فوٹو لینے پر معلوم ہوا کہ دولہا کے بھائی کے اشارے پر فوٹوگرافر نے صرف فلش مار کر خوش کر دیا ہے ہمیں تکلیف تب ہوئی جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ یہ شرارت تھی ہمیں دُکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم نے جس سوٹ کو اس تصویر کی خاطر اُٹھا رکھا تھا اُسے مایوس ہونا پڑا۔ ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ کیمرہ بھی صحیح ہے اور ہمیں دھوکہ نہیں دیا جارہا ہے ہمیں یہ ملال کھائے جاتے لگا کہ ہم نے وہ سوٹ کیوں نہیں پہن رکھا ہے۔ بہرحال جب ہمارا فلم لیا گیا تو یہ انتظار کھائے جارہا تھا کہ اسے کب پیش کیا جائے گا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ فلم صرف نیوز کے لئے لی گئی ہے اور ہم اُسی ایک نیوز کے لئے بے چین ہر روز ٹی وی سے نظریں نہیں ہٹاتے۔ آخر کار وہ مبارک دن آ ہی گیا جب ٹی وی پر ہمارا چہرہ بتایا گیا لیکن مائیک پر کوئی محترمہ نغمہ سرا تھیں ہم نے بغیر کسی غم کے خاموشی اختیار کی کہ آج کے دور میں جتنا بھی سمّان خواتین کو دیا جائے کم ہے کیوں کہ یہ زمانہ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس کہ اُس وقت ہم وہ پروگرام نہ دیکھ سکے۔

شاید پروگرام اگزیکیٹو کو ہم پر رحم آیا اُنھوں نے ہماری افسردگی دیکھی اور ہمیں یقین دلایا کہ آپ کو بھی ٹی وی پر پیش کیا جائے گا۔ ہمیں دھوکہ کھانے کی عادت سی ہے ہم بڑے خوش ہوئے رات بھر جاگتے رہے دن بھر تمام احباب کو اس خوشخبری سے خوش کرتے گئے۔

آخر کار ایک دن وہ بھی آیا جب سرکار نے یہ اعلان کیا کہ مہینے میں دو مرتبہ ہندی اردو کو پندرہ منٹ کا وقت دیا جائے گا ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ حکومت نے بغیر تناسب کے یہ اعلان کر دیا ہے ہمارے احباب وقت کے حصے نکال رہے تھے اور ہم اپنی [illegible] کا استعمال رہے تھے جس طرح ملازمتوں میں درج فہرست اقوام، درج فہرست قبائل اور پست اقوام وغیرہ کا تناسب

دکھا جاتا ہے اسی طرح ان پروگراموں میں یہی تناسب ٹھیک تھا۔ "نئی ماموں سے نکٹے ماموں بہتر"

ہم نے قسمت آزمائی کے لئے دور درشن کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنا مدعا بھی لکھا اپنی تعریف آپ کرنا مشکل ہے۔ چونکہ حیدرآباد میں مزاحیہ شاعر کے نام سے مشہور ہی تھے پروگرام اگزیکیٹو نے ہمیں طلب فرمایا ہم لیٹر کو محبوبہ کے خط کی طرح دل سے لگائے پھرتے رہے۔ احباب پر رعب جھاڑا۔ اغیار کو جلانے کے لئے بہت ساری حرکات کیں۔

خدا خدا کرکے وقت مقرر ہوا۔ شاعر کسی کا پابند نہیں ہوتا لیکن ایک امیدوار ہر حکم کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔ موضوع دیا گیا تھا "فیملی ویلفیر"۔ جس کا ہمیں ایک فیصد بھی تجربہ نہیں۔ لیکن گھر میں گھر سے باہر کے تجربات اتنے تھے کہ نظم مکمل ہوگئی۔ اسکرپٹ منظور ہوگیا اور ریکارڈنگ کی تاریخ بھی مقرر ہوئی ہم اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کے لئے بے چین ہوگئے لیکن خدا کے عطا کئے ہوئے چہرے میں ردوبدل تو ممکن نہیں پھر بھی روغن کاری جاری و ساری رہی اور وہ دن بھی آگیا کہ ہمیں ریکارڈنگ کے لئے بلایا گیا اور ہم اپنے بھاری کپڑوں میں ملبوس وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ قبل ہی نکل گئے کیونکہ ہمیں اپنے شہر کی سڑکوں کی خستہ حالی کا علم تھا۔ اور ٹریفک کا اندازہ بھی۔ مقرر کردہ مقام پر وقت پر پہنچ گئے۔ اور ریکارڈنگ بھی خیر خوبی سے ہوگئی۔

ریکارڈنگ ہونے کے باوجود بھی ہمارے دل میں ایک ڈر تھا کہ تنگیٔ وقت کے باعث ہمارے پروگرام کو کٹ نہ کردیا جائے۔ ٹیلی کاسٹ کی تاریخ معلوم ہونے کے باوجود بھی ہم سب سے چھپاتے رہے اس کے پیچھے بھی ایک واقعہ ہے کہ ردیدرا بھارتی میں ہمارے ریکارڈ کئے ہوئے پروگرام (جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے) کی براڈکاسٹنگ کی تاریخ کی ہم نے تشہیر کی کچھ احباب اور رشتہ داروں کو وقتِ مقررہ پر مدعو کیا ضیافت کے سامان کئے لیکن شرمندگی کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب ہمارے ریکارڈ کئے ہوئے حصّے کو نکال کر "دادیا سنگیت" کا ریکارڈ لگادیا گیا۔

وہ دن انتظار کے بعد آہی گیا جب ہم دوردرشن سے اپنی نظم پیش کرتے دکھائی دینے والے تھے۔ جیسے جیسے وقت قریب آرہا تھا ہمارے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی جارہی تھی ہم گھڑی سے نظریں نہیں ہٹا پارہے تھے کہیں ایسا نہو کہ ہماری نظم کے بغیر ہی "نیشنل پروگرام" شروع ہوجائے لیکن خوش نصیب ہماری نظم شروع ہوئی اور ہماری جان میں جان آئی۔ لیکن نظم مکمل بھی ہونے نہ پائی کہ "فلم اگر تم نہ ہوتے" کا اشتہار دیکھ کر ہم سوچ میں پڑگئے۔ کیا یہ سوال ہم سے ہے کہ اگر ہم نہ ہوتے تو یہ پروگرام بہتر ہوتا یا اگر ہم نہ ہوتے تو یہ پروگرام بیکار ہوجاتا گھر والے بے حد خوش ہوئے انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی رؤف رحیم ہے جو اپنے گھر میں رہتا ہے گورا رنگ بے داغ چہرہ۔۔۔۔ انھیں پتہ نہیں کہ اس گرتی ہوئی دیوار کی کتنی مرمت کی گئی اور کالی عمارت کو کس طرح چونا ڈالا گیا!

ہم بیحد مشکور ہیں محکمہ برقی کے جنھوں نے خلافِ عادت لائیٹ برقرار رکھی اور ہم دوردرشن کے بھی مشکور ہیں کہ انھوں نے پوری نظم نہیں بلکہ آدھی نظم کاٹ دی لیکن سوچ رہے ہیں کہ ملنے والی فیس بھی کہیں آدھی کاٹ نہ لی جائے۔

شکیل شاہ جہاں کاشوی (ناگپور)

جیل پولس اور قانون

کردار :۔

۱. بھیما ۲. کالو

منظر :۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ الیکٹرک پول کے بلب کی مدھم روشنی، پول سے لگ کر ایک بڑے پتھر پر بھیا بیٹھا چرس کا کش لگا رہا ہے۔ اتنے میں اس کا پرانا دوست کالو دور پھیلے ہوئے اندھیروں سے نمودار ہوتا ہے۔ اور بھیا سے مخاطب ہو کر۔

کالو :۔ ارے او بھیا

بھیا :۔ کیا ہے بے کالو

کالو :۔ تیرے بارے میں جو سن رہا ہوں کیا وہ سچ ہے

بھیا :۔ کیوں ۔ میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے کیا۔

کالو :۔ بھروسہ تو ہے لالے مگر ۔۔۔ ؟

بھیا :۔ مگر کیا ۔۔۔ ؟

کالو :۔ یہی کہ جس سے تو شادی کر رہا ہے۔ (رک جاتا ہے)

بھیا :۔ ہاں ۔ ہاں بول

کالو :۔ جانے دے یار اس کی زندگی کا سوال ہے۔

بھیا :۔ ابے پہیلیاں کیا بجھا رہا ہے۔

کالو :۔ تو ۔ صاف صاف بتا دوں ۔۔۔ ؟

بھیا :۔ ہاں ۔۔۔ !

کالو :۔ وہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔

بھیا :۔ جوان ہے، دیکھنے میں خوبصورت ہے پھر ٹھیک کیوں نہیں ہے۔

کالو :۔ اوہوں ۔۔ یعنی اس کا کیریکٹر

بھیا :۔ کبھی اپنے کیریکٹر کے بارے میں بھی سوچا ہے۔

کالو :۔ یار ۔ مَردوں کا کیریکٹر کیا دیکھنا۔

بھیا :۔ تو کیا کیریکٹر صرف عورت کا دیکھنا چاہیئے ؟

کالو :۔ ہاں ۔ !

بھیا :۔ کیوں ۔۔۔ ؟

کالو :۔ کیونکہ اس کے ساتھ زندگی کرنا ہے۔

بھیا :۔ کیا عورت کو مَرد کے ساتھ زندگی نہیں کرنا ہے !

کالو :۔ کرنا ہے ۔۔۔ !

جبیا :۔ تو کیا۔ وہ مرد کے کیریکٹر کے بارے میں نہیں جان سکتی ـــ ؟

کالو :۔ جان سکتی ہے۔

جبیا :۔ آگے بول۔

کالو :۔ ہاں تو میں اس لڑکی کے بارے میں بول رہا تھا۔ جس سے . . . .

جبیا :۔ ہاں ـــ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

کالو :۔ جبیا اب بھی وقت ہے فیصلہ بدل لے۔

جبیا :۔ شادی تو اسی سے کروں گا۔

کالو :۔ مگر یار وہ تو . . . .

جبیا :۔ یہی نا کہ وہ عزت بیچتی ہے۔

کالو :۔ ہاں ـــ اور سر عام بیچتی ہے۔

جبیا :۔ وہ تو مجھے کو بھی معلوم ہے۔

کالو :۔ پھر سب کچھ جان کر ـــ ؟

جبیا :۔ ہاں ـ سب کچھ جان کر اور سمجھ بوجھ کر۔

کالو :۔ لگتا ہے تیرا دماغ چل نکلا ہے۔

جبیا :۔ ایسے بے وقوف ذرا سوچ میں اس سے شادی کر لیا تو میرا نقصان کیا ہے۔

کالو :۔ سارے شہر میں بدنامی ہوگی۔

جبیا :۔ ویسے بھی اپن کون سے عزت دار ہیں۔ کتنی بار جیل جا چکے ہیں۔ لیکن اب ہمیں جیل، پولس اور قانون سے بچنے کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔

کالو :۔ جیل ـ پولس ـ اور قانون ـ مجھے کچھ یاد آرہا ہے۔

جبیا :۔ کیا ـــ ؟

کالو :۔ میرے سیٹھ جی نے بھی اسی طرح سوچا تھا۔

جبیا :۔ کیا سوچا تھا۔؟

کالو :۔ نقلی دواؤں کا دھندہ

جبیا :۔ کیا مطلب ؟

کالو :۔ مطلب یہ کہ لیبل اصلی دوا نقلی۔

جبیا :۔ یہ تو بڑا نفع (نقدی) دھندہ ہے۔

کالو :۔ جبھی تو بلڈنگ پر بلڈنگ بنا لیا اب الیکشن میں بھی کھڑا ہونے والا ہے۔

جبیا :۔ الیکشن میں ـــ ؟!

کالو :۔ ہاں جبیا ـ سماج سیوا کر کے جنتا میں کیا گھر جمایا ہے۔

جبیا :۔ اور وہ دواؤں کا دھندہ ـــ ؟

کالو :۔ اب وہ بند کر دیا ہے۔

جبیا :۔ کیوں ـــ ؟

کالو :۔ نقلی دوائیں بیچ کر وہ اپنے ووٹرس کم نہیں کرنا چاہتا۔

جبیا :۔ مگر وہ جیل، پولس اور قانون ؟

کالو :۔ وہ تو ہم چھوٹے لوگوں کے لئے ہے۔

جبیا :۔ لیکن تیرا سیٹھ چھوٹے سے بڑا کیسے بنا ـــ ؟

کالو :۔ کنسٹرکشن کے دھندے سے۔

جبیا :۔ وہ کیسے ـــ ؟

کالو :۔ بیس لاکھ روپے کا سرکاری کوارٹرس بنانے کا کنٹرکٹ ملا۔ دس لاکھ میں تیار دس لاکھ اندر۔

جبیا :۔ مگر کوارٹرس کتنے دن چلیں گے۔

کالو :۔ یہ انشورنس والے جانے۔

بھیا:۔ اور تیری چھٹی سیٹھ جی کے ہاں سے کیسے ہوگئی؟

کالو:۔ میرا پڑوسی آنند کی بیوی سے اپنا چلتا تھا۔ ایک دن اس نے دیکھ لیا۔ لوہے کی سلاخ لے کر دوڑا میں بھی رام پوری نکالا اور رکھ دیا۔

بھیا:۔ تو کیا وہ مرگیا۔؟

کالو:۔ نہیں سالا بچ گیا۔ اگر کچھ لوگ بیچ میں نہیں آتے تو مار ہی ڈالتا۔

بھیا:۔ پھر۔؟

کالو:۔ پھر کیا۔ اس لفڑے میں جیل ہوگئی۔ جب چھوٹ کر آیا تو سیٹھ جی نے کہا اب تمہارا کیریکٹر خراب ہوچکا ہے۔ اب تم کو ہمارے ہاں نوکری نہیں مل سکتی۔ تو میں نے کہا مگر سیٹھ جی تمہارا کیریکٹر کون سا اچھا ہے۔

بھیا:۔ تو۔ تو سچ سچ ایسا بولا تھا؟

کالو:۔ ہاں۔ مگر دل میں۔

بھیا:۔ اور پھر تو چوری ڈکیتی شروع کر دیا۔

کالو:۔ یار لگتا ہے ہم بات کرتے کرتے بہک گئے ہیں۔

بھیا:۔ تو۔ تو شوبھا کے بارے میں جاننا چاہتا ہے نا!

کالو:۔ ہاں۔؟

بھیا:۔ ایک دن میں شوبھا کے پاس گیا۔ وہ بہت اداس تھی۔ کارن پوچھا۔ تو بتائی۔ آٹھ دن سے برابر دھندہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ پولس والے تنگ کر کے رکھے ہیں۔ جبکہ ہفتہ برابر دے رہی ہوں۔

کالو:۔ ہاں پھر۔؟

بھیا:۔ پھر میں نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

کالو:۔ کیا بے تکی حرکت ہے۔

بھیا:۔ ایسے اس طرح اس کو پولس والے تنگ نہیں کرینگے

کالو:۔ وہ کیسے۔؟

بھیا:۔ کیوں کہ پولس اور سماج کی نظر میں وہ میری پتنی ہوگی۔ اور وہ میری مرضی کے مطابق کسی کے ساتھ بھی رہ سکتی ہے۔

کالو:۔ مگر بھیا اس سے فائدہ؟

بھیا:۔ اپن اِدھر اُدھر منہ مارنے سے بچ جائیں گے۔ اور اس کی کمائی میں بھی برابر کے ذمے دار بنے رہیں گے۔

کالو:۔ مگر یہ آئیڈیا (idea) تو سیکھا کہاں سے؟

بھیا:۔ اپنے پڑوسی انجینئر سے (Engineer)

کالو:۔ وہ کیسے۔؟

بھیا:۔ ایک رات وہ الیکٹریسیٹی بورڈ کے افسروں کو پارٹی دیا اور خود شراب پی کر ساری رات میرے مکان میں سویا رہا۔

کالو:۔ اور پارٹی میں مہمانوں کا سواگت۔

بھیا:۔ اپنی خوبصورت بیوی کو سونپ دیا۔

کالو:۔ اور الیکٹریسیٹی بورڈ کا وہ کنٹراکٹ اسے مل گیا۔

بھیا:۔ ہاں۔ آج اس کی گنتی شہر کے سیٹھوں میں ہوتی ہے۔

کالو:۔ مگر بھیا . . . .

بھیا:۔ مگر وگر کچھ نہیں یہ آواز سن رہا ہے۔

(پولس کے سائرن کی آواز ابھرتی ہے)

کالو:۔ ہاں بھیا۔ بھیا:۔ لگتا ہے پولس ادھر ہی آرہی ہے۔
کالو:۔ پھر سوچ رہا کیا ہے جلدی سے بھاگو۔ (دونوں تاریکی میں گم
[illegible]

عابد معزؔ

[مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (حیدرآباد)]

"حیدرآبادی قیامت"

قیامت اپنے وقت پر آئے گی۔ قیامت سے پہلے لوگ مختلف چھوٹی بڑی مصیبتوں اور آفتوں کی تشبیہ قیامت سے دیتے رہیں گے۔ شاعر کے پاس محبوبہ کے حسن، اس کی بے وفائی اور غریب کے پاس روز مرہ کی مہنگائی سے حقیقی قیامت سے پہلے قیامت آتی رہتی ہے! اسی طرح ہم حیدرآبادیوں کے نزدیک بارش ہونا ایک قیامت ہے۔ دوسرے مقامات پر بارش ایک رحمت ہوتی ہے لیکن ہمارے یہاں بارش زحمت کی حد سے بڑھ کر قیامت بن جاتی ہے۔ ایک حیدرآبادی سخت گرمی اور تیز دھوپ برداشت کرے گا لیکن بارش تو کجا بوندا باری بھی اس سے برداشت ہو نہیں پاتی۔ ہلکی پھوار شروع ہوتے ہی قیامت آجاتی ہے۔ شہر میدان حشر کا نمونہ پیش کرنے لگتا ہے۔ سڑکیں اور کھلی جگہیں ویران ہو جاتی ہیں ہر کوئی اپنا اثاثہ اٹھائے جدھر منہ سمائے چھت کے نیچے سر چھپانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں حیدرآبادی زندگی میں دو ہی بار بھاگتا ہے۔ ایک بس پکڑنے کے لئے اور دوسرے بارش سے بچنے کے لئے

بارش کے موسم میں چائے زیادہ پی جاتی ہے۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جاتے ہیں۔ اور داڑھ گرم رکھنے کے لئے پان کھائے جاتے ہیں۔ لوگ گرم چائے اور سگریٹ پیتے ہوئے بارش کا اندازہ کرتے ہیں۔ ڈرتے ہوئے اپنی انگلیاں زیر آسمان رکھ کر بارش کا اندازہ کرتے ہیں۔ پانی کے چند بوند پڑتے ہی انگلیاں کھینچ کر جیب میں چھپا لیتے ہیں۔ بارش رکنے کے بعد سڑک پر بہتے ہوئے پانی کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کہیں اس میں ڈوب تو نہ جائیں گے مطمئن ہونے کے بعد اپنے آپ کو اقساط میں باہر نکالا جاتا ہے پہلے ایک ہاتھ باہر آتا ہے۔ ہاتھ کے پیچھے شانہ ہوتا ہے سہما ہوا چہرہ اور گردن کو ہاتھ کے پیچھے ڈھکیلا جاتا ہے۔ کچھ ہمت بڑھتی ہے تو ایک قدم بھی باہر رکھا جاتا ہے۔ آخر میں دوسرے ہاتھ اور پاؤں کو کھلی فضا میں لے کر آسمان کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ موسمی پیش قیاسی کے لئے

کے بعد ہر طرح سے چوکنّے اچھلتے کودتے اپنی راہ لیتے ہیں ۔

سال میں ایک مرتبہ بارش کا موسم چند دنوں کے لئے آتا ہے ۔ اس موسم کا انحصار بھی مانسون پر ہوتا ہے جس کا ہندوستانی کرکٹ ٹیم کی طرح شاذو نادر ہی شاندار مظاہرہ ہوتا ہے ۔ ہم حیدرآبادی کبھی کبھار ہونے والی بارش کا بھی لطف نہیں اٹھاتے بارش میں بھیگنے سے ڈرتے ہیں ۔ بارش کے وقت سات پردوں میں چھپے بیٹھتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست عذر پیش کرتے ہیں کہ بارش میں بھیگنے سے کپڑے ، بدن اور بال گیلے ہوں گے ۔ ٹھنڈی ہوا لگے گی بسر دی زکام ہوگا ۔ ناک اور آنکھوں سے پانی بہے گا ۔ اعضاء شکنی معذور کر کے گھر میں بٹھا دے گی ۔ سر میں ناقابلِ برداشت درد ہوگا ۔ گلے میں خراش ہوگی ۔ کھانسی دن میں چین اور رات میں آرام نہ لینے دے گی ۔ سانس لینے میں دشواری ہوگی ۔ بخار آئے گا ۔ ڈاکٹر کے ناز نخرے اٹھانے پڑیں گے ۔ دواؤں کے لئے روپیہ پیسہ برباد ہوگا ۔ ہوسکتا ہے کہ نمونیا ، ڈبل نمونیا ، ٹائیفائڈ اور دوسری خطرناک بیماریوں میں گھر کر لقمۂ اجل بن جائیں ۔

بارش کے دنوں میں گھر سے باہر نکلنے کے لئے بمقابلہ دوسرے موسم ، بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے ۔ اُجلے اور اچھے کپڑوں کو چھپا دیا جاتا ہے ۔ پھٹے ، پرانے اور بدرنگ کپڑوں کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ بارش میں بھیگنے سے بچنے کے لئے برساتی پہننی پڑتی ہے ۔ سر کو بھیگنے اور پھسل کر مار لگنے سے محفوظ رکھنے کے لئے ہلمٹ کا استعمال فائدہ بخش ہوتا ہے ۔ پیروں کو بچانے کے لئے لانگ بوٹ درکار ہوتے ہیں ۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں گاؤں کی پگڈنڈیاں بن جاتی ہیں ۔ ان پر چلنے کے لئے ہاتھ میں چھڑی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے ۔ پانی کی بوندیں زمین پر سیدھی نہیں گرتیں اکثر زمین سے ۴۵ ڈگری کا زاویہ بناتی ہیں ۔ پانی کی بوندوں سے چہرے کو بچانے کے لئے چھاتہ استعمال کرنا پڑتا ہے ۔ غرض جب ہم اس اہتمام کے ساتھ سڑک پر نکلتے ہیں تو پڑوسیوں کو نیل آمسٹرانگ کا چاند پر پہلی قدمی کرنا یاد آتا ہے ۔ گلی کے کتّے بھونکنے لگتے ہیں ۔ بچے الگ پیچھے پڑ جاتے ہیں ۔ دوست احباب پہچانتے نہیں بازو سے کترا کر نکل جاتے ہیں ۔

بارش کا منشاء سڑکوں کو تباہ کرنا ہوتا ہے ۔ ہمارے شہر کی بارش کا سارا بوجھ سڑک پر پڑتا ہے ۔ اور تباہ ہونے کے لئے ہماری سڑکیں بھی جیسے مستعد رہتی ہیں ۔ بارش کے پانی میں سڑکیں تحلیل ہو جاتی ہیں اور سڑکوں کا دھندلا نشان باقی رہ جاتا ہے ۔ راستے مخدوش اور پر خطر بن جاتے ہیں ۔ کہیں پتھروں کے ویوڑ کا ٹیلہ تو کہیں گہری کھائی ہوتی ہے ۔ ایک سمت چٹان کھڑی ہے تو دوسری سمت سمنٹ کا سلاب (SLAB) پڑا ہے ۔ غرض پوری سڑک کی شکل بدل جاتی ہے لیکن بارش کے بعد سڑک کے بہت خراب حصے ہی درست کئے جاتے ہیں اس کام کو پیوندکاری (یعنی PATCH WORK) کہتے ہیں ۔ ہمارے شہر کی سڑکوں پر مختلف قسم اور مختلف طریقوں سے اتنے پیوند لگ چکے ہیں کہ اب سڑکیں کسی بھکاری کی جھولی کی مانند دکھائی دینے لگی ہیں ۔ تباہ حال اور پیوندی سڑکوں پر موجودہ دور کی سواریاں چل نہیں سکتیں ۔ پیدل چلنا پڑتا ہے یا بیل بنڈی استعمال کرنا ۔ سڑکوں کی ناگفتہ حالت نے بیل بنڈی کی اہمیت واضح کردی ہے ۔ اس لئے ہم اسے " قومی سواری " کہنے لگے ہیں ۔

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ بارش دو گھنٹہ برستی ہے تو ان کی چھت چار گھنٹے ٹپکتی ہے۔ کچھ اس سے بھی بُرا حال ہمارے شہر کی سڑکوں کا ہوتا ہے۔ بارش صرف دو گھنٹے برستی ہے سڑکوں پر چار دن پانی جمع رہتا ہے۔ اور آئندہ دس دن سڑکیں پانی اُبلتی ہیں۔ ایسے اوقات میں سڑکیں تالاب بن جاتی ہیں۔ ہم نے اکثر اپنے بچوں کو اپنے محلہ کے عارضی تالاب میں تیرتے اور مچھلیاں پکڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ سڑکوں کا پانی آس پاس موجود گھروں میں گھس پڑتا ہے پیدل راہ گیروں کو اپنا اثاثہ سر پر اٹھائے، جوتے ہاتھ میں لئے، پینچے چڑھائے پیر گھسیٹتے چلنا پڑتا ہے۔ موٹروں اور اسکوٹروں کے انجن میں پانی جانے سے ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ سڑک کے کنارے لوگ اپنی ناکارہ سواریوں کو ٹھیک کرنے کے لئے ان سے ورزش کرتے نظر آتے ہیں۔ جو سواری ٹھیک چلتی ہے وہ سڑک کے تالاب میں کسی نہ کسی گڑھے میں پھنس کر گر جاتی ہے۔ ہم نے پچھلی بارش میں شہر کی مشہور شاہراہ پر ایک عجیب منظر دیکھا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب لوگ جمع تھے۔ سامنے سے اسکوٹر آئی اور پانی سے بھرے گڑھے میں گر گئی۔ لوگ اسکوٹر اور سواری کو اٹھا کر نٹ پاتھ رکھنے کے بعد دوسرے شکار کا انتظار کرنے لگے۔

دیہاتوں میں لوگ آسمان پر بادل دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ بارش میں ہنستے کھیلتے بھیگتے ہوئے محنت کرکے اناج پیدا کرتے ہیں۔ شہر کے لوگ آسمان پر چھائے بادل سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ بارش شروع ہونے سے پہلے ہی محفوظ ٹھکانے تلاش کر لیتے ہیں۔ بارش سے اناج کے بجائے شہر میں کیچڑ کی پیداوار ہوتی ہے۔ چہار طرف کیچڑ ہی کیچڑ نظر آتا ہے۔ جبکہ دیہاتوں میں حدِ نگاہ ہریالی بکھری رہتی ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں کیچڑ پانی سے چلنا پھرنا محال ہو جاتا ہے۔ کیچڑ میں پتھر ڈال کر راستہ بنانا پڑتا ہے۔ اور ان پتھروں پر اچھلتے کودتے گزرنا پڑتا ہے۔ راہ گیروں پر کیچڑ ایسے اچھلتا ہے جیسے کہ وہ کیچڑ میں گر کر اُٹھے ہوں ایک وقت سرِ شام اجلے کپڑے پہن کر گھر سے کچھ دور ہی چلے تھے کہ ایک لاری کی مہربانی سے ہم سر سے پیر تک کیچڑ میں نہا گئے۔ دوبارہ انسان بننے کے لئے جب گھر واپس ہوئے تو بچوں اور بچوں کی ماں نے "بھوت... بھوت!" کا داویلا کرکے ایک کہرام بپا کر دیا تھا۔ بارش رکنے کے بعد کیچڑ سے پانی سوکھ جاتا ہے اور سڑکوں پر مٹی رہ جاتی ہے۔ ہوا کے ساتھ مٹی آوارہ بادل کی طرح اڑنے لگتی ہے اور راہ گیروں سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی ہے۔

حیدرآبادی قیامت سے الکٹرک کرنٹ اور ٹیلیفونس بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بارش شروع ہوتے ہی الکٹرک کرنٹ آنکھ مچولی کرنے لگتا ہے کچھ ہی دیر میں وہ تھک کر غائب ہو جاتا ہے۔ گھر میں گھٹا ٹوپ اندھیرا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اور باہر موسلادھار بارش ہوتی رہتی ہے۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے ماحول ہندوستانی فلم کا رومانٹک کم سسپنس منظر نظر آنے لگتا ہے۔ کرنٹ غائب ہونے کے علاوہ بارش کو دیکھ کر الکٹرک کرنٹ کو بھی پانی کے ساتھ زمین پر بہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو ایک خطرناک صورتِ حال سے دو چار کر دیتی ہے۔ بارش کے دوران اور بعد میں بھی ٹیلیفون اٹکھیلیاں کرنے لگتا ہے۔ کال کے بغیر ہی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ ملاتے ایک نمبر ہیں تو کوئی اور ہی نمبر لگتا ہے محکمہ ٹیلیفون سے شکایت کرنے کے لئے ٹیلیفون اُٹھاتے ہیں تو دوسری جانب سے موسمی پیش قیاسی ہونے لگتی ہے۔

زندگی کی تیزی اور رنگینیاں بارش کی نذر ہو جاتی ہیں چند اشخاص اس موسم کی تکالیف سے بچنے کے لئے اپنے [illegible] گھروں میں قید کر لیتے ہیں۔ تمام کاروبار ٹھپ ہو جاتے ہیں دوکان پر گاہکوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ بس اور ریل گاڑی میں بھی لوگ سفر کم کرتے ہیں مطلب یہ کہ شہر میں زندگی بارش کے پانی کی طرح کہیں ایک کونے میں جمع ہو گئی ہے لیکن اس موسم میں دواخانہ ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں چہل پہل اور رونق عروج پر رہتی ہے۔ جسے دیکھئے اپنا ایک ہاتھ منہ اور دوسرا پیٹ پر رکھے ڈاکٹر کے مطب میں بے چین اور مضطرب بیٹھا رہتا ہے اور جو اس مرض سے بچ رہے وہ بخار کھانسی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

حیدرآباد میں بارش سال میں صرف تین مہینے ہوتی ہے۔ تین مہینوں میں ستمبر نے دھاک جمائی ہے اس مہینے نے اتنے ستم ڈھائے ہیں کہ حیدرآبادی اسے "ستمگر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس مہینے میں یوں تو کئی بار حیدرآبادی قیامت آئی ہے لیکن دو مرتبہ اس نے اپنی ایک تاریخ بنائی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں جب حقیقتاً موسیٰ ندی میں طغیانی آئی تھی اور دوسری مرتبہ ۱۹۷۰ء میں جب ایک افواہ شہر میں پانی سے آئی تھی سرِ شام "پانی آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانی آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کا شور بلند ہوا۔ ہر کوئی افراتفری کے عالم میں اونچی جگہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد فرضی طوفان تھا تو نادانی کا احساس ہوا ــــ اور اگر ہم کہتے ہیں کہ بارش کا موسم حیدرآبادیوں کے لئے ایک قیامت ہے تو کیا غلط کہتے ہیں؟ ◻

شگوفہ کے دو یادگار خصوصی نمبر

◎ **ڈرامہ نمبر** قیمت ۲۵ روپے (مجلد)

◎ **کنھیالال کپور نمبر** قیمت ۱۰ روپے (مجلد)

◎

محمد اسد اللہ
ورود، ضلع امراؤتی

ورود

ـــــــــ ایک اُڑتا خاکہ

اس خاکہ کی وجہ تسمیہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ خاکسار کا تعلق بھی اسی خاکداں سے ہے۔ لیکن اُڑتے خاکے کا فائدہ اُٹھا کر ورود کے متعلق بے پر کی اُڑانا مقصود نہیں۔ خاکساری کا مظاہرہ کر کے ورود کو ایک دیہات کہا جا سکتا ہے لیکن ڈر ہے کہ آس پاس کے دیہات احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ شہر کہیں تو اطراف کے شہر ہمارے خلاف کورٹ میں آبرو ریزی کا مقدمہ دائر نہ کردیں اور ورود نے اپنے آپ کو کسی طرح بھی اس قابل نہیں رکھا کہ اسے قصبہ کہا جا سکے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب نے ہمیں مبارکباد دی کہ "ورود اب تحصیل کا مقام ہو گیا ہے۔" ہم نے کہا یہ عبرت کا مقام تو پہلے ہی سے تھا، شکر ہے اب تحصیل بھی ہو گیا۔ ہمارے خیال کے مطابق ہر قصبہ ایک عبرت کا مقام ہوتا ہے اور انجام کار خود اس کے وجود سے ہاتھ پاؤں نکالتے ہوئے شہر میں ضم ہو جاتا ہے۔ کسی گونڈ راجہ "ورو ور" کا نام ورود کا مصدر ہے۔ گونڈ راجہ کے زمانے کے سیاسی حالات اور جنگوں کا کچا چٹھا تو گردشِ دوراں نے صیغۂ راز میں رکھ چھوڑا البتہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ورود کے لوگ اب بھی سنگترے کھلا کر دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیتے ہیں۔

سنگترہ ہی یہاں کی واحد قابلِ تذکرہ شے ہے۔ ورود کے بنانے اور بگاڑنے میں سنگترہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس کے پاؤں بھی بہت بڑے ہیں۔ یہاں کا سنگترہ نہ صرف دہلی، لکھنؤ، بمبئی بلکہ ایران تک چلا جاتا ہے۔ اس کے متعلق تحقیق ہونی چاہیے کہ کہیں ایران کے انقلاب میں ورود کے سنگترہ کا تو ہاتھ نہیں۔ جب سنگتروں کے سلسلے میں کوئی "ناگپوری سنگترہ" کا زبان زد محاورہ چبا چبا کر ادا کرتا ہے تو ہم ورود واسیوں کی حالت اس ماں کی سی ہوتی ہے جس کے بچے کو کوئی بانجھ عورت "میرے لال" کہہ کر پکارے۔ اس لئے کہ اگر ناگپور سے مراد

شہر ناگپور ہے تو اس کے "گنج گراں مایہ" پر تو سنگترے اُگتے نہیں۔ ورروڈ تو امراؤتی ضلع ہے۔ اس کے بچے (سنگترے) بھی ناگپور کے نام کیوں لکھے جاتے ہیں۔

ورروڈ کے اطراف کے علاقے سنگتروں کے سرسبز وشاداب باغوں سے آباد ہیں۔ چند سال قبل یہی باغات حسنِ اتفاق سے "کیلے کے بن" ہوا کرتے تھے مگر موسم نے آنکھ کھیلتے کھیلتے ایک دن آنکھ بند کرکے "چھو" کہا اور آنکھ کھولی تو دیکھا ——— طرف کھیتوں میں، جنگلوں میں، گاؤں میں، دوکانوں میں، لوگوں کی جیبوں میں، دما میں، خوابوں میں سنگترے ہی سنگترے ہوگئے۔ چنانچہ جدید شاعر صفدر تک کا یہ ہے ۔

کھیت میں بویا ہوں اب کے ہرہرے
خواب میں آنے لگے ہیں سنگترے

بقول صفدر ورروڈ میں تین چیزیں بہت زیادہ ہیں۔ داڑھیاں، باڑیاں اور گاڑیاں
پچھلے سال تک ورروڈ میں قطب شمالی کی طرح چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی را ہوا کرتی تھی۔ درختوں کی ثمر ریز شاخیں دن نکلتے ہی (جسے سنگترے کا سیزن شروع کہتے ہیں) تاجروں کی راہ تکتی ہیں اور ان کے آتے ہی میلہ سا لگ جاتا۔ سنگتروں لدے ۷۵ ——— ۱۰۰ ٹرک ورروڈ کو ہارن بجا کر خدا حافظ کہتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اہلِ ورروڈ روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اس وقت ہر شخص ذہنی طور وہاں ہوتا ہے جہاں سے خود اپنی بھی خبر نہیں آتی۔

یہاں چھ مہینے بعد رات ہوتی ہے تو لوگ پہلی فرصت میں سر کھجاتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے سے مصافحے و معانقے کرتے ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے بال بچوں کی خیر دریافت کرتے ہیں۔ ٹرکوں پر لاد کر مریل گھوڑے لاتے ہیں اور ان پر سوار ہو کر شاد کرتے ہیں۔ بعد میں یہی اونگھتے ہوئے مریل گھوڑے ہماری نظموں میں آکر دولہے کے مستقبل کی علامت بن جاتے ہیں۔ اسی زمانے میں لوگ بچے پیدا کرتے ہیں اور جگہ جگہ سلیمان ؟ تعمیر کرتے ہیں۔ یہ یہاں کے قابل دید مقامات ہیں۔ (مگر ٹوپی اُتار کر)۔ اس زمانے لوگ جتنا اور جو جی میں آئے کھاتے ہیں بلکہ بھاسکر اور آریہ بھٹ کی طرح خلاؤں میں بھی بھیجے ورروڈ کی خالص پیداوار وٹامن ہے اور آب وہوا یہاں والوں کے لئے جیسی بھی ہو تاجروں کے لئے نہایت خوش گوار ہے۔ اسی لئے نووابدوں کا جغرافیہ مہینے بھر میں تبدیل

ہے۔ نیا آنے والا آتے وقت تو ایک ٹکٹ لے کر آتا ہے مگر جاتے وقت اسے خود کے لئے دو ٹکٹیں خریدنی پڑتی ہیں۔ اسی لئے لوگ یہاں سے عموماً جانا پسند نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس زمین میں بڑے بڑے مقناطیس لگے ہوئے ہیں۔

وررودڈ کے جغرافیہ میں "مین روڈ" نامی خطِ استوا کے دائیں بائیں خطِ سرطان اور خطِ جدی کی طرح دو راستے بھی ہیں۔ جن میں سے ایک پولس اسٹیشن روڈ کے خطرناک نام سے جانا جاتا ہے۔ ان دونوں کا آغاز تو پرانے بس اسٹینڈ سے ہوتا ہے مگر انجام بڑا عبرتناک ہے کہ ایک ہاسپٹل جاتا ہے اور دوسرا قبرستان۔ وررودڈ کے مغرب میں ایک ندی ہے۔ ممکن ہے یہ کسی زمانے میں دریائے "چڑا امن" رہی ہو مگر ڈارون کے فلسفۂ ارتقار کے احترام میں سوکھ کر صرف ندی رہ گئی۔ لوگ ندی کو گاؤں کے بیچوں بیچ لانے اور قریبی دیہاتوں پر قبضہ کرنے کے لئے بڑی تیزی سے مکانات بنوا رہے ہیں۔ وررودڈ کا ایک ٹکڑا "جھنڈے کے ادھر" کہلاتا ہے۔ یعنی وررودڈ جھنڈے کے ادھر بھی ہے اور اُدھر بھی لیکن آخر وہ جھنڈا کدھر ہے یہ ہمیں آج تک نظر نہیں آیا۔ یہاں پر مسجدیں بھی ہیں اور ان کے بالمقابل مندر بھی۔ ہمارے یہاں جب بھی کسی مسجد کی تعمیر ہوتی ہے تو اس کا پلاسٹر سوکھنے سے پہلے ہی اس کے سامنے ایک نیا مندر تعمیر ہو جاتا ہے۔ ؏

کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

یہاں کالج بھی ہے اور اسی سے ملحق جانوروں کا دواخانہ بھی لہذا دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی والدین کالج میں پڑھتے ہوئے اپنے لڑکے کو دواخانہ میں بندھے بیلوں کے درمیان ڈھونڈتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور کوئی جاہل دیہاتی اپنی بھینس کو انجکشن دلانے کے لئے پروفیسر شاستری سے رجوع کرتا ہے۔ لہذا وہ اسے Follow me کہہ کر جانوروں کے دواخانہ کا راستہ دکھاتے ہیں اور بعض اوقات شدید جھنجھلاہٹ کے عالم میں یہی راستہ وہ اپنے طلبا کو بھی دکھاتے ہیں۔

* *

٭٭٭

معاونین تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

بیس نکات کا یہ مقصود
کنبہ ہو سب کا محدود
davp

برق آشیانوی

برق و شرر

(مستقل فیچر کالم)۔
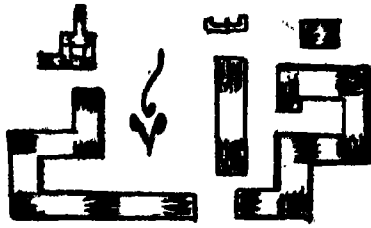
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں "خراٹے" کے عنوان سے مضمون لکھنے کی کیوں سوجھی تو عرض ہے کہ حال ہی میں اسمبلی
ے ایک اجلاس میں ایک رُکن خراٹے لے کر سو رہے تھے جس پر بازو بیٹھے ہوئے رُکن کو اعتراض ہوا اور اُنہوں نے اسپیکر
ے شکایت کی ایوان کے ایک رُکن خراٹے لے رہے ہیں۔ اسپیکر نے یہ رولنگ دی کہ "ایوان میں خراٹے لینا منع ہے! البتہ
اموشی کے ساتھ سونے پر کوئی پابندی نہیں ہے"۔ یہ رولنگ ہمارے خیال میں بالکل صحیح اور منصفانہ فیصلہ ہے۔ اور
ں فیصلے میں خود اسپیکر صاحب نے اپنے لئے بھی ایک جواز نکال لیا ہے اگر وہ خاموشی کے ساتھ سونے پر پابندی عاید کرتے
خود اُن کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا اس لئے کہ بعض وقت کسی رکنِ اسمبلی کی تھکا دینے والی تقریر اُن کے لئے لوری کا
ام دیتی ہے اور وہ تقریر کے دوران آرام سے سو سکتے ہیں۔ غرض ایک رُکن کے ایوان میں سونے سے عوام کو یہ بات تو کم از
م معلوم ہوگئی کہ ایوان میں ارکان سوتے بھی رہتے ہیں۔ جس کی اسپیکر صاحب نے اجازت دے رکھی ہے۔ ہماری اسپیکر
احب سے ایک گزارش ہے کہ وہ اس اجازت میں تھوڑا سا اضافہ کردیں وہ یہ کہ ارکان اسمبلی اپنے ساتھ ایوان میں بستر
بھی لا سکتے ہیں اس لئے کہ کرسیوں پر سونے سے اتنے آرام کی نیند نہیں آتی جتنا بستر پر سونے سے آسکتی ہے! ایسی
اجازت دینے کے بعد ایک اور مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے وہ یہ کہ بستر کہاں لگایا جائے تو عرض ہے کہ ایوان میں ایک علحدہ
ہال تعمیر کیا جائے جو ارکان اسمبلی کے سونے کے لئے مختص ہو۔ یا یوں بھی کیا جاسکتا ہے ایوان کے بالکل پچھلے حصے میں
کرسیاں نہ رکھی جائیں جہاں ارکان اسمبلی اپنا بستر لگا کر آرام سے سو سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ تمام کرسیاں
برخاست کردی جا کر ایک آرام دہ قالینوں سے مزین فرش کر دیا جائے گا۔ اور ہر رکن کے لئے اتنی جگہ مختص کر دی
جائے گی کہ وہ آرام کے ساتھ سو سکے۔ جب یہ انتظام ہو جائے گا تو تمام اراکین آکر آرام کے ساتھ لیٹ جائیں گے۔ اور
ایوان کی کارروائی سُنتے رہیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایوان کی کارروائی کون سُنے گا تو عرض ہے کہ وہ اخبارات میں

ایوان میں تقریر کرتا ہے وہ جاگتے رہیں گے باقی ارکان آرام کے ساتھ سوتے رہیں گے۔ آخر میں صرف ایک ہی رکن جاگتا رہے گا جس کی آخری تقریر ہوگی۔ جب ایوان کی کارروائی ختم ہوگی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ اسپیکر صاحب خود آرام سے سو رہے ہیں۔ چنانچہ آخری مقرر انھیں بیدار کر دے گا تاکہ وہ ایوان کی کارروائی کے اختتام کا اعلان کریں اس اعلان کے بعد ایک شخص کو اس کام پر ملازم رکھا جائے گا کہ وہ تمام ارکان کو فرداً فرداً بیدار کرے تاکہ وہ ایوان سے نکل کر چاہیں تو اپنے گھر جائیں یا پھر کسی اور جلسے میں جو سماجی قسم کا ہو شریک ہو کر اپنی باقی ماندہ نیند پوری کرلیں۔ یا پھر یوں بھی ہوسکتا ہے کہ ایوان کی کارروائی کے اختتام کا اعلان کر کے اسپیکر صاحب مکمل بے فکری کے ساتھ سو جائیں اور جس رکن کی نیند پوری ہو جائے وہ اٹھ کر ایوان سے چلا جائے اس طرح جب تمام ارکان اپنی نیند پوری کرلیں گے تو رفتہ رفتہ پورا ہال خود بہ خود خالی ہو جائے گا اور بیدار کرنے کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی اسی طرح ملازم کی تنخواہ کا بار بھی عاید نہ ہوگا۔ پھر ملازم رکھنے میں اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ اگر خود ملازم بھی سو جائے تو بیدار کون کرے گا۔ چنانچہ ملازم رکھنا بھی بیکار ثابت ہوگا۔ اتنا سارا انتظام کرنے کے بعد یہ شرط بہرحال قائم رکھی جائے کہ کوئی رکن نیند میں خراٹے نہ لے۔ یہ شرط اسی لئے باقی رکھنا پڑے گا کہ خراٹے لینے سے دوسرے ارکان کی نیند میں خلل واقع ہوگا۔ چنانچہ ابتداء میں ہم نے جو بیان کیا کہ ایک رکن کو دوسرے رکن کے خراٹے لینے پر اعتراض ہوا تو اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ معترض رکن کی نیند میں خلل واقع ہوا ہوگا۔ غرض ہم نے ابتداء میں جو تجاویز پیش کی ہیں اُن پر ہمدردانہ غور کیا جا کر ارکان کے آرام کی غرض سے منظور فرما لیا جائے تو تمام ارکان ہمارے حق میں دُعا کریں گے کہ برق آشیانوی صاحب کو راتوں میں جو صرف تین چار گھنٹے کی نیند آتی ہے اس نیند کی عمر میں دو تین گھنٹوں کی درازی نصیب ہو۔

نیند میں خراٹے لینا اسمبلی کے ارکان کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں خراٹے لینا انسان کا پیدائشی حق ہے۔ چنانچہ ایک طفل شیر خوار بھی نیند میں خراٹے لیتا ہے۔ اس طرح خراٹے لینے کا عمل انسان کی پیدائش کیساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے۔ خراٹوں پر سے یاد آیا کہ برق آشیانوی جب جوان تھا تو اُسنے ایک نظم کہی تھی جس میں خراٹوں سے متعلق بھی ایک شعر کہا تھا ؎

صدقے ہر معصوم خراٹے پہ موسیقی ہزار
ایک کروٹ پر کمالِ رقص کے جوہر نثار

مطلب یہ کہ ایک خراٹا اس قسم کا بھی ہوتا ہے جس پر موسیقی کا سارا فن نثار کر دیا جاسکتا ہے البتہ موسیقی کی وہ قسم جس کو استادی گانے کہا جاتا ہے ہمارے مفہوم موسیقی سے خارج ہے۔ بہرحال یہ بات تو عہدِ شباب کی تھی اب جو خراٹے ہم بھگت رہے ہیں وہ استادی گانوں کی ایک قسم بن کر رہ گئے ہیں

مرنا کھونچ (بیتیا)

نیا سال

نئے سال کا پیغام پُرانا
ہے وہی دوستو! پر جام پُرانا
د سے جاگا دلِ بد نام پُرانا
ہے نئے ڈھنگ سے اب کام پُرانا
بوتل ہے وہی دوستو! پر جام پُرانا

بائیگا در سود کا خوش ہونگے مہاجن
ں گے تجوری کو وہ نوٹوں سے دنا دن
ی قسمت ہے وہی ریل کا انجن
گے گریجوئٹ بھی سڑک پہ کھڑے منجن
بوتل ہے وہی دوستو! پر جام پُرانا

ں ملاوٹ میں جوانی پہ جوانی
ادھر سے گیا یہاں شاگرد کا پانی
ب کے رہبر کی تو مر جائے گی نانی
دھری رہ جائے گی سب شعلہ بیانی
بوتل ہے وہی دوستو! پر جام پُرانا

ہو گے تبھی چوروں کے جب سانڈ ہوگے
کرو کام کے انسان بنو گے
ن کو پکڑو گے تو پھر ہاتھ ملو گے
ہی جو کھونچ کرو گے پھلو گے
بوتل ہے وہی دوستو! پر جام پُرانا

عطا الرحمٰن طارق

غزل

دامنِ تار، تار کی باتیں
ایک، دو، تین چار کی باتیں

ہاں کرو مجھ سے پیار کی باتیں
کرسی و اقتدار، کی باتیں

چُن کے آجاؤں اس کے بعد تو پھر
ہونگی بنگلے، کی کار کی باتیں

جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں
اور اُس پر ہزار کی باتیں

کچھ کرو بات مرغ بریاں کی
چھوڑو چٹنی اچار کی باتیں

بات کرتے رہو قیامت تک
پر نہ کرنا ادھار کی باتیں

بات کا ڈھب عجیب ہے طارق
کوئی سمجھا نہ یار، کی باتیں

جاپان چلو جاپان چلو کی رسم اجرا

غالب اکیڈیمی، نئی دہلی، میں ادیبوں اور صحافیوں کا اجتماع

۲۰ نومبر کو اردو کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے سفرنامہ جاپان "جاپان چلو جاپان چلو" کی رسم اجرا غالب اکیڈیمی نئی دہلی میں جناب پی شیوشنکر مرکزی وزیر توانائی کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس خوشگوار تقریب میں دہلی کے ممتاز ادیبوں صحافیوں اور سیاسی قائدین کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ ملک کے نامور صحافی اور ادیب جناب خوشونت سنگھ نے اس تقریب کی صدارت فرمائی۔

کتاب کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے جناب شیوشنکر نے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کو زبردست خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ مجتبیٰ حسین نے مختصر سے عرصے میں مزاح نگاری کے میدان میں ایک اونچا مقام بنالیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو شمال اور جنوب کے بیچ ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنوبی ہند میں ہندی کے لئے ماحول کو سازگار بنانے میں اردو بہت اہم رول انجام دے رہی ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ سیکولر اور اتحاد پسند طاقتوں کا ساتھ دیا ہے اور اردو کے ادیب مستقبل میں بھی یہی فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ انھوں نے وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کی زیر قیادت حکومت ہند کے ان اقدامات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جو اردو کے فروغ کے لئے کئے جا رہے ہیں۔

صدر جلسہ جناب خوشونت سنگھ نے مجتبیٰ حسین کے سفرنامۂ جاپان کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جاپان کے بارے میں بہت سی کتابیں اور سفرنامے پڑھے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ ان سب میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مزاح ناقابل تقلید ہے اور انہوں نے ہنستے ہنستے جاپان کی سماجی و تہذیبی زندگی کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا پُر لطف سفرنامہ میں نے کسی زبان میں نہیں پڑھا۔ اس کی نظیر انگریزی میں بھی نہیں ملتی۔ میری یہ خواہش ہے کہ اس سفرنامے کا سادی ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہئے۔ خوشونت سنگھ نے

۳۵

یہ بھی کہا کہ میں خود جاپان کئی بار جا چکا ہوں اور کئی مہینے رہ چکا ہوں لیکن مجتبیٰ حسین نے اپنے پینتیس دن کے قیام میں جاپان کو جس طرح محسوس کیا ہے اور سمجھا ہے اس طرح میں جاپان میں لمبے قیام کے باوجود محسوس نہ کر سکا۔ مجتبیٰ حسین نے جاپانیوں کا مذاق اُڑانے کے بجائے اپنی ہی ذات کا مذاق اُڑا کر جاپان کے سفر کی دلچسپ روداد لکھی ہے۔

ابتداء میں جناب شمس الرب صدیقی اور جناب سید رحمت علی ممبر پارلیمنٹ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سید رحمت علی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت پر ایک خاکہ سنایا اور محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ ہندی رسالہ "ساریکا" کے ایڈیٹر جناب اے۔ این مُدگل نے مجتبیٰ حسین کے بارے میں کہا کہ وہ نہ صرف اردو بلکہ ہندی حلقوں میں بھی بہت مقبول ہیں۔ ان کا سفرنامہ جب ساریکا میں چھپا تو ہندی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ ہندی رسالہ "دنمان" کے ایڈیٹر صاحب کنھیا لال نندن کی دل آویز تقریر میں اُنہوں نے کہا کہ مجتبیٰ حسین جو زبان لکھتے ہیں اگر وہی زبان ہندی اور اردو کے سارے ادیب لکھنے لگیں تو ملک میں ہندی اور اردو کا کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری جہاں لوگوں کو ہنساتی ہے وہیں پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک چبھن بھی پیدا کرتی ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقالے میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ مجتبیٰ حسین لطیفوں کا سہارا نہیں لیتے بلکہ تخلیقی زبان اور اپنے اچھوتے اسلوب سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ جناب عتیق حنفی نے اپنے طویل مقالے میں سفرنامۂ جاپان کا تنقیدی جائزہ لیا اور مجتبیٰ حسین کی تحریر کے بہت سے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ جنوبی ہند کی دو ادبی شخصیتوں نے شمال پر گہرا اثر ڈالا ہے شاعری میں دکنی اور مزاح نگاری میں مجتبیٰ حسین۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ مجتبیٰ حسین مزاح نگاری کے ہر حربے کو استعمال کرنے کے گُر جانتے ہیں۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بھی مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

اس تقریب میں جس کا اہتمام بزم ساز و ادب نے کیا تھا، سفارت خانۂ جاپان کے فرسٹ سکریٹری مسٹر یوجوادکانو نے بھی شرکت کی۔ مجتبیٰ حسین کو بزم ساز و ادب کی جانب سے ایک ایوارڈ "نشانِ امتیاز" بھی مسٹر یوجوادکانو کے ہاتھوں دیا گیا۔ جناب ذہین نقوی نے جلسے کی کارروائی چلائی اور آخر میں شرکائے محفل کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اس موقع پر ایک سوونیئر بھی شائع کیا گیا جسے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جناب سخی حسن صدیقی نے مرتب کیا تھا۔ سب سے آخر میں مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنے دلچسپ پیرائے میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جس کے دوران ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اُٹھا۔

نامور مزاح نگار خواجہ عبدالغفور کے مضامین **سمن زار** ۱۸/ روپے توسط شگوفہ حاصل کیا جاسکتا ہے!

خرافات

(مراسلے)

محترمی، سلام و نیاز :

شگوفہ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یہ ماہنامہ بتدریج نکھرتا جارہا ہے۔ اس کی ادبی حیثیت مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ مجھے تو دوسرے ادبی رسالوں سے یہ ادبی رسالہ زیادہ دلکش، صحت مند اور دل نشین نظر آتا ہے۔ نظم، مضامین اور مزاحیہ خاکوں کا انتخاب آپ کی ادبی صلاحیت کا غماز ہے۔ اس رسالے کی ادبی خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ ادب کا ایک ایسا شگفتہ گلاب ہے جو صحرا میں بھی اپنی خوشبو بکھیرتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی بے لوث خدمت کا نتیجہ ہے۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ شگوفہ ایک دن ہندوستان کا واحد ادبی رسالہ تصور کیا جائیگا۔ قلم کی حرارت برقرار رہی تو یہ حرارت ادب کے جسم کی حیات بن جائے گی۔ میں آپ کی خدمات کی تعریف کرنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ کی زندگی کا نصب العین ادب کی بے لوث خدمت ہے

جوہر سیوانی
سیوان (بہار)

برادرِ عزیز سلام مسنون :

"براشہر لوگاں سوں معمور کر" والا مستقل کالم شہر شہر کی کہانی ثابت ہورہا ہے۔ مزاح نمبر تو شایانِ شان ہوگا کیونکہ ـــــ یوسف ناظم اور کمال صاحبان کی کوشش اور محنت جو لگی ہوئی ہے۔

رؤف خوشتر، بیدر

محترمی آداب :

اکتوبر کے شمارے میں جن تخلیقات کو پڑھا ہے ان میں "ایسا بھی ہوتا ہے" اور "آوارہ گدھے" نے متاثر کیا ہے۔ "شگوفہ" کا ہندوستانی مزاح نمبر شائع ہونے والا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس شمارے سے طنز و مزاح کے حقیر سرمائے میں اضافہ ہوجائے گا۔

محمد تقی لاتور (مہاراشٹرا)

جناب ایڈیٹر صاحب "شگوفہ"

ستمبر کا شگوفہ پڑھ کر طبیعت "شگوفہ" ہوگئی۔ واقعی آپ کمال کے آدمی ہیں کہ ہر ماہ فکر و آلام سے نجات دلا کر یک گونہ سکون بہم پہنچا کر ہماری پسند کا بوجھ اپنے طاقتور کاندھوں پر اٹھاتے ہیں آپ تو اسم بامسمیٰ ہیں۔ پتہ نہیں کیوں آپ کی جھوٹی تعریف کرنے کو دل ہی نہیں دماغ بھی چاہتا ہے۔ دو تین شماروں میں بیکن نظام آبادی کی شخصیت شگوفہ پر خوشبو کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ بیکن کو ہر ماہ چھاپیئے تاکہ ہماری نقلی انا کو تسکین ہوسکے۔

رفیق شاہی حیدرآباد

مکرمی تسلیم و نیاز

نومبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ شگوفہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ نئے نئے شگوفے کھلا رہا ہے اس کے لیے میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ ہندوستانی مزاح نمبر کا اعلان پڑھ کر مسرت حاصل ہوئی۔ "شگوفہ" کے نمبر مواد اور معیار کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یقین پچھلے نمبروں کی طرح یہ بھی کافی وقیع ہوگا۔ مشمولات سمیع جلیل اور سراج نرملی نے متاثر کیا۔ نظر برنی کا ماڈرن غالب بھی پسند آیا۔

محمد طاہر
بمبئی

Accession Number. 84750
Date 9.7.86